حقیقت بھی کہانی بھی

سید بدرالدین احمد

ناشر
بہار اردو اکادمی، پٹنہ

حقیقت بھی کہانی بھی

(عظیم آباد کی تہذیبی داستان)

سیّد بدرالدین احمد

ناشر

بہار اردو اکادمی، پٹنہ

نام کتاب	:	حقیقت بھی کہانی بھی
مصنف	:	سیّد بدرالدین احمد
تعداد طبع دوم	:	ایک ہزار
سن اشاعت	:	۲۰۰۳ء
طابع	:	پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج، پٹنہ۔۶
کمپیوٹرائزیشن	:	ارم کمپیوٹرس، جمال روڈ، پٹنہ
قیمت مجلد	:	Rs. 300/-
قیمت غیر مجلد	:	Rs. 250/-
ناشر	:	بہار اردو اکادمی، اردو بھون
	:	اشوک راج پتھ، پٹنہ۔800004 (بہار)

HAQIQAT BHI KAHANI BHI

by

Syed Badruddin Ahmad

Price

Library Edition : Rs. 300/-

Paper back : Rs. 250/-

اِنتساب

میں اپنی اِس کتاب کا انتساب پٹنہ کے اس گذرے ہوئے گنگا جمنی سماج کی یادوں کے ساتھ معنون کرتا ہوں جو پٹنہ ہی کا نہیں، پورے ہندوستان کا مشترکہ گنگا جمنی سَماج تھا اور جس کی تعمیر میں یہاں کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگوں نے یکساں طور پر حصہ لیا تھا۔ اس سماج میں پوری قوم ایک اکائی تھی، اس سماج میں بھائی چارہ اور محبت کا راج تھا، رواداری اور یک جہتی پروان چڑھتی تھیں اور ایکتا کے سَانچے میں جذبات و محسوسَات ڈھلتے تھے۔ آج پھر اُسی گنگا جمنی سماج کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا مُلک دوبارہ جنت نشاں بن جائے۔

سیّد بدرُالدین احمد

فہرست مضامین



گفتنی

"حقیقت بھی کہانی بھی" کا اولیں ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں بہار اردو اکادمی نے شائع کیا تھا اور کچھ ہی دنوں میں اس کی تمام کاپیاں ختم ہو گئیں۔ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا مطالبہ ہونے لگا۔ کئی برسوں سے یہ کتاب دستیاب نہیں تھی اسکی افادیت کے پیش نظر دوسرا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔

"حقیقت بھی کہانی بھی" فکشن نہیں ہے لیکن فکشن سے کم دلچسپ نہیں ہے کہ ایک بار کتاب شروع کر کے قاری بس اسے ختم ہی کر کے دم لینا چاہتا ہے شاید اس لئے کہ وہ اس معاشرے اور تہذیب میں کھو جاتا ہے جو کبھی ہمارا سرمایہ تھی اور اب قصۂ پارینہ ہے۔ ماضی خوشنما ہوتا ہے اس کی کہانیاں سب کو اچھی لگتی ہیں۔ ہر شخص اس کے تصور میں کھو جانا چاہتا ہے۔ حقیقت کربناک ہوتی ہے لیکن حقائق سے بالاتر ہوئے بغیر اس کا عرفان نہیں ہو سکتا اس لئے یہاں بیان کردہ حقائق میں بھی کتنی ہی ٹیسیں چھپی ہوئی ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کبھی سسکیاں لیتا ہے اور کبھی غم اندوہ کے سمندر میں غوطے لگانے لگتا ہے۔ لیکن مصنف نے ان حقائق کو زبان بیان کی آمیزش سے کہانی کا روپ دے دیا ہے۔ کہانی دلچسپ ہوتی ہے اس لئے ہمیں بڑے دلچسپ قصے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ محیّر العقول واقعات سے روبرو ہونے کے مواقع بار بار آتے ہیں۔

ہر بستی کا جغرافیہ ہوتا ہے اور تاریخ بھی لیکن ان سب سے پرے اس کی ثقافتی و معاشرتی تہذیب ہوتی ہیں اور اس کو کاغذ پر مورخ نہیں دیدہ ور ہی اتار سکتا ہے۔ عظیم آباد بھی ایک ایسی ہی تاریخی بستی ہے جس کے بارے میں راسخ نے کہا تھا۔

یہ بستی اب بھی بازارِ ختن ہے باکمالوں سے
غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے

عظیم آباد کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں:۔ اشوک اعظم سے لیکر دور حاضر تک لیکن "حقیقت بھی کہانی بھی" اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے کیوں کہ یہ صرف تاریخی نہیں ثقافتی جائزہ بھی ہے۔ مصنف کی دوربیں نگاہوں سے شعبۂ زندگی

کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ سکا ہے، کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا ہے اگر انہوں نے نوابین وامراء کی محفلوں کی سرگزشت بیان کی ہے تو چنڈو خانہ کو بھی احاطہ تحریر میں لیا ہے اگر انہوں نے خانقاہوں کی تقدس مآب شخصیتوں کا ذکر کیا ہے تو گندگی میں بیٹھے کوڑا شاہ بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ شریف عورتوں کا ذکر کیا تو طوائفوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی نظر میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ شخص رہا ہے۔ جہاں اشراف پر قلم اٹھاتے ہیں وہیں اجلاف بھی ان کے دائرۂ تحریر میں آتے ہیں۔ غرض انہوں نے گذشتہ عظیم آباد پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ ہر گوشہ اجاگر ہو گیا ہے ہم نے وہ عظیم آباد نہیں دیکھا لیکن اس کتاب میں اس کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔ اسے پڑھتے وقت ہم خود بھی اس رزم و بزم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ان محفلوں اور صحبتوں میں شرکت کا لطف حاصل ہو جاتا ہے۔

کتاب کے مصنف سید بدر الدین احمد بدر عظیم آبادی خود بھی ہشت پہل شخصیت تھے ان کی مصروفیات گوناگوں تھیں وہ عظیم آباد کے ایک نمایاں خانوادے کے فرد تھے۔ سیاست انہیں وراثت میں ملی تھی اور وہ خود بھی بہار قانون سازیہ کے رکن رکین رہے۔ جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ ادبی اور ثقافتی تھا۔ شعر و ادب انہیں گھٹی میں پلایا گیا تھا جہاں انہوں نے عظیم آباد کی ادبی و ثقافتی مجالس کا مشاہدہ کیا وہیں اس میں خود بھی شریک رہے۔ اسی لئے کتاب میں ان کی شخصیت بہت کھل کر سامنے آتی ہے۔ یہ ایڈیشن ان کے انتقال (۱۱ اگست ۱۹۸۳ء) کے بعد شائع ہو رہا ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ مصنف کی حیات و خدمات کا بھی اجمالی جائزہ لیا جائے جس کے لئے ہم نے ڈاکٹر شکیب ایاز صاحب سے درخواست کی تھی انہوں نے یہ ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دی جس کے لئے ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔

گذشتہ ایڈیشن میں جو خامیاں رہ گئی تھیں ان کو بھی دور کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے امید ہے یہ ایڈیشن قارئین کے لئے زیادہ مفید اور سود مند ثابت ہوگا

ڈاکٹر رضوان احمد

(سکریٹری)

سید بدرالدین احمد، بدؔر عظیم آبادی

ایسے دور میں کہ ماضی درخوراعتنا نہ ہو، حال انقلاب کی رو میں جلد جلد بدل رہا ہو، سماج کے مدارج ابھی متعین نہ ہوئے ہوں ...... میں نے اسی زمانے میں آنکھیں کھولیں، جب عظیم آباد کی ثروت و تہذیب کا چراغ آخری ہچکولے لے رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے یہ شمع بھی بجھ گئی۔ تھوڑی دیر تو اس شمع کشتہ سے دھواں اٹھتا رہا مگر بدلتی ہوئی فضا کی سرد ہواؤں نے اسے بھی منتشر کردیا۔ یہ میری عمر کا ابتدائی دور تھا[1]

اسی عہد گذشتہ کی یادگار سید بدرالدین احمد' بدر عظیم آبادی تھے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی سید ضمیر الدین احمد تھا اور خطاب خان بہادر۔ ارضِ "مخدوم جہاں"، جسے بہار شریف سے موسوم کیا جاتا ہے' آپ کا مولد و مسکن تھا والد سید کرامت حسین کے گھر ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ کالجیٹ اسکول سے انٹرنس پاس کیا اور پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے بی اے کی سند حاصل کی۔ آپ کی شادی سید احمد حسین رئیس صدر گلی کی صاحبزادی سے ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔ میر احمد حسین کا شمار بھی اہل خیر میں ہوتا تھا۔ دولت و ثروت تو ورثے میں ملی تھی لیکن اہل علم سے خصوصی رغبت رکھتے تھے۔ سید بدرالدین احمد لکھتے ہیں......

"میر امداد حسین کے گھر کی ادبی محفلوں کا دور دور چرچا تھا۔ علامہ عبد الحمید پریشاں صدر انجمن تھے۔ ۱۸۸۵ء میں مولوی رحیم الدین بھی مولوی ضمیر الدین احمد کی وساطت سے پہنچ گئے۔ یہ آئے تو مولانا عبد الغنی دربھنگوی اور عبد الغفور شہبازؔ بھی وابستہ ہوگئے۔ شمس العلما مولانا عبد الرؤف صادق پوری' خان بہادر سید رضا حسین' میر احمد حسین وغیرہ باکمالوں کا مجمع تو پہلے سے موجود تھا ہی۔ ان سبھوں نے مل کر ایک اخبار "الپنچ" نکالا۔ سب سے پہلے اس کا دفتر صدر گلی میں قائم کیا گیا۔ بعد میں

---

[1] "یاران میکدہ" (تذکرہ) مرتبہ۔ محمود علی خاں صبا، سنہ اشاعت، ۱۹۵۷۔ ص: ۲۴

[2] انتقال: ۱۸۹۲ء بحوالہ حقیقت بھی کہانی بھی

بانکی پور منتقل ہو گیا تھا۔"

میر احمد حسین کا گھر مرجع علماء تھا

سید بدرالدین احمد کے والد ماجد خان بہادر سید ضمیر الدین احمد (ولادت : ۱۸۶۲ء - وفات : ۱۹۲۲ء) صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ تصانیف و تالیف کے ساتھ ساتھ بہت سے اداروں کی سرپرستی بھی کی۔ انجمن ترقی اردو پٹنہ کے بانی صدر تھے جو ۱۹۲۰ء میں پٹنہ سیٹی میں قائم ہوئی۔ قاضی عبدالودود اس کے معتمد تھے اور ان کے معاونین میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور سید محمود شیر کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اس کا ایک رسالہ "نوید" بھی شائع ہوا تھا۔ جس کے کئی شمارے خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں اور راقم کی نظر سے گزرے ہیں سید ضمیر الدین احمد اور محمڈن اینگلو عربک اسکول کے سکریٹری بھی رہے تھے۔ مارچ ۱۸۸۴ء میں محمڈن ایجوکیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ وہ اس کے اساسی ممبر تھے۔

آپ کی تصانیف میں تاریخ کی معروف کتاب "کولبہ ملوکی و مملوکی" ہے جو ۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی تھی راقم السطور نے "دکن ریویو" میں محولہ کتاب پر سید عبدالغنی کا ایک تبصرہ دیکھا ہے "سیرت الشرف" حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیی منیری کے حالات پر محققانہ تصنیف ہے۔ اس کا اشتہار اخبار "الپنچ" ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔ انگریزی زبان میں ایک طویل مقالہ بعنوان "راسخ عظیم آبادی" بہار و اڑیسہ ریسرچ جرنل شمارہ مارچ ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا تھا۔ "یورپ کے فلسفہ جدیدہ پر ایک سرسری نظر" کے عنوان سے قسط وار ایک مقالہ سید شاہ نذر الرحمٰن حفیظ کے ماہنامہ "بہار" (جاری: ۱۹۰۳) میں شائع ہوا تھا [۱] "شیر شاہ" پر ایک کتاب تصنیف کی تھی لیکن اس کا مسودہ ایک صاحب لے گئے اور پھر واپس نہ ہو سکا۔

اسی ادبی علمی اور تہذیبی ماحول میں سید بدرالدین احمد ۱۹۰۱ء میں اپنی نانیہال

---

[۱] ماہنامہ اشارہ پٹنہ نومبر ۱۹۶۰ ص: ۱۰ [۲] یادگار روزگار میں آپ کا ذکر ہے۔
[۳] ان کے حالات اور کارنامے حقیقت بھی کہانی بھی میں درج ہیں ص: ۴۸۹

سید احمد حسین رئیس صدر گلی کے گھر پیدا ہوئے۔ اسی فضا میں پرورش و پرداخت ہوئی موصوف لکھتے ہیں ۱ے

"شاہ ضیا الدین صاحب ...... والد مرحوم کے دوست بھی تھے۔ میری تعلیم اور نگہداشت صدر گلی میں رہ کر کرنے کی بات ان سے (ضیا الدین) کہیں یا نہ کہیں۔ آخر ایک دن حافظ صاحب آئے تو والد ...... نے اپنی مشکل ان کے آگے پیش کی۔ حافظ سید ضیا الدین صاحب نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ یہ بات منظور کرلی۔"

اسی طرح ابتدائی تعلیم عربی و فارسی کی گھر پر ہوئی۔ ان کے اتالیق اور نگراں سید شاہ ضیا الدین نے چار برسوں تک ان کے بنگلے پر رہ کر ان کی تعلیم کو جاری رکھا۔ اس میں ان کی تربیت بھی شامل تھی۔ ابتدائی انگریزی کتابیں بھی گھر ہی پر پڑھیں۔ پھر اسکول اور کالج میں تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ بی اے پٹنہ کالج سے کرنے کے بعد انگریزی میں ایم اے اور قانون کے امتحانات کی تیاری ہونے لگی لیکن بہ سبب علالت انگریزی میں ایم اے کے امتحان نہ دے سکے لیکن بی ایل کا امتحان پاس کرلیا۔ ۱۹۲۶ء میں باضابطہ وکالت شروع کی لیکن یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور زندگی نے نیا موڑ اختیار کرلیا۔ احباب کے اصرار پر ۱۹۳۷ء سے ملک کی عملی سیاست میں پرجوش اور سرگرم عمل ہوگئے یہاں تک ۱۹۴۰ء میں جو تھوڑا بہت وکالت کا شغل جاری تھا، اس سے بالکل علاحدگی اختیار کرنی پڑی۔ ۲ے

کارکردگی، سرگرمی اور فعالیت کے نتیجے میں آپ کو پرووِنشل مسلم لیگ کا جنرل سکریٹری بنادیا گیا عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر چمپارن سے اسمبلی کا الیکشن لڑتے رہے اور ہمیشہ عوامی مقبولیت کے سبب کامیاب ہوتے

۱ے رسالہ "بہار" اخبار الپنچ کا ادبی ضمیمہ تھا۔ شمارہ جولائی ۱۹۰۲ء میں درج ہے کہ ایک انجمن مؤید اللسان قائم ہوئی تھی جس کے ایک رکن سید ضمیر الدین احمد تھے۔ بحوالہ نوید کے شمارہ ۱۲ تک قسط وار شائع ہوا لیکن مکمل نہ ہو سکا۔ بحوالہ مضمون بعنوان بہار از قاضی عبدالودود۔ شمارہ نومبر ۱۹۶۰ء

۲ے حقیقت بھی کہانی بھی

رہے۔ عملی سیاست میں حصہ کیوں لیتے رہے؟ ان کے انداز نظر کو سمجھنے کیلئے خود ان کے تحریر کردہ الفاظ کو ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں!

۱۹۴۰ء میں جب لاہور گیا...... اس وقت مسلم لیگ کا پنجاب میں بہت زور تھا دوسری مسلم سیاسی پارٹیاں، جن میں جمیعت احرار بھی تھی، ماندہ ہو کر رہ گئی تھی۔ مولانا عطاالله شاہ بخاری سارے پنجاب کے امیر شریعت اور جمیعت احرار کے سب سے اونچے لیڈر ہونے کے باوجود، پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔

سید بدر الدین احمد کے قلم سے نکلے ہوئے فقرے، اسی دور کے حالات کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ وہ بھی دیکھیئے:[1] "ملک تقسیم ہو گیا۔ جذبات بدل گئے۔ لہلہاتے درخت خشک ہو کر پیوند زمین ہو گئے ان کی جگہ پر نئے پودے نکل کر تناور درخت بن گئے۔ مگر پرانی یادیں پہلے ہی کی طرح آج بھی دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ مولانا بخاری گزر گئے۔ میں نے ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انہیں نہیں دیکھا مگر آج بھی ان کی یاد آتی ہے تو دل بے قرار ہو جاتا ہے۔"

مصنف "حقیقت بھی کہانی بھی" ڈاکٹر سچتا نند سنہا کے متعلق اس عہد کی صورت حال کا ذکر کرتے ہیں۔ اردو کے حوالے سے جو تعصب اور تنگ نظری غالب آچکی تھی۔ اس کی نشاندہی اس طرح کرتے ہیں۔

"(سچتا نند سنہا) اردو میں بھی خوب تقریر کرتے تھے۔ ان کا آخری زمانہ تھا اور ۱۹۴۶ء میں وہ بھی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسی زمانے میں، میں بھی اسمبلی کا ممبر تھا...... غالباً ۱۹۴۷ء میں ایک دن جب سید امین احمد مرحوم اپنی لانبی اردو تقریر ختم کر چکے تو مسٹر سنہا اس کے بعد تقریر کرنے کو کھڑے ہوئے۔

---

[1] بحوالہ حقیقت بھی کہانی بھی۔ ص ۳۲۵۔۳۲۶

اردو میں اس دفعہ (تقریر) شروع کی "ابھی میرے دوست اچھی تقریر کر چکے ہیں۔

آگے ان کے فروغ پانا
سورج کو ہے چراغ دکھانا
یہ بحر سخن صدا ہے باقی
دریا نہیں کار بند ساقی

تقریر کیا تھی؟ معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت و بلاغت کا دریا لہریں لے رہا ہو ---۔ تماشہ دیکھئے مسٹر سچیتانند سنہا کی خالص اردو میں ان کی ادبی تقریر باقاعدہ ہندی لکھی گئی اور انکے پاس ہندی میں تصحیح کیلئے بھیجی گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے کا واقعہ ہے کہ مسٹر سنہا نے جب اپنی تقریر ہندی میں دیکھی تو غصے میں رپورٹر کے آگے پھینک دی اور بولے کہ میں نے اردو میں تقریر کی تھی یہ ہندی میں کہاں سے آگئی۔"[1]

سید بدرالدین احمد نے اپنے سیاسی دائرہ کار کا ذکر مختصراً کیا ہے۔ ان میں سے ایک کا ذکر آج سیاق میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھے یاد آتا ہے کہ چین کے مسلمانوں کا ایک مشن ہندوستان آیا تھا۔ غالباً ۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا۔ جب اس مشن کے آنے کی خبر مسٹر سید عبدالعزیز کو ملی تو انھوں نے خط لکھ کر اس مشن کو اپنے یہاں ٹھہرنے کیلئے مدعو کیا ---۔ مجھے بلا کر مسٹر سید عبدالعزیز نے کہا چینی مشن دو دن میں پٹنہ میں آجائے گا۔ مجھے اس کی میزبانی کرنی ہے مگر میں ایک کشمکش میں پڑ گیا ہوں مجھے کل ہی بھاگل پور خون کے ایک سنجیدہ مقدمے میں شیشن میں جانا ہے ---۔ اسی لئے پٹنہ میں تم میری طرف سے چینی مشن کے لوگوں کی میزبانی کرو --۔ ان چینی (مسلمانوں کے مہمانوں کے ساتھ دو تین دن رہ کر مجھے معلوم ہوا کہ چینی مسلمان اسلامی روایات کے سختی سے پابند ہیں۔"[2]

عملی سیاست سے تو علاحدگی اختیار کرلی تھی لیکن دل و دماغ سے وہ نقوش نہیں مٹے جو کبھی مرتب ہوئے تھے آخری دور تک وہ سیاسی تبصرے کرتے رہتے تھے اور

۱۔ ۲۔ بحوالہ "حقیقت بھی کہانی بھی"

اپنے ہم عمروں کی مجلس میں ان کے تبصرے اور مشورے بڑی اہمیت رکھتے تھے وہ لکھتے ہیں:

"سیاست کی وہ سرگرانی تو نہیں مگر چھٹتی نہیں ہے منھ سے وہ کافر لگی ہوئی اس کا چسکہ اب بھی باقی ہے اور ولے بر ندش ابھی تک پانچویں سواروں میں ' میرا شمار بھی کبھی کبھی ہو جاتا ہے"[1]

سید بدرالدین احمد کی نانیہال میں بھی تصوف اور بیعت کا سلسلہ تھا۔ آپ کے والد کو بطور خاص تصوف اور اہل صوف سے نسبت تھی۔ کتاب "سیرت الشرف" کی تصنیف و تالیف کا ایک سبب یہ بھی رہا ہوگا۔ انہیں حضرت حاجی خدا بخش سے عقیدت ہی نہ تھی بلکہ وہ آپ کے دست حق پر بیعت کر چکے تھے۔ آپ کے پیر کا وصال یہیں ہوا اور آپ کو ان کے نانہالی قبرستان میں مدفون کیا گیا تھا۔ سید ضمیر الدین احمد کا انتقال ہوا تو وصیت کے مطابق آپ کو ان کے پیر کے پہلو میں دفن کیا گیا اس طرح سید بدرالدین احمد کو بھی علوم دینوی کے ساتھ ساتھ علوم معرفت بھی ورثے میں ملی تھی۔ وہ بزرگوں ' دینی رہنماؤں اور بطور خاص صوفیوں ولیوں کا دل سے احترام کرتے تھے۔ خود ان کے الفاظ اس کی تائید و تصدیق کرتے ہیں:

"میرے بچپن کے زمانے میں خانقاہ عمادیہ کی رونق حضرت مولانا شاہ رشید الحق علیہ الرحمتہ کے دم قدم سے تھی۔ حضرت کا تعلق باشندگان پٹنہ سے دو طرح پر تھا۔ ایک تو پٹنہ سیٹی میں خانقاہ عمادیہ کی سجادہ نشینی کے سبب سے ' دوسرا تعلق شاہی عید گاہ (گلزار باغ پٹنہ سیٹی) میں عیدین کی نمازوں کی امامت کے باعث ...... میں نے نوجوانی میں حضرت کو دیکھا تھا۔ بڑی متبرک اور نورانی صورت تھی۔ جس وقت عیدین کی نمازیں پڑھاتے اور عربی اور اردو میں خطبہ دیتے تو سارے نمازیوں پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا تھا اور خطبہ کا ہر لفظ دل میں اترتا ہوا معلوم ہوتا......"

---

[1] یاران میکدہ (تذکرہ)

"عم محترم میر عبد الحفیظ صاحب مرحوم کے ساتھ حضرت (حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین جناب حضور خانقاہ مجیبیہ قدس سرہ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ماموں صاحب نے میرا تعارف حضرت سے اس طرح کرایا کہ یہ بھائی ضمیر الدین احمد صاحب کا لڑکا ہے۔ ہنستے ہوئے پوچھا' تمہارا نام کیا ہے۔ میں نے زور دے کر کہا میں بدرالدین ہوں...... مسکراتے رہے اور مجھے کھینچ کر بغل میں بیٹھالیا۔"[1]

آپ کا دائرہ کار وسیع تھا۔ تہذیبی' سماجی اور ملی کاموں سے دلچسپی تھی۔ کئی اداروں سے وابستہ رہے۔ محمڈن ایجوکیشن سوسائٹی (قیام: مارچ ۱۸۸۴ء) کے رکن اور اسکی عاملہ کے صدر بھی ہوئے محمڈن اینگلو عربی ہائی اسکول اور اورینٹل کالج پٹنہ کے رکن عاملہ تاحیات رہے' پٹنہ کے ایک ملی ادارہ یتیم خانہ خادم الاسلام کے اساسی رکن مجلس عام و مجلس عاملہ رہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ کے ممبر بھی تھے۔[2]

سید بدرالدین احمد کی شخصیت اپنے عہد کی آئینہ دار تھی۔ اس دور کی شناخت کیلئے ان کے احوال و آثار کی ورق گردانی ضروری ہے۔ وہ صرف سیاسی مدبر ہی نہ تھے بلکہ علم و ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ راقم السطور نے سن شعور سے آپ کو دیکھا اور مختلف محفلوں میں آپ کی خوش گفتاری اور علمی مباحث سے سیکھنے کا مجھے موقع میسر رہا ۔ میرے والد عظیم الدین مخمور (ولادت: ۱۹۰۱ء ۔ وفات: ۱۹۸۸ء) آپ کے ہم عمر اور ہم مسلک تھے۔ یہ بھی کٹر مسلم لیگی تھے۔ شاید ارتباط کی یہ بھی خاص وجہ رہی ہوگی میں آپ کے بنگلے پر اکثر جایا کرتا تھا وہ اپنے دیوان خانے میں نیم دراز آرام کرسی پر موجود ہوتے اور کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی۔ تاریخ اسلام' تاریخ عالم اور اہم سیاسی اور ادبی شخصیتوں کی سوانح حیات سے گہرا لگاؤ تھا۔ آپ کا ذاتی کتب خانہ خود نادر

---

[1] [2] بحوالہ "حقیقت بھی کہانی بھی۔ حضرت مولانا سید شاہ رشید الحق قدس سرہ، (ولادت: ۱۲۶۲ھ وصال: ۱۳۳۹ھ) آپ کا ایک سفر نامہ بخط مصنف بہ عہد ۱۳۰ ۳ تا ۱۳۳۱ھ کتب خانہ خانقاہ عمادیہ پٹنہ سیٹی میں موجود ہے۔ راقم نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ عصری معلومات سے عبارت ہے۔ حیرت ہے کہ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء میں اس کا حوالہ موجود نہیں ہے۔ حواشی کے ساتھ مرتب کرکے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابوں سے مزین تھا۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس میں کتب خانہ 'انجمن ترقی اردو پٹنہ سیٹی کا عارضی سکریٹری ہوا۔ اس وقت کتاب "حقیقت بھی کہانی بھی" زیر تصنیف تھی میں نے آپ کے حکم پر کئی کتابیں کتب خانے سے فراہم کی تھیں۔ راقم السطور نے آپ کو شیروانی کے بغیر کہیں نہیں دیکھا۔ ٹوپی تو تہذیبی علامت تھی' وہ کیسے چھوٹتی۔ شام کو بالعموم ان کے گھر ان کے احباب کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ چند برسوں تک علامہ جمیل مظہری بھی آپ کے گھر رہتے تھے۔ آپ کے صاحبزادے سید فیاض الدین احمد جمیل صاحب کے مزے دار قصے سناتے ہیں۔ آپ کے احباب میں سید جعفر امام' مظہر امام' نواب زادہ سید محمد مہدی' نواب سید علی سجاد شاہ' محمد حسن بسمل' سید وارث اسماعیل' شاہ رفیع الدین' شاہ رضی احمد رضی مولانگری بطور خاص تھے اور آخری دور میں جمیل احمد شریک بزم ہوئے۔ سید حسین احمد رعنا تو آپ کے رشتہ دار ہی تھے۔ کبھی کبھی اجتبیٰ رضوی بھی آجاتے اور حسین احمد ایڈوکیٹ کے گھر مقیم ہوتے تھے۔

آپ کے عہد میں زوال کے بعد بھی عظیم آباد میں جو علم و ادب کی ایک صف آراستہ تھی' برصغیر کی نگاہ اسی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی تھی۔ قاضی عبدالودود' کلیم الدین احمد' سید حسن عسکری' جمیل مظہری' اختر اورینوی۔ یاس یگانہ چنگیزی' عطا کاکوی' حمید عظیم آبادی' فصیح الدین بلخی' ثاقب عظیم آبادی' سید محمد مسلم' شاہ محمد حسن بسمل' مبارک عظیم آبادی۔ سہیل عظیم آبادی۔ یہ نام وہ ہیں جن سے تاریخ ادب اردو عبارت رہی ہے۔ ان کے متعلق یہ کہنا بجا ہے۔

"نرگس کی آنکھ بن کے رہے ہیں چمن میں ہم" (اکبر داناپوری)

"حقیقت بھی کہانی بھی" ایک کتاب نہیں' عظیم آباد کی تہذیبی دستاویز ہے۔ اسے تحقیقی انداز نظر سے دیکھنا درست نہ ہوگا اس لئے کہ حقیقت کو لباس مجاز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا موازنہ گذشتہ لکھنؤ سے کرنا ہی انسب ہے۔

اس کتاب کی افادیت و مقبولیت کا اندازہ کیجئے کہ معمولی کتابت و طباعت، سرورق کے باوجود برصغیر میں اس کی مانگ ایسی ہوئی کہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اور ایک سال ہی میں اس کی تمام جلدیں فروخت ہو گئیں۔

بہار اردو اکادمی پٹنہ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہی ہے اور نہایت اہتمام سے اس کی طباعت کا کام جاری ہے۔ سکریٹری بہار اردو اکادمی ڈاکٹر رضوان احمد اور دیگر اہل کار مبارک باد کے مستحق ہیں "حقیقت بھی کہانی بھی" جلد دوم ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس کی اشاعت کی جانب بھی ہماری توجہ ضروری ہے۔

سید بدرالدین احمد ایک صاحب طرز نثر نگار ہی نہ تھے بلکہ ایک منفرد آہنگ و فکر کے شاعر بھی تھے۔ مجھے کلیات بدر کے مطالعے کا موقع میسر آیا ہے جو ان کے بڑے صاحبزادے پروفیسر فیاض احمد، سابق پرنسپل اورینٹل کالج پٹنہ کی ملکیت ہے۔ سارا کلام بخط مصنف ہے لیکن اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ مجموعہ کلام میں مرثیے، نظمیں اور غزلیں موجود ہیں وہ اپنی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

شعر سننے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا ...... جب سیاست کی فضا بدلی اور اگلے اور پچھلے واقعات نے طبیعت پر اثر کرنا شروع کیا تو اس کے رد عمل سے بچنے کے لئے چند عزیزوں نے ایک محدود "بزم احباب" کی طرح ڈالی۔ یہ ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا۔ یہیں سے میری شعر گوئی کا مختصر دور شروع ہوا اسی ماحول میں، میں نے غزلیں کہنی شروع کیں۔ کچھ نظمیں اور مرثیے بھی کہے۔

درج بالا اقتباسات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بدر عظیم آبادی نے ۱۹۴۹ء سے شعر کہنا شروع کیا لیکن میں مندرجہ سنہ کو نقطہ آغاز شاعری نہیں مانتا بلکہ ۱۹۴۹ء سے وہ محفلوں اور مشاعروں میں بحیثیت شاعر شرکت کرنے لگے۔ شعر گوئی کی ابتداء اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس کے جواز میں میں "کلیات بدر" کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ دس سال کی مشق سخن کسی بھی شاعر سے ۵۵ بندوں پر مشتمل مسدس نہیں

کہلواسکتی ۔ ''کلیات بدر'' میں دین و عشق ' کے عنوان کے تحت ۵۵ بند کے مرثیہ یا مسدس بخط مصنف موجود ہے جس کی ابتداء اس بند سے ہوتی ہے!

یاد ایام اور رنگینیٔ فطرت تھے ہم
سینۂ عرش میں اک راز حقیقت تھے ہم
لوح محفوظ میں مفہوم خلافت تھے ہم
ترجمان دل بے تاب مشیت تھے ہم
پھینک کر چادر عصمت تگ و دو میں نکلے
محفل کون و مکاں لے کے جلو میں نکلے

کیا شان نزول اس کا پتا نہیں دیتی کہ یہ بند چالیس پچاس برس کی مشق کا نتیجہ ہے۔ قادر الکلامی بندش الفاظ اور اسکی فکر خود غماز ہے اور میرے مقررہ دلائل کو یقین میں بدل دینے کیلئے کافی ہے۔

زیر بحث مسدس کے چند بند بطور نمونہ مزید درج کئے جاتے ہیں۔

ہے یہ راوی کا بیاں لٹ جو چکے آل رسول
آئیں میدان میں لاشوں کے قرین بنت تبول
اور مانگی یہ دعا حق سے بہ آواز ملول
اے خدائے دو جہاں نذر غریبوں کی قبول
خون ناحق سے جو بھیگی ہے یہ ریتی مولا
ہو قبول آل محمدؐ کی یہ کھیتی مولا

تو نے توقیر غریبوں کی بڑھائی مولا
ہوا سر تاج شہیداں مرا بھائی مولا
ہم نے جو دولت اولاد گنوائی مولا
وہ بھی تھی تیری ہی درگاہ سے پائی مولا

ناز بے جا جو کریں کام ہے نادانی کا
حوصلہ کس نے دیا تھا ہمیں قربانی کا

یہ محمدؑ ہیں یہ اکبر ہیں یہ عون ذی جاہ
سب مری گود کے پالے ہوئے لٹا للہ
خاک اور خون میں غلطاں ہیں مگر تو ہے گواہ
میری آنکھوں میں نہ آنسو ہے نہ ہونٹوں پہ ہے آہ
ہمہ تن شکر بہ مرضی مشیت ہوں میں
روؤں کیونکر ترے محبوب کی عزت ہوں میں

مسدس کا آخری بند یہ ہے:

وہ خلش دے کہ جو پھر زیست کا ساماں بن جائے
زندگی درد بنے' درد سے درماں بن جائے
پھر یہ آتشکدۂ دہر گلستان بن جائے
خونِ عشاق بہارِ رخ جاناں بن جائے
موسم شوق گلستاں بہ کنار آجائے
یعنی اس گلشن ہستی میں بہار آجائے

کلیات بدر میں چند نظمیں بھی موجود ہیں۔دو تین نعتیں ہیں۔چند نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں! ساقی سے فریاد' نئی مشیت تہذیب کا تیور وغیرہ۔غزلوں کی تعداد لگ بھگ دو ڈھائی سو ہوگی۔

ان کے کل سرمایہ شاعری میں مرثیے اور غزلیں بطور خاص متوجہ کرتی ہیں۔ نشست الفاظ بندی اور لفظیات میں اقبال کا آہنگ صاف سنائی دیتا ہے لیکن داغ کے انداز بیان یعنی الفاظ کے برتاؤ کا عمل در آیا ہے۔ یہ مقلد نہیں نقال بھی نہیں انہوں نے اپنا رنگ سخن اور کلام جس خمیر میں تیار کیا' وہ انہیں دوسروں سے ممیز کرتا ہے ان کی غزلیں غزلیہ روایت سے رشتہ انسلاک قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ یہاں ان کی

کل شاعری پر تبصرہ مقصود نہیں صرف چند اشارے ہیں۔ کلیات بدر کی اشاعت کے بعد ان کی شاعری کی تعین ممکن ہو سکے گی۔ غزلوں کے چند منتخب اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:

یوں نہ الجھاؤ خدا کے لئے گیسو اپنا
اب تو شانہ بھی چرانے لگا پہلو اپنا
ہم نہ کہتے تھے کہ گستاخ ہے صحرا کا مزاج
ہم نہ کہتے تھے کہ دامن نہ جھکا تو اپنا
ایک دنیا ہے کہ کروٹ لئے جاتی ہے بدر
ایک ہم ہیں کہ بدلتے نہیں، پہلو اپنا
(۱) تم تو آزاد ہو تم کیوں نہ بڑھو چند قدم
ہم تو ہر حال میں پابند سلاسل ٹھہرے
(۲) موسم گل بھی ٹھہر جائے چمن میں اے بدر
شرط یہ ہے کہ ذرا قلب عنادل ٹھہرے
یہی منزل کی فضا ہے ' یہی منزل کا مزاج
کارواں بھول گیا اپنے حدی خوانوں کو
اس چمن میں ترا ہر خواب نہ کیونکر ٹوٹے
جست پہلی تھی کہ بلبل ترے شہ پر ٹوٹے
ایک بار اور جنوں عقل سے ٹکرلے گا
اس میں در آپ کا ٹوٹے کہ مرا سر ٹوٹے
معرکہ عشق میں اور عقل میں ہوتا ہی رہا
یعنی معنی پہ نہیں لفظ پہ جھگڑا ہی رہا
میری نظریں نہ پریشاں ہوئیں جلوے سے تری
مری نظروں سے پریشاں ترا جلوا بھی رہا

تمہاری کم نگاہی اب تمہیں پہ طنز کرتی ہے
تمہارا امتحاں ہے یہ ' ہمارا امتحاں کیوں ہو

اٹھ رہا ہے دل ہر ذرہ سے طوفان جہات
خاک تعمیر اڑی جاتی ہے ویرانی سے

ہم آشیاں سے جو نکلے تو آشیاں کی یاد
پکارتی رہی دیوار گلستاں سے ہمیں

سانس کیا رک گئی زنجیر وفا ٹوٹ گئی
لیجئے ختم ہوئی سلسلہ جنبانی بھی

تم اپنے گیسوئے پیچاں کے خم بڑھاتے جاؤ
گزر رہی ہے جو شانے پہ تم کو کیا معلوم

ہم اپنا چاک گریباں بھی سی سکے نہ تھے بدر
کہ دفعتاً یہ مچا غل اٹھو ! بہار آئی

حریم ناز میں کس نے زباں نہیں کھولی
مگر سکوت کا تیرے جواب ہو نہ سکا

کسی نے یوں رگ گل سے لہو نچوڑ لیا
کہ ایک بوند بھی رخسار گلستاں میں نہیں

حقیقت بھی کہانی بھی' کے مصنف' کلیات بدر کے شاعر سید بدرالدین بدر' بدر عظیم آبادی نے ۱۱ اگست ۱۹۸۳' بروز جمعرات بوقت ۵ بجے شام' اپنے آبائی مکان صدر گلی میں انتقال کیا ۱۲ اگست کو بعد نماز جمعہ خانقاہ عمادیہ پٹنہ سیٹی میں حضور سجادہ عالی جناب مولانا فرید الحق عمادی نے نماز جنازہ پڑھائی نانیہالی قبرستان واقع بہ محلہ کٹرا پٹنہ سیٹی میں اپنے والد سید ضمیر الدین احمد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر شکیب ایاز
پروفیسر کالونی، نواب بہادر روڈ، پٹنہ۔۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

"مامقیمان کوئے دلداریم"

اس کتاب میں اُس زمانے کے کچھ واقعات اور تذکرے ہیں جس وقت ہندوستان میں قومی اتحاد عروج پر تھا۔ اگرچہ یہ سیاسی انحطاط کا زمانہ تھا۔ آزادی کی ناکام کوشش اور اس کے ردعمل نے دلوں میں مایوسی اور قوائے عمل میں اضمحلال پیدا کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غم غلط کرنے کے لئے اور ناکامی کے المناک اثرات کو دور کرنے کی غرض سے عیش کوشی اور آرام پسندی میں پناہ ڈھونڈھی جانے لگی تھی پھر بھی اس حال میں شرافت نفسی، رواداری اور انسانی ہمدردی کا معیار یہاں کے بسنے والوں کے سامنے رہتا تھا۔ اگر بادی النظر میں ان لہو لعب کے مشاغل میں زندگی کے لمحے رائیگاں جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے تو غور سے دیکھنے پر ان کے اندر بھی خلوص و محبت، حق شناسی، غربا پروری اور علم دوستی کے بہت سے رموز اور داستانیں پوشیدہ ملتی تھیں۔ اس زمانہ کا سماج جو ہندو اور مسلمان کے صدیوں کے میل جول سے قائم ہوا تھا وہ ملک میں قومی اتحاد کی سب سے بڑی یادگار تھا۔ اس سماج کی بہاروں میں ہندو اور مسلمان عیش و سکون کے دن گذارتے تھے اور اس کی جاں پرور فضاؤں میں اطمینان و مسرت کی راتیں بسر کرتے تھے۔ اسی ماحول میں رفتہ رفتہ ملک کی فلاح و بہبود کی تحریکیں بھی شروع ہوئیں اور آزادی کا فطری جذبہ بھی دلوں میں پرورش پانے لگا اگر انصاف سے دیکھئے تو زیادہ تر وہی افراد اور ان کے ورثا جو ۱۸۵۷ء کی سیاسی جنگ ہار کر

عیش کوش بن گئے تھے، وہی آئندہ سیاسی جنگ کی ضرورت کو پورا کرنے کے ذمہ دار بنے۔ ظاہری و باطنی طور پر انہی کی امداد نے ملک میں سیاسی تحریک کو تقویت بخشی جب سیاسی انقلاب کا دور شروع ہوا تو ملک کی بد قسمتی سے آزادی کے خواہاں دو گروپ یعنی اکثریت اور اقلیت ایک دوسرے کے حریف نظر آنے لگے اور جب دوبارہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا تو یہ آزادی کے خواہاں دونوں گروپ کے لئے آزادی کے پیام کے ساتھ خونی طوفان بھی اپنے دامن میں سمیٹتا لایا اسی ماحول میں دونوں حریفوں کی خواہش کے مطابق ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ پھر یہ بھی نظر آیا کہ ان دو نئے ملکوں کی سرحدوں کے آرپار بہت دنوں تک تہی دامن اور اجڑے ہوئے مہاجرین کے سینکڑوں قافلے دو مخالف سمتوں میں آتے جاتے دکھائی دئے۔ اس طوفان نے قومی اتحاد کے اجزا کو بری طرح منتشر کیا اور اس سے پیدا شدہ نئے جذبات کے بہاؤ نے سماج کے مختلف مرکزوں کی جڑیں کھوکھلی کردیں۔

آج قومی اتحاد یا قومی ایکتا پر ہندوستان میں پھر کافی زور دیا جارہا ہے، اس کے حصول کے لئے پروگرام اور اسکیمیں بن رہی ہیں مگر ان سب سے زیادہ کارآمد چیز جو ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگلے دور کے واقعات اور تذکرے، جن کا تصور بھی اب مٹتا جارہا ہے، ان کو اجاگر کر کے لوگوں کے سامنے پیش کئے جائیں اور اُس وقت کے سماج کا ایک خاکہ بھی نظروں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہندوستان میں بسنے والے اس نتیجے پر خود ہی پہنچ جائیں گے کہ قومی ایکتا کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہ تو وہی ترکہ ہے جس کو ہمارے آباواجداد ہمارے لئے مشترکہ وراثت کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اسی غرض سے اس کتاب میں اگلے دور کے کچھ تذکرے اور اس وقت کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ منتشر اجزائے قومی کو پھر سے سمیٹنے میں ان سے مدد مل سکے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے سامنے ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد جو لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے وہ اپنی خاندانی روائتیں بھی یہیں

اپنے پیچھے چھوڑ گئے اور اب ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد وہ اپنی خاندانی روائتوں اور اپنے بزرگوں کے کارناموں سے بھی ناآشنا ہو جائیں گے۔ اگر یہ ہوا تو پھر ان کی آنے والی نسلوں کو بتانے والا کوئی نہ ہوگا کہ وادی گنگ دہن میں ان کے اسلاف نے کون کون سی انجمنیں بسائی تھیں، کیسے کیسے چمن لگائے تھے اور مذہب کے اختلاف کے باوجود اتحاد و خلوص اور رواداری کے زور پر متحدہ ہندوستان میں کس طرح ایک عظیم الشان گنگا جمنی سماج کی عمارت کھڑی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ وقت آئے اور یہاں سے جانے والے خود بھی یہ سب بھول جائیں میری خواہش ہے کہ اگلے دور کے یہی واقعات اور تذکرے اور اس دور کے سماج کا یہی خاکہ ان کے سامنے بھی رکھ دیا جائے تاکہ وہ اپنے بزرگوں کے خدو خال کو اپنے حافظے میں محفوظ کرلیں اور ان کے کارناموں کی برکتوں سے بھی آشنا رہیں۔ جس طرح پردہ سمیں پر واقعات کی تصویریں دکھلا کر لوگوں کو حقیقت حال کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اسی طرح اگلے دور کے واقعات اور تذکرے ہندوستان اور پاکستان کے عام لوگوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان جو مغائرت کے پردے ہیں، وہ بھی اٹھ جائیں گے۔

اگرچہ اس کتاب میں کچھ مطلب سے زیادہ میں لکھ گیا ہوں پھر بھی بہت سی کام کی باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ بہت سی انجمنوں کا تذکرہ چھوٹا ہوا معلوم ہوگا۔ بہت سے مشاہیر کا ذکر بھی اس میں شامل نظر نہ آئیگا، اس لئے ایک مکمل کتاب پیش کرنے کا میں دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ اس کتاب میں بہت سے تذکروں کی کمی کا باعث میری تنگ دامانی بھی ہے اور ان لوگوں کی بے اعتنائی بھی جن سے میں نے ان کے بزرگوں کے تذکرے اور احوال درج کرنے کے لئے بار بار مواد مانگے اور وہ وعدہ کر کے ٹالتے رہے پھر مجھے طوالت کا خوف بھی ہوا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو بہت سے معزز حضرات کے تذکرے اور اہم واقعات دوسری جلد میں پیش کروں گا۔

آخر میں عرض کرنا ہے کہ میں نے یہاں صرف پٹنہ ہی کے واقعات اور تذکروں کو یکجا کر کے سمیٹا ہے۔ صوبہ بہار میں اور بھی اہم واقعات ہیں جہاں کے اور تذکرے، کارآمد ہو سکتے ہیں مگر پٹنہ کے انتخاب میں مجھے اس کی مرکزیت کے علاوہ اپنے لئے سہولت بھی نظر کے سامنے رہی ہے۔ جس دور کے واقعات اور تذکرے اس کتاب میں قلمبند ہیں وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ آزادی کی ناکام جدوجہد اور انگریزوں کے خونی انتقام اور غارتگری کے بعد سے ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کی ابتدا بھی اسی دور سے ہوتی ہے، جس کی لہر ملک کے ہر حصہ میں دوڑ گئی تھی۔ میں نے سیاسی تذکروں کو قصداً چھوڑ دیا ہے۔ میرے خیال میں مورخ کا قلم ہی ان کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اس نمایاں کمی کے سوا میں نے ہر طرح کے تذکرے اس کتاب میں جمع کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی ان تذکروں کو محققانہ نظر سے دیکھے اور ہر واقعہ کی صداقت کا ثبوت مانگے تو یہ ایک طرح کا مجھ پر ظلم ہو گا۔ ان تذکروں میں کچھ تو سنی سنائی باتیں ہیں، کچھ آنکھوں دیکھے واقعات ہیں اور کچھ تاریخی تذکرے جو کتابوں اور رسالوں سے ماخوذ ہیں اور بس اس کے سوا کچھ نہیں۔ سنی سنائی باتیں میں نے اپنے جانے پہچانے معتبر بزرگوں کی زبانی سنیں اور اسلئے ان پر اعتبار کرلیا۔ آنکھوں دیکھے واقعات کے لئے مجھے اپنے حواسِ خمسہ پر بھروسہ کرنا پڑا۔ تاریخی تذکرے کے ماخذ چند رسالے اور کتابیں ہیں جن پر بھروسہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ خود کتاب کا نام ''**حقیقت بھی کہانی بھی**'' بہت کچھ میرے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔

فقط

سید بدرالدین احمد

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

عظیم آباد کی تہذیبی داستان

۱۸۵۷ء کے بعد کا پٹنہ

اتفاق و یکجہتی

اگرچہ پہلی بساط الٹ چکی تھی ۔ آزادی کی ناکام جنگ کے خون خرابہ کا دور گزر چکا تھا، پورے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے انگریزوں نے لوگوں میں تفریق پیدا کرو اور حکومت چلاؤ کی پالیسی شروع کردی تھی ۔ پھر بھی سینکڑوں برس کے آپس میں سمبندھ کی گرہیں ابھی ڈھیلی نہیں ہوئی تھیں ۔ ابھی تک ہندوستانیوں کے دل کی دھڑکنیں یکساں ہوتی تھیں ، کان صرف محبت ہی کے نغمے سنتے تھے ، آنکھیں خلوص ہی کے نظارے دیکھتی تھیں ، دشمنی میں بھی ابھی تک الفت کے پہلو نکالے جاتے تھے اور کانٹوں کو بھی رفیق گل سمجھ کر ان سے انس برتا جاتا تھا۔ عیش و عشرت کی محفلوں میں ، روزانہ آپس کی صحبتوں اور کاروباری زندگی میں بھی شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا جس کی مثالیں امرا سے لیکر ادنیٰ مزدور کے طبقوں میں حتیٰ کہ طوائفوں کی مطعون جماعت میں بھی ملتی تھیں ۔ قول و فعل میں توازن رہتا تھا ادر برائیاں بھی مخصوص دائرے کے اندر محدود رکھی جاتی تھیں ۔ فرقہ وارانہ اتحاد کی عمارت جو ٹھوس بنیادوں پر کھڑی کی گئی تھی ، اس میں ابھی تک تعصّبات کے جھٹکے نہیں لگے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور ایک دوسرے کے جذبات کے احترام ملحوظ خاطر رکھتے تھے ۔ اس وقت کا قومی اتحاد کوئی سیاسی اتحاد نہ تھا کہ وقتی مصلحت کی بنا پر قائم ہوا پھر ٹوٹ گیا۔

اس کی بنیاد انسانیت ، خلوص اور رواداری کے اصولوں پر تھی ۔ آپس کے رجحانات اور جذبات چونکہ ایک تھے اس لئے سبھوں کی زبان بھی ایک ، کردار بھی ایک اور آواز بھی ایک تھی ۔ اس وقت کے سماج کی برکتیں ایسی تھیں کہ اتحاد کا شیرازہ منتشر نہیں ہونے پاتا تھا ۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ مسلمان اپنی جگہ پر پکا مسلمان اور ہندو اپنی جگہ پر سچا ہندو تھا مگر مذہب کی سچی پیروی دونوں کے درمیان اخوت کے رشتے کو اور بھی مضبوط کرتی تھی ۔ چھوت چھات میں وہ رواداری تھی جس پر آج کل کی آزاد خیالی سو دفعہ قربان ہو ۔ غرض اس وقت کے قومی اتحاد نے سب طرح کی برکتیں یہاں کے لوگوں کو دے رکھی تھیں ۔ سڑکوں پر ، میلوں میں ، تفریح گاہوں میں ، ہر طرح کی تقریبات اور شادی و غم کے موقعوں پر سب اس طرح شیر و شکر ہوکر ملتے اور ساتھ رہتے کہ پہچاننا مشکل تھا کہ کون مسلمان ہے اور کون ہندو ہے ۔ تکلیف و مصیبت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ، ڈھارس بندھاتے اور شادی و خوشی میں ساتھ مل کر خوشیاں مناتے ۔ قند پارسی میں ہندی کھانڈ کا مزہ ملتا ۔ عربی کی حلاوت میں سنسکرت کی مٹھاس ملتی اور تصوف کی روشنی میں دیداور دیدانت کے راستوں کا سراغ ڈھونڈھا جاتا ۔ اتحاد قومی کی بڑی مثال تو یہ ہے کہ اس قومی اتحاد کے دور میں جو مذہبی فرقے بھی موجود تھے وہ بھی یکساں طور پر اسلام اور ہندومت سے متاثر تھے ۔ گرونانک جی کی تعلیم ہو یا بابا کبیر داس کی تبلیغ ، دونوں میں وحدانیت کی روح رواں دواں تھی اور عالمی برادری کا رنگا رنگی پرچار بھی تھا ۔ تصوف اور جوگ کے انداز فکر نے تعصب کی قائم کردہ حدیں توڑدی تھیں خدائے واحد کے جلوے سے مسجد و مندر یکساں طور پر آباد نظر آتے تھے ۔ راجہ بھرتھری کے افسانوں کے رومان پرور گیت مسلمانوں کو موہ لیتے تھے اور مثنوی مولانا روم کا نغمہ ہندوؤں کو وجد میں لاتا تھا ۔ یہی

نہیں بلکہ بدلتے ہوئے موسم کے اثرات سے بھی سب کے جذبات یکساں طرح پر چھلک پڑتے تھے ۔ رکن آباد کی سیر اور گلگشت مصلی کا سمان چیت کی بہار اور ساون کی ملہار میں ابھرتا نظر آتا تھا ۔ مسلمانوں کے تہواروں میں ہندو شریک ہوکر ان کی عظمت بڑھاتے اور ہندوؤں کے مذہبی اجتماعات میں مسلمان شامل ہوکر اس کو پر بہار اور رنگین بناتے تھے یہاں کا محرم اور یہاں کی ہولی بھی تمام ہندوستان میں مشہور تھی ۔ یہاں کے تہواروں میں جو یکجہتی اور اخوت کا منظر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نظر آتا تھا ان کو پھر دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں انہی تہواروں پر کیا منحصر تھا ۔ عید ہو یا دسہرا ، شب برات ہو یا دیوالی ، دونوں فرقے ان موقعوں پر مل جل کر بڑا ہی دل نواز نظارہ پیش کرتے تھے ۔ سچ پوچھئے تو تمام تہواروں اور تقریبات کی رونق یہاں آپس کے اتفاق و اتحاد ہی سے باقی بھی تھی ۔

تعمیری کاموں میں اشتراک عمل

عیش و عشرت اور تن آسانی کی زندگی گزارنے کا الزام اس دور کے بزرگوں پر لگانے والے اور ان پر تنقید اور ان کی تنقیص کرنے والے اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ اجتماعی طور پر قوم کی تعمیر کا کام بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ ملک میں جو تحریک اٹھتی اس کی لہر پٹنہ میں بھی پہونچتی اور یہاں کے لوگ بھی یکساں طور پر اس سے متاثر ہوتے ۔ اس سلسلے میں اس دور کے بزرگوں کے مشاغل مختلف حلقوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ایک تو ادبی حلقہ تھا جس میں مشاعرے ہوتے ، اخبار و رسائل نکالے جاتے ، انگریزی اور دوسری اہم زبانوں کے ترجمے شائع کئے جاتے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اور

اس سے متعلق تالیف و تصنیف کو فروغ دیا جاتا ۔ تعلیمی حلقے میں مغربی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا جاتا ، اسکولوں اور کالجوں کی بنیادیں رکھی جاتیں ، نوجوانوں کو انگلستان اور یورپ جاکر تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی اور غریب مگر صاحب صلاحیت طالب العلموں کی تعلیم کے لئے فنڈ اکٹھا کئے جاتے ۔ اس طرح پٹنہ فریزر میموریل فنڈ کا قیام مستقل طور پر پٹنہ میں ہوا جس سے بلا امتیاز دین و مذہب غریب اور باصلاحیت ہندو اور مسلمان لڑکوں کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفے ملتے ۔ سماجی حلقہ وہ تھا جہاں احساس مدنیت پیدا کرنے کی تبلیغ کی جاتی سماج کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوششیں کی جاتیں اور بدلتے ہوئے زمانے کے مطابق ذہنوں کی تربیت کے لئے تحریکیں اٹھائی جاتیں ۔ سیاسی حلقہ اگرچہ قید و بند کے اندر محدود تھا پھر بھی ہمت والے سیاسی کارکنوں کے ساتھ ہمدردی برتی جاتی اور سیاسی تنظیم کو آگے بڑھانے کی راہیں نکالی جاتیں ۔ کچھ لوگ ایک ہی حلقہ سے تعلق رکھتے تھے ، کچھ ایسے تھے جو ایک سے زیادہ حلقوں میں سرگرم کار نظر آتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جن کی اہم شخصیت کی مانگ ہر حلقے میں تھی ان میں ہندو اور مسلمان رؤسائے شہر ، تجار ، علماء مشائخ ، مہنت ، پنڈت ، پروفیسر ، حکماء ، ڈاکٹر ، وکیل اور بیرسٹر سب ہی تھے ۔ ان حضرات کے رفاہ عام کی وطن دوستی اور علوم و فنون کی سرپرستی کی یادگاریں آج بھی زندگی کے ہر موڑ پر ملتی ہیں اور ان کے فیض و الوالعزمی کے باعث بہت سے ادارے آج بھی روشن ہیں ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں ملک کے دوسرے اہم مرکزوں کے دوش بدوش پٹنہ کی سرزمین بھی اپنی آغوش میں ایسے نونہالوں کی پرورش کر رہی تھی جو بڑھ کر ہر شعبہ زندگی میں راہبر ثابت ہوئے ۔ انہوں نے ہندوستان کے وقار کو بھی بڑھایا اور خود بھی ملک کے لئے قابل افتخار کہلائے ۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کا تہوار

محرّم

عشرۂ محرم کے دس دن پٹنہ والوں کے لئے ایسی مصروفیت کے دن ہوتے تھے کہ زندگی کے دیگر کاروبار ترک اور دوسری مشغولیتیں بند ہوجاتی تھیں ۔ اپنے اپنے حوصلے اور توفیق کے مطابق ہندو اور مسلمان ، دونوں عزاداری کے اہتمام میں لگ جاتے ، ذی الحجہ (بقرعید) کی آخری تاریخیں آئیں اور محرم کے جلوس اور مجلسوں کی تیاریاں مکمل ہونے لگیں ۔ انتیس ہوئی تو لوگ کوٹھوں اور مسجد کے میناروں پر چڑھ کر محرم کا چاند ڈھونڈھنے لگے ۔ ادھر چاند نظر آیا ادھر نوبت خانوں اور اکھاڑوں میں محرم کے ڈنکے بجنے لگے۔ اعلان ہوگیا کہ کل محرم کی پہلی ہے ۔ اگر انتیس کو چاند نہ دکھائی دیا تو مایوسی کا عالم نہ پوچھئے ۔ لوگوں کے لئے ایک دن کا انتظار بھی ناقابل برداشت تھا ۔ چمروڈنڈیا کا اکھاڑہ مٹی لانے کے لئے پہلی تاریخ میں بڑے تزک اور احتشام سے نکلتا ۔ میل ڈیڑھ میل کے جلوس میں ہاتھیوں کی لانبی قطار، پیٹھ پر زرنگار جھولین پڑی ہوئیں ان پر ہودے اور عماریاں کسی ہوئیں ، کوئی چاندی کی تو کوئی گنگا جمنی ۔ ہاتھیوں کے مستک پر گینڈے کی بڑی سی ڈھال جس میں چاندی کے پھول لگے ہوئے ۔ لانبے لانبے دانتوں میں سبز اور سرخ ریشمی پھر ہرے بندھے ہوئے ۔ کسی ہاتھی کے لانبے دانتوں پر چاندی کی قندیلیں بھی نصب کردیتے ۔ گلے میں نقرئی ہیکل اور دموں میں نقرئی دمچیاں ہوتیں ۔ سونے چاندی کے چھوٹے چھوٹے علم ، سدے ھلالی نشان ، چھوٹے چھوٹے بانسوں کے سرے پر جڑے ہوئے ۔ ان بانسوں میں ریشم ، کمخواب اور جامہ دار کے دیدہ زیب پھر ہرے

لگے ہوئے جن پر خوشخط طغرے کڑھے ہوئے ان کو لوگ ہاتھوں سے تھامے ، ہاتھیوں پر بیٹھے ہوتے ۔ جن ہاتھیوں پر صرف زرنگار جھولیں ہوتیں ان پر لوگ بڑے بڑے سیاہ علموں اور نشان کے بانسوں کو مضبوط ڈوریوں کے سہارے تھامے ہوتے ۔ چاندی اور سونے کے علم ، نشان اور سدے روشنی میں جگ مگ کرتے رہتے ، اونٹوں کی قطاریں ہوتیں جس میں آگے آگے ایک سجی سجائی سانڈنی پر نقیب وردی پہنے قدم قدم پر حضرت امام حسینؓ کی سواری کا اعلان کرتا جاتا ۔ جب اس کی آواز فضا میں بلند ہوتی تو جلوس کی سطوت اور بڑھ جاتی ۔ اس کی کڑکتی تان نقارے کے چوب پر ٹوٹتی ، جلوس میں سب سے آگے ایک نشان کا ہاتھی ہوتا پھر پچاسوں گھوڑے سوار ہوتے ، سب ایک طرح کے فوجی لباس پہنے ، ہاتھوں میں نیزے لئے جن سے سبز اور سرخ پھر ہرے بندھے ہوئے شہہ سواری کی شان دکھاتے جاتے ۔ اس کے بعد کوتل میں پچاسوں گھوڑے چاندی اور گنگا جمنی زیورات سے آراستہ ، پشت پر زریں چار جامے ان سب کی باگ ڈور سائیسوں کے ہاتھوں میں ، خوبصورت کلائیاں مارتے گزرتے رہتے ۔ ان کے پیچھے شتر سواروں کا پرا ہوتا اس کے بعد کوتل کے اونٹ ہوتے پھر ہاتھیوں کی قطار شروع ہوجاتی ۔ اس لانبے جلوس کے بیچ بیچ میں طرح طرح کے باجے بجانے والوں کے گروہ ہوتے جو واقعات کربلا کے متعلق جنگ کے گیت بجاتے جاتے ۔ آخر میں مٹی لانے کا سامان ہوتا ۔ ایک آدمی کے سر پر چاندی کا بڑا طشت پر خوان پوش سے ڈھکا ہوتا ۔ اس طشت میں کسی درگاہ یا کسی تکیئے کی مٹی ہوتی ۔ اس مٹی سے امام باڑے کی اس جگہ کو لیپ پوت کر صاف کرتے جہاں سپر اور تعزئے رکھتے ۔ اسی طرح کے کم و بیش بہت سے اکھاڑے مٹی لانے کے لئے ۶ تاریخ تک نکلتے رہتے ۔ ۷ویں محرم کو چمروڈنڈیا کا اکھاڑا دوبارہ پھر بڑے تزک و احتشام سے نکلتا اس کے بعد ہی تمام تعزئے اور

سپر تیار ہو کر محرم کی ۸ تاریخ سے بڑی دھوم دھام سے نکلتے تھے جن کی شان و شوکت بھی کم و بیش وہی رہتی جو چمروڈنڈیا کے اکھاڑے کی ہوتی ۔ اس طرح آٹھویں محرم سے نو محرم کی رات تک جلوس کے ساتھ اکھاڑوں کا نکلنا گشت کہلاتا تھا دسویں محرم کو تمام اکھاڑے بڑے اور چھوٹے جلوس کے ساتھ نکلتے ۔ رات کا وقت ہوتا تو پچاسوں بڑے بڑے جھاڑ جن میں رنگ برنگ کے شیشے کے خوبصورت کنول نصب ہوتے جن میں موم بتیاں جلتی ہوتیں ، مزدور ان کو پر تلوں پر اٹھائے جلوس کے ساتھ ساتھ چلتے ۔ ان کے علاوہ مزید روشنی کے لئے سینکڑوں مشعلیں اور لوکڑیاں بھی جلوس کے ہمراہ ہوتیں ۔ اکھاڑوں کی یہ دھوم دھام اور یہ ہنگامہ اور یہ اہتمام غرض کہ پہلی تاریخ سے شروع ہوتا تو اگیارہویں کی دوپہر کے بعد ختم ہوتا ۔ اکھاڑوں کے نکلنے کے اوقات کے لئے کوئی قانونی پابندی تو نہ تھی مگر یہ ضرور تھا کہ ہر اکھاڑہ اپنے روایتی معینہ وقت پر نکلتا ۔ اکثر اکھاڑہ والوں کے درمیان لڑائی بھی ہوجاتی ۔ بعض اکھاڑے والے کوشش کرتے کہ انکا اکھاڑہ دوسرے اکھاڑے کے جلوس کو چیر کر آگے بڑھ جائے یہی کوشش لڑائی کا باعث ہوتی جس میں لوگ زخمی بھی ہوتے اور بعد میں دونوں فریقوں کے درمیان مقدمات بھی چلتے ۔ سب تعزئے اور سب سپروں کے لوازمات چونکہ شاہ ارزاں کی کربلا میں دفن ہوتے تھے اس لئے دسویں محرم کے آتے ہی پتھر کی مسجد کے سامنے دکھن کی طرف شاہ ارزاں کی درگاہ کو جو سڑک جاتی ہے ، اس کے اغل بغل کی سینکڑوں دوکانیں اور کوٹھے اور ان کے آس پاس کی افتادہ زمینیں بھی ایک دن کے لئے اچھے کرایے پر اٹھ جاتیں ان دوکانوں میں اور کوٹھوں پر اکھاڑوں کا منظر دیکھنے والوں کا ہجوم نظر آتا اور افتادہ زمینوں میں نانبائیوں اور حلوائیوں کی دوکانیں ، چائے خانے ، بچوں کے لئے کھلونوں کی دوکانیں اور چرخ ہنڈولے سب ہوتے ۔ ایک میل کے

احاطے میں ایک نیا گنجان شہر بسا ہوا معلوم ہوتا ۔ حکومت کی طرف سے حفاظت اور نظم و ضبط کو قائم رکھنے کے لئے شاہ ارزاں کو جانے والی بڑی سڑک کے سرے پر ایک دن کے لئے ایک تھانہ بھی قائم کر دیا جاتا اور دوچار مجسٹریٹ کی ڈیوٹی بھی لگادی جاتی ۔ یوں تو تمام شہر کی دوکانیں محرم کی نو تاریخ تک بڑی رات گئے تک کھلی رہتیں مگر دسویں تاریخ کو شہر کی کل دکانیں دن رات میں کسی بھی وقت بند نہیں ہوتیں ۔ یہاں تماشائیوں کا ہجوم دسویں تاریخ کی صبح سے گیارہویں تاریخ کی صبح تک جما بیٹھا رہتا ۔ رات کی گشت ختم کرکے دسویں محرم کی صبح سے اکھاڑے پہلام کے لئے ایک ایک کرکے اس طرح نکلنا شروع ہوتے کہ ایک پر ایک لگا ہوا جس کا سلسلہ لامتناہی گیارہویں محرم کی دوپہر کو ختم ہوتا ۔ انہی اکھاڑوں میں منو بھٹیارہ کا اکھاڑہ ایک نئی امتیازی شان کے ساتھ نکلتا ۔ جلوس میں متعدد چھوٹے بڑے چاندی کے علم ، سدے ، پنجے اور نشان جن کے سیاہ پھر ہرے بیش قیمت کشمیری شال اور جامہ دار کے ہوتے ۔ خوبصورت کاڑھے ہوئے پھولوں کے عوض ان پر طغرے ، قرآنی آیتیں اور حدیثوں کی عبارتیں بڑی فنکاری کے ساتھ کاڑھی ہوئی ہوتیں۔ جلوس میں جو لوگ ساتھ ہوتے وہ سب سیاہ پوش ہوتے حتی کہ باجہ بجانے والے بھی ۔ ہاتھیوں کی جھولیں اور گھوڑوں کے چار جامے بھی سیاہ ہوتے ۔ تعزیہ کے اوپر بھی سیاہ نقاب پڑا ہوتا ۔ محلہ پیر دمڑیہ سے ہیجڑوں کا تعزیہ نکلتا جس کے جلوس میں ہیجڑے نوحہ خوانی اور سوزخوانی کرتے جاتے ۔ ان کی درد میں ڈوبی ہوئی نوحہ خوانی بڑی پر اثر ہوتی ۔ اس سے پہلے ایک دن ۹ ویں محرم کو ہیجڑے دل دل کے جلوس بھی نکالتے تھے ۔ اب ہیجڑوں کے ساتھ ان کا اکھاڑہ اور جلوس بھی ختم ہوگیا ۔ محرم میں علم کے جلوس آخری تاریخوں میں مختلف جگہوں سے نکلتے تھے جن میں ماتم کرنے والوں کی متعدد مقامی ٹولیاں

ہوتی تھیں ۔ انکے علاوہ لکھنو ، فیض آباد اور جون پور سے آئے ہوئے ماتم کرنے والوں کی متعدد ٹولیاں بھی الگ اپنا اپنا حلقہ بناکر جلوس میں شامل رہتی تھیں ۔ ہر ٹولی کے بیچ میں ایک آدمی نوحہ پڑھتا جاتا ۔ جب وہ آخری حصہ پر پہونچتا تو اس کے حلقے کے ماتم کرنے والے حضرت امام حسینؑ اور حضرت مولا مشکل کشاؑ کا نام لیکر اس زور سے اپنے سینے پیٹتے کہ اس کی دھمک دور دور تک پہونچتی ۔ ماتم کا جوش بڑھتا تو زنجیروں کے ساتھ ماتم کرنا شروع کردیتے ان زنجیروں میں چھوٹے چھوٹے چاقو کے تیز پھل لگے ہوتے زنجیروں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پشت اور سینے پر اس طرح مارتے کہ تمام پیٹھ اور سینے سے خون کے شرارے پھوٹ نکلتے مگر ماتم کرنے والوں کا عالم دارفتگی میں اس کی خبر بھی نہ ہوتی ، لوگ خالص عرق گلاب کے چھینٹے ماتم کرنے والوں کے بدن اور منھ پر دیتے جاتے یہ بڑا ہی پردرد ساتھ ہی بڑا جوش دلانے والا نظارہ ہوتا ۔ نوحہ خوانی تیز ہوتی تو سینہ کوبی بھی تیز ہوجاتی ۔ کچھ ماتم کرنے والے زخموں سے چور بیہوش بھی ہوجاتے جن کو ہاتھوں ہاتھ ان کے گھر پہنچا دیا جاتا جہاں ان کی مرہم پٹی ہوتی ۔

آٹھویں محرم کو علم کا سب سے بڑا جلوس صبح چمروڈنڈیا کے امام باڑہ سے نکلتا ۔ اس میں تمام شہر کے چھوٹے بڑے علم کے جلوس شامل ہوتے ۔ یہ ہزاروں آدمیوں کا جلوس ہوتا ۔ بہت سے عام مسلمان اور ہندو بھی احتراماً ساتھ ہوتے ۔ یہ ماتم تو نہ کرتے مگر دایاں ہاتھ تعظیماً اپنے سینوں پر رکھے ہوتے ۔ اس جلوس میں بھی چھوٹے بڑے سینکڑوں سیاہ علم ، سدے اور نشان ہوتے ۔ کسی علم کا سفید پھر ہرا ہوتا تو اس پر سرخ رنگ کی چھینٹے اس طرح دئے گئے ہوتے کہ صاف معلوم ہوتا کہ خون کے چھینٹوں سے پھر ہرا گلنار ہوگیا ہے۔ علم کے سرے پر مشکیزہ ہوتا جو متعدد تیروں سے چھدا ہوتا یہ حضرت عباسؑ علمبردار کا علم

کہلاتا۔ آٹھویں محرم کا یہ علم کا شاندار جلوس حضرت عباسؑ کی سقائی، بہادری اور جانثاری کی یادگار میں نکالا جاتا۔ ماتم اور نوحہ خوانی کے سبب یہ جلوس بہت آہستہ آہستہ چلتا اور جہاں جہاں علم نکالنے والوں کے مکان آتے جاتے وہاں سے یہ لوگ کٹ کر اور اپنے علم کو لیکر اپنے مکان کی طرف روانہ ہو جاتے مگر اس جلوس کا اختتام گذری کے محلے میں ہوتا۔ قابل دید بات یہ ہوتی کہ ہر فرقے کے مسلمان اور ہندو بھی بڑی تعداد میں جلوس کے ساتھ ہوتے جس کے سبب سے یہ جلوس بڑا عظیم الشان معلوم ہوتا۔ اگرچہ یہ لوگ ماتم اور نوحہ خوانی میں شامل نہ ہوتے مگر احتراماً ننگے سر ہوتے، سڑک کے دونوں طرف بھی آدمیوں کا ہجوم ہوتا، دوکانیں اور کوٹھے بھی علم کا جلوس دیکھنے والوں سے بھرے ہوتے۔ جلوس جب گذرنے لگتا تو یہ لوگ بھی سروں سے ٹوپیاں احتراماً اتار لیتے۔ علم کے آخر میں متعدد بیل گاڑیوں پر بڑے بڑے برتنوں میں طرح طرح کے شربت ہوتے جو پیاسوں کو پلائے جاتے۔

ذُلدُل کے جلوس نویں محرم کی رات میں نکلتے ان میں ویسا ہی ماتم کا جوش اور ویسا ہی ماتم کرنے والوں کا مجمع ہوتا۔ یہاں کے جلوس کے آخر میں کہیں ایک کہیں دو عربی نسل کے گھوڑے ہوتے جن پر سامان جنگ سجے ہوتے۔ کارچوبی کے چار جامے سے تلوار لٹکی ہوتی، دوسری طرف ترکش ہوتا۔ جس میں تیر بھرے ہوتے، گھوڑے کے پشت پر ”خود“ ہوتا جس میں سہرا لٹکا ہوتا۔ پکھال پر سرخ رنگ کی چھینٹیں خون کے دھبوں کا یقین دلاتیں۔ یہ گھوڑے زر نگار شامیانوں کے سائے میں جن کے گنگا جمنی پائے لوگ ہاتھوں میں تھامے ہوئے بڑی متانت سے آہستہ آہستہ چلتے، انکی باگ ڈوریں ان کے مالکوں کے ہاتھ میں ہوتیں۔ سال بھر ان گھوڑوں کی بڑی دیکھ بھال ہوتی تھی۔ دوسرے گھوڑوں سے الگ ان کا خاص اصطبل بھی بنایا جاتا تھا۔ متعدد تابوت کے جلوس بھی علم، سدے، پنجے اور نشان ہوتے۔ سب پھر ہرے کہیں ریشمی کہیں کمخواب کہیں قیمتی شال اور جامہ دار کے ہوتے جن پر طغرے، آیات قرانی اور حدیثیں

کاڑھی ہوتیں۔ آج بھی نواب زادہ سید محمد مہدی صاحب مرحوم (گندری) کے یہاں سے جو تابوت نکلتا ہے وہ سارا کا سارا غلاف کعبہ سے ڈھکا ہوتا ہے۔

دس دنوں تک امام باڑے سجے رہتے، وہ بھی جہاں سپر اور تعزئے رکھے جاتے، وہ بھی جہاں صرف عزا کی مجلسیں ہوتیں۔ بعض ایسے بھی امام باڑے ہوتے جہاں سپر اور تعزئے بھی رکھے جاتے۔ اور مجلسیں بھی ہوتیں ان امام باڑوں میں رنگ برنگ کے قیمتی جھاڑ، شیشے کی طرح طرح کی قندیلیں، کونڈیاں، قمقے، اعلیٰ درجے کے کنول کی دیوار گیریں چھتوں اور دیواروں سے آویزاں کی جاتیں جن کی روشنی میں رات پر دن کا دھوکہ ہوتا۔ موقع موقع سے مقامات مقدسہ کے نقشے، تصویریں اور طرح طرح کے طغرے خوبصورت چوکھٹوں میں جڑے دیواروں کو زینت بخشتے۔ چاندی سونے کے علم سدے پنجے اور نشان جابجار رکھے ہوتے۔ لوگ امام باڑوں میں آتے، حضرت امام حسین اور شہیدان دشت کربلا کے نام کی نیاز دلواتے اور فاتحہ کی مٹھائیاں تبرکاً گھر لے جاتے ان میں ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے۔ ایسی جگہوں سے دونوں کو عقیدت تھی۔ اولاد کے لئے بھی ہندو اور مسلمان امام باڑوں میں جاکر امام حسینؑ سے مرادیں مانگتے۔ مراد پوری ہونے کے لئے طرح طرح کی منتیں مانتے اور جس طرح منت اتارنے کا عہد کرتے، اسی طرح اس کو پورا بھی کرتے۔ کوئی اپنے بچوں کو امام کا پیک بناتا، کوئی سقا بنا کر اس سے پیاسوں کی سقائی کراتا، کوئی امام کا بھکاری بنا کر امام کے نام پر اپنے عزیزوں کے پاس اس سے بھیک منگواتا اور کوئی حضرت عابد بیمار کی طرح زندانی بنا کر اور تعزیہ میں اس کا ہاتھ بندھوا کر سر کوچہ و بازار تعزیہ کے ساتھ اس سے گشت لگواتا۔ تھوڑے فاصلہ پر ٹھنڈے پانی کی سبیلیں بھی ہوتیں۔ کہیں کہیں ان سبیلوں میں دودھ کے شربت یا صرف شکر کے ٹھنڈے شربت بھی تقسیم ہوتے۔ راہ چلتوں کو آواز دیتے "پیاسو! پیو سبیل ہے نذر حسینؑ کی" کہیں سے آواز آتی "سبیل ساقی کوثر شاد جاری ہے"۔ اس طرح کی سبیلیں ہندو اور مسلمان دونوں مہیا کرتے۔ کچھ دن

پہلے کی بات ہے کہ پٹنہ میں میر حقّہ زندہ تھے، وہ محلّہ بلور گنج اپنے مکان کے برآمدہ میں جو لب سڑک تھا، جھاڑ فانوس اور قندیلوں سے سج کر ایسے خلوص نیت اور فراخ دلی سے سبیل لگاتے کہ دولتمند حضرات بھی میر حقّہ کی عقیدت سے مرعوب ہو جاتے۔ میر حقّہ کی گذر بسر صرف روساء اور شرفاء کے یہاں کی تقریبات میں حقوں کے اہتمام کی اجرت پر تھی۔

رنگریزوں کی دوکانوں پر سبز رنگے ہوئے کپڑوں کی بہار نظر آتی، سبز کپڑوں پر سنہری اور رد پہلی چھاپ، کوئی آڑی کوئی ترچھی اور کسی پر طرح طرح کے پھول اور پھول کی چھڑیاں۔ ساڑیاں، دوپٹے، کرتے، انگرکھے اور ساتھ ساتھ سبز اور سفید دھاری کے رنگے ہوئے صافے دوکانوں میں چاروں طرف ٹنگے ہوتے۔ لوگ اپنے مطلب کے مطابق خریدتے، عورتیں سبز یا سیاہ کپڑے پہنتیں۔ بچے اور بچیاں سبز چھاپے کے کپڑوں میں نظر آتیں۔ عورتیں اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دیتیں آرائش و زیبائش بند رہتی۔ امامؑ کا سوگ منانے میں یہ باتیں ضروری تھیں چوڑیوں کی جگہ کچھ عورتیں کالا بتو کی عمدہ بٹی ہوئی ڈوریاں جن میں سنہرے روپہلے تار بھی ملے ہوتے، صرف کلائیوں میں باندھتیں جن میں کالا بتو کا پر زر پھدنا لٹکا ہوتا۔

ہر طرح کے پر زر بڑے چھوٹے بٹوے سینکڑوں کی تعداد میں بڑے قرینے سے سامنے سجے ہوئے قطار در قطار ڈوریوں میں بندھے، دوکانوں میں ہر جگہ دکھائی دیتے۔ ناریل کے ٹکڑوں کو باریک تراش کر ان میں چھوہارے، کشمش کے ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، چکنی ڈلیوں کے ساتھ الائچی کے دانے، ان سبھوں کو ملا کر پان کی جگہ کھانے کا مسالہ بناتے۔ لوگ پر زر بٹوے بھی خریدتے اور یہ بنے ہوئے مسالے بھی خریدتے۔ بچوں کی نظر ان بٹوؤں اور مسالے پر سب سے پہلے پڑتی۔ بٹوے میں مسالے بھر کر پھانکے لگاتے رہتے۔ جو حضرات پان اور تمباکو کے عادی ہوتے وہ گھر پر بھی ایسا مسالہ بناتے اور اس میں کتھ اور چونا ملا کر خشک کر لیتے اور تمباکو کے ساتھ

کھاتے۔ محرم میں احتراماً پان کھانا بند رکھتے تھے۔ اور پان کی کسر اس طرح کے مسالوں سے نکالتے۔

لوگ بڑی تعداد میں "پیک" بھی بنتے تھے اور یہ امامؑ کے پیک کہلاتے تھے۔ ان کو نسبت ان سے دی جاتی تھی جو میدان کربلا میں حضرت امام حسین کو ان کے دشمنوں کی طرف کی خبریں پہونچایا کرتے تھے۔ اگلے زمانہ میں یہ پیک کہلاتے تھے۔ پٹنہ میں جہاں محرم کے بہت سے رسومات ختم ہو گئے، یہ پیک بھی ختم ہو گئے۔ اب تو محرم میں ایسے ایک پیک پر بھی نظر نہیں پڑتی، ان کا لباس بھی انکے مفروضہ خدمات کے مطابق ہوتا۔ بدن پر سبز رنگا ہوا رو پہلی یا سنہری چھاپ کا کرتا یا انگرکھا اور پاؤں میں سفید چست پائجامہ ہوتا، سبز دھاریوں کے پانچ گز لانبے ململ کے کپڑے کو لانبا لپیٹ کر بیچ دیتے جس سے یہ موٹے ڈورے کی شکل کا ہوتا پھر اس کو پگڑی کی طرح سر پر یوں لپیٹتے کہ اوپر کلغی نکل آتی اسی طرح ململ کے لانبے سبز دھاری کے کپڑوں کا کمر بند بھی مڑور کر اور پیچ دیکر اس کو موٹے ڈورے کی شکل کا بنا کر کمر میں لپیٹتے۔ اس کمر بند میں چاندی کی متعدد گھنٹیاں ایک الگ ڈورے میں بندھی ہوئی، آویزاں ہوتیں اور حرکت کرنے اور چلنے مین خوب بجتیں۔ ہاتھوں میں مور کے پروں کا لانبا چاندی کا مور چھل ہوتا۔ ہر امام باڑے میں ان کی ٹولیاں سلام کرنے کو جاتیں۔ عموماً یہ پیک دس دس بیس کی ٹولیوں میں ساتھ چلتے، جب امام باڑے میں پہونچتے تو پرا باندھ کر بڑے قاعدے اور ضابطے کے ساتھ صف بند ہو کر چند قدم آگے اور پیچھے اس طرح تیزی کے ساتھ حرکت کرتے کہ معلوم ہوتا کہ ان کی صفیں ایک ساتھ کبھی آگے کی طرف ڈول رہی ہیں اور کبھی الٹے پاؤں پیچھے کی طرف۔ اس درمیان میں مور چھل والے ہاتھ کو اٹھاتے اور گراتے جاتے اور ساتھ ہی ساتھ حضرت امام حسینؑ کی شان میں مدحیہ اشعار پڑھتے جاتے۔ اس طرح حضرت امامؑ کے حضور میں ان کی سلامی ہوتی۔ شہر میں پیکوں کی سینکڑوں ٹولیاں، رات دن گشت کرتی رہتیں جن کی گھنٹیوں کی آواز

فضا میں گونجتی رہتی۔ شرفاء اور دولت مندوں کے بچے بھی "پیک" بنتے تھے، محلّہ کے امام باڑوں میں جاکر سلامی بھی دیتے تھے مگر ہر جگہ امام باڑوں میں جانا اور رات دن شہر کا چکر لگانا چونکہ ان کے لئے مشکل تھا اس لئے ان کی نیابت ان کے گھر کا کوئی خاص ملازم کرتا جس کے لئے بھی پیک کا لباس الگ سے بنایا جاتا۔ دیہاتوں میں لوگ کثرت سے پیک بنتے تھے۔ شہر میں آس پاس کے دیہاتوں سے بڑی تعداد میں یہ پیک دیہات سے آتے تھے جن کی آمد سے پیکوں کی رونق شہر میں اور بڑھ جاتی تھی۔ دیہات سے آنے والے پیکوں کی ٹولیاں شہر میں آتیں، یہاں کے امام باڑوں میں جاکر حضرت امامؑ کو سلامی دیتیں پھر دیہات واپس چلی جاتیں۔ ان کے آنے جانے کا سلسلہ نویں محرم تک شہر میں لگا رہتا۔ شہر والے جو پیک بنتے تھے وہ اپنی پوشاک اگیارہویں محرم کو اتارتے تھے۔

جو لوگ سقایا بہشتی بنتے تھے ان کا بھی لباس تقریباً وہی ہوتا تھا جو پیک کا ہوتا تھا۔ ذرا سا فرق یہ ہوتا تھا کہ کمر بند کے اوپر لال کھاروے کا کپڑا لپیٹ لیتے جو تہبند کا کام دیتا۔ کمر بند میں گھنٹیاں نہیں ہوتیں اور ہاتھ میں مور چھل بھی نہیں ہوتا جس کے بدلے ہاتھ میں ایک تین فٹ کے لانبے پتلے بانس کا جھنڈا ہوتا جس پر چاندی کا منقش خول چڑھا ہوتا اور جس کے سرے پر سبز ریشمی کپڑے کا پھریرا لگا ہوتا۔ کھاروے کے تہبند پر خوبصورت کہیں چھوٹا سا کہیں اوسط درجہ کا مشکیزہ اور اس پر جا بجا چاندی کے ابھرے ہوئے پھول لگے ہوئے۔ مشکیزہ میں شکر کا ذائقہ دار شربت۔ ایک ہاتھ سے چاندی یا گنگا جمنی کا کٹورہ انڈیل انڈیل کر شربت پلاتے پھرتے۔ غربا کے ساتھ یہ کمی رہتی کہ مشکیزہ صرف چمڑے کا ہوتا اور کٹورہ اگرچہ چاندی کا نہیں میسر ہوتا تو سلور کا ہوتا۔ شرفاء کے بچے بھی سقا بنتے وہ بھی اپنے گھروں میں اور عزیزوں کے یہاں جاکر شربت پلاتے اور انعام میں روپے پاتے۔

تعزیہ بنانے میں پٹنہ والے بھی دوسرے شہروں کے کاریگروں سے کم صناع

نہ تھے۔ یہاں بھی ہر طرح کے تعزیئے بنائے جاتے جو بڑے عمدہ، نفیس اور صنعت گری کا شاہکار ہوتے۔ کپڑے کے، رنگ برنگ کاغذوں کے، موم کے، سرسوں کے دانوں کے اور روئی کے بھی۔ بعض تعزیئے سراسر شیشے کے بھی ہوتے۔ ان تعزیوں میں کمال کی ندرت کے ساتھ طرح طرح کے مناظر کا نقشہ دکھاتے، جنگلوں کے، پہاڑوں کے، دریا کے، نہر فرات کے، کہیں میدان کربلا کا نقشہ ہوتا کہ سامنے چٹیل میدان ہے ایک طرف نہر فرات ہے اور بیچ میں لٹے ہوئے اور جلے ہوئے اہل بیت کے خیمے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ اور حضرت مولا علیؑ کے روضہ مقدسہ کا پورا ڈھانچہ بھی تعزیوں میں کھڑا کرتے۔ چھوٹے چھوٹے تعزیوں میں رف رف اور دل دل کا ڈھانچہ سجا کر پیش کرتے، کاغذ کے تعزیوں میں گل تراشی کے جوہر کھلتے۔ موم کے تعزیئے تکمیل میں کافی مدت لیتے۔ اکثر چھ مہینوں میں تیار ہوتے تھے اور ان پر لاگت بھی کافی اُٹھتی تھی۔

امام باڑوں میں تعزیوں کے ساتھ سپر بھی رکھنا صرف پٹنہ میں رائج ہے اور چونکہ یہ خاص پٹنہ کی چیز ہے اسلئے اس کی صناعی میں پٹنہ تمام ہندوستان میں مشہور ہی نہیں منفرد بھی ہے۔ تقریباً سات فٹ لانبے اور مضبوط بانس کا قطر قائم کر کے اس کے دونوں طرف بانس ہی کی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ چوڑی پٹریوں سے نیم دائرے کی شکل کی دو ٹھٹریاں بنا کر اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح باندھ کر بیچ کا بانس حد فاصل بنا ہوا دونوں ٹھٹریوں کے ساتھ پیوست رہے نیم دائرے کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادد تین ساڑھے تین فٹ لانبا اور اتنا ہی چوڑا ہوتا ہے۔ بانس کا اوپری حصہ ڈھانچے کے بیچوں بیچ ہوتا ہوا دائرے کی کمان میں پیوست ہو کر ختم ہو جاتا ہے اور اس کا دوسرا حصہ ڈھانچے کے نیچے تین فٹ باہر نکلا رہتا ہے۔ ڈھانچے کے سرے کے جو کمان کی شکل کا ہوتا ہے پہلے اسکو پیال سے اسکے بعد پرزر کپڑوں سے نہیں تو ساٹن یا ریشم کے کپڑوں سے جن پر رو پہلی یا سنہری چھاپ ہوتی ہے منڈھتے

ہیں اس پر چھوٹی چھوٹی لانبی تلواریں اور کٹار چار چار انچ کے فاصلے پر بڑی ترتیب کے ساتھ نصب کرتے ہیں۔ ان سب کی نوک پر چاندی یا سونے کے مصنوعی انار لگاتے ہیں اور کہیں اصلی انار لگاتے ہیں۔ ڈھانچے کو اس طرح سجتے ہیں کہ اس کے اگلے حصہ میں چھوٹے چھوٹے مجلّا آہنی آئینے متعدد تعداد میں باندھتے ہیں جس سے ٹھٹھری چھپ جاتی ہے۔ آئینوں کے اوپر اور کہیں گینڈے کی، کہیں پیتل کی، کہیں سلور کی اوسط قد کی ڈھالیں کم از کم سات نہیں تو نو قرینے سے اس طرح لگاتے ہیں کہ ان ڈھالوں کے ابھار کے ساتھ مجلّا آئینے بھی ساتھ جھلکتے نظر آئیں۔ پھر ان سب پر بڑا قیمتی زر نگار سہرا باندھتے ہیں جس کی پر زر لڑیاں سہروں کے ساتھ سامنے والے ڈھانچے کو چھپالیتی ہیں۔ سہرے کے اغل بغل سنہری یا رو پہلی بدھیاں اور زر دوزی کے بنے ہوئے چاند لٹکے ہوتے ہیں۔ ڈھانچے کے پچھلے حصے کو عمدہ کاشانی مخمل یا قیمتی بانات سے منڈھتے ہیں۔ جن پر کہیں تو زر دوزی کے بنے ہوئے محراب کے اندر پھول بوٹے یا مقامات مقدسہ کی تصویریں بنی ہوتی ہیں یا نب کاری کے۔ عام لوگ سپر کے پچھلے حصہ میں رو پہلے گوٹے سے محراب بناتے ہیں۔ یہ معمولی سپر نہیں ہوتی ہے جب سپر تیار ہو جاتی ہے تو روشنی میں ایسی دمکتی ہے کہ اس کے سامنے آئینے کی ضو بھی ماند پڑنے لگتے۔ جب دولت کی فراوانی تھی تو شوق و عقیدت کی بھی کمی نہ تھی۔ لوگ عقیدتاً چھوٹی چھوٹی سپریں اس طرح تیار کراتے اور انکو سجواتے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی۔ ان سپروں کے سارے سامان سونے اور چاندی کے ہوتے۔ عام طور پر جب سپریں سج کر تیار ہو جاتیں تو ان کو اس جگہ سے جہاں یہ سپریں تیار کی جاتیں جس کو کسنا کہتے ہیں تو ان کو سپروں کو گردش دیتے ہوئے لوگ بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ ان کے لئے جو مخصوص امام باڑے ہوتے اسپر ان کو نصب کرتے۔ سپر کو اٹھانے کا اور اس کو گردش دینے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ بانس کا وہ حصہ جو سپر سے نیچے کی طرف تین فٹ نکلا ہوتا ہے اس کو کمر سے لگے ہوئے پر تلے کے چرمی خول کے اندر

رکھ کر سپر کو اٹھاتے ہیں سپر کے ڈھانچے کی نچلی طرف سپر کو ہاتھوں سے پکڑنے کی جو جگہ بنی ہوتی ہے اس سے سپر کو مضبوطی کے ساتھ پکڑتے ہیں۔ مزید سہارے کیلئے سپر کے آگے اور پیچھے سرے پر دو لانبی مضبوط ڈوریاں ہوتی ہیں ان کو دو آدمی تھامے ہوتے ہیں کہ سپر کے اٹھانے میں اور گردش دینے میں سپر کا توازن قائم رہے اس کے بعد جو شخص سپر کو اٹھاتا ہے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ سپر کو گردش دیتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح سپر کو اٹھانے کی اور اس کو گردش دینے کی مشق ایک مہینہ پہلے ہی سے کرائی جاتی ہے۔ سپر کو اٹھانے والے اور گردش دینے والے متعدد لوگ سپر کے ساتھ رہتے ہیں، ایک تھک جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لیتا ہے۔

پہلے جتنے جلوس نکلتے تھے ان میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی تعداد شریک رہتی تھی اور بہت سے اکھاڑوں کے خلیفہ ہندو ہی ہوتے تھے اور یکساں عقیدت کے ساتھ کل مراسم انجام دیتے تھے۔ غرض پٹنہ میں محرم کی دھوم دھام اور رونق ہندو اور مسلمان کے میل ملاپ سے قائم تھی جس میں دونوں کا مساوی حصہ ہوتا تھا۔

محرم کے دس دن غریبوں کے لئے رحمت کے دن ہوتے۔ امراء اور ذی حیثیت لوگوں کے یہاں کھچڑے گھی میں پکتے اور روزانہ غریبوں میں تقسیم ہوتے۔ کہیں دس بیس سیر پکتے، کہیں من دو من، مجلس کے حصوں اور حاضریوں کی تو بات ہی جدا تھی۔ دو بڑی بڑی باقرخوانیاں یا شیرمالیں، کباب، قورمے اور حلوے یہ ایک حصہ ایسا ہوتا جن میں پانچ آدمی کھالیں۔ لوگ مجلسوں میں شرکت کے لئے علی الصباح گھر سے نکلتے تو بارہ بجے رات کو گھر واپس آتے۔ حصوں اور حاضریوں کے گٹھر غریبوں سے اٹھائے نہیں اٹھتے۔ ہندوؤں کے یہاں حاضریاں تو نہیں بنتی تھیں اور نہ مجلسیں ہوتی تھیں مگر امامؑ کے نام پر وہ بھی غریبوں میں دال اور چاول ملا کر بانٹتے تھے۔

پٹنہ کا چہلم بھی اکثر دوسری جگہوں کے محرم سے تزک و احتشام میں بڑھا ہی ہوا ہوتا تھا۔ چار دنوں کے لئے تقریباً محرم کی سب گھما گھمی واپس آجاتی۔ اکھاڑوں کا تقریباً ویسا ہی لانبا جلوس نکلتا۔ ویسی ہی امام باڑوں کی بھی سجاوٹ ہوتی۔ چہلم میں وہ

اکھاڑے نہیں نکلتے ہیں جو محرم میں نکلتے ہیں۔ دونوں موقعوں کے لئے الگ الگ اکھاڑے مخصوص ہوتے ہیں۔ اکثر امام باڑے بھی جہاں تعزیہ داری ہوتی ہے یا تو محرم کے لئے مخصوص ہوتے ہیں یا چہلم کے لئے۔ ایک ماتمی جلوس، جواب بھی نکلتا ہے مگر بہت مختصر طور پر نکلتا ہے، پہلے بڑے اہتمام سے باؤلی ہال سے ۲۰/ صفر کو دن کے دس بجے نکلتا تھا اور ایک میل سے زیادہ کی مسافت طے کر کے تین بجے دن میں نوذر کٹرے کے امام باڑے میں پہونچتا تھا۔ یہاں پہونچ کر بڑے زوروں پر آخری ماتم ہوتا اور اس کے بعد یہ جلوس منتشر ہوجاتا۔ اس میں دوسرے شہروں سے آئی ہوئی ماتم کرنے والوں کی متعدد ٹولیاں بھی ہوتیں۔ جلوس میں گھوڑے سوار بھی ہوتے، کوتل کے گھوڑے بھی زیوروں سے آراستہ ساتھ رہتے۔ ہاتھی اور اونٹوں کی قطاریں بھی ہوتیں اور باجہ بجانے والوں کی ٹولیاں بھی ہوتیں مگر سب خاموش۔ صرف ماتم کرنے والوں کی آہ و بکا اور نوحہ پڑھنے والوں کا بین فضا میں ارتعاش پیدا کرتی رہتیں۔ یہ بڑا ہی غم انگیز نظارہ ہوتا۔ رک رک کر لوگ ماتم کرتے اور پھر آہستہ آہستہ یہ جلوس آگے بڑھتا۔ جلوس کے آخر میں دُلدُل کے گھوڑے، تابوت اور تعزئے ہوتے۔ جلوس میں سینکڑوں علم، سدّے اور نشان ہاتھوں میں لئے لوگ ساتھ ساتھ چلتے۔ شام کے وقت تابوت کا ایک دوسرا جلوس گذری سے نکلتا اور شاہ باقر کی تکیہ تک جاتا تھا۔ یہ صرف ماتم کرنے والوں کا جلوس ہوتا۔ شاہ باقر کی تکیہ میں پہنچ کر ماتم کرنے والے زنجیروں کا ماتم شروع کردیتے۔ شاہ باقر کی تکیہ میں چہلم کے اکھاڑوں کے تعزیوں اور سپروں کے پھول دفن کئے جاتے ہیں۔

آج کے گئے گذرے زمانے میں اگلے تزک و احتشام کا ایک دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے اور یہ بھی غنیمت ہے۔ سب سے بڑی بات جو باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ آج بھی ہندوؤں کی عقیدت محرم کے ساتھ باقی ہے اور آج بھی ہندو اور مسلمان مل کر پٹنہ میں محرم مناتے ہیں۔ پٹنہ ہی تمام ہندوستان میں یہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ آج تک محرم میں یہاں ذرا بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑا نہ اٹھا۔

پٹنہ میں عزا کی مجلسیں

یوں تو پٹنہ میں سینکڑوں عزا کی مجلسیں ہوتی تھیں مگر سوز خوانی کے لئے محلّہ دھولپورہ میں نواب کاظم علی خان کا امام باڑہ سب سے زیادہ مشہور تھا۔ پٹنہ میں باہر سے بھی سوز خواں آتے تھے اور پٹنہ کے بھی نامور سوز خواں یہاں سوز خوانی کرتے تھے۔ سوز خوانی نہ پہلے آسان فن تھا اور نہ آج ہے یہ دوسری بات ہے کہ اب سارے باکمال اٹھ گئے ہیں جو ہیں ان میں سوائے ایک کے سب سوز خوانی کی رسم کو نباہ رہے ہیں۔ سوز خوانی کے لئے موسیقی کے تمام رموز سے کماحقہ واقف ہونا لازمی تھا۔ تمام راگ راگنیوں پر قدرت ہونی ضروری تھی اور برسوں اس فن میں ریاضت لابدی تھی۔ مخصوص راگوں سے الگ ایک ایسا راگ نکالنا ہوتا تھا جس میں گداز ہو ترنم نہ ہو۔ انشراح ہو، درد ہو، مگر انبساط و سرور نہ ہو اور جو دل کو موم بنا کر عرفانِ محبت کی منزلوں تک پہونچا دے۔ اگر سوز خواں ذرا بھی کچا ہوتا تو اس کی سوز خوانی موسیقی بن جاتی تھی جو مقررہ شرعی حدود سے باہر ہو کر ایک ناجائز فعل سمجھی جاتی۔ شیخ رحم علی اور میر احمد پٹنہ کے بڑے باکمال سوز خوانوں میں تھے اور تمام ہندوستان میں ان کا شہرہ تھا۔ شیخ رحم علی، نواب غازی الدیّن حیدر کے زمانہ میں لکھنؤ گئے اور وہاں کے تمام گویوں اور سوز خوانوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ میر احمد شیخ رحم علی کے شاگرد تھے اور محلّہ مغلپورہ پٹنہ میں رہتے تھے۔ واجد علی شاہ کے یہاں جا کر یہ سوز خوانی کرتے تھے۔ ان کی سوز خوانی کی دھوم بھی تمام ہندوستان میں تھی یہ دونوں تو خیر اگلے زمانے میں گذرے ہیں مگر ان کے بعد علی حسن اور بندہ حسن جو میر احمد سوز خواں کے شاگرد تھے۔ ان دونوں نے بھی سوز خوانی میں تمام ہندوستان سے خراج تحسین پایا۔ یہ دونوں بھی پٹنہ ہی کے رہنے والے تھے۔ کچھ بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ ان دونوں کی سوز خوانی در حقیقت اعجاز تھی۔ سوز خوانی کرتے تو واقعات کربلا کا نقشہ نظر کے سامنے کھینچ دیتے اور

مصرعوں میں اس طرح جان ڈال دیتے کہ درد و غم خود ماتم کرتے ہوئے معلوم ہوتے۔
یہ حضرات جب مجلسوں میں آتے تو خلقت ٹوٹ پڑتی۔ تمام ہندوستان میں ان کی مانگ تھی اور یہ مشکل سے وقت نکال کر کہیں جاتے تھے۔ میر علی حسن اور میر بندہ حسن دونوں بھائی تھے۔ دونوں ہی اپنے فن میں آفتاب تھے۔ نواب ناظم مرشد آباد کو ان دونوں سے بڑی محبت اور عقیدت تھی اور ان کی جان نہیں چھوڑتے تھے۔ نواب ناظم ایک دفعہ انگلستان گئے تو ان دونوں بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں بھی عزا کی مجلسیں ترتیب دیں اور میر علی حسن اور میر بندہ حسن نے بھی وہاں سوز خوانی کی اس مجلس میں بہت سے ہندوستانی اور انگریز شریک تھے۔ سوز خوانی کے سلسلہ میں یہ دونوں تقریباً سال بھر پٹنہ سے باہر رہتے تھے۔ ہندوستان کا کوئی بڑا امام باڑہ ایسا نہ تھا جہاں ان کی سوز خوانی ایک سال میں متعدد بار نہ ہوتی ہو اور اسی لئے پٹنہ کو ان کا فیض کم ہی نصیب ہوتا تھا۔ ان دونوں کے بعد میر مہدی حسین اور منجھو صاحب جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے سوز خوانی کے لئے پٹنہ آیا کرتے تھے۔ آخری زمانہ میں یہی دونوں ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ باکمال سوز خواں سمجھے جاتے تھے میں نے اپنی نوعمری کے زمانہ میں ان دونوں کو پٹنہ میں خوب سنا ہے۔

پٹنہ میں اگلے زمانے کے بچے بچائے سید باقر حسین باقر رہ گئے تھے۔ شاعر بھی تھے اور سوز خواں بھی ۱۹۵۸ء میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ آج کے ہندوستان کے سب سے نامی سوز خواں ولی احمد ہیں۔ یہ بھی پٹنہ ہی کے رہنے والے ہیں۔ میں نے ان کی نوعمری بھی دیکھی اور ان کو فن میں پروان چڑھتے بھی دیکھا۔ جب یہ فن میں اونچے ہوئے تو انھوں نے پٹنہ ہی کو چھوڑ دیا۔ یہاں کبھی کسی مجلس میں آگئے تو مہمان ہی بن کر آئے۔ ان کے مجلس پڑھنے کی رقم بھی اتنی اونچی ہے کہ یہاں کے مجلس پڑھوانے والوں کی، آج کل کے زمانہ میں، بس کی بات نہیں رہی۔ پھر کبھی آہی جاتے ہیں اور اپنے فن کا کمال دکھا جاتے ہیں۔

پٹنہ میں امام باڑوں کو گننا شروع کیجئے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہونچے گی۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے بنائے ہوئے امام باڑے بھی بہت ملیں گے۔ ہندوؤں کے بنائے ہوئے امام باڑوں میں تعزیہ داری ہوتی ہے اور سپریں رکھی جاتی ہیں جو آج بھی ان کی عقیدت کو ظاہر کرتی ہیں۔ دوسرے امام باڑوں میں کہیں حدیث خوانی ہوتی ہے اور کہیں مرثیہ خوانی۔ اگلے زمانے میں صبح سویرے سے لیکر لگاتار گیارہ بجے رات تک بڑی بڑی مجلسوں کا دس دنوں تک تانتا نہیں ٹوٹتا تھا۔ مرثیہ خوانی کے لئے نواب بہادر ولایت علی خاں کا امام باڑہ، قاسم علی خاں کا امام باڑہ، امام باندی بیگم کا امام باڑہ، کرنل کلب علی صاحب کا امام باڑہ، باؤلی کا امام باڑہ، نواب لطف علی خاں کا امام باڑہ تھا۔ اس کے علاوہ صدر گلی میں میر نادر علی کا امام باڑہ اور دولپور حاجی گنج اور دولی گھاٹ کے امام باڑے اور شہر کے چند دوسرے امام باڑے بھی بہت مشہور تھے۔ بہت سے امام باڑوں میں پٹنہ ہی کے حدیث خواں اور کچھ شاعر اپنا لکھا ہوا مرثیہ پڑھتے تھے اور یہاں کی مجلسیں بھی اچھی ہوتی تھیں۔ سچ پوچھئے تو پٹنہ میں مرثیہ خوانی کا فروغ خاندان انیسؔ اور خاندان دبیر کے افرد کی مرثیہ خوانی سے وابستہ تھی۔ پہلے تو یہ دونوں بزرگ آئے اور پھر ان کے خاندان کے افراد آتے رہے۔

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی آپس میں چشمکیں چل چکی تھیں۔ انہی چشمکوں کا فیض سمجھئے کہ ہندوستان میں فن مرثیہ گوئی انتہائے کمال کو پہونچ گیا۔ میر انیسؔ کا یہ دعویٰ حقیقت میں سو فیصدی صحیح ہے۔

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر میں نے پلہ گراں کر دیا

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے ماننے والے ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے اور ہر جگہ دو دو گروہ بن گئے تھے ایک انیسیہ تھا تو دوسرا دبیریہ۔ پٹنہ میں بھی یہ دونوں گروہ قائم تھے۔ چونکہ ان دونوں بزرگوں کا اسلوب بیان الگ الگ تھا۔ اسی لحاظ سے دو دبستاں شاعری بھی تھے اور اکثر ان دو مختلف دبستانوں کے افراد میں ادبی چوٹیں بھی چل جاتی تھیں۔

میر انیسؔ کی پٹنہ میں پہلی آمد اور مرثیہ خوانی

میر انیسؔ مرحوم ۱۸۵۸ء میں نواب سید قاسم علی خاں کے بلانے پر ان کے لڑکے نواب سید احمد حسین عرف احمد نواب کی چہلم کی مجلس پڑھنے کے لئے پٹنہ آئے تھے۔ میر مونسؔ مرحوم بھی ان کے ساتھ تھے۔ نواب قاسم علی خاں، میر عبداللہ بانی خاندان روسائے گذری کے تیسرے صاجزادے تھے۔ میر انیسؔ مرحوم ان کے یہاں لگاتار تین سال ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء تک محرم کی مجلسیں پڑھنے کے لئے آتے رہے۔ میر مونس مرحوم بھی ہر بار ان کے ساتھ آئے۔ جب ۱۸۶۱ء میں میر انیسؔ مرحوم کو نواب سر سالار جنگ اول کے یہاں سے حیدر آباد آنے کا بلاوا آیا اور میر انیس مرحوم حیدر آباد میں مجلسیں پڑھنے کے لئے جانے لگے۔ تو میر مونسؔ مرحوم کو پٹنہ میں نواب قاسم علی خاں کے یہاں کی مجلسیں سپرد کر گئے۔ جب نواب قاسم علی خاں کا انتقال ہو گیا تو میر مونس مرحوم کے تعلق نواب بہادر سید ولایت علی خاں کے یہاں کی مجلسیں ہوئیں۔ یہ نواب قاسم کے بھتیجے اور دوسری شادی سے داماد بھی تھے۔ میر مونسؔ کے انتقال کے بعد نواب بہادر ولایت علی خاں کے یہاں میر انیس مرحوم کے چھوٹے صاجزادے میر سلیس آنے لگے۔

باؤلی ہال پٹنہ کے امام باڑے میں نواب سید لطف علی خاں جو میر عبداللہ کے چھوٹے صاجزادے تھے انھوں نے بھی بڑی مجلسوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ یہاں پر اُنس کے صاجزادے میر وحید آتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد میر وحید کا جوانی میں ماں باپ کے سامنے انتقال ہو گیا۔ قسمت کی یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کے بعد نواب سید لطف علی خاں کے یہاں میر وحیدؔ کی جگہ پر ان کے بوڑھے باپ میر اُنس کو یہ خدمت تفویض ہوئی۔

۱۸۵۸ء میں میر انیس کا پہلی دفعہ پٹنہ آنا تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۵۸ء میں میر انیس مرحوم پہلی مرتبہ مجلس پڑھنے کے لئے لکھنؤ سے باہر نکلے۔ ابھی ابھی

۱۸۵۷ء کے غدر کا ہنگامہ سرد ہوا تھا۔ جس کی زد میں لکھنؤ بھی بُری طرح آیا تھا۔ اس سیاسی ہنگامے میں ہزاروں خاندان اجڑ گئے تھے۔ اور اس طوفان نے معاشرت کی سطح کو تہہ و بالا کر دیا تھا جس سے سماج کی چولیں بھی ڈھیلی پڑ گئیں تھیں۔ اس بحران سے زیادہ متاثر شرفاء ہی تھے۔ پھر بھی مذہبی تقریبات جاری رہیں اور جب کچھ سکون ہوا تو عقیدوں میں کچھ شدت ہی بڑھ گئی۔ میر انیسؔ ۱۸۵۸ء میں پٹنہ پہلی مرتبہ آئے تو نواب قاسم علی خاں کے صاحبزادے کی چہلم کی مجلس میں مرثیہ پڑھنے سے قبل انھوں نے ممبر پر یہ رباعی پڑھی جو ان کے دلی جذبات کی ترجمان تھی۔

جو گل کہ کبھو نہ بوستاں سے نکلے
اس دور میں جورِ باغباں سے نکلے
پھولوں کی جگہ نظر جو آئے کانٹے
بلبل تھے، سڑک کے آشیاں سے نکلے

نواب قاسم علی خاں کے یہاں میر انیسؔ کے آنے کا اور پٹنہ میں ان کے پہلی مرتبہ مجلس پڑھنے کا واقعہ یوں ہے کہ ۱۸۵۸ء میں نواب قاسم علی خاں کے کم سن صاحبزادے احمد نواب مرحوم کا انتقال ہو گیا اور انھوں نے ایک شیر خوار بچہ خورشید نواب کو اپنی یادگار چھوڑا۔ ستم رسیدہ نواب قاسم علی خاں نے اپنے بیٹے احمد نواب کے ایصال ثواب کے لئے خوب خیر و خیرات کئے چالیس دنوں تک روزانہ قرآن خوانی اور چھوٹی چھوٹی مجلسیں ہوتی رہیں۔ چہلم کی مجلس پڑھنے کے لئے بہتر سے بہتر مجلس پڑھنے والے کو بلانا چاہا، تو میر انیسؔ سے بہتر کون مجلس پڑھنے والا ہو سکتا تھا۔ میر انیسؔ آئے اور اس موقع کے لئے انھوں نے بھی بالکل نیا مرثیہ لکھا جس میں احمد نواب مرحوم کا جاں گداز واقعہ درج تھا۔ ان کی بیماری کا حال تھا اور ان کے والدین اور ان کی کم سن بیگم کی حالت زار کا نقشہ کھینچا تھا۔ بیان درد و الم میں یہ مرثیہ بڑا ہی رقت انگیز ہے مجلس پڑھنے کے بعد میر انیسؔ مرحوم نے یہ مرثیہ نواب قاسم علی خاں مرحوم کے

حوالہ کر دیا تھا تاکہ مرنے والے کی یہ یادگار جو مرثیہ کی شکل میں تھی اسی خاندان میں محفوظ رہے۔ ہوا بھی یہی کہ یہ یادگار مرثیہ تبرکاً احمد نواب مرحوم کے وارثوں کے پاس احتیاط کے ساتھ تجوری میں بند رہا۔ اسی لئے میر انیس کے مراثی کے مجموعوں میں جو چھپ کر بہت دن ہوئے شائع ہو چکے تھے، یہ مرثیہ نہیں ملتا۔ نواب سید وارث اسمٰعیل جو اب نواب مرحوم کے پوتے ہیں اور اب اس خاندان کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کے پاس یہ مرثیہ محفوظ تھا۔ ۱۹۵۴ء میں حضرت مہذبؔ لکھنوی نے "وقار انیس" کے نام سے ایک کتاب چھاپی جس میں میر انیس کے دو چار مرثیوں کے ساتھ نمبر اول میں یہ مرثیہ چھپا۔ اس مرثیہ کو حضرت مہذب لکھنوی نے نواب سید وارث اسمٰعیل سے حاصل کیا تھا۔ نواب وارث اسمٰعیل ہی سے مجھے میر انیس کے پٹنہ آنے کا حال اور یہاں ان کے مجلس پڑھنے کا قصہ بھی معلوم ہوا تھا اور اس مرثیہ کی نقل بھی ملی تھی۔ اس مرثیہ کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

یا خدا دل کو کسی کے غمِ اولاد نہ ہو مبتلا داغِ پسر میں کوئی ناشاد نہ ہو
یہ ریاضت کسی دشمن کی بھی برباد نہ ہو اور سب دکھ ہو جہاں میں پہ یہ بیداد نہ ہو
دل اسی کوفت میں نالوں کی صدا دیتا ہے
یہ وہ غم ہے جو کلیجے کو بٹھا دیتا ہے

یہ مرض وہ ہے کہ دنیا میں نہیں جس کی دوا یہ وہ ہے زخم کہ مرہم نہیں جس کا بہ خدا
یہ وہ نشتر ہے کہ سینے میں کھٹکتا ہے صدا یہ قلق وہ ہے کہ دل ہی جانتا ہے جس کا مزا
شکل فرزند جو ماں باپ کو یاد آتی ہے
رات سب پیٹنے رونے میں گذر جاتی ہے

خالی ہو جاتا ہے بیٹے کا جو سونے کا مقام دل بھر آتا ہے مادر ہوئی جاتی ہے تمام
رکھ کے منہ پیار سے تکیوں پہ یہ کرتی ہے کلام واری ماں قبر میں کیونکر تمہیں آیا آرام
بستر خاک پہ بے چین نہیں ہوتے ہیں
کیسے تربت میں کفن پہنے ہوئے سوتے ہیں

(کلائمکس وہاں پر ہے کہ احمد نواب مر رہے ہیں مگر ماں کو تسلی دیئے جاتے ہیں۔)

آپ کیوں روتی ہیں جو مرضی ربّ اکبر آگے ماں باپ کے مرتا نہیں کیا کوئی پسر
کارخانہ یہی جاری ہے یہاں شام و سحر کوئی آتا ہے جہاں میں کوئی کرتا ہے سفر
شکر معبود کا، ہر حال میں دم بھرتے ہیں
پیرنا چاری سے جیتے ہیں جواں مرتے ہیں

آپ تو عاشقِ اولادِ پیمبر ہیں کمال ذکر سنتی ہیں جوانانِ علیؑ کا ہر سال
شہر بانو کی مصیبت کا مناسب ہے خیال مر گیا ہو کے جواں اکبر ذی جاہ سا لال
ہم تو بیاہے بھی گئے صاحبِ اولاد ہوئے
وہ تو بن پھولے پھلے کشتۂ بیداد ہوئے

(احمد نواب مرحوم کی کم سن جواں بیگم کا بین بھی غضب ہے)

تفرقہ چرخ ستمگر نے دکھایا یہ عجیب دور میں رہ گئی اور تم گئے منزل کے قریب
کچھ نہ بس چل سکا اے گورِ غریباں کے غریب دیکھا دم توڑتے آنکھوں سے تمہیں وائے نصیب
سچ ہے مہلت کسے تھمنے کی قضا دیتی ہے
ساتھ برسوں کا یہ دم بھر میں چھڑا دیتی ہے

گر سفر تم کہیں کرتے تو نہ تھا کچھ وسواس واں سے خط بھیجتے ہوتی مجھے پھر آنے کی آس
عمر بھر روؤں گی اس غم میں میں باحسرت دیاس واں سدھارے ہو کہ آؤ گے نہ پھر کر مرے پاس
قبر سے اٹھ کے کوئی شکل ادھر آنیکی نہیں
حشر تک اب تو یہ صورت نظر آنے کی نہیں

اصل مرثیہ کی طرف گریز کر کے اب حضرت علی اکبرؑ کی شہادت اور حضرت امام حسینؑ کی بیچارگی اور بیقراری بیان کرتے ہیں۔

اب سنیں اہل عزا حالِ امامِ دو جہاں دن میں جب چل گئی اکبر کے کلیجے پہ سناں
خوں یہ اُبلا کہ بدن میں نہ رہی تاب و تواں کر کے گھوڑے سے تڑپنے لگا وہ تشنہ وہاں
غل ہوا لختِ دل سبطِ نبی کو مارا
ہم نے ہمشکلِ رسولِ عربی کو مارا

سُن کے یہ خیمے کے باہر نکل آئیں زینب　شور رانڈوں مٰں ہواہائے غضب ہائے غضب
ننگے سر رن کو چلا ابنِ شہنشاہ عرب　زرد تھا چاند سارخ خشک تھے یاقوت سے لب

دم بدم عرش کو نالوں سے ہلا دیتے تھے
علی اکبر علی اکبر کی صدا دیتے تھے

حضرت امام حسینؑ جب میدان جنگ میں پہونچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حضرت علی اکبرؑ خاک و خوں میں غلطاں پڑے ہیں زخموں سے تمام بدن چور ہے۔ ظالموں نے جو سینے پر سناں ماری تھی اس کا پھل کلیجے سے باہر نکل آیا ہے اور موت کی غشی طاری ہے۔

حال یہ دیکھ کے مطلق نہ رہے ہوش بجا　کر پڑے ہائے پسر کہہ کے امام دوسرا
روئے چلاکے کہ باپ آیا ہے دیکھو بیٹا　کھول کر خوں بھری آنکھوں کو یہ اکبر نے کہا

منہہ سے ٹپکایئے گر آئے میسر پانی
دل پھنکا جاتا ہے اے مالکِ کوثر پانی

منہہ پہ منہہ رکھ کے کہاشہ نے بچشم خونبار　علی اکبر میں تری تشنہ دہانی کے نثار
نہر کے گھاٹ کو روکے ہوئے ہیں ظلم شعار　ایک قطرہ بھی ہے مظلوم کو ملنا دشوار

کیا کروں میں کہ ہے برگشتہ زمانہ بیٹا
جاکے کوثر ہی پہ اب پیاس بجھانا بیٹا

میر نفیسؔ کی پٹنہ میں مرثیہ خوانی

میر نفیسؔ بجا طور پر اپنے والد ماجد میر انیسؔ کے جانشیں تھے۔ کلام میں میر انیس کی سلاست، زور بیان اور ڈرامائی انداز جو میر انیسؔ کا مخصوص حصہ تھا میر نفیسؔ کو مل چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میر نفیس شاعری کی لطافتوں کے ساتھ فن کی نزاکتوں پر بھی نظر رکھتے تھے اسی لئے رزم اور بین میں ہمعصروں میں ممتاز و مفتخر سمجھے جاتے تھے۔ میر نفیسؔ کا میر انیسؔ کے ہمراہ پٹنہ آنا تو کئی تذکروں سے ثابت ہے مگر پٹنہ آکر ان کا مجلسیں پڑھنا اگلے تذکروں میں نہیں ملتا۔ افسوس ہے کہ تذکرہ نگاروں نے میر نفیسؔ کی پٹنہ میں مرثیہ خوانی کو وہ اہمیت نہ دی جو دینی چاہیئے تھی۔ یہ تو میرے عزیز ڈاکٹر سید افضل حسن صدر شعبہ اردو گرو گوبند سنگھ کالج پٹنہ کی جدو جہد اور نئی تحقیقات کا کارنامہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو سکا کہ میر نفیسؔ اپنے والد میر انیس کے انتقال کے کئی سال بعد پٹنہ آکر مسلسل تین چار برسوں تک مجلسیں پڑھتے رہے مگر یہ امام باڑہ نواب بہادر ولایت علی خاں جانشیں نواب قاسم علی خاں کا امام باڑہ نہ تھا۔ جہاں میر نفیسؔ مجلسیں پڑھتے رہے وہ عبّن صاحب مرحوم کا امام باڑہ تھا۔ عبّن صاحب مرحوم متمول بزرگ تھے ان کا شمار پٹنہ کے بڑے رئیسوں میں نہ تھا۔ ان کا امام باڑہ نواب بہادر روڈ کے آخری جنوبی سرے پر واقع تھا جو مغلپورہ پٹنہ کا آخری مغربی حصہ ہے۔ مرور زمانہ کے ہاتھوں عبن صاحب مرحوم کا یہ امام باڑہ اب شکستہ ہو کر زمیں بوس ہو چکا ہے۔ اس امام باڑہ کے قریب ہی دوسرا امام باڑہ مہدی بیگم صاحبہ مرحومہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مہدی بیگم صاحبہ کا امام باڑہ بھی اب خستگی اور شکستہ حالی کی تصویر بنا کھڑا ہے اسی امام باڑے میں میر نفیسؔ مرحوم کا سنگ مرمر پر لکھا ہوا ایک قطعہ تاریخ بھی چند دن قبل تک نصب تھا جس کو ڈاکٹر پروفیسر افضل حسن نے دیکھا بھی تھا اور پڑھا بھی تھا۔ چونکہ افضل حسن صاحب کو یہ یقین تھا کہ سنگ مرمر پر لکھا ہوا قطعہ تاریخ اپنی حالت پر ابھی نصب رہیگا اس لئے قطعہ تاریخ کو نقل کرنے کو دوسرے موقع پر

ملتوی کر دیا تھا۔ افضل حسن صاحب کی یہ خواہش بھی تھی کہ امام باڑے کے آس پاس کے لوگوں سے یہ کتبہ خود حاصل کر کے اپنے ساتھ لے آئیں جب افضل حسن صاحب دو بارہ وہاں پہونچے تو دیکھا کہ اس جگہ کے چند لوگوں نے اُسے اکھاڑ کر غائب کر دیا ہے۔

میر نفیسؔ کے پوتے سید محمد عباس صاحب نے مہذب صاحب کی ترتیب دارہ کتاب "نگار نفیس" کے مقدمہ میں میر نفیسؔ کی خواندگی کے طرز و انداز کے بارے میں لکھا ہے کہ میر نفیسؔ نے اپنے جدو پدر سے مرثیہ خوانی سیکھی تھی مگر لوگ بتاتے ہیں کہ آپ کے پڑھنے کا طرز میر انیسؔ سے کسی قدر جدا تھا۔ آپ بڑی قوت اور کس بل سے پڑھتے تھے، آواز بہت چوڑی ہوتی جو دور تک اور پورے مجمع پر چھا جاتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تمام سامعین ہمہ تن گوش بنے رہتے تھے۔ میر نفیسؔ مرثیہ میں رزمیہ حصوں کو اس حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرتے تھے کہ میدانِ جدال و قتال کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا اور چشم و ابرو کے اشارے سے فنونِ حرب و ضرب کی آزمودہ چالیں اس طرح بتاتے گویا معرکہ آرائی کا بازار گرم ہو۔ بزرگوں کی زبان سے یہ حکایت سنی گئی ہے کہ ایک بار میر نفیسؔ منبر پر تشریف فرما تھے اور مجلس پر محویت کا عالم طاری تھا کہ میر نفیسؔ نے یہ مصرع پڑھا۔

"وہ گرد اٹھی وہ جگر بندِ بو تراب آیا"

اور سامنے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا پوری مجلس پشت کی جانب دیکھنے لگی۔ ایک بار میر نفیس اسی امام باڑے میں اپنا مشہور مرثیہ

"بیاضِ صبح کا جب چرخ پر ظہور ہوا"

پڑھ رہے تھے اور سبحان اللہ! واہ واہ کے نعروں سے امام باڑے کی چھتیں اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جب وہ رزمیہ حصّوں کو پڑھتے پڑھتے اس ٹیپ پر پہونچے

قدم بڑھائے ہوئے تیغے اٹھائے ہوئے
چلے چلو انہیں کوفے تلک بھگائے ہوئے

تو اس ٹیپ کو سن کر مجلس میں داد و تحسین کی وہ صدا بلند ہوئی کہ پندرہ بیس منٹوں تک میر نفیس کو رکنا پڑا اس کے بعد میر نفیس نے آگے کے بندوں کو پڑھنا شروع کیا۔ میر نفیس شہادت کے واقعہ اور بین کے حصوں کو بڑے دل دوز انداز میں ادا کرتے تھے۔ سامعین پہلے غم زدہ اور مغموم سے نظر آتے اور بتدریج دل میں گداز پیدا ہوتا اور پھر سب سامعین گریہ وزاری میں محو ہو جاتے اور حسینؑ کی دلخراش صداؤں میں سینہ کوبی شروع ہو جاتی۔

میر نفیس کے رجزیہ بندوں میں سے ایک بند یہاں پیش کر رہا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔

ہر اس کچھ نہیں پیدل بڑھیں سوار بڑھیں
رسالہ دار بڑھیں آزمودہ کار بڑھیں
پچاس صف سے بڑھیں سو بڑھیں ہزار بڑھیں
جو کچھ ہو خوف تو سب مل کے ایک بار بڑھیں

بہت ہوں صید تو دل اور شیر ہوتا ہے
شکار سے کہیں صیّاد سیر ہوتا ہے

یہ دوسرا بند بین کا ہے یہ حضرت علی اکبر کی شہادت سے متعلق ہے۔ حضرت زینب اپنے بھتیجے کی لاش کے پاس بیٹھی آہ کر رہی ہیں۔ غضب کا المناک بند ہے۔

کچھ اب کلام کرو ماں کو اک نظر دیکھو
تڑپ رہی ہے پھوپھی اک ذرا ادھر دیکھو
تمہارے واسطے روتا ہے سارا گھر دیکھو
یہ وقت خواب نہیں آنکھ کھول کر دیکھو

سکینہ لپٹی ہوئی اشکِ خوں بہاتی ہے
اٹھو اٹھو تمہیں چھوٹی بہن جگاتی ہے

دبستانِ انیس کی یہ روشن شمع ۱۹۰۱ء میں گل ہو گئی۔

میر وحیدؔ

نواب سید لطف علی خاں کے یہاں بڑی مجلسوں کا آغاز میر وحید کی مرثیہ خوانی سے ہوا۔ یہ جوانی میں انتقال کر گئے۔ میر اُنس جوان کے والد تھے ان کو بڑھاپے میں جوان بیٹے کی موت کا جانکاہ حادثہ دیکھنا پڑا۔ نواب لطف علی خاں کے یہاں کی مرثیہ خوانی سونی ہونے والی تھی کہ نواب لطف علی خاں نے اصرار کر کے میر اُنسؔ کو اپنے یہاں مجلس پڑھنے پر راضی کیا۔

میر وحیدؔ کی مرثیہ خوانی کا ذکر ہر زبان پر جاری تھا۔ ان کی مرثیہ خوانی کا تذکرہ میرے والد مرحوم اکثر کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر یوں کرنے لگے کہ میں مجلس کی شرکت کے لئے گیا تو نواب لطف علی خاں۔ جن سے خاندانی مراسم تھے انھوں نے اپنے پاس ہی منبر کے قریب بیٹھا لیا۔ میر وحیدؔ منبر پر تشریف لائے تو مجلس ایک سلام سے شروع کی جس کا مقطع بہت سے لوگوں کی زبان پر چڑھا اور مدتوں یاد رکھا۔

پیس اے گردوں جو پیسا ہے وحید زار کو
چشم مردم میں نہ کھٹکے، سرمہ سا، ایسا تو ہو

میر وحیدؔ خوب پڑھتے تھے۔ پڑھنے میں بالکل میر انیسؔ کا انداز تھا، کیوں نہ ہوتا بھتیجے ہی تھے اور انہیں کی آغوش میں تربیت پائی تھی۔ ان کے ایک مرثیہ کے دو بند درج کر رہا ہوں یہ مرثیہ انھوں نے پٹنہ میں پڑھا۔

یارب سخنوری کا مرے سر کو تاج دے سِکّے کو ضرب تیغ زباں کے رواج دے
فردوسی و نظامی و بونصر باج دے وہ زمزمے عطا ہوں کہ بلبل خراج دے
لب دُرفشاں ہو کان جواہر دہن بنے
منہ سے جھڑیں وہ پھول کہ مجلس چمن بنے

شیرینی سخن سے فصیحوں کے لب ہوں بند مضموں کی تازگی سے حلاوت ہو بہرہ مند
صدقے ہوں بات بات پہ شہد و نبات و قند لذت شکر کی پھر نہ سخنور کریں پسند
کوثر کے جام آئیں نظر دست حور پر
عالم ہو جوئے شیر کا بین السطور پر

پیارے صاحب رشیدؔ

پیارے صاحب رشیدؔ کی مجلسیں پٹنہ میں مشہور تھیں خاندان انیسؔ اور خاندان عشق و تعشق، یہ دونوں خاندانوں کی نمائندگی کرتے تھے اور اس پر ان کو فخر بھی تھا۔ ان کے ایک مرثیہ کا یہ بند بہت مشہور ہے۔

میں بھی ہوں وارثِ طرزِ سخن میر انیسؔ
ہوں تعشق کے سبب ملکِ مضامین کا رئیسؔ
مونسؔ خلق ہوں میں میری زباں ہے جو سلیسؔ
ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں، میں اور نفیسؔ
خوب تحقیق میں بچپن سے رہی کد مجھ کو
مستند ہوں کہ ملی عشقؔ کی مسند مجھ کو

باؤلی کے امام باڑہ کی مجلسیں ان کے دم سے یادگار مجلسیں بن گئی تھیں۔ پیارے صاحب رشیدؔ بہاریہ مضمون باندھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اسی مرثیہ میں بہار کی کیفیت جو کہی ہے، وہ بھی ذرا سنئے۔

بلبلوں کا وہ چہکنا و سحر کا ہونا آب شبنم سے ہر اک پھول کا وہ منہہ دھونا
بس گیا عطر سے گلزار کا کونا کونا آنکھ نرگس کی جھپکتی نہیں کیسا سونا
غنچہ و گل کی ہنسی روح کو تڑپاتی ہے
دل بلبل سے بھی اُف اُف کی صدا آتی ہے

صورت تیغ دو دم شاخ ہر اک دمتی ہے دم بدم باد صبا چلتی ہے اور تھمتی ہے
اب بھلا عاشق و معشوق کی کیا کمتی ہے بلبوں کے ہیں پرے پھولوں کی صف جمتی ہے

لطف اب موسم سرما کا یہاں اٹھتا ہے
اوس پڑتی ہے چمن میں کہ دھواں اٹھتا ہے

گل جہاں پر نہ ہوں ایسا نہیں کوئی گوشا باقی پھر بھی ہے باد بہاری کی تمنا باقی
غیر آب اب نظر آتا نہیں رستا باقی پاؤں رکھنے کی پے سرو نہیں جا باقی

تنگ عرصہ ہے محبت کے گرفتاروں پر
بلبلیں بیٹھتی ہیں باغ کی دیواروں پر

گرد کانٹے ہیں کہ لٹ جائے نہ سامان چمن کل جو دشمن تھے وہ ہیں آج نگہبان چمن
غور سے دیکھئے جس گل کو وہ ہے جان چمن محو بازی ہیں ہر اک سمت جوانان چمن

باغباں شرطِ محبت کی جزا پاتے ہیں
پھول گرتا ہے تو آنکھوں میں اٹھا لاتے ہیں

منّے صاحب ذکی

میر ذکی حسین ذکی عرف منّے صاحب مرحوم میر انیسؔ کی بڑی صاحبزادی کے نواسے تھے اور اس تعلق سے خاندان انیس سے بھر پور شاعری میں ترکہ پایا تھا۔ میر ذکی عرف منّے صاحب مرحوم بہت دنوں تک پٹنہ میں رہے۔ ان کے آخری زمانہ کی مجلسیں میں نے بھی سنی اور ان کو نزدیک سے بھی دیکھا۔ ان کے شاگردوں کا یہاں ایک اچھا حلقہ قائم تھا۔ آخری دور کے پڑھنے والوں میں آپ اپنی مثال تھے۔ خاندان انیس کے فرد تھے اس لئے مجلس پڑھنے میں خاندانی آداب اور اپنے خاندانی تیور قائم رکھتے تھے مجلس پڑھتے وقت میر انیس کا پورا انداز جھلکنے لگتا تھا۔ مرثیہ میں ساقی نامہ کی چاشنی پیدا کرنا بھی انہیں کا حصہ تھا۔ ان کے ساقی نامہ کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

جہاں میں ساقیا مئے کا تری جواب بھی ہے؟ دوائے دردِ معاصی بھی ہے شراب بھی ہے
گنہ بھی ترکہ میں اس کے ہے اور عذاب بھی ہے اسی کے پینے میں بخشش بھی ہے ثواب بھی ہے

وہ دور جام وہ گردش تری نگاہوں کی
سفید کیوں نہ ہو فرایہ گناہوں کی

کرم سے تیرے سب امیدوار پیتے ہیں کسے ملی ہے جو ہم بادہ خوار پیتے ہیں
خدا شناس سدا بار بار پیتے ہیں تری شراب عبادت گزار پیتے ہیں

پھرا جو ساقیا اس در سے کب ملول نہیں
کہ اس شراب کی توبہ قبول نہیں

پٹنہ میں خاندان دبیر کی گل افشانیاں

پٹنہ میں دبستان دبیرؔ کے گل بوٹے بھی کم نظر افروز اور جاذب نظر نہ تھے۔ مرزا دبیر کا تبحر علمی اور ان کی پختہ کاری نے تمام ہندوستان سے خراج تحسین وصول کیا۔ میر انیس تو صرف تین دفعہ پٹنہ آئے۔ میر اُنس اور میر مونس برابر آتے رہے مگر مرزا دبیر کے شیدائیوں نے ان کو سولہ آنا اپنا بنائے رکھنے کی پوری کوشش کی اور یہی سبب تھا کہ امام باندی بیگم صاحبہ کے امام باڑے میں عشرہ محرم کی مجلسوں کی رونق مرزا دبیر اور ان کے بیٹے اور پوتے کی مرثیہ خوانی سے ہر سال بڑھتی رہی جس کی دھمک آج بھی پٹنہ کی فضا میں گونجتی ہے۔ امام باندی بیگم صاحبہ نے ازراہ عقیدت مرزا دبیرؔ اور ان کے خاندان کے افراد کی دوامی مقرری کر کے دبستان دبیرؔ سے بہرہ افروز ہونے کا موقع پٹنہ والوں کے لئے مہیا کردیا مرزا دبیر ہر سال پٹنہ آتے تھے ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مرزا اوجؔ مجلسیں پڑھنے کو آتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں جب وہ بھی گذر گئے تو ان کے لڑکے مرزا طاہر رفیع آیا کئے۔ مرزا دبیرؔ کے مراثی لوگوں کی نظر کے سامنے ہیں اس لئے یہاں ان کا دھرانا مقصود نہیں۔ مرزا اوج کی صرف ایک رباعی اور ان کے سلام کے چند شعر تبرکاً درج کر رہا ہوں۔

رباعی

اے ذوق سخن سلام کہہ دینا تو
ہے آخری یہ پیام کہہ دینا تو
مل جائے کہیں اگر شباب رفتہ
ٹھہرا کے مرا سلام کہہ دینا تو

سلام کے چند اشعار یہ ہیں۔

نورِ معنی سے سلامِ آنکھیں روشن ہو گئیں مجلسیں رنگ سخن سے رشکِ گلشن ہو گئیں
چل سوئے گورِ غریباں اے حریصِ مال و زر دیکھ کتنی آرزوئیں نذرِ مدفن ہو گئیں
جامۂ ہستی ہوا صد چاک .جب مثلِ سجاف کہ نیتیں دنیا کی گرداگرد دامن ہو گئیں
.جب مرے نالے ہوئے قد صنوبر سے بلند بلبلیں ساکت سرِ دیوارِ گلشن ہو گئیں
تھی سکینہ کو جو دیدارِ پدر کی آرزو آنکھیں وارہ کر درِ زنداں کا رفدن ہو گئیں
.جب ہوا تیار بانو کے پر ارماں کا مزار آرزوئیں سر ٹپک کر لوحِ مدفن ہو گئیں

آیئے وہ دن کربلا میں چل کے پوچھیں اوجؔ سے
اب تو پوری حسرتیں اے شفقؔ من ہو گئیں؟

مرزا طاہر رفیعؔ مرحوم

مرزا دبیر مرحوم کی علمی صلاحیت اور قادر الکلامی مُسلّم مگر ان کے پوتے مرزا طاہر رفیعؔ نے شاعری میں چمن در چمن جو گل بوٹے اگائے اور روایتی شاعری کے حدود میں رہ کر جو نئے اسلوب پیدا کئے اس کے لئے مرزا طاہر رفیع کا نام ایک انفرادی حیثیت کا مالک ہے غالباً ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء کا زمانہ ہے، مرزا طاہر رفیع کے دم سے امام باندی بیگم کے یہاں کی مجلسیں مرجع خواص و عوام بنی ہوئی ہیں۔ باؤلی کے امام باڑے میں میر منے صاحب ذکی مجلسیں پڑھتے ہیں۔ کرنل کلب علی خاں کے امام باڑے میں میر حمید کی جگہ پر اب میر فریدؔ آنے لگے ہیں۔ مجھے ان سب حضرات سے عقیدت تھی، میں ان مجلسوں میں شریک رہنے کی کوشش کرتا۔ غالباً نویں محرم تھی میں مجلس کے مقررہ وقت پر امام باندی بیگم صاحبہ کے امام باڑے میں پہونچا تو سوز خوانی شروع ہو چکی تھی۔ امام باڑے میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ کسی صورت سے میں جگہ بناتا ہوا

آگے بڑھا، منبر کے پاس ہی نواب سید محمد صاحب مرحوم (متولی) بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس بلالیا اور مجھ سے چپکے سے کہنے لگے کہ آج مرزا صاحب نیا مرثیہ پڑھ رہے ہیں جس کا عنوان معرات نامہ انھوں نے رکھا ہے۔ میں سمجھ گیا آج کا اسقدر اژدہام جو ہے، وہ نیا مرثیہ سننے کی غرض سے ہے اتنے میں سوز خوانی ختم ہوئی۔ مرزا ذاکر مرحوم جو مرزا طاہر رفیع صاحب کے صاجزادے تھے۔ انھوں نے اپنے مرثیہ کے دو چار بند پیش خوانی میں پڑھے اور منبر سے اتر آئے۔ اب سبھوں کی آنکھیں مرزا رفیع کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مرزا صاحب اٹھے اور منبر پر آگئے۔ بستہ سے مرثیہ نکالا، ساتھ میں صلوٰۃ کی آواز ہر طرف سے اٹھی۔ مرزا صاحب نے سامعین پر ایک نظر ڈالی اور اپنا مرثیہ شروع کیا۔ یہ مرثیہ حقیقت میں ایک شاہکار ہے اس کے چند بند اس کتاب کی ترتیب دیتے وقت میں نے بمشکل حاصل کئے ہیں۔ یہ صرف ابتدائی بند ہیں آپ ملاحظہ کریں۔

واقعہ طور کا اے حضرت موسیٰ کیا تھا جس سے بے ہوش ہوئے آپ وہ جلوہ کیا تھا
کچھ کھلا بھی کہ وہ قدرت کا کرشمہ کیا تھا خیر اتنا تو بتا دیجئے دیکھا کیا تھا
کس کے رخ کی تھی جھلک طور کی پیشانی میں
جلوہ گر کون تھا اس پردۂ نورانی میں

ایک نظارے کی بھی تاب نہ لائے موسیٰ ہو کے غش تیسرے دن ہوش میں آئے موسیٰ
رنج فرقت کا اٹھا نا تھا اٹھائے موسیٰ جلوۂ یار کہاں دیکھنے پائے موسیٰ
لنترانی کے سوا اس کا نتیجہ کیا تھا
بے نیازی کا دکھانا تھا تجلا کیا تھا

شوق دیدار نے حضرت پہ قیامت ڈھائی آپ بے ہوش ہوئے طور پہ آفت آئی
تھی فقط نور مجرد کی وہ حسن آرائی گہری نظریں جو پڑیں ڈوب گئی بینائی

ایسے بیخود ہوئے پھر ہوش میں آیا نہ گیا
سر تو سر آنکھ کا پردہ بھی اٹھایا نہ گیا

دل کو تھی جس کی تمنا نہ وہ حسرت نکلی　دیکھتیں جسکو نگاہیں نہ وہ صورت نکلی
شوخیِ جلوہ گہہ ناز قیامت نکلی　جو گھڑی وصل کی تھی ساعت فرقت نکلی

ہاتھ کو اپنے جلا کر ید بیضا پایا
دامن طور کو جلوا کے مزا کیا پایا

اے کلیم آج دکھاتے ہیں تمہیں ہم وہی نور　طور پر کل تھا نگاہوں میں ہے اسدم وہی نور
چاند یثرب کا ضیا بخش دو عالم وہی نور　واں مجرد تھا فقط یاں ہے مجسم وہی نور

انجمن حسن کی ہے جلوہ گہہ ناز نہیں
لنترانی کا یہ جلوت کدۂ راز نہیں

جن کے دیدار کی تھی تمکو تمنا دیکھو　خوب جی بھر کے جمالِ رخِ زیبا دیکھو
شبِ معراج کے دولہا کا سراپا دیکھو　اب نہ آجائے غش اے حضرت موسیٰ دیکھو

یہ وہ منظر ہے کہ شک بھی نہیں دھوکا بھی نہیں
آمنا سامنا ہے آنکھ کا پردا بھی نہیں

خاندان انیس و خاندان دبیر کے درمیان ایک چشمک

مجلسوں میں جہاں عقیدت کے پھول کھلتے تھے وہاں ذوق شاعری بھی پروان چڑھتا تھا۔ پٹنہ میں دبستان انیسؔ اور دبستان دبیرؔ دونوں کے نمائندے اپنے خزانوں کے لعل و گہر بے دریغ مجلسوں میں لٹاتے تھے اور سامعین ان سے اپنے دامن بھر بھر کر لیجاتے تھے۔ آپس میں چشمکیں بھی ہوتی تھیں اور چوٹیں بھی چلتی تھیں مگر اس لطیف پیرائے میں کہ حاضرین لطف اندوز ہوتے اور جس پر وار ہوتا وہ فراخ دلی سے مسکرا دیتا۔ اس طرح کا ایک واقعہ لگ بھگ انہیں دنوں مجھے یاد ہے۔ امام باندی بیگم صاحبہ کے امام باڑے میں سوز خوانی ختم ہو چکی تھی۔ مرزا ذاکر اپنے والد مرزا طاہر رفیع کی

پیش خوانی کرنے کو حسب معمول منبر پر آئے اور اپنا ایک مرثیہ شروع کیا۔ ان کے مرثیہ کے ابتدائی بندوں میں دو ایک بند ایسے بھی تھے جن میں ان کے خاندانی وقار و افتخار کا تذکرہ تھا اور کچھ ذاتی اعلیٰ بھی تھی۔ بند تو مجھے یاد نہیں مگر ایک مصرع یاد رہ گیا ہے جس میں مرزا ذاکر اپنے متعلق فخریہ یہ کہہ گئے تھے۔

"جناب اوجؔ کا پوتا پسر رفیع کا ہوں"

اسی مجلس میں میر فرید جو خاندان انیسؔ کی نمائندگی پٹنہ میں کرتے تھے اور کرنل کلب علی خاں کے امام باڑے میں مجلسیں پڑھتے تھے وہ بھی منبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان پر ان بندوں کا کیا اثر ہوا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا مگر میرے دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ آج کی مجلس جو میر فرید کرنل صاحب کے امام باڑے میں پڑھیں گے، وہاں ضرور ان بندوں کا جواب ملے گا...... ہوا بھی یہی۔ امام باندی بیگم صاحبہ کے امام باڑے میں دس بجے دن میں مجلسیں شروع ہوتی تھیں اور ڈیڑھ بجے ختم ہو جاتی تھیں۔ سہ پہر میں چار بجے کرنل صاحب کے یہاں کی مجلسیں شروع ہوتی تھیں۔ میں وہاں پہونچا تو سارا امام باڑا سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ منبر کے پاس ہی مرزا طاہر رفیع مرحوم اور ان کے صاحبزادے مرزا ذاکر مرحوم بیٹھے ہوئے تھے۔ پیش خوانی ختم ہوتے ہی میر فرید منبر پر آئے اور انھوں نے بھی نیا مرثیہ شروع کیا۔ دو ایک ابتدائی بندوں کے بعد ایک بند پر پہونچے جو غالباً اسی دن انھوں نے کہہ کر اس مرثیہ کے بندوں کے ساتھ پیوست کیا تھا۔ یہ بند مجھے آج تک یاد ہے اور یہی مرزا ذاکر کے افتخار سے بندوں کا جواب ہے۔ میر فرید نے کس سلیقہ سے جواب دیا ہے آپ اسکو دیکھیں۔

یہ کہہ کے سب سے کہ ہم ہیں انیس کے پوتے ریاض نظم میں تخم غرور کیوں بوتے
علاوہ اس کے بزرگوں کی آبرو کھوتے مزا تو کہنے کا جب تھا کہ ہم بھی کچھ ہوتے
کہا اور نہ کہیں گے کہ ہم ہیں جان انیسؔ
زباں اگرچہ یہ کہدے کہ ہے زبان انیسؔ

مذہبی رسومات تو عقیدت کی چیزیں ہیں جس کا جی چاہے انکو ادا کیا کرے۔
جس طرح امام باڑوں میں مرثیہ خوانی سننے کے لئے ہندو شرفاء اور رؤسا دس دنوں تک عقیدت کے ساتھ جاتے تھے اور بڑھ بڑھ کر داد سخن دیتے تھے اسی طرح پٹنہ کے شریف گھروں کی زنانہ مجلسوں میں شریف ہندہ خواتین بھی جاتیں اور سوز خوانی اور نوحہ خوانی سنکر بے حد متاثر ہوتیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایسا اتحاد ایک رنگی شاید ہی کہیں نظر آتا ہو۔ عزاداری پر بھی پابندی نہیں اسی لئے محرم میں طوائفیں بھی بڑے خلوص واہتمام سے اپنے گھروں میں مجلسیں کرتی تھیں۔ حدیث خوانی بھی ہوتی اور مرثیہ خوانی بھی مگر سب سے زیادہ مخصوص چیز ان کے یہاں کی سوز خوانی اور نوحہ خوانی تھی کہ سننے والوں کے دل چھلنی ہو جاتے۔ سب مل کر ماتم کرتیں اور اس میں ایسی پٹس پڑتی کہ زمین و آسماں تھرا اٹھتے۔ ان کے یہاں کی مجلسوں میں بھی بڑا مجمع ہوتا رئیسوں اور شریفوں کے یہاں جاکر ان کو مدعو کرتیں اور حاضریاں بھی بڑی پر لطف تقسیم کرتیں۔ ایک دفعہ ایک بڑی مالدار اور مشہور طوائف بی چھٹن نے چاندی کے طباقوں میں مجلس کے ہزاروں حاضری کے حصے تقسیم کئے۔

نوحہ خوانی کے لئے پٹنہ میں دو جگہیں بہت مشہور تھیں ایک تو بیگم کا امام باڑہ جو چوک پر واقع ہے اور دوسرا ارزاں صاحب کا امام باڑہ۔ شہر کی نامی طوائفیں یہاں نواور دس کی راتوں میں نوحہ خوانی کرتیں دور دور سے لوگ ان کی سوز خوانی اور نوحہ خوانی سننے کو آتے تھے۔ بی کنیز کی نوحہ خوانی کا بڑا شہرہ تھا۔ غضب کی درد بھری آواز تھی کہ دل موم ہو کر پگھلنے لگتے تھے۔ آخر میں تائب ہو کر ایک شخص کی پابند ہو کر اس کے گھر بیٹھ گئی تھیں مگر محرم میں دو دن نوحہ خوانی کے لئے بیگم کے امام باڑے میں ضرور آتی تھیں۔ بیگم کا امام باڑہ چوک میں عین شاہراہ سے لگا ہوا واقع ہے۔ سننے والوں کا وہ ہجوم اور اژدہام ہوتا کہ گھنٹوں یہ شاہراہ بند ہو جاتی۔ اب بھی وہ امام باڑہ قائم ہے مگر سامنے سے لوگوں نے دکانیں بنا کر اس طرح اس کو گھیر دیا ہے کہ سڑک سے یہ امام باڑہ اب نظر نہیں آتا محرم کے دنوں میں احتراماً لوگ ایک تعزیہ رکھ دیتے ہیں۔ اب نہ وہ لوگ رہے اور نہ سوز خوانی رہی۔

شاہ چھیدی صاحب کی مرثیہ خوانی

ایک بزرگ شاہ چھیدی صاحب ضلع مونگیر کے ایک گاؤں پچنا کے رہنے والے میرے ماموں سید عبدالمجید صاحب مرحوم اور خاں بہادر سید ابراہیم حسین صاحب مرحوم کے پاس محلہ ٹیڑھی گھاٹ میں مستقل اقامت پذیر تھے۔ پڑھے لکھے تو زیادہ نہ تھے مگر بڑے ذہین، دور رس بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ اسی سبب سے ہر محفل کی روح رواں تھے، جہاں پہونچ گئے، بزم میں نئی روح آگئی۔ گفتگو کا انداز ایسا دلکش کہ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کر دیں تو اس میں سننے والوں کو صداقت ہی کا مزا ملے۔ پہلوانی، سپہ گری، شہہ سواری، شعر و شاعری اور موسیقی غرض ہر چیز میں ہر فن مولا بنے ہوئے تھے۔ گفتگو اور بحث میں ہر جگہ چھا جاتے تھے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ صرف ذہانت سے کام چلاتے تھے۔ کیونکہ ان کا علم صرف سنی سنائی باتوں ہی تک محدود تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے کے آدمی تھے۔ اہل کمال سے صحبت رہی تھی، باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ یہی ان کا مبلغ بہتوں کو پہلی ملاقات میں اکثر متاثر بھی کر دیتا تھا۔ آزاد تھے۔ شادی بیاہ کی جھنجھٹ سے آخر دم تک بھاگتے رہے۔ ہنستے ہنساتے زندگی بسر کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی زندگی میں ایک نمایاں انقلاب آیا۔ اللہ کی رحمت ان پر ایسی ہوئی کہ محبت رسولؐ میں یکدم متوالے ہو گئے۔ طبیعت بدلی تو لباس اور ماحول بھی بدلا۔ لانبی داڑھی، لانبا کرتا اور پیر میں تہہ بند سر پر گول چپکی ہوئی ٹوپی اور ہاتھ میں ہر وقت تسبیح۔ نماز کے بھی سختی سے پابند ہو گئے۔ نعت سنتے تو گریہ نہیں رکتا، روتے جاتے اور زبان سے ہر شعر کو دہراتے جاتے۔ طبیعت کی شگفتگی پھر بھی باقی تھی۔ اسی لئے ہر حال میں ہر دل عزیز ہی رہے۔ کچھ دنوں کے بعد حج کو گئے۔ حج کر چکے تو مدینہ طیبہ پہونچے۔ محبت رسولؐ نے وہاں ان کی دستگیری کی۔ آستانہ رسول کی جاروب کشی کی خدمت مل گئی اور مرے تو جنتہ البقیع میں ابدی آرام گاہ پائی۔ میں نے اپنے بچپن میں ان کا آخری دور دیکھا۔ اسی کے بعد وہ یہاں سے ہجرت کر گئے۔ جس

زمانے میں ان کی زندگی نے پلٹا نہیں کھایا تھا اور رنگِ صحبت ان کی طبیعت پر غالب تھا ان دنوں پٹنہ میں .مرزا اوجؔ کی مرثیہ خوانی کی بڑی دھوم تھی۔ ادھر پیارے صاحب رشید باؤلی کے امام باڑے میں مجلسیں پڑھنے کے سبب سے اپنی مجلسوں میں عقیدت مندوں اور صاحب ذوق حضرات کو گھسیٹتے رہتے تھے۔ شاہ چھیدی صاحب مرحوم بالا التزام ان دونوں جگہوں کی مجلسوں میں روزانہ شریک ہوتے۔ ایک دن امام باندی بیگم صاحبہ کے امام باڑے میں گئے تو منبر کے قریب ہی جگہ پا کر بیٹھ گئے۔ مرزا اوجؔ مرحوم نے مرثیہ خوانی شروع کی تو شاہ چھیدی صاحب مرحوم نے موقع موقع سے خوب خوب داد دی۔ ذہین بھی تھے اور خوش فہم بھی۔ داد پہونچ کر دیتے تھے۔ مرزا صاحب مجلس پڑھنے کے درمیان انہی کی طرف زیادہ مخاطب رہے۔ مجلس ختم ہوئی تو مرزا صاحب نے ان کو روک رکھا اور کہنے لگے۔ "مجھے اہل کمال اور صاحب ذوق حضرات کی ہمیشہ تلاش رہی۔ آج کل سخن سنجوں اور سخن فہموں کا فقدان نظر آتا ہے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے حقیقی خوشی ہوئی کہ پٹنہ اہل ذوق اور صاحب نظر سے خالی نہیں ہے؟ شاہ چھیدی صاحب نے اپنی تعریف سنی تو بڑی منکسر مزاجی سے جواب دیا" مرزا صاحب آپ تو آفتاب ہیں اور آفتاب کو آفتاب کہنا ہی پڑتا ہے اور میں تو ایک ذرہ بے مقدار ہوں، آپکی ایک نظر پڑی اور چمک اٹھا"۔ شاہ چھیدی صاحب مرحوم باتیں ایسی لوچدار کر رہے تھے کہ مرزا اوجؔ ان کے گرویدہ ہوتے گئے۔ سخن فہمی سے گفتگو سخن سنجی پر آنکلی تو مرزا صاحب نے شاہ چھیدی صاحب سے کہا "مجھے اب بڑا اشتیاق ہو گیا کہ آپ کا کلام سنوں آپ کی دور رس طبیعت اس کا پتہ دیتی ہے کہ آپ نے بھی مسدس یا مرثیہ ضرور کہا ہوگا۔" شاہ چھیدی صاحب مرحوم اب تو گھبرائے پول کھلتا ہوا معلوم ہونے لگا مگر آگے بڑھ کر اب پیچھے ہٹنا بھی مشکل نظر آتا تھا اس لئے بات کو ٹالنے کے لئے انکسار کو سپر بنایا اور بولے " آپ ہی جیسے باکمالوں کی صحبت میں رہ کر اشعار کی کچھ خوبیاں صرف سمجھ لیتا ہوں اور اس سے آگے کبھی بڑھا بھی نہیں۔ اگر کچھ کہا بھی ہوتا

تو آپ کے سامنے فروغ پانا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہوتا۔ مرزا صاحب ان کے انداز سخن فہمی سے متاثر ہو چکے تھے ان کو کیسے یقین آتا کہ شاہ چھیدی صاحب جو کہہ رہے ہیں وہ اصل واقعہ ہے، انکسار نہیں اب وہ اور بھی شدت سے اصرار کرنے لگے اور اس پر اتر آئے کہ شاہ چھیدی صاحب اپنا مسدس یا مرثیہ اسی امام باڑے میں ضرور پڑھیں۔ شاہ چھیدی صاحب اپنی بے بسی کا راز بھی زیادہ فاش نہیں کرنا چاہتے تھے مگر سخت پریشان بھی تھے۔ چھٹکارا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ آخر توکل بخدا دوسرے دن اپنا کہا ہوا مرثیہ امام باندی بیگم صاحبہ کے امام باڑے میں پڑھنے پر مجبوراً راضی ہوگئے۔ وعدہ کر کے چلے تو دل میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ معاً ایک بات ذہن میں آئی، مشکل آسان ہوتی نظر آئی، جی ہی جی میں بہت خوش ہوئے۔ سیدھے باؤلی ہال پہونچے جہاں پیارے صاحب رشیدؔ قیام پزیر تھے۔ میر صاحب فوراً دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے شاہ چھیدی صاحب نے ملازم سے اپنے آنے کی اطلاع کرائی۔ اگرچہ شاہ چھیدی صاحب کی جان پہچان نہ تھی مگر پیارے صاحب رشید نے فوراً ان کو اپنے کمرہ میں بلا لیا۔ بڑے اخلاق سے ملے اور آنیکی وجہ پوچھی۔ شاہ چھیدی صاحب نے صداقت کو رہبر بنایا۔ امام باندی بیگم صاحبہ کے یہاں کی مجلس میں جانے کا قصہ، وہاں اپنے داد دینے کی کیفیت اس سے متاثر ہو کر مرزا اوج کا یہ اصرار کہ اپنا کہا ہوا مرثیہ امام باڑے میں پڑھو۔ اس پر اپنی بے بضاعتی یہ سب کچھ حال بے کم وکاست کہہ سنایا اور آخر میں عرض کی کہ اب میری عزت و آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ اب تو زبردستی کا پڑھنا ہے۔ آپ دستگیری کریں تو عزت رہے۔ پیارے صاحب رشیدؔ یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے آپ مطلق نہ گھبرائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ سرخ رو رہیں گے۔ اس کے بعد اپنے ملازم کو آواز دی جب وہ آیا تو اپنے کلام کا بستہ اس سے طلب کیا۔ بستے میں متعدد مراثی تھے۔ پیارے صاحب رشید مرحوم نے ایک تقریباً مکمل نیا مرثیہ چن کر نکالا جو اب تک کسی مجلس کی زینت نہ ہوا تھا کچھ دیر اس پر نظر ثانی

کرتے رہے، کچھ بڑھایا کچھ گھٹایا پھر شاہ چھیدی صاحب مرحوم سے مخاطب ہو کر فرمایا
کہ لیجئے حضرت مرثیہ تیار ہے مگر آپ پہلے سارا مرثیہ دو چار مرتبہ میرے سامنے
پڑھیں۔ دیکھوں تو آپ کس طرح پڑھتے ہیں کیونکہ مرثیہ پڑھنا بھی ایک فن ہے۔
شاہ چھیدی مرحوم نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ذہانت ایک حد تک تو کام آئی مگر
پھر بھی مرثیہ میں پوری جان نہ آسکی۔ یہ دیکھا تو پیارے صاحب رشید نے ہر مصرعہ کو
خود پڑھنا شروع کیا۔ جگہ جگہ الفاظ پر زور دینا تیور سے معنی پیدا کرنا یہ بھی بتاتے
جاتے۔ کچھ دیر پڑھنے کے بعد اسی انداز میں شاہ چھیدی صاحب کو پڑھنے کی فہمائش کی۔
مرثیہ زیادہ طویل نہ تھا۔ تقریباً اسی پچاسی بندوں پر تمام ہوتا تھا پھر بھی ایک ہی دفعہ
پڑھنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔ رشید صاحب کی تشفی ہوئی تو پھر شاہ چھیدی صاحب
کو پڑھنے کو کہا غرض تین چار گھنٹوں میں مرثیہ پڑھنے کی تعلیم ختم ہوئی اور یہ گھنٹے رشید
صاحب نے زحمت اٹھا کر شاہ چھیدی صاحب کی تعلیم میں گذارے۔ اب شام ہو چلی
تھی۔ شاہ چھیدی صاحب کو تاکید کی کہ رات میں ضرور دو تین بار تنہائی میں مرثیہ
پڑھنے کی مشق کرلیں اور خدا حافظ کہہ کر ان کو رخصت کیا۔ شاہ چھیدی صاحب ٹیڑھی
گھاٹ واپس پہونچے۔ یہاں ان کے آنے کے قبل ہی یہ خبر پہونچ چکی تھی کہ شاہ
چھیدی صاحب کل گلزار باغ (امام باندی بیگم صاحبہ) کے امام باڑے میں اپنا کہا ہوا
مرثیہ پڑھیں گے۔ لوگ انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یہ آئیں تو ان کے قدم لیں۔
یارانِ طریقت کے مجمع کو دیکھ کر شاہ چھیدی صاحب نے دور ہی سے زور کا السلام علیکم
داغا اور سیدھے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ لوگ بھلا ان کو کب چھوڑنے والے تھے۔ اُدھر
یہ حضرات لپکے اور ادھر شاہ چھیدی صاحب غڑاپ اپنے کمرے میں داخل اور اندر سے
کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ لوگ دروازہ پیٹ رہے ہیں۔ انھوں نے پہلے تو بڑی احتیاط سے
مرثیہ کو اپنے بکس میں بند کیا۔ کپڑے اتارنے لگے تو کواڑ میں زلزلہ آیا۔ انھوں نے
لپک کر دروازہ کھولا تو پوری جماعت کمرہ کے اندر دھنس پڑی لوگوں نے گھیر لیا۔ کوئی

ہنس رہا ہے کوئی مسکرا کر کل آنے والے دن میں جو ان کی درگت بننے والی ہے اس پر تبصرہ کر رہا ہے؟ شاہ جی تم بُرے پھنسے اب کہاں جاؤ گے، مجلس خوانی آسان نہیں ہے اور پھر باورا مرثیہ کہاں سے رات بھر میں لاؤ گے۔ کبھی ایک شعر بھی تو کہا ہوتا یہ تو ایک کامل فن مشہور زمانہ استاد کے سامنے اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھنے کا امتحان ہے۔ شاہ چھیدی صاحب بڑے اطمینان سے مسکراتے جاتے ہیں۔ گھبراہٹ کا چہرے پر کہیں نام و نشان نہیں۔ میرے بڑے ماموں سید عبدالمجید صاحب نے شاہ چھیدی صاحب کے قریب آکر کہا کہ شاہ جی آخر یہ کیا مصیبت اپنے سر لگا لائے۔ تم نے مرثیہ پڑھنے پر رضا مندی کیوں ظاہر کی؟ اب کیا کرو گے؟ شاہ چھیدی صاحب نے کہا بھائی گھبراتے کیوں ہو۔ تم سبھوں نے ابھی تک میری قدر ہی نہ جانی۔ اے حضرت! میں ولی کامل ہوں۔ یہ ایک مرثیہ لکھنا کیا میں چاہوں تو سال بھر تک روزانہ نیا مرثیہ اپنا کہا ہوا پڑھ سکتا ہوں۔ اب تو لوگ کچھ اور بھی حیران ہوئے کہ نہ معلوم کیا بات ہے کہ شاہ چھیدی صاحب مطمئن بھی ہیں اور پہلے سے زیادہ ان کی زبان بھی تیز چل رہی ہے۔ لوگ گھسیٹ کر انکو باہر لائے۔ سائبان میں سب آکر بیٹھے تو شاہ چھیدی صاحب نے امام باندی بیگم صاحبہ کے یہاں کی مجلس کی روداد بیان کی کہ کس طرح مرزا اوجؔ صاحب سر ہو گئے کہ اپنا مسدس یا مرثیہ کل یہاں کے امام باڑے میں پڑھو۔ لوگوں نے پوچھا کہ اب کیا کرو گے؟ کہنے لگے پڑھوں گا اور ڈنکے کی چوٹ پر پڑھوں گا۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ لگا۔ شاہ چھیدی صاحب بولے کہ یارو ہنس لو مگر یہ نہیں دیکھتے کہ پٹنہ کی عزت پر آبنی ہے۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ آپ حضرات مل جل کر رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہہ دیں اور میرے حوالہ کر دیں کہ جاؤ پڑھو اور پٹنہ کی عزت رکھ لو۔ یہاں تو بس آوازے کسے جاتے ہیں۔ یہ میری عزت کا سوال نہیں عظیم آباد کی عزت کا سوال ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ میں عظیم آباد کی عزت پر حرف نہ آنے دوں گا بلکہ اس میں چار چاند لگا کر اس کو اور روشن کروں گا۔ میر عبدالمجید صاحب نے اکتا کر کہا "خیر

یہ بات تو تم نے ٹھیک ہی کہی کہ ایک حد تک تمہارے ساتھ عظیم آباد کی عزت کا بھی سوال پیدا ہو گیا ہے مگر مرثیہ لکھنا آسان نہیں اور پھر اتنے کم عرصہ میں ایک نیا مرثیہ لکھنا تو ناممکن بات ہے۔ اگر دو چار آدمی مل کر کہنے بیٹھیں تب بھی یہ مرثیہ رات بھر میں شاید مکمل نہ ہو سکے گا۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ واقعی تم کیا کرو گے؟ شاہ چھیدی صاحب نے کہا "کرونگا رات بھر میں خود ہی ایک نیا مرثیہ کہہ لوں گا مگر شرط یہ ہے کہ آپ لوگ مجھے تنہا چھوڑ دیں اور دق نہ کریں۔" سید ابراہیم حسین صاحب نے کہا کہ آپکا مرثیہ کہنا آپ کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں کیوں بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہے ہو۔ ایک بھی کہہ سکو تو غنیمت سمجھوں گا۔ شاہ چھیدی صاحب بگڑ گئے اور بھنا کر بول اٹھے۔ حضرت مثال تو آپ نے جوئے شیر لانے کی دی اور غالباً یہ سمجھ کر یہ مثال دی کہ یہ ناممکن کام ہے مگر جوئے شیر لائی بھی گئی، کوہ بے ستون کٹا بھی اور نہر نکلی بھی۔ غرض لوگ حیران ہی رہے اور شاہ چھیدی صاحب اٹھ کر بازار کی سیر کو نکل گئے۔ اس ہڑبونگ میں دن کا کھانا بھی غرہ ہی رہا تھا۔ پہلے تو ایک چائے والے کی دوکان پر پہونچ کر بسکٹ اور کباب کا سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ چائے پی پھر مٹر گشتی میں ادھر ادھر منڈلاتے رہے۔ نو دس بجے شب میں واپس آئے تو مجمع اسی طرح جمع ہوا تھا اور انہیں کا ذکر خیر جاری تھا۔ لوگ سخت حیران تھے کہ یہ حضرت کیا کریں گے۔ سمجھ میں بات نہیں آ رہی تھی۔ یہ پہونچے تو پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ کچھ دیر یہ بیٹھے رہے اور پھر سید ابراہیم حسین صاحب سے مخاطب ہو کر بولے "میں اپنے کمرہ میں جاتا ہوں مرثیہ لکھوں گا، بہت دیر ہو چکی ہے اب زیادہ مہلت بھی نہیں ہے۔ رات کے کھانے پر آپ اور مجید میاں میرا انتظار نہ کیجئے گا۔" یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آئے، دروازہ بند کیا اور لیمپ جلا کر آہستہ آہستہ مرثیہ خوانی کی مشق شروع کر دی۔ آدھی رات سے زیادہ تک یہ مشق جاری رہی۔ دوسرے دن لوگوں میں عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ شاہ چھیدی صاحب گلزار باغ کے امام باڑے میں

مرثیہ پڑھیں گے۔ ان کے ملنے جلنے والے کافی تھے وقت پر سب پرا باندھ کر امام باڑے میں پہونچے۔ جب یہ پہونچے تو سوز خوانی ہو رہی تھی۔ مرزا اوجؔ صاحب نے ان کو اپنے پاس بٹھایا۔ سوز خوانی ختم ہو چکی تو ان کو منبر پر جانیکا اشارہ کیا۔ شاہ چھیدی صاحب منبر پر پہونچے۔ بغل سے بستہ نکالا۔ جس میں متعدد کاغذات تہہ کئے ہوئے شامل رکھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی مرثیے ایک ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے الٹ پلٹ کر ایک ایک کو دیکھا اور بڑے اطمینان سے ایک کو چنا اور علیحدہ کر کے رکھا اور بقیہ کاغذات کو بستہ میں پھر لپیٹ دیا۔ درود شریف بلند آواز کے ساتھ پڑھی اور سامعین سے اپنے مرثیہ پڑھنے کی اجازت مانگی۔ ہر طرف سے آواز آئی ”بسم اللہ، بسم اللہ۔“ انھوں نے گلا صاف کیا اور ان کی مرثیہ خوانی شروع ہوئی کہ مرثیہ بھی لاجواب تھا اور ان کے پڑھنے کا انداز بھی دلکش تھا۔ ان کے چشم و ابرو کے اشارے بھی اتنے واضح تھے کہ پوری مجلس نقشِ حیرت بنی ہوئی اُن کو سن رہی تھی اور تعریفِ میں صَلِّ علیٰ صَلِّ علیٰ کا شور بیچ بیچ میں اٹھ رہا تھا۔ دو گھنٹوں میں مرثیہ ختم ہوا، یہ منبر سے اترے تو مرزا اوجؔ صاحب نے اٹھ کر گلے لگا لیا اور وہیں پر کھڑے کھڑے اعلان کیا آج وہ اپنا مرثیہ شاہ چھیدی صاحب کے بعد نہیں پڑھیں گے۔ کل سامعین متحیر تھے کہ ایسا صاحب کمال پٹنہ میں موجود تھا اور پٹنہ والے اس سے بے خبر تھے۔ سب سے زیادہ حیرت تو ان کے دوستوں کو تھی جو ان کی درگت بنتے دیکھنے آئے تھے اور اب خود ان کے معتقد ہو چلے تھے۔ شاہ چھیدی صاحب ان سبھوں کی نظر بچا کر نکل جانا چاہتے تھے۔ مجمع بہت بڑا تھا مگر یہ دو چار کا داد دیکھ کر نکل جانے میں کامیاب ہو ہی گئے اور وہاں سے سیدھے باؤلی ہال پہونچے۔ پیارے صاحب رشید مرحوم کو بھی بڑی تشویش تھی ان کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے۔ پوچھا کہ میاں کیا ہوا؟ یہ مؤدبانہ سلام کر کے آگے بڑھے اور کہا کہ حضور کا فیض تھا، ”معرکہ آپکا یہ طفل دبستان جیتا“ اس کے بعد مجلس کی کل حالت بیان کی۔ پیارے صاحب رشید حد سے زیادہ خوش ہوئے شاہ

چھیدی صاحب نے مرثیہ ان کی خدمت میں واپس کیا تو کہنے لگے کہ مرثیہ تو اب تمہارا ہو چکا اپنے پاس رکھو۔ شاہ چھیدی صاحب نے سلام کر کے مرثیہ واپس لے لیا اور اس طرح شاہ چھیدی صاحب کا یہ معرکہ بہ حسن و خوبی ختم ہوا۔ شاہ چھیدی صاحب اس کے بہت دنوں کے بعد ہجرت کر کے یہاں سے مکہ معظمہ گئے پھر دیار رسول ﷺ اکرم میں پہونچے وہاں آخری دم تک گنبد مزار اقدس کے چاروں طرف جا روب کشی کی خدمت انجام دیتے رہے اور مرے تو روضۃ البقیع میں جگہ ملی جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں۔ اپنے مرثیہ پڑھنے کا راز شاہ چھیدی صاحب نے کچھ دنوں بعد کھولا مگر اس مرثیہ کو آخر دم تک حرز جاں بنائے رہے۔ کسی کو چھونے بھی نہیں دیتے تھے۔ ان کے بعد نہ معلوم وہ مرثیہ کہاں رہا۔ یہ قصہ میں نے مولوی عبدالمجید صاحب مرحوم سے سنا جو میرے ماموں تھے۔



ہولی

رت بدلیگی، بسنت آئیگی، موسم اب معتدل ہوگا، گرم کپڑے اب اتریں گے، سفید کپڑوں کی اب بہار شروع ہوگی، رگوں میں منجمد خون پھر دوڑنے لگے گا اور امنگیں پروان چڑھینگیں۔ انہیں امیدوں میں جاڑوں سے ٹھٹھرے ہوئے ولولوں کو پناہ ملتی ہے۔ لیجئے بسنت آگئی، یہی ہولی کا پیش خیمہ ہے۔ رنگ کی پہلی چھینٹ کپڑوں پر پڑی، ابیر سے پہلی مرتبہ چہرے لال بھبوکا ہوئے۔ درختوں کی ویران اور افسردہ شاخوں میں خون بہار کی سرخی دوڑی، نئی نئی کونپلیں نکلنے لگیں، طبیعتوں میں سرور پیدا ہونے لگا اور ہوا جھوم جھوم کر چاروں طرف مستی بکھیرنے لگی۔ شاید اسی موقع پر غالبؔ نے کہا تھا۔

"ہے ہوا میں شراب کی تاثیر"

یہ ہولی کی خوش آمدید کے لئے قدرتی انتظامات ہیں۔ آج کل کی کاروباری زندگی میں کس کو فرصت ہے کہ فطرت کے ان عطیات سے دامن بھر لے مگر گذرے ہوئے زمانہ میں فطری رجحانات کا دل و دماغ پر قبضہ باقی تھا۔ اسی لئے پٹنہ میں بھی ہندو اور مسلمان ہولی کے رنگین کیف و سرور سے یکساں طور پر متکیف ہوتے تھے۔ پھاگن ختم ہونے میں چند دن باقی ہوتے کہ ہولی کا سیلاب امنڈ پڑتا۔ بہکے بہکے نغمے فضا میں تیرتے پھرتے "ہولی آج جلے چاہے کل" کی تانوں کے ساتھ ساتھ رنگ کی پچکاریاں چلنے لگتیں، قہقہے اچھلنے لگتے اور ابیر اور گلال سے ماحول گلنار ہو جاتا۔ مسلمانوں میں بھی رنگ پاشی کے جواز میں عجیب عجیب لطیفے تراشے گئے تھے۔ ایک صاحب جو پڑھے لکھے کم اور روائتی زیادہ تھے کہنے لگے "اجی حضرت! نبیؐ صاحب نے خود ہولی کھیلی ہے"۔ دوسرے صاحب نے کڑک کر اعتراض کیا "استغفر اللہ! یہ کیا آپ کہتے ہیں۔ ہولی اور نبیؐ صاحب! لاحول ولا قوۃ۔ یہ آپ نے کس سے سنا"۔ اگلے لوگوں سے "بات یہ تھی کہ ایرانیوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ان کے قومی تمدن کا ایک عنصر ان کے

اسلامی تمدن میں بھی نمایاں رہا اور جشن نوروز کے ساتھ ان کا جذباتی لگاؤ تھا جو آج تک ان کا قومی تہوار ہے۔ مسلمان جب ایران کی راہ سے ہندوستان آئے تو یہاں کی ہولی میں جشن نوروز کی مماثلت پائی اور یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کیونکہ ایران اور ہندوستان کے تمدن کا ماخذ ایک ہی تھا۔

عہد نایادگار کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ ہندوؤں اور ایرانیوں کے اجداد، جنکو تاریخ آریاؤں کے نام سے پکارتی ہے، پہلے اس خطہ ارض کے ساتھ رہتے تھے جو سال بھر برفستان رہتا تھا اور جس خطہ کو تاریخ تیقن کے ساتھ ٹھیک بتا نہیں سکتی ہے کہ وہ کون سا علاقہ تھا۔ کتاب آویستا (Avesta) میں اس علاقہ کا جو نام پایا جاتا ہے وہ "اریانا ویجا (AIRAYANA VAEJAH) ہے۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ آریاؤں کا قافلہ ضروریات زندگی کے دباؤ میں دکھن کی طرف بڑھتا گیا۔ یہ قافلہ جیوں جیوں آگے بڑھتا گیا، موسم خوشگوار ملتا گیا یہاں تک کہ نقطہ مساوات لیل و نہار EQUINEX کے قریب جب پہونچا تو وہاں کے موسم معتدل نظر آئے اور یہیں پہونچ کر ان قافلے والوں نے سال میں تین چار موسموں کی بنا ڈالی۔ یہاں سے اس قافلے کی ٹولیاں کچھ تو یورپ کی طرف بڑھیں، ان میں سے کچھ نے دوسری طرف رخ کیا اور ایک خطہ زمین کو آباد کر کے اس کا نام ایرانؔ رکھا بقیہ آگے پورب کی سمت بڑھ کر ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ ایرانی روایات کے مطابق کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جمشیدؔ شاہنشاہ ایران نے سیاروں کی چال کے مطابق ماہ وسال کی جنتری مرتب کرائی جس میں سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کرکے ہر مہینہ تیس دنوں کا رکھا اور سال کے آخری مہینہ میں پانچ دن اور جوڑ کر پورے سال میں تین سو پینسٹھ دن مقرر کیئے ۔ تقویم ماہ و سال پر جنتری بنانے کا موجد جمشیدؔ ہی کی بنائی ہوئی جنتری ملتی ہے جس کو بہت سی قوموں نے قبول کیا۔ سال کے اس دن میں جب کہ رات اور دن کی ساعتیں ہم پلہّ ہو جاتی ہیں جمشیدؔ نے ایران میں اس دن کو سال کا آغاز مقرر کر کے

نو روز کی بنا رکھی۔ نوروز کی تقریب میں وزراء امراء شاہی تخت شاہنشاہی کے نیچے جمع ہوتے، جہاں انعامات تقسیم ہوتے، راگ اور رنگ کی محفلیں جمتیں مئے ارغوانی کا دور چلتا۔ خود شاہنشاہ جمشید مساوات کے ساتھ اپنے امراء اور مقربین کی جھرمٹ میں نوروز کا جشن مناتا اور داد عیش و عشرت دیتا۔ ملک بھر میں اعلان کر دیا جاتا کہ ہر شخص نوروز کے دن جی کھول کر خوشیاں منائے، عالم کیف و سر مستی میں ایک دوسرے پر رنگ اچھالے، رقص و سرود کی محفلیں برپا کرے اور جام شراب کی کھنک آسمان تک پہونچائے۔ جشن نوروز کے موقع پر تمام ملک میں میکدے قائم کئے جاتے اور شراب دو آتشہ سے موسم کے کیف کو اور مکیف کیا جاتا۔ جمشید ہی کے عہد میں شراب پینے کی بنیاد پڑی اور پہلا جام شراب وہی تھا جو جمشید کے لئے بنا اور جس نے تاریخوں میں اور شعراء کے اشعار میں جام جمشید کہلا کر لافانی شہرت پائی۔ شاہنشاہ جمشید کی بنائی ہوئی جنتری کو ہندوستان نے بھی کچھ تغیر کے ساتھ اپنایا تھا اور اسی کے حساب پر تقریباً اپنے یہاں موسموں کا مدار قائم کیا تھا۔ اب غور سے دیکھئے تو لگ بھگ جو زمانہ ایران میں جشن نوروز منانے کا ہے وہی ہندوستان میں "ہولی" ...... منانے کا زمانہ ہے۔

اگرچہ ایرانی روائتوں نے نوروز اور ہولی کو مذہبی اور قومی تہواروں کا روپ دے دیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس موسم کا اعتدال جو فصل بہار کا پیامی ہے وہ طبیعتوں میں انبساط، انشراح، اور سرور کی کیفیتیں پیدا کر کے ماحول کو ایک جشن نشاط خود بنا دیتا ہے۔

ایرانی تہذیب و تمدن سے اثر پذیر جو مسلمان یہاں آئے انھوں نے یہاں کی ہولی دیکھ کر ہولی کے روپ میں اس جشن نوروز کا نقشہ دیکھا جس کو ایرانی مسلمان اپنا بنا چکے تھے شاہنشاہ بابر کے متعلق تاریخوں میں ہے کہ وہ کابل میں جشن نوروز کے موقع پر سنگ مرمر کے بڑے حوض کو شراب سے بھروا تا جس میں گلاب کی خوش رنگ پتیاں تیرتی رہتیں حوض کے گرداگرد ایرانی قالینیں بچھی رہتیں حوض کے کنارے چاروں طرف خوشنما جام شراب رکھے ہوتے۔ حوض کے مرمریں پتھروں پر خوبصورت حروف میں

خود باؔبر کا یہ شعر کھدا ہوا پیش نظر ہوتا۔

نو روز و نو بہار و مے دل ربا خوش است

باؔبر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یہاں باؔبر اپنے مصاحبوں کو ساتھ لیکر بیٹھتا، جام بھر بھر کر خود بھی پیتا اور ان کو بھی شراب پینے کی تاکید کرتا۔ باؔبر کے بعد ہندوستان میں اکبر اور جہانگیر اور دوسرے شہانِ مغلیہ نے ہولی کے ساتھ جشن نو روز کو بھی بڑا شاہانہ تقریب بنا کر قائم رکھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر ہولی ہندوستان کی تھی اس لئے ہندوستان کے ہر طبقہ میں چھائی رہی۔ پوجا پاٹ تو اس میں ہندوؤں کی چیز ہے وہ انہیں کے لئے مخصوص تھا۔ مگر اس کے نشاط و تفریح میں ہندو اور مسلمان دونوں ساتھ تھے۔ پھاگن کی آخری رات میں شہر کے تمام چوراہوں پر آگ کا الاؤ روشن کرتے۔ یہ ہولکا کے جلانے کی تقریب ہوتی اس کو اگجا کہتے۔ یہ دن ہندو دیومالا میں ہولکا کے جلنے کا دن ہے، ہولکا بدی کی دیوی کہی جاتی ہے۔ اس دن کی عام خوشی بدی پر نیکی کی فتح کی خوشی سمجھی جاتی اس طرح ہولی میں مذہب کا ایک عنصر بھی داخل کر لیا گیا۔

اگجا جلنے کے چند دن قبل ہی سے تمام شہروں میں ہولی منانے والوں کی ٹولیاں ترنگ میں ہولی گاتی ہوئی گشت کرتی پھرتیں۔ متعدد عجیب و غریب مضحکہ خیز جلوس نکالتے، طرح طرح کا سوانگ بھرتے اور ان سب میں ہندو مسلمان دونوں شریک رہتے۔ رات آتی تو گانے والوں کی ٹولیاں نکلتیں۔ گاتے بجاتے ہر جگہ کا چکر لگاتیں، دکانوں کے سامنے گاتیں، مجرا کرتیں اور انعام پاتیں، ان کے ساتھ ساتھ تماشہ بینوں کا ہجوم چلتا۔ رؤسا اور امراء کے مکانوں میں جاتیں اور وہاں بھی یہ ٹولیاں خوب خوب ہولی گاتیں، ناچ دکھاتیں اور وہاں سے بھی دامن بھر کر لوٹتیں۔ ناچنے اور گانے والوں میں کم سن لونڈے ہوتے جن کو پہلے ہی سے گانے اور ناچنے کی مشق کرائی جاتی اور اس موقع پر یہ عورتوں کا لباس پہن کر ایسا گاتے اور ناچتے کہ لوگ عش عش کرتے اور

ساتھ ہی ساتھ اس غضب کا بھاؤ بتاتے کہ رنڈیاں بھی شرما جاتیں۔ پھاگن ختم ہوتا تو ہولی جلتی اور چیت کی اس پہلی تاریخ میں دُھر کھیل کا طوفان اٹھتا۔ قمقموں اور پچکاریوں سے رنگ برنگ پانی کی دھاریں تیز ہو کر نکلنے لگتیں اس دن سڑکوں پر اور گلیوں میں رنگ اور ابیر سے اپنے کو بچا کر نکل جانا ناممکن تھا۔ نہ رنگ پاشی پر جھگڑا ہوتا اور نہ راہ چلتوں کے چہروں پر ابیر لگانے سے فساد اٹھتا۔ کسی ثقہ مسلمان پر نظر پڑتی تو اس عالم سر خوشی میں بھی یہ طوفان مچانے والے خود ہی مودبانہ سلام کر کے آگے بڑھ جاتے۔

اس دن صاحب مقدرت حضرات رنگ میں نہائے ہوئے گھروں سے سواریوں پر نکلتے۔ دوستوں کے گھر جاتے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے۔ یہ پہونچتے تو پھر دوستوں کے گھروں میں وہ رَن پڑتا کہ الامان۔ درو دیوار رنگ سے لالہ زار بن جاتے، فرش فروش رنگیں، در و دیوار رنگیں، بدن کے کپڑے رنگیں، چہرہ اور تمام بدن رنگیں حد تو یہ ہوتی کہ سر کے بال رنگیں۔ رنگین پانی میں گلاب اور کیوڑے کے عرق ملے ہوتے جن کی چھینٹوں میں صبح بہار کی لپٹیں آتیں۔ دن کے ساتھ یہ رنگیں طوفاں بھی ختم ہوتا۔ شام آتی تو سب دوست نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنتے۔ عزیزوں اور متوسلین کو ہولی کا انعام بانٹتے۔ رات آتی تو کسی ایک دوست کے مکان یا کسی باغ میں جہاں درختوں کی جھرمٹ میں خوشنما رہائشی بنگلہ ہوتا، سب دوست جمع ہوتے، طرح طرح کے پکوان پکتے۔ کھانا الگ الگ ٹولیوں میں ہوتا۔ ہندوؤں کا چوکا الگ، مسلمانوں کا دستر خوان الگ۔ طوائفیں اور ارباب نشاط شام ہوتے ہی موجود ہو جاتے کھانا ختم ہوتا تو رقص و سرود کی محفلیں چمک اٹھتیں اور رات جانے تک پورا ماحول لطف و کیف کے آغوش میں محو عشرت ہو جاتا۔ اس طرح متعدد جلسے رات بھر شہر میں برپا رہتے۔ ہولی کی تقریب میں مشاعرے بھی ہوتے جن میں ہولی سے متعلق نظمیں، رباعیاں، ابیات قصیدے اور غزلیں سب کچھ کہی جاتیں اور اخباروں میں چھپتیں۔ بہت دن ہوئے اخبار "اپنچ"" کا پرانا فائل الٹ رہا تھا کہ ہولی پر ایک غزل نظر

آئی جس کے دو شعر یاد رہ گئے۔ انہیں یہاں قلمبند کر رہا ہوں۔

کسی کے خون کی کرتی ہے جستجو ہولی
تلاش یار میں پھرتی ہے کو بہ کو ہولی
لگا دے یار کے دامن میں کچھ خیال نہ کر
مباح تیرے لئے ہے میرا لہو ہولی

ہولی میں مہاجنوں کے یہاں رات کے وقت جُوا ہوتا، چھوٹے داؤں سے آغاز ہوتا اور رات جاتے جاتے داؤں کی رقم ہزاروں تک پہونچ جاتی اور صبح ہوتے ہوتے لاکھوں کا نیارا ہو جاتا۔

جوہری اسی رات میں قیمتی جواہرات کی اپنے گھروں میں نمائش کرتے۔ اس سے دو مطلب نکلتے۔ ایک تو جواہرات کی نمائش اور دوسرے لچھمی جی کی پوجا بھی جو اس رات میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔ پوجا کے وقت ان کے بہت سے دوست مدعو ہوتے جن مین ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے۔

عید

تاریخوں میں ہے کہ جہانگیر نے عید کا چاند دیکھا، بغل میں نورجہاں بیگم تھیں۔ چاند کی طرف اشارہ کر کے خوشی میں بول اٹھے۔

"ہلال عید براوج فلک ہو یدا شد"

نورجہاں کب چوکنے والی تھیں، مسکرا کر برجستہ مصرعے پر مصرع لگایا۔

"کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد"

روزانہ دور کباب اور نورجہاں کے ہاتھ کا پیش کیا ہوا پیالہ شراب جو سلطنت کی قیمت تھی مہینہ بھر سے بند تھا اب اس کا سلسلہ پھر جاری ہونے والا تھا۔ جہانگیر کی خوشی کا کیا کہنا۔ یہ تو بادشاہ کی عید ہوئی مگر عام طور پر دیکھئے تو عید کی خوشی میں ہر مسلمان کا مساوی حصہ ہے۔ عورت، مرد، بچہ، جواں، بوڑھا، امیر غریب، شیخ، صائم الدھر اور رند خرابات سب کے لئے عید خوشی کا پیام لاتی ہے۔ ہر شخص بہ انداز وسعت مایۂ وظرف اور بمقدار پیمانہ و شوق عید کی خوشیاں مناتا ہے۔ آج کل کی طرح وہ اقتصادی بد حالی کا زمانہ نہ تھا اس لئے عید حقیقت میں عید ہوتی تھی۔ لوگ عید کی خوشی میں دوسروں کو بھی خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ جہاں مسلمان امراء اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے نئے نئے کپڑے بنواتے وہاں اپنے متوسلین اور ملازمین اور آس پاس کے غریب ہندؤں اور مسلمانوں کو بھی نہیں بھولتے تھے۔ ان کے متوسلین اور ملازمین میں بھی ہندو اور مسلمان کی تخصیص نہ تھی۔ دونوں کے لئے نئے کپڑے بنتے اور دونوں کو یکساں عید کے انعام ملتے۔ اسی طرح جو بھی غریب عید کی مبارکباد دینے کو آتا وہ بھی انعام اور کپڑے لے جاتا۔

عید کی صبح نہا دھو کر عید گاہ جانے کو گھر سے نکلتے تو ڈیوڑھی پر ہندو احباب کی بھیجی ہوئی ہر قسم کی سواریاں تیار ملتیں، انہیں سواریوں پر عید گاہ جاتے۔ ان میں فٹن بھی، لینڈو بھی اور بگھی گاڑیاں اور ہر طرح کی سواریاں ہوتیں۔ کسی میں فرد گھوڑا جتا ہوتا کسی میں جوڑی گھوڑوں کی ہوتی۔ اس سے پہلے کی بات ہے کہ تام جھام فنس جن کو کہار اٹھاتے تھے ان پر لوگ عید گاہ جاتے تھے۔ یہ بھی ہندو احباب کے یہاں سے آتے تھے ۔ عید گاہ سے واپس آتے تو کوچبانوں اور سائیسوں کو انعام دیکر رخصت کرتے۔ اس سے بڑھ کر محبت و خلوص کا کیا ثبوت ہوگا کہ فریضۂ عید کی ادائیگی میں بھی کچھ نہیں تو اس طرح ہندو احباب اپنی مسلمان دوستی کا ثبوت دیتے تھے۔ مسلمانوں کے گھروں کی سواریوں کو اس دن فرصت مل جاتی تھی۔ عید کی نماز پڑھ کر لوگ واپس ہوتے تو گھر پر عید ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ امیر بھی غریب ان میں ہندو بھی، مسلم بھی، عطر اور پان کے ساتھ پھلوں مٹھائیوں اور سوئیوں سے سبھوں کی تواضع کی جاتی۔ خوان کے خوان پھلوں اور مٹھائیوں سے لدے ہوئے ہندو احباب کے یہاں سے تحفے آتے رہتے۔ عید کے دن ہندو امراء بھی نئے کپڑے پہنتے اور اپنے مسلمان متوسلین اور ملازمین کو بھی کپڑے بانٹتے۔ گھروں کی خوب صفائی کراتے کہ مسلمان احباب ان سے عید ملنے آئیں تو ان کے گھر بھی صاف ستھرا پائیں۔ یہ آتے تو ان کے ساتھ عید کی خوشیاں مناتے۔ کہیں کہیں اس خوشی میں ہندو اپنے یہاں رقص و سرود کی محفل بھی سجاتے اور اس طرح بھی اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ عید مناتے۔ مسلمان گھر سے عید ملنے کو نکلتے تو ہندو اور مسلمان اپنے سب دوستوں کے یہاں جاتے۔ شام کو ہندو اپنے گھروں سے نکلتے کہ مسلمان دوستوں کو عید کی مبارکباد دیں۔ ان کے گھر پہونچے تو ہونٹوں پر عید کی مبارکباد کا تبسم ہوتا اور آتے ہی گلے سے چمٹ جاتے۔

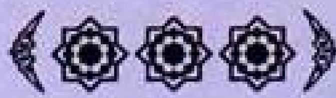
بقر عید میں بھی یہی سماں نظر آتا تھا۔ ایک بات میں پٹنہ ہمیشہ سے منفرد رہا ہے اور یہاں کے مسلمانوں کی رواداری کی یہ مثال اب بھی قائم ہے۔ پٹنہ میں

مسلمانوں نے ہندوؤں کے جذبات کے احترام میں گائے کی قربانیاں چھوڑ دی تھیں۔ پہلے کی طرح آج بھی ہر جگہ بکرے ہی ذبح ہوتے ہیں مگر یہ صرف بقرعید ہی کے لئے تھے۔ اس رواداری سے ایک مطلب اور بھی حل ہوتا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ غریب ہندو بھی قربانی کے گوشت کا حصہ گھر لے جا سکیں۔ آس پاس کے غریب مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے متعدد بکرے بھی ہر گھر میں ذبح کئے جاتے تھے اور ان کے سارے گوشت ان سبھوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ تین دنوں تک اس طرح بکرے ذبح کئے جاتے اور دوستوں کی ضیافتیں رہتیں۔ مدرسوں میں ہندو اور مسلمان دونوں پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب عید اور بقرعید میں عیدیاں لکھ کر ان کو دیتے اور سبھوں سے عید کا انعام وصول کرتے۔

بہت دنوں کی بات ہے غالباً ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء کا زمانہ ہوگا کہ ایک دفعہ کسی دوسرے شہر سے ایک شرماجی پٹنہ آئے۔ یہ تمام ہندوستان کا دورہ کرتے پھرتے تھے اور گاؤکشی کے انسداد کی طرف ہندوؤں کو متوجہ کرتے تھے۔ یہاں بھی آئے تو ہندوؤں کے جلسہ میں گائے کی عظمت اور تقدیس پر بڑا لانبا چوڑا لکچر دیا۔ خیر یہ تو عقیدہ کی بات تھی مگر انھوں نے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو سخت بُرا بھلا بھی کہا اور ہندوؤں کو تلقین کی کہ ہر قیمت پر وہ گائے کشی کو رکوائیں۔ شرماجی کی تقریر بڑی اشتعال انگیز تھی، مسلمان تو خیر چپ رہے مگر یہاں کے سربرآوردہ اور مخلص ہندو امراء اور رؤسا نے فوراً ہی ہندوؤں کا ایک بڑا جلسہ منعقد کیا اور اس میں شرماجی کی شر انگیزی کا جواب دیتے ہوئے لوگوں کو سمجھایا کہ وہ باہر سے آئے ہوئے فساد پھیلانے والوں کے جال میں نہ پھنسیں اور مدت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو بھائی چارہ کا رشتہ چلا آتا ہے اس کو ہر قیمت پر قائم رکھیں۔ اس سے بڑھ کر ان حضرات نے یہ کیا کہ سینکڑوں ہندوؤں سے دستخط لیکر ایک درخواست صاحبِ ضلع کے پاس بھیجدی کہ شرماجی کو پٹنہ سے باہر چلے جانے کا حکم فوراً نافذ کیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور شرماجی سیدھے

دوسرے شہر کو تشریف لے گئے۔

غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کا زمانہ تھا۔ آریہ سماجیوں کی سرگرمیاں پٹنہ میں بہت تیز ہو گئیں تھیں۔ ہر جگہ مذہبی بحث و مباحثہ کے دروازے کھل گئے تھے۔ بقر عید کا زمانہ آیا تو یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ پٹنہ کے دو محلے، بیگم پور اور شاہ گنج، جہاں سال بھر روزانہ بکرے اور گائیں ذبح ہوتی ہیں اور جہاں مذہبی مذبح بھی ہے۔ ہندو وہاں عین بقر عید کے دن مسلمانوں پر حملے کریں گے۔ ان دو محلوں کے لئے تمام شہر میں تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ بقر عید کی صبح ہوئی تو شاہ گنج کے مسلمانوں نے دیکھا کہ بابو دامودر پرشاد، جو پٹنہ کے بڑے ذی اثر اور متمول رئیس تھے، اپنے ہندو ملازمین کے ساتھ موجود ہیں اور مسلمانوں کو تسلی دے رہے ہیں کہ اگر ہندوؤں نے کچھ بھی زیادتی کی وہ مقابلہ کر لیں گے۔ اس لئے مسلمان اطمینان سے بقر عید کی نماز پڑھیں اور گھر پر خوشیاں منائیں اور قربانیاں کریں۔ ادھر تو بابو دامودر پرشاد آئے ادھر بیگم پور میں بابو بھگوت نرائن سنگھ اپنے لوگوں کو لیکر پہونچے اور اسی طرح وہاں کے مسلمانوں کو تسلیاں دیں۔ بقر عید کے دن ہنسی خوشی میں کٹ گئے۔ یہ تھا پہلے کا پٹنہ۔



چیت

ہمیں کیا ہوا کہ بدل گئے، بڑی حیرتوں کا مقام ہے
کہ وہی زمیں ہے وہی فلک وہی صبح ہے وہی شام ہے
(شاؔد عظیم آبادی)

حضرت شاد کی حیرت بجا تھی، انھوں نے بہت کچھ زمانے کو بدلتے ہوئے دیکھا تھا پھر بھی ان کے زمانہ میں اگلے تصورات باقی تھے۔ اگلے سماج کا مٹا مٹا سا نقشہ بھی قائم تھااور اس وقت بہت سے دلوں میں فطرت کے ودیعت کردہ لطیف احساسات بھی کبھی کبھی چٹکیاں لیتے رہتے تھے مگر آج تو وہ اگلا زمانہ مسخ ہو چکا ہے اور طبعیت انسانی نے جس تیزی کے ساتھ تغیّر پسندی کو اپنایا ہے اس پر آج ہمارے فطری رجحانات بھی خود محو حیرت ہیں۔ اس تغیر پسندی میں کچھ تو خارجی اثرات کا ہاتھ ہے اور کچھ خود طبعیت انسانی کے تلون کا جو تخریب اور تعمیر کے چکر میں گھروندے بناتا اور مٹاتا رہتا ہے ماحول کا ردّو بدل، سماج کا تغیر و تبدل، پرانی محفلوں کا اجڑتے جانا اور نئی محفلوں کا نئے انداز سے بسنا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ موسموں سے پیدا شدہ لطیف احساسات سے کبھی قربت کبھی دوری، یہ سب طبعیتِ انسانی کی تغیر پسندی کی دلیلیں نہیں تو اور کیا ہیں؟ ایک سماج کی بنیاد رکھی جاتی ہے پھر اس کو ڈھا کر دوسرا سماج بنایا جاتاہے، پھر تیسرا، چوتھا، ان سماجوں کی تخریب و تعمیر کی علامتیں بدلتی ہوئی طبعیت انسانی ہی میں ملتی ہیں۔ اسی کو دیکھئے کہ ہندوستان بھی وہی، ہندوستانی بھی وہی اور موسم کا الٹ پھیر بھی وہی مگر کتنی صحبتیں اجڑ گئیں، کتنی محفلیں ویران ہوگئیں، کتنے سماجی رسومات دفتر پارینہ بن کر رہ گئے اور کتنے ماہ و سال،اور موسموں سے منسوب و معنون رنگین اجتماعات ختم ہوگئے۔ پٹنہ کا چیت بھی گذرے ہوئے سماج میں سالانہ موسمی

تغیرات سے وابستہ، ولولوں کے پرچار کا رنگین طریقہ تھا۔ جب صبح و شام کی منزلیں برابر ہو کر معتدل ہو جائیں، جب جاڑے کی فصل گرمی کے موسم سے گلے مل کر رخصت ہو چکی ہوتی۔ جب درختوں کی شاخیں عریانی کا دور طئے کر کے سبز پوشاک کی منزل میں پہونچ جاتیں اور جب نئے موسم کی آمد پر غنچے خوشی سے کھلکھلا کر ہنستے اور پھول بن جاتے تو انسانی رگوں میں خون کی روانی بڑھ جاتی۔ روح میں بالیدگی آتی اور دلوں کی دھڑکنیں بھی اس طرح تیز ہو جاتیں کہ طبیعت فطرت کی لطافتوں کی طرف مائل ہو جائے۔ یہ بھی گذرے ہوئے دور کی بات ہے کہ جب چیت کا زمانہ آتا تھا تو اس کی تازہ اور عطر بردوش ہواؤں میں وہ کیف و سرور ملتا کہ دماغ کسل سے آزاد ہو کر لذت حیات کی کیفیتوں میں مست ہونے لگتا۔ رات میں نکھرے ہوئے آسمان پر ستاروں کی جب قندیلیں جل اٹھتیں تو ان کی خنک ضیاؤں میں کائنات کا حسن ابھرتا ہوا نظر آتا۔ چاند کی سحر انگیز چاندنی میں کسی کا مسکراتا ہوا چہرہ جھلک اٹھتا، رات کی خاموشی میں کبھی کی بھولی بسری یادیں، ماضی کے پردوں سے نکل کر دل میں کبھی گدگدی اور کبھی کسک پیدا کرنے لگتیں۔ اور گجردم موسم کی فضاؤں میں پپیہے کی پکار، اور کوئل کی کوک بے قرار دلوں کو سکون کے مرکز کی تلاش میں، سہارا بنتیں۔ آج بھی ہر سال چیت کا موسم آتا ہے مگر ایسے اب کتنے ہیں جن کو اس کی فضاؤں میں وہی دل کشی، اس کی بہاروں میں وہی جنون انگیزی اس کے گانوں میں وہی رس، وہی ولولہ، وہی سرور و کیف، وہی سوز و گداز اور مرکز سکون کی تلاش کی وہی ہوک دلوں میں ملتی ہے؟ اس کا سیدھا سادا جواب ہے کہ اگر چہ فطرت کے عطیات کا فیض اب بھی جاری ہے مگر جنون و عقل کے ربط کا زمانہ گذر چکا ہے خارجی اثرات نے ماحول اور طبیعتوں پر قبضہ کر کے جذبات کو مضمحل کر دیا ہے اور مادی ضروریات نے طبیعت انسانی کو فطرت کے لطیف جذبات، احساسات اور رجحانات کی طرف سے بڑی حد تک لاپرواہ بنا رکھا ہے۔ کاروباری دنیا میں سود و زیاں کا حساب سانس کی ہر آمد وشد سے لگایا جاتا ہے۔

یہاں تک تو چیت کے موسم میں فطری احساسات و رجحانات کا تعلق ہے مگر اس مہینہ میں جس طرح اس موسم کی آمد پر خوشی و سرمستی کی تقریب منائی جاتی ہے اس کا گہرا تعلق رامچندر جی کی تقریب پیدائش سے بھی ہے۔ رامچندر جی کی ذات عظمت تقدس کا عظیم مینار ہے اس کو بڑی تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے۔ ایسی دنیائے رنگ و بو میں رہ کر رامچندر جی کی فرض شناسی، وعدوں کا احترام بدی کی بے پناہ طاقتوں سے انکا ٹکراؤ اور اس پر فتح اور پھر بعد میں ان کی عدیم المثال قربانیاں ایسی ہیں جنھوں نے ان کو لافانی حیثیت دی اور ہندو مذہب نے ان کو ایک عظیم دیوتا کی حیثیت بخشی۔

چیت کا پُر بہار موسم تھا جب کہ گلشن و صحن گلشن کے علاوہ صحرائے پُر خار بھی فرش بہار بن جاتا ہے۔ عطر بیز ہواؤں میں مسرت کی خوشبو ملتی ہے، غنچے چٹکتے ہیں تو خوشی کے نغموں کی لے سنائی دیتی ہے اور ہر پھول گلستاں بہ کنار نظر آتا ہے۔ اسی ماحول میں رامچندر جی کی پیدائش اس مہینہ میں ہوئی۔ گویا یہ ماحول اور موسم پہلے ہی سے ان کی پیشوائی کا انتظام مکمل کر کے ان کے لئے چشم براہ تھے۔ بعد میں ان کی پیدائش کی اس تقریب کو اور بھی رنگین بنانے کیلئے یہاں کے لوگوں نے صرف فطرت کے عطیات ہی پر بس نہیں کیا بلکہ خود بھی اس مہینہ میں رقص و سرود کی محفلیں سجانے لگے اور سرود و انبساط کا بھرپور فیض اٹھانے لگے۔

پٹنہ میں جس طرح چیت منایا جاتا تھا اس کا بہت کچھ حال میں نے اگلے لوگوں سے سنا اور قدرے قلیل اس کی آخری جھلک میں نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھی ہے۔ ایک مہینہ کے لئے شہر بھر میں سینکڑوں ناچ گھر بن جاتے تمام رات رقص و سرود کی محفلیں برپا رہتیں۔ پھاگن کے ختم ہوتے ہی ہولی کا ہنگامہ چیت کی پُر کیف فضا میں گم ہو جاتا۔ دن بھر کاروباری زندگی کا شور شغف حسب دستور جاری رہتا مگر رات آتے ہی ماحول بدل جاتا۔ محلے محلے ناچ گھروں میں لوگ جمع ہونا شروع ہو جاتے، قدم قدم پر پھول بیچنے والے موتیا، چنبیلی اور موگرے کے ہار اور گجرے کچھ

ہاتھوں میں لٹکائے اور کچھ جھولیوں میں رکھے گشت لگاتے پھرتے۔ سڑکیں اور گلیاں پھولوں کی باس سے بسی رہتیں۔ شوقین چار چار پانچ پانچ ہار اور گجرے گلے میں ڈالے کچھ ہاتھوں میں لپیٹے پان والے کی دوکانوں پر بیٹھے خوش گپیاں کرتے ہوتے، کہیں ہم صحبتوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آتے۔ پان بیچنے والوں کی دوکانیں بھی آئینہ بند نظر آتیں، بڑے بڑے آئینوں کے ساتھ چاروں طرف خوبصورت تصویروں کے چوکھٹے بھی ٹنگے ہوتے۔ دوکانوں کی چھت میں کہیں خوبصورت قندیلیں ٹنگی ہوتیں، کہیں نفیس اور دیدہ زیب چھوٹے چھوٹے رنگ برنگی جھاڑ چھتگیر سے آویزاں ہوتے۔ دوکان کے پائیوں میں خوبصورت شیشے کی دیوار گیریں نصب ہوتیں۔ پھولوں کے گجروں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر چھتگیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح تانتے کہ پھولوں کا چھوٹا سا شامیانہ بن جاتا دوکان کے بیچوں بیچ پیتل کی بڑی سی چمکتی ہوئی چوکی ہوتی جس پر کیوڑے سے بسے ہوئے پیتل کے کتھ اور چونے کے جگ مگ پیالے، دوسرے بڑے پیالوں میں ترشی ہوئی سادہ اور چکنی ڈلیاں، خوبصورت تشتوں میں الائچی، لونگ اور پان کے دوسرے مسالے، دیدہ زیب شیشیوں میں کئی قسم کے پان کے ساتھ کھانے کے تمباکو، کسی میں زردہ کسی میں مطبق قوام، کسی میں مطبق گولیاں ایک تشت پر چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوئی سفید پانوں کی گلوریاں، ان سے الگ، ایک خوانچے میں بھیگے ہوئے سفید کپڑوں سے ڈھکے ہوئے سفید پانوں کی ڈھولیاں، تنبولی گاہکوں کو بنی ہوئی گلوریاں بھی اور فرمائش پر تازہ پان بھی دیتے جاتے۔ اور ان گاہکوں سے ناچ کی محفل میں گانے والیوں کی تعریف بھی کرتے جاتے۔ پان والوں کی دوکان میں دوچار خوبصورت پنجڑے بھی لٹکے ہوتے جن میں بلبل شاما، اور اِگن اپنی چہکاروں سے بازار کی گھما گھمی میں اور بھی گرمی پیدا کرتی رہتیں ان نغمہ طراز چڑیوں کے کچھ پنجڑے شوقین تنبولیوں کے ہوتے اور کچھ شوقین تماشہ بینوں کے ہوتے۔

سڑک پر کچھ گھومنے والے تماشہ بینوں کے ہاتھوں میں بھی بلبل شاما اور اگن کے پنجڑے ہوتے۔ ایسے خوبصورت کہ دیکھئے اور عش عش کیجئے۔ کسی میں اگر چاندی کے منقش پتر جڑے ہوتے تو کسی میں ہاتھی دانت کی پٹریاں لگی ہوتیں۔ بعض صاحب مقدرت شوقین ایسے بھی ہوتے کہ وہ پورا پنجڑہ چاندی کا بنواتے جس میں پٹریاں بھی چاندی کی اور پورا پنجڑہ بھی چاندی کے تاروں سے منڈھا ہوا ہوتا جس کے اوپری حصہ پر چاندی یا ہاتھی دانت کا ہینڈل (قبضہ) لگاتے۔ کسی پنجڑے پر مخمل کا زرنگار غلاف، کسی پر بنارسی پوت کا اور کسی پر کمخواب کا غلاف چڑھاتے اور ان پر پھولوں کے گجرے بڑی خوبصورتی سے چاروں طرف لپیٹ دیتے۔ ناچ گھروں میں جہاں شیشے کے خوبصورت جھاڑوں قندیلوں اور دیوار گیروں کی بہار ہوتی، وہاں متعدد اس طرح کے پنجڑے بھی آویزاں نظر آتے۔ ناچ اور گانے کے درمیان بلبل شاما اور اگن کی ترنم ریزیوں سے محفل کی گمک اور بڑھ جاتی۔

امراء اور ذی حیثیت لوگوں کے گھروں میں بھی چیت کی محفلیں سجائی جاتی مگر اصلی بہار تو ان محفلوں میں نظر آتی جو ہر محلہ میں ہر گلی میں اور ہر شاہراہ کے نکڑوں پر بنے ہوئے چیت کے ناچ گھروں میں رات بھر برپا رہتیں۔ یہاں امیر و غریب کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہتی۔ سبھی کی یکساں لطف اندوزیوں کے لئے یہ کھلی محفلیں سجائی جاتیں اور اس طرح پر عوام و خواص یکساں طور پر لطف اٹھاتے۔ ناچنے اور گانے والیوں کو سبھوں سے حسب مقدرت اتنی چھوٹ ملتی کہ دامن بھر جاتے تماشہ بینوں کی ٹولیاں ہر ناچ گھر کی سیر کرتی پھرتیں۔ ان کے لئے ہر محفل ان کی اپنی تھی جہاں رنجش اور عداوت کا شائبہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ جب صبح ہوتی اور محفلیں اٹھتیں تو ناچ گھر کے مہتمم فرش اور روشنی کے قیمتی سامان اٹھوا کر دن بھر کے لئے محفوظ جگہوں میں رکھوا دیتے۔ شام کے آتے آتے پھر سب سامان درست ہو جاتے اور رات کے بھیگتے بھیگتے پھر محفلیں مہک اٹھتیں۔ چیت کے یہ عوامی ناچ گھر اور یہ عوامی محفلیں اچھی گانے والی

طوائفوں کے لئے شہرت اور ان کی آئندہ کامیابی کا زینہ ہوتی تھیں۔ یہیں کے ناچ اور گانے سے ان کی شہرت پھیلتی جس سے بڑی بڑی جگہوں میں پہونچنے کی ان کو راہیں ملتیں۔

پٹنہ میں بروا منگل

مرزا پور کی کجری، پٹنہ کا چیت اور بنارس کا بروا منگل اپنی رنگینیوں کے باعث بہت مشہور تھے جن کو رفتہ رفتہ نئی تہذیب کی آندھیوں نے ختم ہی کر دیا۔ بنارس کا بروا منگل بھی اپنی ندرت اور دلکشی میں آپ اپنی مثال تھا۔ ولولوں کے اٹھنے کا موسم چیت، بنارس میں بروا منگل کے نکھار کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں جب گنگا کی لہروں میں سکون رہتا۔ اس کے دونوں کنارے سمٹ کر ایک دوسرے سے قریب ہونے کی کوشش کرتے اور اس کے شفاف پانی کی روانی میں صبح بنارس کا حسن تیرتا پھرتا تو بنارس کی راتوں کو بھی شام اودھ کی بہاروں سے سجاتے۔ دریا میں چار چار چھ چھ کشتیوں کو ایک دوسرے سے مضبوط باندھ کر بالکل آپس میں ملادیتے۔ پھر لکڑی کے لانبے اور چوڑے تختیوں سے کشتیوں کو اس طرح پاٹ دیتے کہ ایک بڑا وسیع اور مسطح اسٹیج بن جاتا۔ کشتیوں کے چاروں طرف مضبوط بانسوں کی باڑھ باندھ کر اوپر چھت قائم کرتے اس پر خوبصورت نمگیر سے لگاتے اور چھت میں رنگ برنگ شیشے کے جھاڑ، کونڈیاں، قندیلیں اور قمقمے آویزاں کرتے اور خوبصورت کپڑوں سے منڈھ کر اُن میں پھولدار پردے اور خوبصورت دیوار گیریں لگاتے۔ اسٹیج پر پُر تکلف فرش ہوتا۔ جھاڑ، کونڈیوں، قندیلوں اور دیوار گیروں میں مومی شمعیں نصب رہتیں۔ جن کی ٹھنڈی روشنی فانوسوں سے نکل کر نور پھیلاتی رہتی۔ کشتیوں کے اس بڑے اسٹیج پر ایک طرف معزز شوقین بیٹھتے، سامنے گانے والی طوائفوں کے لئے جگہ ہوتی۔ پچاسوں ملاح اس تخت رواں کو دریائے گنگا میں کبھی ڈانڈوں کے ذریعہ سے چلاتے کبھی گون پر کھینچ کے آگے بڑھاتے رات کے سناٹے میں سطح آب پر یہ پرستان کا نظارہ قابل دید ہوتا۔ ایسے

ایسے بہت سے ناچ گھر گنگا کی سطح پر تیرتے نظر آتے یہ طلسماتی منظر، یہ طریقۂ تفریح اور یہ انداز تعیش ایسا تھا کہ شوقین کھنچ کھنچ کر بنارس جاتے اور اس جشن عیش کی صحبتوں میں شریک ہوتے۔ غالباً ۱۹۰۹ء کا زمانہ تھا کہ کچھ حضرات کو پٹنہ میں بروا منگل منانے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے محرک ظفر نواب صاحب مرحوم گیا کے نامی رئیس اور میرے بڑے ماموں مولوی سید عبدالمجید صاحب مرحوم تھے۔ مولوی سید عبدالمجید محلہ ٹیڑھی گھاٹ میں رہتے تھے اور ان کے مکان کے پشتوں سے لگا ہوا دریائے گنگا بہتا تھا۔ یہ تحریک سامنے آئی تو بہت سے ہندو مسلمان روسائے پٹنہ پھڑک اٹھے۔ اس وقت پٹنہ کے تجارتی حلقوں میں حاجی اچھے خاں مرحوم اور حاجی منت خاں مرحوم کا بڑا دار دورہ تھا یہ دونوں بھائی بہت سی چیزوں کی تجارت کرتے تھے۔ براہ راست ولایت سے بھی تجارتی مال منگواتے تھے۔ پٹنہ اور کلکتہ میں ان کی متعدد تجارتی کوٹھیاں اور بڑی بڑی دوکانیں تھیں۔ اس وقت پٹنہ کے سب سے بڑے تاجر یہی دونوں بھائی تھے۔ حاجی منت خاں مرحوم اگرچہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر تجارت کا گر سب سے زیادہ انہیں کو معلوم تھا۔ بڑے بڑے تعلیم یافتہ عقلمند اور کامیاب تجار بھی ان کے سامنے طفل مکتب تھے۔ حاجی منت خاں مرحوم اخلاق، منکسر المزاجی اور ساتھ ہی ساتھ فیاضی اور سخاوت میں بھی مشہور تھے۔ ہر محفل اور ہر صحبت میں شریک رہتے اور ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ ہر صحبت میں شریک ہونے کا خود ان کو بھی شوق تھا۔ پٹنہ میں بروا منگل منانے کی اسکیم جب حاجی منت مرحوم نے سنی تو خود دوڑے ہوئے مولوی سید عبدالمجید صاحب کے پاس ٹیڑھی گھاٹ آئے۔ کشتیوں کو سجانے کے لئے کل سامان کی پیش کش کی۔ آپ کے یہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی ہر چیز کی تجارتی کوٹھیاں اور دکانیں تھیں۔ غرض جھاڑ فانوس، قندیلیں دیوار گیریں، شامیانے نمگیرے اور ہر طرح کے فرش و فروش بھی سب مہیا ہوگئے اور بنارس کے قاعدے پر کشتیاں سجائی گئیں۔ ایک نہیں کئی ناچ گھر الگ الگ کشتیوں کے تخت رواں پر بنکر تیار ہوگئے۔ شہر کے رؤسا اور

شوقین حضرات مدعو کیے گئے۔ نامی طوائفیں خود شوق میں امنڈی پڑتی تھیں۔ خوب محفلیں جمتیں اور رقص و سرود کے ہنگاموں میں شوقینوں کی کئی راتیں سینۂ دریا پر بسر ہوتیں۔ یہ سلسلہ دو یا تین سال چلا تھا کہ ایک سال جبکہ کشتیوں کے تخت رواں پر محفل نشاط شروع ہونے والی تھی۔ کچھ شوقین آچکے تھے۔ کچھ آنے والے تھے، ارباب نشاط کے طائفے بھی پہونچ چکے تھے، انتظار تھا کہ چند معزز حضرات پہونچ لیں تو ملاح ناچ گھروں کو کھے کر آگے بڑھائیں کہ اتنے میں یکایک تیز ہواؤں کا ایک جھونکا آیا تو لوگ متوحش تو ہوئے مگر بیٹھے رہے۔ مگر اب تو پے درپے تیز و تند جھونکے آنے لگے۔ آسمان تیرہ و تار ہو گیا۔ بدلیاں گھر آئیں، بجلیاں چمکنے لگیں اور وہ سخت طوفان اٹھا کہ الاماں الحفیظ۔ جھاڑ کنول اور قندیلیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ نمگیرے اور شامیانے اپنے بندھنوں سے ٹوٹ کر پھڑ پھڑانے لگے۔ غنیمت تھا کہ کشتیاں ابھی تک کنارے سے لگی ہوئی تھیں اور ان کے لنگر سطح زمین میں پیوست تھے، لوگ کشتیوں سے کود کود کر بھاگے، بہتوں نے پانی میں غوطہ کھایا طوائفوں کو گود میں اٹھا کر ملاحوں نے کنارے کی خشک زمین پر پہونچایا۔ منٹوں میں عشرت کی محفلیں عرصۂ قیامت بن گئیں۔ کچھ لوگ مجروح ہوئے مگر جانیں بچ گئیں۔ سارا نقصان حاجی منت خاں مرحوم کا ہوا کہ تقریباً ہزاروں روپے کے جھاڑ فانوس، قندیلیں، کونڈیاں اور دیوار گیریں اس طوفان میں چکنا چور ہو گئیں۔ اس کے بعد بروامنگل کا نظارہ پٹنہ میں نظر نہ آیا۔

دریائے گنگا کی سیر

گذرے ہوئے زمانے میں جبکہ یہاں کے رؤسا اور زمینداروں کے پاس دولت موجود تھی تو ان دنوں بجروں پر دریائے گنگا کی سیر بھی تفریحوں کی فہرست میں شامل تھی۔ ایسے رئیسوں اور دولتمندوں کے پاس دو ایک بجرے ضرور ہوتے تھے جن کے مکانات دریائے گنگا کنارے واقع ہوتے اور یہاں ایسے رئیسوں اور دولتمندوں کی

کمی نہ تھی۔ برسات کی طغیانی کے زمانے میں تو یہ حضرات بھرے ہوئے اور پھیلے ہوئے دریا کا نظارہ اپنے مکانوں کے پشتوں سے کرتے مگر جب جاڑے کے دن آتے اور اس کے بعد گرمی کا سہانا موسم آتا تو دونوں موسموں میں صبح دم یا شام کے سویرے میں اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو لیکر بجروں پر آبیٹھتے۔ ملاح ان بجروں کو کبھی پورب کی طرف دریا کے بہاؤ پر لیجاتے، کبھی پتواروں کے زور پر پچھم کی جانب کھیتے ہوئے آگے بڑھتے۔ گھنٹے دو گھنٹے کی سیر ہوتی۔ راستے میں دوسرے رئیس کے بجرے بھی ملتے۔ آپس میں وہیں صاحب سلامت ہوتی، پھر سیر کر کے واپس آجاتے۔ کبھی لانبا پروگرام بنتا تو دو بجرے ساتھ چلتے۔ ایک پر خود اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھتے۔ اسی پر گانے بجانے کا بھی سامان ساتھ رہتا۔ بجرے بھی بڑے قاعدہ سے بنے ہوتے۔ اندرونی حصہ بالکل بڑے خوبصورت کمرے کی طرح کیبن ہوتا جس میں کھڑکیاں لگی ہوتیں، ان کی کواڑوں میں خوبصورت شیشے جڑے ہوتے اور کھڑکیوں پر عمدہ قیمتی پردے پڑے ہوتے کہ جب چاہئے پردہ ہٹایئے، کھڑکیاں کھولئے اور سطح دریا سے تین چار فٹ اوپر بیٹھے ہوئے جھک کر ہاتھوں سے پانی اچھالتے جایئے۔ بجرے کے کیبن میں اس کی خوبصورت رنگین چوبی دیواروں میں جگہ جگہ شیشے کی عمدہ دیوار گیریں لگی ہوتیں، فرش پر قالینوں کے فرش ہوتے جن پر ہر طرف گاؤ تکیئے رکھے ہوتے۔ اس کیبن کے چاروں طرف ۱ر۲ -۲ فٹ چوڑے لکڑی کے بنچ اس کی چوبی دیواروں سے ملحق ہوتے۔ ان پر بھی خوبصورت گدے پڑے ہوتے کچھ لوگ فرش پر بیٹھتے یہیں دن میں گانا ہوتا، تاش شطرنج چوسر اور گنجفے کھیلتے جاتے، دوپہر میں کھانا بھی یہیں کھاتے۔ اگر جاڑے کے دن ہوتے تو بجرے کی کھلی ہوئی چھت پر جس کی چاروں طرف روک کے لئے خوبصورت کٹہرے لگے ہوتے۔ وہیں قالین کے فرش بچھائے جاتے وہیں دھوپ کا لطف اٹھاتے۔ صبح کا سماں بھی دیکھتے اور شام کی بہار بھی لوٹتے۔ گرمیوں میں صبح اور شام کے وقت چھت پر لوگ آکر بیٹھتے۔ اس بجرے کے پچھلے حصہ میں کافی جگہ چھوڑ دی جاتی تھی اور

کچھ جگہ اگلے حصہ میں بھی چھٹی رہتی تھی۔ انہیں جگہوں میں بیٹھ کر ملاح بجرے کو کھیتے تھے۔ اس بجرے کے ساتھ ساتھ دوسرا بجرا چلتا تھا جو معمولی درجہ کا ہوتا تھا۔ یہیں باورچی اور دوسرے ملازمین وغیرہ رہتے تھے، یہیں کھانے پکتے اور دوسرے بجرے پر لے جائے جاتے۔ رات میں واپسی ہوتی، کبھی اگر شکار کا پروگرام بنتا تو کسی دیارے کے قریب بجرے کا پڑاؤ ہوتا۔ یہیں علی الصباح شکاریوں کی ٹولیاں پرندوں کے شکار کے لئے نکلتیں اکثر شاہ آباد کے دیاروں میں، ہرن، چیتا اور نیل گائیں بھی ملتیں، ان کا بھی شکار ہوتا۔ شکار کے پروگرام میں دو تین دن لگ جاتے اس کے بعد لوگ واپس آتے۔ بجرے پر دریا کے کنارے کی سیر کا لطف تو ملتا ہی تھا مگر پٹنہ کی سیر میں یہ بہار بھی نظر آتی تھی کہ ایک کے بعد ایک دریا کے کنارے طرح طرح کے مستحکم پشتے ملتے جاتے۔ کچھ تو دلند یزوں اور مغلیہ دور حکومت کے زمانے کے پشتے۔ نہانے کے لئے پختہ اور خوبصورت گھاٹ بھی ان سے لگے ہوتے۔ مندر جہاں صبح کے وقت پوجا کرنے والے اور پوجا کرنے والیوں کی بھیڑ لگی رہتی، گھاٹوں پر صبح دم اشنان کا منظر بھی صبح بنارس سے کم دلکش اور نظر فریب نہ ہوتا تھا۔ انہیں گھاٹوں اور مندروں سے متصل کہیں کہیں مسجدیں بھی ملتی جاتیں جن کے مینارے آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے نظر آتے۔

میری یاد میں بھی دو ایک رئیسوں کے پاس عمدہ قسم کے اچھے بجرے باقی رہ گئے تھے ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں جو میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ ایک دفعہ میرے بڑے ماموں مولوی سید عبدالمجید صاحب اور دوسرے ماموں خان بہادر سید ابراہیم حسین صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ دریا کی سیر کے لئے لے گئے، یہ جاڑوں کے دن تھے، پروگرام دن بھر کا تھا۔ میرے دونوں ماموں کے کچھ دوست بھی ساتھ تھے۔ دعوت کا اہتمام بھی خوب تھا اور گانے بجانے کا سامان بھی تھا۔ دوسرے چھوٹے بجرے پر باورچی اور دیگر ملازمین تھے۔ صبح کے دھند لکے ہی میں سب دوست احباب میرے ماموں صاحبان کے

یہاں محلہ ٹیڑھی گھاٹ آگئے۔ یہیں گھاٹ پر دونوں بجرے لگے ہوئے تھے۔ سب لوگ بجرے کے سیلون میں جاکر بیٹھے۔ چائے کا دور چلا، یہ ختم ہوا تو بجرے کھلے۔ اب سورج بھی افق مشرق سے جھانکنے لگا تھا۔ رائے یہ ہوئی کہ بجرے کی چھت پر فرش بچھے، صبح کا ناشتہ وہیں ہو۔ بات کی بات میں چھت پر فرش بچھ گئے۔ گرم کپڑے پہنے اونی چادریں لپیٹے سب اوپر آئے۔ بجرے دریا کے بہاؤ پر جارہے تھے۔ پروگرام یہ طئے تھا کہ راستے میں دیارے ملتے جائیں گے وہاں بجرے سے اتر کر قاز، مرغابیاں اور سرخاب کا شکار کرتے ہوئے کچی درگاہ جاکر رکیں گے۔ دوپہر کا کھانا اور پرندوں کے شکار کے گوشت بجرے ہی پر پکیں گے۔ پھر بجرے سے اتر کر بالو کے وسیع میدان میں دیارے پر فرش بچھیں گے اور دوپہر کا کھانا وہیں ہوگا۔ سب کام پروگرام کے مطابق ہوتا گیا۔ پرندوں کے شکار بھی خوب ہوئے، وقت سے کچی درگاہ بھی پہونچ گئے، درگاہ کے سامنے دیارے پر فرش بھی بچھ گئے۔ پرندوں کے کباب تیار ہونے لگے، کچھ دیر کے بعد دسترخوان بچھا، سبھوں نے کھانے بھی کھائے کباب بھی کھائے جو مزیدار تو ضرور تھے مگر خوب گل نہ سکے تھے۔ اس کے بعد بجرے کے ذریعہ کچی درگاہ پہونچے اور نماز ادا کیں، اس سے فارغ ہوئے تو حضرت مخدوم شہاب الدین جگجوت علیہ الرحمتہ کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھی۔ مزار شریف پر حاضری دیکر واپس آئے تو چائے تیار ملی اب واپسی کا سامان ہونے لگا۔ دریا کے بہاؤ کے خلاف جانا تھا، امید تھی کہ راستے میں رات تو ضرور ہوجائے گی مگر آٹھ نو بجے تک گھر پہونچ جائیں گے۔ چاندنی رات تھی اس لئے ملاحوں کی بھی ہمت بلند تھی۔ مغرب کا وقت بھی جلد ہی آگیا۔ رات میں سب کیبن میں آکر بیٹھے دیوار گیروں میں مومی بتیاں جلوا دی گئیں۔ ستار طنبورے، سارنگیاں اور طبلے بھی آگئے ساتھ میں جولوگ فن موسیقی کے ماہر تھے، جم کر بیٹھ گئے اور تانیں اڑانے لگے۔ یہ خاص احباب کی جماعت تھی، سب ہی بے تکلف دوست تھے۔ گانے والے کھل کر گارہے تھے اور ساز بجانے کے ماہر بھی اپنا کمال دکھا رہے

تھے۔ رات کے سناٹے میں تانیں ابھر ابھر کر فضا میں چار جانب پھیل رہی تھیں۔ بڑے مزے کی صحبت تھی، لوگ محویت کے ساتھ گانے کا لطف اٹھا رہے تھے کہ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ بجرا کسی بھاری چیز سے ٹکرایا۔ پورے بجرے میں زور کا تو نہیں مگر ہلکا دھکا لگا۔ لوگ گھبرا اٹھے کچھ لوگ کیبن سے باہر نکل آئے دیکھا کہ چار پانچ ملاح دریا میں اتر چکے ہیں، بجرا رکا کھڑا تھا اور ملاح دریا میں غوطہ لگا کر اِدھر ادھر ابھر رہے تھے سبھوں کو تشویش تھی کہ کیا معاملہ پیش آیا تھوڑی دیر کے بعد ایک ملاح بجرے پر آیا اور اس نے بتایا کہ ایک بڑا سا درخت نہ جانے کس طرح دریا میں اَٹک رہ گیا ہے۔ بجرے کی یہ ٹکر اسی درخت سے تھی۔ گھبرانے کی کوئی بات تو نہیں ہے مگر بجرے کو ہٹا کر اور دور لے جاکر پھر آگے بڑھنا ہوگا۔ اس کے بعد دونوں بجرے کے دس بارہ ملاح پانی میں اتر گئے اور پانی ہی میں بجرے کو گونج کے رسے کے ذریعہ دوسری سمتوں میں کھینچ کھینچ کر بجروں کو اس جگہ سے دور لے جانے لگے۔ بہاؤ کے خلاف چلنا تھا اور غوطہ لگا کر پھنسے ہوئے اس بڑے درخت سے بجروں کو علیحدہ کرنا تھا۔ اس کام میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ رات کے تقریباً ۹ بجے گئے ہوں گے۔ اب بجرے پھر روانہ ہوئے۔ رائے یہ ہوئی کہ قلعہ سے لگے گھاٹ پر بجرے روک دیئے جائیں تو بہتر ہوگا ورنہ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل کا پچھم کا راستہ ٹیڑھی گھاٹ تک طئے کرنا رات کے وقت ڈیڑھ گھنٹہ اور لے لیگا۔ ملاحوں سے یہ بات کہی گئی تو انھوں نے کہا سرکار دیر تو گھر جانے میں ضرور لگے گی مگر ٹیڑھی گھاٹ ہی پر بجروں کا رکنا بہتر ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ قلعہ کے گھاٹ پر پانی کا توڑ اور بہاؤ بہت تیز و تند رہتا ہے، ایک تو یہ کہ گھاٹ دریا میں دور تک نکلا ہوا چلا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہیں پر دریائے گنگا کا رخ بھی مڑا ہے جس کے سبب سے یہاں دریا کا بہاؤ تیز رہتا ہے۔ یہاں تو دیر ہو جانے کے سبب لوگ گھبرا گئے تھے۔ ساتھ جو کچھ کھانے پینے کا سامان تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ رات زیادہ آجانے سے سردی کے بڑھ جانے کا بھی خیال تھا۔ پاس میں صرف اونی چادریں تھیں۔

اس لئے بیچارے ملاحوں کی رائے نہ مانی گئی۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب قلعہ گھاٹ کی روشنی نظر آئی پہلے ہی کچھ ملاح دریا میں اتر گئے اور بجروں کو گونج کے رسّوں سے کھینچ کر بیچ دریا سے کنارے پر لانے لگے۔ بجرے بیچ دریا سے کھینچ کر گھاٹ کے قریب تک تو آگئے مگر گھاٹ تک پہونچنے میں دریا کے پانی کے توڑ اور اس کے بہاؤ کا مقابلہ بہت سخت تھا۔ تقریباً بیس ملاح ہوں گے جو اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈالے ہوئے بجروں کو گھاٹ تک لانے کی حتیٰ الامکان کوشش کر رہے تھے۔ بجرے اگر دو چار ہاتھ کی طرف بڑھتے تو پھر یکایک پانی کا توڑ اس کو دس بارہ ہاتھ دور پھینک دیتا۔ ملاح بیچاروں کی عجب مشکل میں جان تھی اور سب لوگ اپنی بیوقوفی پر نادم تھے۔ نہ معلوم ہم سبھوں کا اور بیچارے ملاحوں کا کیا حشر ہونا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ قریب ہی دریا کے کنارے اور قلعہ کے گھاٹ سے کچھ دور پر بڑی بڑی کشتیاں لگی ہوئی تھیں، ان کے ملاحوں نے بجروں کے ملاحوں کا ہنگامہ سنا تو زور سے پکار کر ہنگامے کی وجہ پوچھی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ دریا کا تیز دھارا بجروں کو کنارے تک آنے نہیں دیتا تو دو بڑی کشتیاں کو لیکر وہ آگے بڑھے۔ اس وقت ان کی مدد بڑے کام آئی۔ بجرے کے ملاح اور پھر ان دو کشتیوں کے مانجھیوں نے کھینچ تان کر آخر بجرون کو قلعہ کے گھاٹ تک پہونچایا۔ اور وہیں لنگر ڈال دیا۔ اس پریشانی میں رات کے دو بج چکے تھے۔ اللہ اللہ کر کے ہم سب بجرے سے اترے۔ کچھ ملازمین وہیں بجروں پر رہ گئے۔ سارے سامان بھی وہیں بجرے پر تھے۔ سڑک تک پہونچے تو کرائے کی گاڑیاں بھی مل گئیں جن پر سوار ہو کر گھر تک پہونچے۔ میں تو بھوک سے زیادہ نیند سے پریشان تھا۔ آتے ہی سو گیا ہمارے بزرگ حضرات نہ معلوم کب تک جاگتے رہے۔

میلے

پٹنہ کی باڑھنی اور تیراکی کا میلہ

پٹنہ کی آبادی بھی عجیب طریقہ پر ہے۔ اس کے دکھن میں نشیب زمینیں میلوں پورب پچھم چلی گئی ہیں جن میں پن پن ندی اور دریائے سون کا پانی امنڈ کر برسات میں بھر جاتا ہے اور اک لخت یہ زمینیں ایک بڑے چوڑے اور لانبے دریا کا نظارہ پیش کرنے لگتی ہیں۔ اس خطہ کو پٹنہ والے جلا کہتے ہیں۔ پٹنہ کے اتر میں خاص دریائے گنگا ہے۔ جس میں دریائے سون اور دریائے گنڈک کا سنگم پٹنہ کے قریب ہی ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ برسات کے زمانہ میں دریائے گنگا پھیل کر چوڑائی میں پانچ چھ میل چوڑا ہو جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ برسات میں اتر اور دکھن دو وسیع خطہ آب سے گھرے ہوئے پٹنہ کو جب پہلی مرتبہ شیخ علی حزیں نے دیکھا تو گھبرائے اور الٹے پاؤں بنارس واپس جاکر دم لیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب جلا میں سیلاب آتا ہے تو دریائے گنگا میں سیلاب کی طغیانی کم ہو جاتی ہے اور جب دریائے گنگا امنڈنے لگتا ہے تو جلا کا پانی اتار پر آجاتا ہے۔ عظیم آباد کا شہر جب بن کر تیار ہوا تو اس کے پچھم دو دروازے شہر میں داخلے کے لئے بنائے گئے تھے۔ دروازے زمانہ ہوا۔ غائب ہو گئے مگر ان کے نام پر دو محلّے اب تک مشہور ہیں ایک پچھم دروازہ کہلاتا ہے اور دوسرا پورب دروازہ۔ پورب دروازے سے ملی ہوئی ایک نہر نکالی گئی تھی جس کے ذریعہ سے جلا کا طغیانی میں آیا ہوا پانی دریائے گنگا میں جاکر گرتا تھا۔ برسات کے بھرپور دنوں میں جب اس نہر کا پانی امنڈتا تو اس کے کناروں پر باڑھنی کے میلے جمتے تھے۔ باڑھ سیلاب کو کہتے ہیں۔ اسی لحاظ سے باڑھنی سیلاب کے پانی کو کہتے ہیں۔ نہر کے دونوں کناروں پر ہر قسم کی سینکڑوں دوکانیں لگ جاتیں۔ برسات کی بارش سے بچنے کے لئے موم جاموں

سے ان دوکانوں کو اور ان کی چھتوں کو منڈھتے۔ جگہ جگہ میلے کا لطف اٹھانے کے لئے رؤسا اور عمائدین کے خیمے کھڑے کئے جاتے ہیں جہاں دعوتیں بھی ہوتیں اور ناچ گانے کا سامان بھی ہوتا۔ مگر اس میلے کا اصل لطف تو گھڑنائیوں سے تھا جو کافی تعداد میں بجی سجائی نہر میں تیرتی پھرتی تھیں۔ گھڑنائی کی ہیئت ترکیبی بھی سن لیجئے۔ کہیں چالیس، کہیں پچاس، کہیں اس سے بھی کم، مٹی کے گھڑوں کو اوندھا کران کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط باندھ کران پر بانس کی ٹھٹھریاں رکھ کر کستے پھر اس کی سطح کو تر مٹی ڈال کر درست کرتے۔ اور جب گھڑوں کا یہ پلیٹ فارم تیار ہوجاتا تو اس پر خوبصورت بنگلے کا ڈھانچہ بانس یا سبک لکڑیوں سے بناتے پھر اس بنگلے کی چھت اور دیواروں کو خوبصورت کپڑوں سے منڈھتے اور ان میں گوٹے پٹھے، بانکڑیاں اور چمکیں ٹانکتے جس سے اس بنگلے کی خوبصورتی اور دلکشی بڑھ جاتی۔ اس بنگلے کے اندرونی حصے میں شیشے کے جھاڑ کونڈیاں قمقمے لٹکاتے۔ دروازوں میں خوبصورت پردے لگا کر ان کو سجتے ان سب گھڑنائیوں میں رقص وسرود کی محفلیں برپا رہتیں۔ نہر کے پانی میں تیرتے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے بیسوں ناچ گھر بنارس کے بروا منگل کی تصویریں پیش کرتے رہتے تھے۔ یہی باڑھنی کا میلہ تھا جس پر پٹنہ والے جان دیتے تھے اور انہیں سے اس میلے کی رنگینیاں تھیں۔

یہ میلہ ساون میں وقفے کے ساتھ چلتا رہتا۔ جب دو چار دن کی جھڑی لگتی تو گھڑنائیوں کو نہر کے کنارے لاکر باندھ دیتے سامان اٹھا کر گھر لے جاتے، دوکانیں بھی اس موقع پر اٹھ جاتیں مگر جیسے ہی بارش ہلکی ہونے لگتی یا بند ہوجاتی تو پھر باڑھنی کا میلہ اپنے شباب پر آجاتا۔ زمانہ ہوا کہ باڑھنی کا میلہ ختم ہوچکا ہے کیونکہ نہر بھی مٹی سے بھرتے بھرتے اب صرف ایک نالے کی شکل میں رہ گئی ہے۔ انہی برسات کے دنوں میں تیراکی کے میلے بھی لگتے تھے جس کو تیراکی کا مقابلہ (میچ) کہئے تو بجا ہے۔ جب دریا چڑھا ہوا ہوتا ہے اس کی موجیں چار چار فٹ اوپر اٹھتیں اور گرتیں ہیں پانی کی

روانی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ دھارے کے خلاف بڑی بڑی کشتیاں بھی بڑی مشکل سے ملاحوں کی گونج پر آگے بڑھ سکتی ہیں اور دریائے گنگا کا پاٹ پھیل کر پانچ چھ میل چوڑا ہو جاتا ہے، ایسے میں دریا کو تیر کر پار ہونا بھی ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے۔ مگر اس وقت کے منچلے مشاق تیراک ایسے تھے جو دریا کی طغیانی کو خطرہ میں نہیں لاتے تھے۔ خطرے میں پڑنا ہی ان کے ولولوں کو تسکین دیتا تھا۔ اونچے اونچے پشتوں سے دریا میں چھلانگ لگاتے، تیراکی کے کرتب دکھاتے اور اپنے دم خم سے سیلاب سے امنڈتے ہوئے پانچ چھ میل کے چوڑے دریائے گنگا کو عبور کر کے اسی دم خم کے ساتھ فوراً تیرتے ہوئے واپس آجاتے۔ شہر عظیم آباد سے لگے ہوئے دریائے گنگا کے کنارے جو مسلسل پشتوں کی بہار ہے، وہ دوسرے شہروں میں، جو دریا کے کنارے آباد ہیں نظر نہ آئے گی۔ یہ پشتے کہیں پر تو ایک سے ایک لگے ہوئے ہیں اور کہیں تھوڑی فصل پر۔ یہ پشتے پٹنہ کالج کے قریب سے شروع ہوتے تھے اور ان کا سلسلہ دریائے گنگا کے کنارے پانچ چھ میل پورب کی طرف بڑھتے ہوئے محلہ مال سلامی سے بھی آگے حضرت پیر دمڑیا کے مزار شریف سے لگے ہوئے پختہ پشتہ کے بعد کچھ اور دور تک جاکر ختم ہوتا تھا۔ اسٹیمر یا کشتی سے اگر بانکی پور، پٹنہ سے پٹنہ سیٹی کی طرف پورب چلئے تو کچھ صحیح سلامت اور زیادہ تر ان پرانے زمانے کے کھنڈرات آپ کو ملتے جائیں گے۔ ان پشتوں میں جو مشہور تھے، بتیا راج کا پشتہ ہے۔ جس کے ایک حصہ میں عورتوں کے لئے بادشاہ نواب رضوی ٹرینگ کالج ہے۔ گلزار باغ میں نواب صاحب کا پشتہ ہے۔ اس کے پورب نوذر شاہ کا پشتہ ہے جو بالکل منہدم ہو کر پست ہو گیا پھر ولندیزیوں کا پشتہ ملے گا، اسی کے پورب نواب علی ابراہیم صاحب کا پشتہ اور نواب علی قاسم خاں کا پشتہ، یہ سب دولی گھاٹ کے محلہ میں واقع ہیں۔ یونہی بڑھتے جایئے تو مینن گھاٹ میں حضرت منعم پاک کی درگاہ کے پشتے کے آثار آپ کو نظر آئیں گے۔ اس کے بعد حضرت عشق کے آستانے کے مشہور پشتہ کا کھنڈر ملے گا۔ رائے صاحب کا پشتہ ابھی اچھی حالت میں قائم

ہے، پھر نیم گھاٹ میں کئی پشتے، کچھ گرے ہوئے کچھ اچھی حالت میں ملتے جائیں گے۔ خواجہ کلاں میں لب دریا حضرت خواجہ کلب کی مسجد کا پشتہ بھی بُری حالت میں ہے۔ اس کے بعد پھر پشتوں کا سلسلہ یکے بعد دیگرے دیکھتے جایئے اور ٹیڑھی گھاٹ، مہاراج گھاٹ کے تاریخی پشتے سے ہوتے چمنی گھاٹ کے پشتہ تک پہونچیے۔ وہاں سے آگے بڑھیے تو سیف خاں کی مسجد کے گرے ہوئے پشتوں کو دیکھئے اس کے پورب آپ کو نادرِ زمانہ قلعہ کا پشتہ نظر آئے گا جو دور تک دریا میں نکلا چلا گیا ہے اور جس کی پختہ دیواروں میں یہ ندرت رکھی گئی ہے کہ یہ پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ بہ تہہ بنی ہوئی ہیں۔ ایک دیوار پشتے کی اگر گرتی ہے تو اس کے بعد دوسری دیوار نکل آتی ہے اس کے بعد کچھ اور پشتے پورب کی طرف جاتے ہوئے ملیں گے، ان کے بعد جو مشہور پشتہ ملے گا وہ حضرت پیر ڈمڑیا صاحب کی درگاہ اور درگاہ کے وسیع حلقہ کا ہے جس میں رہائشی مکانات بھی ہیں اور عالی شان مسجد بھی ہے۔ یہ پشتہ بھی بُری حالت میں ہے۔ اس کے بعد بھی اور پشتے ہیں مگر سب گرے پڑے ہیں۔ پورب میں ماتارام کا پشتہ ہے۔ مگر یہ بھی اب کھنڈر ہے۔ ماتا رام پٹنہ کے بڑے ساہوکاروں میں تھا۔ چھوٹے چھوٹے غیر معروف پشتوں کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ حیرت کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ جو تھوڑے بہت پشتے اچھی حالت میں موجود ہیں اور جو ہزاروں کی تعداد میں منہدم ہوگئے ہیں یا ہوتے جاتے ہیں ان کی تعمیر میں نہ جانے کیسی اینٹیں لگائی جاتی تھیں اور ان کی جڑائی میں نہ معلوم کیسے مسالوں سے کام لیا جاتا تھا اور ان کی دیواروں پر کس طرح کی استر کاری ہوئی تھی کہ سینکڑوں برس کے بعد بھی دریا کی لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اور سیلاب کے پانی کی ریشہ دوانیوں کے باوجود آج بھی قائم ہیں۔ کچھ پرانے زمانے کے پشتے جو باقی ہیں، ان کی ساخت اور مضبوطی کو دیکھئے اور عش عش کیجئے اور جو سینکڑوں پشتے کھنگل کر دریا کے کنارے سر بہ سجود پڑے ہیں اب ان کے تودوں پر تیز بھاری ہتھوڑے بھی چلایئے تو یہ سب بے اثر ثابت ہوں گے۔

تیراکی کے میلے تین چار جگہوں میں ہوتے تھے۔ ایک تو ولندیزیوں کے پشتے پر سے جو ہالینڈ کے تجار کا بنایا ہوا شاہان مغلیہ کے عہد حکومت کا پشتہ تھا۔ فرمان شاہی حاصل کر کے تجارت کی کوٹھیاں پٹنہ میں ہالینڈ والوں نے قائم کی تھیں جن کو عرف عام میں یہاں ولندیز کہتے تھے۔ انہی لوگوں نے دیوان محلّہ کے علاقہ میں ایک بڑا سا مکان بنوایا تھا۔ جو لب دریا تھا اور دریا کے کنارے پشتہ دیکر ان پر بھی کچھ عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ امتداد زمانہ سے مکانات تو منہدم ہو کر کھیت ہوگئے ہیں مگر پشتے کا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ یہاں بھی تیراکی کا میلہ لگتا تھا، تماشہ بینوں کا ہجوم رہتا، خوانچہ والے طرح طرح کے پکوان اور مٹھائیاں بیچتے پھرتے۔ دوسرا میلہ سیف خاں کی مسجد سے ملحق جو وسیع افتادہ زمین تھی اس میں لگتا یہ مسجد لب دریا بڑی بلندی پر واقع ہے۔ لب دریا جو بُرجیاں بنی ہوئی تھیں انہیں سے تیراک دریا میں چھلانگ لگاتے تھے۔ ایک جگہ اور بھی تھی یہ نواب علی ابراہیم خاں کا پشتہ تھا یہ بھی قریب قریب منہدم ہو چکا ہے اس سے لگی ہوئی افتادہ زمین اجتماع کے لئے کافی تھی ہفتہ میں ایک دن تینوں جگہوں میں سے ایک جگہ تیراک جمع ہوتے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں تماشہ بینوں کا مجمع ہو جاتا اور خوانچے والے پھیرا لگاتے پھرتے۔ نو بجے دن میں میلہ شروع ہوتا۔ اس میں چنے ہوئے مشہور تیراک بھی حصہ لیتے تھے۔ اصل میں یہ ایک طرح کا مقابلہ تھا اس طرح کہ اگر کوئی تیراک ایک سانس میں چڑھتے ہوئے دریا میں اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاکر فوراً بغیر دم لئے پلٹ آئے تو خوب واہ واہ ہوتی اور اگر اس مقابلے میں ناکام واپس ہوتا یا اس پر کوئی افتاد پڑتی تو کچھ بھی نہیں، حقیقی بات یہ تھی کہ ولولوں کی نمائش کا یہ صرف ایک طریقہ تھا۔ پانچ آدمیوں سے زیادہ کسی تیراک کو دریا میں اترنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ یہ پانچوں ایک کے بعد ایک پشتہ کی اونچائی سے دریا میں چھلانگ لگاتے، دریا کے کنارے تماشہ بینوں کا مجمع کھڑا تیراکوں کی ہمت بڑھاتا رہتا۔ دولت مند تماشہ بین کے لئے دو ایک شامیانے اور رچرٹیاں بھی ہوتیں کہ

بارش ہو تو ان میں پناہ لے سکیں۔ ادھر تیراکوں نے دریا میں چھلانگ لگائی اور ادھر تین چار چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر چار پانچ دوسرے مشاق تیراک ان کے ساتھ ساتھ چلتے۔ یہی مقابلہ کے جج ہوتے۔ ان کے ساتھ چلنے کی ایک غرض یہ بھی ہوتی تھی کہ اگر کوئی تیرنے والا پانی کے بہاؤ سے بے بس ہوجائے تو اس کو اٹھا کر اپنی کشتی پر رکھ لیں۔ بھرے دریا میں ان کشتیوں کو چلانے کے لئے بھی بڑے ہی مشاق ملاح ہوتے تھے کہ پانی کی طغیانی سے کشتی کو بچائے رکھیں اور اس کو بہک کر دور جانے نہ دیں۔ پھولتے اور بچکتے ہوئے طوفانی دریا میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو قابو میں رکھنا بھی کوئی آسان کام نہ ہوتا تھا دریا کے دونوں کناروں کو عبور کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ مشاق تیراک تھک جاتے تو اپنے کو دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیتے اور بہاؤ پر دور نکل جاتے تھے۔ جب دم ٹھیک کر لیتے تو پھر مڑتے اور یہی ان کی قوت اور مشاقی کا امتحان تھا کہ سیدھ پر دوسرے کنارے تک پہونچ جائیں۔ ان پانچ تیراکوں میں، دو ہی ایک ہوتے تھے جو دونوں کناروں کو عبور کر لیتے بقیہ بے بس ہو کر جب تھک جاتے تو کشتی والے ان کو اپنی کشتی پر اٹھا لیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک بھی اس مقابلے میں یا امتحان میں کامیاب نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بھی حادثہ رونما ہوجاتا تھا کہ کسی تیراک نے غوطہ لگایا تو پھر اُبھرا ہی نہیں۔ اس وقت مقابلے بند ہوجاتے، اور جو بھی تیراک پانی میں ہوتا تو اس کو کشتی والے اپنی کشتی پر لیکر غوطہ لگانیوالے مفقود تیراک کی تلاش شروع کر دیتے۔ زیادہ تر تیراکوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ بہک کر دریا کے بہاؤ پر دور نکل جاتے۔ واپس آنے کی کوشش کرتے تو بہاؤ کی قوت ان کی قوت پر غالب آکر ان کو اور دور پھینک دیتی اور وہ مضمحل اور بے بس ہوجاتے، ایسی حالت میں کشتی والے ان کو دریا سے نکال کر اپنی کشتی میں ڈال لیتے تھے۔ تیراکی کے مقابلے میں جو تیراک ایک دفعہ ناکام ہوجاتے اس سال ان کو پھر کسی مقابلے میں تیرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی، دوسرے سال وہ مقابلے میں شریک ہوسکتے تھے۔ اگر تیراک دریا میں لاپتہ ہو جاتا اور

اس کی تلاش شروع ہو جاتی تو اس صورت میں باوجود مقابلہ ختم ہو جانے کے تماشہ بینوں کا مجمع اس وقت تک پورے دن بھر قائم رہتا جب تک لاپتہ ہونے والے تیراک کی کوئی خبر نہ مل جائے۔ تیراکی کا شوق صرف عوام ہی میں نہیں بلکہ شرفا اور رئیسوں میں بھی بہ درجہ اتم تھا۔ تیراکی کی مشق عجیب عجیب انداز میں کرتے تھے۔ کوئی پالتھی مارے بیٹھا ہوا بہاؤ پر بہتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ پانی کے اندر پاؤں کی انگلیاں اور پنجے کے ساتھ تلوے پنکھی کا کام دے رہے ہیں اور وہ تیراک اس طرح پانی کو کاٹتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ کوئی چِت پڑا ہوا بہتا جا رہا ہے۔ زیادہ تر وہی معمولی انداز پَٹ لیٹ کر پانی میں تیرنے کا تھا جس میں دونوں ہاتھوں اور پیروں سے پانی کاٹ کر آگے بڑھتے ہیں۔ مقابلہ میں تیراکی کا یہی طریقہ برتا جاتا تھا۔

تیراکی کا المناک حادثہ

(سعادت علی خاں کی موت)

آج بھی پٹنہ میں سب سے بڑا کار آمد وقف امام باندی صاحبہ مرحومہ کا ہے۔ ان کی حیثیت ایک محسنۂ قوم کی ہے۔ اگرچہ ان کے انتقال کو بھی زمانہ گذر گیا مگر اس وقف کی خیرات جاریہ ابھی تک قائم ہیں اور ان کی پاک نیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقف کی آمدنی بجائے گھٹنے کے برابر بڑھتی ہی رہی ہے۔ متولّی بھی ایک کے بعد ایک ایسے ملتے گئے جو وقف کی آمدنی میں اضافہ کرتے اور خیرات جاریہ کی مدوں کو بڑھاتے رہے۔ مذہبی تعلیم کے لئے مدرسے کا قیام، مسجدوں کی دیکھ بھال، مسافروں کی ضیافت اور امداد، یتیم اور بیواؤں کی دستگیری کے ساتھ ساتھ محرم کے دنوں میں بڑی سے بڑی عزاء کی مجلسوں کا مستقل انعقاد اور سینکڑوں غریبوں کو مفت کھانا تقسیم کرنا یہ سب چیزیں آج بھی جاری ہیں۔ انہی امام باندی مرحومہ کے شوہر نواب سعادت علی خاں کے غرقِ دریا ہونے کا واقعہ درج کر رہا ہوں اگرچہ اس واقعہ کو ایک سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذرا مگر آج بھی اس واقعہ کا ذکر بڑے اندوہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

نواب سعادت علی خاں صاحب کا عنفوان شباب تھا، شادی ہوئے ابھی چند سال ہوئے تھے کہ یہ واقعہ فاجعہ پیش آیا۔ نواب صاحب مرحوم کو بچپن ہی سے دریا میں تیرنے کا شوق تھا، اچھے اچھے تیراک ملازم تھے۔ پہلے تو ان سے بہت گر تیراکی کے سیکھے بعد میں خود ایسے بڑے مشاق تیراک ہو گئے کہ دوسروں کو تیراکی کی تعلیم دیتے تھے۔ بڑے دولتمند رئیسوں میں تھے۔ باپ کا سایہ اٹھ چکا تھا، ماں زندہ تھیں۔ بے فکری کی زندگی تھی، کچھ نہیں تو یہی تیراکی کا شغل وقت کاٹنے کو کافی تھا۔ ان کی تیراکی کا شہرہ صرف پٹنہ ہی تک محدود نہ تھا لکھنؤ، دہلی اور دوسری جگہوں مین بھی ان کی شہرت پہونچ چکی تھی۔ نواب صاحب ہر انداز میں تیرتے تھے، بیٹھ کر دریا کے بہاؤ پر چلے جا رہے ہیں، ہاتھ میں گڑگڑی ہے، حقہ کی کش لیتے ہیں اور تیرتے جاتے ہیں، کبھی چت لیٹے ہوئے دریا کے سطح پر بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اس طرح بھی تیرتے کہ سارا جسم پانی کے اندر ہے اور صرف سر باہر ہے اور ان کے تیرنے سے ان کے اغل بغل کہیں ہلکی سی لہر بھی نہیں اٹھ رہی ہے۔ غوطہ لگاتے تو آدھ میل پر جا کر نکلتے۔ یہ پانی میں رہ کر سانس روکے رکھنے کی بڑی مشکل مشق ہے۔ آخر اسی تیراکی کے شوق نے ان کی جان لی۔ ایک دفعہ تیرنے کے لئے اپنے مکان کے پشتہ پر سے دریا میں جو چھلانگ لگائی تو سطح دریا پر پھر نہ اُبھرے۔ ان کے غرق دریا ہونے کا واقعہ دو طرح پر مشہور ہے۔ نواب سعادت علی خاں کے ڈوبنے کا واقعہ کچھ لوگ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حسب عادت نواب صاحب مرحوم جس طرح روزانہ اپنے مکان کے پشتہ سے چھلانگ لگاتے تھے اور کچھ دیر دریا میں تیر کر واپس گھاٹ پر آجاتے تھے اسی طرح ایک دن انھوں نے دریا میں چھلانگ لگائی، کچھ دیر تک ان کے سطح آب پر نہ ابھرنے سے ان کے ملازمین کو تشویش ہوئی مگر جب زیادہ دیر ہوئی تو ان کے دوچار ملازم جو وہاں موجود تھے خود دریا میں کود پڑے اور اندر اندر غوطہ لگا کر ان کو ڈھونڈنے لگے۔ جب اس پر بھی نواب صاحب کا پتہ نہیں چلا تو شور و ہنگامہ شروع ہوا، بیسیوں کشتیاں لیکر

ملاح ہر طرف دوڑ پڑے۔ میلوں تلاش جاری رہی مگر نہ تو نواب صاحب ملے نہ ان کی لاش ملی۔ کچھ لوگ نواب سعادت علی خاں مرحوم کے دریائے گنگا میں ڈوبنے کے واقعہ کو اس طرح بھی بیان کرتے ہیں کہ برسات کے دن تھے اور نواب سعادت علی خاں دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرنے کو جا چکے تھے کہ لکھنؤ کے دو تین صاحبان ان کے یہاں آئے۔ نوکر نے اندر اطلاع بھیجوائی کہ نواب صاحب کی ملاقات کے لئے کچھ معزز حضرات لکھنؤ سے آئے ہیں۔ نواب سعادت علی خاں فوراً باہر نکل آئے۔ صاحب سلامت ہوئی۔ آنے کی غرض پوچھی تو آنے والے مہمان کہنے لگے کہ آپ کی تیراکی کا شہرہ پٹنہ کھینچ لایا ہے۔ اور ہمیں بڑا اشتیاق ہے کہ آپ کی تیراکی کا تماشہ دیکھیں۔ جوانی کا زمانہ تھا اور جوانی کے ولولے تھے۔ وقت بے وقت کا خیال کئے بغیر نواب سعادت علی خاں اسی وقت دریا میں تیرنے کیلئے تیار ہوگئے۔ گلزار باغ میں ان کے مکان سے نزدیک ہی ان کا دوسرا مکان لبِ دریا واقع تھا۔ لکھنؤ سے آئے ہوئے مہمانوں کو لیکر نواب صاحب وہاں پہونچے۔ دو چار ملازم بھی ساتھ تھے۔ نواب صاحب نے نہانے کا لباس پہنا اور مکان کے پشتے سے بھرے دریا میں چھلانگ لگادی۔ ان کا قاعدہ تھا کہ چھلانگ لگا کر جب پانی کے اندر جاتے تو غوطہ لگاتے ہوئے دور نکل جاتے، اس کے بعد سطح آب پر ابھرتے اور پھر طرح طرح سے تیرتے ہوئے اور دور بڑھتے جاتے۔ اس دفعہ نواب سعادت علی خاں نے جب چھلانگ لگائی تو دیر تک اوپر نہ ابھرے۔ پہلے تو ان لوگوں کو جو وہاں پر موجود تھے یہ خیال ہوا کہ اندر ہی اندر غوطہ لگاتے ہوئے دور پر ابھریں گے مگر جب کچھ اور زیادہ دیر ہوئی تو لوگوں کی تشویش بڑھی اور نواب صاحب کے ملازم بے تابانہ دریا میں کود پڑے اور نواب صاحب کو ڈھونڈنے لگے۔ جب اس پر بھی نواب صاحب کا پتہ نہ چلا تو واویلا مچا، ہنگامہ ہوا اور کشتیاں تلاش میں نکلیں اور مچھیرے آئے تو دریا میں ہر طرف بڑے بڑے جال ڈالے جانے لگے۔ اطراف پٹنہ میں بھی دریا کے دونوں طرف میلوں دور تک کشتیاں تلاش میں نکلیں۔ ملاح ہر طرف جال

اور کشتیاں لیکر پھیل گئے۔ رات آئی مگر جستجو کم نہ ہوئی دور تک دریا کے دونوں کناروں پر لوگوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اس حادثے سے متعلق ہر زبان پر گفتگو تھی اور یہ دعا تھی کہ خدا کرے نواب صاحب زندہ اور سلامت مل جائیں۔ گھر پر نواب صاحب کی والدہ نیم مردہ اور ان کی بیگم صاحبہ امام باندی بیگم بے ہوش پڑی تھیں۔ جب نواب صاحب کی غرقابی کو تین دن گزر گئے اور لاش نہ ملی تو فطری طور پر دو باتیں لوگوں کے ذہن میں آئیں۔ یا تو ان کے چھلانگ لگا کر دریا میں کودتے وقت کسی سخت چیز سے ان کا سر ٹکرا گیا اور یہ بے ہوش ہو گئے اور بے ہوشی میں پانی زیادہ پی گئے اور اس طرح لاش پانی کے اندر بیٹھ گئی یا یہ ہوگا کہ جہاں پر یہ دریا میں کودے ہونگے وہاں کوئی بڑا دریائی جانور یعنی گھڑیال وغیرہ موجود ہوگا اس نے انکو پکڑ لیا اور اندر ہی اندر گھسیٹ کر کہیں دور لے گیا۔ اس حادثے کے وقت نواب سعادت علی خاں مرحوم کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ ایک چھوٹا بچہ واجد علی اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے اس کا بھی چند دنوں کے بعد ہیضہ میں انتقال ہو گیا۔

سون پور کا میلہ

پٹنہ کے اتر جانب دریائے گنگا کے اُس پار سون پور کے نام سے ایک بستی آباد ہے۔ اس جگہ دریائے گنگا اور دریائے گنڈک کا سنگم بھی ہے۔ دریائے گنڈک کو اگلے زمانے میں دریائے نرینی بھی کہتے تھے۔ یہیں ہر سال ہریہر چھتر کا میلہ لگتا ہے۔ یہ جگہ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں بڑی مقدس مانی گئی ہے۔ ہریہر چھتر کے معنی ہروشنو جی (ہری) اور شیو جی (ہر) کی متحدہ جائے رہائش ہے۔ اسی جگہ تقریباً ایک مردہ ندی بھی ہے جس کو مہی ندی کہتے ہیں۔ جہاں دریائے گنڈک دریائے گنگا سے پٹنہ کے قریب ملتا ہے اگر اس کی سیدھ میں اُتر کر دریائے گنڈک کے ساتھ ساتھ چلئے تو دو میل اوپر جا کر مہی ندی کا دہانہ ملے گا۔ اسی جگہ ایک بڑا عالیشان مندر صدیوں سے آباد اور قائم ہے۔

اس مندر کی بنائے تعمیر کی تاریخ کے متعلق عام طور پر یوں مشہور ہے کہ ایک دن ایک ہاتھی جب مہی ندی میں پانی پینے کے لئے اترا تو پانی کے اندر اس کو ایک بڑے مہیب گھڑیال نے پکڑلیا اور ہاتھی اور گھڑیال کے درمیان ایک جان لیوا لڑائی شروع ہوگئی۔ گھڑیال پانی میں تھا اس لئے اس کی قوت بڑھی ہوئی تھی اور قریب تھا کہ گھڑیال ہاتھی کو ہلاک کر دے کہ ہاتھی نے بے بسی میں شیو جی اور وشنو جی سے مدد مانگی۔ اسی وقت یہ دونوں ظاہر ہوئے اور گھڑیال سے ہاتھی کی جان بچائی۔ جس وقت گھڑیال اور ہاتھی میں جنگ ہورہی تھی کچھ لوگ دور کھڑے ہوئے اس لڑائی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ہاتھی کی مدد ے لئے وشنو جی اور شیو جی کو آسمان سے اترتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ان دونوں نے کس طرح گھڑیال کو مار کر ہاتھی کو نجات دلائی - اسی لحاظ سے شیو جی اور وشنو جی کا آسمان سے اترنا اور اس واقعہ کی پیش آنیکی تاریخ چونکہ ۳۰ر کارتک تھی اسی مناسبت سے اس دن وہاں پر دریا میں نہانا اور اشنان کرنا ہندوؤں میں بڑا ثواب کا کام ٹھہرا۔ پہلا مندر جو اس جگہ بنا اس کے متعلق ہندوؤں کی مذہبی روایات میں یہ ہے کہ اس مندر کو رام چندر جی نے بنایا تھا جبکہ وہ اجودھیا سے جنک پور کو چلے تھے کہ سیتاجی کو جیت کر لائیں۔ موجودہ مندر راجہ رام نرائن کا بنایا ہوا ہے جو سلطنت مغلیہ کے زمانے میں بہار کے معزز عہدہ دار تھے۔ مندر کا نام ہریہر جو مشہور ہے اس کے متعلق ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جب وشنو جی (ہری) اور شیو جی (ہر) کے پوجنے والوں کے درمیان جھگڑا پڑا کہ کس کی یہاں پوجا کی جائے تو یہ تصفیہ ہوا کہ دونوں کی مورتیاں یہاں رکھی جائیں اور دونوں کی پوجا کی جائے۔ اس طرح اس مندر کا نام ہریہر ناتھ رکھا گیا۔

سون پور کے میلے کے دنوں میں ۳۰ر کارتک کا دن میلے کے شباب کا بھی دن ہوتا ہے جبکہ جاتریوں، تماشہ بینوں اور خرید و فروخت کرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ سے اوپر تک پہونچ جاتی ہے۔ سون پور کا میلہ صدیوں سے چلا آتا ہے مگر ہر زمانہ

کے لحاظ سے اس کی ہیئت ہی بدل گئی ہے۔ بہت پرانے زمانے کا میلہ کیسا ہوتا تھا یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر موجودہ صدی میں بہت بعد جس طرح یہ میلہ لگتا تھا اس کے دیکھنے والے اب بھی موجود ہیں۔ پہلے یہ میلہ کیا تھا اس کی تفصیل تو بعد میں آئے گی آج کل تو یہ گھریلو مصنوعات، کاشتکاری کے لوازمات کچھ کپڑوں کی دوکانیں، کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں اور زیادہ تر مویشیوں کی خرید و فروخت کا میلہ رہ گیا ہے۔ اس کی ہماہمی بڑھانے میں سیاسی پارٹیوں کے پروپگنڈے، تجارتی اشتہارات، حکومت کے قائم کردہ گاؤں سدھار کے عارضی مرکز اور والنٹروں کے کیمپ کام میں لائے جاتے ہیں اور اب یہ سون پور کا میلہ اگلے زمانے کے میلے کا ایک بدنما، بے جان ڈھڈھور ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس میلے کو دیکھا ہوگا وہ بھی آج اس کی بدلی ہوئی ہیئت، اس کا نقشہ اور اس کی بے رنگی کو دیکھ کر کبھی بھی اس کو پہلا مشہور عالم سون پور کا میلہ نہیں کہیں گے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اس میلے کی ایسی شکل بدلی ہے اور اس کی رنگینیاں اس طرح پر ختم ہوئی ہیں کہ اب سوائے گرد وغبار، جانوروں کی غلاظت اور سیاسی پروپگنڈوں کے اس میلے کے مشتاقوں کے لئے وہاں کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ بہت پہلے پٹنہ سے سون پور کے میلے میں جانے کے لئے صرف کشتیاں تھیں مگر جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا اور سہلیتیں اور دوسرے راستے بھی نکلتے آئے۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ پٹنہ سے اسٹیمر پر بیٹھ کر دریائے گنگا کو عبور کیجئے اور پہلیزا گھاٹ پر اتر جائیے اور پھر وہاں سے ریل کے ذریعہ چار پانچ میل کا چکر لگا کر سون پور کے لانبے پلیٹ فارم والے اسٹیشن پر پہونچیئے۔ دوسرا وہی پرانا راستہ ہے کہ براہ راست پٹنہ کے کسی گھاٹ سے کشتیوں کے ذریعہ چلیئے، گنگا کے چار میل کے پاٹ کو عبور کر کے دریائے گنڈک کے دہانے میں داخل ہو جائیے اور پھر دو میل اوپر چڑھتے ہوئے عین اس جگہ پہونچ جائیے جہاں ہریہر جی کا مشہور مندر بھی ندی کے کنارے واقع ہے۔ یہیں سے میلے کی ابتدا بھی ہوتی ہے۔ یہیں دریائے گنڈک اور دریائے گنگا کے فراخ ریگستانی سینوں پر ہزاروں جاتری بھی

ڈیرے ڈالے آپ کو ملیں گے۔ کشتی کا راستہ دوکانداروں کے لئے اور میلے میں جانوروں اور مویشیوں کے لیجانے کے لئے اور وہاں سے ان کو لانے کے لئے بھی سب سے زیادہ آسان سبیل ہے میلے کے زمانہ میں ہزاروں چھوٹی بڑی کشتیاں دور دور تک دریائے گنگا اور دریائے گنڈک کے کناروں پر لگی ہوئی عجیب بہار دکھاتی ہیں۔ پٹنہ سے میلے میں جانے والے ہزاروں آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو روزانہ میلے میں جاتے ہیں اور اسی روز لوٹ آتے ہیں۔ پہلے ان میں شوقین تماشہ بین کی بڑی تعداد ہوتی تھی مگر اب میلے کی چیزوں کے خریدار بھی اور دوکاندار بھی ہوتے ہیں جو میلے کے دنوں میں سون پور اپنی دوکانیں لے جاتے ہیں اور بکری قائم رکھنے کے لئے پٹنہ آکر پھر یہاں سے مزید مال اپنی دوکانوں میں برابر بھرتے رہتے ہیں۔ اگلے زمانہ میں میلے کے شباب کے دنوں میں کشتی اور اسٹیمر اور ریل کے یہ دونوں راستے زحمت طلب ہوجاتے کیونکہ اس زمانہ میں سون پور کے میلے میں جانے والوں کا ہجوم اور ان کی بھیڑ بھاڑ سے نہ کشتیاں آسانی سے دستیاب ہوتیں اور نہ اسٹیمر یا ریل پر جگہ ملتی تھی۔ ۲۱-۱۹۲۰ء میں ایک اسٹیمر چلانے والی کمپنی نے براہ راست پٹنہ کے خواجہ کلاں گھاٹ سے عین مہی ندی کے دہانے تک مسافروں کو لے جانے اور لے آنے کے لئے میلے کے موقع پر دو اسٹیمر بھیجے۔ یہ اسٹیمر صرف پینتالیس منٹ میں پٹنہ سے سون پور کی مسافت طئے کرتے تھے اور ٹھیک ہریہر جی کے مندر کے پاس میلے میں پہونچادیتے تھے۔ ان اسٹیمروں میں چونکہ سفر کا کرایہ بھی بہت کم تھا اور قطع مسافت میں بھی ان سے مزید سہولت ملتی تھی اس کا اثر یہ ہوا کہ راستہ کی بھیڑ بھاڑ سے گھبرانے والے حضرات کھنچ کر خواجہ کلاں گھاٹ پہونچتے اور ایک گھنٹہ کے اندر اپنے کو سون پور کے میلے کے ہجوم میں پاتے۔ سون پور کے میلے کے موقع پر ان اسٹیمروں کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا اور یہ اس وقت ختم ہوا جب دریائے گنگا اور گنڈک کے سنگم کے نزدیک دیارے پڑنے لگے اور اس راستے سے جہاز لے جانا ناممکن ہوگیا۔ ان اسٹیمروں نے جہاں مسافروں کو انتہائی سہولیت

پہونچاتی تھی وہاں میلے کے تماشہ بینوں کی وحشت بھی بڑھادی تھی۔ گھر بیٹھے ہیں کہ اسٹیمر نے سیٹی دی، آپ یقین فرمائیں کہ سیٹی کی یہ آواز شوقینوں کے لئے ''دیوانہ را ہوئے بس است'' سے کم نہ تھی۔ ادھر سیٹی بجی اور ادھر ہر دل میں میلے کے شوق کی ایک ہوک اٹھی دم زدن کی بات تھی، اسباب بندھا، دو ایک ساتھی آس پاس ہی منڈلاتے مل گئے، میلے میں جانے کا معاملہ دم زدن میں طے ہوا۔ اس کے بعد اسٹیمر پر قدم ہی رکھا تھا کہ بات کی بات میں سون پور کے میلے میں ٹہلتے ہوئے نظر آئے۔ یہ دونوں اسٹیمر رات دن پٹنہ اور سون پور کے متعدد چکر لگاتے رہتے تھے۔ اس سے مسافروں کو آنے جانے میں اور بھی آسانیاں ہو گئی تھیں۔ یہ سون پور کا میلہ جو ہندوؤں کی ایک مذہبی تقریب بھی ہے اور چیزوں کی خرید و فروخت اور لاکھوں افراد کے اجتماع کے لحاظ سے ایشیا کا سب سے بڑا میلہ بھی ہے کچھ دنوں پہلے اس کی ایک اور بھی حیثیت تھی جو موجودہ دور میں اب ختم ہو چکی ہے۔ یہ ہزاروں رنگین مزاج، شوقینوں اور دولتمندوں کے پکنک منانے کی اور سیر و تفریح کی جگہ بھی تھی۔ سون پور کے میلے کے عظیم الشان اجتماع کی سہولت کو مد نظر رکھتے ہوئے اور امن عامہ کے انتظام کو برقرار رکھنے کے واسطے حکومت بھی ایک مہینہ کے لئے یہاں سب سے بڑا ڈویژن قائم کر دیتی تھی جہاں متعدد پولس کی چوکیاں بن جاتیں۔ خاص طور پر چند مجسٹریٹ تعینات کئے جاتے اور میلے کی صفائی اور صحت عامہ کی نگرانی اور آسانی کے لئے کئی ہسپتال قائم کئے جاتے اور بہت سے ڈاکٹروں کی ڈیوٹیاں لگ جاتیں۔ پہلے پورے ایک مہینے تک یہ سرکاری انتظامات جاری رہتے تھے۔ اب ان کی مدت صرف ایک ہفتہ رہ گئی ہے۔ اس کے بعد حکومت اعلان کر دیتی ہے کہ میلے کی مدت ختم ہوگئی۔ اس طرح اب یہ میلہ ایک مہینے سے گھٹ کر صرف ایک ہفتہ کا رہ گیا ہے۔

برسات کے ختم ہونے کے بعد جب موسم جاڑوں کی سرحد میں داخل ہونے لگتا ہے تو سون پور یا چھتر کا یہ میلہ کارتک کے مہینے کی درمیانی تاریخ سے ایک مہینہ

کے لئے شروع ہوتا۔ سون پور کے تین طرف میلوں تک پھیلی ہوئی ہزاروں ایکڑ ربیع زار اراضیات جو اس موسم میں ویران پڑی رہتی ہیں۔ میلے کے دنوں میں لاکھوں آدمیوں اور ان گنت مویشیوں اور بے شمار دوکانوں کو اپنے وسیع دامن میں سمیٹ لیتیں اور ایک رنگ برنگا نیا شہر ان مین اگ آتا۔ بڑے بڑے بازار لگ جاتے، یہ مینا بازار ہے، یہ چڑیا بازار ہے۔ آگے بڑھئے تو ہزاروں ہزار گھوڑوں کی مختلف کارواں سرائیں جن میں عراقی بھی، عربی بھی، میعار بھی، کاٹھیاواری بھی اور چھوٹے قدو قامت کے بھوٹانی ٹٹو بھی۔ غرض ہر نسل اور قومیت کے گھوڑے اور ٹٹو ملتے۔ اس کے بعد اونٹوں کے کارواں سرا ہوتی جہاں بڑے بڑے بال والے اونٹ بھی ملتے جن کی کوہانیں نکلی ہوتیں۔ جو افریقہ اور عرب کے ریگزار سے لائے جاتے اور راجپوتانہ کے بھی اونٹ ہوتے۔ ان کی تعداد بھی ہزاروں سے اوپر جاتی۔ اس کارواں سرائے سے ہٹ کر پورب کی طرف ایک بڑی اونچی باندھ ہے جو دو میل تک اتر دکھن چلی گئی ہے۔ اس باندھ سے لگے ہوئے پورب ہی کی جانب گنڈک کی ترائی میں باغات اور سینکڑوں بیگھے پڑتی زمین ہیں، وہاں ہزاروں ہاتھیوں کا کجلی بن نظر آتا۔ سون پور کے اسٹیشن سے نیچے اتر کر پورب کی طرف چلئے تو وہیں سے میلے کا پہلا سرا شروع ہوتا تھا اسٹیشن کے سامنے وسیع میدانوں میں سلسلہ وار ریلوے ملازمین کے چھوٹے بڑے کوارٹر ملتے۔ ان سے لگے ہوئے ہموار وسیع خطہ زمین میں انگریز نلوا ہے، انگریز ریلوے افسران، انگریز حکام اور ان کے انگریز دوست جو میلے کی سیر کو آتے وہ پولو کے میچ بھی کھیلتے اور ریس کے گھوڑے بھی دوڑاتے۔ ہندوستانیوں کی شرکت صرف ریس کی بازی لگانے میں ہو جاتی۔ مویشیوں کا بازار بھی اسٹیشن کی سرحدوں سے شروع ہوتا۔ اس بازار میں بھینس، گائیں، بکرے، بکریاں، بھیڑیں اور کاشتکاری کے لئے مضبوط بیل، یہ سب ہر نسل اور ہر قدو قامت کے ہزاروں کی تعداد میں آتے اور فروخت ہوتے۔ یہ دو میل کا لانبا بازار ''بیل ہٹا'' کہلاتا تھا۔

انگریزی بازار

میلے کی ہماہمی اور گرد و غبار سے دور انگریزی بازار لگتا تھا اور اس جگہ کی کھلی فضا میں سنوٹوریم کا لطف آتا تھا۔ یہاں بڑے بڑے شہروں سے ولائتی اور نفیس دیسی چیزوں کی بھی دوکانیں آتیں تھیں جن میں اعلیٰ درجہ کے فرنیچر، بیش قیمت قالینیں، کپڑے اور طرح طرح کے ریشمی اور اونی کپڑے، یورپ کے بنے ہوئے شیشے کے سامان چاندی کے اور عمدہ چینی کے کھانے کے ظروف، لینڈو، فٹن، انگریزی ٹم ٹم، بگھی گاڑیاں، گھوڑوں کے چرمی ساز اور چمڑے کے دوسرے سامان، بچوں کے لئے ہر طرح کے انگریزی کھلونے اور ان کے لئے پرمبلیٹر (Prembulator) گاڑیاں اور بھی عمدہ عمدہ چیزیں ملتی تھیں۔ یہیں حکام کے کیمپ بھی ہوتے تھے۔ جن میں اکثریت انگریزوں کی ہوا کرتی تھی۔ اس انگریزی بازار میں نوابوں اور راجے مہاراجے، سب کی بارگاہیں بھی لگتی تھیں۔ انگریزوں کے کیمپ میں اگر ڈنر اور ڈانس ہوتے تو نوابوں اور راجاؤں کی بارگاہوں میں ہندوستانی رقص و سرود کی محفلیں سجتیں۔ سون پور کے کئی میل تک پھیلے ہوئے میلے میں ہر جگہ آنے جانے کے لئے پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں اور انہیں سڑکوں کے دونوں طرف بازار بھی لگتے۔ یہاں کرائے کی فٹن، لینڈو اور بگھی گاڑیاں سب موجود رہتیں۔ میلے کے زمانے میں یہ گاڑیاں مظفرپور سے بھی آتیں تھیں اور پٹنہ سے بھی کرایہ کی گاڑیاں چلانے والے گھوڑے گاڑیاں کشتی کے ذریعہ سے میلے میں لیجاتے تھے۔ سون پور کے میلے میں پٹنہ سے پابندی اور تزک و احتشام کے ساتھ جانے والوں میں بادشاہ نواب صاحب مرحوم سب سے آگے آگے تھے۔ انگریزی بازار میں ان کے کیمپ کی ایک مخصوص مستقل جگہ تھی جہاں ایک بہت بڑا مستطیل پختہ چبوترہ بادشاہ نواب صاحب نے بنوایا تھا۔ ہر سال اسی چبوترے پر ان کا دل بادل خیمہ کھڑا کیا جاتا تھا۔ یہ خیمہ کیا تھا ایک پوری عمارت تھی جس میں ایک بڑا ڈرائنگ ہال، اسی کی مناسبت سے ایک ڈائننگ ہال، ایک آفس کا کمرہ اور کئی سونے کے کمرے جن

سے لگے ہوئے غسل خانے بھی ہوتے تھے۔ سامنے رخ پر بڑا سائبان اور داہنے بائیں دو چھوٹے چھوٹے سائبان بھی اس میں ہوتے تھے۔ تمام کمروں میں لکڑی کی عمدہ کواڑیں تھیں جن کو بند کر دیجئے تو ہر کمرہ ایک مخصوص کمرہ بن جاتا تھا۔ ہر کمرہ اپنے پورے سامان سے سجا ہوتا، ان میں انگریزی اور ہندوستانی ہر طرح کے فرنیچر ہوتے۔ اس خیمے کے چاروں طرف ایک وسیع خطہ زمین کو قناتوں سے گھیر کر بڑا بڑا صحن قائم کیا جاتا تھا۔ سامنے صحن میں روشیں نکالی جاتیں اور جگہ جگہ عمدہ اور نفیس گملے رکھے جاتے۔ ایک طرف ایک بڑا کشادہ شامیانہ تنا ہوا جس کے اندر قالینوں کا فرش ہوتا اور قرینہ کے ساتھ صوفے اور کرسیاں رکھی ہوتیں۔ دوسری طرف نوکر پیشوں کے لئے خیمے اور باورچی خانے کے لئے خیمے اور راؤٹیاں الگ ہوتیں۔ کیمپ سے لگا ہوا ان کے گھوڑوں اور گاڑیوں کے لئے اصطبل بھی ہوتا تھا جہاں گھوڑوں کی دوچار جوڑیاں اور لینڈو اور فٹنیں رہتیں۔ پٹنہ کے رؤسا اور دولت مندوں کے رہنے کی جگہیں تھیں یا تو انگریزی بازار یا پھر نخاس میں۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے تھے کہ مہی (Mahi) ندی کے کنارے ہی اپنے خیمے ڈیرے راؤٹیاں ڈالتے، ملازمین ساتھ ہوتے، مصاحبیں اور دوستوں کے ساتھ وہیں جشن مناتے، جولوگ خیمے اور راؤٹیوں کی جھنجھٹ سے الگ رہنا چاہتے تھے ان کے لئے نخاس میں عمدہ عمدہ نئے نئے خیمے راؤٹیاں کرایہ پر بہ افراط ملتی تھیں۔

سون پور کے میلے کی رنگینیاں اور کشش ہندوستان کے والیان ریاست کو بھی کھینچ لاتی تھی۔ بڑے بڑے زمینداروں، نوابوں اور راجوں مہاراجوں کے علاوہ ہر سال دو چار والیان ملک بھی آتے تھے۔ ان کے عالیشان کیمپ اور بارگاہیں سب سے الگ کھلی ہوئی جگہوں میں قائم کی جاتیں۔ کیمپ کے ارد گرد فوجی سپاہیوں کے محافظ دستے تعینات رہتے۔ کیمپ کے اندر جانے کی سڑک سے لگا ہوا ایک عظیم الشان پھاٹک بنایا جاتا، جس میں بڑا ہاتھی عماری کے ساتھ آسانی سے داخل ہو سکے۔ والیان ملک ہاتھی کی عماریوں

میں بیٹھ کر میلے کی سیر کرتے تھے۔ کبھی تو ان کے ہاتھی خود ان کی ریاست سے آتے تھے اور کبھی صوبہ بہار کے نوابوں اور راجہ مہاراجوں کے یہاں سے آجاتے۔ والیان ریاست کے کیمپ میں روزانہ عصرانے کی پارٹیاں، ڈنر اور ڈانس اور ہندوستانیوں کے لئے دعوتیں اور گانے بجانے کی محفلیں برپا رہتیں۔ جس والی ریاست کے یہاں دعوت کے یہ اہتمام ہوتے وہ تھوڑی دیر کے لئے ان میں شریک ہو کر اپنے مہمانوں سے ملاقات بھی کرتا تھا۔ صوبہ بہار کا لفٹنٹ گورنر بھی ہر سال دو ایک دن کے لئے سون پور کے میلے میں جاتا۔ جس زمانہ میں صوبہ بہار، بنگال سے علیحدہ نہیں ہوا تھا تو کلکتہ سے لفٹنٹ گورنر کے سون پور کے میلے میں آنے کا پروگرام بنتا اور میلے میں اس کے لئے کیمپ بھی قائم ہوتا۔ جب بہار کا صوبہ علیحدہ ہوا تو گورنر کے میلے میں جانیکا پروگرام ہر سال مستقل طور پر بننے لگا۔ اس سے ایک فائدہ ضرور ہوتا تھا حکام بھی چوکس ہو جاتے اور میلے میں صفائی کے انتظام کی دیکھ بھال بھی بڑھ جاتی تھی۔

مینا بازار

مینا بازار کا سلسلہ ہریہر جی کے مندر کے پاس سے شروع ہوتا اور دو میل آگے جا کر چڑیا بازار سے جا ملتا مینا بازار میں ہندوستان بھر کی مصنوعات ہر طرح کی ملتیں اعلیٰ دستکاری کے نمونے اسی بازار میں نظر آتے ہیں یہ مینا بازار گھریا ہندوستان کی مصنوعات کی نمائش گاہ ہوتی تھی۔ دوکاندار کوشش کرتے تھے کہ ملک کے کسی حصہ کی کوئی چیز میلے میں آنے سے نہ رہ جائے۔ یہی سبب تھا کہ اس بازار میں وہ ریل پیل ہوتی کہ نا مشکل ہو جاتا تھا۔ گاڑیوں کی آمد ورفت کی کثرت الگ رہتی تھی۔ قدم قدم پر جان پہچان والے ملتے جاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ پورا پٹنہ یہیں سمٹ کر آگیا ہے۔ آپ اس مینا بازار میں مصرف کے لئے ہر طرح کی چیزیں خرید لیجئے۔ معمولی سے معمولی چیزیں بھی اور اعلیٰ سے اعلیٰ بیش قیمت چیزیں بھی! اس بازار میں جگہ جگہ ہوٹل بھی، باورچیوں اور حلوائیوں کی دوکانیں بھی ملی جلی ملتی

جائیں۔ مینا بازار کو اگر کوئی ایک بارونق مستقل شہر کہے تو بجا تھا۔ یہیں ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں کے لوگ بھی ملتے تھے۔ پرانے قسم کے دیہاتی بھی ملتے تھے اوراسی جگہ پر بہو ر اپکوں کی پورش بھی رہتی تھی۔ میلے میں جانے والی دیہاتی عورتوں کا جو ہجوم مینا بازار میں ہوتا تھا اس سے اللہ بچائے ہر منٹ سو دو سو عورتوں کا وہ ریلا آتا کہ راہ چلتے مرد اپنی جگہ سے سو پچاس قدم دور بغیر زمین پر قدم رکھے خود بخود پہونچ جاتے تھے۔

چڑیا بازار

مینا بازار کے اختتام پر چڑیا بازار شروع ہوتا تھا۔ یہاں میر شکار ڈھونڈھ کر ایسی ایسی چڑیا لاتے جو مشکل سے کہیں رہتی ہوں۔ خاص ایران کی بلبلیں، جرمنی، انگلستان اور چین و جاپان کی کنیریاں، خاص انگلستان کی فنچ چڑیاں، ہندوستان کی ہر قسم کی چڑیاں جو چاہئے خریدتے۔ قدرت کی تخلیق کی یہ شاہکار چڑیاں رنگ برنگ کی ہوتی تھیں جن کو بچوں کے ساتھ بوڑھوں کی طبیعت بھی ان کو خرید لینے کے لئے مچل جاتی تھی۔ ان چڑیوں کے علاوہ اور ہر طرح کے پرندے بھی یہاں بکتے تھے۔ چڑیا بازار تو اس بازار کا یونہی نام پڑ گیا تھا حقیقت تو یہ کہ چڑیوں کے ساتھ ساتھ یہاں شیر بھی، بھالو بھی، ہرن بھی، کتے، بلیاں اور خرگوش بھی ملتے تھے۔ بندروں، لنگوروں اور دوسرے ہر قسم کے جانوروں کی بکری کا بھی یہی بازار تھا۔ حد تو یہ تھی کہ سپیرے ہر قسم کے سانپ بھی یہاں فروخت کے لئے لاتے تھے جن میں اکثر اژدہے بھی ہوتے تھے۔

اس بازار میں مختلف شہروں سے متعدد تھیٹریکل کمپنیاں آتیں، طرح طرح کے سرکس آتے یہیں لوگوں کے کھانے اور ٹھہرنے کے لئے ہر قسم کے ہوٹل بھی ہوتے۔ پھونس اور بانس کے بنے ہوئے عارضی مکان میں یہ ہوٹل حد درجہ آرام دہ ہوتے تھے۔ یہیں باورچیوں اور حلوائیوں کی اچھی اچھی دوکانیں جہاں ہر رنگ کے کھانے پکوان اور ہر قسم کی لذیذ مٹھائیاں ملتی تھیں۔ اسی بازار میں ہر طرح کے پھلوں کا لانبا اسٹال دور تک چلا جاتا، جہاں ہر طرح کے پھل بکتے۔ اس بازار کے اختتامی حصہ

میں لوہے اور کاٹھ کی بنی ہوئی چیزوں کی سینکڑوں دوکانیں ہوتیں یہیں فیشن کی چیزیں بھی اور کاشتکاری کا سامان بھی ملتا اور ہر طرح کے فرنیچر، پالکیاں، ڈولے، پنیس بیل گاڑی، رتھ سب کچھ ملتا۔ یہیں ہر طرح کے چھوٹے بڑے سادے اور رنگ برنگ کے خوبصورت ٹوکرے ٹوکریاں، معمولی اور خوبصورت چٹائیاں اور سیتل پاٹیاں، رسّے، رسّیاں اور مٹی کے ظروف بھی ملتے تھے۔

نخاس

مینا بازار اور چڑیا بازار کا جہاں پر سنگم ہوتا تھا وہیں پورب کی طرف سیکڑوں بگھوں کے ایک وسیع خطہ زمین میں ہر طرح کے خیموں اور خرگاہوں کا بازار لگتا۔ بڑے بڑے خیمہ دوز کانپور، میرٹھ اور پٹنہ سے نئے نئے اور ہر طرح کے خیمے، راوٹیاں، شامیانے اور نمگیرے لاتے۔ ان کو کرایہ پر بھی چلاتے اور خریداروں کے ہاتھوں فروخت بھی کرتے۔ ان کے خیموں اور خرگاہوں کے بدولت یہاں ایک بڑے بارونق اور آباد محلے کی تصویر پیش نظر ہو جاتی۔ ان خیمہ دوزوں کے علاوہ بہت سے اس سون پور کے میلے کے شائقین اپنے اپنے خیمے راوٹیاں اور شامیانے اپنی رہائش کے لئے وہیں زمین کرایہ پر لیکر نصب کرتے۔ اس خیموں کی بستی کو نخاس کہتے تھے۔ سون پور کے میلے کی جان اور رنگینیوں کا مرکز یہی نخاس تھا جہاں ہندوستان کے ہر شہر سے ارباب نشاط کے طائفے آتے اور یہیں کرایہ کے خیموں میں اپنے ڈیرے ڈالتے۔ انہیں ارباب نشاط اور نامی طوائفوں کے سبب یہ جگہ رنگین مزاج حضرات کے لئے کشش کا باعث تھی۔ گانے بجانے کے رسیا اور حسن کے پرستاروں کے خیمے بھی یہیں ہوتے تھے جن کے دن عید اور راتیں شب برات بن جاتی تھیں ۔ جن شوقینوں کی نخاس سے باہر دوسری جگہ قیام گاہ ہوتی ان میں سے اکثر یہیں آکر رات کی بہار لوٹتے۔ نخاس کی راتیں شام اودھ پر پہلو مارتیں۔ ان کی خنک فضاؤں میں عیش و نشاط کی مستیاں ابھرتیں، شام کے وقت جب دن بھر کے خرید و فروخت کی دنیا میں کچھ سکون آنے لگتا تو نخاس

کے ماحول میں راگ رنگ کا طوفان اٹھتا۔ طبلے ٹھنکنے لگتے، سارنگی کے پردوں سے راگ راگنیاں جھانکنے لگتیں، حسن بن سنور کر رنگ برنگ کی جلوہ گری کے لئے تیار ہو جاتا۔ عشاق کے دل دھڑکنے لگتے، مشتاقان جمال کی آنکھیں جلووں کو اپنی نظر کے پردوں میں سمیٹنے لگتیں۔ رات کے بھیگتے بھیگتے اگر ایک طرف خیمے کے گرے ہوئے پردوں کے پیچھے جلوت گاہ خلوت گاہ سے بدل جاتی تو دوسری طرف دوسرے خیموں کے اٹھے ہوئے پردوں کی جلوت گاہوں سے نغمہ و رقص کا کیف آدھی رات تک ہر طرف پھیلتا ہوا نظر آتا۔ ان خیموں میں جہاں پردے اٹھے ہوئے ہوتے اور رقص و سرود کے رسیا ان سے محظوظ ہوتے رہتے ان کے چاروں طرف دیہاتیوں کا ٹھٹھ لگا رہتا، کوئی کھڑا گردن ہلاتا ہوتا، کوئی دوسرے دیہاتی کو اِدھر ادھر ڈھکیل کر آگے راستہ بناتا ہوا خیمے کے اغل بغل یا اس کے پیچھے کی جانب اس کے درزوں سے اندر کی بہار دیکھنے کی کوشش کرتا۔ خیمے کے اندر کہیں کہیں نغمہ اور راگ کی گرمی کو بادہ و جام کی گردش اور تیز کرتی جاتی۔ غرض زندگی کے ان رنگیں لمحات کے درمیان وقت کی رفتار و بے پاؤں کبھی بڑھتی، کبھی اٹکتی ہوئی اپنی چال کا اندازہ بتائے بغیر اپنی آخری منزل کی طرف آہستہ آہستہ کھسکتی جاتی۔ گجر دم پہ رنگ و بو کا طلسم ٹوٹتا، رات بھر کے خلوت کدے اور جلوت کدے کی رونق ختم ہوتی اور دوسری آنے والی رات کے لئے یہی پروگرام بنا کر ارباب نشاط اور شوقین حضرات خمار عشرت سے مدہوش بستروں پر دراز ہو کر رات بھر کا کسل مٹانے لگتے۔ دن کا وقت بھی رات کے اوقاف سے کچھ کم لطف انگیز اور سرور افزا نہ ہوتا تھا۔ آگرہ اور اودھ کے علاقوں سے کنچنیوں کی متعدد ٹولیاں میلے میں آتی تھیں اور دن بھر تمام میلے اور خاص کر نخاس کا چکر لگاتی پھرتی تھیں۔ رنگین لہنگا پہنے ہوئے جن میں ساٹن یا سنجاف کی چوڑی چوڑی گوٹ لگی ہوتی، کسی میں بانگڑی، کسی میں چمک ٹنکا ہوا، جسم پر چست انگیا، جوانی کی بہار دکھاتی ہوتی، سر پر ڈھلکا ہوا دوپٹہ، ماتھے پر بندیا، کسی کے سر پر چھپکا، کانوں میں کرن پھول، ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں اور

چاندی کے ہلکے کڑے کمر سے کمر بندھی ہوئی، پاؤں میں توڑیا پازیب اور ان میں متعدد گھنگھرو لگے ہوئے، آگے آگے خود اٹھلا کر چلتی ہوئی پیچھے پیچھے ایک مرد سارنگیا سارنگی پر کسی گانے کی ہلکی ہلکی دھن بجاتا ہوا اس کا دوسرا ساتھی گلے سے ڈھول لٹکائے، اس پر رہ رہ کر سبک سبک تھاپ مارتا ہوا یہ کنچنیاں، ہر خیمے میں جھانکتی ہوئی گھومتی رہتیں۔ طوائفیں بھی بڑے شوق سے ان کنچنیوں کا گانا سنتیں اور ان کے دیہاتی اور نیم وحشیانہ جذبات سے بھرے ہوئے ناچ کا لطف اٹھاتیں شوقین حضرات کا پوچھنا کیا، ان کے لئے تو کنچنیوں میں کبھی کوئی ایسی بھی نکل آتی جس کے حسن گلو سوز کے آگے بڑی بڑی طوائفوں کا حسن ماند پڑنے لگتا اور کبھی کوئی ایسی بھی نظر آتی جس کے گلے کا رس اور دیہات کی فضا میں پلا ہوا فطرت کا ودیعت کردہ موسیقی کا لحن غضب کا جادو جگاتا۔

جہاں دل و نظر کو لبھانے والی یہ بہاریں تھیں۔ وہاں سے کچھ دور ہٹ کر ایسی بھی دو ایک جگہیں تھیں جہاں ابتذالِ انسانیت کے کریہہ اور روح فرسا مناظر بھی ملتے تھے۔ دکھن کی طرف نخاس کی سرحد جس جگہ ختم ہوتی ہے وہیں پر اینٹ اور چونے کا بنا ہوا وہ پل بھی ملتا ہے جو دریائے گنڈک پر بنے ہوئے آہنی پل کے بعد ہی سون پور کے میلے کی نشیب زمیں پر اونچا بنا ہوا اور دو میل لابنا سون پور کے اسٹیشن تک چلا جاتا ہے۔ اس پل پر ریل گاڑیاں برابر چلتی رہتیں ہیں اور چونکہ میلے کی زمینوں کے بیچوں بیچ یہ پل واقع ہوا ہے اس لئے سون پور کے میلے کے دنوں میں اس پل کے دونوں طرف ریل پر آنے جانے والوں کو میلے کی بہار پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس پل کے نیچے جو سینکڑوں محراب بنے ہوئے ہیں ان میں بہت سے لوگ ٹٹیاں لگا کر قنات کا پردہ ڈال کر میلے کے زمانے میں رہتے بھی ہیں، اگر سر پر ریل گاڑیوں کی گھڑ گھڑاہٹ نہ ہو تو بڑی حد تک یہ سکون کی جگہ بھی ہے مگر ان محرابوں سے ذرا دور پورب ہٹ کر اسی پل کے دوسرے محرابوں میں جا بہ جا اکثر خستہ حال اور خبیث امراض سے بھری ہوئی پیشہ ور عورتیں بھی اپنا دھندہ چلاتی رہتی تھیں۔ محراب کے ارد گرد چٹائیوں سے

محرابوں کو ذرا سا گھیر کر کہ نظر کا پردہ رہے، اکثر یہ عورتیں اپنا بسیرا یہیں بناتیں۔ محرابوں کے سامنے جو کھلی جگہیں مل جاتیں، وہاں بھی تین چٹائیوں کو کھینچ تان کر جھونپڑیاں بناتیں۔ جہاں رات دن گندے، بدچلن، دیہاتیوں کا ان میں تانتا لگا رہتا۔ اس طرح کی جھونپڑیاں سینکڑوں ہوتی تھیں، جہاں گھناؤنے امراض کی ماری یہ فلاکت زدہ خستہ حال عورتیں نفرت سے زیادہ رحم و ہمدری کے قابل نظر آتی تھیں۔ ان کے ستے ہوئے چہرے ان کی بے رونق آنکھیں، لبوں پر پھیکی مسکراہٹ، ان کے چھترے لباس اور مسلسل تار بندھے ہوئے شہوانی گاہکوں کے ساتھ ان کی بیکسانہ رضامندی یہ سب باتیں ان کی شاہد ہوتیں کہ دنیا میں ان کا کوئی دوسرا سہارا نہیں اور ظالم سماج نے ان کو اس طرح ٹھکرا کر نیچے پھینک دیا ہے کہ گندے اور ناپاک انسانوں کی ہوس رانی کا شکار بنے بغیر زندگی گذارنے کا ان کے لئے کوئی دوسرا رابتہ بھی نہیں۔

موت ہی میں شرافت کو اکثر پناہ ملتی ہے

سون پور کے میلے کے متعلق لکھتے وقت یاد کو کریدنے لگا تو ایک واقعہ یاد آگیا۔ کچھ باتیں میری دیکھی ہوئی ہیں اور بقیہ سنی ہوئی ہیں۔ جو میں نے سنا اس کو بھی حقیقت ہی سمجھتا ہوں چونکہ اس واقعہ کو ایک حد تک سون پور کے میلے سے بھی تعلق ہے اس لئے سون پور کے میلے کے ضمن میں اس کو درج کر رہا ہوں۔

۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے، اسی سال میں وکیلوں کی جماعت میں داخل ہو کر عدالتوں کا چکر لگانے لگا تھا۔ سون پور کے میلے کا زمانہ آیا تو چند دوستوں کے اصرار پر میلے میں جانے کا پروگرام بنا۔ یوں بھی کچہری میں چار پانچ دنوں کی چھٹیاں تھیں۔ اس لئے کچہری کے ناغہ ہونیکا سوال بھی نہیں تھا۔ بات یہ طئے ہوئی کہ خواجہ کلاں گھاٹ سے براہ راست اسٹیمر کے ذریعہ سون پور چلا جائے۔ اس وقت یہی میلے میں پہونچنے کی آسان راہ بن گئی تھی۔ صبح کو دو نوکر اسباب اور فرش فردش اور کھانا پکانے کا سامان لیکر روانہ ہوگئے۔ ان کو یہ بھی تاکید کر دی گئی تھی کہ جاتے ہی نخاس میں ایک عمدہ

دوپٹا وسیع خیمہ اور غسل خانے کیلئے اس کے بغل میں ایک راوٹی کرایہ پر لے لیں۔ اسی دن شام تک ہم سبھوں کے پہونچنے کا پروگرام تھا۔ اندازہ کے مطابق مغرب کے قریب ہم سب بھی وہاں پہونچ گئے۔ نوکروں نے سامان لیس کر رکھا تھا، خیمہ بھی عمدہ اور کشادہ تھا، پیچھے کی طرف لگی ہوئی غسل خانہ کی راوٹی بھی تھی، فرش پر دریاں اور قالینیں بچھی ہوئی تھیں۔ پہونچے تو ہلکا سا ناشتہ کیا اور چائے پی اس کے بعد فکر ہوئی کہ اور دوستوں کو بھی ڈھونڈھیں کہ کہاں کہاں قیام پذیر ہیں۔ اکثر احباب یہیں نخاس ہی میں مل گئے جو مختلف خیموں، میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم سبھوں نے مل کر رات کے لئے پروگرام بنا ڈالا۔ خیمے میں واپس آئے تو کھانا کھا کر گانا سننے کے لئے حسب تجویز ایک دوست کے خیمے میں جا پہونچے یہیں دو چار گانے والیاں بلائی گئیں تھیں۔ تین چار گھنٹوں تک یہیں گانے بجانے کی چھوٹی سی محفل برپا رہی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی ہم سب واپس اپنے خیمے میں آکر اپنے اپنے بستر پر دراز ہوگئے۔ نیند ٹوٹی تو صبح کی سلامی نوکروں نے گرم گرم چائے کے ساتھ دی۔ کچھ دیر کے بعد ہم سب ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ سارنگی پر بھیرویں کی ہلکی دھن ڈھولک کے سہارے بجتی ہوئی خیمے کے قریب آتی ہوئی سنائی دی۔ خیمے کے پردے اٹھے ہوئے تھے میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان سارنگیا سارنگی پر بھیرویں کا دھیمے دھیمے مزے کا راگ بجاتا ہوا اس کے بغل میں سولہ سترہ برس کا ایک لڑکا ڈھولک پر بھیرویں کے راگ کا ساتھ دیتا ہوا اور ان دونوں کے پیچھے ایک نوجوان حسین کنچنی صاف ستھری ساری باندھے، بدن پر ڈھیلا ڈھالا پوری آستین کا کرتہ، سر پر قرینے سے ساری کا آنچل، کانوں میں کرن پھول اور ہاتھوں میں صرف کانچ کی چوڑیاں پہنے سیدھے، میرے خیمے میں سب داخل ہوئے نوجوان کنچنی جھجک کر خیمے کے در پر ہی کھڑی رہی مگر سارنگئے نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا کہ سرکار اگر حکم ہو تو ہم سب کچھ گانا سنائیں۔ میں نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا کہ پوچھوں کہ ان کی کیا رائے ہے کہ

اتنے میں میرے ایک دوست سبقت کر کے خود ہی بول اٹھے کہ بھئی ضرور گانا سناؤ، ہم سب مشتاق ہیں۔ اب سارنگئے نے نوجوان کنچنی کو اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھی تو بجائے ایک بے باک اور نیم مہذب کنچنی کے بڑی مہذب اور شریفانہ طور اطوار کی لجاتی ہوئی ایک حسین عورت نظر آئی جس نے بڑی تہذیب کے ساتھ ہی ہم سبھوں کو سلام کیا اور قرینے سے ایک کونے میں بیٹھ گئی ساتھ ہی ساتھ اس کے دونوں ساتھی بھی اس کے پاس بیٹھ گئے ان کنچنیوں کا قاعدہ ہے کہ کھڑی کھڑی گاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ناچتی بھی جاتی ہیں مگر یہاں تو قاعدہ ہی بدلا ہوا نظر آیا ہم لوگ حیرت سے اس کنچنی کا انداز اور اس کی صورت دیکھ رہے تھے اس کا چہرہ اس کے اندرونی جذبات کا آئینہ دار بنتا جارہا تھا کبھی شریفانہ شرمیلا پن جس کو حیاء کہیئے، کبھی دلی ہیجان اور گھبراہٹ لبوں پر ساتھ ساتھ حسرت بھری تلخ مسکراہٹ۔ ان ابھرتے ہوئے مختلف جذبات سے اس کے چہرے پر نئے نقش و نگار بن رہے تھے جس کو رہ رہ کر وہ آنچل کے اوٹ میں چھپا رہی تھی ۔ سچ پوچھئے تو ان نقش و نگار کے پردوں میں مجھے کوئی عبرتناک کہانی چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ وہ سر جھکائے ہوئے کچھ دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر بھیرویں کی دھن میں ایک نعت اس نے شروع کی یہ گانا ختم ہوا تو وہ میرا جی کا ایک بھجن گانے لگی معلوم ہوتا تھا کہ بھجن کے تاثرات میں وہ خود کھوئی جارہی تھی اس کے والہانہ راگ نے ہم سبھوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ گانا ختم ہوا تو اس نے ہلکی سے آہ بھری اور چپ ہو گئی وہ ایک منٹ تک خاموش رہی پھر بولی کہ "سرکار اگر حکم ہو تو اور گاؤں" میرے ایک بے تکلف دوست نے غزل کی فرمائش کردی۔وہ آدھے منٹ تک گنگناتی رہی پھر اس نے ایک غزل شروع کی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ موسیقی کے فن سے بڑی حد تک وہ کوری تھی، لحن میں رس تھا مگر پختگی نہ تھی۔ زبان سے جو بول نکلتے تھے کبھی کبھی وہ بے تالے ہو جاتے تھے۔ مگر فطرت کی فیاضیاں ہر کمی کو پورا کر رہی تھیں۔ اس کی آواز میں غضب کا سوز و گداز تھا اور اس کے ترنم میں بلا کی لچک تھی جو دل میں چٹکیاں

لے رہی تھیں۔ اس نے جو غزل گائی اس کا ایک مصرعہ ابھی تک مجھے یاد ہے۔
"کمال تیرا ہے میرا کوئی کمال نہیں"۔ یہ غزل تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔
گانا ختم ہونے کے بعد میرے بے تکلف دوست نے جب اس سے ناچ کی فرمائش کی تو
وہ گھبرا اُٹھی۔ اس کے ساتھی سارنگئے نے کہا "سرکار یہ ابھی ناچنا نہیں جانتی ہیں، سیکھتے
سیکھتے یہ بھی سیکھ لیں گی" مجھے یہ جملہ عجیب معلوم ہوا۔ میں نے دو روپئے انعام کے
دئے تو سارنگیا کچھ عذر کرنے ہی کو تھا کہ اس عورت نے اس کو اشارے سے منع کیا
مگر میں نے دو روپئے اور بڑھا دیئے۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ سلام کر کے وہ
چاروں روپئے اٹھا کر سارنگئے کو دے دئے اور کھڑی ہو گئی۔ میں اس کی ہر حرکت کو
غور سے دیکھ رہا تھا۔ جانے کے لئے اس نے جھک کر پھر مودبانہ سلام کیا تو اور حیرت
بڑھی کہ یہ تو شریف گھرانے کی عورتوں کا طریقہ تھا۔ میرے ایک دوست نے اس
سے کہا۔ "ہم دو چار دن یہاں ہیں، روزانہ آکر اپنا گانا سنا جایا کرو" وہ تو کچھ نہ بولی مگر
سارنگئے نے کہا کہ "یہ سرکار کی غریب پروری ہے جو سرکار ایسا کہتے ہیں۔ ہم ضرور
آئیں گے"۔ یہ سب چلے گئے تو ہم سبھوں میں اس کے حسن اور اس کے گانے کا
تذکرہ چلا۔ میں نے کہا کہ یہ سب تو خیر ہے مگر کیا تم لوگوں نے اس کے طور اطوار پر
نظر نہ کی اور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے نہ دیکھا؟ مجھے تو اس کی زندگی
میں کوئی گہرا راز چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میرے دوسرے ساتھی بولے "بھئی راز کیا
ہوگا۔ ان سبھوں کی زندگی تو کھلی ہوئی کتاب ہے۔ بچپن سے اسی گانے بجانے کے
ماحول میں پلیں، شہروں اور میلوں کا چکر لگا کر ناچیں گائیں، پیسے کمائے، جب سن سے
اتر گئیں تو اپنی نوچی کو اپنے دھندھے میں لگا دیا" میں نے کہا کہ عام طور سے صحیح ہے
مگر کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اس کی زبان کتنی شستہ تھی، اس کی گفتگو اور اس کے اٹھنے
بیٹھنے میں کتنی شائستگی، تہذیب اور حیاء داری کی جھلک تھی اور اس کی وضع اور اس کا
لباس بھی عام کنچنیوں سے کتنا مختلف شریف عورتوں جیسا تھا۔ پھر اس کے ساتھی کا یہ

جملہ کہ ابھی ناچنا نہیں جانتیں بعد میں سیکھ لیں گی ، یہ سب باتیں تو مجھے تعجب میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اس درمیان میں کچھ اور دوست آگئے اور یہ تذکرہ یہیں پر ختم ہو گیا۔ ہم پھر مل کر سیر سپاٹے کو نکل گئے ۔ دوسرے دن صبح میں ناشتہ ہی کھارہا تھا کہ میرے بڑے ماموں سید عبد المجید صاحب مرحوم کے ملازم عالم میاں مجھے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ سرکار کل شام کو چھتر کے میلے میں آئے ہیں۔ پٹنہ ہی میں معلوم ہوا تھا کہ آپ بھی چھتر کے میلے میں گئے ہیں۔ اس وقت سرکار نے آپ کو اپنے کیمپ میں بلایا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کہاں قیام ہے تو عالم میاں نے بتایا کہ مہی ندی کے کنارے خیمے لگائے گئے ہیں ، سید ابراہیم حسین صاحب اور مسٹر یوسف حسین بھی وہیں ہیں اور دو چار احباب بھی ان سبھوں کے ساتھ وہیں قیام پذیر ہیں میں اپنے دوستوں سے دو تین گھنٹوں کی غیر حاضری کی معذرت کر کے عالم میاں مرحوم کے ساتھ اپنے ماموں صاحبان کی خدمت میں پہونچا تو سبھوں نے کہا کہ یہیں کیوں نہیں چلے آتے ہو ، کئی خیمے ہیں ، پورا باورچی خانے کا انتظام بھی ساتھ ہے ؟ میں نے عذر کیا کہ میرے ساتھ دو تین دوست ہیں ان کو چھوڑنا مشکل ہے اور وہ شاید میرے ساتھ یہاں آنے پر راضی بھی نہ ہوں گے ۔ اس معذرت نے مجھ کو معافی دلا دی جس کی مجھے دلی خوشی بھی ہوئی نہیں تو میلے کی تماشہ بینی ان بزرگوں کے ساتھ رہنے میں ختم ہی ہو جاتی۔ اپنے خیمہ میں واپس آیا تو میرے ساتھیوں نے کہا کہ بھئی وہ آئی تھی اور آج تو خوب گائی ۔ میں سمجھ گیا کہ وہی کل والی کنچنی ہوگی ۔ دوپہر کا کھانا کھاکر پھر میلے کی سیر کو ہم سب چل پڑے ۔ غالباً اس دن ریس دیکھنے یا پولو کا میچ دیکھنے کا پروگرام تھا جو ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ہوا کرتا تھا۔ رات کا کھانا کھاکر پہلے ہی سے طئے شدہ پروگرام کے مطابق ہم سب تھیٹر دیکھنے گئے ۔ تقریباً تین بجے شب میں واپسی ہوئی ، آتے ہی ہم سب بستر پر پڑ کر سو گئے ، صبح میں دیر سے اٹھے ، رات کی کسل باقی تھی اس لئے ہم سبھوں نے غسل کیا ، ابھی ناشتہ ختم ہی ہوا تھا اور چائے کا دور چل ہی

رہا تھا کہ کیا دیکھا کہ وہی سارنگیا اور اس کے پیچھے اس کی کنچنی اور ڈھولک بجانے والا لڑکا یہ سب چلے آرہے ہیں۔ سارنگیا تو سیدھے خیمے کے اندر چلا آیا مگر کنچنی خیموں کے پردوں سے لگی باہر ہی کھڑی رہی۔ سارنگئے نے ہم سبھوں کو سلام کیا تو میں نے اس سے کہا کہ گانے والی کو تو اندر بلالو اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور عورت کو اشارہ کیا کہ اندر آجائے۔ آج بھی اس کی جھجک قائم تھی بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بجائے گھٹنے کے اس کی جھجک آج کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی وہ خیمے کے اندر آکر ایک طرف کونے میں کچھ افسردہ کچھ شرمائی ہوئی، خاموش بیٹھ گئی اس کے ساتھی نے اس کو آگے بڑھ کر بیٹھنے کو کہا مگر وہ جب اپنی جگہ ہی بیٹھی رہی تو آخر سارنگیا اور ڈھولک والا لڑکا بھی کنچنی کے پاس ہی آکر بیٹھ گئے۔ سارنگئے نے سارنگی پر ایک غزل کی دھن چھیڑی، تھوڑی دیر تک وہ یہی دھن بجاتا رہا اور لڑکا ڈھولک پر اس کا ساتھ دیتا رہا مگر یہ کنچنی نہ معلوم کس خیال میں محو چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آخر میں سارنگئے نے اس سے کچھ کہا تو وہ بھی گنگنانے لگی مگر اس کے انداز سے اس کی بے دلی ظاہر تھی۔ آج اس کا گانا اکھڑا اکھڑا معلوم ہو رہا تھا اور وہ خود بھی بڑی بے کیف نظر آرہی تھی، اس نے دو ایک چیز گائی تو میرے ایک دوست نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ آج گانے میں تمہارا جی نہیں لگ رہا ہے۔ اس نے جواب دیا "آج طبیعت خراب معلوم ہو رہی ہے، میں تو نہ آتی مگر آپ سبھوں کا حکم تھا اس لئے چلی آئی"۔ میں نے کہا "ہاں جی کل صبح ہی مجھے ایک جگہ جانا پڑا، اخیر میں نہ تھا تو یہ سب تو تھے" بولی "جی ہاں آپ سب ہی میرے سرکار ہیں" پھر اس انداز سے چپ ہو گئی کہ مجھے لگا کہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ گانا ختم ہی ہو چکا تھا، میں نے آج اس کو پانچ روپئے دئے۔ یہ روپئے اس نے اپنے ہی پاس رکھ لئے اور پہلے دن کی طرح اپنے سارنگئے کے حوالے نہ کئے۔ یہ سب اٹھ کر جانے کے لئے خیمے سے باہر نکلے ہی تھے کہ وہ کنچنی الٹے پاؤں پھر واپس آئی۔ غالباً وہ رخصتی سلام کرنا بھول گئی تھی۔ اس نے ہم سبھوں کو جھک کر

سلام کیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ چلی گئی۔ اسی دن دوپہر کے بعد ہی میرے ایک نئے موکل بدحواس مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے خیمے میں آئے۔ ان کا مقدمہ تیسرے دن کھلنے والا تھا وہ سر ہو گئے کہ آج ہی چلئے اور کاغذات اور مقدمہ کی نقل کو دیکھ کر جرح اور بحث کے لئے تیار ہو جایئے۔ میرے سینئر وکیل بیمار ہو گئے تھے۔ اس لئے یہ سب مجھ ہی کو کرنا تھا۔ نئے وکیل کی مصیبت سب لوگ جانتے ہیں۔ موکل کی ہر خواہش اس کو پوری ہی کرنی پڑتی ہے۔ مجھے بھی وہی کرنا پڑا۔ اسی دن بستر لپیٹا اور دوسروں کو لیکر گھر واپس چلا آیا۔ دوسرے سال پھر انہی دوستوں کے اصرار پر سون پور کے میلے میں جانا پڑا۔ وہیں نخاس میں قیام ہوا۔ ایک دن دیکھا کہ وہی اگلے سال والا سارنگیا قریب کے ایک خیمے سے اکیلا نکلا۔ غالباً وہاں گانا بجانا ختم کر کے واپس جاتا ہو گا۔ اس دفعہ اس کے ساتھ کوئی کنچنی نہیں تھی وہ اکیلا ہی سارنگی پر ہلکی ہلکی کوئی دھن بجا رہا تھا۔ میرے خیمے کے پاس پہونچا تو میں نے اس کو بلایا، وہ بھی مجھے اور میرے دوستوں کو پہچان کر سیدھا میرے خیمے میں چلا آیا۔ اس نے سلام کیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ گذشتہ سال والی عورت کیا ہوئی؟ اس نے کہا کہ "سرکار کیا آپ مرادن کو پوچھتے ہیں؟" میں نے جواب دیا" بھلا میں اس کا نام کیا جانوں، میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ اگلے سال جو تمہارے ساتھ گانے والی تھی وہ کیا ہوئی؟" کہنے لگا کہ سرکار وہی تو مرادن تھی، وہ تو مجھے چھوڑ کر اللہ میاں کے یہاں چلی گئی، میں نے دیکھا یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور پھر وہ مضطرب ہو کر چپ ہو گیا۔ یہ موقع زیادہ پوچھ گچھ کا نہ تھا اس لئے میں نے اس سے کہا کہ "آئے ہو تو کچھ گانا سناؤ"۔ وہ فرش پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ سارنگی کے تاروں کو درست کر کے اس نے حمد میں ایک غزل شروع کی۔ یہ غزل ختم ہوئی تو اس نے نعت کی ایک غزل لگائی۔ اس کے گانے میں رس تو نہ تھا، سوز ضرور تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ چپ ہو گیا، میں نے دیکھا تو اس کے چہرے پر حسرت

برس رہی تھی۔ میں نے دو روپے اس کی نذر کئے۔ جب وہ چلنے لگا تو میں نے اس سے کہا "بھئی اپنی فرصت کے وقت تم تنہا آجاؤ، میں تم سے کچھ باتیں کروں گا" وہ "بہت بہتر" کہہ کر چلا گیا۔ مجھے کرید ہونے لگی تھی کہ اس کی ساتھی مرادن کا اس سے قصہ سنوں۔ اسی دن سہ پہر کے وقت وہ سارنگیا اکیلا میرے پاس آیا۔ اتفاق دیکھئے میں بھی تنہا تھا۔ میرے دوست کہیں باہر گئے تھے۔ اس دفعہ شروع ہی سے میں نے دیکھا تھا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام بھی نہیں تھا اور وہ بالکل رندھا رندھا معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ میرے قریب بیٹھ چکا تو میں نے اس سے کہا "اب بتاؤ تمہاری مرادن کو کیا ہوا تھا، اور وہ کس طرح مر گئی اور یہ بھی سچ سچ بتاؤ کہ تم اس کو کہاں سے لائے تھے۔ کیونکہ وہ تو تمہارے جرگے کی عورت نہیں معلوم ہوتی تھی" اس نے جو قصہ بیان کیا وہ بڑا عجیب بھی حسرتناک بھی اور عبرت انگیز بھی تھا۔ ذیل کے سارے واقعات اسی کے بیان کئے ہوئے ہیں جن کو میں اپنے الفاظ میں لکھ رہا ہوں۔ یہ قصہ کچھ طولانی بھی ہے اور کچھ اتنے دنوں کی بات ہے کہ اس کا احتمال ہو سکتا ہے کہ کچھ واقعات چھوٹ گئے ہوں۔ بہر حال جو کچھ میرے حافظے میں محفوظ ہے اس کو میں بجنسہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔ میں رائے بریلی کا رہنے والا ہوں میرے محلہ کے قریب ایک محلہ مغل گنج ہے، وہاں ایک خاندانی شریف آدمی رہا کرتے تھے جو مرزا صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ پہلے تو بہت کچھ باپ دادا کے پاس تھا مگر اب مٹتے مٹاتے صرف ایک پرانی حویلی رہ گئی تھی جو بہت کچھ تو گر گئی تھی اور گرتی جارہی تھی، جو حصہ اس کا بچ رہا تھا اس میں میاں بیوی رہتے تھے۔ یہ حصہ بھی اچھا خاصہ ایک چھوٹا سا پختہ مکان تھا، پہلے کا بچا بچایا کچھ رہ گیا ہوگا اسی سے ایک گونہ آرام کی زندگی گزارتے تھے، کوئی اولاد نہ تھی اس لئے دور کے ایک عزیز کی لڑکی کو لے پالک کر رکھا تھا۔ اس لڑکی کے ماں باپ پہلے ہی مر چکے تھے، اسی کے بعد مرزا صاحب اس یتیم بچی کو اپنے یہاں اٹھالائے، نام تو اس کا مراد النساء تھا مگر پیار سے اسے مرادن کہہ کر پکارتے تھے۔ دولت تو اب

باقی نہیں رہی تھی مگر آس پاس کے محلوں میں اب بھی مرزا صاحب کی کافی عزت تھی اور یہ بھی اپنے باپ دادا کے نام کو بچائے ہوئے سب سے الگ تھلگ گھر میں اپنا زیادہ وقت گزارتے تھے ۔ مرادن کو خود پڑھاتے اس کو تمیز اور سلیقہ کی باتیں بتاتے تھے ۔ ان کی بیوی بھی خانہ داری کا انتظام ، سینا پرونا ، طرح طرح کا کھانا پکانا ، سب کچھ بتاتی رہتی تھیں ۔ خدا نے مرادن کو حسن کے ساتھ گلا بھی اچھا دیا تھا ۔ حمد و نعت ترنم سے جب پڑھتی تو مرزا صاحب اور ان کی بیوی لوٹ پوٹ ہو جاتے ۔ میلاد شریف کی مجلسوں میں اور شادی بیاہ کی تقریبوں میں ، مرزا صاحب کی بیوی اس کو ساتھ لے جاتیں ، یہ میلاد شریف بھی بڑے مزے میں پڑھتی اور شادی بیاہ میں ٹونا سہاگ ، اس لطف سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر گاتی کہ شادی کی محفل لہک اٹھتی تھی ۔ اب مرزا صاحب اور ان کی بیوی کو اس کی شادی کی بھی فکر ہونے لگی تھی ۔ مرزا صاحب ایک اچھے شریف کماؤ لڑکے کی تلاش میں تھے ۔ لوگوں کو یقین تھا کہ مرزا صاحب اپنی حویلی مرادن کو دے جائیں گے ، جس کی قیمت اس کی خراب اور شکستہ حالت پر بھی بیس پچیس ہزار روپے سے کم نہ تھی ۔ میری ذات برادری کے لوگ بھی مرزا صاحب کے گھر سے پلتے رہتے تھے ۔ اگرچہ اب مرزا صاحب کی مالی حیثیت پہلے جیسی نہ رہی تھی پھر بھی ہم لوگ عید ، بقر عید اور کبھی یوں بھی اگر ان کے یہاں چلے جاتے تھے تو دو چار روپے ان سے یا تو ان کی بیوی سے مل ہی جاتے تھے ۔ میری ماں کو مرزا صاحب کی بیوی بہت چاہتی تھیں اور وہ ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ ان کے گھر کا پھیرا ضرور لگاتی تھی ۔ مرزا صاحب کی بیوی کو حمد و نعت سننے کا بڑا شوق تھا ۔ یہی چیزیں مرزا صاحب کی بیوی میری ماں سے سنتیں اور کچھ نہ کچھ دیکر اس کو گھر لوٹاتیں ۔ ایک دن اچانک ہم سبھوں کو معلوم ہوا کہ رات میں مرزا صاحب اور ان کی بیوی کو ڈاکوؤں نے گھر میں گھس کر قتل کر دیا اور جو کچھ اثاثہ اور بچا بچایا مال گھر میں اور ان کی لوہے کی الماری میں تھا ، لیکر غائب ہو گئے ۔ جب محلے کے لوگ چیخ پکار سنکر مرزا صاحب کے گھر پہونچے تو ڈاکو جا

چکے تھے ۔ مرزا صاحب اور ان کی بیوی زخموں سے چور ہو کر مرچکی تھیں اور مرادن سخت زخمی اور بے ہوش ہو کر ایک طرف پڑی ہوئی تھی ۔ پولس آئی تو اس نے دو لاشوں پر قبضہ کر لیا اور مرادن کو اٹھا کر اسپتال پہونچا دیا۔ میری ماں کو مرزا صاحب اور ان کی بیوی سے بڑی عقیدت اور محبت تھی ۔ اس خبر کو سنکر بہت روئی اور پھر مجھ کو ساتھ لیکر مرزا صاحب کے گھر پہونچی ۔ وہاں خاک اڑ رہی تھی ۔ دروازے پر پولس کا پہرا تھا۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی ۔ رات ہی میں پولس نے مرزا صاحب اور ان کی بیوی کی لاشوں کو ڈاکٹری معائنہ کے لئے بھیج دیا تھا۔ اب وہاں سے لوگ ان لاشوں کو دفن کرنے کے لئے قبرستان لے گئے تھے ۔ یہ سنکر ہم دونوں ماں بیٹے بھاگم بھاگ قبرستان پہونچے ۔ میاں بیوی دو قبروں میں اغل بغل دفن کئے جاچکے تھے اور قبر کی مٹی برابر کی جارہی تھی ۔ آج دیکھا تو مرزا صاحب کی برادری کے کچھ لوگ آگے آگے تھے جو زندگی میں کبھی ان کے یہاں آتے بھی نہیں تھے ۔ میری ماں مرزا صاحب کی بیوی کی قبر سے لپٹ کر خوب روئی ، میں بھی کھڑا دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا ۔ جب سب لوگ فاتحہ پڑھ کر چلے گئے تو ماں نے مجھ سے کہا کہ ذرا اسپتال ہوتے چلیں اور مرادن بٹیا کو بھی دیکھ لیں کہ اس غریب بچی کا کیا حال ہے ۔ اسپتال پہونچے تو ایک نرس سے معلوم ہوا کہ سینے پر چھرے کے دو زخم لگے ہیں ۔ زخموں میں ٹانکے دے دئے گئے ہیں ۔ مگر بے ہوشی ابھی تک ہے اور مریضہ کے پاس جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے ۔ ہم دونوں اسپتال سے گھر واپس آئے گھر آکر بھی ماں روتی رہی ۔ کبھی مرزا صاحب اور ان کی بیوی کو یاد کرتی ، کبھی مرادن کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگتی ۔ دوسرے دن ہم دونوں پھر اسپتال پہونچے ۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ اب مریضہ کی حالت کچھ اچھی ہے ۔ خطرہ ٹل گیا ہے اور اب ہوش بھی آگیا ہے ۔ یہ باتیں اسپتال کے دربان سے معلوم ہوئیں ، جو ہم دونوں کی منت سماجت پر اسپتال کے اندر جاکر مریضہ کی حالت دریافت کر آیا تھا ۔ اسی دربان نے پھر نرس سے ہم دونوں کو

مریضہ کے پاس جانے کی اجازت بھی دلوائی۔ میں نے مرادن کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ، وہ پردے میں بیٹھنے والی، مرزا صاحب کی منہ بولی بیٹی، میرے سامنے بے پردہ کیسے آتی آج یہ مقدر کا کھیل تھا کہ وہ کسمپرسی کی حالت میں لاوارث مریضوں کی طرح اسپتال میں بے پردہ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے مریضوں کی ایک مسہری پر آج اس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس کی شرافت کا جلال سمجھئے یا اس کا ہم سبھوں سے بلند درجہ کہ مجھے اس کو بھر نظر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی اور میں اس کی مسہری سے دور کھڑا رہ گیا۔ اس نے میری ماں کو دیکھا تو آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے اور مصیبت میں جس طرح کوئی اپنے ہمدرد کو پاکر بلک بلک کر رونے لگتا ہے وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں لپک کر اس کے پاس پہونچی ، یہ بھی رو رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ دلاسہ بھی دیتی جاتی تھی۔ مرادن کا رونا کچھ کم ہوا تو ماں نے اس سے پوچھا کہ "بیٹا کوئی اپنا آدمی بھی تمہاری دیکھ بھال کرتا ہے ؟" اس پر اس نے سر کے اشارے سے نہیں کہا۔ دربان بھی وہیں پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ جب سے پولس اس کو اسپتال میں داخل کر گئی ہے اس کے بعد سے کوئی اسکی خبر تک پوچھنے نہیں آیا۔ مرادن پر رہ رہ کر رونے کا دورہ پڑ رہا تھا اور جوش گریہ میں اس کی زبان سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اتنے میں ایک نرس آگئی۔ اس نے میری ماں سے اور مجھ سے کہا کہ اب تم دونوں جاؤ۔ مریضہ اگر زیادہ روئیگی تو اس کے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جائیں گے اور اس کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہو جائے گی۔ ماں نے مرادن کو تسلی دی اور چلتے وقت کہا "بٹیا گھبرانا نہیں ، میں نے عمر بھر مرزا صاحب کا نمک کھایا ہے ، تم ان کی اور ان کی بیوی کی نشانی ہو میں تمہاری ہر حال میں خدمت کروں گی" ہسپتال کے کمرے سے ہم دونوں باہر نکلے تو ماں نے مجھ سے کہا کہ مرادن بٹیا کو ہسپتال میں مجھ سے اکیلا نہیں چھوڑا جاتا۔ پھر اس نے دربان سے بڑی لجاجت سے کہا "بھیا کوئی ایسا سامان کردو کہ میں اس لڑکی کے ساتھ ہسپتال میں رہوں" دربان کو بھی مرادن کے ساتھ ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ

میری ماں کو سیدھا ڈاکٹر کے کمرے میں لے گیا۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ ڈاکٹر کے کمرے سے ماں خوش خوش واپس آئی اور کہنے لگی کہ "ڈاکٹر صاحب نے مجھے مرادن بٹیا کے پاس رہنے کی اجازت دے دی ہے اور استپال میں رہنے کا یہ ٹکٹ بھی دے دیا ہے۔ اب جلد گھر واپس چلو تاکہ میں اپنا بستر الیکر اسی وقت یہاں چلی آؤں۔ جب تک مرادن بٹیا ہسپتال میں رہیں گی میں بھی اس کے ساتھ رہوں گی" گھر آکر ماں نے اپنا کمبل اور چادر سنبھالا ٹین کے بکس سے دو چار روپئے نکالے اور مجھ کو تاکید کر کے کہ گھر کو اکیلا نہ چھوڑنا اور کھانا پکا کر کھالینا، ہسپتال چلی گئی۔ دوسرے دن ماں ہسپتال سے صبح میں گھر آئی تو اس نے بتایا کہ اب مرادن بٹیا پہلے سے اچھی ہیں۔ پاؤروٹی اور دودھ اسپتال سے جو ملتا ہے آج انہوں نے تھوڑا سا کھایا۔ ڈاکٹر نے پھل بھی بتایا ہے جو میں بازار سے ان کے لئے خرید لائی ہوں۔ مرادن کی حالت بتاکر اور ایک نظر گھر کو دیکھ کر ماں پھر ہسپتال چلی گئی۔ اس طرح ماں کئی روز تک ہسپتال سے صبح میں آتی، مرادن کی حالت بتاتی اور ضرورت کے لئے کچھ پیسے اپنے بکس سے نکال کر ہسپتال واپس جاتی۔ ڈاکٹر نے اب مرادن کو گوشت کا شوربہ بھی بتایا تھا کہ اس سے قوت آئے گی۔ صبح میں ماں آتی تو تھوڑا سا بکرے کا تازہ گوشت بھی خرید لے جاتی۔ ایک ہفتہ کے بعد میری ماں نے یہ خوش خبری سنائی کہ ڈاکٹر نے اب کہا ہے کہ مرادن بٹیا کا زخم مزے سے بھر رہا ہے اور امید ہے کہ دس بارہ دنوں میں وہ بالکل اچھی ہو جائیں گی۔ اس دن میری ماں بہت خوش تھی۔ اس درمیان میں ایک دن ماں ہسپتال سے آئی تو کہنے لگی "دو ایک دن میں مرادن بٹیا کا نام ہسپتال سے کٹ جائے گا۔ اب وہ اچھی ہیں مگر مجھے بڑی فکر ہے کہ اس کے بعد مرادن بٹیا کا کیا ہوگا؟ مرزا صاحب کے کوئی عزیز ابھی تک اس کی خبر بھی پوچھنے نہیں آئے۔ محلے والوں میں سے بھی کوئی نہ آیا۔ اس حالت میں آخر اس کا ٹھکانہ کہاں ہوگا"۔ میں نے ماں سے کہا کہ چلو ذرا دیکھیں کہ مرزا صاحب کے مکان پر اب کس کا قبضہ ہے۔ یہ مکان تو مرادن بٹیا کا ہی ہونا چاہئے۔ یہ بھی پتہ لگائیں

کہ مرادن بٹیا کی کون کون سی چیزیں لوٹ مار سے بچیں۔ ہم دونوں مرزا صاحب کے محلے میں پہونچے۔ مرزا صاحب کا مکان نظر آیا تو دیکھا اس میں تالا پڑا ہے۔ اب پولس کا پہرہ بھی اٹھ چکا تھا۔ محلے والوں سے پوچھا کہ مکان کس کے تعلق ہے تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے دور کے عزیز قدیر صاحب' اب وہی مکان کے مالک اور مرزا صاحب کے وارث ہیں۔ ایک دن یہی قدیر صاحب آئے تھے۔ مکان کو دیکھا بھالا، وہاں جو چیزیں بچ رہی تھیں ان کو باہر نکال کر اپنے ساتھ لے گئے اور مکان میں تالا لگا دیا۔ محلے والوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قدیر صاحب مرزا صاحب کے مکان کو اب بیچنے کی فکر میں ہیں مگر سردست کوئی اچھا کرایہ دار مل گیا تو کچھ دنوں کے لئے مکان کو کرایہ پر اٹھا دیں گے۔ ماں کرید کرید کر حال پوچھ رہی تھی۔ اس کے ایک سوال پر کہ مرزا صاحب اور ان کی بیوی کے قاتلوں کا پتہ ملا یا نہیں، محلے والوں نے کہا کہ ابھی تک تو پتہ نہیں چلا ہے اور یہ بھی ہے کہ مرزا صاحب کے وارث قدیر صاحب بھی مقدمہ کے آگے پیروی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس سے کچھ شبہہ ہوتا ہے کہ اس قتل اور لوٹ میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ محلے والوں سے قدیر صاحب کے مکان کا پتہ لیکر اب ہم دونوں قدیر صاحب کے یہاں پہونچے۔ وہ ایک مختصر سے کچے مکان میں رہتے تھے۔ آگے کا بیٹھکا کھلا ہوا تھا اور ایک صاحب ادھیڑ عمر کے چوکے کے میلے کچیلے فرش پر بیٹھے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے ہم دونوں سیدھے ان کے پاس گئے، قدیر صاحب کا نام لیا تو بولے میں ہی ہوں اور پھر کام پوچھا۔ ماں نے کہا "ہم ہسپتال سے آرہے ہیں جہاں مرزا صاحب کی بٹیا کو زخمی حالت میں پولس نے داخل کر دیا تھا۔ اب یہ مرادن بٹیا اچھی ہیں۔ دو ایک دن میں ان کا نام ہسپتال کے مریضوں کی فہرست سے کٹ جائے گا اب تو آپ ہی ان کے وارث ہیں اس لئے آپ جاکر مرادن بٹیا کو اپنے یہاں لے آئیں" یہ سننا تھا کہ قدیر صاحب بپھر گئے، سینکڑوں صلواتیں غریب مرادن کے نام کہہ ڈالیں پھر ہم سے کہنے لگے "یہ مرادن کون ہوتی ایک چھوکری بھابھی

صاحبہ نے رکھ لی تھی۔ اب وہ نہیں ہیں تو یہ چھوکری اپنے لئے کوئی دوسری جگہ تلاش کرے" میں اور میری ماں یہ سن کر سناٹے میں آگئے۔ یا خدا یہ کیسا انقلاب تھا نہ ہی مرادن جس کو مرزا صاحب اور ان کی بیوی نے اپنی آنکھوں کا تارا بنا کر پالا تھا آج وہی ان کے مرنے کے بعد راہ کے راہی سے بھی زیادہ ناقابل توجہ اور غیر سمجھی جا رہی تھی۔ ماں نے قدیر صاحب سے کہا کہ خیر یہ تو آپ جانیں، اگر آپ مرادن بٹیا کو اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہیں تو ان کے جو بھی اسباب اور کپڑے بچ رہے ہوں وہ تو دے دیجئے کہ غریب اپنی ستر پوشی کر سکے۔ اس پر بھی وہ بہت برہم ہوئے پھر کچھ سوچ کر اٹھے اور دو جوڑے معمولی پرانے کپڑوں کے اندر سے لاکر دیئے اور کہا کہ اس کا مال اور اسباب جو سمجھو، بس یہی ہے اور یہ ہمکو مرزا صاحب کے مکان میں ڈاکوؤں کی دست برد سے بچ کر ملا ہے ان کپڑوں کو لے جاؤ اور مرادن سے کہہ دو کہ ادھر کا کبھی رخ نہ کرے" ماں نے چپ چاپ کپڑے اٹھائے۔ راستہ بھر گم سم رہی مکان پہونچے تو ماں نے کہا "اچھا ہی ہوا"۔ میں نے پوچھا "اچھا کیا ہوا۔ اب مرادن بٹیا کہاں رہے گی ؟ ماں بولی "اچھا یوں ہوا کہ در در کی خاک چھاننے سے بچ گئی۔ نہ معلوم مرزا صاحب کے بھائی اس کی کیا گت بناتے اور پھر وہ ان کے یہاں سے ٹھکرائی ہوئی کہاں کہاں ماری پھرتیں۔ اب اگر مرادن بٹیا کا کوئی نہیں تو ہم تو ہیں وہ اسی گھر میں رہیں گی۔ دو کوٹھریاں ہیں، ایک میں ان کے لئے خالی کردوں گی اس میں میں اور مرادن بٹیا ساتھ رہیں گے۔ دوسری کوٹھری میں اسباب رہے گا اور تو بھی رات میں وہیں سو رہنا"۔ ماں مجھ کو ایک کوٹھری کے صاف کرنے کی ہدایت دیکر ہسپتال چلی گئی۔ دوسرے دن صبح میں آئی تو میں نے پوچھا مرادن بٹیا کب آتی ہیں۔ ماں نے کہا کہ "ہسپتال سے تو ان کا نام آج ہی کٹ رہا تھا مگر مرادن بٹیا نے ڈاکٹر سے بڑی آرزو منت کر کے ایک دن کے لئے نام کا کٹنا رکوایا ہے۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ مجھ سے جب سنا کہ مرزا صاحب کے عزیز ان کو برا بھلا کہتے ہیں اور گھر پر ان کے آنے کے بھی روادار نہیں تو

مرادن بٹیا رو رو کر اپنا برا حال کیا۔ میں گھنٹوں ان کو سمجھاتی رہی وہ میرے یہاں آنے پر بھی راضی نہیں ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی اپنا بیگانہ بھی نظر نہیں آتا آخر وہ کیا کریں گی؟ بہت کچھ سمجھا بجھا کر آئی ہوں شاید ان کی سمجھ میں آجائے اور کل میرے یہاں آنے پر راضی ہو جائیں؟ اس کے بعد ماں نے مرادن کے لئے شوربہ بنایا اور اس کو لیکر پھر ہسپتال چلی گئی مگر کہتی گئی کہ کل صبح کو میں سیدھا ہسپتال چلا آؤں۔ ماں کے جانے کے بعد مجھے بھی بڑی تشویش رہی کہ سچ مچ مرادن کا کیا ہوگا دوسرے دن صبح کو میں ہسپتال پہونچا تو ماں مرادن کے پاس تھی۔ دیکھا تو مرادن منہ لپیٹے پڑی ہے اور ماں ان کو سمجھا رہی ہے۔ آخر بہت کہنے سننے پر راضی ہوئی کہ ہمارے ساتھ گھر چلیں گی، میں جاکر ٹانگا لے آیا۔ نرس اور دربان ٹانگے تک پہونچانے آئے۔ ٹانگے پر پیچھے مرادن اور ماں بیٹھیں اور میں آگے ٹانگے والے کے برابر بیٹھا۔ ابھی تک مرادن کی کمزوری کچھ باقی تھی۔ گھر آئے تو ماں نے مرادن کو ان کی کوٹھری میں پہونچا دیا۔ میں نے احتیاطاً چارپائی پر ایک دری بچھا دی تھی اور اس پر ایک صاف ستھرا تکیہ بھی رکھ دیا تھا۔ مرادن کو چارپائی پر بیٹھا کر ماں نے جلدی جلدی چولہا سلگایا، میں لپک کر بازار سے تھوڑا بکرے کا گوشت، پاؤروٹی اور دودھ لے آیا۔ شوربہ تیار کر کے ماں نے پاؤ روٹی کا دو ایک ٹکڑا شوربہ اور تھوڑا دودھ مرادن کو بہ اصرار کھلایا۔ اسپتال کے کچھ بچے ہوئے پھل بھی ساتھ آئے تھے، ان میں سے ایک کیلا اور ایک سنگترہ بہت کہہ سنکر ان کو کھلائے اس کے بعد میں گھر سے باہر چلا گیا۔ اب میں قصداً زیادہ تر باہر رہا کرتا تھا کیونکہ میرے سامنے آنے میں مرادن کو ابھی تک جھجک باقی تھی اور سچ پوچھئے تو میں اس کی جھجک کی قدر بھی کرتا تھا۔ چند دنوں میں قریب کے ایک گاؤں میں بڑا میلہ لگنے والا تھا اور مجھے وہاں گانے بجانے کے سلسلے میں کسی گانے اور ناچنے والی کو ساتھ لیکر وہاں جانا تھا۔ شہر میں میری برادری کے لوگ آس پاس کے دیہاتوں میں رہتے تھے۔ اس لئے کبھی تو شہر سے کوئی برادری کی عورت مل جاتی تو وہ میرے ساتھ چلی جاتی

نہیں تو میں دیہات جاکر برادری کی کسی گانے بجانے والی عورت کو میلوں میں جانے کیلئے لے آتا۔ اس دفعہ میرے ماموں زاد بھائی کی سالی میرے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی تھی اس کا شوہر شہر میں ٹانگا چلاتا تھا کیونکہ اس کو گانا بجانا آتا ہی نہیں تھا۔ چونکہ میلے کے دن قریب آرہے تھے اس لئے میں اپنے ساتھ والی کو تعلیم دینے کے لئے روزانہ اس کے گھر جانے لگا یہ بھی ایک وجہ تھی کہ میں گھر سے زیادہ تر غائب رہتا تھا۔

مرادن کو میرے یہاں آئے ہوئے دس بارہ دن ہوگئے ہوں گے کہ میں ایک دن شام کو گھر پہونچا تو دیکھا کہ میرے دروازے پر چھ سات سفید پوش شریف آدمی کھڑے ہیں اور ایک صاحب تیور بدلے میری ماں سے کہہ رہے ہیں "تجھے شرم نہیں آئی کہ ایک شریف زادی کو چپکے سے اٹھاکر ہسپتال سے اپنے گھر لے آئی"۔ میری ماں نے بھی منہ توڑ جواب دیا "جب کوئی شریف زادہ اس شریف زادی کو اپنے گھر پناہ دینے پر راضی نہ ہوا تو کیا میں اس غریب کو راہِ للّٰہ سڑکوں پر ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ آتی؟" معلوم ہوا کہ سب لوگ ان کو اپنے گھر لے جانے کے لئے آئے ہیں اور اسی لئے ماں سے جھگڑا کر رہے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ اس لڑائی جھگڑے مین معاملہ آگے بڑھ جائے گا اس لئے میں نے ان سفید پوشوں سے کہا "سرکار ہم آخر کیا کرتے۔ مرزا صاحب کا ہم لوگوں نے نمک کھایا ہے۔ جب ہم نے دیکھا کہ ہسپتال میں کوئی مرادن بیٹا کی خبر تک لینے نہیں آیا تو میں نے اور ماں نے مرزا صاحب کے عزیز قدیر صاحب سے اب جو مرزا صاحب کے وارث بن بیٹھے ہیں ان کے یہاں جاکر ان سے گڑگڑا کر کہا کہ وہ مرادن بیٹا کو ہسپتال سے اپنے یہاں لے آئیں مگر وہ اس بات پر آگ بگولہ ہوگئے۔ مرادن بیٹا کو گالیاں بھی دیں، برا بھلا بھی کہا اور کسی طرح ان کو اپنے یہاں رکھنے پر راضی نہیں ہوئے انھوں نے تو حد کردی کہ مرادن بیٹا کے کپڑے اور اس کی دوسری چیزیں بھی روک رکھیں اور کہا کہ ان کی کوئی بھی چیز گھر میں نہیں ملی، صرف دو جوڑے معمولی

کپڑوں کے میری ماں کے منہہ پر پھینک مارے اور مجھ کو اور میری ماں کو اپنے مکان سے نکال باہر کیا"۔ ان میں سے ایک صاحب بولے کہ "خیر اگر قدیر صاحب مرادن کو رکھنے پر راضی نہیں ہوئے تو کیا ہوا ہم لوگ مرزا صاحب ہی کے محلے کے رہنے والے ہیں ہم لوگ مرادن کو اپنے عزیزوں کی طرح آرام سے رکھیں گے اور اچھی جگہ اس کی شادی کر دیں گے۔" میں نے ماں کو سمجھایا کہ اگر ایسا ہے تو پھر مرادن بیٹا کے لئے تردد کی کیا بات ہے۔ یہ تو ان کے لئے بہتر ہی ہوگا۔ ماں لپک کر اندر گئی۔ اس کو باہر آنے میں دیر ہوئی تو میں بھی اندر پہونچا دروازے پر آنے والے حضرات انتظار میں کھڑے رہے۔ گھر میں آکر دیکھا کہ مرادن چپ بیٹھی ہے اور ماں اس کو اُونچ نیچ سمجھا رہی ہے۔ آخر ماں نے ہر طرح سمجھا بجھا کر مرادن کو آنے والے لوگوں کے ہمراہ جانے پر راضی کر لیا اور گھر سے باہر آکر ان لوگوں سے کہا کہ "مرادن بیٹا جانے پر راضی ہیں مگر یہ تو بتایئے کہ آپ میں کون صاحب ان کو اپنے گھر لے جائیں گے؟" ایک آدمی جس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی مگر اچھی غذا اور بے فکری نے ان کو ٹاٹھا بنا رکھا تھا اور جو ان لوگوں میں زیادہ ذی حیثیت معلوم ہوتے تھے، انھوں نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں لے جاؤں گا، مرادن میرے یہاں رہیں گی۔ گھر پر میری بیگم موجود ہیں،وہ ان کو بڑی محبت کے ساتھ رکھیں گی۔" ماں نے ان کا نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا نام قیس محمد خاں ہے۔ غرض ٹانگہ آیا اور اس کے ساتھ میری ماں بھی مرادن کو پہونچانے کے لئے قیس محمد خاں کے گھر روانہ ہوگئی۔ رات کچھ جاچکی تھی کہ میری ماں واپس آئی۔ ماں نے کہا کہ "مرادن بیٹا اچھے ٹھکانے گئی ہیں، میں سب کچھ دیکھ آئی۔ صاف ستھرا گھر ہے۔ گھر کی مالکہ بھی سلیقہ کی ہیں، پیسے والے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ کام کاج کے لئے دو ماما بھی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ مرادن بیٹا کو وہاں آرام ملے گا"۔ مرادن کے جانے کے بعد دو چار دنوں تک گھر سونا سونا معلوم ہوتا رہا۔ پہلے تو ماں دو چار دنوں پر مرادن کو دیکھ آتی، جس سے مرادن کی خبر ملتی رہتی تھی

کہ مرادن اس گھر میں خوش ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ اب رفتہ رفتہ ہم لوگ بھی مرادن کی طرف سے بے فکر ہوتے گئے۔ اس لئے ماں کا مرادن کے پاس اب آناجانا بھی کم ہوتا گیا۔ اس کو بھی آٹھ نو مہینے ہوگئے۔ ایک دن ماں مرادن کو دیکھنے گئی اور یہ خبر لیکر واپس آئی کہ مرادن بیٹا کی شادی بھی ہو گئی ۔ میں نے پوچھا کہ "مرادن بیٹا کے دولہا کو بھی دیکھا؟" ماں تلخ لہجہ میں بولی ہاں دیکھا اور تو نے بھی دیکھا ہے"۔ میں نے متحیر ہوکر کہا کہ "میں نے کب دیکھا ہے؟" ماں نے جواب دیا۔ "اس دن جب مرادن بیٹا یہاں سے جارہی تھیں، وہی بوڑھا جس کے یہاں مرادن بیٹا گئیں ہیں، وہی ان کا دولہا ہے۔" میری حیرت کی اب انتہا نہ رہی۔ ہمدردی نہیں بلکہ ہمدردی کے بھیس میں ہوس پرستی تھی۔ ہم دونوں چپ ہوگئے۔ زمانہ گزرتا گیا۔ مرادن کی شادی کو ابھی دو برس سے زیادہ ہوچکے تھے۔ ماں مہینے دو مہینے پر کبھی جاکر مرادن کو دیکھ آتی تھی۔ ایک دن سردیوں میں شام کے وقت جبکہ ہوا بھی ٹھنڈی اور تیز چل رہی تھی بدلی بھی چھائی ہوئی تھی، ماں چولہے کے پاس بیٹھی کھانا پکارہی تھی، میں چولہے کی گرمی کا لطف لیتا ہوا سارنگی پر ہلکے ہلکے ایک دھن کی مشق کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی کی دستک کی آواز آئی۔ ماں نے مجھ سے کہا کہ جاکر دیکھ تو کون آیا ہے۔ میں سارنگی کو ایک کونے میں رکھ کر دروازے کے پاس آیا، کنواڑ کھول کر دیکھا تو ایک برقعہ پوش دروازے سے لگی کھڑی نظر آئی ایک گٹھری بھی اس کے قدموں کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوال "کیا کون ہے؟" تو آہستہ سے آواز آئی "میں مرادن ہوں۔" یہ سنتے ہی میں بد حواس الٹے پاؤں ماں کے پاس دوڑا گیا اور دور ہی سے پکار کر کہا کہ "مرادن بیٹا ڈیوڑھی پر کھڑی ہیں"۔ ماں چولہا چھوڑ کر بے تحاشہ دوڑی۔ میں بھی پیچھے پیچھے تھا۔ میری ماں کو دیکھ مردان اس کے گلے سے لپٹ کر زار زار رونے لگی۔ اس کے رونے پر ماں بھی رو پڑی، پھر سہارا دیکر اس کو مکان کے اندر لائی۔ گٹھری میں نے اٹھالی تھی اس کو لئے میں اندر آیا۔ جس کوٹھری میں پہلے کچھ دنوں مرادن نے قیام کیا

تھا وہاں جاکر اس کی گٹھری رکھ دی۔ جلا کر ایک چراغ وہاں رکھا اور اسارے سے چارپائی اٹھا کر وہاں بچھا دی۔ میں الگ دوسری کوٹھری میں بیٹھ رہا تھا تاکہ مرادن مجھے دیکھ کر نہ جھجکے تھوڑی دیر کے بعد ماں میرے پاس آئی، اس کی آنکھیں اب بھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا "مرادن بیٹا کس طرح آئیں" تو ماں بولی "غریب کے پھر برے دن آگئے تو اسی کو اپنا گھر سمجھ کر پناہ لینے آئی ہے۔" اس کے بعد ماں نے سارا قصہ یوں بیان کیا کہ قیس محمد خاں جو اس کے شوہر تھے آج سے سوا مہینہ قبل مر گئے۔ ان کے مرنے کے بعد ہی ان کی پہلی بیوی نے مرادن بیٹا کے ساتھ برا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ ہر بات پر طعنے دیتی، منحوس بناتی کبھی کبھی گھر سے نکال دینے کی بھی دھمکیاں دیتی۔ قیس محمد خاں کی بیٹی اور ان کے دونوں بیٹے بھی کم نہ تھے۔ جس کمرے میں مرادن رہتی تھی اس پر اب بیٹی نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ غریب سائباں میں سونے لگی تھی۔ کل قیس محمد خاں کا چہلم تھا نیاز اور فاتحے کے بعد سبھوں نے مل کر مرادن بیٹا کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا، یہاں تک کہ گالی گفتہ تک نوبت آگئی اور یہ غریب سب کچھ سنتی اور برداشت کرتی رہی۔ آج کا دن بھی گالی گفتے سے شروع ہوا اور قیس محمد خاں کی پہلی بیوی نے اس سے یہ کہا کہ اپنی چارپائی اور اسباب بھی سائبان سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جائے تاکہ آنے والوں کو گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی نحس صورت نظر نہ آئے۔ مرادن بیٹا نے صرف اتنا جواب دیا کہ کمرہ چھوڑ دیا سائبان میں چلی آئی، یہاں بھی آپ سبھوں کو میرا رہنا گوارہ نہیں تو اب اس رنڈاپے میں گھر کو چھوڑ کر کہاں جاؤں؟ اس جملے پر قیس محمد خاں کی بیوی کو جلال آگیا، پاؤں سے جوتی نکال کر غریب کو مارنا شروع کیا۔ ان کی گرج کی آواز سن کر محلے کی اور عورتیں بھی آگئیں۔ ان سبھوں نے بھی قیس محمد خاں کی پہلی بیوی ہی کی طرفداری کی۔ اندر باہر غریب کی طرف سے کوئی بولنے والا نہ تھا۔ جب مار پیٹ بند ہوئی تو مرادن بیٹا نے اپنا بستر اور قیس محمد خاں کے دیئے ہوئے کچھ کپڑے اور زیورات کو بکس میں بند کر کے مکان

چھوڑ دینا چاہا تو وہ بکس بھی غریب سے قیس محمد خاں کی پہلی بیوی اور ان کے لڑکوں نے چھین لیا۔ بڑی مشکل سے صرف ایک گرم اور ایک ٹھنڈی چادر، ایک دری، ایک تکیہ اور دو تین جوڑے کپڑوں کو لے جانے کی اجازت ملی۔ اتفاق سے پندرہ بیس روپے اس کے بٹوے میں پڑے ہوئے تھے، ان کو لیکر گھر سے باہر نکلیں، ایک ٹانگہ کرایہ کیا، محلّہ کا نام جانتی ہی تھیں، میرا نام پوچھتے پوچھتے یہاں چلی آئیں۔ یہ بھی اللہ کی مصلحت تھی کہ مرادن بیٹا کو کوئی اولاد نہیں ہوئی ورنہ ان کے ساتھ ان کے بچے کا بھی بُرا حال ہوتا۔ اب تو مرادن بیٹا یہاں آگئی ہیں۔ یہ گھر ان ہی کا ہے اب وہ یہیں رہیں گی۔ ماں کو اس کا رنج اور افسوس تو ضرور تھا کہ مرادن کے بُرے دن دوبارہ آگئے مگر اس کی بڑی خوشی تھی کہ وہ اس گھر میں آگئی۔ ماں اس کا دل بہلاتی، تسلیاں دیتی اور اپنے امکان بھر کوشش کرتی کہ مرادن اپنا غم بھول جائے۔ کچھ دن اسی طرح گذرے تھے کہ مرادن نے ماں سے کہا کہ ماں (مرادن بھی میری ماں کو ماں کہنے لگی تھی) اگر کچھ لڑکیاں پڑھنے والی مل جائیں تو بڑا اچھا ہو، میں انہیں پڑھانا شروع کردوں، میرا وقت بھی مزے سے کٹے گا اور ان سے کچھ پیسے بھی مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ میں سلائی بھی جانتی ہوں، اگر سلائی کے کپڑے مل جائیں تو سلائی کا بھی کام کر کے ان کی اجرت سے بھی پیسے نکال لیا کروں۔ ماں نے جواب دیا ”ہاں بیٹا ٹھیک کہتی ہو میں ایسی لڑکیاں تلاش کروں گی اور سلائی کے لئے کپڑے بھی لوگوں سے مانگ کر لانیکی کوشش کروں گی“۔ مگر میرے محلے میں پڑھنے والی لڑکیوں کا ملنا ہی مشکل تھا۔ زیادہ تر غریبوں کی آبادی تھی جو پڑھنے لکھنے سے زیادہ اپنی بچیوں کو اپنے گھر کا کام کاج اور اپنا پیشہ سکھاتے تھے۔ اگر دو چار شریف تھے بھی تو وہ اپنی بچیوں کو میرے گھر بھیجنے پر راضی نہ ہوئے۔ مرادن دوسروں کے یہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ ضرور ہوا کہ ماں دو چار گھروں سے سلائی کے لئے کپڑے مانگ لاتی۔ مرادن سلائی میں اچھی دستکار تھی۔ ہاتھ سے کپڑے طرح طرح کے سیتی پھول کاڑھتی، بیلیں بناتی اور بخیہ کا کام تو اس کا واقعی لاجواب تھا۔

اس لئے لوگوں کو اس کے ہاتھ کے سلے ہوئے کپڑے بہت پسند آئے اور وہ اس طرح سلائی سے مہینہ میں پندرہ بیس روپے نکالنے لگی۔ گاہک غریب لوگ تھے اس لئے اجرت ان سے کم لیتی تھی پھر بھی اس کے لئے یہ روپے کافی تھے۔ میرے گھر مرادن کو رہتے ہوئے ایک سال ہوگئے۔ اس درمیان میں اس کا کوئی پوچھنے والا نہ آیا۔ میری بھی اور ماں کی بھی یہ کوشش تھی کہ کسی شریف سے مرادن کی شادی ہو جائے اور وہ ٹھکانے لگ جائے۔ میرے محلے کی مسجد میں جو مولوی صاحب پیش امام تھے وہ بڑے شریف آدمی تھے۔ ماں نے ان سے تذکرہ کیا کہ اس کے گھر ایک شریف عورت آگئی ہے جو حد درجہ مظلوم اور بیکس ہے اور پھر مرادن کا سارا حال ان سے کہہ سنایا مولوی صاحب کو بھی مرادن سے ہمدردی ہو گئی۔ وہ اور میں اس جستجو میں ہوئے کہ کوئی شریف آدمی مل جائے اور وہ راضی ہو تو مرادن کا اس سے عقد کر دیا جائے۔ کچھ دنوں کے بعد مولوی صاحب نے کہا کہ مرادن کا میرے گھر میں رہنا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوا۔ جس سے بھی مرادن کی شادی کا تذکرہ چلا اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایک پست اور گرے ہوئے گھر میں پناہ لینے والی بھی پست اور گری ہوئی ہوں گی۔ اب مولوی صاحب کی یہ کوشش تھی کہ کم از کم کسی شریف گھر میں مرادن کو بچیوں کے پڑھانے کی ہی ملازمت مل جائے، مگر میرے گھر میں اس کا رہنا اس کے لئے سم قاتل بن چکا تھا۔ لوگ اس کو اپنی بچیوں کی تعلیم کے لئے بھی رکھنا پسند نہیں کرتے تھے اور یہ بھی تھا کہ مرادن خود بھی امیر اور شریف کا لفظ سن کر اب اپنے کانوں پر ہاتھ دھرتی تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا تھا وہ پیسے والے شریفوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ کہتی تھی کہ یہی غریب جن کو ذلیل سمجھا جاتا ہے ان امیروں اور شریفوں سے زیادہ انسان دوست، بامروت اور اخلاق کے ہیں۔ آخر ہار مان کر مولوی صاحب بھی چپ ہوگئے اب مرادن کو میرے یہاں رہتے ہوئے دو سال ہو رہے تھے۔ دنیا والوں کی زبان کو کون روکے۔ اب مرادن پر یہ اتہام لگایا جانے لگا کہ وہ میرے گھر پڑ گئی ہے۔ ماں

بھی اور میں بھی بار بار اس کی پارسائی، اس کی عصمت و حیاء اور اس کی شرافت کی لوگوں کے سامنے قسمیں کھاتے مگر لوگوں کی زبان عیب لگانے سے نہیں رکتی تھی، مرادن کو بھی اس کی خبر ہو گئی، مگر اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ ایک دفعہ محلے کی دو ایک عورتوں سے کہنے لگی کہ مجھے دنیا کے جھوٹے طعن و تشنے اور غلط الزاموں کی پرواہ نہیں، میں نے سب معاملہ اللہ پر چھوڑ رکھا ہے۔ ایک دن پھر محلے کی عورتوں کے سامنے یہ تذکرہ چلا تو بگڑ کر کہنے لگی کہ دنیا والوں کو کیا حق کہ مجھ پر تہمتیں لگائیں، انہیں لوگوں میں وہ بھی ہیں جنھوں نے میرا حق چھین لیا ہے اور مجھے بے بس کر کے گھر سے نکال پھینکا ہے اور اب ایک ٹھکانہ ملا ہے تو وہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ یہ سب کچھ تھا مگر مرادن پر جھوٹی تہمتیں نہ مجھ سے برداشت ہوتی تھیں اور نہ میری ماں سے۔ وہ تو مرادن کی صفائی میں ہر ایک سے لڑ پڑتی تھی۔ مسجد کے مولوی صاحب بیچارے بھی پریشان تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری ایک تجویز ہے۔ اب ذرا اس پر بھی غور کرو۔ میں نے کہا کہ بتایئے مولوی صاحب وہ تجویز کیا ہے تو کہنے لگے کہ میری تجویز اب یہ ہے کہ مرادن کی شادی تمہارے ساتھ کر دی جائے اور موجودہ صورتحال میں یہی اس کے لئے بہتر بھی ہے۔ میں یہ سنکر حیران رہ گیا۔ یہ بات کبھی میرے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی، یہ عجیب قسم کا جوڑ تھا، میں پست گرے ہوئے طبقے کا ایک فرد، نہ جس کو کوئی تعلیم تھی اور نہ جس کا کوئی اچھا ماحول اور نہ اور شریفانہ ذریعہ معاش تھا۔ دوسری طرف مرادن ایک شریف گھر کی پڑھی لکھی عورت تھی جس کی زندگی شریفانہ ماحول میں گزری تھی اور جو اصل زندگی کی اچھائی برائی کو سمجھتی تھی۔ مجھے چپ دیکھ کر مولوی صاحب بولے "اگر چہ تمہیں یہ شادی بے جوڑ معلوم ہو رہی ہو گی مگر دنیا کی زبان بند کرنے کے لئے اور مرادن کی زندگی میں یکسوئی پیدا کرنے کا اب یہی ایک راستہ ہے۔ تم اس پر بھی تو غور کرو کہ اگر تم اس سے شادی نہ کرو گے تو دنیا والے مرادن پر حرام کاری کا جھوٹا الزام دھرتے ہی چلے جائیں گے۔ اس صورت میں ایک

شریف عورت کی عزت کا بچانا بھی ثواب کا کام ہے"۔ میں نے کہا کہ پہلے تو آپ میری ماں سے کہئے۔ دوسرے یہ بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ مرادن بیٹا میرے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہوجائیں گی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں دونوں کو سمجھاؤں گا۔ دوسرے ہی دن مولوی صاحب نے میری ماں سے اس شادی کے متعلق باتیں کیں، میری ماں بھی میری طرح یہ تجویز سن کر حیران ہوئی، پھر کہنے لگی کہ اگر ایسا ممکن بھی ہو تو دنیا یہی کہے گی کہ مرادن کے ساتھ ہمدردی صرف میری اس غرض میں پوشیدہ تھی کہ میں آگے چل کر اس کے ساتھ اپنے بیٹے کا بیاہ رچاؤں۔ مولوی صاحب نے کہا "دنیا والے اب یہ اعتراض کر ہی نہیں سکتے کیونکہ میں خود بہت سی جگہ مرادن کی نسبت لیکر گیا اور لوگوں نے جھوٹی بنیادوں پر مرادن سے شادی کا رشتہ نامنظور کر دیا اور پھر تمہیں یا مرادن کو ایسے دنیا والوں کی کیا فکر جنہیں نہ تم سے واسطہ اور نہ مرادن کے ساتھ ہمدردی ہے"۔ مولوی صاحب نے میری ماں کو اور بھی اونچ نیچ سمجھائے تو کہنے لگی کہ مرادن بیٹا کو شادی کے متعلق کون کہے گا؟ مولوی صاحب نے کہا کہ "میں اس کو بھی سمجھاؤں گا"۔ اسی دن شام میں مولوی صاحب میرے گھر آئے۔ پردے کے پیچھے مرادن کو بلایا۔ میری ماں قصداً وہاں سے ٹل گئی۔ مولوی صاحب بوڑھے ضعیف آدمی تھے اس لئے مرادن نے ان سے پردہ نہیں کیا۔ مولوی صاحب بہت دیر تک مرادن کو سمجھاتے رہے۔ انھوں نے اس سے کیا کہا اور کس طرح سمجھایا، یہ تو ہم ماں بیٹے کو معلوم نہیں، مگر میری ماں جو وہاں سے دور ہٹ آئی تھی، وہ مرادن کے رونے کے ساتھ ساتھ ہچکیوں کی آواز سن رہی تھی۔ آخر مرادن چپ ہوئی تو مولوی صاحب نے پھر مرادن کو سمجھانا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر میری ماں کے پاس آئے، میں اس وقت گھر سے باہر جا چکا تھا۔ مولوی صاحب نے میری ماں سے کہا "مرادن میرے سمجھانے بجھانے سے شادی پر راضی ہوئی ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کل ہی جمعہ کا دن ہے اس لئے کل نماز جمعہ کے بعد مرادن

کا نکاح تمہارے بیٹے کے ساتھ کردوں۔ میں اپنے ساتھ دو چار آدمیوں کو لیتا آؤں گا کہ وہ نکاح کے گواہ رہیں اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی تہمتوں کو روکیں۔ تم بھی اپنی برادری کے اچھے سمجھدار لوگوں کو بلا لینا"۔ چنانچہ یہی ہوا، مولوی صاحب دو چار لوگوں کو لیکر آگئے جن میں سے دو نکاح کے گواہ بنے، مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ میری برادری کے دو ایک مرد اور دو ایک عورتیں آگئی تھیں۔ میں نکاح کے پہلے ہی مرادن کا ایک جوڑا شاہانہ کپڑا اور کچھ مٹھائیاں بازار سے لے آیا تھا۔ تھوڑے چھوہارے بھی خرید لئے تھے۔ اس سیدھے سادے نکاح کے بعد مٹھائیاں تقسیم ہوئیں، سبھوں نے مجھ کو اور میری ماں کو مبارکباد دی اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ شادی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ مرادن کو میرے گانے بجانے کا پیشہ ناپسند تھا۔ اس لئے میں اس کے سامنے گانے بجانے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی "تم گانے بجانے کا پیشہ چھوڑ دو اور کسی چیز کی دوکان کرلو۔ میرے پاس سلائی کے بچے بچائے سو روپے جمع ہیں۔ اگر پہلے شادی کا خیال ہوتا تو اور بھی پس انداز کر لیتی۔ خیر یہ بھی سردست کافی ہیں، انہیں سے دوکانداری کا کام شروع کرو اللہ تعالیٰ برکت دے گا"۔ حقیقت یہ ہے اب میں بھی اس کے ساتھ رہتے ہوئے گانے بجانے کے کام سے شرماتا تھا۔ اس لئے ہم دونوں میں یہ بات طئے ہوئی کہ نزدیک ہی میں کوئی دوکان ڈھونڈھوں اور پنساری کی چھوٹی سی دوکان کرلوں۔ بدقسمتی کا کیا علاج دو ہی چار دنوں کے بعد میری ماں بیمار پڑگئی۔ جاڑے کے دن تھے اس کو بخار آنے لگا تھا، ادھر میں دوکان کی فکر اور تلاش میں تھا۔ مرادن نے ایک دن مجھ سے کہا کہ ماں کی طبعیت بہت زیادہ خراب ہوتی جارہی ہے، حکیم صاحب کی دوا سے فائدہ نہیں معلوم ہوتا ہے کسی ڈاکٹر کو بلا کر دکھاؤ۔ میں نے کہا "اتنے پیسے کہاں ہیں کہ ڈاکٹر کا علاج کروں"۔ کہنے لگی پیسے میں دوں گی اس کی فکر نہ کرو۔ غرض میں ایک ڈاکٹر صاحب کو جو نزدیک ہی دوسرے محلے میں رہتے تھے، بلا کر لے آیا۔ انھوں نے ماں کو دیکھ کر کہا کہ سخت سردی لگی ہے، دونوں پھیپھڑوں

میں بلغم جمع ہو گیا ہے، اس میں بڑی احتیاط اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ غرض انھوں نے دوا دی اور ہم دونوں نے ماں کی دیکھ بھال شروع کی۔ اس درمیان میں دو دفعہ ڈاکٹر صاحب آئے۔ جب آتے چار روپے فیس کے لیتے اور دو تین روپے کی دوا بھی انہی کے یہاں سے آتیں۔ آٹھ دس دنوں میں ماں ٹھیک ہوئی مگر دوائیں جاری رہیں۔ میری ماں بدپرہیز بھی تھی۔ ابھی طبعیت کچھ اچھی ہی ہوئی تھی کہ ایک دن کوٹھری سے نکل کر باہر آنگن میں بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ مرادن نے باہر کھلی ہوا میں زیادہ بیٹھنے کو منع بھی کیا تو اس نے کہا کہ اب اچھی ہوں، بیٹھنے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ اسی دن رات میں پھر اس کو بخار آگیا اور کھانسی بھی بڑھ گئی۔ میں دوسرے دن ڈاکٹر صاحب کو پھر بلا لایا۔ انھوں نے دیکھا تو کہا کہ پھر ٹھنڈک لگی ہے اور یہ دوبارہ ٹھنڈک کا لگنا مریضہ کے لئے اچھا نہیں ہے کیونکہ مریضہ پہلے ہی بہت کمزور ہو چکی ہے۔ ہم دونوں گھبرا گئے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو تسلی دی کہ اللہ پر نظر رکھو، تمھاری ماں ایسے بہت سے مریض اچھے ہو جاتے ہیں۔ پھر نسخہ لکھ کر دیا اور دوا دینے کی ترکیب بتا کر چلے گئے۔ میری ماں کی حالت بگڑتی ہی گئی آخر دوبارہ بیمار پڑنے کے چوتھے دن اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھ پر ماں کے مرنے کا جو اثر ہونا تھا وہ تو ہوا ہی مگر مجھ سے زیادہ مرادن کی حالت خراب تھی۔ رونے دھونے سے فرصت ہوئی تو مرادن ہی نے کفن دفن کے لئے روپے اپنے پاس سے نکال کر دیئے۔ ماں کے بکس سے بھی کچھ روپے نکلے تھے مگر مرادن کا اصرار تھا کہ اسی کے یعنی مرادن کے روپے سے ماں کی تجہیز و تکفین ہو۔ ماں کے مرنے کے بعد مرادن تنہا گھر میں رہ گئی تھی۔ میں اس کے دل بہلانے کی کوشش کرتا گھر ہی میں زیادہ رہتا مگر حقیقت یہ تھی کہ میرا اور اس کا میل بھی عجیب تھا میں آوارہ گرد نیچے درجے کا آدمی، نہ میں پڑھا لکھا تھا نہ میری کوئی جگہ سماج میں متعین تھی۔ میں اس کے سامنے احساس کمتری سے دبا جاتا تھا۔ میں اس کو کیا بہلاتا وہ خود سمجھدار تھی، وہی مجھ کو تسلی دیتی دل پر جبر کر کے غم پر قابو پانے کی

تلقین کرتی اور مجھے مذہب کی بہت سی باتیں بتا کر صبر و شکر کی نصیحتیں بھی کرتی رہتی تھی۔ مرادن کو مجھ سے حقیقی انس ہو گیا تھا۔ وہ اگلی باتوں کو بھول کر اس گری ہوئی حالت میں بھی میرے ساتھ خوش خوش زندگی بسر کرنا چاہتی تھی ۔ میری ماں کی موت نے اگرچہ اس کو دل شکستہ کر دیا تھا پھر بھی وہ زیادہ روتی دھوتی نہیں تھی ، گھر کے کام کاج میں دل بہلاتی ، کبھی اس کا دل بھر آتا تو آہیں بھر کر چپکے سے دو قطرہ آنسو کا بہا لیتی ، پہلے ماں بازار سے سودا سلف لے آیا کرتی تھی ۔ اب یہ کام میرے تعلق ہو گیا تھا مگر کھانا پکانا ، برتنوں کو دھونا ، جھاڑو بہارو کرنا اب یہ سب کام مرادن خود کرتی تھی میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہتا تو وہ مجھے روک دیتی ۔ اس جھنجھٹ میں اس نے سلائی کا کام بھی چھوڑ رکھا تھا۔ تقریباً اس کے سب روپے ماں کی بیماری اور کفن دفن میں ختم ہو چکے تھے اور اس کے ساتھ سر دست دوکان کی اسکیم بھی فیل ہو چکی تھی ۔ گرچہ اسی نے دوکان کھولنے کی اسکیم بنائی تھی ، اس کے لئے بار بار تقاضے بھی کرتی تھی مگر اس کی زبان سے اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا۔ میری آمدنی بھی محدود تھی ۔ ماں کے بکس سے نکالے ہوئے روپے کچھ دن تو چلے مگر وہ بھی ختم ہو رہے تھے ۔ گانے بجانے کے کام سے بھی میں پہلو تہی کرنے لگا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ یہ دھندا مرادن کو ناپسند تھا اور اس سبب سے بھی مرادن کو تنہا کس پر چھوڑ کر جاؤں ۔ ایک دن گھر میں خرچ کے لئے ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ روپے سب پہلے ہی ختم ہو چکے تھے ۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس سے قرض لے کر کام چلاؤں کہ مرادن اپنی کوٹھری سے باہر آئی ۔ اس نے ہاتھ کے چاندی کے دو کڑے لا کر دیئے مجھے بڑی ندامت اور حسرت ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کڑے تم نے بیچنے کو لا کر دیئے ہیں مگر میں اس کو نہیں بیچوں گا ۔ یہ کڑے میری ماں نے شادی کے وقت تم کو یادگار کے طور پر دیئے تھے ، انہیں اپنے پاس ہی رکھو ۔ میں سر دست کام چلانے کے لئے کہیں سے روپے قرض لے آؤں گا مرادن نے کہا کہ کسی سے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے

میں نہیں چاہتی کہ کسی کا احسان اپنے سر لیں ۔ ایک تو لوگ یونہی آوازیں کستے ہیں جب گھر کی گری ہوئی حالت معلوم ہوگی تو اور بھی برا بھلا کہیں گے ۔ میں اس کی خودداری کا قائل ہو گیا اور کڑے بیچ کر روپے لاکر اس کو دے دیئے ۔ دوسرے دن مرادن نے محلے کی ایک عورت کے معرفت سلائی کے لئے کپڑے اپنے پرانے گاہکوں کے یہاں سے منگوائے اور پھر سلائی کا کام شروع کر دیا۔ اس کی سلائی کی اجرت اگرچہ اخراجات کے لئے پورے طور پر کافی نہیں پڑتی تھی، پھر بھی ہم دونوں کی زندگی کسی کا احسان لئے بغیر کسی نہ کسی صورت سے بسر ہو رہی تھی اور اب تو یہی آمدنی کا ذریعہ تھا ۔ جاڑے کے بعد گرمی آئی اس کے بعد اب برسات کا زمانہ گزر رہا تھا پھر جاڑے کے دن آنے والے تھے، مجھے بے حد سوچ رہا کرتی تھی کہ اس محدود آمدنی میں کب تک دن کٹیں گے ۔ ایک دن دل بہت گھبرایا تو بہت دنوں کے بعد سارنگی اٹھالایا۔ اس کو میں ہلکے ہلکے بجارہا تھا اور کچھ گنگنارہا تھا کہ مرادن اپنی کوٹھری سے نکل کر میرے پاس آکر بیٹھ گئی پہلے تو میں نے سمجھا کہ سارنگی بجانے پر مجھے ملامت کرے گی اور میں چپ ہو گیا مگر میرے پاس بیٹھ کر اس نے خود دھیمے لہجے میں معرفت کی ایک غزل گانی شروع کر دی ۔ میں بھی سارنگی پر اس کا ساتھ دینے لگا۔ میں نے اس کو گاتے ہوئے کبھی نہیں سنا تھا اور نہ دیکھا تھا۔ وہ بہت رسیلی مدھر آواز میں گا رہی تھی ۔ میں اس کی آواز پر فدا ہوتا جارہا تھا۔ میری برادری تو کیا شہر کی بڑی بڑی گانے والی کو ایسی پیاری آواز نصیب نہ تھی۔ غزل گا کر وہ چپ ہوئی تو میں نے اس کو بہت داد دی۔ مسکرا کر کہنے لگی ”میں تو صرف معرفت اور حمد و نعت ہی کی غزلیں جانتی ہوں اگر تم دو چار بھجن اور دو چار چلتی ہوئی چیزیں بتادو تو میں ان کی بھی مشق کر لوں“۔ میں نے اس کو خوش دیکھ کر کہا کہ یہ تو میں تمہیں دل سے بتادوں گا مگر ایک بات ہے اگر تم برا نہ مانو تو وہ بھی کہدوں۔ اس نے کہا ”کہو تو آخر کون سی بات ہے“۔ میں نے اس سے کہا ”تم دیکھ رہی ہو کہ کس عسرت اور تنگی سے تمہاری اور میری زندگی بسر ہو رہی ہے اور پھر

ہم دونوں کی تمنا جو دوکان کھولنے کی تھی وہ بھی روپئے کے نہ ہونے کے سبب پوری ہوتی نظر نہیں آتی ہے۔ اگر تم اجازت دو تو ایک بار کسی میلے میں جاکر پھر گانے بجانے سے کچھ روپئے کما لاؤں اور ہو سکے تو دوکان کھولنے کی پھر کوشش کروں"۔ مرادن نے کہا کہ میں ایک شرط پر تم کو اس کی اجازت دوں گی اور وہ یہ ہے کہ تم اکیلے گانے بجانے کا کام کرو اور کسی غیر محرم عورت کو اپنے ساتھ لئے نہ پھرو کیونکہ غیر محرم عورت کو ساتھ لئے پھرنا سخت عیب اور سخت گناہ بھی ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں تو صرف سارنگی بجانا جانتا ہوں اور اگر گانے کی کچھ دانست ہے بھی تو اسی کے سہارے پر اس کی تھوڑی بہت تعلیم دیتا ہوں مجھے گانے کا گلا نہیں، میری آواز اچھی نہیں، میرا گانا کون پسند کریگا؟ میری اس بات پر مرادن چپ رہی اس کے بعد کچھ ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں۔ مجھے بھی ہمت نہیں پڑی کہ گانے بجانے کے متعلق اور باتیں کروں۔ دوسرے دن اس نے مجھ سے پوچھا کہ "کیا دوسرے شہروں میں بھی اچھے میلے لگتے ہیں جہاں گانے بجانے والے بھی ہوں"۔ میں نے جواب دیا کہ سب سے بڑا میلہ تو مہینے ڈیڑھ مہینے میں سون پور میں لگے گا، یہ میلہ ہر سال وہاں ہندی کے کارتک مہینہ کی آخری تاریخوں میں لگتا ہے مگر سون پور یہاں سے بارہ گھنٹوں کا ریل کا راستہ ہے اور بہت دور ہے۔ یہاں سے ہر سال کچھ گانے والیوں کی ٹولیاں جاتی ہیں اور جب جاتی ہیں تو سون پور کے میلے سے خوب روپئے کما کر لاتی ہیں۔ مرادن نے پوچھا کہ تم بھی کبھی وہاں گئے ہو؟ میں نے کہا کہ کئی سال ہوئے دو تین دفعہ میں بھی اپنے ماموں کے ساتھ وہاں گیا تھا، وہ مر گئے تو میرا جانا بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے سون پور کے میلے کی حالت سنائی تو کہنے لگی کہ اگر واقعی سون پور یہاں سے بہت دور ہے تو ہم لوگوں کو جاننے اور پہچاننے والے بھی نہیں ملیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ یہاں سے اگر کچھ لوگ گئے تو وہی مجھ کو پہچانیں گے اور دوسرا کیوں مجھے جاننے لگا اور تم کو پہچاننے والی شاید ہی کوئی عورت یا کوئی مرد ملے۔ تم تو پردہ میں رہتی ہو اور نہ کوئی

تمہارے پاس عورت آتی ہے اور نہ تم کسی کے یہاں جاتی ہو۔ دو چار عورتیں جو یہاں کبھی آئی بھی ہیں، وہ میلے میں جانے والی عورتیں نہیں۔ اس کے بعد مرادن کچھ سوچتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی کشمکش جاری ہے۔ اس کے بعد وہ چپ چاپ اٹھ کر اسی کوٹھری میں چلی گئی۔ دن گذرا اور رات آئی مگر کچھ وہ اپنے خیال میں غلطیاں پیچاں سوچتی ہی رہی۔ دوسرے دن اس نے مجھ سے جب یہ کہا کہ اگر میں تمہارے ساتھ سون پور کے میلے میں چلوں اور تمہارے ساتھ گاؤں تو کیسا ہوگا؟ میں یہ سنکر سکتے میں آگیا، میرے خواب و خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ مرادن ایسا کرنے پر راضی ہوگی اور یہاں تو اب اس کی خود یہ تجویز تھی۔ میری حیرت دیکھ کر مرادن نے کہا کہ تمہارے لئے بیشک یہ حیرت کی بات ہے اور آج سے ایک دن پہلے اگر کوئی میرے سامنے یہ تجویز پیش کرتا تو میں بھی نہ معلوم کیسا اس کا منہ توڑ دیتی۔ مگر رات میں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ رات بھر یہ خیال میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا کہ زندگی بسر کرنے کا کوئی سامان کر سکوں تو کیسا ہوگا؟ دنیا مجھ کو ذلیل سمجھے گی مگر آج کب اچھا سمجھ رہی ہے۔ دنیا نے میرے ساتھ کیا بھلائی کی۔ میرے حقوق چھین لئے مجھے ٹھوکریں مار کر در بدری کے لئے باہر نکال پھینکا اگر تمہارا گھر نہ ہوتا، اور ماں میرے ساتھ ہمدردی نہ کرتی تو نہ معلوم میرا کیا حشر ہوتا۔ یہ اللہ جانتا ہے کہ میں نے تمہارے گھر میں رہ کر پاک زندگی گذاری ہے اور آئندہ بھی شریفانہ زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتی ہوں۔ حالات پر نہ تمہارا قابو ہے اور نہ میرا۔ اب یہی ایک صورت میری نظر کے سامنے ہے کہ ہفتہ دس دن کے لئے رسوائی اٹھا کر اور بے شرمی سہہ کر، گندگیوں سے بچتے ہوئے، گانے بجانے کا پیشہ اختیار کر کے مقدر آزماؤں۔ شاید میری نیک نیت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف کر دے اور اس طرح کچھ روپے جمع ہو جائیں جن سے تم ایک دوکان کھول کر جائز طور پر کماؤ اور ہم دونوں اس کی آمدنی سے شریفانہ زندگی بسر کر سکیں۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت مرادن کا چہرہ شرافت کے جلال

سے دمک رہا تھا۔ وہ پھر کہنے لگی ”میں نے اب طئے کر لیا ہے کہ اس سال تمہارے ساتھ سون پور کے میلے میں چلوں گی اب تو تم میرے مالک اور محافظ بھی ہو، مجھے کسی چیز کا ڈر کیوں ہو، تم بچاؤ گے اور میں گاؤں گی وہاں کوئی پہچاننے والا بھی میرا نہ ہو گا۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو کچھ دنوں کی رسوائی سہی، شریفانہ زندگی گذارنے کی آئندہ راہ تو نکل آئے گی“۔ مرادن کی اس حیرت انگیز تجویز پر میرے آنسو نکل پڑے۔ میں نے بڑی حسرت سے کہا ”مرادن! خدا جانتا ہے کہ میں آج اپنے کو کتنا ذلیل سمجھ رہا ہوں اور اپنی بے بسی پر بھی کٹا جا رہا ہوں کہ تم میری بے بسی کو دور کرنے کے لئے اب ایسی تجویز پر اتر آئیں مگر یہ رسوائی تم کو سہنے نہ دوں گا۔ میں در بدر بھیک مانگو نگا مگر تم کو میلے میں جانے سے باز رکھوں گا“۔ میری اس بات پر مرادن ہنس کر کہنے لگی ”بھیک مانگو گے تو کتنا جمع کر لو گے، یہی ہو گا کہ بھکاری کہلاؤ گے، سبھوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ گے اور اس پر بھی نہ پیٹ بھر کھانا میسر ہو گا اور نہ شریفانہ زندگی بسر کرنے کی تمنا پوری ہو گی۔ میں جانتی ہوں کہ گانا بجانا بہت برا کام ہے، غیر مردوں کے سامنے جانا شرافت سے گری ہوئی بات ہے مگر یہ تو ہفتہ یا دس دن کی عارضی چیزیں ہیں، جب ہم سبھوں کی نیت پاک ہے اور زندگی شرافت کے ساتھ بسر کرنے کی سچی تمنا ہے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے قصوروں کی معافی مانگ لوں گی، وہ بڑا رحم کرنے والا بھی ہے اور بڑا درگذر کرنے والا بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اب تم پریشان مت رہو۔ میلے میں جانے کی بات طے ہو چکی، وہاں جانے کا ہم دونوں کو سامان کرنا چاہئے دوسرے دن سے میں نے اس کو اپنی دانست کے مطابق کچھ چلتے پھرتے گانے اور بھجن سکھانے شروع کر دیئے۔ حمد و نعت کی غزلیں تو اس کو مجھ سے بہتر یاد تھیں۔ مرادن بڑی ذہین تھی اور اب تو اس کو گانا سیکھنے کی کد ہو گئی تھی، جو کچھ میں بتاتا اس کو جلد یاد کر لیتی۔ جب سون پور کے میلے میں جانے کے دن قریب آئے تو مجھ سے کہنے لگی کہ سہارے کی لئے کوئی ایسا لڑکا باہر سے

ڈھونڈ لاؤ جو ہر جگہ میرے جانے کا حال کہتا نہ پھرے مجھے یاد ہے کہ شہر سے دس میل دور ایک گاؤں میں میرے ایک دوست کا بھائی سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا ہے، وہ کام کا بھی ہے اور سمجھدار بھی ہے، وہ میرے راز کو راز ہی رکھے گا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن جاکر اس لڑکے کو میں اپنے ساتھ لے آیا۔ مرادن کو کنچیوں کا لباس پسند نہ تھا، واقعی یہ لباس شریف عورتوں کے پہننے کا تھا بھی نہیں، میں بھی مرادن کے لئے اس کو پسند نہیں کرتا تھا اس لئے اس کے ساتھ میں نے پورا اتفاق کیا کہ وہ میلے میں بھی معمولی روزانہ کا لباس پہنا کرے۔ گھر سے باہر نکلنے کا اور دوسرے شہر میں جانے کا مرادن کا پہلا اتفاق تھا۔ اس کے پہلے وہ ریل پر بھی نہیں بیٹھی تھی۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر کچھ گھبرائی تو ضرور مگر اب اس نے اپنی طبعیت ہی بدل لی تھی۔ اس لئے سب خیال چھوڑ کر وہ عام لوگوں کی طرح ریل کے ڈبے میں بھی بیٹھی رہی۔ سون پور پہونچے تو میں نے ڈھونڈھ کر چڑیا بازار میں سب گانے بجانے والوں سے الگ آٹھ آنے روزانہ پر ایک راوٹی کرایہ پر لے لی۔ میلے میں مرادن کے گانے اور اس کی شکل اور طور اطوار کے باعث اچھا روزگار رہا۔ ہم لوگ روزانہ چالیس پینتالیس روپے کما لیتے تھے۔ آئے ہوئے چھ سات دن ہوئے تھے کہ ایک دن آپ کے خیمے میں، ہم سبھوں کا گذر ہوا۔ مرادن کا آپ سبھوں نے گانا سنا، آپ سب خوش ہوئے۔ ہم سب وہاں سے چلے تو مرادن کچھ بجھی بجھی سی معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی کیفیت جاتی رہی۔ دوسرے دن صبح میں جب ہم لوگ گشت لگاتے ہوئے آپکے خیمے کے نزدیک پہونچے تو مرادن وہاں جاکر گانے کے لئے تیار نہیں تھی، میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی کہ اور سب تو نہیں مگر ایک صاحب میری اصلی حیثیت کو پہچان گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں جو ترحم کی جھلک اور ہمدردی تھی، اس میں میری رسوائی پر چھپی ہوئی کچھ ملامت بھی تھی۔ اس کا اشارہ آپ کی طرف تھا۔ اس کو آپ کے سامنے جانیکی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ میرے اصرار پر سخت مجبوری کی حالت میں وہ آپ کے خیمے میں

آئی، آپ نہیں تھے اس لئے اس دن اس نے اطمینان سے گایا۔ تیسرے دن ہم سب پہونچے تو آپ موجود تھے، وہ پھر آپ کو دیکھ کر جھجکی مگر کچھ سوچ کر اس نے اس دن بھی کچھ گایا۔ آپ نے اس دن جو روپئے دیئے اس نے اپنے پاس رکھ لئے وہاں سے نکلی تو وہ پریشان معلوم ہو رہی تھی کہنے لگی اب سیدھے اپنے ٹھکانے پر جاؤں گی۔ وجہ یہ بتائی کہ سر میں درد اٹھ رہا ہے۔ ہم سب بھی اس کے ساتھ اپنی راوٹی میں چلے آئے۔ اس دن اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں، چپ پڑی رہی دوسرے دن دیکھا تو سچ مچ اس کو بخار تھا۔ اس حالت میں گانے بجانے کا سوال ہی کیا تھا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ سردی کا بخار ہے ایک دن میں اتر جائے گا مگر جب تین دن ہوگئے اور بخار نہ اترا تو اس کے بار بار اصرار پر ہم سب گھر لوٹ آئے۔ سون پور کے میلے میں اچھا روزگار ہو رہا تھا۔ ایک ہفتہ میں ہم سبھوں نے روزانہ کے اخراجات کے بعد تین سو روپئے کما کر بچائے تھے۔ امید تھی کہ اگر ایک ہفتہ اور یہی کاروبار کا رنگ رہا تو اس سے دونی رقم ہاتھ آجائیگی مرادن کے بیمار ہو کر واپس آنے کا مجھے سخت قلق تھا۔ گھر آئے تو حکیم جی کا علاج شروع ہوا، فائدہ تو کچھ ضرور ہوا پھر بھی دو ایک دن پر بخار آہی جاتا تھا اور وہ بھی چپ بجھی بجھی سی رہتی تھی۔ غالباً بیماری کے سبب سے اس کو اس کی تمنا پوری نہ ہونے کا غم ستا رہا تھا۔ ظاہر میں وہ کچھ ایسی بیمار نہ تھی مگر اس کی کمزوری گھٹنے کے بجائے روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے اب پانچوں وقت کی نماز بھی باضابطہ شروع کر دی تھی اور قرآن شریف بھی روز پڑھنے لگی تھی۔ اسی طرح جب ایک مہینہ گذر گیا اور نہ پورے طور پر اس کا بخار گیا اور نہ کمزوری گھٹی تو میں نے اس کو ہسپتال لیجا کر ڈاکٹر کو دکھلایا۔ ڈاکٹر نے اس کو دیکھ کر کہا کہ پھیپھڑا کچھ خراب ہو گیا ہے۔ میں نے یہ بات مرادن سے نہیں کہی مگر یہ سن کر میرے دل پر جو گذری وہ اللہ جانتا ہے۔ مجھے پریشان دیکھ کر ڈاکٹر نے تسلی دی اور کہا کہ میں تردد نہ کرو، میں ایک اچھا سا نسخہ لکھ دیتا ہوں، مریضہ کو کھلاؤ! احتیاط رکھو گے تو مرض کچھ دن کے بعد چلا جائیگا۔ دوا تو میں

نے شروع کرادی مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرادن بھی اپنے مرض سے واقف ہے اور اس کی طبیعت مرض کو دور کرنے کے بدلے مرض کو خود قبول کر رہی ہے، وہ خود سے دوا بھی نہیں پیتی تھی، گرتے پڑتے گھر کے کام میں لگی رہتی میں روکتا تو میری سنتی بھی نہیں۔ رات بھر نمازیں بھی پڑھتی، میرے لئے دعائیں بھی مانگتی اور گڑگڑا کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی بھی چاہتی۔ کام کرتے کرتے تھک جاتی تو چارپائی پر آکر گر جاتی، تھوڑی دیر کے بعد پھر اٹھتی اور غیر ضروری کاموں کو بھی کرنا شروع کر دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آرام لینے سے اس کو نفرت ہوگئی تھی۔ دوا شروع کئے ابھی ایک ہفتہ ہوا تھا اور ابھی فائدہ کی علامت نظر بھی نہیں آئی تھی کہ ایک دن مرادن کو تیز کھانسی شروع ہوئی اور اس کے کچھ دیر کے بعد کھانسی کے ساتھ منہہ سے خون آنے لگا۔ میں گھبراہٹ میں محلّہ کی دو تین عورتوں کو بلا لایا۔ انھوں نے سہارا دیکر صحن کی دھوپ سے مرادن کو کوٹھری میں پہونچادیا۔ اس کے بعد میں دوڑا ہوا اسی ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا جس نے میری ماں کا علاج کیا تھا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو کہا کہ خون زیادہ آگیا ہے۔ اسی کے سبب سے کمزوری بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دوائیں لکھ دیں، چلنے پھرنے کی ممانعت کردی، غذا میں پھلوں کا رس اور دودھ بتایا اور میں انہیں کے یہاں سے دوا لے آیا اب رفتہ رفتہ خون آنا بند ہوچکا تھا۔ مرادن کو دوائیں میں خود پلاتا، وقت سے اس کو کھانے کو دیتا، نمک بھی بند تھا اس لئے نرم روٹی اب دودھ کے ساتھ دیتا تھا، تین چار وقت پھلوں کا عرق دیتا، صبح میں اب ایک انڈا بھی ڈاکٹر صاحب کی اجازت سے اس کو کھانیکو ملتا تھا۔ دو ہفتہ کے بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی تو مجھ سے کہنے لگی کہ روپے اب ختم ہورہے ہیں، اگر سلائی کا کام پھر مل جائے تو سلائی شروع کر دوں۔ میں نے کہا کہ ابھی اور قوت تو آنے دو۔ کہنے لگی اب اچھی ہوں سلائی میں وقت بھی کٹے گا جی بھی بہلے گا اور کچھ پیسے بھی نکل آئیں گے۔ میرے کہتے سنتے اس نے سلائی کا کام ایک ہفتہ اور ملتوی رکھا۔ اس کے بعد محلے کی ایک عورت سے اس نے

پرانے گاہکوں کے یہاں سے کچھ سلائی کے کپڑے منگوائے اور پھر سلائی شروع کر دی۔ اب گھر کا سب کام میں کرتا تھا۔ مرادن کی بڑی خواہش تھی کہ وہی سب کام کرے مگر مجھ کو اس کی صحت کی فکر تھی، اس کو بھاری کام میں کرنے نہیں دیتا تھا، وہ صرف سلائی کرتی یا نمازیں پڑھتی اور قرآن شریف کی تلاوت کرتی۔ اسی طرح ایک مہینہ گذرا ہوگا اور اس کی صحت کی مجھے پوری امید ہو چلی تھی کہ نہ معلوم کیوں یکایک اس کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کے بعد ہی منہہ سے پھر خون آنے لگا۔ رات کا وقت تھا۔ ڈاکٹر گھر پر ملے تو مگر اس وقت آنے پر راضی نہ ہوئے۔ صرف ایک نسخہ لکھ دیا، جو میں انہی کے مطب سے لیکر بھاگم بھاگ گھر آیا۔ وہ رات بڑی مصیبت کی رات تھی۔ محلہ کی کوئی عورت بھی اس وقت نہ آسکتی تھی۔ میں رات بھر تنہا مرادن کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ رات بھر اس کو کھانسی اٹھتی رہی اور اس کے ساتھ منہہ سے خون آتا رہا۔ اسی حالت میں رات گذری۔ صبح کا وقت ہو رہا تھا۔ نڈھال ہو کر مرادن پڑ گئی۔ کھانسی بھی اب گویا رک گئی تھی، میں نے سمجھا کہ شاید سو گئی ہے۔ یہ حالت قریب ایک گھنٹہ کے رہی ہو گئی کہ اس نے آنکھیں کھولیں میں اس کی چارپائی سے لگا بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا وقت ہے۔ میں نے کہا کہ اب دن نکل آیا ہے۔ یہ سنکر اس کو تیمّم کی مٹی دی تو مشکل سے اس نے تیمّم کیا، معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں اب قوت باقی نہ رہی تھی۔ مشکل سے تیمّم کرنے کے بعد پڑے ہی پڑے ہاتھ باندھ کر وہ نمازیں پڑھتی رہی نمازیں ختم ہوئیں تو اس نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھ کر کہا "تم اپنی مرادن کے قصور تو اب معاف کر دو"۔ میرا دل چیخ اٹھا کہ یا اللہ کیا یہ سچ مچ اب مجھ سے جدا ہو رہی ہے وہ مجھے غور سے دیکھتی رہی میں نے کہا کہ مرادن یہ کیا کہتی ہو، تم نے میرا کون سا قصور کیا ہے کہ میں تم کو معاف کر دوں بلکہ تم ہی میرے قصوروں کو معاف کرو کہ میں نے کبھی تم کو آرام سے نہ رکھا، نہ آرام کی چیزیں تمہارے لئے مہیا کر سکا۔ تمہاری کبھی خاطر داری نہیں کی، تم نے میرے ساتھ نکاح کر کے جو ایثار کیا ہے، میں ہر گز

اس کے لائق نہ تھا؟۔ مرادن بولی کہ ماں کا اور تمہارا یہ احسان کیا کم ہے کہ تم دونوں نے بیکسی میں مجھ کو پناہ دی، جب دنیا نے مجھے ٹھکرا دیا تھا تو تم ہی دونوں نے میری دلجوئی کی اور اپنایا اور مجھ کو شرافت کی زندگی بسر کرنے میں سہارا دینے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اب تمہاری مرادن ایسی جگہ جا رہی ہے جہاں سے پھر واپس نہ آئیگی۔ اس کی تمنائیں بھی اس کے ساتھ جا رہی ہیں جو یہاں پوری نہ ہو سکیں۔ اس نے ایک شریفانہ زندگی کی چاہ میں جو عارضی رسوائی منظور کی اور اس کے حصول کی خاطر غیروں کے سامنے بے حجابانہ میلے میں ماری ماری پھری اور غیروں کو اپنا گانا سنانا قبول کیا کہ اس طرح شاید وہ ایک شریفانہ زندگی کا پروگرام مکمل کر سکے، افسوس اس میں بھی اس کی بد قسمتی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔

اب تمہاری مرادن کے لئے دنیا میں سوائے موت کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ وہ دنیا کے برتاؤ سے دل شکستہ مگر اپنے اللہ کی رحمتوں کا سہارا لئے اُس عالم میں جا رہی ہے جہاں ٹوٹے ہوئے دل جڑتے ہیں، جہاں مقدرات کی گردشوں کی پہنچ نہیں، جہاں انصاف نہیں بلکہ اللہ کی رحمتیں گناہ کی آلودگیوں کو دور کر کے قلب کو اطمینان عطا فرماتی ہیں۔ میری روح مجھ سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ مرادن اس دنیا سے جلد چل جہاں کا سماج صرف نفرت کرنا جانتا ہے اور محبت کرنا نہیں جانتا۔ وہ کسی کو سہارا دیکر سیدھے راستے پر نہیں لگاتا بلکہ جو اس کی زد میں آجاتا ہے اس کی گردن مروڑ کر رکھ دیتا ہے''۔ یہ کہتے کہتے اس کا دم پھول گیا اور وہ بے سدھ ہو کر چپ ہو گئی میں نے اس کو منع کیا کہ اب نہ بولے۔ میں اٹھا کہ جاکر ڈاکٹر صاحب کو بلاؤں تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بڑے پیار سے حسرت بھرے لہجے میں بولی اس آخری وقت میں تو اپنی مرادن کو چھوڑ کر نہ جاؤ''۔ میں رونے لگا تو اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''دنیا کی یہی ریت ہے جو یہاں آتا ہے دیر سویر اس کا جانا بھی ضروری ہے، میں تو خوش قسمت ہوں کہ تمہارے گھر سے مر کر نکلوں گی۔ اگر یہ گھر نہ ہوتا تو نہ جانے اور کیا مقدرات

کا لکھا سامنے آتا اور کہاں کہاں رسوائی کے ساتھ ٹھوکریں کھانی پڑتیں"۔ پھر بولی "ڈاکٹر کو بلانے جارہے تھے نا؟ اب اس کی ضرورت نہیں؟ میں اب تو تھوڑی دیر کی مہمان ہوں، میں خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ زندہ رہوں اور اپنی حالت پر نوحہ کرتے ہوئے دن گذاروں۔ صرف یہ حسرت رہی جاتی ہے کہ ہم اور تم کچھ دن تو مل کر شریفانہ زندگی بسر کر لیتے، تم دوکانداری کرتے اور میں ایک شریف بیوی کی طرح آس پاس کے لوگوں میں تمہاری سربلندی اور تمہاری ترقی دیکھ کر خوش ہوتی"۔ اتنا کہہ کر پھر چپ ہوگئی۔ اب اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ میں بے چینی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی جان بچانے کا سہارا ڈھونڈھتا تھا مگر ہر طرف اس کی موت ہی سامنے کھڑی نظر آتی تھی، پھر دیکھا کہ مرادن پھر کچھ بول رہی ہے۔ اس کی آواز اب اتنی کمزور تھی کہ مجھے جھک کر سننا پڑا۔ اس نے کہا "میرے بکس میں تمہیں بیس روپے ملیں گے، یہ سب میری سلائی کی اجرت کے ہیں، میرے مرنے کے بعد انہیں سے میرا کفن خریدنا اور انہیں روپے سے مجھے دفن کرنا، ہاں ایک وصیت بھی ہے۔ میرے مرنے گے بعد اگر ہو سکے تو اپنے پیشے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا اچھا پیشہ اختیار کرنا تاکہ دوسری دنیا سے جب تمہاری مرادن تمہیں جھانک کر دیکھے تو یہ دیکھ کر خوش ہو کہ تم اچھے کام میں لگ گئے ہو"۔

مجھ میں اب ضبط کی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے بڑی بے قراری سے جھک کر اس کی پیشانی چومی، اس کے ہاتھ لرز رہے تھے، میں نے جب جھک کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر چوما تو بڑی نقاہت کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھ میرے گلے میں ڈال دیئے۔ اب اس کی زبان سے دھیرے دھیرے کلمے کے الفاظ نکل رہے تھے، اتنے میں اس کو ایک ابکائی آئی جس کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ یہ گاڑھا گاڑھا خون تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ہاتھ ناطاقتی سے میرے گلے سے چھوٹ کر گر گئے، اس کی سانس اور بھی تیز ہوگئی، آنکھیں پتھرانے لگیں، ایک ہلکی سی ہچکی آئی اور مرادن

ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ گئی۔

یہ کہانی حقیقت میں بڑی درد انگیز تھی، مرادن کا شوہر پوری کہانی تو ضبط و تحمل سے سنا گیا مگر جب یہ کہانی ختم ہوئی تو بڑی بیقراری کے ساتھ رونے لگا۔ میں بھی کافی متاثر تھا۔ جب چپ ہوا تو میں نے کہا کہ پھر بھی تم گانے بجانے کا دھندھا کر رہے ہو۔ کہنے لگا کہ ”سرکار! مرادن مری تو میری خوش بختی بھی اور گھر میں جو کچھ برکت تھی وہ سب بھی اپنے ساتھ لیتی چلی گئی۔ سب روپے خرچ ہو چکے تھے، پھر بھی میں نے طئے کر لیا تھا کہ اب مزدوری کر کے دن گزاروں گا مگر بد قسمتی سے کئی دنوں تک مجھے کام نہیں ملا، اسی چکر میں میں نے پورے شہر کی خاک چھان ڈالی۔ بڑے لوگوں کی ڈیوڑھی پر خدمتگاری کی جگہ کے لئے آس لگا کر بھی گیا مگر نہ مزدوری کا کام ملتا اور نہ کہیں خدمتگاری کی نوکری ہی ملی۔ کئی فاقے ہو چکے تو ایک دن ایک جگہ آٹھ آنے روز کی مزدوری ملی، دوسرے مزدوروں کے ساتھ مٹی ڈھونے کا کام تھا۔ سبھوں کو تو بارہ آنے ملتے تھے مگر چونکہ میں نیا آدمی تھا اس لئے آٹھ ہی آنے ملتے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا مگر یہ کام بھی آٹھ دس دن ہی چلا۔ پھر وہی بیکاری اپنی قسمت میں تھی۔ جس مکان میں میں رہتا تھا اس کے دو روپے مہینے کرائے دینے ہوتے تھے، میں نے ایک دو پلنگ، بڑی چھوٹی دو چوکیاں، دو لوٹے دو ایک دیگچیاں، جو گھر کا اثاثہ تھیں، ان سب کو بیچ ڈالا۔ مالک مکان کے دو مہینے کے کرائے چار روپے نکلتے تھے اس کو بے باق کر کے بقیہ جو رقم تھی ان کو لیکر تن بہ تقدیر اپنے ایک دوست کے پاس دوسرے محلے چلا گیا۔ دو چار دن پھر کام نہ ملا تو بچے ہوئے پیسے سے بازار میں کھاتا رہا۔ دس پندرہ روپے کی کیا بساط وہ بھی ختم ہونے پر آگئے میرا دوست خود پریشان حال تھا، ایک مختصر سی کوٹھری اور ایک چھوٹا سا دالان تھا جن میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا، میں نے دیکھا کہ میری وجہ سے سب کو تکلیف ہو رہی ہے تو میں اپنے محلے کی مسجد میں چلا آیا۔ مسجد کے پیش امام مولوی صاحب تھے جنہوں نے میرے ساتھ اور مرادن کے

ساتھ ہمدردی کی تھی اور ہم دونوں کا نکاح بھی پڑھایا تھا۔ انھوں نے بھی ایک دو جگہ میرے لئے کام کی سفارش کی مگر کام تو مشکل سے ہی ملتا تھا۔ ایک جگہ خدمتگاری، دس روپئے مہینے اور کھانے پر ملی بھی تو میرے مالک کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں گانے بجانے کا پیشہ ور ہوں تو دس ہی دنوں کے بعد مجھے اپنے یہاں سے ہٹا دیا۔ پھر وہی مزدوری کی تلاش تھی اور میں تھا۔ کبھی ہفتہ دس دن مزدوری کا کام مل جاتا پھر دس پندرہ دنوں کے لئے بیکار ہو جاتا اور کمائی کے جو پیسے بچا کر رکھتا ان ہی سے بیکاری کے دنوں میں کھانا مول لیکر بازار میں کھاتا۔ پھر بھی مہینے میں دو چار دن فاقے کرنے ہی پڑتے۔ اس طرح کئی مہینے گذر گئے۔ اب جاڑے کے دن نزدیک آرہے تھے، میں نے سونچا کہ کیوں نہیں ایک دفعہ اور مرادن کی اسکیم پر عمل کر کے میلے میں گانے بجانے سے کچھ روپئے جمع کرلوں اور پھر انہی روپئے سے ایک چھوٹی موٹی دوکان کھولوں، شاید اس مرتبہ قسمت یاوری کرے۔ یہ طئے کر کے میں نے وضو کیا، مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی اور سچے دل سے اللہ میاں سے یہ عہد کیا کہ اس دفعہ کے بعد پھر گانے بجانے کا دھندھا نہیں کروں گا۔ سون پور کے میلے کا زمانہ آہی رہا تھا میں نے اپنی پرانی سارنگی نکالی اس پر دو چار دن مرادن سے سنی ہوئی حمد و نعت کی غزلیں مشق کیں۔ پھر تنہا اس میلے میں چلا آیا۔ اگرچہ روزگار ٹھیک طور پر اچھا نہیں چل رہا ہے مگر کچھ بھی ہو میں اس کے بعد اب کبھی یہ دھندھا نہیں کروں گا"۔

یہ کہانی ختم کر کے وہ جانیکو اٹھا تو میں نے اس کو روکا اور الگ جاکر اپنے پاس کے روپیوں کا جائزہ لیا، ان میں ایک خاصی رقم میرے اپنے گھر کے لئے اور اپنے آفس کے لئے فرنیچر خریدنے کی تھی۔ میں نے میلے میں ان کی خریداری کا خیال اٹھا دیا اور وہی رقم مرادن کے شوہر کو دیتے ہوئے کہا کہ بھائی یہ روپئے لو، یہ تمہیں دوکان کرنے کے کام آئیں گے۔ وہ روپئے لینے پر راضی نہ تھا مگر اصرار کر کے میں نے یہ روپئے اس کو دیئے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں شکریہ کے آنسو تیر رہے

ہیں۔ اس کے بعد وہ چپ چاپ اٹھا اور سلام کر کے چلا گیا اتنے میں میرے دوست بھی سیر کر کے آگئے، ان سے ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ رات آگئی تھی۔ آج ایک دوست کے خیمے میں کھانے کی دعوت بھی تھی اور وہیں گانے بجانے کا پروگرام بھی تھا، سب چلنے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ تم سب جاؤ، میری طبیعت اچھی نہیں ہے اس لئے میں نہیں جاؤں گا۔ اگرچہ اس پر میرے دوستوں نے میرے جانے کے لئے اصرار کیا مگر میں نہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے نوکر سے چائے بنوائی اور دو ایک بسکٹ کے ساتھ چائے پی اور سویرے ہی اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔ مرادن کی داستان میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ اس کا قصہ جتنا المناک تھا اس سے زیادہ ہمارے سماج پر گہرا طنز تھا۔ میں سوچتا رہا کہ کیا سچ مچ شرافت کو کہیں پناہ نہیں ملتی؟ میں بہت دیر تک اپنے دل سے یہی سوال کرتا رہا پھر دوبارہ مرادن کی ناکام زندگی اور اس کے حسرتناک انجام پر جو غور کیا تو یکایک میرے سوال کا جواب میرے سامنے آگیا کہ ''موت ہی میں شرافت کو اکثر پناہ ملتی ہے'' سوال کا یہ جواب بڑا عبرت انگیز تھا، پھر بھی دماغی الجھن کو اسی سے سکون ملا اور کچھ دیر کے بعد میں غافل ہو کر سو گیا۔

اس کے بعد بھی کئی دفعہ سون پور کے میلے میں گیا مگر مرادن کے شوہر سے پھر ملاقات نہ ہوئی شاید مرادن کی وصیت کی تکمیل کے بعد اس کے اچھے دن آگئے تھے۔

پٹنہ کا سوموباری میلہ

آج سے بہت دن پہلے جس طرح دلی والوں کے لئے پھول والوں کی سیر نے ایک قومی میلے کی حیثیت حاصل کرلی تھی، جس میں بادشاہ بھی لال قلعہ سے نکل کر، اس میلے کی بہار دیکھنے کے لئے قطب صاحب جاتے تھے اور جہان اس موقع پر ایک چھوٹا سا شہر اگ آتا تھا، پٹنہ میں بھی سوموباری میلہ چھوٹے پیانے پر سہی، چھوٹے بڑے سبھوں کے لئے ساون کے ہر سوموبار میں سیر و تفریح اور دلبستگی کی جگہ بن جاتا۔ پٹنہ میں یہ میلے دو جگہوں میں لگتے تھے ایک تو باقی پور میں جو اس کے بعد بانکی پور کہلایا اور اب صرف پٹنہ ہے۔ دوسرا میلہ پرانے شہر عظیم آباد کے چوک کے قریب یہی عظیم آباد اب پٹنہ سیٹی ہے۔ بانکی پور میں دریائے گنگا سے لگے ہوئے ایک بہت بڑا کشادہ قطعہ زمین کا تھا جس کو پہلے کمپنی باغ کہتے تھے، جہاں طرح طرح کے آموں کا باغ اور بیسیوں نیم کے درخت تھے۔ جب نیم کے درخت پر پکی ہوئی پیلی پیلی کوڑیاں ختم ہونے لگتیں تو ساون کے مہینے میں یہاں میلہ لگتا۔ اس جگہ کی شکل اب بالکل بدل گئی ہے۔ چند لوگوں کے سوااب عام طور پر لوگ جانتے بھی نہیں ہیں کہ اسی باغ کا بڑا حصہ کٹ کر عدالت کی کچہری بن گیا ہے اور اس کے پورب پچھم میں دور تک بڑی بڑی عمارتیں، جو دکھائی دیتی ہیں وہ اپنے ملحقہ زمینوں کے ساتھ کمپنی باغ کا حصہ تھیں۔ پہلے جب اس باغ میں سوموباری میلہ لگتا تھا تو درختوں میں جھولے ڈالے جاتے لانبی لانبی پینگیں پڑتیں اور ملہار اور کجری کے راگوں سے فضا بسی رہتی۔ ہر طرف صاف ستھری ہر طرح کی دوکانیں لگی رہتیں خریداروں اور تماشائیوں کا ہجوم رہتا۔ نانبائیوں اور حلوائیوں کی دوکانوں سے طرح طرح کے پکوان کی خوشبو سیر کرنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی۔ چرخ ہنڈولوں پر بچے چڑھتے اور خوش ہوتے، کہیں بندر والے بندریا کا ناچ دکھاتے، ناٹک اور نوٹنکی کے گھرے ہوئے اسٹیج کے اندر تماشہ بینوں کی ریل پیل رہتی، سینکڑوں پھول والے موتیا کے خوبصورت گجرے بیچتے پھرتے جن کی

دل آویز مہک سے میلے کا ہر راستہ بس جاتا۔ کچھ شوقین حضرات ایسے بھی ہوتے جو میلے کے حدود میں لب دریا تھوڑی سی جگہ کرایہ پر لیکر اپنا خیمہ اور شامیانہ نصب کرتے اور ان کو قناتوں سے گھیر کر دوستوں کے ساتھ رقص و سرود کی الگ محفل جماتے۔ اس میلے کی بہار لوٹنے کے لئے دور دور مضافات سے لوگ کھنچ کر آتے تھے۔ چونکہ کمپنی باغ کا رقبہ کافی وسیع تھا اس لئے یہاں کے میلے کا پھیلاؤ بھی بڑا ہوتا تھا۔ یہیں ایک پرانا مندر بھی ہے، وہاں اچھے اچھے گانے والے اور گانے والیاں آتی تھیں اور رات بھر یہاں بھی گانے کا سیلاب دریائے گنگا کے ساتھ امنڈتا رہتا تھا۔ رات کے وقت دوکانوں کی روشنیاں تو الگ تمام میلے میں بانس کی اونچی پاڑ ہر جگہ باندھ کر لوگ کاغذ کی خوبصورت قندیلیں لٹکاتے جن کی رنگارنگ روشنی میلے کی بہار کو دوگنا کر دیتی۔ چونکہ یہ برسات کا زمانہ ہوتا اس لئے ہر دوکان کی چھت ترپال سے محفوظ کی جاتی کہ پانی سے دوکان کی چیزوں کو نقصان نہ پہونچے۔ اگر میلے کے دن موسلادھار بارش بھی ہوتی تو بھی پانی میں لت پت شوقین میلے کا دو چار چکر لگا ہی لیتے۔ یہ میلے لوند کے حساب سے جب دو ساون ساتھ ساتھ ہوتے تو دو مہینوں تک لگاتار سومبار کے دن کی قید کے ساتھ چلتے رہتے۔

پٹنہ سیٹی کا سومباری میلہ

ایک دوسرا سومباری میلہ پٹنہ سیٹی میں بھی لگتا تھا۔ پٹنہ سیٹی میں چوک محلہ سے کچھ آگے پورب کی طرف جھاؤ گنج کا محلہ ہے۔ پورب۔پچھم شہر کے درمیان میں جو شاہراہ ہے اسی سے پھوٹ کر عین جھاؤ گنج کے محلے میں اتر کی طرف ایک سڑک نکل کر دریائے گنگا کے کنارے جاکر ختم ہوتی ہے۔ وہیں اس سڑک سے پورب کی طرف وسیع پڑتی زمینیں ہیں اور پھر انہی سے لگی ہوئی آگے بڑھ کر پورب کی طرف لب دریا سیف خاں کی تاریخی مسجد ہے جس کو پٹنہ کی مسجد بھی اور مدرسہ کی مسجد بھی کہتے ہیں۔ جو سڑک دریا کی طرف گئی ہے اس کے دونوں طرف سومبار کے دن صبح سے ہی دوکانیں

لگ جاتی تھیں۔ اس سے ملحق بڑی وسیع اراضی تھی، وہاں تماشہ دکھانے والے، سرکس والے، چھوٹی موٹی ناٹک کمپنیاں آکر ڈیرہ جماتیں۔ دریا کے قریب یہیں پر ایک چھوٹا سا مندر بھی ہے جہاں میلے کے دن ہزاروں پوجا کرنے والوں کی کثرت رہتی۔ ان میں دن کے وقت عورتوں کی کثرت ہوتی مگر شام ہوتے ہوتے عورتوں کی آمد بند ہوجاتی اور مردوں کا اژدہام شروع ہوجاتا۔ مندر میں شام کے بعد بھجن اور پکا گانا گانے والی طوائفوں اور مشہور گویوں کے گانے کا خاص اہتمام ہوتا۔ مندر کے آگے چُھٹی ہوئی زمین میں شامیانے لگاتے، چوکیوں کا فرش کرتے۔ کرسیوں کی لانبی دوہری، تہری قطاریں بھی ہوتیں۔ شوقین یہیں بیٹھ کر چین سے گانے سنتے۔ ان میں ہندو اور مسلمان سبھی ہوتے تھے۔ پھول بیچنے والے پھولوں کے ہار اور گجرے بیچتے پھرتے۔ اکثر معتقد حضرات یہ ہار اور گجرے مندر میں چڑھاتے جس سے مندر کے اندر پھولوں کا انبار لگ جاتا۔ لوگوں کی ریل پیل صبح سے ہی شروع ہوجاتی تھی۔ حلوائیوں اور نان بائیوں کی دوکانوں میں کھانے والوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ ہندو حلوائیوں کے یہاں پوریاں کچوریاں، اندر سے اور طرح طرح کی دوسری مٹھائیاں کھاتے۔ نان بائیوں کے یہاں خمیری روٹیاں، شیر مالیں، باقرخانیاں، پراٹھے، کوفتے، کباب، شاہی ٹکڑے، بالائی اور تنجن کھانے میں ملتے۔ دیس کی بنی ہوئی مصنوعات، بچے کے کھلونوں اور پرچون کی چیزوں سے دوکانیں بھری رہتیں۔ کاٹھ کے فرنیچر کی دوکانیں میلے کے آخر میں ہوتیں تھیں۔ شیشے اور چاندی کے ظروف کی دوکانیں بھی ہوتیں۔ دو ایک دوکانوں میں ولایت کی بنی ہوئی چیزیں بھی ملتی تھیں۔ شام کے بعد یہ بازار اور بھی چمک اٹھتا تھا۔ جیسے جیسے رات جاتی خرید فروخت کا بازار تو ماند ہونے لگتا مگر مندر کے آس پاس گانا سننے والوں کا مجمع بڑھ جاتا۔ صبح ہوتے ہوتے گانا ختم ہوتا اور ساتھ ہی ساتھ میلے کی بہار بھی ختم ہوتی۔ ساون کا مہینہ برسات کا مہینہ ہے مگر میلے کی سیر دیکھنے والے جب گھر سے چلتے تو یہ تہیہ کر کے چلتے کہ پانی برسے یا طوفان آئے، میلہ جی بھر کے دیکھیں گے۔ یہاں بھی دوکان دار دوکانوں کے بچاؤ کے لئے دوکانوں پر ترپال کی چھت بنا لیتے تھے تاکہ دوکان کی چیزیں پانی سے محفوظ رہیں۔ اگر میلے کے دن بارش ہوتی تو اس کی مکافات

یوں ہوتی کہ دوسرے دن اکھڑا ہوا میلہ پھر جمتا جس میں خرید و فروخت کا بازار گرم رہتا۔ گانا بجانا البتہ پہلی ہی رات میں اوقات معنیہ کے ساتھ ختم ہو جاتا تھا۔

پٹنہ سیٹی کا سومباری میلہ اب تو برائے نام باقی رہ گیا ہے مگر ابھی کچھ جان پٹنہ کی عدالت کچہری کے میلے میں رہ گئی ہے۔ وہاں جس خطہ زمین میں پہلے یہ میلہ لگتا تھا اسی میں عدالت کی وسیع عمارت بن گئی جس کے سبب سے میلے کا پھیلاؤ عدالت کی کچہری کے کمپاؤنڈ کے اندر جو ادھر ادھر سڑکیں نکلی ہیں انہیں کے دونوں طرف محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ میلے کی سیر دیکھنے والے بھی بہت کم رہ گئے ہیں اور میلے کی رنگینیاں تو سرے سے مفقود ہو گئی ہیں۔

کچی درگاہ کا میلہ

حضرت مخدوم شہاب الدین جگجوت علیہ الرحمہ کا مزار پٹنہ سیٹی سے پانچ میل پورب موضع ''جٹھلی'' کے قریب لب دریا واقع ہے۔ مزار بالکل خام ہے اور عین لب دریا مٹی کے ایک بڑے اونچے پشتے پر کھلی جگہ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اگر چہ یہ درگاہ بستی ۔سے دور ایک سنسان مقام پر ہے مگر زائرین کی ہر وقت کی حاضری سے یہ جگہ ہمیشہ آباد نظر آتی ہے۔ حضرت مخدوم شہاب الدین جگجوت علیہ الرحمہ حضرت مخدوم شرف الدین بہاری علیہ الرحمہ کے نانا تھے اور سلطان التمش کے ہم عصر تھے۔ حضرت شہاب الدین جگجوت علیہ الرحمہ کا عرس ہر سال یہاں ۲۱/ذی قعدہ کو پابندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جن میں ہزاروں مسلمان اور ہندو شریک ہوتے ہیں۔ غالباً ہندوؤں کا جتنا مجمع یہاں ہوتا ہے شاید دوسری جگہوں میں نہ ہوتا ہوگا۔ یوں روزانہ بھی اور ہر جمعرات کو بھی زیادہ تر ہندو نیاز دلانیکو آتے ہیں۔ آج بھی حضرت کے عرس کے موقع پر زائرین کا مجمع ویسا ہی ہوتا ہے جیسا پہلے ہوا کرتا تھا فرق صرف یہ ہے کہ حاشئے کے کچے مکانات جن میں سینکڑوں زائرین اور حاجت مند رہا کرتے تھے وہ سب منہدم ہوگئے۔ اس لئے پہلے جس طرح یہ عرس کا میلہ ایک ہفتہ تک چلا جاتا تھا اب یہ

میلہ اسی دن شام میں اور وہاں جو باہر سے دوکانیں جاتی ہیں، دوسرے دن اٹھ جاتی ہیں۔ اطراف و جوانب اور مفصلات سے ہزاروں لوگ آج بھی آتے ہیں مگر کچھ تو قیام کرنیکی مشکلات اور رسل و رسائل کی سہولت سے اسی دن واپس جاتے ہیں۔اور کچھ کھلی فضا میں درختوں کے نیچے رات بسر کرتے ہیں۔ مزار پر چادریں بھی خوب چڑھائی جاتی ہیں مگر اگلے دنوں والی پُر زر چادریں اب نظر نہیں آتیں جس کی وجہ روپئے کی گرانی ہے۔ اگلے دنوں کی بات ہے جب یہ عرس کا میلہ کئی دنوں تک چلا جاتا تھا تو درگاہ کے صحن میں خوب خوب قوالیاں ہوتی رہتی تھیں حاشئے کے قیام گاہوں میں دولتمند زائرین کی طرف سے دیگیں چڑھی رہتی تھیں۔ پلاؤ قورمے اور خمیری روٹیاں فقراء میں تقسیم ہوتی رہتیں۔ کھلی ہوئی افتادہ زمینوں میں ہر طرح کی دوکانیں لگی رہتیں جن میں دیہاتی خریدار بھرے رہتے تھے۔ جاڑے کے دنوں میں جب عرس کی تاریخ پڑتی تھی تو بہار دوگنی ہوجاتی تھی۔ مزار کے پشتے سے دریا کا پانی سرک کر بہت دور چلا جاتا ہے۔ ہر طرف خشک زمینیں نکل آتی ہیں جس کے چمکتے ہوئے ریت پر خیمے اور چھولداریاں ڈال دیتے جن سے لگے ہوئے دریا پر بھی ایک بڑی بستی آباد نظر آتی۔ یہیں کنکوے کے شوقین کنکوے کی پیچیں لڑاتے شرطیں بدی جاتیں اور کنکوابازای کا سلسلہ ایک ہفتہ تک چلا جاتا۔ رات کے وقت اس ریگستان کی بستی میں قوالیاں بھی ہوتیں، لوگوں کی ضیافتیں بھی ہوتیں اور فاتحہ خوانی کے جلسے بھی ہوتے۔ حضرت مخدوم کے عرس کا یہ جاڑوں کا زمانہ بہتوں کے لئے تبدیل آب وہوا اور پکنک کا موقع بھی نکال دیتا تھا۔ موضع جٹھلی جو حضرت مخدوم کی درگاہ سے قریب ہی ایک بڑی آباد بستی ہے اس کی وجہ تسمیہ بھی عجیب بتائی جاتی ہے۔ حضرت کے بعض معتقدین کے یہاں یہ روایت مشہور ہے کہ برسات کی ایک تاریک رات میں حضرت مخدوم جہاں چلہ کیا کرتے تھے اس کے قریب کچھ روشنی نظر آئی اور لوگوں کی آوازیں بھی آئیں وصال سے پہلے حضرت مخدوم اس جگہ پر جہاں آپ کا مزار مبارک ہے یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے، روشنی دیکھ کر اور لوگوں کی آوازیں سن کر مخدوم صاحب وہاں پہونچے تو دیکھا کہ ایک جوان ہندو عورت کی لاش رکھی ہوئی ہے جس کو جلانے کے

لئے لوگ دریا کے کنارے لائے تھے۔ اس عورت کا شوہر اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے اس عورت کے مرنے پر بلک بلک کر رو رہے تھے۔ مخدوم صاحب کو سبھی پہچانتے تھے ان کو دیکھ کر ان کے پاؤں پر شوہر بھی اور ان کے بچے بھی گر گئے اور اپنی مصیبت کی داستان رو رو کر بیان کرنے لگے مخدوم صاحب پہلے کچھ دیر تک غور کرتے رہے پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ رونا دھونا بند کرو یہ عورت مری نہیں ہے اور آپ نے لاش سے فرمایا ''اُٹھ'' یہ سنتے ہی وہ لاش یہ کہتے ہوئے اُٹھ بیٹھی ''جی اُٹھلی''۔ یہ انہیں اطراف کے لوگوں کے ٹھیٹھ ہندی الفاظ ہیں جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں زندہ ہو گئی اس کا دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ میں اُٹھ بیٹھی۔ اس طرح ایک بستی حضرت کے کرامت کی یادگار میں جٹھلی کے نام سے آباد ہو گئی۔

حضرت مخدوم شہاب الدین جگجوت علیہ الرحمۃ کی درگاہ سے متعلق نہ تو کوئی وقف ہے اور نہ کوئی آمدنی ہے مگر عرس کے سارے اخراجات جو بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں آج بھی معتقدین خود کرتے ہیں۔ درگاہ کے کمپاؤنڈ میں ایک پختہ مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ زائرین سے وہ بھی آباد رہتی ہے۔ درگاہ کے خدام بھی ہیں جو دن بھر درگاہ میں حاضری دیتے ہیں اور رات میں گھر چلے جاتے ہیں۔ زیادہ تر یہ سب موضع جٹھلی کے رہنے والے ہیں۔ رات کے وقت کچھ فقراء اور حاجت مند درگاہ میں رہ جاتے ہیں، کھانے پینے کی دوکانیں بھی ہیں اور سب ہندوؤں کی ہیں اور حقیقت پوچھئے تو یہی درگاہ شریف کے نگہبان بھی ہیں۔

اگم کنواں کا میلہ

شہر پٹنہ کے دکھن سرحد پر جو آخری محلہ آباد ہے وہ کمہرار کہلاتا ہے۔ یہ جگہ ایک محلّہ کی نہیں بلکہ مستقل شہر کی ہے جس کی وسعت میں شاہنشاہ اشوک کے عالیشان محلوں کے آثار ملتے ہیں اور آج سے سینکڑوں برس پہلے بودھ دھرم کی تبلیغ داشاعت کا ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہیں ایک بہت بڑا خوفناک کنواں ہے جس کی سطح ٹوٹی ہوئی ہے جس کے سبب

سے اس کے تہہ کی اور چھور نہیں ملتی ہے۔ کنواں کی ساخت اور طرز تعمیر یہی بتاتی ہے کہ یہ بھی زمانہ نایادگار کی ایک نشانی ہے جس کے بنانے والے معمار کی فنکاریوں کی دوسری نشانیاں، شاہنشاہ اشوک کے کھنڈروں میں اور بہار شریف (نالندہ) کے قریب بودھ دھرم کی پرانی درسگاہ نالندہ کی زمین سے برآمد شدہ عمارتوں میں پائی جاتی ہیں۔ پرانی تاریخوں سے اس کنواں کی بنائے تعمیر کا پتہ نہیں چلتا اور یہ بھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے مگر پرانی روایتوں سے جو عوام میں مشہور ہیں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سینکڑوں برس سے یہ کنواں مرجع خلائق ہے وہ کنواں کی پوجا کرتے ہیں اس میں بھینٹ کے لڈو اور پھول چڑھاتے ہیں۔ اساڑھ کے میلا کے موقع پر یہاں ہزاروں ہندوؤں کا میلہ لگتاہے پرانے دور کے معتبر تاریخ داں بھی ابھی تک صحت کے ساتھ اس کنواں کے متعلق تحقیقات کر کے پورا حال نہ جان سکے ہیں صرف سطحی تحقیقات سے جو پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ شاہنشاہ اشوک کے عہد میں یہ کنواں موجود تھا جس میں قابل گردن زدنی اشخاص زندہ ڈال دیئے جاتے اور جنکو کنواں کا ابال کھاتا ہوا پانی اپنے گرداب میں لیکر انکا گلا گھونٹ دیتا تھا۔ شاہنشاہ اشوک نے اپنے اولین دور سلطنت میں جبکہ وہ بودھ مت کا پیرو اور حامی نہیں ہوا تھا اپنے سو سے اوپر بھائیوں کو جو اس کے رقیب اور اس کی سلطنت کے دعویدار تھے۔ اسی کنواں میں زندہ ڈلوادیا اور اس طرح ان کی زندگیاں ختم کردیں۔ شاہنشاہ اشوک کے بعد جب ہندوستان سے بودھ مت کا استیصال ہوا اور پھر برہمنی مذہب لوٹ آیا تو یہی کنواں بعد کے راجاؤں کے غیظ و غضب کا آلہ کار پھر بنا عوام میں اس کنواں کی حیثیت ظالم دیوتاؤں کے مرکزی استھان کی بن گئی تھی۔ اس کی تاریخی حیثیت جو بھی ہو اس کے دہشت ناک افسانوں سے عوام آج بھی دہشت کھاتے ہیں۔

یہیں اساڑھ مہینہ میں ایک مندر کے پاس میلہ لگتا ہے، جہاں دیوتاؤں کے غضب سے بچنے کے لئے مندر میں پوجا کی جاتی ہے۔ بچے بوڑھے جوان کثرت سے جاتے ہیں۔ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ رسمی معتقدات میں عورتیں ہمیشہ مردوں سے بڑھی رہتی ہیں۔

شادی بیاہ کی تقریبات

شادیات میں طول و تکلف وہی ہوتے جن کے لئے اکثر لوگ اپنے بزرگوں کو مصرف اور اسراف پسند کا لقب دیتے ہیں۔ آج مہندی آئی کل سانچق گیا پھر بڑے تزک و احتشام سے بری نکلی اس کے بعد بڑی شان و شوکت سے بارات سج کر دلھن کے گھر پہونچی۔ ہر شادی بیاہ میں کم از کم دس پندرہ دن کی چہل پہل تو ضرور ہو جاتی تھی۔ فضول اور مسرفانہ رسموں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر ایک بات یہ ضرور تھی کہ اسی سے برادری اور عزیز داری کی تجدید ہو جاتی تھی۔ بگڑے ہوؤں کو منا کر لاتے، برسوں کا دل کا میل انہیں موقعوں پر صاف ہوتا اور غریبوں کو نئے نئے کپڑے اور انعامات مل جاتے تھے۔ مسلمانوں کی شادیوں میں ہندو احباب کی کثرت ہوتی اور ہندوؤں کی باراتوں میں مسلمان دوستوں کا جم غفیر ساتھ چلتا۔ مسلمانوں کے لئے ان کے مذاق کے کھانے ہندو اپنے یہاں مسلمان باورچیوں سے پکوا کر کھلاتے۔ شادیوں میں ہندو احباب اپنے یہاں مدعو کرنے کو آتے تو ان کے مدعو کرنے کا طریقہ مسلمانوں سے جدا ہوتا ہے۔ تقریب شادی کے ایک ہفتہ قبل بڑے بڑے خوانچوں میں قسم قسم کے خشک میوے، پھل، مٹھائیاں بہنگیوں پر کہاروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے یہاں بھیجتے اس کے بعد خود صاحب تقریب آتے۔ دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر نیوتہ دیتے۔ خواہ کتنے ہی بے تکلف دوست ہوں پہلے نیوتہ (دعوت) اس قاعدے پر دے لیتے تو اور باتیں ہوتیں۔ مسلمانوں میں طرح تقسیم کرنیکی رسم تھی۔ تقریبات شادی سے دو چار دن پیشتر بڑے بڑے خوانچوں میں ہر طرح کے بہنگیوں پر مسلمان احباب اعزاء اور ہمسایوں کو بھیجے جاتے۔ ہر خوانچہ لال قند کے خوان پوشوں سے ڈھکا ہوتا کھانے قلعی شدہ تانبے یا چینی کے برتنوں میں رکھے ہوتے۔ کہیں ایک بہنگی پہونچی، کہیں دو، کہیں تین، گھر میں جتنے لوگ ملازمین ملا کر ہوتے سبھوں کے لئے کھانے ہوتے بلکہ اس حساب سے دوگنا ہی ہوتے کہ کھانوں میں کمی نہ پڑجائے۔ خوانچے خوان پوش اور تمام برتن انہی کے

ہو جاتے۔ جن کے یہاں یہ طرے بھیجے جاتے۔ پورے محلّہ میں بھی یہ طرّے بٹتے جن کو عوام توڑا کہتے تھے۔ ہندو احباب چونکہ مسلمانوں کے یہاں کے پکے ہوئے کھانوں سے پرہیز کرتے تھے اس لئے ان کے یہاں ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں بھیجے جاتے شادی کے درمیان کھلا ہوا مردانہ اور زنانہ دعوت کا سامان ہوتا۔ کسی کو روک ٹوک نہ تھی۔ جو مدعوئین تھے وہ بھی کھاتے۔ شہر کے غرباء جو بن بلائے آتے وہ بھی انہیں دسترخوان پر بے تکلف کھاتے۔ ہندو احباب کے لئے نامی حلوائیوں کی دوکانیں لگائی جاتیں۔ ان احباب کے لئے الگ جہاں ان کا چوکا ہوتا۔ اس کے منتظم بھی خود ہندو احباب ہوتے اور دعوت کے کھانے وہ انہیں چوکوں میں کھاتے۔ یہاں بھی ہندو غریبوں کی روک ٹوک نہ تھی۔ ہر طرح کے غلوں کا بھی انبار لگا ہوتا۔ لالہ جی اس کے نگراں بیٹھے ہوتے ہندو اور مسلمان جس کو غلے درکار ہوتے اس تقریب میں وہ غلے بھی گھر لے جاتے۔ تیل شکر مسالے، ترکاریاں پان ڈلی، کتھ سب یہاں سے ملتا۔ اسی طرح ہندو حضرات کے یہاں کی شادی کی تقریبات میں مسلمانوں کے لئے الگ کھانے کا سامان ہوتا جس کے مہتم اور انچارج ہندو صاحب تقریب کا کوئی مسلمان دوست ہوتا۔ کھانوں میں یہ اہتمام ہوتا کہ جس قسم کے لذیذ اور پر تکلف دعوت کے کھانے مسلمانوں کے یہاں ہوتے ویسے ہی پر تکلف کھانے ہندو صاحب تقریب مسلمانوں کو کھلاتے صرف اتنا فرق ہوتا کہ یہاں گوشت سے قطعی طور پر پرہیز کیا جاتا۔ رمضان کے دن تھے اور غالباً ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کا زمانہ ہوگا للو بابو مشہور زمانہ مہاجن دھولپورہ کوٹھی کے مالک کے لڑکے بنیئے کرشن کی شادی تھی۔ یہ دھولپورہ کوٹھی صرف بڑے مہاجنی کاربار ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنے صنعتی کارخانوں کے لئے بھی پٹنہ اور کلکتہ میں بڑی مشہور تھی۔ دھولپورہ کوٹھی کے مالک اپنے لڑکے بنیئے کرشن کی شادی کی تقریب میں میرے والد مرحوم خان بہادر سید ضمیر الدین احمد کو مدعو کرنے کے لئے آئے اور یہ سخت اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ اس تقریب میں ضرور شریک ہوں۔ والد مرحوم کے عذر و معذرت کو سن کر صاحب تقریب اب اس پر راضی ہوگئے کہ وہ صرف میری ایک شرکت کو بھی میرے والد مرحوم کی شرکت سمجھیں گے۔ جس رات میں دعوت

محفل تھی میں اس رات میں والد مرحوم کے مختار صاحب کی معیت میں دھولپورہ کوٹھی پہنچا۔ محفل میں رقص و سرود کا آغاز ہوچکا تھا۔ ناچ گھر کے دروازے پر چند معزز حضرات مہمانوں کے استقبال کے لئے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں مولوی فصیح احمد صاحب مرحوم جو پٹنہ کے رئیس اور ریٹائرڈ چیف جسٹس خلیل احمد صاحب کے والد بزرگوار تھے، وہ بھی موجود تھے۔ میں جب ان کے قریب پہنچا اور ان کو سلام کیا تو اٹھ کر انہوں نے مجھے لپٹا لیا پھر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے محفل میں جہاں ایک بلند جگہ پر شہہ نشیں قائم کی گئی تھی وہیں لے جاکر مجھے بٹھا دیا۔ مختار صاحب ساتھ ہی ساتھ تھے وہ بھی ذرا الگ ہٹ کر بیٹھ گئے۔ جیسے جیسے رات بھیگتی گئی محفل کی گمک بڑھتی گئی۔ قریب ایک بجے شب میں جانکی بائی کا گانا شروع ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ محفل میں نئی جان آگئی۔ گرمیوں کے دن تھے اس لئے مہمانوں کے لئے برف کی قفلیوں کا اور ٹھنڈے شربت کا بھی کافی انتظام تھا۔ مسلمانوں کے لئے گنگا جمنی طشت پر خوبصورت گلاسوں میں ٹھنڈے شربت کا رہ رہ کر دور چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہیں گنگا جمنی طشت پر خوبصورت طشتریوں میں برف کی قفلیاں آجاتی تھیں۔ ہندو مہمانوں کے لئے ناچ گھر کے ایک الگ حصے میں یہی انتظام تھا۔ مہتمم حضرات کو ہاتھ جوڑ کر اس حصے میں اٹھا کر لے جاتے تاکہ ٹھنڈے شربت اور برف کی قلفیاں سے ان کی ضیافت ہو۔ چھوت چھات کے سبب سے ہندو حضرات کے لئے اس طرح کا انتظام تھا۔

رات کے دو بجے ہوں گے کہ میں نے دیکھا مولوی فصیح احمد صاحب مرحوم، چند معزز حضرات اور خود صاحب تقریب بھی مسلمانوں کے پاس جاکر بہت مؤدبانہ طریقے سے ان سے کچھ کہہ رہے ہیں، پھر اپنے ساتھ ناچ گھر سے لگے ہوئے برآمدے سے ہوکر دوسری طرف ان کو لے جارہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہی مولوی فصیح احمد صاحب مرحوم میری طرف بھی آئے کہنے لگے "چلو سحری کا وقت ہوگیا ہے سحری کھا لو"۔ میں نے معذرت چاہی تو کہنے لگے کیا روزے نہیں رکھتے ہو؟ میں نے کہا روزہ تو میں بلاناغہ رکھتا ہوں۔ اس پر وہ ہنسے اور یہ فرمایا کہ آؤ ذرا یہاں بھی تو دیکھو کہ سحری کا کیسا انتظام ہے۔ میں ان کے ساتھ وہاں پہنچا جہاں دسترخوان لگے ہوئے تھے۔ اب جو

دیکھتا ہوں تو واہ واہ یہاں تو اعلیٰ چائے کا وہی انتظام ہے جو مسلمان رئیسوں کے یہاں رمضان کے مہینے کی شادی بیاہ میں ضیافت کے لئے اس وقت کیا جاتا تھا۔ پندرہ بیس قسم کے کھانے دستر خوان پر لگے ہوئے تھے۔

یہ تو میرا ایک دفعہ کا تجربہ ہے مگر رمضان کے مہینے میں جب کسی ہندو کے یہاں شادی ہوتی تو مسلمان دوستوں کے لئے کھانا اور سحری کا انتظام مسلمانوں کے مذاق کے مطابق ضرور مہیا رہتا۔ آج کل کے لوگ کیا جانیں کہ اس وقت کی محبت اور دوستی خونی رشتوں سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔

بڑے گھروں کی شادیات میں رقص و سرود کی محفلوں کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اگر کوئی صاحب تقریب ثقہ بھی ہوتا جس کو گانا سننے اور ناچ دیکھنے سے پرہیز ہوتا اس حالت میں بھی اس کو دوستوں کی خاطر اتنی عزیز تھی کہ ان کے لئے رقص و سرود کی محفل سجاتا مگر خود محفل رقص و سرود سے الگ مکان کے کسی دور افتادہ حصے میں اٹھ جاتا۔ یہیں اس کے احباب آکر اس کو مبارک باد دیتے۔ محفل میں صاحب تقریب کے نزدیکی اعزا مہمانوں کی خاطر مدارت میں لگے رہتے۔ شادی بیاہ میں ناچ گانے کی محفلوں کا ہونا چونکہ عام رواج ہو گیا تھا اس لئے آئے دن رقص و سرود کی بہار نظر آتی۔ بعض حضرات تو شادی بیاہ کے ہنگاموں کے اتنے دلدادہ تھے کہ اپنے بچے اور بچیوں کے گوشوارے، بسم اللہ خوانی اور ختنے کے موقعوں پر بھی رقص و سرود کی محفلیں برپا کرتے، بڑی بڑی دعوتوں کا انتظام کرتے اور چار پانچ دنوں کے لئے شادی بیاہ جیسا ہنگامہ کھڑا کر دیتے، ہندو حضرات کے یہاں بچے کے موڑن کی تقریب میں بھی اکثر اسی طرح کی خوشی کا ہنگامہ ہوتا رہتا۔

شادیات میں بری، شانچق اور آخر میں بارات ان تینوں میں لانبے لانبے جلوس ہوتے۔ آگے آگے نشان کا ہاتھی ہوتا اس کے بعد باجے والے پھر سواروں

کے پرے ہوتے جن کے بعد پھر پریوں کی سواریاں ہوتیں جو خیالی پریوں کے لباس میں زیورات سے بجی سجائی۔ کہیں متعدد تخت رواں پر جن کو کہار اُٹھائے ہوتے، بیٹھی ہوتیں اور کئی زیور سے آراستہ پیراستہ گھوڑوں پر سوار نظر آتیں۔ کمسن لڑکوں کو پریاں بناتے تھے۔ پریوں کی قطار گذر جاتی تو پھر کوتل کے گھوڑوں کی قطار شروع ہوتی جو چاندی اور گنگا جمنی زیوروں سے سجے ہوئے اپنے سائیسوں کے ساتھ شوخیاں کرتے ہوئے کچھ دیر تک گذرتے رہتے۔ گھوڑوں میں اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہوتے۔ اس کے بعد پھر ہاتھیوں کی قطار شروع ہوتی جن پر زریں جھولیں پڑی ہوتیں اور ان جھولوں پر بھاری چاندی کی یا گنگا جمنی عماریوں اور ہودے کسے ہوتے، پھر ان کے بعد آرائش کے ساماں ہوتے جن میں گل تراش اپنی ندرت، جدّت اور صناعی کا مظاہرہ دیکھاتے۔ آرائش کے سامانوں کی بہار بھی بڑی نظر فریب ہوتی۔ ان سامانوں کو مزدور قطار در قطار اپنے کاندھوں پر لئے چلتے رہتے۔ جلوس کے بیچ بیچ میں طرح طرح کے باجے اور انگریزی بینڈ ہوتے۔ اسی طرح بارات کے شروع سے لیکر آخر تک بیچ بیچ میں شیشے کے متعدد جھاڑ ہوتے جن میں موم بتیاں روشن ہوتیں۔ مزدور ان کو بھی پر تلوں میں اٹھائے ہوئے بارات کے ساتھ ساتھ چلتے۔ جلوس کے دائیں بائیں دونوں طرف روشنی کی لوکڑیاں مزدوروں کے کاندھوں پر ساتھ ساتھ رہتیں اگر یہ بارات کا جلوس رہتا تو آخر میں نوشاہ کبھی تو ہاتھی کے ایک سجائے ہودہ میں کہیں ایک سجے سجائے گھوڑے پر اور کہیں چاندی یا گنگا جمنی تام جھام میں بیٹھا نظر آتا اور سر پر پُر زر چھتر لئے ایک آدمی ساتھ رہتا اور آگے پیچھے ماہی مراتب لئے خدام کا مجمع ہوتا۔ جلوس دیکھنے کے لئے بازار کی دوکانوں اور کوٹھوں پر تماشائیوں کا ہجوم گھنٹوں منتظر رہتا۔

رقص و سرود کی محفلیں

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اصل گانا تو وہی ہوتا ہے جو عناصر کو بھی متاثر کردے۔ جو گویوں کے متعلق اکثر کہانیوں میں آیا ہے اور یہ بات کثرت سے مشہور ہے کہ ان کے گلے سے نکلے ہوئے گانوں سے سوکھے ہوئے درختوں پر بہار آجاتی تھی، ہواؤں کا رخ مڑ جاتا تھا، دریاؤں کا بہاؤ تھم جاتا تھا، تپش آفتاب سے تپتی ہوئی فضا ایک لخت برسات کے موسم کی فضا میں بدل جاتی تھی اور موسلوں دھار پانی برسنے لگتا تھا۔ دیپک راگ جو میاں تان سین کے نام سے تاریخی طور پر وابستہ ہو گیا ہے اس کی تاثیر یہ بتائی جاتی ہے کہ سننے والوں کے بدن میں گرمی پیدا ہونے لگتی اور جسم پھنک اٹھتا اور بجھے ہوئے چراغ خود بخود جل اٹھتے۔ ہندی گانوں میں اوقات اور موسم کا لحاظ رکھا گیا ہے در حقیقت بلاوجہ نہیں۔ موسم کے لحاظ سے جو گانا سنئے اس میں جو لطف آتا ہے وہ لطف اور کیفیت موسم ہی کی تخصیص کے سبب سے محسوس ہوتی ہے۔ جاڑوں کے موسم میں ملہار یا کجری کبھی لطف نہیں دیتی۔ چیت کے موسم میں چیت ہی کے گانے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ برسات میں کجری کا دوگونہ لطف اٹھانے کے لئے باغوں میں جھولے پڑے ہوں، رم جھم پانی برستا ہو، شوخ و شنگ حسینوں کا جھرمٹ ہو، جھولے کی ہر پینگ پر کجری کی تانیں اڑتی ہوں تب دیکھئے کہ کجری کیا بہار دکھاتی ہے۔ ہولی کی ترنگ بھری فضا میں کوئی ہولی گائے تو عجیب سماں بندھ جاتا ہے۔ اسی طرح شام کلیان، بھاگ بھیرو اور بھیرویں وغیرہ وقت کے مخصوص گانے ہیں اور یہ سب اپنے وقت ہی پر مزہ دیتے ہیں۔ فضا کا بھی گانوں سے متاثر ہو جانا اس کی جھلک بھی اگلے زمانے کے رقص و سرود کی محفلوں میں ملتی تھی ایسا ہوتا تھا کہ ابھی آپ اس جگہ جہاں محفل برپا ہے پہونچے بھی نہیں ہیں کہ دور ہی سے محفل کی گمک آپکا استقبال کرنیکو دوڑی۔ محفل کی یہ گمک ہی ایسی ہوتی تھی کہ شعور کی لطافتیں خود بہ خود جاگ اٹھتیں قدم خود بہ خود تیز اٹھنے لگتے جیسے کوئی مقناطیسی کشش ذہن و شعور کو قدموں کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ محفل کی جگہ جس کو ناچ گھر کہتے تھے ایک بہت ہی آراستہ پیراستہ بہت بڑا

ہال ہوتا، ڈیڑھ دو سو فٹ چوڑا اور اتنا ہی لانبا۔ چاروں طرف اینٹ اور چونے کے بنے ہوئے خوبصورت فیل پائے کہیں انپر نقش و نگار بنے ہوئے اور کہیں سادے۔ جو فیل پائے سادہ ہوتے ان کو سبز و سرخ کپڑوں سے منڈھتے کپڑوں پر اطلس کی لہریاں بناتے اور ان میں زری کے گوٹے پٹھے سے پھول پتے اور چاند تارے کاڑھتے، ناچ گھر کے بیچ بیچ میں بھی ایسے ہی فیل پائے قائم کر کے لکڑی کے موٹے موٹے کھمبوں اور بانسوں سے ان پر جو چھت بنائی جاتی اس کا بوجھا اٹھاتے رہیں اور یہ چھت مضبوط بانسوں کے ٹھاٹھ کی ہوتی جس پر دل بادل نیم گیرے تانتے، اس کے نیچے کے حصے کے لئے یا تو بڑی بڑی چاندنیوں کو ملا کر چھت گیر بناتے یا سینکڑوں گز پھولدار کپڑوں کی چھت گیر بنا کر اس کو مزین کرتے۔ چھت گیر میں جگہ جگہ سوراخ بنا کر چھت کی ٹھاٹھ کے مضبوط بانسوں سے شیشے کے رنگ برنگ کے بڑے بڑے خوبصورت جھاڑ قندیلیں، کونڈیاں اور قمقمے آویزاں کرتے۔ فیل پائے جو خوبصورت ستون کا کام دیتے تھے ان میں خوشنما رنگ برنگی شیشوں کی دیوار گیریں اور حلبی آئینے نصب کرتے، کہیں زری کے مخملی کہیں ریشمی پردوں سے کہیں خوبصورت جالی لیٹ کے پردوں سے جن کے کناروں میں جھوٹی موتیوں کی جھالریں ٹانکی ہوئی ہوتیں دیدہ زیب محرابیں بناتے۔ ہال کے چاروں طرف بیچ میں کافی جگہ چھوڑ کر سطح زمین سے ڈیڑھ دو فٹ اونچی اور ڈھائی تین فٹ چوڑی اینٹوں کی پختہ غلام گردشیں بناتے۔ کہیں لکڑی کے چوکے بچھا کر غلام گردشوں کا کام لیتے۔ سفید براق چاندنی کا فرش ہوتا۔ اگر جاڑوں کے دن ہوتے تو قالینوں کا تمام فرش ہوتا۔ فرش پر پنج شاخہ بیٹھکیوں کے خوبصورت رنگ برنگی شیشے کے فانوسوں کی بہار ہوتی۔ ان بیٹھکیوں سے فرش پر خوبصورت بھول بھلیاں بنا کر راستے نکالتے جن سے ہو کر مہمان آگے بڑھ کر صدر مقام تک پہونچتے۔ بیٹھکیوں کے فانوسوں میں جلتی ہوئی موی شمعیں وہ لطف بہار پیش کرتیں کہ معلوم ہوتا فرش پر ہر طرف ہر رنگ کے پھولوں کے تختے کھلے ہوئے ہیں۔ جھاڑ، قندیلیں، کونڈیاں اور دیوار گیریں جن کے پھولدار شیشے کے فانوسوں میں موی شمعیں روشن ہوتیں ان کا عکس جب آئینوں اور قمقموں پر پڑتا تو پورا ناچ گھر جگمگا اٹھتا اور ان سب کی نرم اور

خنک روشنی میں بجائے خیرگی کے آنکھوں میں ٹھنڈک آتی۔ صدر میں گنگا جمنی پایوں پر سرخ مخمل کا زر نگار چھوٹا سا شامیانہ تنا ہوتا جس کے نیچے پُر زر مسند بچھی ہوتی ویسا ہی پر زر ایک گاؤ تکیہ اور کئی چھوٹے تکئے لگے ہوتے یہ تو نوشاہ کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی جس کو شہ نشین کہتے تھے۔ جس سمت نوشاہ کی شہ نشین ہوتی اس کے مخالف سمت میں آمنے سامنے ناچ گھر میں داخل ہونیکا صدر دروازہ ہوتا۔ یہاں آتے ہی سامنے نوشاہ کی شہ نشین پر نظر پڑتی۔ صدر دروازہ سے ناچ گھر میں داخل ہونے کے بعد آگے کی جانب کچھ جگہ چھوڑ کر شہ نشین کے ٹھیک سامنے ارباب نشاط کے گانے اور ناچنے کی جگہ ہوتی۔ یہ جگہ کچھ اس انداز سے ناپ جونکھ کر نکالی جاتی کہ گانے والی کی آواز ناچ گھر کے ہر گوشے میں پہونچے اور ناچ کا مظاہرہ ہر طرف سے دکھائی دے۔ اس وقت پٹنہ میں گانے والی نامی طوائفوں کی کمی نہیں تھی۔ پھر باہر سے وہ مشہور طوائفیں بھی بلائی جاتی تھیں جو ناچ اور گانے کی ماہر سمجھی جاتی تھیں۔ بلائی جانے والی طوائفوں میں حسن و جمال کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ کچھ صرف اپنے حسن کی بدولت بھی محفلوں میں پہونچ جاتی تھیں۔ محفلوں میں بھانڈوں کا بھی ایک طائفہ ضرور بلایا جاتا تھا۔ ان کی نت نئی نقلوں اور مذاق اور چٹکلوں سے محفل کشتِ زعفران بن جاتی تھی۔ ناچ اور گانے میں بھی بھانڈ کسی سے کم نہیں ہوتے تھے۔ محفلیں کم از کم دو دن اور دو راتوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ رات کی محفل ناچ اور گانے کی محفل ہوتی تھی اور یہ کھڑی محفل کہلاتی تھی۔ دن کی محفل کو مجرے کی محفل کہتے تھے جس میں طوائفیں بیٹھ کر گاتیں۔ آٹھ بجے رات میں محفل شروع ہوتی اور طلوع آفتاب کے ساتھ بھیرویں کے راگ پر ختم ہوتی۔ گانے والیاں رات میں اپنے اپنے ناچ اور گانے کا کمال پیش کرتیں اور پوری محفل ایک فرد واحد بنی ہوئی محو رہتی۔ مہمانوں کے لئے رات میں بھی اور دن میں بھی طرح طرح کے پر تکلف کھانوں کا انتظام رہتا۔ دن کی محفل نو بجے دن میں شروع ہوتی اور سہ پہر شام ہونے کے قبل ختم ہوتی تھی اس کے بعد ہی تمام ناچ گھر میں صفائی شروع ہو جاتی۔ فرش فروش بدلے جاتے۔ جھاڑ، قندیلوں، کونڈیوں اور دیوار گیروں کے شیشے صاف کئے جاتے اور نئی نئی موم بتیاں فانوسوں میں لگائی جاتی۔ رات

کے آٹھ بجتے بجتے ناچ گھر پھر محفل کے سامان سے لیس ہو جاتا۔ کبھی کبھی ایسی محفلیں چار پانچ دنوں تک برپا رہتیں۔ یہ صاحب تقریب کے حوصلے اور استطاعت پر منحصر ہوتا تھا۔ محفل میں روٗسا اور شرفا آتے جاتے، صاحب تقریب ہر ایک کو ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا اور صدر مقام پر لے جاکر بیٹھاتا۔ ہندو اور مسلمان زانو سے زانو بھڑا کر ساتھ بیٹھتے آپس میں آہستہ آہستہ ہنسی اور ٹھٹھول بھی ہوتا رہتا اور گانے اور ناچ پر واہ واہ بھی ہوتی۔ ہر رئیس کے ساتھ دو تین مصاحب اور دو ایک ملازم بھی ہوتے۔ مصاحبین بھی اسی وضع اور لباس میں ہوتے جو ان کے رئیس کا ہوتا۔ اپنے مصاحبوں کو روٗسا اسی شان سے تقریبوں میں اپنے ساتھ لے جاتے یہ بھی اس زمانے کی شان ریاست تھی۔ اپنے رئیسوں کے پیچھے مصاحبین بیٹھتے۔ ایک ملازم کے ہاتھ میں پانوں کا چاندی یا گنگا جمنی خاصدان اور کاندھے پر ایک سفید نفیس تولیہ ہوتا۔ اگر جاڑے کے دن ہوتے تو ملازم کے کاندھے پر اعلی درجہ کی قیمتی شال ہوتی۔ رئیس بیٹھتے تو ملازم بھی غلام گردش کے کسی پائے سے لگ کر کھڑے ہو کر محفل کا لطف اٹھاتے رہتے پان کی ضرورت ہوتی تو مصاحب اشارے سے کسی ملازم کو بلاتے جو خاصدان رئیس کے سامنے پیش کرتا رئیس کے پان کھانے کے بعد پھر خاصدان لیکر اپنی جگہ پر چلا جاتا۔ اگر جاڑے کے دنوں میں سردی کچھ تیز ہو جاتی تو رئیس اپنے کسی مصاحب کی طرف دیکھتا وہ سمجھ جاتا اور اشارے سے ملازم کو بلاتا ملازم مؤدبانہ طریقے سے تہ کیا ہوا شال اپنے رئیس کے زانوں پر رکھ کر واپس ہو جاتا۔ اگر جاڑے کے دن ہوتے تو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ چاندی کے متعدد بڑے طشت پر گرم گرم شیر چائے کی پیالیاں لئے صاحب تقریب کے ملازمین ان چائے کی پیالیوں کو سلیقہ کے ساتھ اہل محفل کے آگے پیش کرتے گرمیوں میں اسی طرح ٹھنڈے شربت اور برف کی قلفیوں کا دور چلتا رہتا۔ چاندی کے چھوٹے چھوٹے متعدد طشت پر پان کی مطبق گلوریاں، چکنی ڈلیاں، الائچیاں اور خوشبو دار قوام کی مطبق گولیاں بھی مہمانوں کو پیش کی جاتی رہتیں۔ خاصہ بردار فتح پیچ اور پیچوان جن کے لڑ بادلے سے منڈھے ہوتے یا جن پر بنت کاری کا کام ہوتا حقہ پینے والوں کے آگے لگا دیتے۔ روغنی چلموں کا مشکبار تمباکو محفل کو معطر کر دیتا چلموں

پر چاندی کے بادلے کے کام کے خوبصورت سر پوش ہوتے۔ گڑگڑی بھی چاندی کی یا بادلے کے کام کی ہوتی۔ سگریٹوں کا اُس وقت رواج نہیں تھا۔ اکثر مسلمان رؤسا اور شرفا بھی دوسروں کے فتح پیچ اور حقے نہیں پیتے تھے۔ ان کے لئے ان کا ملازم گھر ہی سے ان کا پر تکلف پیچوان یا فتح پیچ ساتھ لاتا اور اس کو سج سجا کر اور ان کے سامنے پُر زر یا انداز بچھا کر پیچوان یا فتح پیچ ان کے آگے لگا دیتا۔ تھوڑی دیر پر خاصہ بردار سب پیچوانوں اور فتح پیچوں کی چلمیں بدلتے جاتے۔ رات آدھی پہنچتی اور مہمانوں میں سے اگر کوئی نیند کے خمار میں جھولے لینے لگتا تو صاحب تقریب کے عزیزوں میں سے کوئی شخص دبے پاؤں آہستہ آہستہ بڑھتا، اس کے پیچھے ایک ملازم کے ہاتھوں پر گنگا جمنی طشت جس پر ایک گنگا جمنی بڑے پیالے میں عرق گلاب بھرا ہوا اور ساتھ اس کے ایک بڑی خوبصورت پچکاری رکھی ہوتی۔ نیند سے جھولا لینے والے مہمان کے چہرے پر اس پچکاری سے عرق گلاب کی ہلکی اور ٹھنڈی پھوار مارتا۔ مہمان چونکتا تو یہ مسکرا کر سلام کرتا ہوا پچھلے قدم پلٹ آتا۔

محفل میں ہلکی واہ واہ کے ساتھ کسی منچلے رئیس اور طوائف کے درمیان مذاق کی چھپی ہوئی چوٹیں بھی چل جاتیں۔ پر مذاق فقرے اور برجستہ آوازے سب چھپے ہوئے انداز میں ہوتے کہ آداب محفل اور تہذیب و شائستگی میں خلل نہ پڑے۔ اسی سلسلہ میں مجھے یہ واقعہ یاد آگیا کہ بابو بینی پرشاد رئیس جو محلہ بلور گنج میں رہتے تھے ان کے لڑکے کی شادی میں دن کے مجرے کی محفل جمی ہوئی تھی۔ دو دن کی محفل تھی باہر سے بھی نامی طوائفیں بلائی گئی تھی۔ جانکی بائی ہندوستان کی مشہور گانے والی الہ آباد سے آئی تھی۔ دن کے مجرے کی محفل میں بھی پٹنہ کے ہندو اور مسلمان رؤسائے شہر شریک تھے۔ اتنے میں جانکی بائی مجرے کی محفل میں آئی۔ کم رو، گہرا ساؤنلا رنگ چہرے پر متعدد زخموں کے نشان مشہور تھا کہ جوانی میں کسی حرمان نصیب عاشق نے اپنی تمناؤں سے مایوس ہو کر اپنی حرمان نصیبی کا بدلہ چھریوں کے ضرب سے لیا تھا زخم تو بھر گئے مگر عاشق نامراد کی داستان انتقام جانکی بائی کے چہرے کے داغوں میں باقی رہ گئی تھی۔ اسی سبب سے لوگ جانکی بائی کو چھپن چھری بھی کہتے تھے۔ بدن

اور چہرے پر ملا کر چھری کے چھپّن زخم اس کو سہنے پڑے تھے مگر اس کا گانا جادو تھا جس سے ہر شخص سحر زدہ ہو جاتا تھا۔ یہاں محفل میں اس نے گانا شروع کیا تو شوقین سمٹ کر اس کے قریب آگئے ان میں ایک بزرگ صورت رئیس باریش سفید سب سے آگے بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی واہ واہ سے جانکی بائی کی توجہ حاصل کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جانکی بائی نے ایک غزل شروع کی جب اس شعر پر پہونچی۔

معشوق نوجواں پہ سبھی ہوتے ہیں فدا
جانانِ پیر پر جو فدا ہو تو جانئے

تو ان سفید ریش بزرگ نے زور کا قہقہ لگایا اور جانکی بائی سے آنکھیں ملا کر بول اٹھے "واہ واہ کیا میرے دل کی بات کہی ہے"۔ جانکی بائی نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کرلیں۔

اس زمانے میں پٹنہ آباد تھا۔ رئیسوں اور شریفوں کے پاس دولت تھی اس لئے ہر شادی بیاہ میں بڑی چھوٹی پندرہ بیس محفلیں ہر مہینے میں ہوا کرتیں۔ پٹنہ میں ہندو اور مسلمان رئیسوں کے یہاں کی چند محفلیں بہت دنوں تک لوگوں کو یاد رہیں۔ اختصار کے لئے ان کی تعداد بھی کم کر کے ان کا تذکرہ لکھوں تو الگ سے کتاب تیار ہو جائے۔ بہر حال دو چار محفلوں کی نشاندہی کر دیتا ہوں۔

(۱) گزری کے نواب سید ابراہیم حسین خاں عرف مجھلے نواب صاحب نے اپنے سالے منیر نواب مرحوم کی شادی میں پانچ دن کی محفل نشاط ترتیب دی تھی۔ ہندوستان کی مشہور نامی طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ طوائفوں میں ان کے ناچ اور گانے کے علاوہ حسن و رعنائی کا بھی خیال رکھا گیا تھا مگر اس پانچ دن کی محفل میں جو چیز سب سے زیادہ نادر اور بے مثال تھی وہ یہ تھی کہ ہر دن کی محفل کے لئے نیا اہتمام تھا جس کے ماتحت ناچ گھر کا نقشہ ہر روز بدلا جاتا تھا۔ آج سبز جھاڑ سبز فانوس سبز قندیلیں سبز کونڈیاں سبز شیشے کی دیوار گیریں قمقمے اور سبز پردے اور فرش فروش کی بہار ہے تو کل یہی سب چیزیں سرخ نظر آئیں تیسرے دن محفل میں صرف زرد رنگ کی بہار ہوتی تو چوتھے اور پانچویں دن گلابی اور سفید سامان آرائش سے محفل جگمگاتی رہتی۔

(۲) جسٹس سید شرف الدین مرحوم نے اپنے اکلوتے لڑکے سید احمد شرف الدین مرحوم کی شادی میں دو دن کی محفل صدر گلی میں قائم کی۔ ایک وسیع ناچ گھر بنایا پھر بہتر سے بہتر آرائش و سامان تلاش کر کے ہر جگہ سے منگوائے۔ طوائفوں کے انتخاب میں بھی کدوکاوش کر کے پٹنہ اور باہر سے متعدد طوائفیں بلائیں۔ یہ محفل اندر کا اکھاڑا معلوم ہوتی تھی۔ ایک تعجب خیز بات یہ نظر آتی تھی کہ بڑے بڑے انگریز حکام بھی محفل کا لطف اٹھا رہے تھے مگر کوٹ پتلون میں نہیں بلکہ چست پائجامے جامدانی کے انگرکھے اور لکھنؤ کے پلے کی ٹوپیوں میں یہ انگریز دس پانچ نہیں ان کی تعداد کسی طرح سو سوا سو سے کم نہیں تھی۔ یہ سر علی امام مرحوم اور جسٹس شرف الدین مرحوم کے عروج کا زمانہ تھا۔ حکومت ہند میں سر علی امام مرحوم کا طوطی بولتا تھا اور اس وقت کلکتہ ہائی کورٹ میں جسٹس سید شرف الدین مرحوم انگریزوں کی نظر میں بھی معزز سمجھے جاتے تھے۔ شادی کی شرکت کے لئے زیادہ تر انگریز دہلی اور کلکتہ سے آئے تھے اس کے علاوہ پٹنہ کے بھی انگریز حکام تھے۔

(۳) دھولپورہ کوٹھی میں جو محفل بابو بنئے کرشن کی شادی میں ہوئی وہ بھی پٹنہ کی بڑی محفلوں میں تھی جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

(۴) بابو بھگوت نرائن سنگھ بخشی محلہ میں رہتے تھے۔ پٹنہ کے ایک بڑے معزز رئیسوں میں تھے ان کے اکلوتے لڑکے جمنا پرشاد کی شادی میں بھی دو دن کی محفل یادگار محفل تھی۔

(۵) محلہ لودیکڑہ میں میر کفایت حسین صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے مسٹر منظور حسین بیرسٹر کی شادی میں بھی بڑی شاندار دو دن کی محفل ہوئی۔ اسی محفل میں چودھرائن بچو اور فضل حسین بھانڈ کے درمیان ناچ کا مقابلہ ہوا اس کا بیان بعد کے ایک تذکرہ میں آئے گا۔

(۶) نواب سرفراز حسین خان کے صاحبزادے مسٹر تجمل حسین بیرسٹر کی شادی میں دو دن کی محفل سید محبوب اشرف پٹنہ کے مشہور رئیس کے مکان میں منعقد ہوئی ان کا یہ عالیشان مکان بھی ایک بڑے عالیشان پختہ ناچ گھر کا نقشہ پیش کرتا ہے اس پر مزید جو محفل کے لئے سجاوٹ اور اہتمام ہوا تو مت پوچھئے کیا طلسمی ناچ گھر کا

نظارہ آنکھوں کے سامنے پیش ہوا۔ غرض یہ محفل بھی ہر لحاظ سے یادگار ہے۔

(۷) ٹیڑھی گھاٹ میں خان بہادر سید ابراہیم حسین صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی سید یوسف حسین بیرسٹر مرحوم کی شادی میں جو محفل رقص و سرود منعقد کی وہ بھی بہت سے لوگوں کو بہت دنوں تک یاد رہی۔ نامی طوائفوں کا طائفہ تھا ہی مگر اس شادی میں ناچ گھر کا لطف سب سے بڑھا ہوا اس لئے تھا کہ یہ برسات کے دن تھے۔ پختہ بڑے صحن میں پختہ فیل پائے اس طرح بنائے گئے تھے کہ مستقل بارش سے بھی اس کی عارضی چھت متاثر نہ ہو۔ سامنے سید ابراہیم حسین صاحب مرحوم کے مکان کے پشتوں سے ٹکراتی ہوئی دریائے گنگا کی طوفانی موجیں اہل محفل کو دلکش نظارہ پیش کرتی تھیں۔ اسی محفل کے ناچ گھر کی تعمیر میں جو خاصہ اہتمام کیا گیا تھا اس کے سبب سے اخراجات بھی کافی ہوئے تھے۔

(۸) حاجی اچھے خان منت خان پٹنہ کے سب سے بڑے تاجر تھے ان کی متعدد دوکانیں اور گودام پٹنہ میں اور کلکتہ میں بھی تھے۔ دولت کافی تھی ان کے یہاں اور سبھی شادیوں میں ناچ اور گانے کی محفلیں ہوا کیں مگر سلطان خان کی شادی کی محفل ہر لحاظ سے ایک بڑی اور یادگار محفل تھی ناچ گھر بڑا خوبصورت بنا اور ناچ گھر کی آرائش میں بڑا تکلف برتا گیا۔ خوشنما اور قیمتی زرنگار ریشمی پردوں سے فیل پاؤں کے درمیان محرابیں بنائی گیں۔ اعلیٰ درجے کے کٹ گلاس کے شیشے کے جھاڑ فانوس قندیلوں کونڈیوں اور دیوار گیروں سے اس طرح ناچ گھر کو سجایا گیا کہ یہ خود نئی نویلی دلہن کا مرقع بن گیا۔ غرض ہر چیز لاجواب تھی ارباب نشاط کے طائفے منتخب زمانہ بلائے گئے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے، مہمانوں کے لئے بڑے خوبصورت دستی پنکھے ولایت کے بنے ہوئے جن سے ہوا بھی نکلے اور خوبصورت تحفے بھی کہلائیں ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے اور مہمانوں کو پیش کئے جاتے تھے۔ ان پنکھوں کے علاوہ کراسن لیمپ سے چلنے والے کیکو کے پنکھے ہر جگہ محفل میں قرینہ سے رکھے تھے اور وہ اسی طرح چل رہے جس طرح بجلی سے چلنے ٹیبل فین یا پڈسٹل فین چلتے ہیں۔ دو دن کی محفل تھی مگر اس محفل کا چرچا بہت دنوں تک رہا۔

(۹) سید نجم الحسن مرحوم کی شادی میں سر سید سلطان احمد مرحوم نے جو محفل نشاط سجائی اور جس طرح فراغ حوصلگی سے اس کا اہتمام کیا اس نے محفل نشاط کو یاد گار بنا دیا۔ نجم الحسن سر سید سلطان احمد کے بھتیجے اور لے پالک تھے۔ سر سلطان احمد نے ان کی پرورش شہزادوں کی طرح کی چونکہ لاولد تھے اس لئے اپنی پوری محبت انہیں کی طرف مرکوز کر دی تھی۔ نجم الحسن مرحوم کی شادی گزری کے چھوٹے نواب مرحوم کی صاحبزادی یعنی نواب زادہ سید محمد مہدی مرحوم کی چھوٹی بہن سے انجام پا رہی تھی۔ یہ سر سلطان احمد مرحوم کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا صوبہ بہار کیا حکومت ہند میں بھی ان کا طوطی بولتا تھا سر علی امام، مسٹر حسن امام کے ناموں کے ساتھ ان کا نام بھی ضرور آتا تھا۔ بہر کیف اپنے یہاں کی محفل نشاط میں انھوں نے ہندوستان کی مشہور گانے والیوں کو بلایا تھا جن میں جے پور کی گوہر بائی بھی تھی جو مشکلوں سے دور کی محفلوں میں جاتی تھی۔ ناچ گھر بڑا وسیع تھا اس کی آرائش میں صاحب تقریب کا حوصلہ دیکھنے کی چیز تھا۔ راجے اور مہاراجے سبھوں نے اپنے یہاں کے سامان آرائش بلا مانگے بھیج دیئے تھے اس لئے محفل ہر طرح سے محفل رنگ و نور بن گئی تھی۔ باوجود مغربی طرز تہذیب کے نمائندے ہونے کے جو سر سلطان احمد کے بیرسٹری کے پیشے کے لئے ضروری تھا ان پر مشرقی تہذیب کی چھاپ پھر بھی نمایاں رہتی تھی۔ گانے کے متعلق ان کی معلومات کافی تھیں اور خود اچھے گانوں کے رسیا تھے۔ ان کے بعض مغرب زدہ دوستوں نے اس محفل نشاط کے متعلق ان پر اعتراض کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ "بھئی سلطان انگریزی ماحول میں رہ کر بھی تم پرانے فرسودہ رواج کے کس طرح دلدادہ ہو؟" انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ خوشی اور غم میں انسان کچھ دماغی توازن ضرور کھو دیتا ہے اور جتنا زیادہ خوشی یا غم سے متاثر ہوتا ہے اتنا ہی دماغی توازن سے دور جا پڑتا ہے۔ میرے لئے نجم الحسن کی شادی میری سب خوشیوں سے بڑھ کر تھی اب اگر میں تم لوگوں کے خیال کے مطابق ایک لغو فعل کر بیٹھا تو اس کو اسی قاعدے پر سمجھو۔

افسوس زمانے کے بحر ناپیدا کنار میں ایسی سب ہستیاں پانی کے بلبلے کی طرح فنا ہوتی گئیں۔

بھانڈ

رقص کا دلچسپ مقابلہ

شادی کی تقریب میں یا کسی خوشی کے موقع پر بھی جہاں بھی رقص و سرود کی محفل برپا ہوتی اور نامی طوائفین ناچ اور گانے کے لئے بلائی جاتیں وہاں بھانڈوں کا ہونا بھی ضروری تھا۔ یہ اپنی اچھوتی بر محل نقلوں سے ساری محفل کو کشت زعفران بنا دیتے تھے۔ ان کی پھبتیاں، ان کے چٹکلے اور ان کی بنی ہوئی مضحک شکلیں ایسی ہوتی تھیں کہ روتوں کو ہنسا دیں۔ یہ محفل میں آئے اور محفل کی محفل چونک اٹھی۔ محفل میں ان کے آنے کا انداز نرالا ہوتا تھا۔ جب محفل میں ان کے آنے کی باری آتی اور ان کے قبل کا طائفہ اٹھ چکا ہوتا تو یکایک محفل کے کناروں سے گھوڑوں کی ہنہنانے کی آوزیں آنے لگتیں اور ساتھ ہی ساتھ کچھ بھانڈ ادھر اُدھر سے سواروں کی ٹھاٹھ بنائے اور خیالی گھوڑوں کی لگامیں دونوں ہاتھوں سے کھینچے بیچ محفل میں آدھمکتے۔ تھوڑی دیر تک ہر سوار اپنے خیالی گھوڑوں کی تعریف مقفی اور مسجع الفاظ میں سناتا رہتا۔ یہ بھونچال ختم ہوتا تو مُرھے اور پھول جھڑیوں کی شوں شاں اس مزے سے منہ سے نکالتے کہ سچ مچ آتشبازی کا مزہ آجاتا۔ سوتوں کو بیدار کرنے، اونگھتوں کو چونکانے اور اپنا رنگ جمانے کی یہ خاص ترکیب تھی۔ اس کے بعد آٹھ دس بھانڈوں کا یہ گروہ تالیوں کی آواز پر سُر قائم کرتا اور اسی سُر پر سارنگیاں اور ٹھیکے ہلکے ہلکے بجنے لگتے۔ سرگروہ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ناچ اور گانے میں طاق ہو۔ سرگروہ ہی کے نام سے بھانڈوں کا طائفہ منسوب اور مشہور رہتا تھا۔ گروہ کے اور لوگ تو معمولی لباس میں ہوتے مگر سرگروہ کا لباس یہ ہوتا کہ چوڑی دار پائجامہ کے اوپر پرزر پیشواز، زردوزی کا ریشمی یا مخملی چست شلوکہ اس پر باریک ریشمی کپڑے کی زرنگار اوڑھنی جو کبھی سر پر رہتی اور کبھی ڈھلک کر

شانوں پر آجاتی، سر پر لانبے بالوں کا جوڑا بندھا ہوا اور دونوں پاؤں میں متعدد گھونگھرو بندھے ہوتے۔ گروہ کی ایک ساتھ تالیوں اور سارنگی کے ہلکے سُر کے ساتھ گانے کی ابتدا ہوتی۔ پہلے تو ہلکے ترنم میں سب مل کر گاتے پھر سرگروہ کوئی موزوں اور وقت کا راگ چھیڑتا ساتھ ہی طبلے اور سارنگی کی آواز بلند ہوتی اور یہ راگ فضا میں لہرانے لگتا۔ ساتھ والے ہم آہنگی کے ساتھ تالیاں اس طرح بجاتے کہ وہ بھی ساز کی دم ساز بن جاتیں۔ جب ایک گانا ختم ہوتا تو بیچ میں بیحد عجیب اور مضحکہ خیز نقلیں کرتے۔ اس درمیان میں سرگروہ دم لینے کے لئے تھوڑی دیر الگ بیٹھ رہتا۔ لکھنؤ اور دلی میں بھانڈوں کے متعدد نامی طائفے تھے مگر پٹنہ بھی ان سے خالی نہ تھا۔ یہاں بھی ان کے کئی گروہ تھے جن میں سے دو طائفے ملک بھر میں مشہور تھے۔ ایک گنیشی کا طائفہ دوسرا زمرد بھانڈ کا طائفہ تھا۔ شرابی کی نقل اور برہا گانے میں آخر تک گنیشی کا کوئی مد مقابل نہ نکلا۔ بے پئے شرابی کی ایسی نقل کرتا تھا کہ سچ مچ ایک بڑے پئیکڑ شرابی کا نقشہ نظر کے سامنے آجاتا۔ شراب کے ہر خیالی گھونٹ پر چہرے پر چڑھتا ہوا نشہ لوگوں کو حیرت زدہ کر دیتا تھا اور برہا کا گانا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی کے لئے محفلیں بن کر اوپر سے اترا ہے۔ یہ ایک دھوبی کے شراب پینے اور عالم سرور میں اس کے برہا گانے کی نقل تھی۔ محفلوں میں گنیشی سے اس کی نقل کی فرمائش کی جاتی تھی اور جب تک شوقین حضرات یہ نقل نہیں دیکھ لیتے محفل چھوڑ کر نہیں جاتے تھے۔ محفل ہی میں نقل شروع ہوتی جب ناچ اور گانے کے بعد وقفہ ہوتا تو گنیشی دھوبی کا روپ بناتا۔ پھر محفل ہی میں ادھر ادھر گھوم کر ایک بڑا گٹھر اٹھائے ہوئے اپنی جگہ پر واپس آتا اور تاثر دیتا کہ دن بھر کے کام سے تھکا ہوا گھاٹ سے واپس آیا ہے۔ گٹھر ایک طرف ڈال دیتا ہے۔ اس کا ایک ساتھی ساڑی باندھے ہوئے دھوبن کا پارٹ ادا کرتا۔ نقلی دھوبی کے لئے دھوبن ایک تھال میں کچھ کھانے کی چیزیں لاتی اور سامنے اس کے رکھ دیتی۔ دھوبی اٹھ کر گھر کے اندر جاتا اور دیسی شراب کی ایک بوتل نکال لاتا۔ منجیرہ کی پیالیاں جو کانسے

کی بنی ہوتی ہیں اور جن کو آپس میں ٹکرا کر دوسرے سازوں کا ساتھ دیتے ہیں ان میں سے ایک میں سے ایک کو گنیشی شراب کا پیمانہ بناتا۔ بوتل میں شراب کی جگہ لال شربت ہی ہوتا۔ اب آہستہ آہستہ تھال سے یہ مصنوعی دھوبی منہ میں لقمہ ڈالتا جاتا اور منجیرہ کے بنے ہوئے پیالے سے اس میں شراب کا گھونٹ بھی لیتا جاتا۔ ہر جُرعہ شراب پر عجب عجب طرح اس کا منہ بھی بنتا۔ اس درمیان میں اس کے کچھ ساتھی دھوبی بنے ہوئے اس کے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ ان کے آنے سے پیمانے کی گردش بڑھ جاتی جس کے ساتھ ساتھ دھوبی کی نشہ کی تیزی بھی بڑھنے لگتی۔ اس ترنگ میں اپنے ساتھیوں کی فرمائش پر دھوبی برہا کا راگ شروع کرتا۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہوتی تھی کہ بوتل میں اگرچہ شراب کی جگہ پر شربت ہوتا تھا مگر ان شربت کے پیمانوں کو جام شراب بناکر گنیشی کس کس طرح شراب کی نئی کیفیتیں اپنے چہرے پر طاری کرتا تھا۔ ہر گھونٹ پر آنکھیں سرخ ہوتی جاتیں، خدو خال میں شرابی کا نقشہ ابھر جاتا اور آواز بھرانے لگتی، حالت اور ہیئت کی تبدیلی اتنی مکمل ہوتی تھی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ گنیشی کے ایکٹنگ کا یہی کمال تھا کہ بے پیے سچ مچ نشہ میں چور معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس نقلی عالم مستی میں ایک مخمور شرابی کی طرح اس کا اس انداز میں برہا گانا جو فضا اور ماحول کو بھی مخمور بنادے بڑا ہی حیرت انگیز نظارہ ہوتا تھا اپنے بچپن میں جب میری عمر دس۔ گیارہ سال کی تھی میں نے دو محفلوں میں گنیشی کو شرابی کی نقل کرتے اور برہا گاتے دیکھا۔ گنیشی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ میرا تو خیر بچپن کا زمانہ تھا مگر دوسرے بڑے لوگوں سے گنیشی کے ایکٹنگ کی تعریف بار بار سنی۔

رقص کا ایک دلچسپ مقابلہ

۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں میرے ایک عزیز قریب کی شادی تھی۔ یہ میر کفایت حسین صاحب مرحوم محلہ لودی کٹرہ پٹنہ کے معزز رئیس کے صاحبزادے مسٹر سید منظور احمد بیرسٹر تھے۔ ان کی شادی میں دو دنوں کی محفل کا پروگرام تھا۔ باہر سے بھی گانے اور ناچنے والے طائفے بلائے گئے تھے پٹنہ کی بہتر سے بہتر گانے والی طوائفیں بھی تھیں۔ باہر سے بلائے جانے والیوں میں چودھرائن بچوا بھی تھی۔ مصطفیٰ حسین بھانڈ کا طائفہ بھی لکھنؤ سے بلایا گیا تھا۔ ہندوستان بھر میں رقص کے مانے ہوئے کامل استاد کا لکا اور بندا دین دو اپنے بھائی تھے۔ یہ دونوں مرحوم واجد علی شاہ کے نظر کردہ تھے دونوں ہی اپنے فن میں آفتاب تھے۔ دونوں بھائیوں کے کمال میں فرق بتانا مشکل ہی نہیں محال تھا۔ ان کا زمانہ بہت پہلے گزر چکا تھا مگر اپنے پیچھے دونوں نے اپنی مشترکہ و فنی وراثت اپنے دو پختہ فنکار شاگردوں کی حیثیت سے چھوڑی تھی ایک تو فضل حسین جو مصطفیٰ حسین بھانڈ کا باپ تھا دوسری چودھرائن بچوا تھی۔ ناچنے والیوں میں چودھرائن بچوا کا شہرہ ہر جگہ تھا۔ محفلوں کے لئے بڑی بڑی رقمیں فیس کی مانگتی اور یہ رقمیں شوقین خوشی سے دیتے۔ محفل کے پہلے ہی دن چودھرائن بچوا نے پوری محفل کو اپنے پر کیف رقص سے موہ لیا تھا۔ فضل حسین نے بڑھاپے کے سبب سے ناچنا ترک کر دیا تھا۔ کبھی کبھی دور کی محفلوں میں تماشہ بینی اور محض سیر کے لئے اپنے بیٹے مصطفیٰ حسین کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ اتفاقاً یہاں بھی اپنے بیٹے کے ساتھ لکھنؤ سے آگیا تھا۔ پہلے دن ناچ ختم ہوا تو بچوا نے رندؔ کی مشہور غزل۔

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد

میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

اس طرح بتا بتا کر گانا شروع کیا کہ ساری محفل لوٹ پوٹ ہوگئی۔ ڈیڑھ گھنٹے تک وہ اس غزل کو گاتی رہی اور ہر بار نئے انداز میں اپنے چشم و ابرو کے اشاروں سے ہر لفظ کو اس

طرح ادا کرتی گئی کہ خود شعر کی تشریح بن گئی۔ محفل کا یہ حال تھا کہ اس کے ہر انداز پر جھوم رہی تھی۔ دوسری رات آئی۔ دو ایک گانے والیوں کے بعد پھر بچوا کا گانا شروع ہوا۔ ناچ ختم ہوا اور جب ہر طرف سے یہ تعریف میں زوروں پر واہ واہ ہوئی تو بچوا نے سبھوں کو جھک کر تسلیم کی اور کہا کہ آج میں آپ ہی کی ہمت افزائی کے باعث اپنے استاد کا کمال پیش بھی کر گئی۔

فضل حسین بھانڈ اپنے گروہ کے ساتھ الگ ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا محفل کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بچوا کے اس جملہ پر چونکا ضبط نہ رہا تو بھری محفل میں صاحب تقریب کے پاس آکر دست بستہ کہنے لگا "سرکار بوڑھا ہو چکا ہوں اس لئے ناچنا اور گانا چھوڑ دیا ہے۔ برسوں سے ذرہ برابر ریاضت بھی نہیں کی ہے مگر آج چودھرائن جی نے ایک بات ایسی کہہ دی کہ اس بڑھاپے میں مجھے اپنا عہد توڑنا پڑا استاد تو اپنا کمال اپنے ساتھ لے گئے وہ کمال اب کہاں باقی جو چودھرائن جی پیش کر سکیں۔ یہ طنز مجھ پر تھا مجھے اجازت ملے تو آج مصطفیٰ حسین کی جگہ پر آپ کے سامنے اپنا ناچ پیش کروں"۔ لوگوں کو فضل حسین کا ناچ دیکھے ہوئے بہت دن ہوگئے تھے۔ ہر شخص اس کا ناچ دیکھنے کا دل سے مشتاق تھا مگر یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ دنوں سے اس نے ناچنا اور گانا چھوڑ دیا ہے۔ اب اس کی اس استدعا پر ساری محفل پھڑک اٹھی۔ "ہاں" "ہاں" اور "ضرور" "ضرور" کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ اس درمیان میں بچوا نے اپنا ناچ ختم کر کے گانا شروع کر دیا تھا۔ ابتو چشمک چل چکی تھی، بچوا نے بھی سنبھل کر گانا شروع کیا۔ خوب جی توڑ کر گائی اور ہر راگ اور راگنی میں روح پھونکتی گئی۔ اس کا گانا ختم ہوا تو سبھوں کی آنکھیں فضل حسین کو ڈھونڈنے لگیں۔ بیچ میں ایک دوسری اچھی گانے والی کی باری تھی سردست اس کا گانا ملتوی رہا اور فضل حسین اپنے گروہ کے ساتھ محفل میں آدھمکا۔ بوڑھا فضل حسین پیشواز پہنے ہوئے اس پر چست شلوکہ اور سر پر اوڑھنی، دونوں پاؤں میں سینکڑوں گھونگھرو بندھے ہوئے عجب سماں تھا۔ ایک طرف بچوا بھی

اب جا کر بیٹھ گئی۔ تمام شائقین سمٹ سمٹ کر آگے بڑھے چند لمحہ تو محفل میں خاموشی کا عالم رہا پھر ہلکی اور ہم آہنگ تالیوں نے اس سکوت کو توڑا۔ مدھم سروں میں ساز بجنے لگے۔ ساتھیوں نے پنجی لئے میں ابتدائی گان شروع کر دیا۔ اتنے میں فضل حسین نے بھاؤ بتا کر ناچ کا پینترا بدلا اور دفعتہً گھونگھرو جھنجھنا اٹھے۔ حقیقت میں یہ ناچ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ گھونگھرو کی آواز ساز سے ملی ہوئی ایسا راگ پیش کر رہی تھی جس کا بیان نہ زبان سے ادا ہو اور نہ تحریر میں آسکے۔ ہر گت پر "تا تھئی تا تھئی تھا تھا" کی آواز کے ساتھ رقص آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک لپکا تھا جو ہر لمحہ بھڑک اٹھتا تھا ایک بجلی تھی جو بار بار کوند رہی تھی۔ گھونگھرو پاؤں کی حرکت پر سب کے سب بجنے لگتے پھر کچھ خاموش ہو جاتے اور بقیہ بجتے رہتے، فضل حسین بتاتا جاتا کہ حضور سو گھونگھرو بج رہے ہیں، اب پچاس بج رہے ہیں، لیجئے دس بجتے ہیں، یہ ایک گھونگھرو ہے جو بج رہا، اب ایک بھی نہیں بجتا۔ رقص کبھی تیز کبھی مدھم ہوتا اور اسی کے انداز میں رقص کا دائرہ بنتا رہتا۔ فضل حسین کے ایک ساتھی نے اس کے چاروں طرف سینکڑوں بتاشے لا کر بچھائے۔ فضل حسین کا یہ عالم کہ سدھ بدھ کا ہوش نہیں۔ بتاشے بچھائے گئے تو فضل حسین چونک کر مسکرایا اس کے اشارے پر دائرہ اور تنگ کر دیا گیا۔ چاروں طرف بتاشے بیچ میں مشکل سے تین چار فٹ کی جگہ خالی رہی اب فضل حسین نے ایک کلاسیکی اور روائتی رقص شروع کیا یہ رقص عام طور سے محفلوں میں نہیں ناچا جاتا تھا۔ عشق و عقیدہ کا یہ علاماتی رقص ہے جو صرف جنوبی ہندوستان کے بعض مندروں کی چند دیو داسیوں میں اب باقی رہ گیا ہے۔ فضل حسین کا یہ رقص بھی اچھوتا تھا اور انداز رقص کا دائرہ اتنا تنگ کہ ناچ میں پاؤں بہکے تو بتاشے چور ہوں، مگر فضل حسین کا یہی کمال تھا کہ اس عالم خود فراموشی اور وارفتگی میں جو فضل حسین پر رقص سے طاری تھا اس کے پاؤں دائرے کے اندر ہی تھرک رہے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں چشم وابرو، چہرے اور اس کی پوری حالت سے جو جذبات کی شدت بڑھتی تو گھونگھرو کی آواز اور جھنکار بھی

تیز ہو جاتی ۔ پھر ان کی کیفیت بدلتی تو گھونگھرو کی جھنکار میں بھی فرق آنے لگتا۔ یہ رقص کم و بیش ایک گھنٹہ تک جاری رہا رفتہ رفتہ جب رقص کا ابھار ختم ہوا اور فضل حسین کے پاؤں رکے تو دیکھا کہ ارد گرد کا ایک ایک بتاشہ مسلم تھا رقص کے ختم ہوتے ہی ساری محفل گرداب طلسم سے ابھری اور واہ واہ کے شور سے ناچ گھر گونج اٹھا ۔ سب کو حیرت یہ تھی کہ یہ جذبات عشق و عقیدت سے بھرپور طویل کلاسیکی رقص فضل حسین نے اپنے بڑھاپے میں مکمل طور پر کس طرح اختتام تک پہونچایا۔ اس رقص کے بعد فضل حسین نے دم درست کرنے کے لئے تھوڑی مہلت مانگی ۔ پندرہ بیس منٹ گزرے تو اس نے ناچ کا دوسرا پینترا بدلا۔ سازندے اس کے اور قریب آگئے "پیا سے سندیسہ مورا کہیو جائے ، کاگارے جارے جارے" اس کے بول سارنگی کے تاروں سے نکلے تو نرالا سماں بندھنے لگا۔ فضل حسین نے ہنس کر بچوا کی طرف دیکھا تو بچوا بھی مسکرا کر کچھ آگے کھسک آئی ۔ بہت دیر تک فضل حسین طرح طرح کے انداز میں بھاؤ بتا کر اس ٹکڑے کو گایا کیا۔ کبھی تو التماس و تمنا کی تصویر بن جاتا کبھی یاس و حرماں کا وہ نقشہ پیش کرتا کہ معلوم ہونے لگتا کہ سچ مچ ایک درد ہجراں کی ماری اپنے پریتم کا سندیسہ اپنے پریتم کے پاس بھیجنے کے لئے کس طرح بے چین ہے۔ پوری محفل ایک متنفس بنی ہوئی عالم محویت میں تھی ۔ ناچ اور گانا ختم ہوا۔ گھڑی دیکھتے ہیں تو تین گھنٹے گزر چکے تھے اور سامنے پورب کی جانب آسمان پر صبح کا دھندلکا نمودار ہو رہا تھا۔ فضل حسین کا یہ ناچ برسوں لوگوں کو یاد رہا۔

بھانڈوں کی نقلیں طنز و ظرافت کی چاشنی لئے ایسی ہوتی تھیں کہ جو چاہے ان سے اچھی نصیحتیں بھی حاصل کرلے، تمیز دار چچا اور بدتمیز بھتیجے کی نقل اور اس کے برعکس بدتمیز چچا اور تمیز دار بھتیجے کا لطیفہ یہ سب ہنسنے ہنسانے کی باتیں تو تھیں مگر سماج پر بھی اس میں بھرپور طنز تھا۔ بعض نقلوں میں بازار حسن کی سیر کرنے والے رئیسوں اور حسن فروش طوائفوں پر طنز و ظرافت کے پردے میں گہر دار کر جاتے تھے ۔ مگر یہ

سب ایسے لطیف پیرائے میں کہ دلوں کو ٹھیس نہ لگے اور حقیقت باریک پردے میں چھپی رہے۔ طوائفیں اپنے متعلق نقلیں شوق سے دیکھتیں اور ان میں کہیں اگر گہری چوٹ پڑتی تو شرما کر پیچھے کھسک جاتیں۔ مزہ تو اس وقت آتا جب یہ بھانڈ کسی سے بگڑے ہوئے ہوتے اور اس کی کسر اپنی نقلوں سے نکالتے۔ اس کے لئے نقل کا پلاٹ پہلے ہی تیار کر لیتے تھے اور پھر اس میں ظرافت کی چاشنی بھر کر محفل میں پیش کرتے تھے نقل اس انداز میں پیش کرتے کہ جن صاحب سے کسر نکالنی ہوتی وہ بھی اور دوسرے لوگ بھی مطلب سمجھ جاتے مگر نقل میں وہ لطف پاتے کہ خفا ہونے کی جگہ پر قہقہہ لگا کر واہ واہ بھی کرتے۔

اس دور کی طوائفیں

زہرا بائی

یوں تو بی رمزو، بی چھٹن پھر ان کے بعد بڑی کنیز جو آخر میں شراب کے ہاتھوں پاگل ہو کر سڑکوں پر ماری ماری پھرتی تھی، بی حیدر جان، بی حنا یہودن، اللہ جلائی اور محمد باندی جس نے خود بھی لاکھوں کمایا اور اپنے ایک بیٹا اور ایک بیٹی کو بڑے دولت مند گھروں کا مالک بنایا ان سب کی ہر محفل نشاط میں مانگ رہتی تھی اور یہ سب پٹنہ کی نامی طوائفوں میں تھیں مگر فن موسیقی میں جو کمال زہرہ بائی کو حاصل تھا اور اس فن میں جتنا اس کا نام نکلا اور ہر جگہ اور ہر شہر میں مشہور ہوا اور آخری دم تک وہ کمال اور وہ شہرت جو اس کے نام کے ساتھ وابستہ رہی وہ ان میں سے کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ زہرہ بائی آگرہ کی رہنے والی تھی۔ ۱۸۸۵ء کا زمانہ ہوگا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ کم سنی میں مہاراجہ دربھنگہ کے دربار میں پہونچی۔ اس وقت کے مہاراجہ دربھنگہ کی الوالعزمی اور دریا دلی تمام ہندوستان میں مشہور تھی۔ ہندوستانی موسیقی کے

بڑے سرپرست تھے۔ اس فن کے کامل ان کے یہاں کھینچے چلے آتے تھے اور ان کے دامن دولت سے وابستہ ہو جاتے تھے مہاراجہ کا دربار اس طرح ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کا ۱۸۵۷ء کے بعد مامن و مسکن بن گیا تھا۔ زہرہ بائی نے موسیقی کی تعلیم انہیں یگانہ روزگار استادوں سے پائی۔ وہاں سے تعلیم پاکر نکلی تو پٹنہ میں آکر بس گئی۔ پٹنہ سے اس کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی۔ بڑی بڑی محفلیں بغیر اس کے پھیکی رہتیں۔ یہ گاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ درودیوار سے نغمے پھوٹے پڑتے ہیں۔ فضا سے نغموں کی بارش ہو رہی ہے اور محفل میں راگنی دیوی اپنے جاہ و جلال کے ساتھ براجمان ہے۔ اس کے پاس دور دور سے گانون کے ماہر اور استاد آتے تھے اور کچھ نہ کچھ اس سے فیض حاصل کر کے لے ہی جاتے تھے۔ اس کی نشست و برخاست دیکھ کر یہ تمیز مشکل تھی کہ یہ طوائف ہے یا کسی اچھے گھر کی شریف زادی۔ اس کی منکسر مزاجی اس کی رقیب طوائفوں کا بھی دل موہ لیتی تھی اس کی شرافت پسندی کا بھی ایک واقعہ سنئے۔ اسکول اور کالج کے چند طلبا ایک دفعہ اس کے یہاں پہونچے۔ یہ صورت دیکھ کر سمجھ گئی کہ شریف طالب العلم لڑکے ہیں ان کی خوب آؤ بھگت کی، آنے کا مقصد پوچھا۔ ان سبھوں نے گانا سننے کی خواہش ظاہر کی تو تان پورا لیکر بیٹھ گئی۔ بغل کے کمرے سے سا جی بھی آگئی۔ دو گھنٹوں تک ان لڑکوں کو گانا سناتی رہی۔ گانا ختم ہوا تو ہنس کر بولی کہ سیر ہوئی کہ نہیں؟ لڑکے بہت خوش تھے۔ سبھوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گھر واپس گئے۔ اپنے آخری زمانے میں اس نے تائب ہو کر نکاح کر لیا تھا مگر گانے کا دھندھا جاری رکھا تھا گانا چھوٹتا بھی تو کیسے۔ گانا ہی تو اس کی جان اور اس کی زندگی بن گیا تھا اور آخر میں گانے ہی پر اس نے اپنی جان بھی قربان کر دی۔ ایک دفعہ ایک بڑے مشکل راگ کی مشق کر رہی تھی یہ ایسا راگ تھا جس پر ہندوستان کے بڑے بڑے گویئے قابو نہ پاسکے تھے۔ آخری مرحلوں میں یہ راگ زہرہ بائی کے قابو میں تو آیا مگر اس کی بڑی قیمت دینی پڑی۔ پھیپھڑوں پر زور پڑا اور منہ سے خون آنے لگا ڈاکٹر

آئے علاج شروع ہوا افاقہ بھی ہوا۔ ڈاکٹروں نے سختی کے ساتھ ممانعت کی کہ کم از کم ایک سال تک، گانا بجانا بند رکھو اور مکمل آرام کرو تندرست ہو جاؤ تو پھر گانا بجانا شروع کرنا۔ گانے ہی میں تو زہرہ بائی کی زندگی تھی۔ ذرا اچھی ہو چلی تھی کہ اس نے پھر اسی راگ کی مشق شروع کر دی منہ سے پھر خون آیا اور مشکل سے رکا۔ علاج تو ڈاکٹروں کا جاری ہی تھا وہ پھر آئے اور طرح طرح کی دوائیں اور بڑھائیں پھر یہ کچھ رو بہ صحت ہو چلی تھی کہ اس کی اکلوتی اولاد ایک لڑکی ہیضہ میں بیمار پڑی اور چل بسی۔ زہرہ بائی بیٹی سے بے حد محبت کرتی تھی اور اس کو زہرہ بائی نے اپنے گندے پیشے سے الگ رکھ کر فارسی، عربی اور مذہبیات کی تعلیم اچھے اچھے مولویوں سے دلوائی تھی اور اس فکر میں تھی کہ کوئی اچھا شریف لڑکا مل جائے تو اس سے اس کی شادی کر دے۔ بیٹی کا یہ جاں گسل صدمہ زہرہ بائی اپنی بیماری میں برداشت نہ کر سکی۔ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کے ساتھ وہ راگ بھی دفن ہو گیا جس کو حاصل کرنے میں اس نے اپنے پھیپھڑوں کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔

مچھوہٹہ میں اس کا عالیشان مکان اور کوٹھا لب سڑک تھا اس کے مکان سے لگے ہوئے ایک مختصر حصہ میں سڑک کے کنارے آج بھی اس کی اور اس کی بیٹی کی قبر نظر آتی ہے۔

زہرہ بائی چھریرے بدن کی لانبی اور قبول صورت طوائف تھی رنگ سانولا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ چہرے کے حسن کا بدل اس کی آنکھوں میں تھا جو خود بھی مخمور معلوم ہوتی تھیں اور دیکھنے والوں کو بھی مخمور کر دیتی تھیں۔

زہرہ بائی کو حضرت شاہ اکبر صاحب داناپوری سے بڑی عقیدت تھی تائب ہونے کے بعد انہیں سے مرید بھی ہوئی اور انہیں سے اپنے اشعار پر اصلاح بھی لیتی رہی۔ اس کو شعر کہنے کا اچھا خاصہ مذاق تھا اس کی بہت سی غزلیں تھیں جن سے اکثر غزلیں وہ محفل میں خود گاتی تھی جس سے محفل میں حسن کلام اور بڑھ جاتا تھا۔ اس

کے مرنے کے بعد کس کو فکر تھی کہ اس کی غزلوں کو یکجا کر کے محفوظ کر لے غرض کہ اس کی غزلیں منتشر ہو کر لاپتہ ہو گئیں۔ لوگوں کو صرف چند اشعار یاد رہ گئے انہیں میں سے دو ر چار شعر یہ ہیں۔

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے
جھک کے کچھ بات کہی شیشے نے پیمانے سے
ہم نے دیکھی ہیں کسی شوخ کی مے گوں آنکھیں
ملتی جلتی ہیں چھلکتے ہوئے پیمانے سے

حوصلہ آپکو جفا کا ہے ☆ یہ نتیجہ مری وفا کا ہے
ہند میں رہ کے کیا کریں زہرہ ☆ عزم بالجزم کربلا کا ہے

بڑی کنیز

میرے بچپن میں روزانہ شام کے وقت ایک لہکتی ہوئی تان دور فضا میں بلند ہوتی۔ میں تو خیر کم سن تھا مگر دوسرے لوگ چونک اٹھتے۔ آواز بتدریج قریب آتی جاتی اور ساتھ ہی ساتھ یہ محسوس ہونے لگتا کہ ساری فضا اس کی دلکش تان سے مست ہوتی جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت نیم وار فتگی میں آہستہ آہستہ کشمیری کوٹھی کی طرف سے میرے محلّہ کی جانب چلتی ہوئی نظر آتی دس قدم چلتی پھر رک جاتی۔ رک جاتی تو ایک ایسی پاٹ دار آواز آتی جو سننے والے کو مسحور کر دے، پھر اپنا راگ چھیڑتی۔ دوکاندار اپنا کام چھوڑ دیتے اور راہگیر رک کر اس کا گانا سننے لگے۔ یونہی گاتی ہوئی وہ میرے محلّہ سے گزرتی اور شاہراہ تک پہونچتی۔ وہاں تک پہونچنے کے بعد اس کا گانا ختم ہو جاتا اور وہ آگے بڑھ کر نہ معلوم کہاں چلی جاتی۔ اس کے گانے تو مجھے یاد نہیں مگر غزل تو آسان اور دل پسند چیز بھی ہے۔ وہ کبھی کبھی جو رند کی غزل

گاتی تھی وہ مجھے یاد رہ گئی۔

جا کے گلزار سے صیاد پھر آیا الٹا

کیا نصیبا ہے ترا بلبل شیدا الٹا

حقیقت پوچھئے تو آج اس عمر میں بھی جبکہ بڑھاپے کی منزلیں طے کر رہا ہوں میں نے نہ ایسی دلکش آواز پھر سنی اور نہ ایسی لہراتی ہوئی تان جو دور اور نزدیک والے سب کو یکساں چونکا دے۔ یہ تھی پگلی کنیز جو پہلے ہر محفل اور ہر مجرے میں زہرہ بائی کی ہم پلہ تصور کی جاتی تھی۔ پہلے جس کی اسی طرح ہر جگہ مانگ تھی جیسی زہرہ بائی کی بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ کنیز حسین بھی تھی اور زہرہ بائی حسین نہیں صرف قبول صورت تھی۔ کنیز کو شراب کا چسکا لگا اور ایسا لگا کہ رات دن شراب میں غرق رہنے لگی۔ اس کی شراب خواری نے اس کے پیشے پر بھی برا اثر ڈالا۔ آمدنی کم ہوئی تو دیسی شراب کی نوبت آئی۔ پینے میں اعتدال نہ تھا اس لئے شراب نے دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ آخر میں تو یہ حالت تھی کہ گاتے ہوئے گزرتی تو اس کی حالت کو جاننے والے اس کو کچھ پیسے روپے خود دیدیتے۔ اس حال میں بھی اس کی خودداری ایسی تھی کہ اس نے خود کسی کے آگے ہاتھ کبھی نہیں پھیلایا۔

حیدر جان

غالباً ۱۸۸۰ء یا اس کے فوراً ہی بعد کا واقعہ ہے کہ حیدر جان لکھنو سے پٹنہ ایک محفل میں گانے کے لئے آئی اور آتے ہی اس نے ایک بڑے گھر پر چھاپہ مارا۔ اس کا حسن تو اتنا عشق انگیز نہ تھا جتنا اس کی معشوقانہ لگاوٹوں میں جاذبیت تھی۔ نہ جانے کہاں سے عشوہ و ناز کا انداز سیکھا تھا کہ جس کو ترچھی نظروں سے دیکھا وہ بستہ فتراک ہوا۔ اس زمانہ کی رنگین حکایتوں میں حیدر جان کا قصہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ۳۵-۱۹۳۰ء میں سید وصی حیدر بلگرامی نے ایک مضمون "س ش ص" میں جہاں

حضرت شاد عظیم آبادی کو اپنے دادا حضرت صغیر بلگرامی کا شاگرد زبردستی بنانا چاہا ہے وہاں حیدر جان کے ساتھ ایک معزز نواب زادے کے عشق کی داستان بھی سپرد قلم کی ہے۔ ان دونوں کے حسن و عشق کی بساط تو بہت پہلے اٹھ چکی تھی۔ مگر میں نے جب ہوش سنبھالا تو اس وقت بھی اپنے سے بہت زیادہ سن والوں کو اکثر گفتگو میں حیدر جان کا نام لیتے سنا۔ لوگ کہتے تھے گانے سے زیادہ اس کو رجھانے کا فن خوب معلوم تھا۔ حسین بھی کچھ ایسی نہ تھی مگر ناز و انداز کی ملکہ تھی اور یہ سچ ہے کہ حسین بھی کیسے کہلاتی جب کہ استرے کی پردہ پوشی کے باوجود اس کے ہونٹوں پر ذرا سی مونچھوں کی سبز تحریر بھی نظر آتی تھی۔ مردوں کے منہ پر سبزہ نورسیدہ جہاں حسن کی بہار کو اور بڑھاتا ہے وہاں عورتوں کے حسن کے لئے سبز سنکھیا ثابت ہوتا ہے۔ پھر بھی حیدر جان میں بلا کی کشش تھی اس عیب کے باوجود بھی اس کے جلو میں عشاق کا لشکر چلتا تھا۔ اس وقت کے شعراء کے اشعار میں حیدر جان کا نام اکثر آیا ہے۔ حضرت عبدالغفور شہباز نے تو غضب کیا ایک نظم "پٹنہ کی مونچھیں" جو لکھی اس میں جہاں کھوج کھوج کر پٹنہ کے مونچھ والوں کا نام لیا ہے اور ان کے مونچھوں کی تعریف کی ہے وہاں حیدر جان کی مونچھ کا بھی منظر دکھایا ہے۔

حیدر جان کی مونچھوں کے بیان میں شہباز کی اس لانبی نظم کے تین بند سن لیجئے۔ اوپر کے دو بند نظم کا ربط قائم کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں، مطلب کا بند تیسرا ہے۔

سرشام کوٹھی سے اپنی نکل کر   اٹھاتی ہوئی دُم بہ دم لطف منظر
لگاتی ہوئی لان کے گرد چکر   بٹر ہاف کے ساتھ عمدہ فٹن پر
ہوا کھا رہی ہیں کمشنر کی مونچھیں

کسی روم میں ایک ریکارڈ کیپر   ہے بیٹھا ہوا اپنی کرسی کے اوپر
نہیں ڈر سے رکھتا چُرٹ منہ کے اندر   کہ پھیلا ہے کرسی پہ مونچھوں کا دفتر

محافظ ہیں خود اپنی دفتر کی مونچھیں

وہ جلسہ ہو پٹنہ میں یا لکھنؤ میں وہ ہو عشق زردار یا عشق ٹیں ٹیں

کہیں ہاتھ ناچیں کہیں پاؤں تھرکیں لب لعل سے ہونٹ طوطی کے مل دیں

الاپیں جو شہباز حیدر کی مونچھیں

اللہ جلائی

خدا جانے پٹنہ کے رنگین مزاجوں میں کون سی کشش تھی اور یہاں کی کیسی حسن پرستی تھی جو حسن و ادا والوں کو دوسری جگہ سے یہاں کھینچ لاتی تھی۔ ابھی ۱۹۰۲ء کا آغاز ہوا تھا کہ ایک قتالہ عالم حسینہ الہ آباد سے پٹنہ پہونچی اور یہاں کی رنگین فضا پر صبح کا ستارہ بن کر دفعتہً چمک اٹھی۔ اللہ جلائی کا حسن حقیقت میں جنون انگیز تھا۔ کتنے ہوش والے حواس کھو بیٹھے۔ اس کا گانا بھی غضب تھا۔ وہ حسن و موسیقی دونوں کی ملکہ تھی۔ آتے ہی پٹنہ پر چھا گئی۔ اپنی قدر و قیمت سے بھی خوب واقف تھی اس لئے اس نے معمولی مانگ کبھی نہیں مانگی۔ خود بڑے بڑے نذرانے اس کے قدموں میں کھنچے آتے تھے دولت اس کے قدموں پر لوٹ رہی تھی اور رقابت کا جذبہ بڑھ بڑھ کر بولیاں اور بڑھا رہے تھے۔ یہ صرف دیکھتی اور مسکراتی اور اس کی اسی ادا پر خریدار اپنی بولیاں بڑھاتے چلے جاتے۔ چوک پر اس کے خوبصورت مکان کا بالا خانہ رانیوں اور شہزادیوں کی عشرت گاہوں سے کم سجا ہوا نہ تھا۔ پانچ پانچ سو کنول کے بلجیم کٹ کے متعدد رنگ برنگ کے جھاڑ، چاندی اور ہاتھی دانتوں کی بنی ہوئی دیوار گیریں، سنہرے اور روپہلے پھول پتیوں سے مزین چھت، چاندی کے فریم میں بڑے بڑے جلی آئینے، چاندی کے گملے اور گلدان، چھوٹی اور بڑی اصلی سنگ مرمر کی میزین جن کے کٹھرے اور استادوں پر کاشمیری صناعی کے بہترین سبک اور دیدہ زیب کام بنے ہوئے، رومی اور ایرانی قالینیں، کاشانی مخمل کے زرنگار پردے یہ سامان اس کے حسن کرشمہ ساز نے

گزری کے ایک الوالعزم نواب سے خراج حسن میں حاصل کئے تھے۔ اپنے کمرے میں خوبصورت پُر زرگاؤ تکیوں سے لگی بیٹھی ہوئی اللہ جلائی قلو پطرہ کی تصویر نظر آتی تھی۔ دینے والوں کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی مگر یہ بات تھی ؎ "جو بڑھ کے خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے" اونچی بولی دینے والے گزری کے نواب کے نام پر اللہ جلائی کا خلوت کدہ نیلام ہو چکا تھا۔ اب کتنے دولت مند اپنی کم حوصلگی پر متاسف بھی تھے اور رشک و حسد کی آگ میں جل بھی رہے تھے۔

پٹنہ کی کوئی محفل رقص و سرود ایسی نہ تھی جہاں اس کی مانگ نہ ہو۔ لوگ کہتے تھے کہ اللہ جلائی کے بغیر محفلیں اور مجرے سنسان معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ جلائی کا سن بھی زیادہ نہ تھا۔ سترہ اٹھارہ کے سن میں پٹنہ آئی اور بیس لگتے لگتے اقلیم حسن کی ملکہ بن بیٹھی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ خوبصورت پھول جلد ہی توڑ لئے جاتے ہیں۔ ابھی شباب کی منزلیں بہت کچھ باقی تھیں کہ چوبیس برس کے سن میں فرشتہ اجل کا شکار بن گئی۔ یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا مگر مجھے یاد ہے کہ کس طرح پٹنہ کے لوگ اس کی موت سے متاثر ہوئے تھے۔ اُس وقت تو مجھے تعجب ہوتا تھا کہ ایک طوائف کی موت کا اس قدر چرچا کیسا؟ مگر بعد میں یہ بات سمجھ میں آئی کہ اُس وقت کے لوگوں میں اس طرح کی بات کا چرچا ہونا ان کے مذاق طبیعت کے موافق تھا کیونکہ حسن پرستی کا شوق اُس وقت تک عام طور پر بری نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

حضرت مخدوم شہاب الدین پیر جگجوت رحمتہ علیہ اللہ کا خام مزار کچی درگاہ کے نام سے مشہور اور مرجع خلائق ہے۔ پٹنہ سیٹی سے پانچ میل پورب دریائے گنگا کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر حضرت کا خام مزار مبارک ہے۔ ہر روز ہندو اور مسلمان زائرین کا وہاں مجمع رہتا ہے اور یہ مجمع جمعرات کے دن اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ حضرت کے سالانہ عرس کے موقع پر تو ہزاروں آدمیوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ شہر سے ہر طرح کی بہت سی دوکانیں آجاتی ہیں اور ایک ہفتہ تک بھیڑ رہتی ہے۔ حضرت پیر جگجوت کے

مزار سے تھوڑی دور اتر کی جانب دریا سے ہی لگا ہوا ایک پختہ احاطے کے اندر ایک دوسرے بزرگ حضرت آدم صوفی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے اس گھرے ہوئے احاطہ میں اور بھی بہت سی پختہ قبریں ہیں۔ حضرت آدم صوفی علیہ رحمتہ اللہ کے مزار کو اور اس کے پختہ احاطہ کو پکی درگاہ کہتے ہیں۔ حضرت شہاب الدین پیر جگجوت علیہ رحمتہ اللہ کے سالانہ عرس کے زمانے میں آدمیوں کا ہجوم پکی درگاہ کے حدود سے بھی آگے پھیل کر بڑھ جاتا ہے۔ عرس کے زمانے کے علاوہ بھی جب زائرین کچی درگاہ میں حاضری اور فاتحہ خوانی کو آتے ہیں تو پکی درگاہ میں بھی جا کر حاضری دیتے ہیں اور حضرت آدم صوفی علیہ الرحمتہ کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ پکی درگاہ کے گھرے ہوئے احاطہ میں داخل ہونے کا جو بڑا دروازہ ہے اس سے باہر سامنے کی طرف بہت سی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان قبروں سے ذرا سا الگ عین داخلہ کے نزدیک ایک قبر نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ اچھے پتھروں سے بنی ہوئی اونچی کرسی پر نقش و نگار سے مزین پتھر ہی کی بنی ہوئی قبر ہے جس کے چاروں طرف پتھر ہی کے جالیدار کٹہرے لگے ہوئے ہیں۔ سرہانے سنگ مرمر کا شمعدان اور سنگ مرمر ہی کا لوح مزار بھی ہے جس پر کھدا ہوا خوبصورت حرفوں میں ایک کتبہ بھی نصب ہے۔ یہ قبر اللہ جلائی کی آخری آرام گاہ ہے۔ ایک دفعہ حضرت مخدوم پیر جگجوت علیہ الرحمتہ کے عرس کے دن کچی درگاہ گیا اور وہاں فاتحہ پڑھ کر حضرت مخدوم آدم صوفی علیہ الرحمتہ کے مزار پر حاضر ہوا۔ جب میں احاط درگاہ سے فاتحہ پڑھ کر داخلہ کے دروازہ سے باہر نکلا تو دیکھا کہ اللہ جلائی کی قبر پر کچھ آدمی فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ پہلے تو مجھے ہنسی آئی کہ یہ فاتحہ پڑھنے والے نہ معلوم کیا سمجھ کر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ غالباً ان کو یہ نہیں معلوم کہ یہ ایک طوائف اللہ جلائی کی قبر ہے۔ یہ بات میرے دماغ میں آئی ہی تھی کہ دماغ کو جھٹکا لگا پھر یہ خیال دماغ میں خود بخود ابھرا کہ دنیا میں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے آدمی موجود ہیں جو حق العباد کو پامال کر رہے ہیں، دھوکہ بازی اور فریب ان کی کاروباری زندگی کے جزو لاینفک

بن گئے ہیں۔ غریبوں اور بیکسوں پر ظلم کرنا ان کی زندگی کا ایک معمولی حصہ ہے اور غور سے دیکھا جائے تو ان کے وجود میں بھی وہی گندگیاں موجود ہیں جن کے لئے طوائفیں مطعون خلائق ہیں جن میں کی ایک فرد اللہ جلائی بھی تھی فرق بس اتنا ہے کہ ایسے سیہ کاروں کے برے اعمال پر پردہ پڑا رہتا ہے اور طوائفوں کی سب برائیاں کھلی ہوئی ہوتی ہیں۔ دنیا کو دھوکہ دینے میں اپنے اعمال پر پردہ ڈال کر یہ حضرات طوائفوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں پھر جب یہ حضرات دنیا سے گزر جاتے ہیں تو ان کے جنازے میں ہر طبقہ کے ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے ملا اور شاہ صاحبان ان کی نماز جنازہ پڑھاتے ہیں۔ ان کا قل ہوتا ہے تو شرکت کے لئے ہزاروں ٹوٹ پڑتے ہیں اور قرآن مجید کے ایک دو ختم نہیں بیسوں ختم دو تین گھنٹوں میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ ادھر اللہ جلائی تھی جو گندگی میں پیدا ہوئی اسی گندے ماحول میں اس نے پرورش پائی اور اسی حالت میں مرگئی۔ گنہگار وہ بھی تھی مگر کافر مشرک نہ تھی۔ جب اُس جیسے دوسرے گنہ گاروں پر لوگ فاتحہ پڑھتے ہیں، ان کے لئے دعاء مغفرت مانگتے ہیں جس پر ہزاروں آدمی آمین کہتے ہیں تو بیچاری اللہ جلائی اس سے کیوں محروم رہے۔ یہ خیالات دماغ میں آئے تو میں نے بھی اللہ جلائی پر فاتحہ پڑھنے کے لئے ہاتھ اٹھا دئے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی مغفرت کے لئے بھی دعاء مانگی۔ سبھوں کا بخشنے والا وہی غفورالرحیم ہے۔

اللہ جلائی کے شیدائیوں میں سے ایک نے اس کے مرنے کا ایک تاریخی قطعہ لکھا جو آج بھی اس کے لوح مزار پر ابھرا ہوا اس کی داستان حیات سنا رہا ہے۔

طوالت کے خیال سے یہاں وہ قطعہ نہیں لکھ رہا ہوں مگر اس قطعہ میں آخری شعر جس سے اللہ جلائی کے مرنے کی تاریخ نکلتی ہے صرف لکھ رہا ہوں۔

تہہ دل سے دعا دیکر کہی تاریخ یہ میں نے
جگہ دلوادے یارب اسکو اک گوشہ میں جنت کے

۱۳۲۷ھجری

بی چھٹن کی شریف نوازی کی ایک داستان

پٹنہ میں جہاں طوائفوں کی فتنہ سامانیوں اور محشر آفرینوں کی بہت سی داستانیں حافظے میں محفوظ ہیں وہاں ایک عجیب واقعہ بھی کبھی حافظے میں ابھر آتا ہے۔ آپ اس واقعہ کی روداد سمجھ کر پڑھیں کہ کبھی حقیقت افسانوں سے بھی زیادہ تعجب خیر ہوتی ہے۔ بی رمزو اور بی چھٹن کے نام سے آج بھی کچھ لوگ واقف ہوں گے کہ ان دونوں نے اپنے زمانے میں کسی طرح یہاں کے بازار حسن میں قیامت برپا کر رکھی تھی اور اگر واقف نہ بھی ہوں تو یہ شعر ضرور سنا ہوگا

ادھر رمزو کے بیٹھے ہیں ادھر چھٹن کے بیٹھے ہیں
سر بزم سخن عشاق دو دو من کے بیٹھے ہیں

جو واقعہ لکھ رہا ہوں وہ ۱۸۷۵ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ میں نے بچپن میں اکثر لوگوں سے انکا قصہ سنا دو ایک ان میں ایسے بھی نکلے جو اس روایت میں چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بی چھٹن کا عنفوان شباب پروان چڑھ کر مکمل جوانی کی رضائیوں میں جلوہ گر تھا۔ سن و سال کی پختگی کے ساتھ حسن و انداز میں بھی پختگی آگئی تھی، ان کی موسیقی کا کمال اور ان کے حسن کی سحر آفرینیاں جادو جگاتی تھیں۔ دور و نزدیک ہر جگہ ان کے سینکڑوں پرستار تھے۔ مہاراجہ بھی، نواب بھی، رئیس بھی اور اوسط درجے کے اصحاب بھی۔ بچارے غریبوں کا پوچھنا کیا ان کے لئے دور کا جلوہ ہی بہت تھا۔ بی چھٹن کی بارگاہ میں انہیں کی گذر تھی جن میں ناز اٹھانے کی سکت اور گرانقدر مطالبوں کو پورا کرنے کی استطاعت تھی۔ پٹنہ کا ہفت خانہ (ست گھروا) بی چھٹن کی خلوتوں اور جلوتوں کے لئے دور دور مشہور تھا۔ ہفت خانہ میں ایک سے ایک لگے ہوئے سات مکان تقریباً ایک ہی ڈھنگ کے بنے ہوئے تھے۔ پست عمارتیں اندر کا حصہ سڑک کی سطح سے بھی نیچا گھر کے پیچھے کی طرف کافی کشادہ صحن بھی دالان بھی اور متعدد کمرے بھی۔ بالائی منزل

سڑک کی جانب بھی جو اس کی سطح سے زیادہ سے زیادہ چھ فٹ اونچی ہو گی۔ اس پر دو کمرے تھے سڑک کے عین مقابل جھروکہ تھا جہاں سے بی چھٹن کی سر شام بازار کی سیر ہوتی اور مشتاقان جمال کو دعوت نظارہ دی جاتی تھی ۔ اس سے لگا ہوا جو مکان تھا اس میں بی رمزو رہتی تھیں۔ بقیہ اور مکانوں میں دوسری نامی طوائفیں رہتی تھیں بی چھٹن کے جھروکے کے سامنے ایک تنبولی کی دوکان بھی تھی جہاں پان کھانے کے بہانے آنکھ سینکنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ شام کے وقت بی چھٹن بن سنور کر جھروکے پر آکر بیٹھتیں اور اپنی جلوہ سامانی کی بہار دکھاتیں۔ ایک صاجزادے جن کی عمر چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہ ہو گی وہ چند دنوں سے دیدار کے تمنائیوں میں نظر آتے تھے ۔ پختہ مزاج عشاق کے مجمع میں ایک خام عمر کے لڑکے کا رہنا عجیب تھا۔ دوسرے لوگ باتیں بھی کرتے، ان کا آپس میں ہنسی ٹھٹھول بھی ہویا، آواز بھی کستے مگر ان صاجبزادے کا یہ عالم رہتا کہ بس بی چھٹن کی طرف ٹکٹکی لگی ہے، نہ گرد و پیش کی خبر ہے نہ اپنی سدھ کی۔ بی چھٹن یہ تماشہ کچھ دنوں تک غور سے دیکھتی رہیں۔ ایک دن اپنے ملازم کو بلا کر اس لڑکے کی صورت دکھائی اور اس سے کہا کہ چپکے سے اس لڑکے کو بلا لائے۔ ملازم تنبولی کی دوکان پر پہنچا تو لڑکا جھڑوکے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیدار جاناں میں کھویا ہوا نظر آیا۔ ملازم کے ذہن میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ بلا تعارف اور بلاواسطہ بی چھٹن کی بارگاہ حسن میں اس طرح طلبی ہو گی۔ ملازم نے اس لڑکے کے کان میں آہستہ سے طلبی کا پیام سنایا تھا۔ اس لئے دوسرے جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ سن نہ سکے تھے۔ لڑکا کچھ دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے ملازم کی طرف دیکھتا رہا۔ ملازم نے جب چلنے کا اشارہ کیا تو دوکان سے نیچے اتر تو آیا مگر سراسیمگی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ملازم معاملہ سمجھ گیا کہ میاں صاجزادے گھبرا گئے ہیں۔ بڑھ کر ان کو تسلی دی کہ میاں چلئے شرم کی کوئی بات نہیں ہے۔ بی صاحبہ آپ کو خود بلا رہی ہیں آپ سے بڑے اخلاق کے ساتھ ملیں گی اور باتیں کریں گی۔ غرض دلاسا تسلی دیتا ہوا ملازم لڑکے کو

لیکر بی چھٹن کے بالا خانے پر پہونچا اور ایک کشادہ سجے ہوئے کمرے میں لاکر بیٹھا دیا۔ لڑکے اور ملازم کے آنے کی آہٹ ہوئی تو بی چھٹن بھی جھروکے سے کمرے میں آگئیں۔ کمرے میں سفید چاندنی کا فرش تھا، صدر میں عمدہ قالین بچھا ہوا تھا، چھت میں نفیس اور قیمتی جھاڑ فانوس آویزاں تھے، متعدد آئینے اور مرقعے دیواروں سے ٹنگے تھے، فرش پر کئی گاؤ تکئے صاف شفاف قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ قالین کے ارد گرد تین چار چاندی کے اگالدان اور سرے پر ایک بڑا سا چاندی کا پاندان رکھا ہوا تھا۔ خود صدر میں آکر بیٹھیں، لڑکے کو بھی صدر میں پاس ہی بیٹھایا۔ بڑی شفقت سے نام پوچھا، سمجھ گئیں کہ صاحبزادی کو اس کا ڈر ہے کہ کہیں نام اور پتہ ظاہر ہونے پر گھر پر اس عشق بازی کی خبر نہ ہو جائے یہ سمجھ کر بی چھٹن نے اپنی گفتگو کا انداز بدلا۔ بولیں کہ میاں تم آگئے بڑی مہربانی میں روز تم کو دور سے دیکھتی تھی اور طبیعت تمہاری طرف کھنچی جاتی تھی، آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور تم کو اپنے پاس بلانا ہی پڑا۔ اب آئے ہو تو ہنسو بولو کچھ میری سنو، کچھ اپنی کہو زندگی تو اسی طرح خوشگوار بنتی ہے۔ باتیں اس ڈھنگ سے کیں کے لڑکے کا ڈر مٹا، دو چار باتوں میں رام ہوگئے۔ نام بھی بتایا کہ علی احمد ہے مکان کا پتہ دیا کہ محلہ کیواں شکوہ میں رہتے ہیں، پانچ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ایک بہن دو بھائی ان سے بڑے تھے۔ ان کے والد کے سامنے ان کا انتقال ہوا اب اکیلے یہ بچ رہے ہیں۔ والد کے مرتے ہی چچا سے جائداد کا جھگڑا اٹھا، اکثر جائداد پر چچا قابض ہوگئے۔ تھوڑی سی زمینداری بچ رہی ہے اور شہر میں دو چار چھوٹے چھوٹے مکانات اور دوکانیں ہیں جن کا کرایہ آتا ہے ان کا بھی کوئی دیکھنے والا نہیں، کرایہ داروں کا جب جی چاہا آکر کچھ کرایہ کی رقمیں دے جاتے ہیں، گذر بسر کی یہی صورت ہے۔ پڑھنے کا حال پوچھا تو بولے کہ تھوڑی سی اردو فارسی گھر پر پڑھی ہے اسکول میں دو سال ہوئے داخلہ کرا دیا گیا ہے۔ رشتے کے ایک ماموں مغل پورہ میں رہتے ہیں وہ دو چار دن پر آکر خیریت پوچھ جاتے ہیں۔ اسکول میں بھی یہی ان کے ولی ہیں ان کو فرصت نہیں کہ ان

کی پورے طور پر دیکھ بھال کریں۔ وہ خود ایک نواب صاحب کے یہاں مقدمات کی پیروی کے لئے ملازم ہیں۔ یہ سب پوچھ کر بی چھٹن کہنے لگیں کہ میاں مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم روزانہ تنبولی کی دوکان پر آکر بیٹھو۔ جب آتے ہی ہو تو مغرب کے کچھ قبل سیدھے میرے یہاں چلے آؤ۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھو اور مجھ کو اپنے سے الگ نہ جانو۔ علی احمد کی معراج ہوگئی، ساری تمنائیں پوری ہوتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ جہاں بڑے بڑے کا گذر نہ تھا وہاں ان کے لئے دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اب بی چھٹن کے خریداروں کے آنیکا وقت ہو چلا تھا۔ علی احمد کی دل دہی اور تشفی کر کے اور دوسرے دن آنیکا ان سے وعدہ لیکر بی چھٹن نے ان کو رخصت کیا۔ علی احمد کے آنیکا پروگرام بھی یہی تھا کہ قبل مغرب آجاتے گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھتے، بی چھٹن سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے اس کے بعد بی چھٹن ان کو گھر واپس کر دیتیں۔ ایک دو ہفتے یوں گذر گئے۔ ایک دن بی چھٹن نے علی احمد سے پوچھا کہ میاں سچ بتاؤ کیا بات ہے کہ تم جب آتے ہو ٹکٹکی لگائے ہوئے مجھے دیکھا کرتے ہو۔ آئے تو پھول کی طرح شگفتہ ہوگئے اور جب یہاں سے گھر واپس چلے تو مرجھا گئے۔ علی احمد نے نظریں نیچی کرلیں کچھ کہنے کی ہمت تو نہ ہوئی صرف یہ جواب دیا کہ ہر وقت آپ کے پاس بیٹھے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ گھر پر طبیعت نہیں لگتی ہے اور پڑھنے میں بھی دم الجھتا ہے۔ بی چھٹن نے پوچھا کہ اسکول تو جاتے ہوگے۔ بولے ایک مہینہ سے اوپر ہوتا ہے وہ بھی ناغہ ہے۔ بی چھٹن کو کرید بڑھی تو عقدہ کھلا کہ اسکول کی غیر حاضری تو ایک طرف ان کا نام بھی اسکول سے کٹ گیا ہے۔ شرماتے کیوں ہو محبت میں تو سراسر گھاٹا ہی ہوتا ہے۔ مگر تم جس طرح کر رہے ہو اس سے عشق و محبت کا مطلب نہیں حاصل ہو سکتا۔ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو میرا کہا مانو۔ میری محبت حاصل کرنے کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ جی لگا کر پڑھنا شروع کردو۔ روزانہ اسکول جاؤ انگریزی اور حساب کے لئے ایک اچھا ماسٹر تلاش کرو جو اخراجات ہوں گے میں دوں گی۔ رات میں پڑھو، علی الصباح اٹھ کر پڑھو، شام میں

میرے پاس دو ڈیڑھ گھنٹے کے لئے چلے آؤ۔ روپے لینے پر علی احمد راضی نہ تھے۔ بی چھٹن نے دوبارہ یہ کہہ کر زور دیا کہ اگر مجھ کو اپنا سمجھتے ہو تو پھر مجھ سے یہ غیریت کیسی۔ اگر تم روپئے لینے سے انکار پر مصر رہے تو میں بھی تم کو غیر سمجھوں گی اور پھر میرا واسطہ تم سے قائم نہیں رہے گا۔ یہ کہہ کر بی چھٹن اٹھیں دوسرے کمرے میں جا کر صندوقچے سے کافی روپے نکال لائیں اور علی احمد کے حوالہ کرتے ہوئے بولیں کہ اب اسکول میں دوبارہ نام لکھوالو اسکول کا اگلا حساب بے باق کردو، اچھا سا ماسٹر بھی رکھ لو اور اسکول کی سب کتابیں بھی خرید لو۔ چونکہ اب بی چھٹن کو علی احمد کے حالات کے ساتھ پوری دلچسپی ہوگئی تھی اس لئے انھوں نے بالا بالا پتہ لگا لیا تھا کہ علی احمد کے گھر پر روپیوں کی تنگی رہتی ہے مکان اور دوکان کے کرائے اگر وصول بھی ہوتے ہیں تو وہ اخراجات کے لئے ناکافی ہوتے ہیں۔ تھوڑی سی زمینداری ہے اس کی آمدنی بھی تھوڑی بہت مشکل سے ان کو وصول ہوتی ہے۔ لالہ جس کے ہاتھ میں انتظام ہے اِدھر اُدھر کا حساب دیکر کافی رقم خود کھا جاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا انتظام کرنے والا بھی نہیں۔ شریف ماں خود مصیبت سہتی ہے مگر بچے کو تکلیف نہیں ہونے دیتی اور پھر اس خود فریبی میں بھی مبتلا ہے کہ صاحبزادے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ اور گھر سے باہر رہتے ہیں تو اچھے ہی لوگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں۔ دوسرے دن علی احمد آئے تو بی چھٹن نے کیفیت پوچھی علی احمد نے اسکول میں داخلے کی رسید دکھائی خریدی ہوئی کتابوں کی قیمت کی رسیدیں بھی سامنے رکھ دیں اور ایک صاحب کے متعلق کہا کہ وہ اسکول میں ماسٹر ہیں اور اگلے دن سے دو گھنٹے روزانہ گھر پر آکر صبح میں پڑھایا کریں گے۔ علی احمد کچھ گھبرائے ہوئے بھی تھے کہنے لگے اگر اماں دریافت کریں گی کہ ماسٹر کا مشاہرہ کہاں سے آئے گا اور اتنی ساری کتابیں کہاں سے آئیں تو کیا جواب دوں گا۔ بی چھٹن نے بڑی آسان ترکیب بتائی۔ کہا کہ اپنی والدہ سے کہہ دینا کہ والد مرحوم کے ایک مخلص دوست ہیں انھوں نے زبردستی ماسٹر کا بھی بندوبست کر دیا ہے اور کتابیں

بھی خرید کر دی ہیں۔ علی احمد نے اپنی والدہ سے یہی کہا مگر وہ اس پر راضی نہ ہوتی تھیں کہ دوسرے کا احسان کیوں لیں مگر جب علی احمد کی تعلیم کی سہولت کا خیال آیا تو چپ ہو رہیں اور اس طرح بی چھٹن کا چلتا ہوا نسخہ کام آیا۔ علی احمد بھی بی چھٹن کی محبت حاصل کرنے کے لئے کتابوں پر پل پڑے۔ جی لگا کر پڑھنا شروع کیا امتحان کا زمانہ آیا تو بڑے اچھے نمبروں سے امتحان میں پاس ہوئے۔ بی چھٹن کے یہاں ان کی روزانہ کی نشست جاری تھی۔ وہ بھی محبت کی نظروں سے دیکھ کر ہمت بڑھاتیں، مگر وعدے کی یاد دہانی سختی سے کرتیں۔ دن گذرتے گئے اور علی احمد نے انٹرنس کا امتحان اونچے درجے میں پاس کیا۔ بہت خوشی خوش بی چھٹن کے یہاں آئے خوش خبری سنائی تو واقعی یہ بھی بہت خوش ہوئیں۔ آگے پڑھنے کی تاکید کی اور کہنے لگیں کہ ہاں اب تم مجھ سے محبت کرنے کے قابل بنتے جا رہے ہو۔ میں تم کو تعلیم یافتہ اور باوقار آدمی دیکھنا چاہتی ہوں۔ بی چھٹن پڑھنے کے اخراجات کی کفیل ہونے پر تیار ہی نہیں بلکہ مصر تھیں۔ کلکتہ جاکر وہاں کے کسی اچھے کالج میں پڑھنے کی اسکیم انھوں نے پیش کی تو یہ جھکے۔ بی چھٹن نے محبت کے انداز میں ڈانٹا۔ علی احمد کا عذر یہ تھا کہ والدہ گھر پر اکیلے رہ جائیں گی۔ بولیں کہ ماما گھر میں موجود ہے، ایک بوڑھا ملازم باہر نوکر رکھ لو باہر کا کام بھی دیکھے گا اور گھر کی حفاظت بھی کرے گا۔ گھر پر تمہارے ذاتی اخراجات کے جو روپے بچیں گے ان سے ایک ملازم رکھا جا سکتا ہے۔ اور اپنی والدہ سے کہو کہ تمہارے والد کے دوست جو تمہاری پڑھائی کے کفیل ہیں ان کا اصرار ہے کہ کلکتہ جاکر پڑھو وہ تمہارے ذاتی اور پڑھنے کے کل اخراجات کی کفالت کرنے پر مصر ہیں۔ علی احمد نے آخر اسی طرح کہہ کر اپنی والدہ کو راضی کیا اور کلکتہ روانہ ہوگئے۔ ان کو بھی اب دھن بندھ گئی تھی کہ تکمیل محبت کی جب یہی صورت ہے تو مکمل تعلیم حاصل کرلیں، اس کے علاوہ انٹرنس کا امتحان پاس کرلینے کے بعد تعلیم میں مزہ بھی ملنے لگا تھا۔ دن گذرتے دیر نہیں لگتی۔ چار برس میں علی احمد اف اے اور بی اے کے امتحانات اعزاز

کے ساتھ پاس کر لینے کے بعد پھر پٹنہ واپس آگئے ۔ درمیان میں جب چھٹیوں میں آتے تو زیادہ وقت بی چھٹن کے یہاں گذارنے کی کوشش کرتے مگر وہ تاکید کرتیں کہ گھر پر زیادہ رہو۔ اپنی والدہ کی دیکھ بھال کرو اور ان کی خدمت کرنا سعادت سمجھو۔ بی اے پاس کرنے کے بعد علی احمد کے لئے دو راستے تھے یا تو سرکاری ملازمت کے لئے دوڑ دھوپ کریں یا وکالت کی تعلیم حاصل کریں۔ سرکاری ملازمت ملنے میں وسیلوں کی ضرورت تھی اگرچہ بی چھٹن کے چاہنے والے بڑے بڑے لوگ تھے اور وہ ان کی وساطت سے بہت کچھ کام نکال سکتی تھیں مگر اس معاملے میں وہ کسی کا احسان اپنے اوپر یا علی احمدؒ کے اوپر لینا نہیں چاہتی تھیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ علی احمد کو اپنے ساتھ منظر عام پر لانا ہی پسند نہ کرتی تھیں۔ دوسری راہ وہی تھی کہ علی احمد وکالت کی تعلیم حاصل کریں۔ بی چھٹن کی مصلحت بیں آنکھیں علی احمد کے لئے کلکتہ کو پٹنہ پر برابر ترجیح دیتی رہیں۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ متوالا علی احمد ان سے دور ہی رہے۔ نہ معلوم کب حسن و عشق میں تصادم ہو جائے اور عشق کے شعلے بھڑک کر حسن کے ضبط کو بھی جلا کر خاکستر کردیں۔ کلکتہ اسی لحاظ سے موزوں تھا مگر علی احمد اب کسی طرح کلکتہ جانے پر راضی نہ تھے۔ بی چھٹن نے پھر گھڑکا تو دلے بر ندش راضی ہوئے اور کلکتہ کے ایک کالج میں داخلہ لیکر اب قانون پڑھنے لگے، ایک دفعہ چھٹیوں میں گھر آئے تو ماں کو بیمار پایا دوا دارو میں لگے رہے۔ جب بی چھٹن کے یہاں جاتے تو وہ یہ کہہ کر واپس کر دیتیں کہ جاؤ والدہ کی تیماری کرو، کبھی کبھی مجھ سے ملاقات کرلیا کرو۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی والدہ اچھی ہو گئیں۔ چھٹیاں اب ختم ہو گئی تھیں۔ اس لئے کلکتہ واپس گئے انکی والدہ کو ان کی شادی کی اب بڑی فکر تھی۔ نسبتیں تلاش کر کے ان کی پسند کے لئے پیش کرتیں مگر یہ ٹال دیتے کہتے تھے کہ جلدی کیا ہے۔ وکالت پاس کر لیں تو پھر دیکھا جائے گا۔ انکی نانہالی برادری میں ان کے عزیز تھے۔ ضلع پٹنہ کے کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ اچھے خوش حال تھے زمینداری بھی تھی اور لانبی چوڑی کاشتکاری

بھی تھی۔ رقم بھی کافی جمع تھی۔ ان کو ایک ہی لڑکی تھی اچھی صورت شکل کی اور پڑھی لکھی بھی۔ علی احمد کی ماں نے اپنے مغلپورہ والے بھائی کے ذریعہ سے وہاں نسبت بھیجی۔ اس کی پوری امید تھی کہ نسبت وہاں منظور ہو جائے گی کیونکہ علی احمد گھر ہی کا لڑکا تھا اور ہر طرح اچھا تھا۔ اور وکالت کی تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا۔ علی احمد کلکتہ میں تھے اور یہاں ان کی طبیعت میں یہ سلسلۂ جنبانی شروع ہوئی تھی۔ ابھی وکالت کا آخری امتحان ختم ہوا ہی تھا اور ہاں اور نہیں کا جواب نسبت کے سلسلہ میں ابھی دوسرے فریق کی جانب سے نہیں آیا تھا کہ ان کی والدہ یکایک پھر بیمار پڑیں۔ طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور علی احمد کو کلکتہ تار گیا تو دوڑے ہوئے آئے اور اپنی والدہ کو زیادہ بیمار دیکھ کر گھبرا گئے۔ ان کی والدہ نے ان کو تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بیماری دور ہو جائے گی۔ ڈاکٹروں کا بھی خیال تھا کہ سردست خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ قوت آئے گی تو بیماری گھٹتی جائے گی۔ اس درمیان میں ایک دن ان کی والدہ نے شادی کا پھر تذکرہ نکالا۔ علی احمد بہت چکرائے۔ ماں کی حالت دیکھ کر انکار کی ہمت نہیں پڑتی تھی مگر دل تو دوسری جگہ لگا ہوا تھا ہاں کرتے تو کس طرح کرتے۔ بڑی تشویش میں پڑے۔ ماں نے ان کی پریشانی دیکھی تو اس نسبت کی خوبیاں گنانے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی منظوری کے لئے اصرار بھی کرنے لگیں۔ اب علی احمد سے ضبط نہ ہو سکا، ماں کا دل نہیں توڑ سکتے تھے رو پڑے۔ اب تو ماں کے گھبرانیکی باری تھی۔ بیٹے کو روتا دیکھ کر تسلی دینے لگیں تو علی احمد نے کہا اماں جان جو بات دس سال سے پوشیدہ ایک راز تھی اب آپ پر ظاہر کئے بغیر چارہ نہیں، اور شرما شرما کر کل قصہ بی چھٹن کے ساتھ اپنی گرویدگی کا، ان کے احسانات کا، ان کی ہمدردی کا اور ان کی شرافت اور محبت سے بھرے ہوئے برتاؤ کا سب کہہ سنایا۔ ان کی والدہ سناٹے میں آگئیں۔ کچھ دیر کے بعد بولیں، بیٹا کیا سچ مچ ایک طوائف سے شادی کروگے؟ علی احمد نے جواب دیا اب سب حال تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا پھر بھی آپ کی رضامندی کے بغیر شادی نہ کروں

گا۔ اس کے علاوہ ابھی تو وکالت کے آخری امتحان کا نتیجہ بھی نہیں معلوم ہے۔ علی احمد کی والدہ نے کہا کہ بیٹا ہے تو وہ طوائف لیکن شریفوں سے بڑھ کر تم ہی پر نہیں مجھ پر بھی اس کا احسان ہے کہ تمہاری زندگی اس نے سنوار دی اور جو میں تمہارے لئے نہ کر سکی وہ سب کچھ اس نے تمہارے لئے کر دکھایا۔ تمہیں تعلیم دلا کر اور تمہیں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کر کے اس نے میرا بھی سر برادری کے لوگوں میں اونچا کر دیا ہے ۔ اگر تم اس سے شادی کر لو تو مجھے کبھی اس سے رنج نہ ہوگا۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے اور مجھے تمہاری خوشی سے کام ہے۔ ماں بیٹے کی باتیں ختم ہوئیں تو علی احمد بی چھٹن کے یہاں دوڑے پہونچے پہلے تو ماں کی خیریت کہی پھر آج کا واقعہ بیان کیا۔ بی چھٹن مسکرا کر چپ ہو رہیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس درمیان میں علی احمد کی والدہ کی بیماری بڑھتی ہی گئی۔ ایک دن بی چھٹن نے علی احمد سے کہا کہ میں تمہاری والدہ کو دیکھنا چاہتی ہوں وہ بیمار ہیں اگر میں ان کی کچھ خدمت نہیں کر سکتی اور اس کے لائق نہیں سمجھی جاسکتی تو انہیں کم از کم ایک نظر دیکھ تو آتی اور ان کی عیادت تو کر لوں۔ تم اپنی والدہ سے اس کی اجازت میری طرف سے مانگو اگر وہ خوشی سے دیں تو میری تمنا پوری ہو جائے گی کہ میں نے ان کو ایک نظر دیکھ لیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو سلام کر لیا۔ علی احمد گھر واپس گئے تو ماں کے آگے بی چھٹن کی گذارش پیش کی۔ ان کی والدہ بھی چاہتی تھیں کہ بی چھٹن کو دیکھیں اس کا احتمال تو ضرور تھا کہ گھر میں بی چھٹن کے آنے کے بعد تمام برادری میں غوغا اٹھے گا کہ ایک طوائف ایک شریف زادی کے گھر گئی۔ اس زمانے میں پٹنہ میں طوائفیں شریف گھروں کے زنانے میں نہیں جاسکتی تھیں اور شریف عورتیں ان سے پردہ کرتی تھیں۔ علی احمد کی والدہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا ہاں بیٹا کل ان کو ضرور لاؤ میں خوشی کے ساتھ ان سے ملوں گی۔ دوسرے دن بی چھٹن علی احمد کے گھر آئیں۔ علی احمد کی والدہ کو مودبانہ سلام کیا سمٹ سمٹا کر الگ بیٹھیں تو علی احمد کی والدہ نے اصرار کر کے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پہلے تو علی احمد کے لئے

جو کچھ بی چھٹن نے کیا تھا ان کا شکریہ ادا کیا پھر بڑی محبت سے باتیں کرنے لگیں۔ بی چھٹن شکریہ کے الفاظ پر بول اٹھیں کہ حضور شکریہ کی اس میں کون سی بات ہے اگر مجھ جیسی طوائف کسی شریف کی خدمت کر سکے تو اس کے لئے شکریہ کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے صرف اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ علی احمد کی والدہ نے ناشتہ کا بھی اہتمام کیا تھا۔ بیمار تھیں پلنگ سے اٹھنا مشکل تھا مگر اصرار کر کے بڑی محبت سے ہر چیز کھلائی۔ بی چھٹن گھنٹوں وہاں رہیں چلنے لگیں تو علی احمد کی والدہ نے بڑی محبت سے ان کو رخصت کیا اور کہا کہ تمہیں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اگر جی چاہے تو آجایا کرو میں تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔ بی چھٹن نے پھر کہا کہ حضور بار بار احسان اور شکریہ کا نام لیکر مجھ کو شرمندہ نہ کریں میں تو خود آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے اپنے قریب آنے کا موقع دیا۔ علی احمد کی والدہ کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ علاج میں کوئی کسر اٹھا رکھی نہ گئی تھی مگر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ علی احمد کے ساتھ بی چھٹن بھی پریشان تھیں بار بار تاکید کرتی تھیں کہ بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج کراؤ پیسے کا منہ نہ دیکھو اور اس کی فکر نہ کرو۔ بی چھٹن خود بھی روزانہ علی احمد کے گھر اب جانے لگی تھیں وہاں بیٹھ کر تیمارداری بھی کرتیں اور علی احمد کو تسلی اور تشفی بھی دیتیں مگر علی احمد کی والدہ کی حالت روز بروز غیر ہوتی جارہی تھی۔ ایک روز بی چھٹن پہنچی تو دیکھا کہ برداطرف کے علامات شروع ہو چکے ہیں مگر سولہ آنا ہوش باقی ہے۔ کمزوری سے ہلنا تو پہلے ہی مشکل ہو گیا تھا اب تو آخری وقت آپہونچا تھا۔ پھر بھی بی چھٹن کو دیکھا تو مسکرائیں۔ اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ علی احمد وہیں پر موجود تھے ان کی والدہ نے بڑی نحیف آواز میں بی چھٹن سے کہا کہ بیٹی میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی پھر اور قریب بلایا علی احمد کو بھی اشارے سے کہا تم بھی قریب آجاؤ۔ جب یہ دونوں ان کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گئے تو انھوں نے دونوں کے ہاتھ اپنے کمزور ہاتھوں میں لئے دیر تک مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا کچھ دعائیں زیر لب

پڑھیں اور دونوں کے ہاتھ ملا دئے بی چھٹن اور علی احمد بت بنے ہوئے یہ کاروائی دیکھتے رہے اگر چہ اس ڈرامہ کے ایکٹر یہ دونوں ہی تھے مگر اب تو ایسا لگا کہ اس وقت یہ دونوں جذبات سے عاری دو کھلونے ہیں جن سے ایک نحیف و بیمار بچہ اپنا الجھتا ہوا دم بہلا رہا ہے۔ دونوں کی آنکھیں مریضہ کے لحظہ لحظہ رنگ بدلتے ہوئے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ علی احمد کی والدہ نقاہت سے کبھی آنکھیں بند کر لیتیں کبھی آنکھیں کھول دیتیں پھر پیار بھری نظروں سے دونوں کو دیکھتیں۔ مگر ہونٹ تھے کہ برابر ہلے جا رہے تھے اور توبہ و استغفار کے الفاظ زبان سے آہستہ آہستہ نکل رہے تھے۔ بی چھٹن اور علی احمد سمجھ گئے تھے کہ مریضہ کا آخری وقت آپہونچا ہے اب دوائیں بیکار ہیں دونوں کا دل امنڈ رہا تھا مگر آنسو روکے ہوئے تھے۔ مریضہ کا ایک ہاتھ علی احمد کے ہاتھوں میں تھا دوسرا ہاتھ بی چھٹن اپنے ہاتھوں میں لئے اس کو کبھی سہلاتیں اور کبھی بڑی عقیدت سے چومتی جاتی تھیں۔ اب مریضہ کی سانس بھی بے ترتیب ہونے لگیں چہرے پر جلد جلد موت کی زردی چھاتی چلی اور آنکھیں بھی بے نور ہونے لگیں یکایک دونوں کے دیکھتے دیکھتے ایک بار زور سے مریضہ نے کلمہ پڑھا ہچکی آئی، منکا ڈھلا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ علی احمد مارے صدمے کے بے ہوش ہوگئے۔ اس وقت بی چھٹن نے بڑا کام کیا اپنے حواس قائم رکھے اور علی احمد کو ہوش میں لانیکی تدبیریں کرنے لگیں جب ان کو ہوش آگیا تو صبر کی تلقین کرتی رہیں۔ ماما سے کہا کہ اعزہ کو اطلاع دینے کے لئے اور محلہ میں لوگوں کو خبر کے واسطے ملازم کو ہر جگہ بھیج دے۔ بی چھٹن نے علی احمد کی والدہ کے بدن اور چہرے کو پہلے ہی دھلی ہوئی چادر سے ڈھک دیا اور ماما کی مدد سے لاش کو بھی قبلہ رخ کر دیا تھا۔ جب تمام لوگوں کو انتقال کی خبر دینے کے لئے ملازم جا چکا تو بی چھٹن نے علی احمد کو تسلی دی اور ان کے آنسو پونچھے اس کے بعد وہاں اپنا زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور دل پر جبر کر کے گھر واپس آگئیں۔ ماں کے مرنے کے بعد علی احمد کا گھر پر اب تو اور بھی جی نہیں لگتا تھا۔ گھر پر تھا بھی اور کون

جس کی اب ان کو فکر رہتی اس لئے تقریباً دن کا سارا وقت بی چھٹن کے یہاں گذارتے
تھے اور وہ بھی ان کی دل دہی اور غم خواری میں لگی رہتی تھیں۔ شام کے وقت بی چھٹن
ان کو سمجھا بجھا کر گھر واپس بھیج دیتیں۔ یہاں رشتہ کی دو ایک بوڑھی عورتیں آگئی
تھیں وہی ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتیں یہ گھر آکر بستر پر پڑ رہتے۔ ایک مہینہ
کے بعد وکالت کے امتحان کا نتیجہ نکلا اور علی احمد یہ آخری امتحان بھی اعزاز کے ساتھ
پاس کر گئے۔ ایک دن بی چھٹن نے علی احمد سے کہا کہ میاں میری شرطیں تم نے پوری
کردیں اور میرا مقصد بھی حل ہوگیا، اب آج میں کھل کر تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی
ہوں ذرا غور سے سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو، پھر کہنے لگیں "دنیا جس کو عام طور
سے محبت ہوتی کہتی ہے وہ صرف جسمانی توصل کا نام نہیں، محبت کا جذبہ تو ہر جذبہ
سے اونچا بڑا ہی پاکیزہ اور قابل احترام جذبہ ہے۔ مجھ کو بھی تم سے محبت ہے آج سے
نہیں بلکہ اس دن سے جب میرے بلانے پر تم پہلی مرتبہ میرے یہاں آئے تھے۔ اس
وقت تم صرف پندرہ سال کے تھے اور میں پچیس چھبیس سال کی تھی میری اور تمہاری
عمر میں تقریباً بارہ سال کا تفاوت تھا۔ میں نے چھبیس سال کی عمر میں اپنے پیشہ کی
بدولت دنیا کا خوب تماشہ دیکھا تھا اور محبت کے معنی خوب سمجھنے لگی تھی۔ تم کم سن
تھے۔ نہ محبت کے معنی سے آشنا تھے اور نہ دنیا کا تم کو تجربہ تھا اور تم جھوٹ کو بھی سچ
سمجھتے تھے اور میں سچ کو بھی جھوٹ جاننے کی کوشش کرتی تھی۔ تمہارے گھر کی تعلیم
صداقت اور خلوص کے اعلیٰ اصول پر ہوئی تھی اور مجھے بچپن سے ہی جھوٹ اور فریب
سکھایا گیا تھا، تم شریف تھے جس کی زندگی کی بنیاد سچائی اور خلوص پر رکھی جاتی ہے اور
میں بازار کی بیٹھنے والی ایک طوائف جس کی ساری زندگی کاروباری ہوتی ہے، جو اپنے
کاروبار میں بڑی بولیوں پر اپنی جھوٹی محبت بیچتی ہے۔ اپنے عشوہ و ناز بیچتی ہے اور اپنا
جسم بیچتی ہے وہ اپنے پیشے کے اندر محبت کر بھی نہیں سکتی اگر وہ ایسا کرے تو اس کے
پیشے کے خلاف یہ غداری ہوتی ہے۔ وہ فریب مجسم ہوتی ہے اس کا رونا بھی فریب اور

اس کی ہنسی بھی فریب مگر سب سے بری چیز اس کی روح کی گندگی ہے جس کو وہ اپنے خوبصورت جسم کے اندر چھپائے ہوئے ہر اس چیز کو جو اس سے چھو جائے گندہ کرتی رہتی ہے ان سب باتوں کے باوجود طوائف پھر بھی عورت ہے۔ خدا نے جو فطری جذبہ عورت کو دیا ہے اس سے طوائف بے بہرہ نہیں جس ماحول میں طوائف رہتی ہے اس ماحول میں رہ کر بھی وہ جذبہ مردہ نہیں ہوتا مگر سو جاتا ہے اور بہت گہری نیند سو جاتا ہے اور جب کبھی محرکات قدرت اس کو ٹھوکے دیکر بیدار کرتے ہیں تو مختلف کیفیات کے ساتھ وہ جاگ بھی اٹھتا ہے کبھی ماں کی ممتا کی صورت میں کبھی بیوی کے پیار کے انداز میں کبھی بہن کے خلوص کا روپ دھار کر اور کبھی بیٹی کی سچی محبت کے بھیس میں۔ تم کو میں تنبولی کی دوکان پر بیٹھا دیکھتی تھی، عین اس وقت جب میں بھی اپنے پیشے کے لئے تیار ہو کر سر بازار جھروکے پر آ بیٹھتی تھی۔ پہلے تو میں نے تم کو بازاری ماحول کا ایک آوارہ گرد لڑکا سمجھا جس کی تعلیم ارد گرد کے بازاروں میں ہوتی رہتی ہے پھر مجھے تعجب ہوا جب میں نے یہ دیکھا کہ تم ان لوگوں سے مختلف ہو جو مجمع قائم کئے میرے دیدار کے منتظر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے سوقیانہ مذاق اور تفریح سے تم الگ رہتے۔ جب میں جھروکے پر آتی تو تم کو ٹکٹکی لگ جاتی اور جب میں واپس جاتی تو تم بھی چپ چاپ اٹھ کر چلے جاتے۔ تمہاری کم سنی اور تمہارا ہم نشینوں سے الگ تھلگ رہنا مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے تم کو بلا بھیجا تم آئے تو تمہارے وجود سے شرافت کی بو آئی۔ میں نے دیکھا کہ تم شریف بھی ہو پاکیزہ بھی ہو اور سچ بھی ہو۔ تمہاری پاکیزگی دیکھ کر میری روح میں ایک عجیب قسم کا التہاب پیدا ہونے لگا۔ کوئی چیز اندر ہی اندر سلگ اٹھی۔ میں تمہاری طرف کھنچنے لگی کس طرح یہ مجھ کو آج تک معلوم نہ ہو سکا میں نے یہ بھی دیکھا کہ تم ابھی ابھی صحیح راہ سے بھٹکے ہو مگر ابھی پھر راستے پر لگ بھی سکتے ہو۔ صرف ایک راہ نما کی تم کو ضرورت ہے جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تمہارے والد زندہ نہیں اعزہ بھی تمہیں نہیں پوچھتے بلکہ تباہ کرنے کی فکر میں لگے ہیں،

تم ایسی ماں کی اکیلی اولاد ہو جو شریف بھی ہے اور بڑی محبت کرنے والی بھی مگر اپنی پردہ نشینی کے باعث تمہاری نگہداشت نہیں کر سکتی تو میں نے اپنے کاروباری زندگی سے تھوڑا ہٹ کر ایک پارٹ ادا کرنا چاہا جو میرے پیشے کے سراسر خلاف تھا مگر اس پارٹ کو عورت ہی ادا کر سکتی تھی۔ میں نے تمہاری محبت کو جھٹلایا نہیں بلکہ تم کو ہمت دلائی۔ میں تمہاری محبت کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے خود اس میں ایک عجیب طرح کا سرور مل رہا تھا جس کو سمجھنے کی میں نے کوشش کی اور نہ سمجھ سکی۔ میں نے اس کو مقدم سمجھا کہ تمہاری زندگی کا راستہ ہموار کردوں پھر دیکھا جائیگا۔ اس میں میرے ضبط نفس کا بھی امتحان تھا، جس میں میں بھی پورا اترنا چاہتی تھی۔ میری زندگی میں یہ بڑے کشمکش کے ایام تھے مگر میں نے اپنے دل میں بڑی سختی کے ساتھ عہد کر رکھا تھا کہ اپنی گندی زندگی کے باوجود کم از کم تمہارے لئے پاک رہ کر میں تم کو پاکیزگی کے راستے سے نہیں ہٹنے دوں گی اور تم کو سہارا دیکر اس منزل پر پہنچادوں گی جہاں شریفوں کی بستی ہے۔ تم بھی میرے اندازے کے موافق نکلے۔ تم نے میری ہدایتیں قبول کر لیں اسی ڈگر پر چلے جس پر میں نے تم کو چلانا چاہا۔ میں یہ سب باتیں اس لئے تم کو بتا رہی ہوں کہ تم میرے متعلق سب کچھ جان لو۔ بہر کیف جب تم وکالت کا آخری امتحان دیکر کلکتہ سے واپس آئے تو تمہاری والدہ نے اپنے ایک عزیز کی لڑکی سے تمہاری شادی کرنی چاہی۔ وہاں سب کچھ تھا شرافت بھی، وجاہت بھی، دولت بھی اور لڑکی بھی خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھی۔ تمہارے لئے بڑی مشکل تھی کہ تم ماں کا حکم بھی ٹال نہیں سکتے تھے اور میری محبت سے بھی باز نہیں آسکتے تھے۔ بہر حال تم نے فیصلہ کیا ماں سے سب حال کہہ دیا۔ ماں سے بڑھ کر محبت کرنے والی کوئی ہستی نہیں۔ تمہاری ماں شرافت کی دیوی تھیں، اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ انھوں نے سب حال سنکر فیصلہ تمہیں پر چھوڑا، وہ بھی اپنا فیصلہ کس طرح دیتیں۔ انھوں نے مجھے دیکھا نہیں تھا۔ پھر ایک آبرو باختہ طوائف کی عزت اور حیثیت ہی کیا مگر ان کو تمہاری خوشی سب سے

زیادہ عزیز تھی۔ جب ان کی حالت بگڑی تو میں نے ان کو دیکھنا چاہا انھوں نے بڑی محبت سے مجھے اپنے پاس آنیکی اجازت دی۔ انھوں نے مجھ کو دیکھا اور میں نے ان کو دیکھا، ان پر کیا اثر ہوا یہ تو میں کہہ نہیں سکتی مگر میں نے ایسی پاکیزہ ہستی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انکی پاکیزگی گندگی کو صاف ستھرا بنانے والی تھی۔ ان کی عصمت کا اجالا غلط راہ چلنے والوں کو صحیح راستہ دکھانے والا تھا اور ان کی محبت سب پر ابر رحمت بنکر چھا جانے والی تھی۔ جب میں پہلی مرتبہ ان کے پاس گئی تو انھوں نے بڑی پیار کی نظروں سے مجھے دیکھا، وہ ممتا بھری نظریں مجھے ابھرتی ہوئی دکھائی دی تھیں۔ خدا جانے یہ میرا وہم تھا یا حقیقت۔ مگر ظاہر طور پر واقعات کی دنیا میں جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا تو میں نے یہی دیکھا تھا کہ ایک طوائف پیشہ کاروباری عورت کے پاس بیٹھی ہوں اس سے دنیا بھر کے عجیب عجیب قصے سنتی ہوں اور آئے دن نئے تماشے دیکھتی ہوں یہاں ہر بات مصنوعی تھی، محبت بھی نفرت بھی اخلاص بھی دشمنی بھی ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تمہاری ماں نے مجھے اپنی پہلی نظر میں وہ محبت دی جس کی بچپن سے میری روح متلاشی تھی، ان کو دیکھ کر میری آتما کو وہ راحت ملی جو ماں کے آغوش ہی میں ملتی ہے۔ میں بار بار ان کے پاس جانے لگی۔ میں جب جاتی تو وہ میرے چہرے کو دیکھتیں پھر تم کو دیکھتیں پھر نہ معلوم کیا سمجھ کر مسکرانے لگتیں۔ ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی تم سخت پریشان تھے میں بھی مضطرب تھی۔ سوچتی تھی کہ ایسی محبت کرنے والی ماں کے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ میں جس دن سے ڈرتی تھی آخر وہ دن آ ہی گیا۔ اس دن میں ان کے پاس گئی تو انھوں نے نہ جانے کیا سوچ کر مجھے اور تمہیں اپنے قریب بلایا ہم دونوں کے ہاتھ محبت سے پکڑے اور ملا دئے۔ پھر مسرت بھری نظروں سے ہم دونوں کو آخری بار دیکھا اور ہمیشہ کے لئے تم سے اور ہم سے رخصت ہو گئیں"۔

بی چھٹن یہ باتیں کہے جا رہی تھیں، آنکھیں خلاء میں گم تھیں، پلکیں بھیگی ہوئی تھیں چہرے پر اندرونی کشمکش کے آثار چھپائے نہیں چھپتے تھے، علی احمد کی یہ حالت تھی کہ

ٹکٹکی لگائے بی چھٹن کو دیکھ رہے تھے۔ آخر بی چھٹن رکیں، سامنے سے چاندی کا بڑا پاندان اپنے پاس گھسیٹا اس کو کھول کر پان بنانے لگیں ایک گلوری خود کھائی ایک علی احمد کو دی پھر بولیں۔ ""تم سمجھتے ہو گے کہ میں یہ سب کیا اوٹ پٹانگ بک رہی ہوں۔ مگر تمہیں کیا معلوم کہ میں کس کشمکش میں مبتلا ہوں۔ علی احمد! میں ایک ایسے دوراہے پر آ پہنچی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب آگے کس راستے پر چلوں"۔ اتنا کہہ کر بی چھٹن نے سر جھکا لیا کچھ دیر تک سوچتی رہیں۔ علی احمد چپ چاپ نقش حیرت بنے دیکھتے رہے۔ آخر کچھ دیر کے بعد بی چھٹن نے سر اٹھایا۔ علی احمد کو پیار کی نظروں سے دیکھا اور پھر کہنے لگیں "علی احمد! لو اب میں طے کر چکی کہ کس راستے پر مجھے چلنا ہے۔ ایک راستہ وہ ہے جس پر تم چلتے رہے اور رہ رہ کر میرا دل بھی مجھے اکساتا رہا کہ میں بھی اس راستے میں تمہاری ہم سفر بن کر چلوں۔ تمہیں تو پوری امید تھی کہ آخر کار میں اس راستے میں تمہاری ہم سفر بن جاؤنگی مگر آج میں جب تمہارے مستقبل کو دیکھتی ہوں اور تمہاری پاکیزگی پر غور کرتی ہوں تو اس راستے پر ساتھ چلنے کے لئے تمہارے لائق اپنے کو نہیں پاتی۔ یہ تو پہلا راستہ ہے مگر اس کے علاوہ ایک دوسرے راستے کا نشان میں نے تمہاری والدہ کی محبت بھری نظروں میں پایا تھا جس میں خلوص اور سچی محبت اپنی قربانیوں کے ساتھ راہبر ہوتی ہے۔ یہی دو راستے میرے سامنے تھے۔ دل پہلے راستہ کی طرف مائل کرتا ہے عقل دوسرے راستے پر چلنے کا اشارہ کرتی اور خود میرا یہ حال کہ فیصلہ نہ کر پاتی تھی کہ کیا کروں لیکن ابھی ابھی میں نے تمہارے مستقبل کو سامنے رکھ کر اور تمہاری بہبودی کے لئے اپنے دل پر جبر سہہ کر ایسا فیصلہ کر لیا کہ پہلے راستے میں میرا اور تمہارا ساتھ مل کر چلنا بڑا بے جوڑ ہے۔ اس سفر میں ہم عمر اور برابر کا ساتھی ہو تو راستہ مزے سے طے ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرا راستہ جواب سنسان پڑا ہے اور جس پر چلنے والا مسافر اس راستے کو ویران چھوڑ کر چلا گیا وہی راستہ اب میرے لئے۔ سنو تمہاری والدہ کی خواہش تھی کہ تمہاری شادی اپنے عزیز کے یہاں کر دیں وہ جگہ

ان کو دل سے پسند تھی ۔ ابھی وہاں تمہاری نسبت کی گفتگو مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ تم نے اپنی والدہ کو اپنی رام کہانی کہہ سنائی انہوں نے اپنی خواہش کو کچل کر صرف تمہاری خوشی اور تمہارے جذبات کا لحاظ رکھا اور فیصلہ پر چھوڑ دیا اب وقت آگیا ہے کہ تم وہی کرو جو تمہاری والدہ کی تمنا تھی جس کو انہوں نے دل میں دبا دیا تھا۔ تمہارے لئے بھی اس کے سوا دوسرا راستہ نہیں کیونکہ میری تمام محبت اگرچہ تمہارے لئے ہے لیکن اب وہ بیوی کی محبت نہیں بلکہ ایک ماں کی محبت ہے۔" علی احمد یہ سن کر بڑے زور سے چونکے ۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ بی چھٹن سے بڑے سخت لہجے میں بولے" آپ یہ کیا اول فول بک رہی ہیں" بی چھٹن مسکرائیں اور علی احمد کا ہاتھ تھام کر محبت سے تھپ تھپایا اور کہنے لگیں "ذرا عقل سے کام لو کیا یہ صحیح نہیں کہ میری اور تمہاری عمر میں تقریباً بارہ تیرہ سال کا تفاوت ہے ۔ میں چھتیس سینتیس سال کی ہوں اور تم ابھی غالباً چوبیس سال کی عمر کے بھی پورے نہیں ۔ میری عمر کا انحطاط شروع ہو چکا ۔ تم جوانی اور زندگی کی پر کیف وادی میں اب داخل ہو رہے ہو اور میں عمر کی درمیانی منزل میں پہنچ کر بہت کچھ اپنی زندگی کا مقصد پا چکی ہوں ، ابھی تم کو ایک شریف انسان کی طرح اپنے مقصد زندگی کو کامیاب بنانا باقی ہے ۔ پاگل نہ بنو اور مجھے بھی پاگل نہ بناؤ گھر جاؤ ، اس مسئلے پر آج رات میں ٹھنڈے دل سے غور کرو کل میں صبح ناشتے پر تمہارا انتظار کرونگی ، علی احمد بہت افسردہ ہو اٹھے پاؤں میں لغزش تھی بدن میں جھرجھری معلوم ہو رہی تھی ۔ بی چھٹن نے یہ سب کچھ دیکھا مگر چپ رہیں ان کا دل بھی اپنے فیصلے پر کانپ رہا تھا برسوں کی محبت اپنی طرف کھینچتی تھی مگر اعلی مقصد شرافت فیصلہ کو اٹل بنا چکا تھا ۔ اس لئے دماغ صحیح طور پر سوچ رہا تھا اور وہ ہوش مندی سے یہ سمجھتی تھی کہ ان باتوں کا ردعمل علی احمد پر ایسا ہونا ہی تھا اور پھر یہ بھی ایسے وقت تالیف قلوب کی کارروائی بہت سی پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیتی ہے اور غلط فہمی کو بھی جنم دیتی ہے ۔ دوسرے دن علی احمد صبح کے وقت آئے بہت پژمردہ تھے ، چہرا اترا ہوا تھا ، معلوم

ہوتا تھا کہ رات آنکھوں میں کاٹی ہے۔ ناشتہ تیار تھا اصرار پر دو ایک لقمہ بہ مشکل کھایا ۔ ناشتہ ختم ہوا تو بی چھٹن نے پاندان کھول کر دو پان بنائے ایک خود کھایا دوسرا علی احمد کو دیا، علی احمد گفتگو کرنے کے لئے بے قرار نظر آرہے تھے۔ بی چھٹن ان کو جلد گفتگو کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھیں۔ آخر علی احمد نے گفتگو کا پہلو نکالا کہنے لگے "میں نے بھی اب فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے" بی چھٹن نے پوچھا "ہاں کہو اب کیا کروگے ؟ بولے "اب زندگی بھر شادی نہ کروں گا"۔ بی چھٹن نے ڈانٹا کہ "یہ کیا کہتے ہو تم کو شادی کرنی ہوگی اور وہیں کرنی ہوگی جہاں تمہاری والدہ کی خواہش تھی اور جہاں انہوں نے تمہاری نسبت کی تحریک کی تھی" علی احمد نے جواب دیا "یہ تو عجب تماشہ ہے آپ میری والدہ کی خواہش بھی پوری کرنا چاہتی ہیں اور پھر ان کی خواہش کی خلاف ورزی بھی کر رہی ہیں" بی چھٹن نے پوچھا یہ کیسے "؟ اس پر بولے والدہ مرحومہ نے اپنے آخری وقت میں مجھ کو اور آپ کو اپنے قریب بلایا، میرا اور آپ کا اپنے ہاتھ میں لے کر ہم دونوں کے ہاتھ ملا دیئے پھر اس پر مسکرائیں اور خوش نظر آئیں۔ جس کے کھلے کھلے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں ہم دونوں کو ایک کر تیں" بی چھٹن نے جواب دیا "اس کے یہ بھی تو معنی ہوتے ہیں کہ وہ تم کو میرے حوالے کر گئیں کہ جس طرح وہ تم سے محبت کرتی تھیں میں بھی تم سے ویسی ہی محبت کروں اور انہی کی طرح تمہارا خیال رکھوں۔ علی احمد ! دیکھو جو محبت تم مجھ سے چاہتے ہو وہ تو اب میں تم کو دے نہیں سکتی مگر تمہاری والدہ کی دی ہوئی ماما جو اس کی جگہ لے چکی ہے اس کو خدا کے واسطے نہ ٹھکراؤ"۔ یہ کہتے کہتے بی چھٹن کی آنکھوں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ آخر وہی ہوا جو بی چھٹن چاہتی تھیں۔ علی احمد کی شادی ان کے مغلپورہ والے ماموں کے وساطت سے اسی عزیز کے یہاں ہو گئی جہاں ان کی والدہ نے سلسلہ جنبانی کی تھی۔ اندر اندر شادی کا سارا سامان بی چھٹن نے کیا۔ دولہن رخصت ہو کر گھر آئی تو شادی میں کھلے بند چونکہ علی احمد کے رشتہ داروں کے ڈر سے علی احمد کے گھر جا نہیں سکتی

تھیں اس لئے ایک غیر معروف اجنبی عورت بن کر گئیں اور جی بھر کر دولہن کو دیکھ آئیں اور بہت خوش ہوئیں۔ شادی کے بعد جب مجمع چھٹا تو بالاعلان بھی جانے لگیں۔ بی چھٹن نے علی احمد کو کلکتہ ہی میں وکالت کرنے کی رائے دی یہ زندگی بھر انہیں کی رائے پر چلتے آئے تھے یہاں کیوں انکار کرتے۔ علی احمد کی سسر کی بھی اتفاق سے یہی رائے ہوئی علی احمد نے کلکتہ میں وکالت شروع کی، وہیں فروغ پایا اور مستقل کلکتہ باشی ہوگئے پھر بھی یہ کبھی کبھی سبھوں کو لے کر آتے تو بی چھٹن کی عید ہوجاتی، ان کے گھر روزانہ آتیں ان کے بچوں کو کھلاتی رہتیں۔

میرے ایک بزرگ سید محمد فخر النبی صاحب تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال تقریباً اسی برس کی عمر میں ہوا وہ علی احمد کے اسکول کے ساتھی اور دوست بھی تھے یہ قصہ باتفصیل میں نے ان سے باربار سنا ۔ چونکہ انوکھا واقعہ تھا۔ جب ان سے سنتا بڑا مزہ ملتا۔

پیارے نواب صاحب مرحوم اور دیپک راگ

آج ہندوستان میں موسیقی دو شکلوں میں تقسیم ہوئی ملے گی۔ ایک تو کرناٹک سنگیت کہلاتی ہے دوسری کو ہندوستانی سنگیت کہتے ہیں۔ کرناٹک سنگیت بغیر تغیر و تبدل کے اسی شکل میں چلا آتا ہے جس کی ایجاد شاستروں کے زمانے میں ہوئی تھی۔ یہ جذبات کے لحاظ سے بھرپور تو ہے مگر اس میں ان اسلوب کی کمی رہ گئی ہے جو موسموں کی تبدیلی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کرناٹک سنگیت ان کی کیفیات سے بھی بڑی حد تک محروم ہے جو محدود دائرے سے نکل کر آفاقیت کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ کرناٹک سنگیت باہر کے اثرات سے الگ رہ کر اپنے ہی ماحول میں زندگی بسر کرتا رہا۔ دوسری طرف ہندوستانی موسیقی کی تاریخ ارتقاء پر نظر ڈالئے تو واضح ہوگا کہ عہد قدیم کے ساتھ یہ شاستریہ سنگیت کا یہ بازو اپنی سطح سے

کس طرح اونچا ہوتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے متحدہ کلچر کے سہارے یہ ہندوستان کا مشترکہ سرمایہ بنا۔ ہندوستانی موسیقی کو سب سے پہلے سنوارنے اور اس میں آفاقیت کی صلاحیت پیدا کرنے میں امیر خسرو اور ہندوستان میں باہر کے آنے والے فنکاروں کا بڑا حصہ ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کی ایک دوسرے سے قربت نے بھی اس میں گوناں گوں رنگ بھرے اور پھر شاہی سرپرستیاں بھی اسے پروان چڑھاتی رہیں۔ دکن میں قطب شاہوں نے نئے نئے گانے پرانے گانوں میں جوڑے۔ اکبر کے بڑھے ہوئے شوق کی بدولت تان سین نے طرح طرح کے راگ راگنیوں سے اس کا دامن مالامال کیا۔ محمد شاہ رنگیلے کے دور میں اور بھی بہت سے گانے ایجاد ہوئے اور ٹھمری کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ ہی اس کے موجد تھے۔ ہندوستان کے دور انحطاط میں اس کو فنا ہونے سے بچانے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے۔ سلطنت ختم ہو چکی تھی، ملک میں افرا تفری کا زور تھا، بہت سی قوموں کی خصوصیات مٹ رہی تھیں مگر اس فن کے شیدائی اس فن کو سینے سے لگائے رہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوا کہ ہندوستان کے امراء اور شرفاء بھی اس کو اپنی وارثت سمجھتے تھے اور فن کے ساتھ فنکاروں کو بھی فنا ہونے سے بچائے چلے جا رہے تھے۔ ہندوستانی موسیقی کی سلامتی اور اس کی عظمت کا انحصار اگلے دور کے ہندو اور مسلمان امراء اور شرفاء کی فیاضیوں پر یوں بھی تھا کہ وہ اس فن کے ماہرین کی بلاامتیاز مذہب و ملت مدد اور سرپرستی کرنے کے علاوہ خود بھی اس فن میں کمال حاصل کرتے تھے اور ان کا ایسا کرنا ایک حد تک ضروری بھی تھا کیونکہ موسیقی کے فن میں جب تک کسی کو درک نہ ہو وہ اس کی پوری قدروقیمت بھی نہیں سمجھ سکتا۔ پٹنہ میں پیارے نواب صاحب مرحوم دیوان محلہ میں رہتے تھے۔ ایک شریف خاندان کے فرد اور خاندانی رئیس تھے اور موسیقی میں ان کی حیثیت جگت استاد کی تھی۔ ان کا ستار بجانا تو سچ مچ ایک معجزہ تھا جو آج تک پھر کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔ دور دور

سے بڑے بڑے ستارے آتے اور ان کے قدموں کو چھو کر فیض پاتے تھے۔ سبھوں کے سامنے گانے کے بول زبان سے نہیں نکالتے تھے صرف ستار کے پردوں میں موسیقی کے تمام رموز و نکات اور طرح طرح کے راگ راگنیاں سنا دیتے تھے۔ یوں اگر کسی کو کچھ بتا دیا تو بتا دیا مگر پورا شاگرد کبھی مشکل سے ہی کسی کو بناتے تھے۔ رئیس تھے، محفلوں میں کمال دکھانا کسر شان تھی۔ اس لئے شوقین ان کے مکان ہی پر دوڑے آتے۔ پیارے نواب صاحب بڑے اخلاق سے چھوٹے بڑے سبھوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور کبھی کبھی ان کی فرمائش بھی پوری کر دیتے۔ مسٹر ڈھاولے آئی۔ سی۔ اس پٹنہ میں سیٹی مجسٹریٹ تھے پہلے دور کے سویلین اور قوم کے مرہٹہ تھے۔ اور موسیقی کے بڑے دلدادہ۔ پیارے نواب صاحب کا شہرہ ان کے کان تک پہنچا تو ان کے پاس خود گئے، ربط بڑھایا اور ان سے ستار سیکھنے کی استدعاء کی۔ پیارے نواب صاحب نے ان کو بھی بہ مشکل شاگردی میں لیا۔ مسٹر ڈھاولے کا شوق سچا تھا۔ اس لئے انھوں نے جی لگا کر ستار بجانا سیکھا۔ لگاتار مشق کرتے رہے آخر میں اچھے خاصے اس فن کے ماہر بن گئے۔ پیارے نواب صاحب کچھ دنوں کے بعد تو گذر گئے مگر مسٹر ڈھاولے جو آخر میں پٹنہ ہائیکوٹ کے جج ہو گئے تھے پیارے نواب صاحب کے گھر کے لوگوں کی برابر عزت اور مدد کرتے رہے۔ عام طور سے یہ بھی مشہور تھا کہ ہندوستان بھر میں صرف پیارے نواب صاحب ہی دیپک راگ جانتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کے ہر حصہ سے موسیقی کے استاد پیارے نواب صاحب کی خدمت میں آتے اور ان سے دیپک راگ سننے کی تمنا ظاہر کرتے۔ پیارے نواب صاحب مرحوم تو کبھی تو ہنس کر ٹال دیتے اور کبھی ایسی باتوں کو جھوٹ کہہ کر چپ ہو جاتے۔ ایک دفعہ گوالیار، مدراس اور لکھنؤ کے کچھ بڑے گوئیے پیارے نواب صاحب کی زیارت کو آئے۔ یہ سب زہرہ بائی کے مہمان تھے۔ پیارے نواب صاحب کی شام کی نشست میں زہرہ بائی سبھوں کو لیکر ان کے یہاں پہنچی۔ کچھ اور لوگ بھی پیارے نواب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ زہرہ بائی، جو خود بھی

ہندوستان میں موسیقی کی بڑی ماہر سمجھی جاتی تھی، اس کی بھی بڑی تمنا تھی کہ کسی طرح پیارے نواب صاحب سے دیپک راگ سنے۔ بار بار آتی تھی مگر پیارے نواب صاحب اپنی عدم واقفیت کا عذر کر کے اس کو خاموش کر دیتے تھے۔ آج جو یہ سب ماہرین فن جمع ہوئے تو دیپک راگ کے متعلق پھر بحث چھڑی گویوں میں سے ایک صاحب غالباً طنز سے بولے "میری عمر پچاس سال سے اُوپر آئی، ہندوستان کے گوشے گوشے کی خاک چھان ڈالی، جنگلوں میں رہ کر جوگیوں کی خدمتیں کیں، مندروں میں دیو داسیوں کی خوشامدیں کیں، جہاں بھی صاحب کمال کا نام سنا ان کے پاس دوڑا گیا کہ شاید دیپک راگ کا کچھ بھید ملے مگر اتنی دوڑ دھوپ کے بعد بھی کوئی ایسا نہ ملا جو دیپک راگ سے واقف ہو۔ اب تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگلے کچھ لوگوں نے دیپک راگ کا صرف ڈھونگ رچایا اور عام کلاکاروں پر رعب جمانے کے لئے دیپک راگ کا مصنوعی قصہ گڑھا تھا کہ لوگ موسیقی کے کل رموز اور سب راگ راگنیوں کو جانتے ہوئے بھی دیپک راگ کا نام سنکر اور اس سے عدم واقفیت کے باعث اپنے علم کو نامکمل سمجھیں اور استاد کے آخری گر سے ڈرتے رہیں"۔ صحبت میں کچھ لوگوں نے اس گفتگو کی موافقت بھی کی اور کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے مخالفت کی۔ زہرہ بائی پیارے نواب صاحب کا منہ تک رہی تھی اور پیارے نواب صاحب سب کی گفتگو سن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ستار ان کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ پیارے نواب صاحب نے شغل کے طور پر ستار کو اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور ان کی انگلیاں آہستہ آہستہ ستار کے تاروں کی طرف بڑھنے لگیں۔ یکایک تار جھنجھنا اٹھے ایک مقناطیسی کشش نے سبھوں کی آنکھوں اور دل و دماغ کو پیارے نواب صاحب کی طرف متوجہ کر دیا۔ ستار کے پردوں سے ایک ایسا نغمہ پھوٹا کہ جس کے آہنگ و ترنگ سے قوائے ذہن اور قوائے جسمانی میں بھی ایک کیف بخش ہیجان اٹھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ساری فضا بیقراری میں کروٹیں بدلنے لگی ہے۔ نبضیں تیز ہوئیں اور دلوں میں ایک عجیب قسم کا التہاب بھڑک اٹھا۔ ستار کے

پردوں سے ایسا راگ نکل رہا تھا جس سے کان کبھی آشنا نہ تھے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ ایک شعلہ ساری کائنات پر محیط ہے جس سے سرود زندگی کی چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں اور اس میں ایسا سوز اور اس سوز میں ایسا کیف و سرور تھا کہ اس میں جلنے ہی پر آتما کو ابدی نشاط حاصل ہو۔ سب مدہوش تھے، چونکے تو دیکھا کہ پیارے صاحب بیٹھے مسکرا رہے ہیں اور ستار اپنی جگہ پر ان کے قریب ہی پڑا ہوا ہے۔ ابتو یہ حالت ہوئی کہ کوئی پیارے صاحب پر تصدیق ہو رہا ہے، کوئی ان کے قدموں پر گرا ہوا ہے اور کوئی دست بستہ ان سے التجا کر رہا ہے کہ خدارا ایک دفعہ تو جی بھر کے یہ دیپک راگ پھر سنا دیجئے۔ پیارے نواب صاحب صرف ہنستے ہی رہے مگر ستار کے تاروں پر کسی طرح ان کی انگلیاں نہ گئیں اور غالبًا لوگوں کے آگے دوبارہ دیپک راگ ان کی انگلیوں کے سہارے پھر کبھی پردۂ ساز پر باہر نہ اُبھرا۔

میرے ماموں سید عبدالمجید صاحب مرحوم کے یہاں زہرہ بائی برابر آیا کرتی تھی۔ کبھی گانے اور مجرے کے سلسلے میں اور کبھی یونہی ملاقات کی غرض سے۔ اس نے یہ واقعہ سید عبدالمجید صاحب مرحوم سے بیان کیا۔ صدیق خاں گویئے گوالیار کے رہنے والے تھے۔ وہ ہر سال پٹنہ کا دورہ کیا کرتے تھے اور رئیسوں کے یہاں جاتے اور انعام سمیٹتے تھے۔ وہ بھی اکثر عبدالمجید صاحب مرحوم کے یہاں حاضری دیا کرتے تھے اس واقعہ کی مزید تصدیق اپنی عین شہادت کے ساتھ انھوں نے بھی کی۔ میں نے یہ قصہ سید عبدالمجید صاحب کی زبانی سنا۔

راجہ بھر تھری کی منظوم کہانی

گانے والے بھاٹ

بیسویں صدی کے آغاز کے کچھ سال بعد تک جہاں فقیروں اور سنت اور سادھوؤں سے لوگوں کو دلی عقیدت تھی وہاں راجہ بھر تھری کی منظوم کہانی گانے والے بھاٹوں کو بھی بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور عقیدت مندانہ انداز میں ہندو اور مسلمان اس منظوم کہانی کے گیت ان سے سنتے تھے۔ ان کی وضع قطع میں خدا پرستی جھلکتی تھی۔ ان کے بدن پر گیروا لباس اور بغل میں بھی گیروا رنگ کا ایک جھولا ہوتا۔ زیادہ تر مونچھ داڑھی اور سر کے بال صاف اور کچھ ایسے بھی ہوتے تھے کہ سادھوؤں کی طرح لانبی داڑھی اور مونچھیں اور سر پر بالوں کی جٹا رکھتے مگر ایسے کم ہوتے تھے۔ ہاتھ میں ایک تارہ لئے دیہات دیہات قصبہ قصبہ اور شہر شہر گھومتے پھرتے۔ کسی کی ڈیوڑھی پر یا کسی دوکان کے آگے رک کر یک تارہ چھیڑتے تو ان کے گرد مشتاقوں کا مجمع لگ جاتا۔ اور ان کے گیت بول جس کے کان میں پڑتے وہ ان کے پاس خود کھینچ آتا۔ یہ مدھر بول میں راجہ بھر تھری کی منظوم کہانی ایسے والہانہ انداز میں الاپتے تھے کہ کہانی کے کردار فضا میں ابھرتے نظر آتے اور پرانی ہندو تاریخ کا یہ کھویا ہوا واقعہ حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے آنے لگتا۔ نہ جانے ان کی وضع قطع میں کوئی کشش تھی یا ان کے گانے کے ہلکے رسیلے بول میں سحر تھا یا راجہ بھر تھری کی سچی کہانی میں اثر تھا کہ روح کو عجیب لذت ملتی اور دل سکون سے بھر جاتا۔ اکتارہ پر گائی ہوئی راجہ بھر تھری کی اس منظوم کہانی نے سینکڑوں مردوں کو بیراگی اور عورتوں کو بیراگن بنا دیا۔ اپنے بچپن کے زمانے کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ میرے محلے کے ایک گوالے کا لڑکا ان بھاٹوں کے گانے کا بڑا دلدادہ تھا۔ کوئی بھاٹ نظر آتا تو گھر کا سب کام چھوڑ کر محلے محلے اس کے ساتھ مارا پھرتا۔ ایک دن وہ گھر سے غائب ہوگیا۔ کئی برس تک اس کا کچھ پتہ نہ

چلا۔ ایک دن میرے والد مرحوم گھر پر تھے اور دو چار آدمی ان کے پاس بیٹھے تھے کہ ملازم نے آکر کہا کہ محلے کے لوگ آئے ہیں اور کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ والد مرحوم نے ملازم سے کہا کہ سبھوں کو بلا لائے۔ محلے والے آئے تو ان کے پیچھے میں دو بیراگی بھی نظر آئے ایک تو بوڑھا تھا، گیروا لباس میں ملبوس ہاتھ میں ایک تارہ لئے دوسرا نوجوان بیراگی بھی اسی لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں بھی ایک تارہ تھا۔ ان دونوں کو اس طرح گھیرے ہوئے تھے کہ ان دونوں کی حیثیت قیدی کی معلوم ہوتی تھی۔ والد مرحوم نے محلے والوں سے آنے کا سبب پوچھا تو انھوں نے بوڑھے بیراگی کے خلاف یہ مقدمہ ان کے سامنے رکھا کہ یہ بھاٹ ہر جگہ راجہ بھرتھری کی کہانی سناتا پھرتا تھا اور کئی برس پہلے اس محلے میں بھی برابر آتا تھا اور یہ نوجوان بیراگی بنا ہوا اس کے ساتھ ہے وہ اس محلے کے ایک گوالے کا لڑکا ہے بوڑھے بیراگی نے اس لڑکے کو بہکا کر گھر سے نکالا اور پھر برسوں اس محلے میں کیا اس شہر ہی میں نہ آیا۔ غریب گوالا جس کا نوجوان بیراگی بیٹا تھا وہ بھی اس مجمع میں محلے والوں کے ساتھ تھا مگر بیٹے کو دیکھ کر روئے جاتا تھا۔ بوڑھے بیراگی کا بیان تھا کہ وہ لڑکے کو بہکا کر نہیں لے گیا بلکہ لڑکا اپنے جی سے اس کے ساتھ رہا اور اس کے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ آج بھی وہ لڑکے کو سمجھانے پر تیار ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس رہے۔ گوالے کا لڑکا جو نوجوان بیراگی تھا اس نے بھی یہی کہا کہ وہ اپنے جی سے بیراگی ہوا ہے اور اب تو گھر کے کام کا بھی نہیں ہے کیونکہ سنسار میں محبت پھیلانا ہی اب اس کا دھرم ہے۔ نوجوان بیراگی نے بوڑھے بھاٹ کی طرف سے مزید یہ بھی صفائی دی کہ تمام بڑی مذہبی جگہوں کے یاترے پر دونوں مل کر نکل گئے۔تھے اس لئے گھر واپس آنے میں کئی سال لگے۔ غرض یہ کہ گوالے کا لڑکا گھر واپس جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ بس اتنا ہوا کہ ماں باپ سے اس نے ملاقات کر لی۔

ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے دیوان محلّہ میں شریف ادھیڑ عمر کی ایک ہندو

بیوہ تھی۔ اس کے دو جوان بیٹے تھے جن کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ یہ بیوہ رات دن گیان دھیان میں لگی رہتی۔ سن، سادھوؤں سے بڑی عقیدت تھی پیسے والی تھی اس لئے جوگیوں اور بیراگیوں کے چرنوں میں روپے پیسے بھی بھینٹ کرتی رہتی تھی۔ راجہ بھرتھری کی منظوم کہانی گانے والے بھاٹ آتے تو بڑے شوق اور بیقراری کے ساتھ ان کے گیت سنتی اور دوسرے عالم میں کھو جاتی۔ ایک دن گھر پر نہ ملی تو تلاش شروع ہوئی مگر کہیں اس کا پتہ نہ چلا اس کو بھی چھ مہینے ہو گئے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ تنہا دریا میں نہانے گئی اور وہیں ڈوب مری۔ دریا میں جال بھی ڈلوائے گئے ملاحوں نے بھی دور دور تک دریا کی لہروں میں اس کی لاش کو ڈھونڈھا مگر یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ اس کی طرف سے اب نا امیدی ہو گئی تھی کہ اب ایک دن یہ خبر اس کے بیٹوں کو ملی پٹنہ سے تقریباً بیس میل دور پورب کی طرف اور بختیار پور کے نزدیک ایک پھونس کے جھونپڑے میں دریا کے کنارے جو بالکل سنسان ہے ایک بیراگن رہتی ہے۔ کبھی اپنے جھونپڑی میں اور کبھی دریا کے کنارے پر راجہ بھرتھری کی منظوم کہانی گاتی رہتی ہے۔ نہ کسی سے کچھ مانگتی ہے اور نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے۔ کبھی کوئی آنے جانے والا اس طرف سے گزرا اور کھانے کی کوئی چیز اس کے جھونپڑی میں چھوڑ گیا تو وہی اس کے کھانے کا سہارا بن جاتا ہے۔ دونوں بیٹوں کو ابھی تک ماں کی تلاش تھی ایک مبہم امید پر دونوں اس جگہ پہنچے تو دیکھا کہ وہ بیراگن سچ مچ ان کی ماں ہے۔ سمجھا بجھا کر گھر لائے مگر اس کی دار تنگی کا عالم گھر پر بھی وہی رہا۔ یہاں بھی کبھی مکان کے کوٹھے پر تنہائی میں یا دریا کے کسی سنسان گھاٹ کے کنارے چلی جاتی یک تارہ چھیڑتی، راجہ بھرتھری کی کہانی گاتی اور دنیا اور مافیہا سے دور کسی اور عالم میں کھو جاتی۔ راجہ بھرتھری کی منظوم کہانی گانے والے بھاٹ کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلاتے تھے مگر اپنی خواہش سے جو کوئی کچھ دے دیتا وہ اپنے جھولے میں رکھ بھی لیتے تھے۔ اس جھولے میں ان کا اوڑھنا بچھونا ایک پانی پینے کا لوٹا اور ان کی محدود ضرورت

کی کچھ اور چیزیں ہوتی تھیں۔ دنیا نقالوں سے خالی نہیں ان کی دیکھا دیکھی اسی شکل و صورت کے کچھ اور لوگ بھی نکل آئے تھے یہ بھی راجہ بھرتھری کی کہانی گاتے پھرتے ان کے ہاتھ میں یک تارہ کی جگہ سارنگی ہوتی مگر ان کے گانے میں نہ یہ کشش ہوتی تھی نہ والہانہ جذبات کے انداز ہوتے تھے اور نہ ہی سارنگی میں کہانی کا وہ فطری رچاؤ ہوتا تھا جو اصلی بھاٹوں کے تاروں کے لئے مخصوص تھا۔ ان کے علاوہ ان نقالوں کی حالت ہی صورتِ سوال ہوتی تھی۔ یہ کہانی سنا کر ختم کرتے تو ساتھ ہی ساتھ ہاتھ بھی پھیلا دیتے تھے۔

ہندوستان ترقی کے شوق میں اتنا تیزی سے آگے بڑھا کہ اپنی مخصوص رنگین قومی روائتوں کو بھی بڑی بے اعتنائی کے ساتھ روندتا چلا گیا۔ آج کی موجودہ نسل کو کیا خبر کہ راجہ بھرتھری کی منظوم کہانی میں کیسے سحر آفریں نغمے بھرے ہوتے تھے، اس کے گانے والوں میں کیسا والہانہ پن ہوتا تھا، اکتارے کے سہارے پر نکلے ہوئے سیدھے سادے بول کس طرح دل و دماغ کو سکون اور روح کو ابدی لذت بخشتے تھے اور اس کی سبق آموز داستاں میں کلاسیکل موسیقی کے ماہروں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ ان کو انعامات تمغے اور پنشن بھی ملتی ہیں مگر یہ فطرت کے ترجمان کلاکار جو ہندوستان کی بھولی ہوئی تاریخ کے ایک فرض آموز اور رومان پرور واقعے کی نشان دہی دیہاتوں میں، قصبوں اور شہروں میں راجہ بھرتھری کی منظوم کہانی کے ذریعہ کرتے پھرتے تھے نہ اب کسی کو ان کی تلاش ہے اور نہ وہ خود بھی آج کی کاروباری دنیا میں کہیں نظر آتے ہیں۔

پٹنہ میں ناٹک اور تھیٹر

ہندوستان میں ڈرامہ نویسی کی تاریخ قریب قریب اتنی ہی پرانی ہے جتنی یہاں کے علم و ادب کی تاریخ۔ ہندوؤں کے اگلے ادب کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ یہاں کی ڈرامہ نویسی اور کردار نگاری کی کسی دوسری زبان کی مرہون منت کبھی نہیں رہی۔ اس کی اپنی خاص ٹکنک اور اپنا خاص اسلوب تھا جس سے ہندوستان کی ڈرامہ نویسی نقطۂ عروج پر پہنچی اور اس کی یہی انفرادیت آج ڈرامہ نویسی کی دنیا میں اس کی عظمت کا ثبوت ہے۔ انحطاط کا دور شروع ہوا تو علم و ادب کے ساتھ ڈرامہ نویسی کا بھی انحطاط ہوا اسی لئے معیاری ڈرامے اس دور میں منظر عام پر نہ آسکے مگر اسی دور انحطاط میں ناٹک دیکھنے کا شوق زوروں میں ابھر آیا تھا۔ ناٹک کا عام رواج بڑی حد تک مذہب میں غلو کے سبب تھا اور یہ غلو بھی دور انحطاط میں پیدا ہوا تھا۔ ناٹکوں میں وہی ڈرامے کھیلے جاتے تھے جو ہندو تاریخ کے افسانوں اور مذہبی روایت پر مشتمل تھے اور جن کو دیکھنے میں دلچسپی اور تفریح بھی ہوتی تھی جس سے دل کو ہر طرح کا سکون بھی ملتا تھا آج یہ پرانے طرز کے ناٹکوں میں جس کو نوٹنکی کہتے ہیں ان کے اسٹیج پر رام چندر جی اور سیتا جی کے قصے مہابھارت کی لڑائیاں اور کرشن جی اور ان کی گوپیوں کی داستانیں مذہبی تہواروں میں عوام کے سامنے دہرائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے اولین دور حکومت میں جہاں مسلمانوں نے ہندوستان کے دوسرے علم و فن کی طرف توجہ دی وہاں ہندو ڈرامہ نویسی اور ناٹک بڑی کسمپرسی کی حالت میں پڑے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں ملک گیری کے جھگڑے ہوں، جہاں سلطنتیں گرتی اور ابھرتی ہوں، بادشاہ اور امراء کے دن اور راتیں گھوڑوں کی پیٹھ پر بسر ہوتی ہوں وہاں امور سیاست اور جنگی مصلحتیں اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ ناٹک گھر تعمیر ہوں اور خیالی طلسم بندی میں میدان عمل پس پشت چھوڑ دیا جائے۔ جب فاتحین کا دور گزر گیا، آسودگی اور تن آسانی کے باعث سلطنت پر گرفت بھی ڈھیلی پڑنے لگی جس سبب سے مسلمانوں کا آفتاب حکومت

گہنانے لگا اور آپس کے جھگڑوں میں خود غرضی اور ہوس رانی سے صوبہ داری اور علاقہ داری حکومتیں قائم کرنی شروع کیں تو لازمی طور پر میدان عمل بھی محدود ہوا اور سیاسی وسعت نظر میں بھی کم بینی آنے لگی۔ آخری دور کے آسانی سے قائم شدہ حکومتوں کے فرمارواؤں کا اگر مزاج حکومت اور ان کا قومی سیاسی کارنامہ کوئی دیکھنا چاہے تو دکن میں تاناشاہ کے درباری جشن کا اہتمام دیکھے، پونا میں پیشواؤں کے بزم عشرت کی داستان پڑھے اور اودھ میں نوابان اودھ کی عیش پوشی کی جھلک واجد علی شاہ کے متعدد رئیسوں میں مطالعہ کریں۔ لکھنو اور دہلی میں اسی وقت کے دور ابتلاء میں اضمحلال، حکومت کی تلافی اور اردو شعر و ادب اور افسانہ اور داستانوں سے کی جس کے ساتھ ساتھ اردو ڈرامہ نویسی کی بھی ابتداء ہوتی ہے اور جس کے علم برادروں میں میاں امانت ملتے ہیں اور واجد علی شاہ اپنے رئیسوں نے ناٹک کا دائرہ وسیع کرتے نظر آتے ہیں۔ الناس علی دین ملکوھم۔ جو بات شاہی محل سے نکلی وہ عوام میں پھیلی اسی طرح انیسویں صدی کے نصف اول کے دور میں ناٹک اور رہس کے تماشے ہر جگہ مقبول ہونے لگے۔ جب غدر کی ناکامی نے بساط سیاست مکمل طور پر الٹ دی اور انگریز ایک خونی ڈرامہ کے سامنے ہندوستان کے حکمراں بن گئے تو مغربی اثرات کو بھی پھیلنے کی گنجائش ملی اس وقت سے ہندوستانی ناٹک نے انگریزی تھئیٹر کا رخ دھارنا اختیار کیا۔ ناٹک کے اس انقلاب کی باگ ڈور پارسیوں کے ہاتھوں میں تھی البتہ نئے ڈھنگ سے ڈرامہ لکھنے والے ہندو اور مسلمان دونوں تھے جتنے ڈرامے لکھے جاتے تھے وہ اردو میں ہی لکھے جاتے تھے کیونکہ اس وقت اردو ہی ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی۔ پٹنہ میں پارسیوں کی گشت کرنے والی تھیٹر کی کمپنیاں آتی رہتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد سید عظیم الدین عرف دمڑی مختار نے جو بہار شریف کے رہنے والے تھے پٹنہ میں ایک تھیٹر کی کمپنی قائم کی۔ تھیٹر خوب چلا اور چلتا کیوں نہیں۔ اس کا قیام تجارتی اصول پر تھا۔ صوبہ کی سب بڑی بڑی جگہوں میں تھیٹر کی کمپنی گشت لگاتی اور شوقینوں سے پیسے

کماتی۔ جب دمڑی مختار کا شوق پورا ہو چکا تو انہیں کے تھیٹر کے ایک مشہور ایکٹر محبوسنامی نے اسی تھیٹر کے سامان سے ایک نئی تھیٹریکل کمپنی پٹنہ میں قائم کی۔ یہ تھیٹریکل کمپنی بھی سولہ آنا تجارتی اصول پر تھی اور صوبہ سے باہر بھی مشہور شہروں کا دورہ کرتی تھی۔ اس زمانہ میں بادشاہ نواب صاحب مرحوم نے اپنی دلبستگی کے لئے پٹنہ میں ایک ڈرامٹک کلب قائم کیا اور اس میں اچھے اچھے ایکٹروں کو نوکر رکھا۔ خود بھی تماشہ دیکھتے اپنے احباب کو بھی تماشہ دکھاتے اور اس طرح اپنا جی بہلانے کے لئے ڈرامہ کلب کے کل مصارف اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ بادشاہ نواب مرحوم کا یہ ڈرامٹک کلب نوجوانوں کے لئے ایک تعلیمی مرکز بن گیا تھا۔ جس میں نوجوانوں کو ڈرامہ میں پارٹ کرنے کی تعلیم دی جاتی اور ان کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ ایک تو تھیٹر کی رنگینیاں کیا کم تھیں اس پر نوجوانوں کی اس طرح ہمت افزائی نے پٹنہ میں اس وقت بہت سے ایکٹر پیدا کر دئے تھے جو مردانہ اور زنانہ دونوں طرح کا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کرتے تھے۔ دیکھا دیکھی پٹنہ میں دو اور ڈرامہ کے کلب قائم ہوگئے۔ ایک ڈرامٹک کلب محلہ کنگھیاٹولہ میں قاضی نجم الدین صاحب مرحوم نے سید محبوب اشرف صاحب مرحوم جو پٹنہ کے بڑے مقتدر رئیس تھے ان کی مدد سے ۱۹۰۵ء میں قائم کیا۔ تھیٹر کے نئے نئے ساز وسامان مہیا کئے گئے اور جب اس کی خبر دوسرے شوقین حضرات کو ملی تو وہ بھی اس کلب کو سولہ آنہ کامیاب بنانے کے لئے چندہ دینے پر تیار ہوگئے۔ یہ کلب بھی دل بستگی کا کلب تھا۔ اخراجات تو بانیان کلب کے ذمہ تھا مگر تماشہ دیکھنے کے لئے کوئی ٹکٹ یا فیس نہ تھی۔ یہاں ایک بات اور بھی تھی کہ اس کلب میں پارٹ کرنے والے صرف اپنے شوق میں پارٹ کرتے تھے اور پیسے نہیں لیتے تھے۔ یہ کلب دوسرے ڈرامٹک کلب سے زیادہ مقبول ہوا۔ ساز و سامان تو بادشاہ نواب صاحب کے کلب کا زیادہ بہتر تھا مگر یہاں پڑھے لکھے پارٹ کرنے والے ایکٹر مل گئے تھے جو اپنی تعلیم کے سبب سے اپنے پارٹ کی ذمہ داریاں خوب سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ کنگھیاٹولے

کا یہ ڈرامٹک کلب چل ہی رہا تھا کہ بادشاہ نواب صاحب کا شوق ختم ہو گیا جس کے نتیجے میں ان کا ڈرامٹک کلب بھی بند ہو گیا۔ لوگوں کو تھیٹر کا چسکہ پڑ چکا تھا اس لئے کچھ شوقینوں نے محلہ بلور گنج میں ایک دوسرے ڈرامٹک کلب کی اس کے بعد ہی بنیاد ڈالی۔ ایکٹروں کی اب پٹنہ میں کمی نہیں تھی۔ بادشاہ نواب صاحب مرحوم کے جن سے سینکڑوں ایکٹر بن چکے تھے۔ بلور گنج کا یہ ڈرامٹک کلب بھی تجارتی اصول پر نہ تھا یہاں بھی تفریح اور دل بستگی ہی صرف مد نظر تھی۔ ہفتہ میں ایک دن تماشہ ہوتا اور شوقین تماشہ بینوں کا ہجوم رہتا۔ چند سال کے بعد یہ ڈرامٹک کلب بھی اور کنگھیا ٹولے کا ڈرامٹک کلب دونوں ختم ہو گئے۔

یہاں کا قصہ پاک ہوا تو بابو شیو نارائن لال نے محلہ کچی گھاٹ میں اپنے مکان میں ایک نیا ڈرامٹک کلب قائم کیا۔ بابو شیو نارائن لال نالدان گنذری میں دیوان کی حیثیت سے ملازم تھے اور لاکھوں روپے سالانہ کی جائداد کا انتظام کرتے تھے۔ بڑے شوقین بھی تھے اور بڑے بے تعصب بھی۔ ان کا ڈرامٹک کلب بھی خوب مشہور ہوا۔ یہ بھی صرف تفریح اور دل بستگی کے لئے قائم ہوا تھا اس لئے امیر، غریب سب کو تماشہ دیکھنے کی اجازت تھی۔ پٹنہ میں اس ڈرامٹک کلب کی حیات کی مدت سب سے زیادہ رہی۔ تقریباً پچیس برس تک یہ کلب چلتا رہا بیچ بیچ میں کچھ دنوں کے لئے اگر بند ہو جاتا تو موقع ملتے ہی بابو شیو نارائن لال پھر اس کو زندہ کرتے۔ جب وہ زیادہ بوڑھے ہو گئے تو ان کے لڑکوں نے اس کو قائم رکھا آخر ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ اس ڈرامٹک کلب نے بھی دم توڑ دیا۔

ان کے علاوہ سونپور کے میلے کے زمانہ میں کبھی کبھی عارضی طور پر تھیٹریکل کمپنی پٹنہ کے کچھ منچلے لوگ کھڑی کر لیتے۔ سونپور کے میلے میں یہ کمپنی بھی خوب روپے کماتی اور جب میلہ ختم ہوتا تو اس تھیٹریکل کمپنی کا وجود بھی ختم ہو جاتا۔

بہروپئے

میرے بچپن کے زمانے تک بہروپئے برسات کا زمانہ چھوڑ کر سال بھر ہر جگہ کا پھیرا لگاتے پھرتے تھے۔ یہ بوڑھے جوان اور بچے سبھوں کے لئے تفریح کا سامان تھے۔ پٹنہ میں بھی بہروپئے تھے اور یہاں دوسرے شہروں سے بھی آیا کرتے تھے۔ زمانہ بدلتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ان بہروپیوں کی تعداد بھی گھٹتی گئی۔ اب تو کئی برسوں سے کسی بہروپئے پر نظر بھی نہیں پڑتی ہے۔ طرح طرح کے سوانگ بھرنا، لوگوں کی شکل و صورت کی نقلیں اتارنا اور وہ بھی اس کمال کے ساتھ کہ جس کی نقل اتارتے اس کا لب و لہجہ بھی اُسی کی طرح کا ہوتا۔ بعینہ اسی کے نشست و برخاست کا طریقہ بھی ہوتا، اس کی عادتیں اور خصلتیں بھی ہوتیں۔ بہروپ کا یہی کمال ہوتا تھا۔ معمولی بہروپئے رات میں بہروپ بدل کر نکلتے تھے۔ کبھی کسی مارواڑی عورت کا بہروپ ہوتا جس کے پہلو میں ایک بانکا ترچھا راجپوت راجپوتی پگڑی سر پر باندھے نیچی چولی کا انگرکھا پہنے پاؤں میں چست پائجامہ اور گھیتلا جوتا، داڑھی چڑھی ہوتے، کمر کے ٹپکے سے ایک طرف تلوار لٹکی ہوئی، دوسری طرف کھانڈ یا پیش قبض لگا ہوا، ایک لجاتی ہوئی دوسرا اکڑتا ہوا دونوں چلے آرہے ہیں۔ عورت کا حسن اگر بھر نظر دیکھنے کو اکساتا ہے تو اس کے ساتھی کی راجپوتی ٹھاٹ کا رعب نظریں جھپکا دیتا ہے۔ یہ بہروپ لوگوں کو بہت پسند تھا۔ ایک بہروپ یہ تھا کہ ایک ہی بہروپ میں دو مختلف آدمیوں کی شکلوں کی نقل اتارنا جس میں ایک رخ کو دیکھئے تو مرد کی نقل نظر آئے دوسرا رخ دیکھئے تو عورت کی شکل دکھائی دے۔ بچوں کو یہ بہروپ بہت لبھاتا تھا۔ اس کو ادھ رنگی کا روپ کہتے تھے۔ اس میں کمال یہ تھا کہ آدھے سر سے پیر تک ایک ساں ایک روپ دوسری طرف سر سے پیر تک دوسرا روپ۔ عام بہروپئے چودہ بہروپ بھرتے تھے۔ روزانہ ایک نیا بہروپ بھرتے اور رؤساء کے یہاں جاتے، پیچھے پیچھے لڑکوں کا گروہ چلتا۔ کسی رئیس یا شریف کا مکان آجاتا تو بہروپئے مکان کے اندر چلے جاتے اور یہ گروہ باہر کھڑا ان کا

انتظار کرتا۔ چودہ بہروپ جب ختم ہو جاتے تو ایک بوڑھی عورت کا روپ بھرتے۔ چہرے پر جھریاں ہاتھوں میں رعشے بڑھاپے کی علامت گردن ہلتی ہوئی، ڈگمگاتے ہوئے قدم، پوپلا منہ، صرف دو دانت سامنے کے نکلے ہوئے۔ لاٹھی ٹیکتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ سامنے آکر ہاتھ اٹھا کر ترقئ حیات اور جاہ و منصب کی دعائیں دیتی اور پھر کہتی سرکار بہروپ ختم ہوگئے۔ یہ بہروپ بھی خوب ہوتا تھا۔ بہروپ دکھا کر رئیسوں سے کافی انعام پاکر یہ بہروپئے چین سے گھر میں بیٹھ کر کچھ دنوں آرام کرتے پھر اپنا دھندا شہر کے دوسری جگہوں میں چلاتے۔

پٹنہ میں امیر جان بہروپیا بہت مشہور تھا۔ یہ جانور کا بھی بہروپ بھرتا تھا۔ اور وہ بھی اس طرح سے سچ مچ جانور ہی معلوم ہونے لگتا تھا۔ پہلی نظر میں پہچان ناممکن تھی کہ یہ جانور ہے یا انسان۔ امیر جان کو میں نے نہیں دیکھا مگر اس کے اکثر قصے لوگوں سے سنے ہیں۔ دیوان محلہ میں ایک ہندو رئیس تھے، بڑے فیاض اور بڑے رنگین مزاج تھے۔ یہ امیر جان کو بہت مانتے تھے ایک دن اس سے کہنے لگے کہ انسان سے مکمل جانور بن جاؤ تو جانیں۔ امیر جان ہنس کر چپ ہو رہا۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد رات کا وقت تھا، رئیس صاحب کے یہاں بزم نشاط گرم تھی، بادہ و جام کا دور چل رہا تھا، ایک طرف مصاحبین بیٹھے تھے دوسری طرف طوائفیں بیٹھی تھیں، ایک طوائف گارہی تھی کہ خوفناک گرج کے ساتھ ایک مہیب شیر اس بزم میں جست کر کے داخل ہوا۔ شیر کی ہیبت سے لوگ سہم کر رہ گئے، کسی کو غش آیا کسی کا پیشاب خطا ہوا، جب مردوں کی حالت یہ تھی تو طوائفوں کا کیا پوچھنا یہ تو عورتیں ہی تھیں۔ ان سبھوں میں ذرا دلیر رئیس ہی صاحب نکلے جن کو غش تو نہ آیا مگر اچھل کر دوسری طرف بھاگے۔ اتنے میں پیچھے سے ہنسنے کی آواز آئی پلٹ کر دیکھا تو میاں امیر جان بہروپئے اپنے بدن سے شیر کی کھال اتار رہے ہیں۔

امیر جان بہروپیا محمد نواب صاحب مرحوم کے یہاں بھی جایا کرتا تھا۔ محمد

نواب صاحب مرحوم میر عبداللہ بانی خاندان گنذری کے پوتے تھے۔ گنذری میں لب سڑک ان کا عالیشان مکان تھا جو کچھ دن ہوئے گرپڑ کر مہاجنوں کے ہاتھ نیلام ہوا۔ اب اس جگہ سیلس ٹیکس کا آفس ہے۔ محمد نواب صاحب وضع داری کے لئے شہر میں مشہور تھے۔ دوستی میں وضع داری اور نشست و برخواست میں وضع داری کھانے پینے میں وضع داری، کیا مجال کسی بات میں کبھی بھی ذرہ برابر بھی فرق آئے۔ ایک دفعہ امیر جان کا ایک بہروپ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کوئی ایسا بہروپ تو دکھاؤ کہ کچھ دنوں سبھوں کو یاد رہے۔ امیر جان نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ سرکار اگر پہلے معافی کا وعدہ فرمالیں تو میں ایک بہروپ بھرنے کی کوشش کروں۔ محمد نواب صاحب نے ہنس کر کہا کہ اچھا تم کو سات خون معاف کئے۔ ایک دن نواب صاحب سامنے اپنے بڑے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے، مصاحبین بھی تھے، احباب بھی تھے اور کچھ ملنے جلنے والے بھی آگئے تھے کہ سامنے پھاٹک سے ایک رئیس اندر آتے ہوئے نظر آئے ساتھ میں چار پانچ مصاحبین جن کے ہاتھوں میں بٹیروں کی کابکیں۔ ان میں ایک مٹھی میں لئے ایک بٹیر کو کس رہا ہے۔ پیچھے پیچھے چار پانچ ملازم۔ ایک چاندی کا پنکھا جھل رہا ہے، ایک کے ہاتھ میں خاصدان ہے تو دوسرے کے ہاتھ میں اگالدان ہے، ایک ملازم کے ہاتھ میں پیدان کی ایک گڑگڑی ہے جس کی لر رئیس کے ہاتھ میں ہے اور یہ رئیس صاحب پیچوان پیتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ جب یہ رئیس کمرے سے ملحق آگے کے سائبان میں پہنچے تو ہر آدمی حیرت زدہ تھا۔ خود محمد نواب صاحب کی حیرت کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی ایک نہیں دو محمد نواب آمنے سامنے تھے۔ دونوں کی شکل و صورت ایک، لباس ایک حتیٰ کہ جس طرح محمد نواب صاحب باہر جاتے تھے اسی انداز میں مصاحبوں کا ان کے آگے پیچھے جھرمٹ، ساتھ ساتھ بٹیروں کی کابکوں کو لے کر چلنا، ملازموں کا اسی طرح پنکھا جھلنا، ملازموں کا ہاتھوں میں خاصدان اور اگالدان لئے رہنا۔ اور ایک ملازم کا پیچوان کی گڑگڑی لئے پیچھے پیچھے چلنا۔ اب کون کہے کہ کون اصلی محمد نواب ہیں

اور کون نقلی۔ جب یہ رئیس کمرے کے اندر آگئے تو محمد نواب صاحب ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے امیر جان واقعی تم نے آج کمال کر دیا۔ امیر جان اور اس کے ساتھیوں نے ادب سے سلام کیا۔ امیر جان نے کہا کہ بے ادبی معاف ہو، یہ تو سرکار کے حکم کی تعمیل تھی۔

محمد نواب صاحب قدر شناس تھے اسی وقت پانچ سو روپے امیر جان کو بہروپ بھرنے کا انعام دیا۔

داستان گوئی

جہاں ہندو اور مسلمانوں کو متحدہ تہذیب اور کلچر نے ایک کر دیا تھا وہاں زبان کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو گیا تھا۔ یہی اردو جو کل تک ہندو اور مسلمان کی مشترکہ زبان تھی آج اپنے ہی لوگوں سے اجنبی زبان ہونے کا طعنہ سن رہی ہے۔ کچھ ہی دن پہلے اس زبان کے شیدائی ہندو اور مسلمان دونوں تھے، یہی کاروباری زندگی میں ان کی ہمنوا تھی، یہی ان کے جذبات کی ترجمانی کرتی تھی، یہی ان کی خانگی زندگی میں کام دیتی تھی، اور یہی ہر صحبت اور ہر مجلس میں ان کی دلچسپی کا ذریعہ تھی طرز معاشرت ایک تھا، رہن سہن ایک تھا اس لئے جو دلچسپیاں مسلمان گھروں میں تھیں وہی ہندو گھروں میں بھی نظر آتی تھیں۔ نشست وہی، آداب مجلس وہی اس لئے دونوں کے باوجود بھی سونے کا وقت آتا تو دماغ کو یکسوئی کی طرف مائل کرنے کے لئے کہانیوں اور داستانوں کا سہارا ڈھونڈھا جاتا۔ اسی لئے اگلے دور میں ہر رئیس کے یہاں، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایک داستان گو بھی ضرور نوکر رہتا تھا۔ داستان گوئی بھی ایک مستقل فن تھا۔ اس کو بھی گذشتہ تہذیب کا ایک جزو سمجھئے۔ جہاں گذشتہ تہذیب گئی یہ فن بھی گیا۔ اگر لکھنؤ اور دلی میں بڑے بڑے داستان گو تھے تو پٹنہ میں بھی اس فن کے جاننے والوں کی کمی نہ تھی۔ داستان گو ہونا آسان بھی نہ تھا۔ اس فن کے حصول کے لئے پڑھے لکھے ہونے کی ضرورت تھی، زبان قینچی کی طرح چلے، ہاتھ پاؤں میں کس بل ہو، رزم بزم

کا نقشہ یوں کھینچے کہ ان کی چلتی پھرتی تصویریں نظر کے سامنے آجائیں، بزم کا بیان ایسا ہو کہ عالم خیال کا پہلو حقیقت کے دامن سے بندھا ہوا معلوم ہو، گل و گلزار کا سماں پیش کرے تو کلیوں کے چٹکنے کانوں میں آنے لگے، معرکہ رزم کی مرقعہ کشی ایسی ہو کہ بقول میر انیسؔ "تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے۔ داستان گو کیلئے پڑھے لکھے ہونے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ اس کو موسیقی کے رموز سے بھی واقفیت ہو۔ سپہ گری کے فن سے بھی کچھ لگاؤ ہوا اور ساتھ ہی ساتھ شاعر و نثار بھی ہو۔ اگر بزم کی تشریح میں بلبل کی طرح چہکے تو رزم کی تفصیل میں بھی شیر ژیاں کی طرح اس کی ڈپٹ ہو۔ بزم کا سماں باندھنا آسان ہے مگر جنگ کی تصویر سامنے کھڑی کر دینا ذرا مشکل کام ہے۔ ایک سپاہی کی ٹھاٹ ہو، رجز کے الفاظ ٹھیک ٹھیک اسی انداز میں زبان سے نکلیں، تیوری پر جنگجوئی کے بل ہوں۔ میتھ کٹی، پالٹ اور بھنڈارے کے ہاتھ فن کی مطابقت میں چلیں تب کہیں جنگ کی تفصیل مکمل ہوتی ہے۔ مدافعت میں یوں پیترا بدل کر وار خالی دے کہ دشمن کا ہاتھ ہوا میں الجھ کر رہ جائے اور گھونگھٹ کھا کر یوں اپنا پہلو بچائے کہ صاف رقیب کا سینہ زد میں آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختصر سے ایک کمرے میں ایک داستان گو کی ایکٹنگ وہ سماں پیش کرتی تھی جو مکمل سین سنیری کے ساتھ کسی وسیع اسٹیج پر کسی ناٹک کمپنی کا مشہور ایکٹر بھی مشکل سے پیش کر سکتا ہے۔ یوں تو میں نے پٹنہ کے چند بڑے داستان گو کے نام سنے، عابد حسین مرزا امامی، رفعت علی وغیرہ مگر میں نے ہوش سنبھالا تو یہ حضرات رخصت ہو چکے تھے۔ باقیات صالحات میں ایک نشتر تھے جو شاعر بھی تھے اور دوسرے مرزا ولایت حسین رہ گئے تھے جن کی داستان گوئی کا شہرہ پٹنہ سے لکھنؤ تک پہنچا ہوا تھا۔ نشتر کی زبان میں روانی بھی تھی۔ شگفتگی بھی تھی مگر ایکٹنگ کی ذرا کمی تھی۔ جس کے بغیر داستان گوئی مکمل نہیں ہوتی پھر بھی داستان اچھی بیان کرتے تھے اور بذلہ سنجی سے محفل کو کشت زعفران بنا دیتے تھے۔ مرزا ولایت حسین بڑے داستان گو بھی تھے۔ بڑے بذلہ سنج بھی تھے، بڑے بیباک مصاحب بھی تھے اور

ہر فن کے مولا بھی تھے۔ زیاراتِ مقامات مقدسہ کے سلسلے میں ایران اور عراق کے اہم مقامات کا ذکر نکالتے تو وہ بھی کسی داستان کا دلچسپ ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ جس قافلہ میں گئے تھے وہ بادشاہ نواب صاحب مرحوم اور ان کے چھوٹے بھائی اور پٹنہ کے دوسرے دولت مند لوگوں کا قافلہ تھا اور سفر میں مرزا صاحب کو اسی سبب سے ہر طرح کی سہولت بھی ملتی گئی تھی۔ سفر کا جب حال بیان کرتے اور قافلہ کے لوگوں کی جب نقلیں اتارتے تو سننے والوں کی ہنسی نہیں رکتی تھی۔ یوں بھی مراز ولایت حسین لوگوں کی بھرپور نقلیں اتارنے میں کمال تھا۔ جس کی نقل اتارتے تو اس میں چہرے کے اتارچڑھاؤ کی مکمل تصویر بھی ابھر آتی، نشست و برخاست کا وہی انداز بھی ہو جاتا اور لب و لہجہ کی نقل تو ایسی کہ یہ پردہ میں ہوں تو جس کی نقل یہ اتاریں تو اس کے گھر والے بھی سمجھ نہ پائیں کہ دوسرا آدمی بول رہا ہے۔ میں نے ان کا وہ زمانہ دیکھا جب اپنے سرپرستوں کے اٹھ جانے سے وہ تنگدستی اور ناقدری کا شکار ہو رہے تھے۔ پھر بھی کچھ ان کے فن کی قدر کرنے والے تھے جہاں سے ان کا گذارہ چلتا تھا۔ دبلے پتلے آدمی، ساونلا رنگ، داڑھی صاف، بڑی بڑی بل کھاتی مونچھیں، چال میں لپک، آواز میں غضب کی کڑک۔ سامنے سے چلے آرہے ہیں " آداب عرض کرتا ہوں میاں " آئے کچھ لطیفہ کچھ چٹکلا شروع کردیا تھے تو اپنی ناقدری کا رونا رونے لگے۔ گذرے ہوئے زمانے کا قصہ بیان کرتے تو اس میں داستان کا ہی لطف ملتا۔ مٹھائی کے بڑے شائق تھے۔ آتے تو ان کے لئے کچھ مٹھائی بھی آتی۔ اگر رات کا وقت ہے تو مٹھائی کے ساتھ ملائی بھی آگئی۔ دیکھتے ہی خوش ہوگئے ہزاروں دعائیں دیں۔ جب سے افیون کی ڈبیا نکالی، نوکر سے ایک پیالی مانگی اور روئی میں افیون لپیٹ کر اس کا مشیرہ لگانے لگے۔ پہلے افیون کی چسکی لگائی، پھر ملائی کھائی، اس کے بعد مٹھائی پر پل پڑے۔ اتنے میں چائے پی کر فراغت کی تو جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر دھڑا دھڑ سگریٹ کا کش لگانے لگے۔ میں پوچھتا کہ " یہ افیون کیا اپنے مقررہ وقت کی افیون ہے؟ جواب دیتے "

نہیں میاں وہ تو الگ ہے"۔ ملائی بغیر افیون مزہ نہیں دیتی۔ اس وقت کی افیون تو فالتو رہی اب اس کی قیمت بھی آپ کو دینی ہوگی۔ مدک اور چانڈو پہلے چلتا ہوگا مگر مرزا صاحب کی خوش حالی اور ان کے قدر دانوں کے ساتھ اس کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اس کے علاوہ نہ وہ اگلے جیسے مدک خانے تھے اور نہ چانڈو خانے۔ اس لئے افیون کی چسکی ہی پر اکتفاء کرتے تھے۔ رمضان شریف کے روزے پابندی کے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب رمضان میں تو دن کی افیون حذف ہوتی ہوگی۔ پھر اس سے آپ کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ ہنسکر کہنے لگے "میاں میں دن کی افیون کا سحری کھاتے وقت ہی سامان کر لیتا ہوں"۔ میں نے پوچھا "کیسے؟" تو بولے "نماز فجر کے تھوڑی دیر قبل سحری کھاتا ہوں اور دن میں افیون کھانے کی جتنی مقدار ہوتی ہے اس سے ذرا زیادہ ہی پہلے اس کو روئی میں پھر کاغذ میں لپیٹ کر نگل جاتا ہوں۔ دن میں ٹھیک میرے افیون کھانے کے وقت تک روئی اور کاغذ گل جاتے ہیں اور افیون اپنا کام شروع کر دیتی ہے"۔ ایک دفعہ پٹنہ کے ایک رئیس کے ساتھ لکھنؤ گئے۔ ان کی داستان گوئی کا سہرا آگے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ پٹنہ کے ایک دوست لکھنؤ کے ایک نواب صاحب نے کھانے پر اپنے یہاں رئیس کو اور مرزا صاحب کو مدعو کیا۔ کچھ اور احباب لکھنؤ کے اچھے داستان گو بھی وہاں موجود تھے۔ جب کھانے سے فراغت ہوئی تو نواب صاحب نے مرزا صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ کسی داستان کا کوئی ٹکڑا سنائیں۔ اپنے رئیس کی ایماء پاکر مرزا صاحب نے جو داستان شروع کی وہ داستان لن دھور کے جنگ کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس وقت جنگ کے بیان پر پہنچے اور لندھور بن سعدان کی جنگ کا نقشہ کھینچنے لگے تو یہ عالم تھا کہ سبھوں کی آنکھیں مرزا صاحب پر لگی ہوئی تھیں۔ اور مرزا صاحب بنا بنا کر وہ وار کر رہے تھے کہ کچھ لوگ بیخبری میں اپنا پہلو بچانے لگے۔ لڑائی کا وہ سین کہ لندھور نے اپنے مدمقابل کو گرز کی ضرب سے پست کیا اس تصویر کشی پر آئے تو ایک داستان گو جو قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے سہم کر آہ کی اور گھبرا کر الٹ گئے۔

ان کی آہ اور گھبراہٹ نے داستان گوئی کا سارا طلسم توڑ دیا۔ مرزا صاحب چپ ہو گئے۔ تو حاضرین کو ہوش آیا اور لکھنؤ کے وہ داستان گو جو گھبرا کر الٹ گئے تھے مرزا صاحب کے قدموں سے لپٹ گئے اور کہنے لگے کہ آج داستان گوئی کرتا ہوا بڑے داد ستان گوئی کی عظمت اور اس فن کا کمال آپ کے تصدق میں دیکھا۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر مرزا صاحب کو کافی انعام دیا اور مصر ہوئے کہ لکھنؤ میں ان کے ساتھ رہیں۔ مگر یہ پٹنہ کب چھوڑنے والے تھے۔ راضی نہ ہوئے ۱۹۳۶ء میں یہ مرے تو پٹنہ سے داستان گوئی بھی اور اس کا فن بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔

کنکوے کا شوق

یوں تو جاڑے کے دنوں میں کنکوے اڑتے تھے اور مقابلے کے لئے کنکوے بازوں کے درمیان میدان بدے جاتے تھے مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ دوسرے موسموں میں جب بھی ہوا قابو میں ہونے کے قابل معلوم ہوتی تو شوقین حضرات کنکوے اڑاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ کنکوا اڑانا کھیل لغو سہی مگر دماغ کی یکسوئی کے لئے اس سے بہتر کوئی علاج نہیں ہے۔ پھر اس میں چلت پھرت سے پاؤں کی ورزش ہوتی ہے اور ڈوروں کی کھینچ تان سے ہاتھوں میں بھی کافی سکت بڑھ جاتی ہے۔ کنکوا کو پٹنہ میں تلنگی کہتے ہیں اور ساخت میں یہ کنکوے سے ذرا مختلف بھی ہوتی ہے۔ پتنگ کو بڑا کنکوا سمجھ لیجئے۔ ڈور اس کی تلنگی اور کنکوے کی ڈور سے کچھ موٹی رکھتے ہیں تاکہ قد کے لحاظ سے اس پر جو ہوا کا زور اور دباؤ پڑتا ہے اس کی ڈور نہ ٹوٹے۔ پتنگ اڑانے کا عام رواج بھی نہیں اور اس پر اتنا قابو بھی نہیں ہوتا جو کنکوے یا تلنگی پر ہوتا ہے۔ کنکوابازی کے لئے لکھنؤ اور دلی کے ساتھ پٹنہ بھی اگلے زمانے میں بہت مشہور تھا۔ یہاں بھی اس کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ صرف امیر ہی نہیں غریب بھی اس شوق میں مبتلا تھے۔ سبھوں سے بڑھ کر تو چھوٹے بچے کنکوے اور تلنگی کے لئے مچلتے رہتے تھے۔ بڑے، بوڑھے بھی بچوں سے کم نہ تھے۔ کوئی کنکوا کٹ کر آیا اور یہ باوجود اپنی پیرانہ

سالی کے اس کو لوٹنے کے لئے دو چار قدم دوڑ پڑے کنکوا اڑانا یوں دیکھنے میں تو آسان ہے مگر جو اصلی انداز اور طریقہ کنکوا اڑانے کا ہے اس میں کچھ دنوں مشق کی ضرورت ہے۔ انگلیوں کے اشارے پر ہوا میں بل کھاتے ہوئے اس کو بلند کرنا ڈور کے سہارے پر جدھر چاہیں اس کو موڑنا، حریف کے کنکوے کے ڈوروں میں اپنے کنکوے کے ڈور سے پیچ ڈال کر تیزی کے ساتھ اپنی طرف گھسیٹنا اور اپنے کنکوے کو آڑا ترچھا کر کے اپنے کنکوے کے ڈور سے حریف کے کنکوے کے ڈور پر نظر لگانا یہ سب باتیں مشاق کنکوا باز کے ہنر پر موقوف ہیں۔ پٹنہ میں کنکوا بازی کے میچ ہوتے، اس کے لئے میدان بدلے جاتے، ہر میچ کے لئے سو سو روپے کی بازیاں لگتیں۔ لکھنؤ اور دلی سے کنکوے کے شوقین آتے اور پٹنہ والوں سے ان کے خوب خوب مقابلے ہوتے۔ پٹنہ کے کنکوے یہاں تلنگی کہلاتے ہیں، وہ لکھنؤ کے کنکوے سے ذرا ساخت میں مختلف تو ہوتے ہی ہیں یہاں کنکوا اڑانے کا انداز بھی مختلف ہے۔ لکھنؤ اور دلی کے کنکوے لڑانے والے ڈور ہاتھوں میں لے کر انگلیوں اور ہاتھوں کے اشارے کنکوا لڑاتے اور گھسیٹتے ہیں۔ ڈور الگ سے آگے لپٹے رہتے ہیں۔ پٹنہ والے اچکوں پر سوت کے باریک اور مضبوط دھاگے اور ریشم کے بٹے ہوئے نخ، جو بہت باریک ہوتے ہیں، ان کو لپیٹتے ہیں۔ پھر انگلیوں کے سہارے سے تلنگی کو ہوا میں بلند کر کے اچکے کو جس میں تلنگی کا دھاگا یا ڈور لپٹا ہوتا ہے ہاتھوں میں ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں جس سے تلنگی ہوا کے زور پر آگے بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اچکے سے ڈور کی لپیٹیں کھلتی جاتی ہیں۔ جب تلنگی کو اپنی طرف گھسیٹنا ہوتا ہے تو اچکے کے سرے پر جس ہاتھ کی طرف اس کا سرا ہوا اسی ہاتھ کی ہتھیلی اور انگلیوں سے تھپکیاں دیتے ہوئے ڈور کو اچکے پر طرح لپیٹتے ہیں کہ اچکا تیزی سے گھومتا جاتا ہے ڈور سمٹ سمٹ کر اچکے پر لپیٹتے چلے آتے ہیں۔ اچکے پر ڈور لپیٹنے کا انداز اتنا نچا تلا ہوتا ہے کہ جس طرف چاہیں تلنگی کو موڑ بھی لیں اور جتنا تیز چاہیں اپنی طرف گھسیٹ بھی لیں۔ کنکوے یا تلنگی کے ڈور بھی پٹنہ میں لکھنؤ اور دلی کے ڈور

سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں مانجھا کئے ہوئے ڈور بازاروں میں نہیں بکتے بلکہ یہاں کے امیر اور غریب ، سبھی ریشم کے دھاگے ہوں جن کو نخ کہتے ہیں یا سوت کے دھاگے ہوں سبھوں پر اپنے انداز سے مانجھا چڑھاتے ہیں۔ سوت کے دھاگے جو ڈور کا کام دیتے ہیں وہی ہوتے ہیں جن کو درزی سلائی میں استعمال کرتے ہیں۔ ریشمی دھاگے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو ریشم کا تانا بانا جس سے ریشم کے کپڑے بنے جاتے ہیں اور ریشم کے پھول کاڑھے جاتے ہیں۔ یہ بہت باریک ریشم کا دھاگا ہوتا ہے اور کچھ کمزور بھی ہوتا ہے۔ دوسری قسم نخ کہلاتی ہے ریشم کے بانے کے دھاگے کو ملا کر بہت باریک بانٹتے ہیں جو بانے سے ذرا سا موٹا پھر بھی سوت کے دھاگے سے باریک ہی رہتا ہے اس کو ڈور کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ نخ کہلاتا ہے۔ اگلے زمانے میں سینکڑوں اس طرح سے ریشم کے بانے بانٹ کر نخ بنانے والے کاریگر پٹنہ میں تھے۔ اور یہی ان کا روزگار بھی تھا۔ میری یاد میں میر کلو صاحب محلّہ لودی کٹرہ میں رہتے تھے۔ ان کے ہاتھ کے بٹے ہوئے نخ بہت مشہور تھے۔ ہر شوقین کے یہاں سے ان کے پاس فرمائشیں آتیں اور سال بھر وہ نخ بانٹ کر تیار کیا کرتے۔ خود تلنگی کے بڑے شوقین تھے۔ بہت سے شوقین ایسے بھی تھے جو اپنے ہاتھوں سے کنکوے اور تلنگیاں دونوں خود بناتے تھے۔ اور اپنے لئے نخ خود بانٹ کر تیار کرتے تھے۔ ان میں صاحب مقدرت رئیس بھی تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں ایسے دو شوقینوں کو دیکھا۔ ایک میر کفایت حسین صاحب مرحوم تھے جو میرے ایک عزیز قریب پٹنہ کے مشہور رئیسوں میں تھے اور محلّہ لوڈی کٹرہ میں رہتے تھے دوسرے ننّا صاحب موجؔ مرحوم تھے۔ یہ سب تلنگی اڑانے کے دنوں میں گھر سے نکلتے تو ان کے ہاتھوں میں بانس کی تیلیاں ہوتیں اور تیز قلم تراش سے تلنگی کی کانپیں چھیلتے جاتے۔ تلنگی یا کنکوے کی کانپوں کو چھل کر تیار کرنے میں بھی اہتمام برتا جاتا۔ عمدہ عمدہ بانس چُنے جاتے۔ اچھا کاریگر بڑھئی اُن سے تیلیاں بناتا پھر ان تیلیوں سے یہ شوقین حضرات اور پیشہ ور تلنگی بنانے والے کانپیں

بناتے۔ جب کانپیں بن کر تیار ہو جاتیں تو شوقین حضرات کڑوے تیل میں ان کانپوں کو ڈبو کر سال بھر رکھتے تاکہ ان میں تیل جذب ہو جائے، ان میں لچک پیدا ہو جائے اور تیل پی کر یہ مضبوط ہو جائیں۔ کنکوے یا تلنگی اڑانے کا موسم آتا تو انہیں کانپوں پر کنکوے یا تلنگی کا ڈھانچہ قائم کرتے تھے۔ اس زمانے میں عمدہ سے عمدہ کنکوایا تلنگی چار آنے سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھی۔ یوں تو اچھے کنکوئے اور تلنگیاں ایک پیسے میں چار اور چھ تک بکتی تھیں۔ مگر بچوں کی تلنگیاں ایک پیسے میں آٹھ ملتی تھیں۔ شوقینوں کے کنکوے اور تلنگیاں جنہیں وہ خود بناتے جب وہ کٹتی تھیں تو ان کی لوٹ پر عوام جان دیتے تھے۔ کم سے کم آٹھ آنے نہیں تو ایک ایک روپے دیکر شوقین ان کو لوٹنے والوں سے خریدتے تھے۔ جاڑوں میں شہر سے لگے ہوئے دریا کے حصوں میں گنگا کے دریا سے نکل آتے تھے۔ میلوں پورب پچھم چٹیلی دریاوں میں تلنگیاں اڑتیں اور خوب مقابلے ہوتے۔ شوقینوں اور تماشہ بینوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ اس کے علاوہ رؤسا اور شرفاء اپنے مکانوں کے کوٹھوں سے اور اپنے مکان کے وسیع احاطے سے بھی کنکوے اڑاتے اور آس پاس کے دوسرے رئیسوں اور شریفوں سے پیچیں لڑاتے۔ آپس میں بھی مقابلے کے میدان بدلے جاتے تھے۔ اس میں دو پارٹیاں ہو جاتیں، ہر پارٹی میں چار چار پانچ پانچ مشاق ہوتے۔ ایک ایک ہفتہ تک ایک میچ یا مقابلہ چلا جاتا۔ کنکوے کی دلدادہ طوائفیں بھی تھیں۔ شام ہوئی اور ان کے کوٹھے چھتوں سے رنگ برنگ کے کنکوے اور تلنگیاں اڑنی شروع ہو جاتیں۔ عاشق مزاج رئیسوں سے پیچوں کی تاگ داگ چلتی، پیچیں بھی لڑتیں اور ان کے چاہنے والے کنکوے کے ذریعہ سے ان کے کوٹھوں پر اپنا پیغام محبت بھی بھیجتے۔ کنکوے پر مطلب کے اشعار لکھتے اور جب یہ کنکوے طوائفوں کے کوٹھوں تک پہنچتے تو اندازہ لگا کر کنکوے کو ایسا غوطہ دیتے کہ ٹھیک انہیں کے کوٹھے پر کنکوا یا تلنگی چھت کی سطح تک پہنچ جاتی۔ ادھر سے اسی چابکدستی سے محبت کے جواب ملتے۔ میرے محلّہ (صدر گلی) میں بسم اللہ نامی کنکوا بازی میں بڑی شہرت رکھتی

تھی۔ بڑے بڑے مشاق کنکوے باز اس سے پیچ لڑانے میں کتراتے تھے۔ جیسی کنکوے بازی میں کامل تھی ویسی ہی ناچ کے فن میں بھی مشہور زمانہ تھی۔ اس کے مور کا ناچ دور دور تک مشہور تھا۔ بعینہ معلوم ہوتا تھا کہ مور ناچ رہا ہے۔ حسین بھی تھی۔ جب ناچتے ناچتے جذبات میں بھر جاتی تو اس کا حسن بھی نکھر آتا تھا۔ ۱۹۰۹ء کے لگ بھگ کی بات ہے ایک نوجوان زمیندار دیہات سے پٹنہ آئے یہاں کے اس وقت کے ماحول میں پڑے تو گھر کو بھول گئے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ یہ بھی پتنگ اور کنکوے اڑاتے اور دو چار سو دوستوں کے ساتھ دل بہلاتے تھے۔ مچھوہٹہ کے قریب ایک مکان میں قیام تھا۔ اس کنکوے بازی کے سلسلہ میں ایک طوائف اختری بائی کے ساتھ رسم و راہ پیدا ہوئی، دو تین مہینوں تک کنکوے کے ذریعہ سے اپنا پیغامات بھیجے جاتے رہے۔ اُدھر سے کبھی انکار کبھی اقرار محبت ہوتا۔ نیا شکار تھا۔ دام محبت مضبوطی کے ساتھ اس کے گرد کسا جارہا تھا۔ یہ سیدھا دیہاتی زمیندار لوٹ پوٹ ہوجاتا تھا۔ آخر کوچہ جاناں تک کنکوے بازی کے بہانے رسائی ہوئی۔ دو برس تک یہ زندانی محبت گھر بار سے بیگانہ ہوکر یہیں پٹنے میں پڑا رہا۔ زمینداری بڑی تھی، گھر پر ماں اور بیوی تھی اور ان کے علاوہ ملازمین تھے۔ یہ سب پریشان ان کی راہ تکتے تھے۔ انتظامات زمینداری بھی درہم برہم ہورہے تھے مگر یہ صاحب دربار جاناں کو چھوڑ کر گھر جانے کو تیار ہی نہیں تھے۔ آخر ان کی والدہ پٹنہ آئیں اور بہو کو بھی ساتھ لائیں یہاں سب حال کھلا۔ بیوی محبت اور شرافت کی پتلا تھی پہلے تو اپنی ساس کو راضی کیا پھر اپنی طرف سے اس طوائف کے پاس اپنے شوہر کے ساتھ نکاح کا پیغام بھجوایا۔ نکاح پر میاں تو پہلے سے ہی تیار تھے جب طوائف راضی ہوئی تو یہیں پٹنہ میں نکاح ہوا۔ اس کے بعد یہ قافلہ اپنے گاؤں واپس گیا۔ زمیندار صاحب کا ۱۹۴۲ء میں انتقال ہوا۔ مجھ سے کافی ملاقات تھی اگرچہ وہ سن میں مجھ سے بہت بڑے تھے مگر مجھے برابری کا درجہ دے رکھا تھا۔ خود اپنی داستان محبت بڑے مزے میں ہنس ہنس کر سناتے تھے۔ زمیندار صاحب کی دونوں بیویوں سے

اولادیں ہیں اور یہ سب آج کل پاکستان میں اچھی حالت میں ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کی دوسری بیوی پہلے طوائف تھی۔

شیوراتری ہندوؤں کا مقدس پرب ہے۔ اس زمانے میں کنکوے اور تلنکیاں انگنت اُڑتی تھیں۔ ان دنوں کے لئے خاص طور سے ڈوروں یا مانجھے کئے جاتے، رنگ برنگ کے کنکوے اور تلنکیاں بازاروں میں بکتیں۔ جو کنکوے بازی سے کنارہ کر چکے ہوتے وہ بھی دو چار دنوں کے لئے پھر اپنے اچکے سنبھالتے۔ کنکوے اور تلنکیاں کثرت سے اُڑتیں کہ بلا مبالغہ اگر آسمان کو دیکھتے تو تلنکیاں ہی نظر آتیں۔ عام طور سے شیوراتری کے دنوں میں ابر گھر آتا ہے، کبھی تھوڑا بہت آسمان سے ترشح بھی ہو جاتا ہے۔ ان دنوں اودے اودے بادلوں کے چاروں طرف ہر رنگ کے کنکوے اور تلنکیاں عجیب بہار دیتی تھیں۔

چانڈو خانے

یہ کتنا صداقت سے بھرا ہوا مصرع ہے "جو خال اپنی حد سے بڑھا وہ مسا ہوا" اسی طرح جو چیز حد اعتدال سے بڑھی وہ اپنی نفع بخشی کھو بیٹھی اور مصیبت و لعنت بن گئی۔ افیون کا استعمال آج بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔ حکمت کی دواؤں میں یہ بڑی کار آمد اور زوراثر سمجھی جاتی ہے۔ طب یونانی تو بہت پہلے ہی سے اس کے استعمال کی اجازت یہ کہہ کر دیتی آئی ہے کہ "خود مرض و جملہ مرض رادواست" انگریزی طب بھی اکثر امراض کے علاج میں اس کا سہارا لیتا رہا ہے۔ اس کی نفع اسی حالت میں ممکن ہے جب مخصوص حالتوں میں اس کے استعمال کی ضرورت سمجھی جائے اور اس کے اوزان اور اوقات استعمال میں اعتدال برتا جائے۔ صرف نشہ لانے کے لئے اعتدال کی حد سے گزرا ہوا اس کا استعمال قوائے انسانی پر قیامتیں ڈھاتا ہے۔ اچھے خاصے توانا اور پہلوان صفت آدمیوں کو اس کے استعمال کی زیادتی بے بس و ناتواں بنا دیتی ہے۔ اور بڑے چوکس اور ہوشیار انسان پنک لیتے ہیں۔ اس کے روز افزوں

مقدار کی زیادتی اور اس کی عادت کی غلامی اعصاب کو اس طرح ڈھیلا کر دیتی ہے کہ افیون کا استعمال کرنے والوں کی شکلیں دیکھئے اور ہنسئے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بڑے بڑے سپہ سالاروں اور بادشاہوں نے بھی اس کی مزادلت رکھی۔ اکبر اعظم کے بارے میں بھی یہی مشہور ہے مگر شہنشاہ جہانگیر کے متعلق تو تاریخی شہادتیں ہیں کہ وہ بھی افیون کھاتا تھا۔ نواب معتمد خان جو اس کا چہیتا جنرل تھا اس سے جہانگیر ایک دفعہ خفا ہو گیا اور اس کی سزا یہ تجویز کی کہ ایک دن کے لئے معتمد خان کو افیون کے استعمال سے محروم رکھا جائے۔ مشہور انگریز ادیب و مفکر ڈیکوئنسی بھی افیون کھاتا تھا۔ ایسی اور بھی نامی شخصیتیں ہیں جو افیون کی عادی تھیں۔ مگر یہ سب لوگ اعتدال پسند تھے اور ان کے سامنے زندگی کے بہت سے اہم پروگرام بھی تھے جن کو وہ ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے اور اسی سبب سے افیون کے استعمال میں اعتدال برتتے تھے ہندوستان میں حکومت کا انحطاط شروع ہوا تو پے درپے سیاسی ناکامیوں نے طبعیتوں کو مضمحل کرنا شروع کیا، مایوسی بڑھی اور قوائے عمل میں تعطل آیا تو فرائض زندگی سے فرار کی راہیں ڈھونڈھی جانے لگیں۔ کسی نے غم دنیا اور غم سلطنت کو یہ کہہ کر جام شراب میں ڈبویا "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ" اور کچھ ایسے بھی ہوتے جنھوں نے فقہہ کی تھوڑی بہت آڑ لیکر افیون کی غم دنیا مٹانے والی پنک میں اپنے غموں سے نجات کی بہاریں ڈھونڈ نکالیں۔ جب بڑے لوگ اس کے عادی ہوئے تو ان کے متوسلین میں بھی یہ مرض پھیلا اور عمومیت کے جواز سے ہر جگہ چنڈو خانے اور مدک خانے کھل گئے۔ پٹنہ میں بھی پچاسوں چانڈو خانے قائم تھے جہاں کچھ شرفاء بھی مگر زیادہ تر عوام جاکر چانڈو پیتے، مدک کے دم لگاتے اور افیون کی چسکیاں اُڑاتے۔ امراء کے یہاں چانڈو، مدک اور سادہ افیون پینے پلانے کا خاص انتظام رہتا تھا اور اس کام کے لئے ملازم رکھے جاتے تھے جو چانڈو اور مدک کے قوام افیون سے تیار کرتے تھے۔ قرینہ کے ساتھ چانڈو اور مدک چلاتے اور سادہ افیون کو پیالیوں میں گھول کر چسکیوں کے لئے پیش کرتے۔

چانڈو اور مدک امراء تنہا نہیں پیتے تھے۔ ان کے حلقے میں دو چار مصاحبین بھی ہوتے، دو چار اس کے رسیا بھی تاک لگا کر وقت پر پہنچ جاتے۔ ایک خاص کمرہ مخصوص رہتا تھا جہاں گول حلقہ بنائے تکئے کے سہارے چانڈو پینے والے پڑے ہیں، بیچ میں ایک طشت پر چانڈو کے قوام کی بوتل رکھی ہے، چراغ روشن ہے اور چانڈو کی نقالی پر پینے والوں کی آنکھیں لگی ہیں۔ چانڈو اور مدک کے قوام بڑے اہتمام سے بنتے تھے۔ دونوں کے بنانے کی ترکیب بھی الگ الگ تھی۔ افیون کو آگ پر پگھلا کر اس میں امرود کے پتوں کے عرق ڈالتے دو ایک چیزیں اور بھی ملاتے کہ اس کی تلخی کچھ کم ہو۔ قوام میں پھر بھی افیون پندرہ آنے ہوتی تھی باقی اجزاء بیش از بیش ایک آنہ سے زیادہ نہیں ڈالے جاتے تھے۔ چانڈو پینے کے لئے دو سوفٹ لانبی اور دو انچ گول عمدہ بانس یا عمدہ کاٹھ کی نے ہوتی ہے جس کے ایک سرے کے اختتام پر دو انچ اوپر سوراخ کر کے پیتل یا چاندی کے سرپوش نما چلم نصب کرتے ہیں۔ اس کے بیچ میں بھی سوراخ ہوتا ہے جو اس سوراخ سے متوازی ہوتا ہے جس میں چلم نصب ہوتی ہے۔ اس چلم میں افیون کا قوام تقریباً ڈیڑھ یا دو ماشہ ایک دفعہ بھرتے پھر بازو کے بل لیٹ کر چلم کو چراغ کی لو پر رکھتے اور ہلکا اور لانبا کش لگاتے جس سے افیون کا قوام جل اٹھتا۔ اس کے دھواں کو پھیپھڑوں میں بھر کر منہ اور ناک سے باہر پھینکتے۔ اس طرح ایک بار چانڈو پیا جائے تو ایک چھینٹا کہلاتا ہے اگر چار پانچ چانڈو پینے والے جمع ہوتے اور پانچ چھینٹوں کا دور چلتا تو کم از کم ایک گھنٹہ تو لگ ہی جاتا۔ پانچ چھینٹوں میں نشہ جمنا چاہیئے مگر پینے والے تو دس چھینٹوں تک ایک نشست میں پہنچ جاتے تھے۔ عام طور پر چانڈو پینے کے دو وقت تھے، صبح اور شام کا وقت مگر ایسے بھی لوگ تھے جو رات اور دن میں چار دفعہ چانڈو پیتے اور اس کے علاوہ افیون گھول کر چسکیاں بھی لگاتے۔ یہی وہ لوگ ہوتے تھے کہ بوڑھے ہونے کے قبل کار از رفتہ ہوجاتے تھے جن کے نس نس میں افیون رچ جاتی تھی اور جن کے چہرے پر مسکین ان کے افیونی ہونے کا اعلان کرتی رہتی۔

مدک پینے کا طریقہ دوسرا تھا ناریل کے گول اور لمبوترے حصے میں سراسر پولی ہوتی اس کے درمیان ایک طرف سوراخ کر کے لانبی سی نے نصب کرتے پھر ناریل کے سرے پر اوپر کی جانب بھی دوسرا سوراخ کرتے۔ اس میں بھی کاٹھ کی لانبی نے لگاتے۔ پھر اس میں افیون کا گاڑھا قوام اوپر والی نے کے سر پر جماتے، پھر لوہے کے چمٹے سے اس پر تھوڑی سی آگ دہکتے ہوئے کوئلے کی رکھتے۔ قوام پر آگ رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ دم لگاتے اور منہ سے دھواں چھوڑتے جاتے، قوام جل جاتا تو ناریل کے پیندے کو زمین پر اس انداز سے پٹکتے کہ قوام کا سلفا نے کے سوراخ سے نکل کر دور جاکر گرتا۔ بچوں کے لئے یہ تماشہ کی چیز ہوتی۔ میرے بچپن میں میرے یہاں ایک بوڑھا مشعلچی تھا۔ اس کے تعلق تمام زنانہ اور مردانہ مکان کی روشنی کا انتظام تھا۔ دیوار گیروں میں، بیٹھکیوں میں اور لالٹینوں میں مٹی یا رینڈی کا تیل بھرتا۔ ان کے شیشے صاف کرتا اور تمام کمروں میں ان کو روشن کر کے پہنچاتا۔ زنانہ مکان کی روشنیاں ماماؤں کے ذریعہ سے اندر بھجواتا۔ اس بوڑھے مشعلچی کا نام خورشید تھا۔ صبح میں اور شام میں جب اس کو روشنیاں جلانے کے بعد فراغت ہوتی تو یہ دونوں وقت اس کے مدک کے دم لگانیکے تھے۔ دیوار کے سہارے پالتھی مار کر یہ بڑے میاں بیٹھ جاتے، مدک کے قوام کی شیشی سامنے رکھی ہوتی، ایک چھوٹی طشتری میں پتلی چپٹی لوہے کی ایک تیلی اور لوہے کا چیونٹا رکھا ہوتا۔ پاس ہی مٹی کی ہانڈی میں دہکتے ہوئے کوئلے ہوتے۔ یہ مدک کی ناریل کو ہاتھ میں لیتے اس کی اوپر کی نے میں قوام بھرتے اس پر سے ایک دہکتا ہوا کوئلہ چیونٹے سے پکڑ کر اس پر رکھتے اور آستہ آہستہ لانبا کش لگاتے۔ جب افیون کا قوام جل کر سلفا ہو جاتا تو ناریل کے پیندے کو اس مزے میں فرش زمین پر اس انداز سے تھپکی کے انداز میں پٹکتے کہ سلفانے سے نکل کر دور جا گرتا۔ میں کھڑا تماشہ دیکھتا تو مجھ سے کہتے "دیکھتے جایئے میاں یہ توپ کا گولہ بڑھتے بڑھتے اب لندن پر جا کر گریگا"۔ ایک دن میں نے بچپن کی شوخی میں خورشید سے کہا کہ ذرا مجھے بھی تو ایک دفعہ مدک

کا ایک چھینٹا پلاؤ۔ کہنے لگے کہ میاں پہلے یہ شعر سن لیجئے۔

کھودیا حسن مدک نے ستم ایجادوں کا

اڑ گیا رنگ دھواں بن کے پریزادوں کا

پہلی دفعہ یہ شعر میں نے بوڑھے خورشید سے سنا اس کے بعد تو مدک کی مذمت میں کتابوں میں بھی پڑھا اور دوسرے لوگوں سے بھی سنا۔

افیونیوں کے قصے در قصے ہزار ہیں مگر ان کی تصویر کشی جس طرح پنڈت رتن ناتھ سرشار نے کی ہے اور چانڈو خانے کا جو اہتمام انھوں نے دکھلایا ہے اس کا جواب نہیں۔ فسانہ آزاد میں میاں خوجی کی کردار نگاری سچ پوچھئے تو فن کردار نگاری کا بہترین شاہکار ہے۔ پھر بھی یہاں کے چانڈو خانے کا کچھ حال اور افیونیوں کے دو ایک قصے سن لیجئے۔ پٹنہ میں بھی پچاسوں چانڈو خانے تھے جہاں جاکر چانڈو اور مدک کے رسیا افیون پینے پلانے کے ہر صیغہ میں ماہر اور خرانٹ چانڈو باز ہوتا تھا۔ ہر چانڈو خانے کے دو طرح کے گاہک ہوتے تھے۔ ایک تو وہ جو کچھ دیر کے لئے آگئے، دو چار چھینٹے چانڈو اور مدک کے اڑائے اور افیون کے پینے اور پلانے کی اجرت چانڈو خانے کے مالک کے ہاتھ پر رکھے اور چلے گئے۔ ان میں شرفاء بھی ہوتے جو کسی سبب سے گھر پر چانڈو کا سامان اور اس کا جھمیلا رکھنا چاہتے تھے اور چھپ چھپ کر چانڈو خانے میں آکر چانڈو کے دم روزانہ دو دفعہ لگا جاتے تھے۔ اصل میں یہ جگہ ان لوگوں کے لئے تھی جن کے لئے گھر پر چانڈو کا سب سامان مہیا کرنا مشکل تھا۔ پینے کی سہولت بھی اور جھنجھٹ سے ان کی نجات بھی اسی میں تھی کہ سیدھے چانڈو خانے پہنچے؛ چانڈو کے کش لگائے اس کے بعد یا تو گھر گئے یا یہیں اپنی طرح کے دو چار افیونیوں کے ساتھ پڑ رہے۔ بڑی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ افیون تو افیون چانڈو کی لعنت میں مبتلا کچھ عورتیں بھی جو بے پردہ بازاروں میں آتی جاتی تھیں وہ بھی چانڈو خانے میں آکر چانڈو اور مدک کے دم لگا جاتی تھیں۔ اس لئے پردہ ڈال کر الگ تھوڑی سی جگہ بنی ہوتی تھی چونکہ

چانڈو خانے کا مالک بوڑھا اور از کار رفتہ بھی ہوتا تھا اس لئے ایسی عورتوں کو وہاں جانے میں جھجک نہیں ہوتی تھی۔ یہ البتہ تھا کہ وہاں چہرے پر برقعہ ڈال کر جاتی تھیں کہ کوئی پہچان نہ لے۔ دوسری طرح کے گاہک وہ ہوتے تھے جو چانڈو خانے میں مستقل ڈیرہ جما لیتے تھے۔ ان کی گذر بسر کی دو صورتیں تھیں، یا تو گھر سے ان کے پاس پیسے آجاتے یا چانڈو خانے کے آس پاس کا مدانی کا یا کوئی اور ہلکا پھلکا دن میں کام کرتے اور جو پیسے کماتے وہ افیون اور چانڈو خانے کی نذر کر دیتے۔ ان کا کھانا پینا بھی چانڈو خانے کے مالک کے تعلق ہوتا تھا جس کے پیسے بھی وہ چانڈو کی قیمت کے ساتھ وصول کر لیتا تھا۔ ایسوں کے قریب دنیا کی کوئی فکر بھی پھٹکنے نہیں پاتی تھی۔ کبھی جی میں آتا تو دو چار دن پر گھر ہو آتے۔

نہ معلوم افیون کے استعمال میں کیا بات ہے کہ جس افیونی کو میں نے دیکھا اور وہ جتنا زیادہ افیون کا رسیا نکلا اس کی زبان اتنی ہی گل افشاں نظر آتی۔ روایت اور درایت کی پابندیوں کا ان کے یہاں ذکر کیا۔ یہ تو خود داستان گر ہوتے تھے۔ معمولی واقعہ یا بیان بھی ان کی زبان سے داستان امیر حمزہ، فسانۂ عجائب اور بہار دانش کا لطف دیتا تھا۔ باتوں میں مبالغہ آمیزی تو افیونیوں کے جوہر میں داخل ہے۔ جب افیون کا نشہ جمتا تو پھر دیکھیے۔ "انداز گل افشانیٔ گفتار"۔ ان کی طبعیت کی جولانی فلک الافلاک تک پہنچنے لگتی۔ مگر یہ بھی تھا کہ جب ان کا نقشہ ٹوٹنے لگتا تو ان کے بے کسی کی حالت اور ان کی صورت کی مسکینی پر بے اختیار ہنسی آجاتی۔ اس وقت ان کے چہرے سے نقاہت اور لاچاری کی تصویر جھلکتی، آنکھ اور ناک سے پانی جاری رہتا، بجائے حلق کے ناک سے منمنا کر آہستہ آہستہ بولتے۔ ان سب کا علاج وہی افیون کی چسکی یا چانڈو کے دو چار کش تھے۔ چسکی چڑھائی یا چانڈو کے دو چار کش لگائے اور دم کی دم میں ان کی دنیا بدلتی ہوئی نظر آئی۔ خرانٹ افیونیوں کی روزانہ کی زندگی میں تین دور ہوتے ہیں۔ ایک تو چسکی چڑھانے یا چانڈو یا مدک کے دم لگانے کا دور، پھر نشہ جمنے کا دور جس کے بعد وہ باہوش انسان بنتے ہیں اور تیسرا دور ان پر وہ گذرتا ہے جب نشہ ختم ہونے لگتا ہے۔ پہلا اور

تیسرا دور جو گذرتا ہے وہ ہے جو آپ سن چکے اب ذرا دوسرے کے متعلق بھی سن لیجئے۔ جب افیونی افیون کی چسکی چڑھا چکا یا چانڈو یا مدک کے دم لگا چکا ہوتا ہے تو یہ وقت نقشہ جمنے کا ہوتا ہے جس میں وہ گردش زمانہ سے بے نیاز، افکار و حوادث سے بیگانہ اور اپنے ماحول سے بھی بے پروا، بے خیالی کی دنیا میں کبھی جھکولے لیتا ہے اور کبھی دونوں گھٹنوں کے درمیان سرڈال کر خراٹے بھرتا ہے مگر آنکھیں نیم واہی رہتی ہیں۔ پتلیاں عجیب انداز میں اوپر نیچے تنی ہوئی دکھلائی دیتی ہیں اور منہ مضحک طریقہ پر کھلا ہوتا ہے یہ حالت "پنک" کہلاتی ہے اور اسی میں افیونی نشہ اندوز ہو کر اپنے قلب مطمئن کا نقشہ بھی پیش کرتا ہے۔ میرے یہاں ایک منشی تھے وہ افیون بھی کھاتے تھے اور کبھی موقع مل جاتا تو چانڈو کے دم لگانے کے لئے چانڈو خانے کی سیر بھی کر آتے تھے۔ گھر پر جب افیون کھا کر نشہ جماتے اور پنک لیتے تو وہ اونگھتے تھے۔ میں کبھی ایسی حالت میں ان کے پاس جاتا اور ان کو اونگھتے ہوئے دیکھتا تو کہتا کہ منشی جی یہ کیا آپ تو اونگھ رہے ہیں۔ وہ پٹ سے آنکھیں پورے طور پر کھولتے اور کہنے لگتے۔ میاں یہ کیسی تہمت آپ مجھ پر رکھ رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ میں کیوں اونگھنے لگا۔ پھر ہزاروں قسمیں کھاتے کہ وہ ہرگز نہیں اونگھتے ہیں۔

میرے بچپن کے زمانے میں ایک صاحب محمد حسین نامی گنذری پر کہیں رہتے تھے۔ کھاتے پیتے آدمی تھے اور پڑھے لکھے بھی تھے، یہاں کے روساء اور شرفا کے پاس ان کی برابر نشست رہتی تھی۔ والد مرحوم کے پاس بھی آتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں ایک دن صبح میں آئے تو صاحب سلامت کے ساتھ ہی ان پر ہنسی کا دورہ پڑا ہنستے جاتے ہیں اور کچھ کہنا چاہتے ہیں تو ہنسی کے مارے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا ہے۔ والد مرحوم پوچھ رہے ہیں کہ بھئی کیوں اس قدر ہنسی رکے جب ہی تو یہ جواب دیں۔ آخر پانچ دس منٹ کے بعد یہ دورہ ختم ہوا تو بولے "ابھی ایک بڑا مزیدار تماشہ دیکھ کر آرہا ہوں؟۔ پھر یہ قصہ بیان کرنے لگے " آج سویرے ہی صبح کا ناشتہ کر کے گھر سے

چلا کہ اپنے دھوبی کو کہہ آؤں کہ آج جمعہ کا دن ہے دھے دھلائے کپڑے گھنٹے دو گھنٹے میں ایک گھر دے آئے۔ اس سلسلے میں گورہٹہ پہنچا سڑک کے دکھن کی طرف جو ایک بڑا پھاٹک بنا ہوا ہے اس سے لگا ہوا سڑک کے مقابل میں ایک چانڈو خانہ بھی ہے جہاں چانڈو پینے والے رات میں اڈہ جمائے رہتے ہیں۔ پھاٹک ہر وقت کھلا رہتا ہے کیونکہ اس کے اندر جاکر کشادہ زمین میں متعدد کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ جو کہ کرایہ پر اٹھی رہتی ہیں۔ ان میں سے دو کوٹھریوں میں دھوبی رہتا ہے۔ میں پھاٹک کے اندر داخل ہونے لگا تو میں چانڈو خانے پر نظر پڑگئی۔ دیکھا کہ چانڈو خانے کا مالک چولہے کی آگ پر کیتلی میں چائے گرم کر رہا ہے اور چار پانچ افیونی میلے کچیلے فرش پر پڑے سو رہے ہیں۔ میں دھوبی کو گھر پر دھلے ہوئے کپڑے دے آنے کی تاکید کر کے واپس لوٹا تو اس وقت چانڈو خانے کا مالک افیونیوں کو یہ کہہ کر جگا رہا تھا کہ یارو اٹھو اب صبح ہوگئی اور افیونی پڑے پڑے آنکھیں بند کئے ناک کی راہ سے منمنا کر اس سے یہ کہہ رہے تھے کہ ارے یار کیوں دق کرتا ہے صبح کہاں ہوئی ہے۔ یہ تماشہ دیکھنے کے لئے میں پھاٹک کے پاس ہی کھڑا ہوگیا۔ اب چانڈو خانے کے مالک نے ایک ٹوٹے پھوٹے طشت پر چار پانچ میلی پیالیاں رکھیں، ہر ایک پیالی میں ایک میلے کچیلے گھڑے سے پانی ڈالا اور یہ طشت افیونیوں کے پاس لے جاکر ان کو جنجھوڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا " لو پیالیاں سنبھالو اور دیکھو صبح ہوگئی"۔ ہر افیونی نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک ایک پیالی پکڑی، اس کو تھامے ہوئے مشکل سے اٹھ کر بیٹھے مگر ہر ایک کی آنکھیں ابھی تک تھیں۔ جب یہ بیٹھ چکے تو پھر ہر ایک نے اپنی اپنی پیالی میں اپنے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں ڈالیں اور ان کو پانی سے تر کر کے اشہدان لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے ان دونوں انگلیوں کو اپنی آنکھوں پر پھیرا اور پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور منمنا کر کہا کہ ہاں سچ مچ صبح ہوگئی۔ ادھر چولہے کے پاس چنڈو خانے کے مالک نے پوچھا یارو منہ دھو چکے؟ جواب ملا میاں بھیا منہ دھو چکے اب جلد چائے پلاؤ"۔ یہ کہہ کر سبھوں نے اپنی جیبوں سے افیون کی ڈبیہ نکالی۔

اس میں افیون کے ساتھ روئی بھی تھی۔ کالی کالی افیون کو ذرا سی سفید روئی میں لپیٹ کر اپنی پیالیوں کے اسی پانی میں جس سے انھوں نے اپنے خیال میں اپنا منہ دھویا تھا افیون گھولنے لگے۔ اتنے میں چنڈو خانے کے مالک نے کہا "پیالیاں جلد خالی کرو"۔ افیونیوں نے جلد جلد چسکیاں لگائیں اور پکارے کہ "پیالیاں جلد لے جاؤ"۔ اب چائے آگئی۔ میٹھی میٹھی چائے کے گھونٹ سے افیون کی تلخی کو دور کرتے ہوئے ہر ایک نے اپنی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ایک آنہ پیسہ جیب سے نکالا اور چانڈو خانے کے مالک سے کہنے لگے "ذرا تازی تازی جلیبیاں تو لے لو منہ کڑوا ہو رہا ہے"۔ ادھر چانڈو خانے کا مالک جلیبیاں لانے گیا۔ ادھر میں بھی چلا تماشہ ختم ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت سے یہ عالم ہے کہ وہ رہ کر ان افیونیوں کے منہ دھونے کا سماں جب پیش نظر آتا ہے تو ہنسی روکے نہیں رکتی ہے۔ والد مرحوم بھی قصہ سن کر خوب ہنسے، میں بھی وہیں پر تھا مجھے ہنسی آتی رہی۔

کچھ ایسے بھی افیون کے استعمال کرنے والے تھے جن کے چہرے مہرے سے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ بھی افیون کا شغل رکھتے ہیں مگر ایسے لوگ وہی تھے جو اعتدال کے ساتھ افیون کا استعمال کرتے تھے اور جس مقدار میں شروع کرتے تھے اس مقدار کو قائم رکھتے تھے۔ میرے بڑے ماموں مولوی سید عبدالمجید صاحب کے ملازم خاص عالم میاں کے متعلق کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ بھی افیون کھاتے ہیں۔ ساٹھ باسٹھ کی عمر ہوگی۔ سر، داڑھی اور مونچھوں کے بال سفید ہوگئے مگر جوانوں کی طرح چاق و چوبند تھے ۔ جاڑا اور گرمی اور برسات ہر موسم میں الصباح اٹھتے، دریا میں جاکر غسل کرتے اور اس کے بعد فجر کی نماز پڑھتے، پھر کام میں لگ جاتے۔ میرے والد مرحوم کی بیماری میں جب تیمارداری اور خدمت ان کے تعلق ہوئی تو بڑی مستعدی اور تند ہی سے مسلسل تیمار داری اور خدمت ان کے تعلق ہوئی تو راز میرے والد مرحوم نے کھولا۔ انہیں بھی پتہ نہ چلتا اگر عالم میاں کا اخیر شب میں افیون کا نشہ پھیکا نہیں پڑنے لگتا۔

یہی وقت افیونیوں کے لئے کٹھن ہے جبکہ طبعیت مضمحل ہو کر افیون کا نشہ ڈھونڈھتی ہے۔ جب یہ رازِ کھلا تو عالم میاں نے بھی ہنسکر اس طرح کہا کہ "سرکار کی بیماری نے آخیر میرا بھانڈ پھوڑ ہی دیا۔ مظفر پور میں ایک بڑے رئیس تھے، پڑھے لکھے بڑے ممتاز، صاحب ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ وہ بھی چانڈو پینے کے عادی تھے مگر بہت کم لوگ جانتے تھے وہ اس کا شغل کرتے ہیں۔ کسی بات سے اس کی علامت ظاہر نہ تھی۔ ان کے چانڈو پینے کے اوقات بندھے ہوئے تھے۔ سونے کے کمرے میں چھپا ہوا سامان چانڈو کا رکھا رہتا تھا۔ خاص وقت کمرے میں جاتے چار پانچ چھینٹے لگاتے اور باہر نکل آتے۔ اگر ریل کا لانبا سفر ہوتا تو وقت معین پر ان کا ملازم غسل خانے کے ڈبہ میں ان کا سامان جو بکس میں بند رہتا رکھ آتا تھا یہ وہاں دس پندرہ منٹ رہ کر اپنے شغل سے فارغ ہوتے۔

اگلے زمانے میں افیون کی بہتات اور فراوانی نے لوگوں کو ان کا عادی بنا دیا تھا۔ دیہاتوں میں عام طور سے پوستے کی کاشت ہوتی تھی جس سے افیون نکلتی ہے۔ زمینداروں کے یہاں گھروں میں ان کے مواضعات سے افیون آتی تھی۔ بازار میں اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ چار آنے تولہ تھی۔ غریب بھی خرید کے افیون کھاتے مدک اور چانڈو کے قوام بناتے۔ امیروں کا کیا پوچھنا۔ ان کے یہاں یہ سدابرت کی طرح تقسیم بھی ہوتی تھی اور ان کے ساتھ لگے بجھے لوگ مفت میں اوقات مقررہ پر ان کے ساتھ عمدہ عمدہ غذائیں بھی کھاتے اور افیون کا بھی شغل کرتے۔ پھر بھی جتنا مشہور ہے اتنا افیون کا استعمال عام نہ تھا۔ لوگ اس کے استعمال کو حقارت اور مضحکے ہی کی نظر سے دیکھتے اور اس کی لعنت اور اس کی بدنامی سے بھاگتے تھے۔ روپے میں بیش از بیش ایک آنہ آبادی اس کی عادی ہو تو ہو۔ حضرت شاہ ارزاں کے آستانے کے فقیروں اور وہاں ڈیرہ جما کر رہنے والے لنگوٹ بندوں کے لئے پہلے درگاہ ہی سے افیون مفت روزانہ حسب ضرورت ملتی تھی، پھر جب انگریز حکومت نے افیون پر لائنس لگایا تو ان لوگوں کے لئے سال میں ایک من افیون حکومت سے مفت ملا کی۔ یہ مقدار گھٹتے گھٹتے سال میں دس پانچ سیر تک پہنچی اور اب ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد یہ بھی بند ہے۔

چانڈو خانے اور مدک خانے پہلے ہی بند ہو چکے تھے۔ صرف چسکی لگانے والے یا کچی افیون کھانے والے افیون کے شیدائی باقی تھے۔ وہ بھی بدلتے ہوئے ماحول میں افیون کھانے کی مقدار گھٹانے پر مجبور ہوتے گئے۔ افیون دس بارہ روپئے تولہ تک جاکر پہنچی تھی۔ اور مشکل سے مہینہ میں دو تولہ افیون کا پرمٹ حکومت سے ملتا تھا اور ادھر زیادہ وہی فلاکت زدہ لوگ تھے جن کے پاس پیسے نہیں تھے۔ افیون نہ ملنے کے سبب سے کتنے جاڑے سے اکڑ کر مر گئے، کتنے دوسری بیماریوں کا شکار ہوکر عدم کو سدھارے۔ جن میں کچھ سکت باقی تھی انھوں نے تکلیف اٹھاکر اور جبر سہہ کر اس عادت سے چھٹکارا پایا۔ پھر بھی دو چار سخت جان افیونی جو افیم کو حرز جان بنا کر بچ رہے تھے، ان کو دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ عالم نزع میں دم توڑ رہے ہیں۔ اب تو افیون کسی قیمت میں بھی بازار میں نہیں ملتی ہے۔ افیونی کیا گئے رنگین بیانی اور شوخ زبانی محفل سے اُٹھ گئی اور داستان گوئی جو انہیں افیونیوں کے دم سے قائم تھی افسانہ بنکر رہ گئی۔

ورزش اور سپہگری

میاں غلام حسین

موجوزہ نصاب تعلیم میں ورزش بھی داخل ہے تاکہ دماغی نشو و نما کے ساتھ جسمانی نشو نما بھی اچھی ہو۔ اس کے لئے جگہ جگہ جمنازیم ہیں، اسکولوں اور کالجوں میں اس کے لئے ورزش عمل کا الگ انتظام ہے تاکہ ہر طرح کے کھیل سے بدن میں چستی آئے اور طاقت بڑھے۔ ورزش کی تعلیم کے لئے تعلیم گاہوں میں معلم بھی مقرر ہیں۔ پھر بھی دیکھئے تو جمنازیم میں خاک اڑ رہی ہے، لڑکوں کو سیاست اور تماشہ بینی سے فرصت کہاں کہ ورزش کی طرف توجہ دیں۔ کچھ لڑکے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ کتاب کا کیڑا بنے ہوئے صرف کتابیں چاٹ رہیں ہیں۔ دوچار ہی ہوں گے جو شوق سے جمنازیم میں جاتے ہوں۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت ورزش کا شوق عام

تھا۔ یہ اچک کود والی ورزش نہیں بلکہ پہلوان اور مکمل سپاہی بنانے والی ورزشیں تھیں جو شریف مرد کی زینت سمجھی جاتی تھیں۔ بزرگوں کو دیکھ کر لڑکوں کو بھی شوق ہوتا تھا بلکہ ہر بزرگ بچوں میں یہ شوق خود پیدا کرتا تھا۔ شروع سے ہی یہ بات بچوں کو ذہن نشیں کرائی جاتی تھی کہ اچھے ہاتھ پاؤں کا سجیلا نوجوان مردانہ حسن کا مالک سمجھا جاتا ہے اور یہ کہ جس طرح مکتب کی تعلیم ضروری ہے اسی طرح کچھ دیر کے لئے اکھاڑوں میں جاکر ورزش کرنا بھی اہم اور ضروری ہے۔ صرف ورزش ہی نہیں فن سپہگری کی تعلیم کا بھی پورا خیال رکھا جاتا تھا کہ وقت پڑے تو مدد کے لئے دوسروں کو پکارنے کی حاجت نہ ہو۔ ہر محلے میں اکھاڑے بنے ہوئے تھے، کہیں ایک کہیں دو۔ ان میں محلے کے بچے اور نوجوان علی الصباح اکھٹے ہوتے، الگ الگ سب ورزش کرتے۔ اکھاڑے کا خلیفہ بیٹھا ہوا ورزش کی ترکیبیں بتاتا جاتا۔ ورزش ختم ہوتی تو بھلکے پر نوجوانوں کو کشتی کا داؤں پیچ بتاتا، پھر ان کو زور کراتا۔ یہ دم پکانے کا خاص طریقہ تھا، اس سے بدن میں زور بھی بڑھتا تھا اور کسی بل بھی زیادہ ہوتا تھا۔ نوجوان ورزش کرنے والے، بچوں کو داؤں پیچ سکھاتے تھے اور زور کراتے تھے۔ یہ سب صبح کے وقت اکھاڑے میں دو گھنٹہ ورزش کرلیتے تو کاروبار میں لگتے۔ بہت سے اکھاڑے اپنے خلیفہ یا وہاں کے نامی استاد کے نام سے منسوب ہوتے تھے۔ جو نامی استاد یا خلیفہ ہوتے تھے ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جاتی تھی جن میں خود بڑے نامی پہلوان بھی ہوتے تھے۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جو زور و قوت اور نام و نمود میں اپنے استاد سے بھی بڑھ جاتے تھے مگر اس کے باوجود بھی جب اکھاڑے میں آتے تو پہلے استاد کے پاؤں چھوتے اور مؤدبانہ اس کے سامنے بیٹھے رہتے۔ استاد بھی ایسا ہوتا تھا کہ بڑے تو بڑے معمولی شاگردوں کی بھی دل جوئی کرتا رہتا اور اپنی اولاد کی طرح ان سے محبت کرتا۔ استاد کی عظمت اور ان کا احترام بھی اکھاڑوں میں دیکھنے کی چیز تھی۔ امیروں اور رئیسوں کے یہاں ورزش کے لئے عمدہ اکھاڑے ہوتے اوز ورزش گاہیں ہوتیں جہاں یہ خود بھی ورزش کرتے اور

تعلیم کے لئے اچھے اچھے پہلوان نوکر رکھتے جو انہیں بھی اور ان کے بچوں کو بھی زور کراتے اور پہلوانی کے داؤ پیچ سکھاتے۔ ان کے یہاں خاص ان کی ورزش گاہ کے علاوہ عام ورزش گاہ یا اکھاڑہ بھی ہوتا تھا جن میں ان رئیسوں اور امیروں کی ایماء پر محلے کے شریف نوجوانوں اور بچوں کو بھی ملازم پہلوان ورزش اور کشتی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اکثر رؤسا ایسے بھی تھے جو صرف اپنے یہاں نہیں بلکہ محلے میں بھی عوام کے لئے اکھاڑے قائم کرتے اور وہاں کے اخراجات اور اس اکھاڑے کے خلیفہ یا استاد کی ضرورتوں کو پورا کرتے رہتے۔ سب سے بڑی بات ان اکھاڑوں میں وہاں کی بے تعصبی تھی۔ پہلا سبق جو ورزش کرنے والوں کو جو دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ اکھاڑے میں آکر وہ بھول جائیں کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ایک استاد کے شاگرد ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے اور میں نے خود دیکھا ہے کہ ان استاد بھائیوں میں جو محبت اور مروت آپس میں ہوتی تھی وہ مسلمان بھائی بھائی میں اور ہندو بھائی بھائی میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ استاد اپنے ہندو اور مسلمان شاگرد کا باپ سمجھا جاتا تھا اور اس طرح وہ بھی چاہے ہندو ہو یا مسلمان اپنے شاگردوں کو بلا تخصیص مذہب اپنی اولاد ہی سمجھتا تھا۔

باہر سے نامی پہلوان آتے تو یہاں کے پہلوانوں سے مقابلہ کے لئے اپنی جوڑ لکھواتے۔ پچاس روپے سے لیکر دو ہزار کبھی کبھی چار پانچ ہزار تک کی جوڑیں لکھی جاتیں رئیسوں اور امیروں کے یہاں تعلیم دہی کے علاوہ یوں بھی متعدد پہلوان ملازم رہتے تھے جن کے کھانے پینے کے اخراجات کے علاوہ ان کی ضرورت کے لئے بھی ان کو مشاہرے دئے جاتے تھے۔ اس سے ریاست کی متان دکھائی بھی مقصود تھی اور اس فن کی سرپرستی بھی اس سے ہوتی تھی۔ پہلوان کی شہرت سے مالک رئیس کی بھی شہرت ہوتی تھی اور ان پہلوانوں کو دیکھ کر عوام میں ورزش کا شوق اور بھی تیز ہوتا تھا۔ محلے کے ہر اکھاڑے میں کشتی کے مقابلہ کا ہفتہ میں ایک دن مقرر تھا۔ اور اس کو دنگل بھی کہتے تھے۔ سنیچر کے دن ہر اکھاڑے میں چھوٹے چھوٹے دنگل ہوا کرتے

تھے۔ کشتیوں کے درمیان ڈنکے بجتے رہتے۔ اسی سبب سے پہلوانوں کے آگے بڑھنے کا یہ زینہ ہوتا تھا۔ در حقیقت ابھرتے ہوئے نوجوان سے ان کی جھجک مٹتی اور ان کی خامیاں ان کی نظر کے سامنے آجاتیں اور اس طرح باہر سے آنے والے پہلوانوں سے مقابلہ کے لئے زمین ان کے لئے تیار کی جاتی۔ اگر ان دنگلوں میں کوئی نوجوان برابر کشتیاں نکالتا چلا جاتا تو اس کی ہمت بھی بڑھتی جاتی اور خود اعتمادی کے ساتھ وہ بڑے پہلوانوں کے ساتھ کشتیاں لڑنے کے قابل بن جاتا۔ بڑی بڑی کشتیوں کے دنگل میں یہاں کے شرفاء اور رؤسا جج مقرر ہوتے تھے۔ ان پر ہر ایک کو بھروسہ تھا کیونکہ یہ فن کے خود ماہر ہوتے تھے۔ اور ذی حیثیت اور صاحب عزت ہونے کے سبب سے کسی کی پاسداری کی ان کے یہاں گنجائش نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بانک بنا گتکا لاٹھی اور تلوار کے تعلیم کے لئے بھی رؤسا کے یہاں بڑے بڑے استاد نوکر رکھے جاتے تھے۔ عام لوگوں میں بھی ان کے سیکھنے کا شوق تھا بلکہ پہلوانی سے زیادہ ان کے سیکھنے پر زور دیا جاتا تھا۔ ان کے سیکھنے میں مزید فائدہ یہ تھا کہ کشتی کے داؤ پیچ تو نہیں مگر چلت پھرت کے سبب سے ہاتھ پاؤں میں قوت آتی تھی، دم پچتا تھا اور بدن میں کس بل بھی پیدا ہوتا تھا۔

پٹنہ میں تو بہت سے نامی اکھاڑے اور ان کے نامی خلیفہ اور استاد تھے جو پہلوانی میں پٹنہ کے قرب وجوار میں مشہور تھے اور جن کے شاگرد بھی بڑی تعداد میں تھے مگر میں نے چند اکھاڑوں کے نام بڑی عزت کے ساتھ لئے جاتے ہوئے سنے۔ ایک تو مرچائی گنج کا اکھاڑہ تھا جہاں کے رام اسیس مصرا استاد اور خلیفہ تھے بعد میں میر کھجو صاحب استاد یہاں کے خلیفہ ہوئے۔ یہ اپنے وقت کے پٹنہ میں جگت استاد سمجھے جاتے تھے اور دوسرا مشہور اکھاڑہ بھولن خلیفہ کا گذری بازار میں تھا۔ تیسرا اکھاڑہ پھگنی پانڈے کا تھا۔ پھگنی پانڈے بھی اور بھولن خلیفہ بھی صوبہ سے باہر ہندوستان کے نامی پہلوانوں میں اور استادوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں گنی جاتی تھی۔ چوتھا مشہور اکھاڑہ بیگم پور کے نزدیک تھا۔ اس کو بڑا اکھاڑہ کہتے

تھے۔ شیو پرشاد دوبے یہاں کے خلیفہ تھے۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ہندوستان کے سب سے بڑے اور اب سے نامی غلام پہلوان ایک دفعہ پٹنہ آئے۔ یہ بھولن خلیفہ کے بڑھاپے کا زمانہ تھا مگر پھر بھی ہر جگہ مشہور تھے۔ غلام پہلوان پٹنہ آئے تو انہیں کے یہاں انھوں نے قیام کیا۔ شہر میں دھوم تھی کہ غلام پہلوان آئے ہیں۔ صبح میں اپنے شاگردوں سے زور کرتے تھے۔ ان کے زور کرنے کا تماشہ دیکھنے کے لئے اکھاڑے میں خلقت امنڈ پڑتی تھی۔ یہاں رؤسا، شرفاء اور باہر سے بھی آئے ہوئے کشتی کے شائقین اور ماہرین کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ایک ہفتہ یہاں غلام پہلوان اور ان کے ساتھ ان کے دس بارہ شاگردوں کا قیام رہا۔ شاگرد سب بھی نامی تھے جن کی جوڑ کا کوئی پہلوان نہ پٹنہ میں تھا اور نہ صوبہ کے کسی دوسرے شہر میں۔ غلام پہلوان ایک ہفتہ کے قیام میں نذرانۂ عقیدت کے ہزاروں روپے لے گئے مگر ایک نوجوان خبطی پہلوان کو مستقل پاگل بھی بنا گئے۔ انہیں دنوں ایک نوجوان کو کشتی کا شوق چرایا تھا۔ بھولن خلیفہ کے اکھاڑے میں اس نے نام لکھایا ان کا شاگرد ہوا اور ورزش کرنے لگا۔ معمولی ہاتھ پاؤں اور زور و طاقت کا نوجوان تھا۔ اس لئے اکھاڑے میں بھی اس کا معمولی درجہ تھا مگر اپنے کو سبھوں سے اونچا سمجھتا تھا، لوگ اس کا مذاق اڑانے کے لئے اس کی ہاں میں ہاں بھی ملاتے تھے اور اس طرح اس کے خبط کو بھی بڑھاتے رہتے تھے۔ غلام پہلوان آئے تو بھولن خلیفہ سے اس نے ڈرتے ڈرتے یہ خواہش ظاہر کی کہ استاد میں بھی غلام سے زور کروں گا۔ عام طور سے دوسرے استادوں کے شاگرد کسی دوسرے پہلوان سے زور نہیں کرتے ہیں۔ یہ بھی آداب پہلوانی میں داخل ہے۔ بھولن خلیفہ نے اسی بنا پر اس کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ غلام سے زور کرنے کی کیا تک ہے۔ ہاتھ پاؤں میں کس بل نہیں اور چلے ہو غلام سے زور کرنے۔ یہ بات اس کو پسند نہ آئی اور سبھوں سے یہی کہتا پھرا کہ میں تو محض ادب اور لحاظ سے غلام سے زور کرنے کی بات کرتا تھا نہیں تو میں ان سے زور و طاقت میں کم ہوں۔ اکھاڑے کے لوگ بھی غضب تھے۔ سبھوں نے اس کو بیوقوف

بنانے کے لئے اس کی تائید بھی کر دی۔ پھر تو اس نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ غلام سے ایک پکڑ لڑنا چاہتا ہوں۔ ایک دن صبح میں غلام اپنے شاگردوں کو زور کرا رہے تھے کہ یہ دنگل میں جا پہنچا اور کہنے لگا کہ استاد میری تمنا ہے کہ دو چار منٹ آپ میرا زور بھی دیکھ لیں۔ بھولن خلیفہ وہیں پر موجود تھے انھوں نے پھر اس کو ڈانٹا۔ اس پر جب وہ چپ ہو گیا تو غلام، جو اخلاق مجسم تھے کہنے لگے میاں آجاؤ اپنی تمنا پوری کر لو۔ یہ کپڑے پھینک لنگوٹ اور جانگیہ کھینچ کر اکھاڑے میں کود ہی پڑا۔ غلام کے شاگرد الگ ہٹ گئے۔ اس نے غلام سے ہاتھ ملایا سب لوگ حیران یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں کہ اس خبطی کو کیا سوجھی ہے۔ غلام میں اور اس خبطی نوجوان میں آسمان اور زمین کا فرق تھا۔ غلام اپنا زور روکے ہوئے تھے اور یہ پلا ہوا ان سے لپٹ رہا تھا۔ دو تین منٹ کے بعد غلام نے کہا بھئی تم سے لڑنا آسان نہیں ہے اب بس کرو۔ اس کا دل اور بھی بڑھ گیا کہنے لگا استاد ابھی داؤں پیچ کہاں ہوئے ہیں، ذرا اس معمولی داؤں کو تو روکئے۔ نہ معلوم غلام کے دل میں کیا بات آئی کہ سبھوں نے دیکھا کہ اس کے معمولی داؤں کو روکنے کے بجائے غلام خود بخود آہستہ سے پھلکے پر نیچے آگئے اور ان کا نیچے آنا تھا کہ یہ اپنے خیال میں ان پر چھا گیا۔ غلام پڑے ہوئے مسکراتے رہے اور تماشہ بیں بھی ہنستے رہے۔ اتنے میں اس نے لنگوٹ ہاتھ میں دے کر غلام پہلوان کو چت کرنا چاہا تو وہ کروٹ بدل کر خود چت ہو گئے اب کیا تھا خبطی نے قہقہہ لگا کر شور مچایا کہ وہ مارا وہ مارا اور یہ بکتا ہوا اکھاڑہ میں چاروں طرف ناچنے لگا۔ پہلے تو سبھوں نے یہی سمجھا کہ غلام کے اس مذاق کو یہ نوجوان بھی سمجھ گیا ہوگا مگر جب اس کی شوریدگی بڑھی اور وہ مارا وہ مارا کہتا ہوا بازار میں نکل آیا اور سڑکوں پر دوڑنے لگا تو غلام بھی اور بقیہ لوگ بھی اس کی اس حالت پر گھبرا گئے کہ مذاق ہی مذاق میں یہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا اور حقیقت میں ہوا بھی یہی تھا۔ اس دن سے اس کی ہمیشہ کے لئے یہی حالت رہی کہ سڑکوں پر کہتا پھرتا تھا کہ میں نے غلام کو پچھاڑ دیا۔

غالباً ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کے ایک اور بڑے نامی پہلوان بڑے کریم اپنے شاگردوں کے ساتھ پٹنہ آئے۔ محلّہ ٹیڑھی گھاٹ میں میرے ماموں مولوی سید عبدالمجید صاحب مرحوم کے یہاں ان کا قیام ہوا۔ مولوی عبدالمجید صاحب کو بھی ورزش کا بڑا شوق تھااور اکھاڑہ بھی بڑا عمدہ تھا، زور کرانے کے لئے میر کھجو صاحب بھی نوکر تھے۔ جب بڑے کریم پٹنہ آئے تو ان کی ورزش اور زور کرنے کے طریقے کا تماشہ دیکھنے کے لئے شہر کے بڑے بڑے رؤسا شرفاء اور کشتی کے شائقین کو مجمع لگا رہنے لگا۔ ایک ہفتہ پٹنہ میں ان کا قیام رہا۔ ان کی جوڑ کا کوئی پہلوان سوائے غلام کے ملک بھر میں نہ تھا۔ دونوں کی طرف سے مقابلہ کا اعلان کئی بار ہوا مگر نہ معلوم دونوں کی کشتی کیوں نہ ہو سکی اس وقت تک پٹنہ میں ورزش اور کشتی گیری کا شوق باقی تھا۔ بوڑھے جوان اور بچے سب اکھاڑے میں جاتے تھے اور ورزش کرتے تھے اس کے بعد سے ورزش کا انحطاط بھی شروع ہوا۔

میر کھجو صاحب پٹنہ کے ایک شریف گھرانے کے فرد تھے۔ بچپن سے پہلوانی کا شوق تھا اور اس میں انھوں نے کمال بھی حاصل کیا۔ غالباً رام اسیس مصر کے شاگرد تھے اسی لئے بعد میں ان کی جگہ پر مرچائی گنج کے مشہور اکھاڑے کے خلیفہ بھی بنائے گئے پٹنہ میں میر کھجو صاحب کے شاگردوں کی بڑی کافی تعداد تھی، ہندو بھی مسلمان بھی اور رئیس بھی عوام بھی، ان کی جوڑ کا کوئی پہلوان آس پاس کے دوسرے شہروں میں نہ تھا۔ بڑے منکسر مزاج، خدا ترس اور ملنسار بھی تھے۔ چھوٹے بڑے سب سے جھک کر ملتے، رعونت اور غرور مزاج میں ذرہ برابر نہ تھا۔ ان کے شاگردوں میں جہاں شہر کے بڑے شور پشت اور نامی بدمعاش تھے وہاں شہر کے بہت سے معزز شرفاء اور رؤسا بھی تھے۔ سب ان کی قدر کرتے تھے بڑے بڑے بدمعاش اور غنڈے ان کو بابا کہتے تھے اور ان کے سامنے بڑے مسکین بنے رہتے تھے۔ دوسرے اکھاڑوں کے پہلوان بھی ان کا بہت ادب کرتے تھے اور ان کے ساتھ بڑے خلوص واحترام سے پیش آتے۔

۱۹۰۰ء کا یہ واقعہ ہے کہ پٹنہ سیٹی میونسپلٹی کا انتخاب ہو رہا تھا میر کھجو صاحب مرحوم

بھی ایک امیدوار کے ہمدرد تھے۔ ان کے سبب سے ان کے تمام شاگرد بھی اس امیدوار کی مدد کر رہے تھے۔ ان کی ہمدردی اور ان کے شاگردوں کی مدد کا یہ اثر تھا کہ فریق مخالف جو خود بھی ایک رئیس تھے ان کی طرف کوئی ووٹر رخ نہیں کرتا تھا۔ ووٹ کا وقت ختم ہو رہا تھا وقت کی کمی کے سبب فریق مخالف جو تھے وہ غصہ میں بھرے ہوئے پولنگ بوتھ کا چکر لگا رہے تھے۔ ان صاحب کو سب سے زیادہ غصہ میر کھجو صاحب مرحوم پر آرہا تھا جن کے سبب سے نہ ووٹر ان کی طرف رخ کرتے تھے نہ ان کو بوگس ووٹ ہی چلانے کا موقع ملتا تھا۔ اس غصہ کی حالت میں میر کھجو صاحب مرحوم کی طرف بڑی تیزی سے بڑھے میر کھجو صاحب مرحوم منہ دوسری طرف کئے لوگوں کے آنے جانے کا تماشہ دیکھ رہے تھے کہ یکایک ان صاحب نے میر کھجو صاحب مرحوم کو زور کی ٹکر ماری۔ یہ صاحب لحیم شحیم بھی تھے اور ٹکر بھی اچانک تھی مگر میر کھجو صاحب مرحوم تو اپنے لوہے کی لاٹ کی طرح کھڑے ہی رہے لیکن یہ حضرت خود اپنی ٹکر کے زور میں پیچھے پھنکا کر قلابازیاں کھاتے ہوئے دور جاگرے۔ دوڑ کر میر کھجو صاحب مرحوم نے ان کو اٹھایا اور الٹے خود ہی ان سے معذرت بھی کرنے لگے۔ پولنگ بوتھ میں سینکڑوں آدمیوں نے یہ تماشہ دیکھا۔ سب ہنس رہے تھے۔ اب وقت بھی ختم ہو رہا تھا۔ یہ صاحب سب کو چھوڑ چھاڑ بڑے خفیف ہو کر سیدھے گھر کو سدھارے۔ اس زمانے میں فن سپہ گری کے اور بھی نامی استاد پٹنہ میں تھے۔ جن میں پھنگی پانڈے بہت مشہور تھے۔ ان کے گذرنے کے بعد ہمت خاں مرحوم کا نام نکلا ہوا تھا۔ شریفوں اور رؤسا کو گھروں میں بالعموم یہی بانک ، پٹا، لاٹھی، تلوار، گتکا اور نبوت سکھاتے تھے اور اچھی تنخواہ پاتے تھے۔ شہر بھر میں ان کا ایسا رعب تھا کہ بڑے بڑے بدمعاش اور غنڈے ان سے پہلو بچائے رہتے، ان سے راستہ کترا کر چلتے اور ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے، ہمت خاں مرحوم پنجہ لڑانے میں بڑے استاد تھے پہلے پنجہ کشی کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ ان کے پنجوں میں ایسی سکت تھی کہ لانبی چوڑی چارپائی کی

ادوائن میں۔ انگلیاں ڈال کر ایک جھٹکے کے ساتھ چارپائی کو کلائی کے زور پر کھڑی کر لیتے۔ یہ میاں گلام حسین کے شاگردوں میں تھے جن کی بہادری اور ڈکیتی کی داستانیں بر سہا برس تک صوبہ بہار کے ہر حصے میں گونجتی رہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے صرف پھگنی پانڈے کا نام سنا مگر بہت کو اپنے بچپن میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ میرے والد مرحوم کے پاس بھی آیا کرتے تھے اور پٹنہ کے شریفوں کو لاٹھی اور تلوار وغیرہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

لینا میاں غلام حسین

ضلع پٹنہ کی ایک بستی موضع بالی شیخپورہ کے رہنے والے اور ذات کے شیخ صاحب تھے۔ گھرانا اچھا تھا مگر بچپن ہی سے بڑے لاابالی اور خودسر تھے۔ پہلے بچپن میں بچوں کی ایک جماعت بنا کر آنے جانے والوں کو تنگ کرتے۔ جب بڑھے تو ان کی شورش اور بڑھی۔ شریف باپ نے تنگ آکر ان کو گھر سے نکال دیا یہ بھی خوش ہوئے کہ چلو پاپ کٹا۔ گھر چھوٹا تو اپنے جیسے لوگوں کا ایک جتھا بنا کر ڈاکہ ڈالنے لگے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے قبل اور کئی سال بعد تک میاں غلام حسین کی ہیبت سے بڑے بڑے ساہوکاروں اور زمینداروں کے گھروں میں رات دن ہل چل مچی رہتی تھی۔ ان کی ڈاکہ زنی کا میدان محدود نہ تھا۔ آج پٹنہ کے کسی علاقہ میں ڈاکہ ڈال تو ایک ہفتہ یا دس دن کے بعد مونگیر کی کسی آباد بستی میں ان کی تباہ کاری کی واردات سننے میں آئی۔ دوسرے ہفتے گیا یا شاہ آباد کے کسی حصہ میں لوٹ مار مچاتے پائے گئے۔ غازی پور، بنارس اور بلیا تک ان کا دھاوا ہوتا تھا۔ یہ خود بھی بڑے لڑنتیے تھے اور چن چن کر ساتھی بھی ایسے رکھتے تھے کہ ہر فرد دس بیس پر بھاری ہو۔ بڑے بڑے گھروں کو تاکتے اور بڑی بڑی رقمیں لوٹ لاتے مگر شریفوں کی شرافت کا لحاظ کرتے تھے۔ امیروں سے جو لوٹ کر لاتے وہ غریبوں میں بانٹ دیتے۔ کسی کمزور پر ظلم ہوتا تو یہی اس کے مددگار بھی ہوتے۔ بڑے بڑے ظالم جلاد اور دوسرے ڈاکو اور چور بھی ان کا نام سنتے تو چونک اٹھتے

تھے۔ اونچی اونچی دیواریں اور اونچے اونچے کوٹھے سب میاں غلام حسین کی آسان پہنچ کے اندر تھے۔ ایک جست میں بغیر سیڑھی اور کمند کے کوٹھوں پر پہنچے۔ ان کی کامیابی کا بڑا سبب ان کی پھرتی اور ان کی بے پناہ جست تھی۔ جب لڑائی میں کسی غول میں گھر جاتے تو غول کو پھاند کر نکل آتے۔ ان کو گھیر رکھنا اور ان پر ہاتھ اٹھانا گویا ہوا کو گھیر رکھنا اور ہاتھ اٹھانا تھا۔ اگر گھر جاتے تو دم کے دم گھیرا توڑ کر بے داغ نکل جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ "لینا میاں غلام حسین" کا فقرہ ہر جگہ لوگوں کی زبان پر ان کے مرنے کے بعد بھی مدتوں جاری رہا۔ ان کے رہنے کی کبھی کوئی مخصوص جگہ نہ تھی۔ خبر لگی کہ آج یہاں ہیں، حکومت کے سپاہیوں کی دوڑ پہنچی تو اس جگہ سے یہ کوسوں دور پہنچے ہوئے تھے۔ برسوں حکومت کو بھی پریشان کرتے رہے۔ جب غدر کے بعد پورے طور پر امن و امان ہو چکا اور حکومت ٹھوس بنیادوں پر چلی تو بھی کئی سال تک ان کی لوٹ کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کو حکومت سے کوئی سیاسی مخاصمت نہ تھی اور اسی لئے انگریزی حکومت بھی ان کو باغی نہیں سمجھتی تھی۔ پھر بھی امن عامہ کے قیام کے لئے ان کی گرفتاری کے لئے انعامات کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ آخر ایک دن ان کے ایک ساتھی نے ان کے خلاف ان کی مخبری کی اور یہ بے خبری میں پکڑے گئے۔ ان کے ساتھی جو ان کے شاگرد بھی ہوا کرتے تھے کچھ کے شامل گرفتار بھی ہوئے مگر زیادہ تر نکل بھاگے۔ میاں غلام حسین پر مقدمہ چلا، ان کے کارنامے تو سیاہ تھے مگر قسمت نے یاوری کی۔ غدر کے قتل و غارت کے بعد انگریزی حکومت زیادہ خون بہانا نہیں چاہتی تھی اس لئے صرف حبس دوام بہ عور دریا کے شور کی سزا ہوئی اور عمر بھر کی قید بھگتنے کے لئے یہ انڈمن کے جزیرے میں بھیج دیئے گئے۔ جب ملکہ وکٹوریہ کی سنہری جبلی منائی گئی تو جہاں بہت سے قیدی رہا کئے ان میں میاں غلام حسین بھی تھے۔ چھوٹ کر آئے تو کچھ جزیرہ انڈمن کی خراب آب و ہوا کا اثر، پھر بوڑھے بھی ہو چلے تھے اور زمانہ بہت کچھ بدل بھی چکا تھا اور ان کا جتھا بھی تتر بتر ہو چکا تھا اس لئے یہ اپنے گاؤں میں رہ کر سیدھی زندگی بسر کرنے لگے۔ تائب ہو ہی چکے تھے، شریف گھرانے کے فرد

بھی تھے اور اطوار میں خاندانی شائستگی باقی تھی اس لئے ہر جگہ شریف گھروں میں اب ان کی آمد و رفت بھی ہونے لگی۔ پٹنہ آتے تو میرے نانا میر احمد حسین صاحب مرحوم کے یہاں بھی آتے۔ ایک دفعہ میر احمد حسین صاحب مرحوم نے ان سے پوچھا کہ شیخ صاحب کبھی آپ ایسے مدمقابل سے بھی واسطہ پڑا جس سے آپ زچ ہو گئے ہوں۔ کہنے لگے ہاں ایک کم سن لڑکے نے ایک دفعہ مجھے وہ سبق دیا کہ آج تک اس کو نہیں بھولا ہوں۔ پھر حسب ذیل واقعہ بیان کرنے لگے۔ "میرے عروج کا زمانہ تھا۔ لوگ میرا نام سن کر تھرا اٹھتے تھے جس سے جتنا چاہا مطالبہ کیا اور وہ فوراً وصول ہوا۔ مونگیر میں ایک دولت مند زمیندار رہتے تھے۔ یہ غدر سے دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ زمیندار صاحب کا نام اکرم حسین تھا۔ آپ بھی ان کو جانتے ہوں گے۔ ان کی اکلوتی لڑکی کی شادی ایک دولت مند زمیندار کے لڑکے سے ہوئی جو ضلع گیا کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس شادی میں بڑا اہتمام تھا۔ خاص کر اکرام حسین صاحب نے شاہانہ انداز پر شادی کا انتظام کیا تھا۔ ایک ہی لڑکی تھی بلکہ وہی ایک اولاد تھی۔ شادی میں بے دریغ روپے خرچ کئے گئے۔ اس شادی کی شہرت دور دور تھی میں نے شادی کے بعد اکرم حسین صاحب کو کہلا بھیجا کہ لڑکی کی شادی آپ کو مبارک مگر میرا حق کیا ہوا؟ فوراً دس ہزار روپے میرے حق کے فلاں پتہ پر بھیجئے ورنہ یہ شادی آپ کو مہنگی پڑے گی۔ اکرم حسین صاحب بہت گھبرائے اور وہ یقیناً میرا مطالبہ پورا کرتے مگر ان کے نئے داماد نے سخت مخالفت کی جو ان دنوں اپنی سسرال میں ہی تھے۔ روپے آنے میں دیر ہوئی تو مجھے میرے مخبروں نے اطلاع دی کہ روپے اس سبب سے اٹکے ہوئے ہیں کہ اکرم حسین صاحب کے نئے داماد یہ کہتے ہیں کہ اگر روپے غلام حسین کو بھیجے گئے تو وہ پھر کبھی سسرال نہ آئیں گے۔ ہزار اکرم حسین صاحب نے اپنے داماد کو سمجھایا کہ میاں اتنے روپے تم پر سے تصدق ہیں، کیوں بھڑ کے چھتے کو چھیڑتے ہو۔ مگر صاحبزادے کے یہی ضد تھی کہ روپے نہ بھیجے جائیں۔ داماد کی ضد ایک طرف دوسری طرف میرا ڈر۔ اکرم حسین صاحب عجیب مخمصے میں گرفتار تھے۔ بہر حال روپے نہ

آئے اور ان کے داماد ہی کی ضد پوری ہوئی ۔ مجھے یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو میں نے صاحبزادے کی گوشمالی واجب سمجھی ۔ پتہ چلا کہ میاں صاحبزادے اپنی سسرال میں مقیم ہیں ۔ اپنے چند شاگردوں کو لے کر میں اکرم حسین کے گاؤں میں پہنچا ۔ لوٹ مار کا قطعی ارادہ نہ تھا، صرف صاحبزادے کی گوشمالی مد نظر تھی اور زادراہ کے طور پر جو کچھ آسانی سے ہاتھ آجائے اس کو لیکر چلے آنا مقصود تھا ۔ رات آدھی بجی تو میں اپنی کمین گاہ سے جو میرے ایک شاگرد کا اسی بستی میں مکان تھا باہر نکلا ۔ میں پتہ لگا چکا تھا کہ صاحبزادے نے زنانہ مکان کے کس حصہ کے بالاخانے پر سوتے ہیں ۔ مکان کا پورا نقشہ میرے شاگرد نے مجھے بتادیا تھا ۔ میں نے صاحبزادے کی طرف توجہ دینا ضروری سمجھا کہ انہیں کو یرغمال بناکر انہیں کے ذریعہ سے اپنا مطالبہ اکرم حسین صاحب سے پورا کراؤں ۔ اس لئے جب میں اکرم حسین صاحب کے مکان کے وسیع احاطہ کی چار دیواری کو پھاند کر اندر جانے لگا تو میں نے اپنے شاگردوں کو اپنے ساتھ اندر آنے سے منع کیا اور کہا کہ میں اکیلا کیا کم ہوں اور پھر لڑائی جھگڑا تو کرنا نہیں ہے ۔ اس لئے تم سب یہیں میرا انتظار کرو ۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں ۔ بغیر کمند اور بغیر سیڑھیوں کے میرے لئے اونچی دیواروں کو پھاندنا اور کسی کوٹھے کی چھت پر پہنچ جانا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ۔ میں آسانی سے دیواروں کو پھاند کر کوٹھے کے قریب پہنچا تو میں نے اپنے دونوں زانوں پر تھپکی لگائی اور پھر جست جو کی تو چشم زدن میں بالاخانے پڑتا ۔ گرمی کے دن تھے ، میاں صاحبزادے مسہری میں کھلی چھت پر سو رہے تھے آہٹ جو ہوئی تو ان کی نیند ٹوٹی ، آنکھیں کھلیں تو پوچھا کون ؟ میں نے جواب دیا کہ غلام حسین ہوں اور تمہاری گوشمالی کو آیا ہوں ۔ یہ سنکر اٹھے ، اپنی دلہن کو جواب جاگ چکی تھی اور خوف سے کانپ رہی تھی دلاسا دیا اور کہا کہ چپ بیٹھی رہو اور اللہ تعالی پر بھروسہ رکھو ۔ اس کے بعد میرے سامنے آئے ۔ میں نے دیکھا صاحبزادے بالکل کم سن ہیں ، اٹھارہ بیس کی عمر ہوگی ، ابھی پورے طور پر مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں ۔ معصوم بھولا بھالا چہرہ تھا مجھے ان پر بڑا ترس آیا ۔ میں نے کہا کہ میاں تم کو دیکھ کر اب تمہاری گوشمالی کا

ارادہ بھی ترک کیا۔ بہتر یہ ہے کہ چپکے میرے ساتھ چلے چلو، میں تم کو آرام سے رکھوں گا اور تم کو یرغمال بناکر اپنا مطالبہ تمہارے سسر سے وصول کروں گا،اس کے بعد تم کو یہاں واپس چلادوں گا۔ صاحبزادے نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ میں نے آپکا بہت شہرہ سنا ہے اور جانتا ہوں کہ آپ بڑے بہادر اور فن سپہ گری میں بھی بڑے ماہر ہیں، مگر میں خود سے آپ کے ہمراہ نہ جاؤں گا اگر آپ کا بس چلے تو آپ مجھے باندھ کر لے جایئے۔ مجھے صاحبزادے کے جواب پر ہنسی بھی آتی، کچھ غصہ بھی آیا کہ لڑکا بیوقوف بھی ہے اور ضدی بھی معلوم ہوتا ہے۔ میرے پاس بھی میں ڈیڑھ گز لابنا ڈنڈا تھا جو میرے ہاتھ میں تلوار سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا۔ میں صرف گروہ اور گھمسان کی لڑائیوں میں تلوار سے کام لیتا تھا ورنہ عموماً اسی ڈنڈے سے کام نکالتا تھا۔ میں نے اس وقت اس ڈنڈے سے بھی کام لینا نہ چاہا۔ میرا خیال تھا کہ صاحبزادے کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لوں گا۔ اور مُشکیں ان کی باندھ کر ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے لئے یہ بالکل معمولی بات تھی۔ میں نے ڈنڈے کو بغل میں دابا اور آگے بڑھ کر میاں صاحبزادے کو پکڑنا چاہا تو وہ بغلی دے کر دوسری طرف ہوئے۔ میں نے پھر فاصلہ کا اندازہ لگا کر ان پر جست کی تو وہ بجلی ایسی تیزی سے علحدہ ہٹ کر میری پشت کی طرف آگئے۔ اب میں بھی معاملہ کی نزاکت کو سمجھنے لگا۔ اس لئے میں ڈنڈا سنبھالا اور پینترا بدل کر ایک ہلکا ہاتھ چلا دیا۔ انھوں نے پھر بڑی پُھرتی سے وار خالی دیا۔وقت اور موقع کا مجھے خیال آیا کہ وقت بھی کم ہے اور کہیں ایسا نہ ۔ کھٹ پٹ کی آواز سن کر لوگ مدد کو آجائیں۔ اس لئے میں نے پے درپے وار کرنے شروع کردیئے۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے ہر وار خالی دے رہے تھے۔ کیا مجال کہ ایک بھی چوٹ کھائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو بلبلیں گتھی ہوئی ہیں۔ چاندنی رات تھی چھت پر جگہ کافی وسیع تھی۔ میں اب بڑھ بڑھ کر وار کر رہا تھا اور صاحبزادے بڑے اطمینان سے مجھے جھکائیاں دے رہے تھے۔ غصے میں اب احتیاط برتنا بھی بھول گیا۔ ایک دفعہ انھوں نے ٹوکا کہ استاد اب آپ احتیاط چھوڑ رہے ہیں۔ میں سنبھلا اور پھر سنبھل کر میں نے ایک سخت وار کیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وار

کاری ہونے کے علاوہ قطعی کامیاب وار بھی ہوگا۔ مگر نتیجہ صفر ہی نکلا۔ وہ اس وار کو خالی دے کر میری پشت پر آگئے۔ میں پلٹا تو انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور کہنے لگے کہ استاد آپ اپنے متعدد وار کر چکے اور میں آپ کے سب وار بچا گیا اب ایک وار میرا بھی آپ روک لیں۔ میں آپ کو آگاہ کر کے اپنا وار کرنا چاہتا ہوں۔ میں حیران تھا کہ یہ نہتا لڑکا کون سا وار کرے گا کہ اتنے میں انھوں نے لپک کر چارپائی سے اپنی دلہن کی اوڑھنی اٹھائی، دلہن بیچاری تو چادر میں لپٹی سمٹی بیٹھی تھی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ دلہن کی اوڑھنی اٹھائی تو اس کے ایک پلو میں پھرتی سے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی کی گرہ لگائی اور دونوں ہاتھوں سے اوڑھنی کا دونوں پلو پکڑے اور سامنے اس کا پردہ بنائے میری طرف بڑھے۔ مجھے ہنسی آئی کہ یہ کیا مذاق ہے معاً میں نے دیکھا کہ اوڑھنی کا ایک سرا ہوا میں بلند ہو کر لہرایا۔ میں ہر وار کو روکنے کے لئے تیار تھا۔ میں نے الگ ہٹنے کے لئے پیچھے کی طرف جو جست کی تو اسی درمیان میں ایک سخت چوٹ میری گردن پر شہ رگ کے پاس لگی میں لڑکھڑا گیا اس کے بعد مجھے خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ صاحبزادے مجھ پر جھکے ہوئے میری گردن کو آہستہ آہستہ جنبش دے رہے ہیں اور پانی کا گلاس وہیں پر رکھا ہوا ہے۔ اس سے پانی لے کر میرے منہ پر پانی کا چھینٹا دئے جاتے ہیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو سہارا دے کر مجھے اٹھایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں میں دم ہی نہیں باقی ہے میرا اداس چہرہ دیکھ کر بولے کہ استاد آپ گھبرائیں نہیں دو تین منٹ میں آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ سب باتیں عارضی ہیں۔ انھوں نے ایک گلاس پانی بھر مجھے پینے کو دیا۔ پانی پی کر میری جان میں جان آئی۔ اب میں ہر طرح ٹھیک تھا۔ صاحبزادے نے کہا کہ استاد آپ کو دیر ہو رہی ہے اس وقت آپ تشریف لے جائیں آپ کے شاگرد آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے مگر جانے سے پہلے وعدہ کر لیجئے کہ کل صبح آپ آکر میرے ساتھ ناشتہ کریں گے۔ اگر آپ کو اس میں تامل ہو تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی عزت اور آپ کی جان میری عزت اور جان کے ساتھ ہے۔ میرے لئے دوسرا چارہ نہیں تھا۔

میں نے ان سے صبح میں آنے کا وعدہ کیا اور چھت کی مونڈ پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے نیچے اتر آیا۔ میرے ساتھی میرے لئے مسرور ہو رہے تھے۔ میں جب خالی ہاتھ پہنچا تو تعجب سے پوچھنے لگے کہ استاد آپ اور خالی ہاتھ واپس آئیں۔ میں نے کہا کہ ہاں جی ہوا تو یہی پھر میں چپ ہو رہا۔ میرا سکوت دیکھ کر میرے ساتھی بھی چپ ہو رہے۔ جب ہم سب وہاں سے چل کر اس مکان میں آئے جو میرا عارضی قیام گاہ تھا تو میں بستر پر آکر پڑ گیا۔ نیند کالے کوسوں دور تھی۔ اپنے ساتھ کے گذرے ہوئے ابھی ابھی کے واقعہ پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ یہ کیا اندھیر تھا کہ میں، جس کے نام کا سکہ ہر جگہ چلتا ہے، جس کی دھاک دور دور تک پہنچی ہوئی ہے اور جس سے بڑے بڑے جوان مرد اور تلوارئے کانپتے ہیں وہ ایک کم سن لڑکے کے مقابلے میں ایک ناتواں بچے سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ رات آنکھوں میں کٹی۔ صبح اٹھ کر غسل کیا، کپڑے بدلے شاگردوں نے پوچھا کہ استاد کہاں چلے۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت ایک جگہ دعوت ہے وہیں جانا ہے تم سب یہیں رہو میں جلد واپس آجاؤں گا۔ دن کے وقت علانیہ تنہا نکلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ شاگرد سب ساتھ چلنے پر مصر تھے۔ میں نے سبھوں کو دلاسا دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر تنہا چل پڑا۔ مجھ کو اس لڑکے کی شرافت پر پورا اعتماد تھا۔ جب میں اکرم حسین صاحب کے مکان کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ڈیوڑھی آباد ہے، متعدد دربان بیٹھے ہیں، میں نے اطمینان سے ڈیوڑھی طے کی کوئی معترض نہ ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ میری صورت سے مجھے کبھی نہیں پہچانیں گے۔ اندر آیا تو دیکھا کہ بڑا وسیع صحن تھا جس میں قرینے سے جگہ جگہ پھول کے درخت لگے تھے، روشیں بنی ہوئی تھیں۔ بیچ صحن میں ایک چبوترا سنگ مرمر کا تھا۔ سامنے رہنے کی بارہ دری تھی۔ میں نے ایک شخص سے جو ملازم پیشہ معلوم ہوتا تھا دریافت کیا کہ دولہا میاں کہاں ہیں اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا کے اندر بیٹھے ہیں۔ میں سیڑھیوں پر چڑھ کر بارہ دری کے برآمدہ سے ہوتا ہوا کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر پہنچا تو دیکھا کہ کشادہ کمرہ ہے اور جھاڑ فانوس سے سجا ہے سفید چاندنی کے فرش

پر مخملی قالین بچھی ہوئی ہے اور دوسری طرف برآمدہ میں بیٹھا ہوا ایک ملازم چھت سے لگے ہوئے پنکھے کی دوڑی کھینچ رہا ہے۔ کمرے میں گاؤ تکیہ سے لگے صاجزادے بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھا تو مسکرا کر کھڑے ہوگئے۔ سلام میں سبقت کی۔ لپک کر آگے بڑھے اور مجھے ہاتھ تھام کر قالین تک لائے اور اپنے پاس ہی بیٹھا لیا۔ ایک شخص جو پہلے سے ہی کمرے میں موجود تھا اس سے کہا کہ ناشتہ کا سامان کرو۔ اس درمیان میں مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے پتہ چلا کہ ماشاء اللہ یہ پڑھے لکھے بھی کافی ہیں۔ اتنے میں دسترخوان بچھا۔ ناشتے میں طرح طرح کی عمدہ چیزیں تھیں۔ مجھے اصرار کر کے ساتھ ہر چیز کھلائی اور خود بھی کھائی۔ دسترخوان اٹھا تو پان آئے، مجھ سے حقہ لے لئے پوچھا تو میں نے کہا کہ میں حقہ نہیں پیتا۔ پھر خود پان بھی کھایا اور مجھے بھی کھلایا۔ اس کے بعد کہنے لگے۔ استاد مجھے دو منٹ کی غیر حاضری کے لئے معافی دیجئے۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔ یہ کہہ کر باہر چلے گئے۔ میں حیران ہوا کہ یہ لڑکا اب کیا کرے گا۔ مجھے بہر حال اس کی شرافت اور اس کے قول پر بھروسہ تھا اس لئے کسی طرح کا خوف تو نہ تھا پھر بھی کچھ تشویش تو ہونے لگی تھی۔ دو تین منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ صاجزادے واپس آئے۔ ان کے پیچھے ان کے سسر اکرم حسین صاحب بھی تھے اگرچہ انھوں نے میری صورت کبھی نہ دیکھی تھی مگر میں انہیں پہچانتا تھا۔ میں نے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے میرے سلام کو جواب دیا اور بولے کہ شیخ صاحب مجھے ندامت ہے میں آپ کا مطالبہ پورا نہ کرسکا۔ اس میں میری کوتاہی کا باعث یہ عزیز تھے۔ میں نے جواب دیا اس قصے کو اب جانے بھی دیجئے۔ آج اس رقم سے بڑھ کر بڑی نعمت مجھ کو مل گئی کہ آپ کی ملاقات اور آپ کا دیدار اور صاجزادے کی مہمانی مجھے نصیب ہوئی۔ اکرم حسین صاحب نے مسکرا کر اپنے ملازم کو آواز دی۔ وہ ایک طشت کارچوبی کے خوان پوش سے ڈھکا ہوا ہاتھوں پر رکھے اندر آیا اور اس کو اکرم حسین صاحب کے آگے رکھ کر الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ کمرے میں اب سوائے میرے، اکرم حسین صاحب اور صاجزادے کے اور کوئی نہ تھا۔ اکرم حسین صاحب

نے خوان پوش اٹھایا تو طشت پر ایک خوبصورت مخملی تھیلی رکھی ہوئی نظر آئی۔ انھوں نے طشت میری طرف بڑھایا اور کہا اس میں تین سو عالم شاہی اشرفیاں ہیں جن کو میں آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ مجھ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہوا، میں سوچنے لگا کہ اللہ اللہ اس سے بڑھ کر کیا شرافت اور درگذر ہوگی۔ میں، جس کی زندگی ڈاکہ زنی اور غارتگری میں گذری تھی جس کا دماغ رفتہ رفتہ اب شرافت اور حمیت کے متعلق سوچنے سے بھی عاری ہو چکا تھا آج ان دو شریفوں کے سامنے خود اپنی نظر میں گرا ہوا اور حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا حضور اب ان اشرفیوں کی مجھے ضرورت نہیں۔ آپ دونوں کی شرافت اور فیاضی نے آج مجھے ان سے زیادہ بیش قیمت چیز عطا کی ہے اور وہ یہ کہ میں شرافت کے معیار کو پہچاننے کے قابل ہو گیا۔ صاحبزادے بولے استاد میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ آپ اس نذرانہ کو رد کر کے مجھے تکلیف نہ دیجئے۔ اکرم حسین صاحب کہنے لگے شیخ صاحب میں نے آپ کے متعلق بہت سے قصے سنے ہیں۔ جن میں بہت سی باتیں آپ کے خلاف بھی ہیں مگر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ نے کبھی کسی غریب کو نہیں ستایا۔ عورت، بچے اور بوڑھے سے کبھی معترض نہ ہوئے، اگر آپ نے امیروں پر ڈاکہ ڈالا تو اس مال سے غریبوں اور بیکسوں کی مدد کی اور وقت پڑا تو ان کی جانیں بھی بچائیں۔ آپ کی شرافت آپ کی برائیوں پر غالب ہے۔ کم از کم اس شرافت کے ناطے آپ ایک شریف کا تحفہ تو واپس نہ کیجئے۔ میں مجبور ہو گیا۔ اشرفیوں کی تھیلی میں نے اٹھالی، بڑھ کر اکرم حسین صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور میاں صاحبزادے کی پیشانی چومی اور سر جھکائے اپنے مقام پر واپس چلا آیا۔ آنے کے بعد میں نے اپنے شاگردوں کو ساتھ لیا اور سیدھے گھر کی راہ لی۔ ساتھ ہی دل میں یہ حتمی عہد بھی کیا کہ ان اطراف میں اب کبھی ڈاکہ نہ ڈالوں گا"۔ یہ واقعہ میں نے اپنے کئی بزرگ سے سنا۔

پرانی مروجہ سواریاں اور شرفاء میں دوبارہ گھوڑوں کا شوق

تاریخ کے مبصروں کا قول ہے کہ جب شاہان مغلیہ نے میدان جنگ میں گھوڑوں کی سواری چھوڑی اور ہواداروں اور نالکیوں پر باہر نکلنے لگے تو ان کی سلطنت کا زوال بھی شروع ہوا۔ خیر یہ تو گذشتہ تاریخ کے شواہد ہیں اور ان سے یہاں مطلب نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ بادشاہوں اور امرائے سلطنت کی آرام طلبی سے جس طرح مردانہ مشاغل کی جگہ رقص و سرود کی محفلوں نے لی اسی طرح گھوڑوں کی مردانہ سواری کی جگہ پر دوسری آرام دہ سواریاں آگئیں ان میں پالکیاں، نالکیاں فنسیں، ہوادار اور تام جھام سبھی تھے جن کو کہار اٹھاتے تھے اور انھیں پر عمائدین، امراء اور رؤسا ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ پٹنہ میں تام جھام کی سواری کا اگلے زمانے میں عام رواج تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی کچھ دنوں تک یہ سواریاں چلتی رہیں۔ زنانہ سواریوں کے لئے پالکیاں اور کھٹولیاں تو ۱۹۳۰ء تک تھیں۔ دیہاتوں میں یہ سواریاں ابھی تک نظر آجاتی ہیں۔ ہر جگہ چونکہ اب سڑکوں کا جال پھیلتا جارہا ہے اس لئے ہر جگہ موٹر گاڑیاں اور موٹر بسیں ان پرانی یادگاروں کو جلد ہی ختم کر دیں گی۔ بہر حال یہ تذکرہ تو اگلے دنوں کا ہے جب یہ سواریاں جاری تھیں۔ میرے گھر میں بھی دو تین بچے کھچے تام جھام میرے بچپن کے زمانے تک موجود تھے اگر چہ ان کا زمانہ مدت گذر چکا تھا مگر پرانی یادگار چیزوں کے ساتھ یہ بھی ایک طرف رکھے ہوئے تھے ان کی ساخت فٹن کے ہودے کی طرح سمجھ لیجئے۔ اس ہودے کے آمنے سامنے دو بیٹھنے کی نشستیں ہوتی تھیں جن کی سطح ہودے سے اونچی اور جن کی وضع دو چھوٹے چھوٹے تخت کی طرح ہوتی تھی۔ ہودے کے بیچ میں ان تختیوں سے جو جگہ بچ جاتی تھی وہ پاؤں رکھنے کی جگہ ہوتی تھی جس کو تام جھام کا حوض کہتے بھی تھے۔ فٹن ہی کی طرح تام جھام میں اندر

بیٹھنے والوں کے لئے ہُڈیا چھتری لگی ہوتی تھی کہ جب چاہا سایہ کرنے کے لئے یا بارش سے بچنے کے لئے اس کو اٹھا دیا اور جب چاہا اس کو گرا دیا۔ تام جھام کے آگے کے سرے پر دائیں بائیں فٹن وغیرہ کی طرح دو لالٹینیں بھی نصب کر دیتے تھے کہ رات کے وقت چلنے میں اس کی روشنی سے آسانی ہو۔ تام جھام کے ہودے تو کاٹھ ہی کے بنے ہوتے تھے مگر حسب حیثیت لوگ ان پر پیتل کے خوبصورت پتر جڑتے یا چاندی اور گنگا جمنی منقش پتر جڑتے یا چاندی اور گنگا جمنی منقش پتر لگا کر بالکل چاندی یا گنگا جمنی ہودا بنا دیتے۔ اندر کے حصے میں بھی نشستوں کو کاشانی مخمل وغیرہ سے مزین کرتے تھے۔ پالکی کی طرح آگے پیچھے اس کے لوہے یا پیتل کے ڈنڈوں کے سہارے پر جڑے ہوئے دو خول ہوتے تھے۔ جن میں یا تو عمدہ قسم کے بانس ڈال کر یا کاٹھ کے خوبصورت موٹے ڈنڈے خول میں دے کر کہار اس کو اٹھاتے تھے جن میں دو کہار آگے ہوتے اور دو پیچھے۔ ہڈیا چھتری بھی عمدہ چمڑے کی ہوتی تھی۔ اس پر بھی ابھرے ہوئے کہیں پیتل کے کہیں سلور کے اور کہیں چاندی کے پھول لگے ہوتے۔ کہیں یہ ہڈیا چھتری عمدہ ریشمی یا مخمل کے کپڑوں کی بھی ہوتی تھیں جن کے نیچے موم جامہ ہوتا اور کارچوبی کا کام بنا ہوا ہوتا تھا۔ صدر میں رئیس خود بیٹھتے اور جی چاہتا تو کبھی کسی مصاحب کو اپنے سامنے والی نشست پر بھی بیٹھا لیتے۔ مغربی طرز معاشرت نے جب یہاں قدم ملانا شروع کیا اور شہر میں کشادہ سڑکوں کا انتظام ہوا اور اونچے نیچے راستے ہموار ہونے لگے تو انگریزوں کی دیکھا دیکھی فٹن لینڈو، پالکی گاڑیاں، ٹمٹم کا بھی شوق شروع ہوا اور گھوڑوں کی پھر قدر بڑھی تو شہ سواری کا پرانا شوق بھی عود کر آیا۔ گھوڑوں کا شوق انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ فوجی رسالوں کے لئے بھی چن چن کر گھوڑے رکھتے اور ریس اور پولو کے لئے بھی عمدہ گھوڑوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ شوق بڑھا تو ہندوستان کے ہر حصے کے علاوہ یورپ سے بھی اچھے گھوڑے بکری کے لئے آنے لگے۔ سونپور کے میلے میں ہزاروں گھوڑے آتے تھے۔ اس کے علاوہ گھوڑوں کی

خریداری کے لئے ایک اور جگہ مشہور تھی۔ جہاں صرف گھوڑوں کی خرید و فروخت کا میلہ لگتا تھا۔ یہ کاٹھ برہم پور کا میلہ کاٹھیاوار کے علاقہ میں لگتا تھا۔ سونپور کے میلے میں جہاں گھوڑوں کی کارواں سرائے ہوتی تھی وہاں بکری کے لئے جو عمدہ عمدہ فرد گھوڑے آتے وہ بھی اور عمدہ عمدہ گھوڑوں کی جوڑیاں بھی الگ الگ شامیانوں میں رہتی تھیں۔ اس وقت بھی عمدہ فرد گھوڑے کی قیمت دو ہزار تک پہنچی ہوئی تھی اور جوڑیاں تین تین چار چار ہزار تک بکتی تھیں۔ معمولی گھوڑے سو ڈیڑھ سو میں مل جاتے تھے۔ گھوڑوں کی کارواں سرائے میں گھوڑوں کی پہچان رکھنے والے اور ان کو پھیری دینے والے ہر طرف چکر لگاتے پھرتے تھے۔ ان کو چابک سوار کہتے تھے۔ ان کی ٹھاٹھ بھی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ اونچی چولی کا انگرکھا یا مرزئی بدن پر، پاؤں میں چست پاجامہ، سر پر راجپوتانہ فیشن کی پگڑی، ہاتھ میں چابک یا کوڑا۔ رئیسوں کو دیکھتے تو جھک جھک کر سلام کرتے اور گھوڑوں کی شناخت اور اس کی پھیری کے لئے اپنی ضرورت پیش کرتے۔ اگر خریدار نے گھوڑے پسند کئے تو یہی اس پر سوار ہو کر خریدار کو اس کی چال دکھاتے اور اس کی اجرت میں پیسے کماتے۔ عام خریداروں میں ان کی مانگ رہتی تھی۔ رئیسوں کے ساتھ ان کے اپنے مبصر اور گھوڑوں کے ماہر ہوتے تھے۔ اکثر یہ رئیس خود بھی گھوڑوں کی پہچان اور ان کی سواری میں بڑے بڑے چابک سواروں سے آگے ہوتے۔

میر عمر دراز صاحب

میر عمر دراز صاحب پٹنہ کے بڑے دولت مند رئیسوں میں تھے۔ ان کو گھوڑوں کا شوق ہی نہیں بلکہ ان سے عشق تھا ان کے اصطبل میں پچاسوں عمدہ نسل کے گھوڑے تھے۔ عربی، عراقی، دھیلر بھی، کاٹھیاواری اور ملتانی بھی۔ بڑے مانے ہوئے شہ سوار بھی تھے۔ سرکش سے سرکش گھوڑوں کو چٹکی بجاتے رام کر لیتے تھے۔ چھ فٹ سے کچھ اونچا ہی قد، سڈول اور بھرے ہوئے ہاتھ پاؤں، کسرتی بدن۔ ان کی شہ زوری کی بھی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ ایک دفعہ ان کے کسی گاؤں سے ان کا ایک مالدار

رعیت ان کے پاس کوئی عرضی پیش کرنے آیا۔ یہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اور اتفاق سے وہ بھی لانبا تڑنگا بڑا ہی سجیلا نوجوان تھا۔ اس نے ایک روپیہ سلامی کا ان کے قدموں کے پاس رکھا، جھک کر سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر اپنی عرضداشت ان کے آگے پیش کرنے لگا۔ اس مالدار رعیت کو دیکھ ان کی طبیعت میں پھریری آئی۔ وہ روپیہ جو اس نے سلامی کا پیش کیا تھا آہستہ سے اس کو اٹھا کر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا اور داہنے ہاتھ کے انوکھے سے جو اس کو دبایا تو وہ پچک گیا۔ میر عمر دراز صاحب نے ہنستے ہوئے وہ روپیہ نوجوان رعیت کی طرف اٹھا کر پھینکا اور کہنے لگے مالک کو کھوٹے روپے سلامی میں نہیں دیئے جاتے۔ وہ نوجوان بھی اپنے مالک کے بانکپن کو سمجھ گیا اور اس روپے کو اٹھا کر اس نے اپنی انگلیوں سے توڑ موڑ کر چپٹا کر دیا اور دوسرا اچھا روپیہ کمر سے نکالا اور ہاتھ جوڑ کر بولا سرکار سچ ہے وہ روپیہ خراب اور چپٹا تھا یہ دوسرا روپیہ سلامی کا حاضر ہے۔ میر عمر دراز صاحب بڑے قدرشناش بھی تھے انھوں نے اس کی عرضداشت بھی منظور کر لی اور انعام واکرام دے کر اس کی کاشت کی اراضیات بھی بڑھا دیں۔

میر عمر دراز صاحب کا انتقال میری پیدائش سے بہت پہلے ہو چکا تھا مگر میرے بچپن تک ان کے دیکھنے والے کچھ موجود تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بالکل لکھنؤ کے نوابوں اور شہزادوں کے ایسی وضع قطع تھی۔ سر پر لانبے لانبے بال، پیچھے جوڑا بندھا ہوا، ہلکی پھلکی جامدانی کے کپڑے کی ٹوپی یا پلہ سر کے اوپر اٹکا ہوا، اونچی چولی کا انگرکھا، پاؤں میں کبھی چست کبھی خالتے دار پائجامہ اور پاؤں میں کامدار جوتیاں۔ شہ سواری کرتے تو چست پائجامہ ہی پہنتے تھے۔ شام کے وقت جب شہر میں سیر کو نکلتے تو ران کے نیچے عربی گھوڑا ہوتا۔ دوکانوں اور کوٹھوں سے سب کی نظریں ان پر اٹھنے لگتیں۔ ایک دفعہ شہ سواری کی شان دکھاتے ہوئے شام کے وقت چوک سے گذر رہے تھے، عربی گھوڑا تھرکتا ہوا آڑا ترچھا بیچ سڑک پر چل رہا تھا۔ اس وقت پٹنہ سیٹی کا انگریز سیٹی مجسٹریٹ بھی اپنی گگ (انگریزی ٹم ٹم) پر پیچھے سے آپہنچا۔ گھنٹی بجائی کہ آگے نکلنے کا

راستہ ملے مگر میر عمر دراز صاحب مرحوم اپنی اور اپنے گھوڑے کی چال کب بگاڑنے والے تھے۔ انھوں نے صاحب بہادر کی گھنٹی کی پرواہ نہیں کی۔ انگریز جب گھنٹی بجاتے بجاتے تنگ آگیا تو وہ اپنی ٹمٹم بڑھا کر میر عمر دراز صاحب کے گھوڑے کے پاس پہنچا اور دو تین کوڑے اس پر برسا دیے۔ عربی النسل گھوڑا بھلا کوڑوں کی تاب کہاں لاتا۔ سخت بھرا مگر عمر دراز صاحب ایسے ہی شہ سوار تھے جنھوں نے اس کو سنبھال لیا۔ اتنی دیر میں کہ عمر دراز کا گھوڑا مکمل طور پر قابو میں آئے انگریز کی ٹمٹم آگے نکل چکی تھی۔ بھرا ہوا گھوڑا جب عمر دراز کے قابو میں آگیا تو اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ دم زدن سے گھوڑا ٹمٹم سے آگے پہنچا، میر عمر دراز صاحب نے گھوڑے کو درمیان میں لاکر انگریز مجسٹریٹ کی ٹمٹم روکی اور اس پر کوڑوں کی بارش کردی، پھر اپنے گھوڑے کو بڑھا کر یہ جاوہ جا۔ یہ واقعہ دیکھ کر خلقت چاروں طرف سے ٹوٹ پڑی۔ انگریز مجسٹریٹ کوڑوں کی مار کھا کر سانپ کی طرح پیچ و تاب میں تھا ہر شخص سے میر عمر دراز کے متعلق پوچھنے لگا کہ یہ گھوڑا سوار کون تھا۔ آپ اس وقت کی یک جہتی اور ملت خیال کا اندازہ کیجئے کہ اس واقعہ کو دیکھنے والے اور میر عمر دراز صاحب کو پہچاننے والے سبھی موجود تھے مگر کسی نے بھی عمر دراز صاحب کو پہچاننے کا اقرار نہیں کیا۔ انگریز مجسٹریٹ اس طرح سر بازار ذلت اٹھا کر اور پٹ پٹا کر سیدھا اپنی کوٹھی کو گیا۔

ایک دفعہ ان کے مصاحبین نے ان سے کہا کہ سرکار ایسا کیوں نہ ہو کہ وحشی گھوڑے کاٹھیاوار کے جنگلوں سے پھنسا کر لائے جائیں اور پھر ان کو گھر پر سدھایا جائے۔ یہ تجویز عمر دراز صاحب کے شوق کے حسب منشاء تھی۔ یہ البیلے رئیس اپنے شوق کی بات میں ہر چیز پر یقین کرنے کو تیار تھے۔ یقین آگیا کہ واقعی کاٹھیاوار کے جنگلوں میں وحشی گھوڑے ملتے ہیں۔ چنانچہ میر عمر دراز صاحب مصاحبوں، سائیسوں اور صادت گذاروں کا ایک قافلہ لیکر کاٹھیاوار روانہ ہوگئے۔ انہیں دنوں ریل بھی چلتی تھی۔ پھر پھرا کر ایک ہفتے میں معہ قافلہ واپس آئے تو دو گھوڑے ساتھ تھے۔ ایک بڑا

خوبصورت گلدار اور دوسرا سمند۔ یہ گھوڑے دو تین سال سے زیادہ کے نہیں تھے۔ پٹنہ میں سبھوں سے یہ کہا گیا کہ بڑی مشکلوں سے یہ دونوں گھوڑے کا نیجاوار کے ایک جنگل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ کسی کو یقین آیا کسی کو نہیں مگر یہ بات ضرور تھی کہ دونوں گھوڑوں کی وحشت بہت دنوں میں گئی۔ اور بڑی مشکل سے رام ہوئے۔ میر عمر دراز صاحب ہی ان پر سواری کرتے تھے۔ دوسروں کو ان تک پھٹکنے کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی۔ البتہ اپنے اپنے سائیسوں سے دونوں مانوس ہوگئے تھے۔

ان کو کوئی اولاد نہ تھی ایک لاکھ سے اوپر سالانہ آمدنی کے مالک تھے۔ گھوڑوں پر اور ان کے شوق پر خوب روپۓ خرچ کرتے تھے۔ گھوڑوں کی اصطبل کیا تھی ایک محلسرا تھی۔ پچاسوں محراب دار کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہر کمرے کے آگے لانبا سائبان چلا گیا تھا، کمرے میں کھڑکیاں لگی تھیں جن سے دھوپ بھی آئے اور تازہ ہوا بھی، محراب میں دوہرے موٹے موٹے پردے ٹنگے تھے کہ جاڑوں میں گھوڑے سردی سے بچیں، دن میں کمرے میں صفائی ہوتی تھی۔ اصطبل کے سامنے بڑا کشادہ میدان تھا جاڑوں میں گھوڑے وہیں دھوپ کھاتے اور گرمیوں میں صبح و شام وہیں ان کی مالش ہوتی تھی۔ سامنے سائیسوں کی رہائش کوٹھریاں اور سائبان بنے ہوئے تھے مگر سب صاف ستھرے۔ اصطبل سے دور غلاظت پھیکنے کی جگہ تھی۔ پختہ نالیاں ہر جگہ بنی ہوئی تھیں کہ گندہ اور بدبو پانی باہر نکلتا رہے۔ جگہ جگہ سایہ دار درخت تھے جس کے نیچے بھی گھوڑے تھوڑی دیر کے لئے بندھتے تھے۔ اصطبل میں جگہ جگہ رات کو روشنی کے لئے دیوار گیریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ میدان میں صحرائیاں بھی جلتی تھیں۔ ان کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کی اصطبل بھی قابل دید تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اپنی بے اولاد کے غم کو گھوڑوں کی محبت سے دور کرتے تھے۔ جب مرنے لگے تو اپنے عزیز گھوڑوں کو اپنے عزیزوں اور قرابت مندوں میں ان کی لیاقت اور شوق کے حساب سے بانٹ گئے۔ کسی نے ان گھوڑوں کی کماحقہ قدر کی اور کسی نے اچھی قیمت پر انہیں بیچ ڈالا۔

منجھلے نواب صاحب مرحوم

پٹنہ میں کون سا گھر تھا جہاں گھوڑوں کی دو دو تین تین جوڑیاں نہ ہوں۔ ہر گھر میں لینڈو، فٹن، پالکی کی گاڑیاں، بروہم، ولائتی ٹمٹمیں موجود تھیں۔ ان کے علاوہ بہت سے امراء اور رؤسا ان سواریوں کے شوقین بھی تھے اور ان سواری کے گھوڑوں کے بھی۔ ران سواری کے گھوڑے عام سواریوں کے گھوڑوں سے الگ ہوتے تھے۔ گھوڑوں کے شوق کے لحاظ سے دوسری شخصیت نواب سید ابراہیم حسین خان عرف منجھلے نواب مرحوم کی تھی جو نواب لطف علی خاں مرحوم کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ ہر نسل کے عمدہ عمدہ گھوڑے ان کی اصطبل میں بھی تھے۔ گھوڑوں کے علاوہ ان کو شیروں کے پالنے کا بھی شوق تھا اور ہر نسل کے ولایتی کتے بھی ان کے یہاں پلے ہوئے تھے۔ اپنے مکان میں ایک طرف انھوں نے جانوروں کا عجائب خانہ بنا رکھا تھا۔ باؤلی ہال ان کی رہائش گاہ تھی جس کے احاطہ میں پتھروں کی خوبصورت جالیوں کے اندر نواب منیر الدولہ کا چھوٹا سا مقبرہ اب بھی باقی ہے۔ یہی وہ منیر الدولہ ہیں جنھوں نے خاندان مغلیہ کا حق نمک اس طرح ادا کیا تھا کہ شاہ عالم سے دیوانی بنگال، بہار، اڑیسہ کی انگریزوں کو دلوائی۔ منجھلے نواب صاحب مرحوم گورے چٹے درمیانی قد کے دبلے پتلے آدمی تھے مگر ہاتھوں میں خداداد زور تھا۔ بڑے جاندار چار گھوڑے کی چوکڑی ان کے ہاتھوں کے اشاروں پر اس طرح چلتی جیسے کوئی بڑا شہ سوار ایک معمولی گھوڑے کو چلا رہا ہو۔ ایک دفعہ چار گھوڑوں کی چوکڑی پر جا رہے تھے، فرشی گاڑی میں چار طاقتور دھیلر گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ حسب معمول گھوڑوں کی باگیں ان کے ہاتھوں میں تھیں، گھوڑے تیز رفتاری سے سڑکیں طے کر رہے تھے کہ اچانک بیچ سڑک پر منڈلاتی ہوئی ایک بڑھیا پہنچ گئی۔ لوگوں نے شور مچایا اور خود منجھلے نواب صاحب نے بھی دیکھا کہ بڑھیا کا گھوڑوں کی ٹاپوں کی لپیٹ میں آنا یقینی ہے پھر بھی انھوں نے بڑھیا کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے گھوڑوں کی باگیں سمیٹ کر جو اپنی طرف کھینچیں تو چاروں اپنے

اپنے پیچھے کے قدموں پر تنگ کر رہ گئے اور بڑھیا تو لڑکھڑاتی ہوئی بچ کر ایک طرف بھاگی اور لوگ منجھلے نواب صاحب مرحوم کے پتلے پتلے ہاتھوں کی قدرت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

میں نے منجھلے نواب صاحب کا آخری زمانہ دیکھا جب وہ بڑھاپے کی مجبوری سے گھر بیٹھ چکے تھے۔ پھر بھی حاجت مندوں کی ان کے پاس بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جائیداد کورٹ آف وارڈس کے تعلق تھی۔ تقریباً ایک لاکھ سالانہ آمدنی تھی۔ کوئی قرض نہ تھا۔ صرف انتظام کی سہولت کے لئے گورنمنٹ نے جائیداد کو کورٹ آف وارڈس میں لے لیا تھا۔ ان کی دیکھ بھال حکومت کے تعلق تھی۔ ڈاکٹر نوکر تھا، ڈپٹی مجسٹریٹ روزانہ آکر ان کی خیریت پوچھ جاتا، ہفتہ میں صاحب ضلع کلکٹر بھی ان کو آکر دیکھ جاتے۔ ان کا یہ عالم تھا کہ جو بھی ان کے پاس اپنی غرض لایا اس کو خالی ہاتھ کبھی واپس نہیں کیا۔ حکومت نے ایک منیجر بھی ان کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ وہ بھی برابر ساتھ رہتا تھا۔ اخراجات اسکے ہاتھ سے ہوتے تھے۔ بیچارہ منیجر ان کی داد دہش اور غربا پروری سے عاجز رہتا تھا۔ منجھلے نواب صاحب صبح کو سو کر اٹھتے تو غرباء سلام کو آتے، یہ سبھوں کی خیریت پوچھتے اور منیجر کو حکم دیتے کہ ان سب کو کچھ دے کر رخصت کرو۔ شام کو بھی یہی حالت رہتی۔ بہت سے شریف لوگ جن کی زندگی تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی یہ ان کو اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ ان کا کھانا پینا اور ان کے اخراجات سب ان کے ذمے ہوتے۔ کلکٹر جو بجٹ ان کے اخراجات کا بناتا وہ ہمیشہ فیل ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ان کی سخاوت اور غرباء پروری کسی حد کی پابند نہ تھی۔ کلکٹر اور ڈپٹی کلکٹر دونوں ان کو سمجھاتے کہ روپے اس طرح نہ پھینکیں مگر یہ جواب دیتے کہ روپئے پھینک کہاں رہا ہوں یہ تو حقداروں کو دیتا ہوں جن کے حقوق ان روپیوں میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کردئے ہیں۔ جائیداد پر کوئی قرض نہ تھا اس لئے آمدنی کی حد میں ان کے اخراجات کو گورنمنٹ روک بھی نہیں سکتی تھی۔ آخری دنوں میں محمد نواب صاحب کی حویلی میں اٹھ آئے تھے۔ یہ گذری میں لب سڑک بڑی شاندار حویلی تھی۔ محمد نواب صاحب گذر

چکے تھے۔ اِن کی اولاد بھی تتر بتر ہو چکی تھی۔ اس حویلی کو منجھلے نواب نے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ اسی حویلی کے منہدم ہونے کے بعد اب حکومت کے سیلس ٹیکس کی عمارت ہے۔ ان کی جوانی کے زمانے کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ جانوروں کا شوق، انگریزوں کی مورتیں۔ اعلیٰ درجے کے فرنیچر کی برابر انگلستان سے خریداری اور غریبوں میں داد دہش انہیں باتوں میں سالانہ آمدنی کے علاوہ لاکھوں روپے نقد جو نواب لطف علی خاں سے ترکے میں ملے تھے خرچ کرتے تھے۔ ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے جو آمدنی تھی اس کو بلا روک ٹوک خرچ کرتے گئے۔ پھر بھی قرض سے پاک ایک لاکھ کی سالانہ آمدنی اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ گئے۔

شعر وشاعری کا بھی شوق تھا حضرت مائل لکھنوی پٹنہ میں انہیں کے یہاں مقیم رہتے تھے۔ انہیں سے منجھلے نواب صاحب اصلاح بھی لیتے تھے مگر افسوس ان کے سب کلام ضائع ہوگئے۔ مجھے تو تلاش پر بھی ان کا ایک شعر نہ مل سکا۔ نواب صاحب ارمؔ تخلص فرماتے تھے۔

پاٹلی پترا۔ پٹنہ۔ عظیم آباد پھر پٹنہ

اگر حقیقت پوچھئے تو ہندوستان کے مورخین بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہی پٹنہ، جو کبھی پاٹلی پترا بعد میں پٹنہ اور شاہان مغلیہ کے آخری دور میں عظیم آباد کہلایا اور پھر گھوم گھما کر پٹنہ ہی رہا، اپنی عظمت کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں بڑی خصوصی اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مرد و زنانہ کے ہاتھوں اس کے مٹتے ہوئے اور ابھرتے ہوئے تاریخی آغاز کی کہانی اگر لکھی جائے تو کئی جلدوں میں ختم ہو۔ یہ کتاب نامکمل رہے گی اگر پٹنہ کے پرانے خدو خال مختصر طور پر ناظرین کے سامنے نہ آسکیں۔ اس مقصد کے لئے صرف چند اہم مقامات کا بیان حاضر خدمت ہے۔

اب آیئے۔ اِن چند تاریخی مقامات کی سیر کیجئے۔ پہلے پاٹلی پترا شہر کا مختصر حال سنئے۔

تاریخی پاٹلی پترا

چندر گپت کا دور حکومت تین چار سو سال قبل مسیح کے لگ بھگ ہے۔ پاٹلی پترا میں اس کی راجدھانی تھی۔ اس کے بعد جب شاہنشاہ اشوک تخت حکومت پر بیٹھا تو اس نے اپنی حدود سلطنت کو بھی بڑھایا اور ساتھ ہی ساتھ تاریخ میں ہندوستان کو عظمت کا وہ مقام بخشا جس پر ہندوستان کو آج بھی ناز ہے۔ پاٹلی پترا کا پرانا شہر موجودہ پٹنہ سیٹی سے دکھن کئی میلوں تک پھیلا ہوا تھا پھر بھی اگر موجودہ پٹنہ سیٹی کو وسعت دیکر پیش کیا جائے تو تاریخی تباہ شدہ پاٹلی پترا اس کا دکھنی حصہ کہلائے گا جہاں زیر زمیں جگہ جگہ تاریخی شواہد ملتے ہیں۔

شاہنشاہ اشوک کا پاٹلی پترا چاروں طرف اونچی اور چوڑی مضبوط شہر پناہ کی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ اس وسیع اور آباد شہر میں آنے جانے کے لئے چونسٹھ دروازے تھے۔ شہر پناہ کی دیواروں پر بُرجیاں بنی ہوئی تھیں جن کی تعداد پانچ سو ستر تھی۔ شہر کے بیچوں بیچ مہاراجہ اشوک کا محل تھا۔ یہ بھی تاریخ کا عجیب مشاہدہ ہے کہ پاٹلی پترا کے شہر اور اشوک کے محلات نے زمانہ گزرنے پر کھنڈروں کا لباس نہ پہنا اور اس طرح آینوالی نسلوں کے لئے عبرت کا مرقعہ نہ بنے بلکہ ہوا تو یہ کہ جب ان کی تباہی کا زمانہ آیا تو پاٹلی پترا کا شہر اشوک کے محلات نے زیر زمیں دفن ہو کر دیکھنے والوں سے اپنا منہ چھپالیا۔ پاٹلی پترا کی یادگار اشوک کے محل سے متعلق ایک بہت وسیع اور بہت گہرا کنواں ہے جس کی تہہ ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہ زیر زمیں دفن ہونے سے بچ رہا ہے جو اب اگم کنواں کہلاتا ہے۔ اس کنواں کے متعلق بہت سی بھیانک کہانیاں مشہور ہیں جن میں سب سے بھیانک کہانی وہ دل کو دہلانے کا واقعہ ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اپنی سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لئے شہنشاہ اشوک نے اپنے ایک سو سے زیادہ بھائیوں کو ان کے ہاتھ پاؤں بندھوا کر زندہ اس کنواں میں ڈلوا دیا تھا۔ یہ شہنشاہ اشوک کے آبائی دور حکومت کا واقعہ کہا جاتا ہے۔

جہاں پاٹلی پتر اکا شہر اور اشوک کے محلات تھے آج کل اس کو محلہ کمہر ار اور اس سے لگے علاقہ کو چھوٹی پہاڑی کہتے ہیں۔ حکومت نے محکمہ آثار قدیمہ کے تحت یہاں پر تاریخی اعتبار سے دریافت و تحقیق ہو رہی ہے جن پر پرانے ہندوستان کی تاریخ کا ڈھانچہ قائم کر کے تاریخ کی عمارت کھڑی کی جارہی ہے۔

جب ہندوستان میں پٹھانوں کا دور حکومت شروع ہوا تو ان کے زمانہ میں بھی پٹنہ کی اہمیت باقی تھی اور آپس کے جنگ و جدال میں ہر فریق کے لئے اس کی کلیدی حیثیت قائم تھی۔ پٹنہ اور بہار میں کئی عروج و زوال کی جنگیں لڑی گئیں۔ بنگال کے لئے پٹنہ ہی وہاں کے داخلہ کی کنجی تھا۔ غرض پٹنہ حکومتِ ہند کے اہم مرکز کے لحاظ سے پٹھانوں کے دور حکومت میں بھی ممتاز رہا۔ یہاں اس دور حکومت کے بھی مٹتے ہوئے آثار ملتے ہیں۔ یہ بچے کھچے ہوئے آثار بتاتے ہیں کہ یہ جو کچھ بچ رہا ہے وہ صرف اپنی سخت جانی سے بچ رہا ہے ورنہ ان کے بعد آنے والے دور حکومت نے جو شاہان مغلیہ کا دور حکومت ہے ان کی خبر بھی نہ لی۔ اس طرح پٹھان بادشاہوں کے زمانے کے آثار کسمپرسی میں پڑے رہے۔ اس کو شیر شاہ کی نیت کا خلوص کہئے کہ پٹنہ میں اس کی بنائی ہوئی عمارتوں کے کچھ آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں تو ایک شیر شاہ کا قلعہ ہے اور دوسری عمارت وہ ہے جو شیر شاہ کی مسجد کہلاتی ہے اور محلہ دھولپورہ میں اپنی عظمت و ندرت کو نوحہ کرتی ہوئی آج شکستہ حالت میں کھڑی ہے۔

پٹنہ میں شیر شاہ کا قلعہ

دریائے گنگا کے کنارے یہ قلعہ دور تک پانی میں نکلتا ہوا چلا گیا ہے۔ آج بھی اس کے پشتے پر بچے ہوئے دو چار کمروں میں بیٹھ کر دیکھئے تو یہ معلوم ہوگا کہ کسی عرشہ جہاز پر بنے ہوئے کیبن میں آپ بیٹھے ہیں اور دریا کی موجیں تین طرف سے آآکر کیبن سے ٹکرا رہی ہیں۔ برسات کے دنوں میں جب دریا کا پاٹ بڑھ کر میلوں پھیل جاتا ہے اور جوش مارتا ہوا دریا دائیں بائیں اور سامنے سے طوفانی یلغار کرتا ہوا

قلعہ کے بچے کھچے پشتوں پر حملہ کرتا نظر آتا ہے تو نظارہ اور بھی دلفریب اور دلکش ہو جاتا ہے۔ جب شیر شاہ نے اس قلعہ کی بنیاد رکھنی چاہی تو دریائے گنگا کے ساحل سے آگے بڑھ کر دور تک دریا میں بندھ بندھوائے اور جو زمین دریا کے سینہ سے حاصل کی اس کو پتھروں سے بھروا کر اونچا کیا پھر بندھ کی جگہوں پر دور تک ہر طرف مضبوط پشتے بنوائے اور پشتے کے بعد کی زمین پر اپنے قلعہ کی عالیشان اور تاریخی عمارت ۱۵۴۱ء میں تیار کی۔ مغلوں کا زمانہ آیا تو سوری خاندان کے زوال کے ساتھ شیر شاہی عمارتیں بھی کسمپرسی کی لپیٹ میں آئیں۔ مرور زمانہ کے اثرات سے یہ قلعہ بھی شکستہ اور مرمت طلب حالت میں جا پہونچا۔ جب شاہزادہ عظیم الشان نے نیا شہر عظیم آباد بسانیکا ارادہ کیا تو پٹنہ میں شیر شاہ کے بنائے ہوئے قلعہ کی مرمت کی طرف بھی توجہ کی اور اس کی سرنگیں جو خاص شیر شاہ کی ہدایت سے قلعہ سے ہوتی ہوئیں اور سطح دریا سے نیچے نیچے دریا کے دوسرے کنارے سے قصبہ حاجی پور میں نکلتی تھیں، ان کی صفائی کا بھی حکم دیا۔ حاجی پور دریائے گنگا کے اتر ایک بڑا قصبہ تھا۔ جو بہت دنوں تک سب ڈویزن رہا اور آج کل ضلع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیر شاہ کے قلعے کی یہ سرنگ جس کا آج کل پتہ نہیں چلتا ہے، اس کے متعلق اگلے لوگوں کا بیان تھا کہ اس سرنگ کی تیاری فن انجیئرنگ کا ایک شاہکار تھا جس کے سبب سے اس قلعے کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ اب نہ قلعہ باقی ہے اور نہ اس کی فصلیں اور نہ اس کی دوسری عمارتیں باقی ہیں۔ لب دریا چند مکانات رہ گئے ہیں جو ۱۹۱۵ء تک پٹنہ کے ایک رئیس مرزا محمد سعید کی ملکیت تھی۔ اس کے بعد قلعہ کے بچے کھچے مکانوں اور بچی ہوئی اس کی کچھ زمینوں کو دیوان بہادر رادھا کرشن جالان نے خرید لیا۔ یہ پٹنہ کے بڑے مارواڑی تاجروں میں تھے۔ قلعہ کی بچی ہوئی عمارت پھر بھی شاہی عمارت تھی، جو مختصر حصہ بچ رہا تھا وہ بھی بڑی بڑی عمارتوں کا تھا۔ دیوان بہادر رادھا کرشن جالان نے بڑے سلیقہ کے ساتھ بقیہ عمارت کی مرمت کرائی۔ افتادہ زمینوں میں چمن لگوائے اور روشیں بنوائیں اور اس میں

تمام ہندوستان سے گراں بہا تاریخی نوادارات لاکر سجائے جس سے یہ مکان رہائشی کم مگر نمائشی میوزیم بن گیا۔ دیوان بہادر رادھا کرشن جالان پکے تاجر تھے، تمام ہندوستان سے سمیٹ کر نوادرات جمع کرتے، اپنے مکان میں رکھتے، یورپ اور امریکہ کے سیاح آتے تو ان کو دکھاتے اور پھر ان سیاحوں میں جو نوادرات کا بڑا شائق نکلتا اس کے ہاتھوں اچھی قیمتوں پر فروخت بھی کردیتے۔ انہی کے یہاں وہ شہ نشیں بھی ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ وہی شہ نشیں ہے جس کے اندر بیٹھ کر شاہ عالم نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی وارن ہیسٹنگز کو عطا کی تھی۔ پہلے مرشد آباد میں یہ شہ نشیں تھی وہیں سے نہ جانے کس طرح دیوان بہادر رادھا کرشن جالان کو یہ شہ نشیں ہاتھ لگی۔

عظیم آباد

شاہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے آخری دور حکومت میں پٹنہ کی گورنری اپنے لائق پوتے شاہزادہ عظیم الشان کے حوالہ کی۔ یہ الوالعزم شاہزادہ صرف میدان جنگ کا ایک جلیل القدر سپہ سالار نہ تھا بلکہ وہ متعدد علوم اور تاریخ کا بھی بڑا دلدادہ اور مہمات ملکی کا بھی بڑا ماہر تھا۔ سرحدوں کی دیکھ بھال، باغیوں کے استیصال اور فتنہ و فساد کے انسداد کے بعد اس نے پرانے پٹنہ کو نئے سرے سے آباد و آراستہ کرنا شروع کیا اور ۱۷۰۴ء میں اپنے نام پر اس نے اس شہر کا نام عظیم آباد رکھا۔ اس کی کوشش تھی کہ عظیم آباد کو شاہجہاں آباد کے مقابل کا شہر بنادیں۔ محلوں کی تقسیم اس طرح کی کہ ہر محلہ اپنی جگہ پر ایک مستقل اور مضبوط یونٹ (حلقہ) بنا۔ جہاں لودی خاندان کے اُمراء پہلے سے آباد تھے ان کو ذرہ بھی نہ چھیڑا بلکہ انہی کے نام پر اس محلّہ کا نام لودیکٹرہ رکھا۔ ایک دوسری جگہ اس کے قریب ایک دوسری جگہ اس کے قریب ہی مُغل افسرانِ فوج اور اُمراء کو آباد کرکے اس محلّہ کو مغلپورہ کا نام دیا۔ قریب ہی جہاں کشمیری تجار اور دولت مند آکر بس گئے تھے اس کو ایک محلّہ قرار دے کر اس محلّہ کو کشمیری

کوٹھی کے نام سے نامزد کیا۔ ہندو اُمراء، وزراء اورُ ہندو سرکاری عمال کے لئے دریائے گنگا کے کنارے دیوان محلہ آباد ہوا۔ ایک محلّہ شیر شاہی قلعہ کے نزدیک جہاں کچھ شیر شاہی خاندان کے لوگ آباد تھے اس کا نام محلّہ کیواں شکوہ رکھا۔ عام دولتمندوں کے رہنے کا جو علاقہ مقرر کیا اس کا نام دَوَلپورہ رکھا جو اب دھولپورہ کہلاتا ہے۔ علماء، ادباء اور شعراء کے لئے بھی محلّہ آباد کیا جو میدان فصاحت کے نام سے موسوم ہوا۔ صدرالصدور کے رہنے کا جو محلّہ تھا اس کا نام صدر کی گلی رکھا گیا جو اب صدر گلی ہے۔ غرض کہ محلّہ کی تقسیم اور ان کے نام رکھنے میں بھی شہزادہ عظیم الشان نے بڑی ندرت رکھی۔ مختلف پیشہ وروں کے لحاظ سے بھی محلے آباد کئے گئے جن میں آج کل کی کمنگر گلی جس کا اصلی نام کمانگر کی گلی رکھا گیا تھا۔ اس گلی میں فوج کے لئے تیر و کمان بنانے والے بسائے گئے تھے۔ کنگھیا ٹولہ کنگھی بنانے والوں کا محلّہ تھا۔ اسی طرح پان دریبہ پان بیچنے والوں کا محلّہ، بکری ہٹا، نخاس، شیش محل گنذری، چوک وغیرہ آباد کئے گئے۔ شہر کے پچھمی حصہ میں ایک محلّہ تیرپولیہ کے نام سے آج کل مشہور ہے جس کا اصلی نام تربت اولیاء تھا جہاں ایک بزرگ کا مزار آج بھی موجود ہے۔ اس سے بڑھئے تو شہر کے تاریخی محلے عالم گنج و سلطان گنج ملیں گے۔ شہر کے وسطی علاقے میں ایک محلّہ پادری کی حویلی کے نام سے مشہور ہے جہاں ایک بڑا عیسائی گرجا بنا ہوا ہے جہاں پہلے بھی آج کل بھی باہر کے عیسائیوں کے انتظام میں ہے۔ اس گرجے کو دلندیزیوں نے بنایا تھا جبکہ وہ تاجر کی حیثیت سے مغلوں کے زمانے میں پٹنہ میں رہتے تھے۔ یہ ایک عالیشان عمارت ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت بھی ہے کیونکہ یہی وہ گرجا تھا جہاں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اور ان کے فوجی سپاہیوں نے انقلابیوں سے مقابلے کے لئے مورچہ بنا رکھا تھا۔ صادقپور کا محلّہ جو گنذری کے محلے سے کچھ آگے پچھم کی طرف ہے وہ علماء و فقراء کا محلّہ تھا۔ اسی محلے سے بار بار مغربی ہندوستان میں اور دوسری جگہوں سے بھی انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریکیں اٹھتی رہیں جن کو انگریزوں نے غلط

طور پر وہابی تحریک کا نام دیدیا تھا۔ تجارت کی منڈیوں کے لئے بھی جو محلے قائم ہوئے ان میں محلہ نون گولہ وغیرہ تھا۔ پٹنہ میں چار بلند ٹیلے مشہور ہیں جن پر قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ ان پر چار بزرگ کی قبریں ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ یہ حضرات اپنے وقت کے بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ ان ٹیلوں سے لگے ہوئے جو محلے آباد ہوئے ان کے نام بھی ان بزرگوں کے ناموں پر رکھے گئے جو آج بھی محلہ مہدی گنج، محلہ جعفر گنج، محلہ معروف گنج اور محلہ منصور گنج کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے محلے آباد ہوئے۔ عظیم آباد کا شہر ابھی زیر تعمیر ہی تھا اور ابھی شاہی محلات کی تعمیر کا سلسلہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب کی بڑھتی ہوئی علالت کی خبر شہزادہ عظیم الشان کو پٹنہ میں ملی۔ یہ اورنگ زیب کے آخری ایام تھے۔ دارالسلطنت کی فضا میں سیاسی بحران اور خانہ جنگی کی علامتیں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ شاہزادہ عظیم الشان بڑی عجلت میں دہلی روانہ ہوا۔ کروڑوں روپے جو عظیم آباد کی تعمیر کے لئے رکھے تھے ان کو بھی سیاسی ضرورت کے لئے اپنے ساتھ لیتا گیا اور اپنے پیارے شہر سے اس طرح رخصت ہوا کہ پھر واپس نہ لوٹا۔ عظیم الشان کی قسمت کے ساتھ عظیم آباد کی قسمت بندھی ہوئی تھی۔ یہاں سے جانے کے کچھ دنوں کے بعد شاہزادہ عظیم الشان ایک لڑائی میں شہید ہوا اور عظیم آباد کی ادھوری تعمیر اس کی اچانک موت پر نوحہ کرتی رہ گئی۔

پٹنہ کی چند مشہور اور تاریخی عبادت گاہیں

مسجدیں پٹنہ میں پاس ہی پاس ملتی چلی جائیں گی۔ جن میں کچھ تو اچھی حالت میں ہیں اور کچھ بالکل شکستہ حالت میں۔ بہت سے محلے اب پٹنہ میں ایسے ہیں جہاں کی مسلم آبادی خدا جانے کہاں کھسک کر جابسی ہے مگر ان کی یادگاریں مقبروں، مسجدوں، خانقاہوں اور امام باڑوں کی شکلوں میں موجود ہیں۔ مقبروں میں مکانات بنتے جاتے

ہیں، مسجدیں، خانقاہیں اور امام باڑے گر گر کر گزرے ہوئے زمانے کی نوحہ خوانی کر رہے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ شہر کی وسعت اور اس کی آبادی کا اگر تناسب نکالا جائے تو وسعت اور مسلم آبادی کے لحاظ سے پٹنہ میں بھی دلی اور لکھنؤ سے کم مسجدیں نہ ملیں گی۔ انہیں مسجدوں میں چند مسجدیں بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو شیر شاہ کی بنائی ہوئی مسجد جو محلّہ دھولپورہ میں ہے ملے گی۔ دوسرے نمبر پر نواب سیف خاں کی مسجد ہے جو مدرسہ کی مسجد کہلاتی ہے اور دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ تیسری مسجد شہزادہ پرویز کی بنائی ہوئی ہے۔ شاہزادہ پرویز شہنشاہ اورنگ زیب کا لڑکا تھا۔ یہ پتھر کی مسجد کہلاتی ہے۔ چوتھی مسجد نواب فخر الدولہ کی ہے جو نوابان مرشد آباد میں سے تھے۔ چوک میں خواجہ عنبر کی مسجد ہے۔ خواجہ عنبر دلی میں شاہی محلات کے خواجہ سرا تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دھڑا دھڑ ایک کے بعد دوسرا شہزادہ تخت دلی پر بٹھایا جاتا اور پھر قتل کر دیا جاتا۔ خواجہ عنبر سے یہ ہولناک وارداتیں نہ دیکھی گئیں۔ وہ دلی چھوڑ کر پٹنہ چلے آئے اور یہیں اپنے دوران قیام میں انھوں نے ایک مسجد بنوائی جو ان کے نام کی یادگار ہے اور عنبر کی مسجد کہلاتی ہے۔ محلّہ دولی گھاٹ میں نواب علی ابراہیم خان کا بنایا ہوا پشتہ اور ان کی بنائی ہوئی عالیشان مسجد ملتی ہے۔ نواب علی ابراہیم خان دور مغلیہ میں حکومت کے اراکین سے تھے۔ چوک سے آگے بڑھئے تو حاجی تاتار کی مسجد ملتی ہے۔ حاجی تاتار دور مغلیہ کے آخری عہد میں بڑے کاروباری آدمی تھے۔ ایک اور بڑی مسجد خواجہ کلاں میں ساحل دریا سے آگے بڑھ کر دریا میں کچھ آگے تک نکلی ہوئی آپ کو نظر آئے گی۔ یہ مسجد خواجہ کلاں کی مسجد کے نام سے موسوم ہے جن کے نام سے یہ محلّہ مشہور ہے۔ ان کے علاوہ اور سینکڑوں مسجدیں پٹنہ میں ہر طرف آپ کو تھوڑی تھوڑی دور پر ملتی جائیں گی۔ جن کا تذکرہ یہاں لاحاصل ہوگا۔ انہیں میں مسماۃ محمدی جان کی مسجد پٹنہ سیٹی میں ہے جسے پٹنہ کی مخیّر خاتون محمدی جان نے انیسوی صدی کے آخیر میں تعمیر کرایا۔ مسجد کی عمارت کے

علاوہ مسجد کے منتظمین کے لئے بھی مکانات بنوائے۔ اسی کے ساتھ ایک مدرسہ کی عمارت بھی ملحق ہے۔ مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے قیام گاہ بھی ہے۔ غرض یہ مسجد بڑی عالیشان ہے۔ مسجد و مدرسہ اور مسافروں کے کھانے پینے کے اخراجات کے لئے مسماۃ محمدی جان نے ایک بڑی جائداد بھی وقف کردی تھی۔

بیگو حجّام کی مسجد

پٹنہ کی تاریخی عمارتوں میں بیگو حجّام کی مسجد اپنے طرز عمارت کے باعث ایک منفرد امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ بیگو حجّام کی یہ مسجد پٹنہ سیٹی کے مشہور ہفت خانہ، جس کو لوگ سنگھروا بھی کہتے ہیں، اس کے سامنے واقع ہے اور خواجہ کلاں کے تھانے کے بالمقابل بھی اس کا کچھ حصہ پڑتا ہے۔ میں نے اس مسجد کا تذکرہ اپنے عزیز ڈاکٹر قیام الدین احمد سے بھی کیا جو پٹنہ یونیورسیٹی میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر قیام الدین احمد پٹنہ میں اور صوبہ کے اندر اور باہر بھی آثار قدیمہ کا کھوج لگاتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے دوسرے ماہرین آثار قدیمہ سے بڑھ کر بیگو حجام کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کی ہیں اور بہت سی قدیمی کتبات پر مشتمل ایک کتاب جو انھوں نے لکھی ہے اس میں بھی بیگو حجام کی مسجد کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے ان کی کتاب سے ماخوذ مختصر طور پر میں بیگو حجام کی مسجد کی تاریخ پیش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر قیام الدین احمد[1] کہتے ہیں کہ پٹنہ سیٹی میں جو سب سے قدیم کتبہ ملا ہے وہ بیگو حجام کی مسجد کا ہے جو مسجد کے اندرونی حصہ میں داخل ہونے کے تین دروازوں میں سے ایک دروازے کے محراب پر لگا ہوا ہے اور یہ مسجد خواجہ کلاں تھانہ کے آمنے سامنے شاہراہ کے دوسری طرف اتر کی جانب واقع ہے اور یہ مسجد عام طور سے بیگو حجام کی مسجد کہلاتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "بیگو" اصل میں بیگ ہے جو

[1] پروفیسر قیام الدین کا ۲۷ اگست ۱۹۹۸ء کو انتقال ہو گیا،

لفظی طور پر بگڑ کر بیگو ہو گیا ہے کیونکہ اصل نام جو کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے وہ بیگ محمد ہے جس کا لگایا ہوا کتبہ بھی مورخہ ۱۰۵۶ھ میں لگا ہوا موجود ہے۔

مسجد کے زیادہ تر حصہ میں تبدیلی آچکی ہے۔ ان تبدیلیوں کے بعد صرف مسجد کا اندرونی حصہ جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے مخصوص ہے اور اس پر بنے ہوئے تین گنبد اپنی اصل شاخت تعمیر کے ساتھ باقی ہیں۔ بہت قبل سید محمد صاحب نے اس مسجد سے متعلق کتبہ کا مضمون بغیر پلیٹ کے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا تھا اس کے ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں اس مسجد میں ایک بہت خوبصورت پتھر کا بنا ہوا دروازہ دکھن کی جانب شاہراہ کی طرف نکلنے کا تھا۔ اور مسجد کا صحن چکنے اور خوشنما پتھروں سے مزین تھا۔ اب وہ خوبصورت پتھر کا دروازہ بھی غائب ہے اور وہ پتھر جو اس میں لگے ہوئے تھے ان کا بھی پتہ نہیں لیکن بڑی خوبصورتی سے پتھر سے کاڑھا ہوا ابھی تک ایک دریچہ مسجد کے باہری دروازے کے اوپر لگا ہوا ہے۔ جو دیکھنے میں لکڑی کا معلوم ہوتا ہے جس میں ایک گھڑی بھی نصب کردی گئی ہے مگر وہ دریچہ پتھر ہی کا ہے جو سیاہ پتھر ہے۔ غالباً یہ پتھر پالا عہد کا ہے اور ایک ایسا ہی دریچے کا فریم ٹوٹا ہوا نماز پڑھنے کے ہال میں ایک طرف رکھا ہوا ہے۔ جس پر دو سطریں عربی نثر کی موجود ہیں جن میں اس مسجد کے تعمیر کرنے والے خان معظم نظیر خان کا نام لکھا ہے جو سلطان علاء الدین حسین شاہ کے زمانے میں تھا۔ اس کتبہ میں تاریخ ۹۱۶ھ درج ہے جو ۱۵۱۰ء کے مطابق ہے۔ عربی میں اس کتبہ کی عبارت یوں ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بنی مسجداً للہ بنی اللہ لمہ بیتا مثلہ فی الجنة بنی ھذا المسجد الجامع فی عھد السلطان علاء الدین والدین ابو ماظفر حسین شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ و سلطنة وبانیہ خان معظم ناظر خان دام علوہ' فی سنة بائة عشر و تعمانیہ.

اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہوا ہے فرمایا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے

بنایا مسجد اللہ کے لئے تو اللہ بنائے گا اس کے لئے ایسا ہی گھر جنت میں۔

"یہ مسجد جامع تیار ہوئی عہد سلطنت میں سلطان علاء الدنیا داد چہ و مظفر سلطان۔ اللہ تعالیٰ ان کی حکومت اور سلطنت کو ہمیشہ باقی رکھے اور اس مسجد کے بنانے والے خاندان معظم نظیر خاں ہیں اللہ ان کی عزت بڑھائے۔ یہ مسجد ۱۹۱۶ء میں بنی ہے۔

ایک دوسرا کتبہ، جو بیگو حجام کی مسجد میں نماز پڑھنے کے ہال کے بیچ کے دروازے میں پایا گیا اس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک خوبصورت مسجد پٹنہ شہر میں بیگ محمد نے ۷-۱۹۴۶ء میں تعمیر کی۔ سنہ ہجری کا یہ ۲۵۶ سال ہے جو اس قطعہ تاریخ میں درج ہے۔

ساختہ بیگِ محمد نیک رائے　　　معبدے در شہر پٹنہ خانجائے

گفت معمارِ خرد تاریخ آں　　　مسجد زیبا و روشن شد بنائے با! ۱۰۵۶ھ

اس کتبہ میں لکھے ہوئے قطع تاریخ سے سنہ ۱۰۵۶ھ نکلتا ہے اس کی وجہ سے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ مسجد کا اپنا طرز تعمیر اور وہ پتھر جن پر عربی میں لکھی ہوئی تاریخ صاف طور پر بیان کرتی ہے کہ یہ مسجد ۱۹۱۶ھ میں علاء الدین حسین شاہ کے دورِ حکومت میں بنی۔ دوسرے کتبہ میں جو تاریخ تعمیر مسجد کی ۱۰۵۶ھ ہے اور جس کے تعمیر کرنے والے کا نام بیگ محمد ظاہر ہوتا ہے اس کے متعلق مزید غور و شہادت کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے اصل مسجد کو خانِ معظم ناظر خاں نے تعمیر کیا تھا۔ مسجد میں اس کی توسیع و ترمیم کا کام بیگ محمد نے انجام دیا۔ اس کا ثبوت مسجد کا طرز تعمیر ہے اور یہی طرز تعمیر سلاطین بنگالہ کے دور میں بنگال میں رائج بھی تھا اب رہا بیگو حجام کا نام جو بانی مسجد کے سلسلہ میں لوگوں کی زبان پر ہے تو اس کے لئے یہ جواب کافی ہے کہ بیگو، بیگ محمد کا بگڑا ہوا نام ہے مگر حجام کا لفظ جو ایک بہت نیچے طبقے سے ہے، اس کا پتہ نہیں چلتا ہے کہ وہ کس طرح بیگو سے منسلک ہو گیا۔

یہ تاریخی مسجد ساٹھ، ستر برس قبل کسمپرسی کی حالت میں تھی، اب بحمد اللہ

یہ بہت اچھی حالت میں ہے اس کی متعلقہ دوکانوں کی آمدنی مسجد کے سارے اخراجات
کی کفیل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہاں نماز پڑھنے والوں کی بڑی جماعت بھی اس کی
خوشحالی اوراسکی ہر دلعزیزی کی دلیل صاف ہے۔

شیر شاہ کی مسجد

پٹنہ میں کچھ پرانے لوگوں کی زبانی یہ قصہ مشہور تھا کہ ایک دفعہ شیر شاہ
بنگالہ کی کسی مہم پر جارہا تھا۔ پٹنہ راستے میں پڑتا تھا۔ ایک دن کے لئے شیر شاہ نے
یہاں قیام کیا۔ شاہی خیمے اور خرگاہیں اتفاق سے وہیں لگائی گئیں جہاں آج اس کی بنائی
ہوئی مسجد کی عمارت قائم ہے۔ رات کے وقت شیر شاہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک
بڑی وسیع اور شاندار مسجد کے اندر نماز پڑھ رہا ہے۔ صبح کو اٹھا تو نیند میں دیکھی ہوئی
مسجد کا نقشہ یاد تھا۔ حکم شاہی ہوا کہ اس نقشہ کی عمارت اسی جگہ تعمیر کی جائے تاکہ
بادشاہ جب بنگالہ کی مہم سے واپس لوٹے تو اسی مسجد میں نماز پڑھے۔ چنانچہ شیر شاہ کی
واپسی کے قبل یہ مسجد تیار ہو گئی اور بنگالہ سے لوٹتے وقت شیر شاہ نے اسی میں نماز
پڑھی۔ اس واقعہ کی تاریخی شہادت نہیں ملتی ہے مگر اکثر زبانوں پر پٹنہ میں یہ واقعہ
سنے سنائے ہوئے طور پر جاری ہے۔ بہر حال یہ بات تو بالکل ثابت ہے کہ اس مسجد کی
سائستان عمارتوں سے ملتی ہے جو شیر شاہ کے دور سلطنت کی یادگاریں ہیں اور جس کی
تعمیر شیر شاہ کی حکم سے ہوتی گئی۔ صناعی کے لحاظ سے بھی یہ مسجد فن تعمیر کا ایک
شاہکار ہے۔ اصل میں ایک گنبد کی بڑی وسیع اور سربلند مسجد ہے جس کی وسعت میں
نمازیوں کی بہت بڑی تعداد سما جائے۔ باہر سے دیکھئے تو یہ مسجد پانچ گنبدوں کی نظر آتی
ہے۔ تعمیر کرتے وقت معماروں نے یہ ندرت رکھی تھی کہ چاروں گوشوں پر اصلی
گنبد سے لگا ہوا ایک ایک گنبد اس طرح بنا کر ترتیب دیا تھا کہ باہر سے دیکھنے والوں کو
یہ مسجد پانچ گنبدوں پر بنی ہوئی نظر آئے گی مگر اندر جاکر دیکھیں تو وہی اصلی ایک گنبد
مسجد کی پوری اندرونی وسعت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے دکھلائی دے۔ ایک وسیع

اور اونچے خطہ زمین کے چاروں طرف مضبوط اور پختہ پشتہ باندھ کر بیچ میں اینٹوں اور مسالوں سے اس مسجد کی وسیع عمارت کھڑی کی گئی تھی جس کے صحن کے حلقے میں رواق اور حاشئے کے مکانات بھی تھے اور جن کے مبہم آثار بڑی تلاش سے زمین سے لگے ہوئے کہیں کہیں ملتے ہیں۔ اس مسجد کی نگہداشت اور اس کے ضروری اخراجات کے لئے نہ پہلے کسی آمدنی کے ذریعہ کا پتہ چلتا ہے۔ اور نہ آج کوئی آمدنی ہے۔ محمد قاسم مرحوم محلہ دھولپورہ کے ایک مخیّر رئیس تھے۔ وہ زندگی بھر مسجد کے اخراجات کی ہر طرح کفالت کرتے رہے ان کے انتقال کے بعد آس پاس کے غریب مسلمان اپنی استطاعت کے مطابق اس کی خدمت کرتے ہیں اور نمازیں بھی وہی آکر پڑھتے ہیں غالبا ۱۹۱۷ء میں میرے والد مرحوم خان بہادر سید ضمیر الدین احمد نے اس وقت کے انگریز صوبائی گورنر سر ہنری وہیلر کی توجہ اس مسجد کی طرف دلائی تھی کہ محکمہ آثار قدیمہ کے تحت اس کی بھی نگہداشت و نگرانی کی جائے۔ سر ہنری وہیلر والد مرحوم کے یہاں آئے اور دونوں پھر مسجد دیکھنے بھی گئے۔ سر ہنری وہیلر اس مسجد کی تاریخی عظمت اور اس کے فن کی ندرت سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے خاص طور سے حکومت ہند کے پاس سفارشی خط لکھا کہ یہ مسجد بھی محکمہ آثار قدیمہ کے اندر لے لی جائے۔ بہت کچھ امید بندھ چلی تھی کہ کچھ دنوں کے بعد سر ہنری وھیلر مستعفی ہو کر انگلستان چلے گئے۔ دوسرے گورنر آئے تو ان کو بھی والد مرحوم نے اس کام کی طرف متوجہ کیا۔ وہ صرف وعدے ہی کرتا رہا۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد والد مرحوم کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ یادگار مسجد بالآخر محکمہ آثار قدیمہ کی نگرانی میں نہ آسکی۔ یہ سب تو ایک طرف مگر ذرا اس کا ملاحظہ کیجئے کہ شیر شاہ نے نہ جانے کس خلوص نیت اور کس جذبہ ایمانی کے ساتھ اس مسجد کی تعمیر کا حکم دیا تھا کہ باوجود شکستہ حال ہونے کے بھی مسجد بہار کے ۱۹۳۴ء کے تباہ کن زلزلہ کے جھٹکوں کو بڑی حد تک برداشت کر گئی۔ چار گوشوں کے نمائشی گنبد تو ضرور اس زلزلہ کے نذر ہوئے مگر اصل گنبد تو پھر بھی علیٰ حالہ باقی

رہا جہاں غریب مسلمان عیدین کی نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور پھر انہیں کے جوش ایمانی سے رات اور دن میں پانچ دفعہ نماز کی صفیں بھی بچھ جاتی ہیں۔ انگریزوں کی حکومت تو غیر ملکی تھی مگر آج ہندوستان میں اپنی ملکی حکومت بھی ہندوستانی بادشاہ شیر شاہ کی بنائی ہوئی تاریخی مسجد کی بقاء کے مسئلے سے بے پرواہ ہے۔ بہرحال یہ مسجد غریب نمازیوں کے بل بوتے پر پہلے بھی کھڑی تھی اور آج بھی کھڑی ہے۔

سیف خاں کی مسجد

اب آیئے زمانہ مابعد کی تاریخی مسجد سیف خاں کی بھی کچھ جھلک دیکھ لیجئے۔ شیر شاہ کے بنائے ہوئے قلعہ سے پچھم کی طرف کچھ آگے بڑھ کر دریائے گنگا کی موجوں سے ٹکراتے ہوئے سیف خاں کی مسجد کے پشتے اور اس کی فصیلوں کی برجیاں آج بھی آپ کو ملیں گی۔ سامنے اتر کی طرف پچھم سے پورب کی جانب شان و شکوہ کے ساتھ بہتا ہوا دریا، جس کی چوڑائی برسات میں چھ میل تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے، ایسا شاندار نظارہ پیش کرتا ہے جو ساحل گنگا پر بسے ہوئے اور دوسرے شہروں میں اس طرح کہیں نظر نہ آئے گا۔ دریا کے سینے پر بڑی بڑی کشتیاں اپنے بادباں کو لئے ہوئے پورب سے پچھم اور پچھم سے پورب دن و رات آتے جاتے سینکڑوں دکھلائی دیں گی۔ ان پر غلوں کا انبار اور تجارت کے مال پٹنہ سے ہی نہیں بلکہ بنارس اور الہ آباد سے بھی آج تک کلکتہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ پٹنہ دریائے گنگا کے کنارے پر غلوں کی تجارت کی بڑی منڈی ہے۔ ریلوں کے ہوتے ہوئے بھی کشتیوں کے ذریعہ غلوں اور دوسری تجارت کی چیزوں کی۔ درآمد اور برآمد کلکتہ اور بنگال کے دوسرے شہروں سے اسی طرح آج بھی قائم ہے جس طرح اگلے زمانے میں تھی۔ پٹنہ سے پچیس یا تیس میل آگے پچھم کی طرف دریائے سون آکر گنگا میں گرتا ہے۔ دریائے گنڈک اتری بہار کی کئی ندیوں کے پانی کو سمیٹتا ہوا شہر پٹنہ کے مقابل میں گنگا میں شامل ہو جاتا ہے۔ برسات میں دریا کی روانی، موجوں کا پیچ و تاب، سطح آب پر رقص کرتے ہوئے ہزاروں چھوٹے بڑے بھنور کا نظارہ

دریا کی سیر کے لطف کو اور بڑھا دیتا ہے۔ کبھی یہ بھی نظارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جبکہ بیچ دریا میں اٹھتی اور گرتی ہوئی لہروں کے درمیان کوئی بڑی کشتی اپنے ملاحوں کے قبضہ سے باہر موجوں کے رحم و کرم پر بے تحاشہ تیزی کے ساتھ دریا کے بہاؤ پر جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کشتی سے اس کے ملاحوں کا دوسری کشتیوں کو سہارا دینے کے لئے اشارہ کرنا اور کشتی کے مسافروں کی بے بسی یہ سب ساحل دریا پر کھڑے دیکھنے والے حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ کبھی ہمت کر کے مدد کے لئے کنارے سے کچھ کشتیاں باد باں لگائے ہوئے اس کشتی کو سہارا دینے کے لئے آگے بڑھتی ہیں مگر دور چل کر ساحل کی طرف پھر اپنا رخ موڑ لیتی ہیں کیونکہ دریا کی بے رحم موجیں اس کے لئے بھی خطرات کا سماں پیش کرنے لگتی ہیں۔ کبھی تو ملاحوں کے قبضہ سے باہر یہ بے بس کشتی یوں ہی اللہ کے نام پر بہتی ہوئی حد نظروں سے باہر نکل جاتی ہے اور کبھی آنکھوں بھی اس کا بہاؤ پر چل کر رک جاتا ہے اور کسی بڑے بھنور میں پھنس کر وہ رقص لبمل کی طرح چکر لگانے لگتی ہے اور چند منٹوں کے اندر دریا کے اندر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک اور چیز جو سطوت دریا کے شکوہ کو بڑھاتی ہے وہ دریا کے اتیز دھاروں کی گونج بھی ہے جو اس طرح عام طور پر دوسرے دریا کے دھاروں سے نہیں پیدا ہوتی۔

یہی دریائے گنگا برسات کے طغیاں کا دور ختم کر کے معتدل اور سرد و خشک موسم میں دوسرا دلفریب پیش کرتا ہے۔ گنگا کی چھاتی پر جہاں برسات میں بلاخیز موجیں اٹھتی رہتی ہیں اس جگہ اب نرم و چمکدار روپہلی ریت کے تودے نظر آتے ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر ادھر اُدھر کئی ریگستان نظر آنے لگتے ہیں جو کہیں چٹیل کہیں طرح طرح کے غلوں کی ہریالی سے ہرے بھرے دکھلائی دیتے ہیں۔ دریا سمٹ کر ایک ندی بن جاتی ہے۔ جس میں بافراغت اسٹیمر اور بڑی بڑی کشتیاں چلتی رہتی ہیں۔ گذرے ہوئے زمانے میں جاڑے میں اور شروع گرمی کے دنوں میں دریا کے ساکن و شفاف سینے پر رنگ برنگ کے بجرے اور چھوٹی چھوٹی پستی ہر وقت نظر آتی تھیں۔ جن میں سیر و تفریح

کے لئے لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ دریا پر موجود ہوئے تماشہ بینوں کو لبھائے رکھتی تھی۔ دریا کے اس ریت کے میدان میں جب رئیسوں کا مجمع ہوتا تو کنکوا بازی اور پتنگ بازی کا مقابلہ ہوتا۔ متعدد کنکوے اور پتنگ بازوں کے بنے رہتیں۔ داؤں بدھے جاتے پنچیں لڑائی جاتیں اور دن بھر ریت پر ایک میلہ سا لگا رہتا۔ خوانچے والے گھومتے پھرتے، تماشہ بین ان سے مزے مزے کی چیزیں خریدتے اور کھاتے، تنبولیوں کی دوکانیں بھی چار قرینے سے لگ جاتیں۔ یہی دریا کا ساحل سیف خاں کی مسجد کا جائے وقوع ہے۔ محلّہ چوک کے پاس ساحل دریا سے لگے ہوئے دکھن کی طرف دور تک مستحکم پختہ پشتہ باندھ کر ۱۶۲۹ء میں صوبہ بہار کے گورنر سیف خاں نے ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی و سیف خاں شاہجہاں کے ہم زلف تھے۔ جن کی شادی ممتاز محل کی بہن سے ہوئی تھی۔ سیف خاں کی مسجد پٹنہ میں مدرسہ کی مسجد کے نام سے بھی مشہور ہے۔ وسعت کے لحاظ سے بھی یہ مسجد ہندوستان کی بڑی بڑی مسجدوں کے پیش نظر آئے گی۔ اگرچہ اس کا صحن اب چھوٹا کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی مسجد کے اصلی صحن کی جگہ مسجد سے لگی اب بھی باقی ہے۔ یہاں اب نمازیوں کی گاڑیاں، رکشے اور دوسری سواریاں کھڑی رہتی ہیں۔ پورے صحن کی وسعت لاہور یا دہلی کی جامع مسجدوں سے کم نہ تھی۔ وہ زمین بھی جس کو اب صحن مسجد سے باہر کر دیا گیا ہے وہ سب کی سب صحن مسجد کا حصہ تھی جس کے بیچوں بیچ بڑا کشادہ حوض تھا جس میں فوارے چلتے رہتے تھے اور اس کشادہ حوض کے ارد گرد وضو کرنے والوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ اس صحن سے لگی ہوئی دریا کے کنارے متعدد چھوٹی چھوٹی خوبصورت برجیاں تھیں جن میں بیٹھ کر نمازی دریا کی سیر کا لطف اٹھاتے تھے۔ ان برجیوں میں سے باقی رہ گئی ہیں۔ صحن مسجد سے لگی ہوئی دریا کی طرف اترنے کے لئے پتھروں کی بنی ہوئی سیڑھیاں بھی ہیں۔ مسجد کے چاروں طرف رواق بنے ہوئے تھے ان میں سے دو چار پورب کی جانب ابتر حالت میں اب بھی موجود ہیں۔ مدرسہ کی عمارت تو بہت کچھ گر چکی ہے مگر اس کے ایک حصہ پر مولوی محمد یحیٰ صاحب کا قبضہ تھا اور اس کو

انھوں نے درست کر کے اپنا رہائشی مکان بنوایا تھا جو اب بھی قائم ہے۔ مسجد کے پچھم طرف کے افتادہ زمینوں میں آج کل سکھوں نے بڑے بڑے کارخانے اور مکانات بنا لئے ہیں اس لئے مسجد تک پہونچنے کا راستہ بھی تنگ ہو گیا ہے۔ اور اس کی عظمت جو دور سے نمایاں رہتی تھی وہ بھی تقریباً ڈھک گئی ہے۔ مسجد کی عمارت اچھی حالت میں ہے، یہاں نمازیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی مذہبی اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور آزادی سے پہلے یہیں مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی جلسے بھی ہوتے تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں اور مسٹر فضل الحق مرحومین کی تقریروں سے کبھی یہاں کی فضا گونجتی رہتی تھی۔

سکھوں کا ایک تاریخی گردوارہ

جب سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر سنگھ جی دہلی کی شاہی فوجوں کے تعاقب سے بچتے بچاتے آسام کی طرف جا رہے تھے تو اس سفر میں ان کی بیوی ماتا گجری بھی ساتھ تھیں جن کے وضع حمل کا زمانہ بھی قریب آرہا تھا۔ راستہ میں پٹنہ پڑتا تھا۔ گرو تیغ بہادر سنگھ جی جب پٹنہ پہنچے تو انھوں نے اپنی بیوی ماتا گجری کو وضع حمل کے لئے پٹنہ میں چھوڑا اور خود آسام کی طرف بڑھ گئے۔ پٹنہ میں ماتا گجری کا قیام پٹنہ کے ایک نامی جوہری کی حویلی میں تھا۔ یہ حویلی ہرمندر کی گلی میں واقع تھی، اسی حویلی میں ماتا گجری کو وضع حمل ہوا اور یہیں گرو گوبند سنگھ جی پیدا ہوئے۔ یہ ۱۶۶۰ء کا زمانہ تھا اور دسمبر کی ۲۲ر تاریخ تھی۔ اس وقت تمام ہندوستان کی عنان حکومت شاہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں میں تھی۔ ابھی گرو گوبند سنگھ جی کی عمر نو ہی سال کی تھی کہ ان کے والد تیغ بہادر سنگھ جی کا انتقال ہو گیا جس کے بعد ہی بچپن میں گرو گوبند سنگھ جی دسویں گرو کی حیثیت سے اپنے باپ کی جگہ پر مسند نشیں ہوئے اور پٹنہ کو خیر باد کہہ کر پنجاب

چلے گئے۔ ان کا بچپن گذرا اور جوانی آئی تو سیاسی جدو جہد کی دنیا میں انھوں نے بھی قدم رکھا۔ سیاسی سوجھ بوجھ ان کی بڑھی ہوئی تھی، ہمت کی بھی کمی نہیں تھی جس نے یہ لگن ان کے دل میں لگائی کہ سکھوں کو پستی سے اٹھا کر بلندی تک پہنچائیں، ان میں نئی زندگی پھونکیں اور ان کو ایک مضبوط فوجی اور منظم جماعت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے نئے اصول بنائے جس میں ہر وقت ہتھیاروں سے لیس رہنا بھی ایک مذہبی رکن قرار پایااور ساتھ ہی ساتھ' سلطنت مغلیہ کر خارف لغاوت کا جذبہ بھی پرورش کیا جانے لگا۔ تنظیم کی جان میں ہمہ گیر بنانے کے لئے یہ نعرہ بھی اٹھایا گیا۔

چو کار از ہمہ چلتے در گزست
علاں است برون بہ شمشیر دست

یہ نعرہ جو گرو گوبند سنگھ جی نے اپنی زندگی میں بلند کیا تھااس کے بعد برسوں پنجاب کی فضا میں گونجتا رہا۔ گرو گوبند سنگھ جی کی اصلاحی تنظیم میں سیاسی مقصد بھرے ہوئے تھے۔ ان کی دوربین آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ سلطنت مغلیہ کی وسیع حکومت میں جگہ جگہ شگاف پڑنے والے ہیں۔ جس سلطنت کو شہنشاہ اورنگ زیب کے مضبوط ہاتھوں نے وسعت دی تھی اس کی عنان ان کے بیٹوں کے کمزور ہاتھوں میں ڈھیلی پڑنے والی ہے۔ پنجاب کا صوبہ بھی چند اقتدار پسند اراکین حکومت کے درمیان رسہ کشی کا مرکز بن جائیگا۔ اگر ایسے وقت میں سکھوں کی مضبوط تنظیم پنجاب میں موجود رہی تو آئندہ ملک کی افرا تفری میں یہی جماعت پنجاب میں ایک نئی حکومت کی سربراہ بھی بن سکتی ہے۔ گرو گوبند سنگھ کا یہ اندازہ غلط نہ تھا۔ بعد کے واقعات نے اس اندازے کو صحیح ثابت کر دکھایا اور آخر وہ زمانہ آیا جب سلطنت مغلیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سکھ حکومت قائم کرلی۔

پٹنہ میں وہ جہاں گرو گوبند سنگھ جی پیدا ہوئے تھے بڑی مقدس جگہ قرار پائی۔
جب مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب کے فرماں روا ہوئے تو اسی جگہ انھوں نے پٹنہ میں ایک گردوارہ بنوایا جس کا نام تخت سری ہر مندر رکھا گیا۔ گرو گوبند سنگھ جی کی جائے پیدائش ہونے کے سبب سے پٹنہ کا بھی تقدس بڑھا جس کو اکثر سکھ حضرات پٹنہ صاحب کہتے ہیں اور اسی تقدس کے باعث پنجاب سے سال بھر سکھ زائرین کی ٹولیاں برابر پٹنہ آتی رہتی ہیں۔ جب گرو گوبند سنگھ جی کی پیدائش کا زمانہ آتا ہے تو ہزاروں ہزار سکھ پنجاب سے آجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ پٹنہ بہار کا نہیں بلکہ پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ تاریخ ولادت کے دن شام کے وقت ایک بڑا جلوس پٹنہ کے ایک دوسرے گردوارہ سے نکلتا ہے یہ گردوارہ تخت ہر مندر کے گردوارہ سے تقریباً دو میل پچھم محلہ گائے گھاٹ میں واقع ہے۔ اگلے زمانہ میں یہ جلوس مختصر طور پر نکلتا تھا جس میں کچھ پنجاب سے آئے ہوئے زائرین شریک ہوتے تھے اور تھوڑے بہت سکھ جو گردوارہ میں رہتے تھے وہ اور کچھ تجارت کے سلسلہ میں یہاں جو مقیم ہوتے تھے وہ سب مل کر جلوس نکالتے تھے۔ مگر ہندوستان میں جب سیاست کی ہوا تیز ہوئی تو اپنے اس قومی اور مذہبی تہواروں میں سکھوں نے پنجاب سے بڑی تعداد میں آکر حصہ لینا شروع کیا اب تقسیم ہندوستان و پاکستان کے بعد پہلے کا یہ مختصر جلوس ایک عظیم الشان جلوس ہو گیا ہے جس میں پنجاب سے آئے ہوئے ہزاروں سکھ مرد و عورت اور بچے شریک رہتے ہیں۔
اس کے علاوہ اب پٹنہ میں بسنے والے سکھوں کی آبادی بھی کئی ہزار تک پہنچ گئی ہے جو بڑے جوش و خروش کے ساتھ جلوس کے اہتمام میں لگی رہتی ہے۔ چونکہ اس جلوس کے نکلنے کا وقت شام کو ہوتا ہے اور بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ جگہ جگہ رک کر یہ جلوس آگے بڑھتا ہے اس لئے جلوس کے ساتھ روشنی کا سامان بھی کافی رہتا ہے۔ رتھوں اور کھلی ہوئی موٹروں پر عورتیں اور بچے جلوس کے ساتھ رہتے ہیں۔ جلوس میں متعدد باجہ بجانے والوں کی ٹولیاں ساتھ چلتی ہیں۔ آگے پیچھے ہزاروں سکھوں کا ہجوم رہتا ہے۔ جس کے

بیچ میں ایک رتھ پر گرو گرنتھ کو لئے سکھوں کے چند پیشوایان مذہب بیٹھے رہتے ہیں۔ قدم قدم پر "ست سری اکال بولے سونہال" کے نعروں سے فضا گونجتی رہتی ہے۔ پانچ چھ گھنٹوں میں یہ جلوس دو میل کی مسافت طئے کر کے تخت ہر مندر میں پہنچتا ہے۔ اس وقت رات بھی اپنی آدھی مسافت طے کر چکی ہوتی ہے اور ٹھیک اسی وقت جس وقت گرو گوبند جی پیدا ہوئے تھے جلوس کے پہنچتے ہی مذہبی رسومات بڑی دھوم دھام سے ادا کی جانے لگتی ہیں۔ اس موقع پر بھی ہر مذہب کے ماننے والوں کو تخت ہری مندر کے گرودوارہ میں آنے جانے، تمام رسومات کو دیکھنے اور ہر طرف گھومنے پھرنے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ رات بھر تخت ہری مندر کا گرودوارہ "ست سری اکال بولے سونہال" کے نعروں سے گونجتا رہتا ہے۔ اس موقع پر گرو گوبند سنگھ کی پیدائش کے وقت کے تبرکات اور ان کے بچپن کے زمانے کی چیزیں بھی زیارت کے لئے نکال کر رکھ دی جاتی ہیں۔ یوم پیدائش کو جشن تین دنوں تک جاری رہتا ہے۔ ان تین دنوں میں گرودوارہ کے اندر بھجن اور کرتن ہوتے رہتے ہیں اور ہر مذہب کے لوگوں کے کھانے کے لئے عام لنگر خانہ جاری رہتا ہے۔ پچاسوں من کھانے پکتے رہتے ہیں اور مسافروں، غریبوں، محتاجوں میں تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد اس گردوارہ کی عمارت نئی ترمیموں کے ساتھ اور بھی وسیع اور عالیشان بن گئی جس کا مرمرین گنبد عمارتوں سے اونچا دور تک جھلکتا ہے۔ اس کا کلس دن میں آفتاب پر چشمک زنی کرتا ہے اور رات میں اس کا برقی قمقمہ ستارہ بن کر دمکتا رہتا ہے۔ گرودوارہ کا وسیع صحن بھی سنگ مرمر کا بن گیا ہے اور وہ کنواں بھی جس کا پانی گرو گوبند سنگھ جی اپنے بچپن میں پیتے تھے او جس کے پانی سے نہاتے تھے اس کا جگت بھی اب سنگ مرمر کا خوبصورت بنا ہوا نظر آتا ہے۔ گرو گوبند سنگھ جی یادگار میں ۱۹۵۸ء میں سکھوں نے ایک ڈگری کالج کی بنیاد رکھ دی جس کا نام گرو گوبند سنگھ کالج ہے۔ ہاں تو یہ لکھنا ہی بھول گیا کہ اس جشن پیدائش کے موقع پر ہر سال گرودوارے کے اند مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ پنجاب سے آئے ہوئے سکھ حضرات، پٹنہ میں بسے والے سکھ، یہاں کے

ہندو اور مسلمان سبھی اردو میں اپنی غزلیں خوب خوب پڑھتے ہیں، شاعروں کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے اور بڑی دیر رات گئے مشاعرے کی یہ صحبت ختم ہوتی ہے۔

پٹنہ میں ہندوؤں کے مندر

یہاں مندروں کی بھی کمی نہیں۔ ایک تو یہ ہندوستان کا پرانا تاریخی شہر ہے پھر یہاں کی آبادی میں بھی ہندوؤں کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ اس لئے ہر محلے میں نئے و پرانے مندر مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ دریائے گنگا کے لحاظ سے بھی دریا کے کنارے پچاسوں مندر نظر آئیں گے جہاں عقیدت مند اشنان کر کے دیوتاؤں پر گنگا جل اور پھول چڑھاتے ہیں۔ ہر مندر سے لگے ہوئے پختہ اور صاف ستھرے گھاٹ ملیں گیں جن کے بیچ میں پتھر کی متعدد سیڑھیاں ہیں جو اوپر سے نیچے دریا کے پانی تک پہنچا دیتی ہیں۔ ان گھاٹوں کے درمیان بھی اس طرح کی تقسیم کہ ایک مردوں کے اشنان کے لئے دوسرا عورتوں کے لئے۔ جب اشنان کر کے عورتیں اور مرد گھاٹ سے لگے ہوئے مندر میں پہنچے تو دیوتا اور دیوی پر گنگا کا پاک اور پوتر جل چھڑکا، تھالیوں سے پھول نکال کر ان کے چرنوں میں ڈالے، عقیدت کے ساتھ ڈنڈوٹ کئے، ماتھے پر صندل کے ٹیکے لگوائے، پجاریوں کے ہاتھ پر دان کے پیسے رکھے اور گھر لوٹے۔ دریا کے کنارے کچھ ایسے بھی گھاٹ ہیں جہاں ایک طرف مندر ہے اور اس سے قریب ہی مسجد بھی ہے۔ اس مسجد اور مندر کی قربت کو اگلے دنوں کے اتحاد اور محبت کی یادگار سمجھئے جب کہ اذان اور ناقوس میں سبھوں کو اللہ کی طرف بلانے کی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔

ان سب مندروں میں دو مندروں کا تذکرہ مقصود ہے اور یہ دونوں مندر قدامت اور اپنی عظمت کی وجہ سے بہت مشہور بھی ہیں۔ ایک تو بڑی پٹن دیوی مندر ہے اور دوسرا کالی استھان کا مندر ہے۔

بڑی پٹن دیوی کا مندر

عام روایات کے مطابق پٹنہ میں سب سے زیادہ پرانا اور تقدس کے لحاظ سے بھی بڑا یہی مندر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بنانے کی صحیح تاریخ نہ کسی کے ذہن میں محفوظ ہے اور نہ کسی مذہبی کتاب کے اوراق میں ملتی ہے۔ البتہ اس مندر کے متعلق عقیدت کی کہانیاں بہت سی مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب دیوتاؤں کا زمانہ تھا اور وہ جسمانی طور پر بھی اس دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اس زمانہ میں بڑے دیوتا مہادیو جی کی شادی پاروتی جی سے ہوئی تھی جو ایک راجہ کی بیٹی تھیں۔ راجہ کا نام ہماچل تھا۔ کچھ دنوں کے بعد راجہ ہماچل نے اپنی راجدھانی میں سب دیوتاؤں کی دعوت کی مگر اپنے داماد مہادیو جی کو نہ بلایا۔ پاروتی چونکہ راجہ کی بیٹی تھیں اس لئے باپ نے صرف اپنی بیٹی کو بلا بھیجا۔ پاروتی جی نے جب اپنے پتی دیو مہادیو جی سے اس دعوت میں شریک ہونے کی اجازت مانگی تو انھوں نے پاروتی جی کو جانے سے منع کیا۔ ایک تو ماں باپ سے ملنے کی تمنا پھر اس دعوت کی بڑھی ہوئی شہرت۔ پاروتی جی اپنے شوہر کے منع کرنے کے باوجود وہاں چلی گئیں۔ راجہ ہماچل نے اس دعوت میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ ایک طرف بڑا الاؤ بھی تھا جس میں ھماد اور خوشبو چیزیں جل رہی تھیں۔ جب دعوت میں سب دیوتا جمع ہوگئے اور ان میں پاروتی جی نے اپنے پتی دیو کی جگہ خالی دیکھی تو اس وقت ان کے دل میں بڑی کسک اٹھی۔ ایک تو شوہر کے کہنے کے خلاف اس دعوت میں شریک ہونا دوسرے اپنے باپ کے ہاتھوں شوہر کی یہ توہین کہ دیوتاؤں کے دعوت میں ان کو نہ بلایا۔ اس وقت پاروتی جی سخت نادم تھیں۔ دل امنڈ آیا تھا اور اب ان کو یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اس دعوت کا اصلی مطلب اور منشاء مہادیو جی کو ذلیل کرنا ہے۔ احساس وفا نے اتنی شدت پکڑی کہ یہ وفا کی دیوی پاروتی جی اپنے شوہر کی ذلت نہ برداشت کر سکیں اور الاؤ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں چھلانگ لگا دی۔ اس طرح جسمانی طور پر وہ جل کر خاک ہوگئیں۔ اس لئے ان کا نام ستی بھی پڑ گیا ہے کہ شوہر کی آبرو پر

انھوں نے آگ میں جل کر اپنی جان قربان کردی۔ جس وقت پاروتی جی آگ کے آلاؤ میں کودیں ان کے بدن کا کپڑا ان کے بدن سے علحدہ ہوکر ایک جگہ زمین پر گرا۔ راویوں کا بیان ہے کہ یہ وہی جگہ ہے بعد میں جہاں ان کی یادگار بڑی پٹن دیوی کا مندر بنایا گیا۔

موجودہ بڑی پٹن دیوی کا مندر پٹنہ میں محلہ مہاراج گنج میں واقع ہے۔ مگر دیکھنے میں اس کی عمارت بہت قدیم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے تاریخ کا کھوج لگانے والے اس مندر کو اصلی اور قدیم تاریخی مندر ماننے کو تیار نہیں ہوتے ہیں۔ غالباً ۱۹۴۷ء کے کچھ دنوں بعد کا واقعہ ہے کہ تاریخ ہند کے مشہور پروفیسر سید حسن عسکری دور مغلیہ کی ایک شاہی دستاویز کی بناء پر پٹن دیوی کے مندر کے اصل جائے بنا اور قدیمی جائے وقوع کی تلاش میں نکلے۔ ان کے ساتھ ام- اے کلاس کے ان کے کچھ شاگرد بھی تھے۔ مہاراج گنج سے آگے بڑھتے ہوئے صندل پور کی طرف آئے تو ایک جگہ انھوں نے دیکھا کہ ایک بڑے خطہ زمین میں گڑھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ گڑھے بھی بہت دنوں کے معلوم ہوئے جن سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ زمین میں یہ گڑھے کسی بڑی عمارت کی بنیاد کے کھودے جانے کی نشانیاں ہیں۔ اس گڑھے کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی نظر آیا آس پاس کے لوگوں نے بتایا کہ یہ پٹن دیوی جی کا مندر ہے۔ اس کی عمارت بھی زیادہ دنوں کی نہیں معلوم ہوئی۔ ان کو تو اصلی اور قدیمی مندر کی تلاش تھی کچھ آگے بڑھے تو دو سن رشیدہ ہندو حضرات سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ پٹن دیوی جی کا اصلی مندر وہیں پر تھا۔ جہاں اب گڑھے پڑے ہوئے ہیں۔ بہت دنوں کی بات ہے کہ جب یہ مندر شکستہ حالت میں ہوکر گر گیا تو لوگوں نے اس کی عمارت کو کھود کر اس کے پتھر اور اینٹ وغیرہ نکال لئے۔ بس یہ گڑھے پیدا ہوگئے اور اس کے کچھ دنوں بعد کچھ اور لوگوں نے اس کی جگہ پر پوجا کرنے کے لئے یہ چھوٹا مندر بنالیا۔ یہ کچھ لگتی ہوئی بات معلوم ہوئی۔ بہر حال

اب تو بڑی پٹن دیوی کا وہی مندر کہا جاتا ہے جو مہاراج گنج میں واقع ہے اور جہاں جاتریوں اور پوجا کرنے والوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ پٹنہ میں چوک کے محلّہ میں بھی ایک مندر ہے جو چھوٹی پٹن دیوی کا مندر کہلاتا ہے مگر اس کی اہمیت وہ نہیں جو بڑی پٹن دیوی کے مندر کی ہے۔

ایک شہید وطن مجاہد کے ایثار و ہمت کی داستان

''پیر علی شہید''

یوں تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہزاروں محبان وطن نے اپنی جان و مال قربان کر دیئے۔ ان کے تذکروں کے لئے نہ تو یہ کتاب موزوں ہے اور نہ یہاں اتنی گنجائش ہے کہ ان سب کے تذکرے لکھے جاسکیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر ان میں سے چند کے تذکرے یہاں لکھے بھی جائیں تو سارے ہندوستان کے شہیدان وطن میں سے چند کو منتخب کر کے ان کا تذکرہ لکھنا بڑا ہی مشکل کام ہوگا۔ بہر حال میں پٹنہ کے ایک شہید وطن کی ہمت و عزم کا تذکرہ لکھ رہا ہوں مجھے امید ہے کہ صرف یہی تذکرہ ۱۸۵۷ء کے ماحول کی سچی تصویر پیش کریگا جن میں اس وقت کے ہزاروں محبان وطن کے خدوخال نظر آئیں گے۔

پٹنہ میں چند ہستیاں ایسی تھیں جن کی قیادت میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا محاذ تیار ہوا اور انہیں کے عزائم نے لوگوں کے دلوں میں سر فروشی کا جذبہ پیدا کیا۔ انہیں حضرات میں پیر علی کا نام بڑی خصوصیت سے آتا ہے۔ اصل میں پیر علی خاں لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور وہاں سے آکر پٹنہ میں بہت دنوں پہلے سے اقامت گزیں تھے۔ یہیں کے ایک محلّہ گورہٹہ میں ان کی کتابوں کی ایک دکان بھی تھی۔ محلّہ گورہٹہ خواجہ کلاں کی کوتوالی کے علاقہ میں پڑتا ہے جو اس زمانے میں پٹنہ سٹی کا مشہور ترین علاقہ تھا۔

بڑی حیرت کی بات ہے کہ پیر علی خان کی یاد بھی بہت دنوں تک لوگوں نے بھلا دی تھی۔ چند لوگوں کے سوا کسی کو یاد بھی نہ تھا کہ اسی پٹنہ میں ایک ایسے مجاہد ملت اور وطن پرست نے ملک کی آزادی کے لئے جان دی ہے جس کے کردار کی عظمت کا اعتراف خود اس کے بدترین دشمنوں کو بھی تھا۔ ۱۹۵۷ء کے قریب، جب گذرنے ہوئے ۱۸۵۷ء کے سرفروشوں اور پہلی جنگ آزادی کے جانبازوں کی یادگار منانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو اسی سلسلے میں چند نوجوانوں نے پرانی تاریخوں کو کھنگال کر پیر علی خاں کے دفن شدہ کارنامے بھی ڈھونڈھ نکالے اور اس شہید قوم کا ایک ہیولا بھی ڈراما کے اسٹیج پر لاکر کھڑا کر دیا۔ اپٹا (Ipta) کے نام سے ایک ڈرامٹک کلب قائم ہے۔ ۱۹۵۷ء میں اسی کلب کے ممبروں نے پٹنہ میں سو سال پہلے کے پیر علی خاں کو، اپنی ڈرامٹک کلب میں ان کی داستان پیش کر کے حیات نو بخشا۔ انہی دنوں میرے نوجوان عزیز ڈاکٹر قیام احمد پی ایچ ڈی نے، جو ہندوستانی تاریخ کے ایک مشہور تحقیقاتی ادارہ اگروال انسٹی ٹیوٹ کے اہم رکن ہیں، بڑی تلاش و تحقیق کے ساتھ اپنا معیاری مضمون پرچوں میں شائع کر کے پیر علی خاں کو دوبارہ پبلک میں روشناس کرایا۔

پیر علی خاں کی ہستی پٹنہ میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامی واقعات اور ان حالات کے ساتھ سراسر وابستہ ہے اور آزادی کی جنگ لڑنے کی پوشیدہ تیاریاں کی گئی تھیں۔ اسی وقت صدر مقام ہونے کے سبب سے پٹنہ آزادی کی جدو جہد کا خفیہ مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں خاص طور پر تین مختلف جماعتیں اپنے اپنے طریقے پر آزادی کی خفیہ تحریکیں چلا رہی تھیں۔ ان میں ایک تو اودھ کے ان حریت پسندوں کی جماعت تھی جو اودھ کی حکومت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتی تھی۔ پٹنہ میں اس جماعت کی قیادت پیر علی خاں کے ہاتھوں میں تھی جن کا براہ راست اس تحریک کے اہم بانی مسیح الزماں سے رابطہ تھا جو لکھنؤ میں اس تحریک کے مدارالمہام تھے۔ پٹنہ کے کوٹ گشت کے داروغہ مہدی علی خاں اندر اندر پیر علی خاں کے معاون اور مشیر کار تھے۔ دوسری جماعت مجاہدین صادق

پور کی تھی جن کی تحریک آزادی اپنے طریقے پر قبل اور بعد میں بھی چلتی رہی۔ تیسری جماعت کا تعلق براہ راست تخت دہلی سے تھا جس کے نام پر ہندوستان کے ہر گوشے سے ہندو اور مسلمان آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے متحد ہو رہے تھے اور اس جماعت کی تحریک ہمہ گیر بھی تھی۔ مولوی علی کریم پٹنہ میں اس جماعت اور تحریک کی نمائندگی کرتے تھے۔ پیر علی خاں نے پٹنہ میں تینوں جماعتوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور متحدہ محاذ بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ خفیہ طور پر سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے اور عام شورش کا ایک دن مقرر بھی ہو چکا تھا کہ قسمت نے ہندوستانیوں کے ساتھ دغا کی چند غدارانِ قوم نے شورش و سازش کی جو اسکیم تیار ہوئی تھی اس کی خبر پٹنہکے انگریز کمشنر ولیم ٹیلر کو پہنچا دی۔ اس خبر کے ملنے پر ولیم ٹیلر نے جو کیا اس کو وہ اپنے ان خطوط میں حکومت کو وقتاً فوقتاً لکھتا گیا جو سرکاری کاغذات کے دفتر میں محفوظ ہیں انہیں میں سے بعض کا مختصر اقتباس درج کرتا ہوں۔ ان خطوط کے مضامین انڈین ہسٹوریکل ریکارڈ کمیشن کی جلد نمبر ۳۲ میں ملتے ہیں۔ اقتباس یہ ہے کہ:

"............. مجھے ماہ جون کے اوائل ہی میں مختلف حلقوں سے خبر ملی تھی کہ مہدی علی جو شہر پٹنہ کے کوٹ گشت کا داروغہ ہے اس کے یہاں مختلف اوقات میں رات کے وقت جلسے ہوا کرتے ہیں جس میں چند وہابی بھی شریک رہا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گمنام خطوط بھی میرے پاس آئے ہیں جن میں خوفناک سازشوں کی اطلاعات تھیں اور تین شہادتیں بھی تھیں۔ مجھے اس کا یقین پہلے سے بھی تھا کہ نصرانیوں کے خلاف جو محاذ بن رہا ہے اس میں ہر فرقے کے لوگ اپنے اپنے اختلاف دور کر کے شریک ہو جائیں گے۔ مجھے دو گروہ سے زیادہ خطرہ تھا ایک تو وہ گروہ جو حکومت اودھ کے ختم کے بعد اس کو پھر قائم کرنے سے پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرا گروہ کٹر اور منسب وہابیوں کا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ ایک بڑا خطرہ یہ بھی نظر کے سامنے تھا کہ پٹنہ میں اگر ذرا سی بھی ہڑبونگ ہوئی تو یہاں کے عوام بھی اس غدر کے طوفان میں کود

پڑیں گے۔ مہدی علی شہر پٹنہ کے گشتی داروغہ کی شخصیت ایسے وقت میں بہت اہم اور خطرناک بھی تھی۔ وہ بڑی صلاحیت اور بڑے اختیارات کا آدمی تھا اور پہلے چند بار دربار اودھ میں اس کی رسائی بھی ہو چکی تھی۔ اسی لئے میں نے اس کو معطل کر کے کل اختیارات بھی اس سے لے لئے اور فوری طور پر کڑی نگرانی کے ساتھ اس کو حراست میں ڈال دیا۔ دوسرا گروہ وہابیوں کا تھا جن کا آپس میں اتحاد، ان کی ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری اور اپنے رہنماؤں کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت مشہور ہے۔ میرا مطلب اُن کے چند سرگروہ کو گرفتار کرنے سے یہ تھا کہ ان کو آسان قید میں ہوشیاری کے ساتھ اس لئے رکھا جائے کہ اگر ضرورت پڑے تو ان کے عقیدت مندوں کے رویہ کے لئے وہ ضمانت کا کام دے سکیں۔ میں نے تیسرا کام یہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکا شہر کے لوگوں سے ہتھیار رکھوالئے جس کے لئے میں نے اعلان کرا دیا تھا کہ شہر والے حکومت کے پاس اپنے ہتھیار داخل کر دیں۔ اس طرح خود بخود لوگوں نے پانچسو ہتھیار تھانوں میں جمع کرتے رات میں نو بجے کے بعد لوگوں کو گھروں سے نکلنے کی ممانعت بھی کر دی..........."

یہ تو ولیم ٹیلر کے خطوط کا جگہ جگہ سے اقتباس ہے مگر ان جبری کاروائیوں کا الٹا اثر یہ ہوا کہ بجائے دہشت کھانے کے لوگوں کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ اور بھڑک اٹھا۔ یہ تو ولیم ٹیلر کا بیان ہے کہ اس نے صرف جبری احتیاطی کاروائیوں پر اکتفا کیا تھا لیکن اس زمانے میں ہنگامہ کے قبل پٹنہ کا یہ حال تھا کہ انگریزی سپاہیوں کے ڈر سے لوگوں کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مسجدوں اور مندروں میں اجتماع بند کر دیا گیا تھا اشنان کے گھاٹ سنسان پڑے تھے۔ دو ایک آدمی اگر ایک ساتھ کہیں گھر سے باہر نکلے بھی تو لاٹھی سے پٹے یا گرفتار کر کے پوچھ گچھ کے لئے تھانے لائے گئے۔ دوکانیں بند پڑی تھیں اور سڑکوں پر ویرانی چھائی رہتی تھی۔ ان سب باتوں سے عوام کے دل سلگ رہے تھے اور لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہوتا جا رہا

تھا۔ آخر تیسری جولائی ۱۸۵۷ء کو پٹنہ کے لوگ جوش میں بھرے ہوئے بے صبری میں قبل از وقت ہی گھروں سے نکل پڑے۔ یہ نہتے پہلے ہی کر دئے گے یہ آگے بڑھے تو انگریزی سپاہیوں کی گولیاں ان کی پذیرائی کو موجود تھیں۔ پھر ان نہتے عوام کے جوش کا یہ عالم تھا کہ گولیاں کھاکر بھی ان کے قدم آگے بڑھنے سے نہیں رکے تھے۔ جو زخم کھا کر یا مر کر گرا تو دوسرا اس کی جگہ لینے کو آگے بڑھا آتا۔ عوام کے قتل اور غارتگری کا یہ ہنگامہ جاری رہا۔ سینکڑوں شہید ہوئے ہزاروں لٹ گئے اس کا ذکر تو ولیم ٹیلر کے خطوط میں کہیں نہیں ملتا۔ صرف چند کا تذکرہ اس کی رپورٹ میں ملتا ہے جو اس نے اس واقعہ کے متعلق حکومت بنگال کو ۱۱ر جولائی ۱۸۵۷ء میں بھیجی۔ اس رپورٹ میں ولیم ٹیلر نے جس طرح اصلی واقعات کو چھپانے کی کوشش کی ہے وہ اس اقتباس سے ظاہر ہے۔

"............... یوں معلوم ہوتا ہے کہ ۳ر جولائی ۱۸۵۷ء کی شام میں اندازے کے مطابق دو سو آدمی پیر علی خاں کتب فروش کے گھر جمع ہوئے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق جو غالباً ایک دن پہلے تیار ہو چکا تھا بڑے بڑے جھنڈوں کے ساتھ دھوم مچاتے ہوئے اور علی علی کا نعرہ لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل پڑے اور اس ارادے سے سیدھے رومن کتھلک گرجا کا رخ کیا کہ وہاں کے پادری کو مار ڈالیں۔ پادری تو بھاگ نکلا مگر یہ لوگ وہاں سے نکل کر دوسروں کو اپنی مدد کے لئے پکارنے لگے۔ پٹنہ میں افیون کوٹھی کے ایجنٹ لیال کو جب یہ خبر بھیجی گئی تو وہ فوراً پچاس آدمیوں کا دستہ اور اس کے علاوہ ایک صوبہ دار اور پچاس سکھ فوجیوں کو لیکر پہونچ گیا اس وقت انقلابی رومن کتھلک گرجا سے نکل کر چوک تک آگئے تھے۔ یہاں انقلابیوں نے اپنا جھنڈا نصب کر رکھا تھا اور مذہبی نعرے لگا رہے تھے۔ بد قسمتی سے ڈاکٹر لیال انقلابیوں کے سمجھانے کو آگے بڑھا اور ان سے امن قائم رکھنے کے لئے خوشامدیں کرنے لگا مگر یہ انقلابی اس پر دوڑ پڑے اور اس کو گولی کا نشانہ بنا دیا اور ان میں سے چند

دیوانوں نے تلوار سے ڈاکٹر لیال کا سر کاٹ لیا یہ دیکھ کر اس کے بعد دستے نے انقلابیوں پر گولیاں چلائیں انقلابیوں میں سے ایک مارا گیا اور گواہوں کے مطابق چند زخمی بھی ہوئے مگر ابھی تک ایک کے سوا دوسرا زخمی مل نہیں سکا ہے۔ اس کے بعد یہ ہجوم منتشر ہو گیا مگر ڈاکٹر لیال کے مرنے کے قبل نئے کوٹ گشت داروغہ سے ان انقلابیوں کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی جس میں اگرچہ کوٹ گشت کے داروغہ کو بہت ہی کاری زخم آئے تھے مگر اب وہ پورے طور پر اچھا ہو رہا تھا............۔"

ولیم ٹیلر کا مندرجہ بالا بیان جس قدر حقیقت سے دور ہے اتنا عقل کی روشنی میں بھی سراسر پوچ اور لچر ہے اور یہ بات صاف جھلکتی ہے کہ اس نے اپنی ظالمانہ کاروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے جس طرح بھی اس سے ممکن ہوا اس نے اصلی واقعات میں کتر بیونت کی ہے۔ اس کے یکطرفہ بیان کے مقابلے میں اگر اس وقت کے صحیح حالات لکھے جائیں تو ایک مختلف داستان تیار ہو جائے۔ پھر اس قتل عام کے بعد پٹنہ کے باغیوں پر مقدمہ چلائے جانے کے بعد ان کو جو سزائیں دی گئیں اس کی رپورٹ بھی ولیم ٹیلر نے حکومت بنگال کو یوں بھیجی "............ چودہ اشخاص کو سزائے موت دی گئی جن میں بارہ آدمی مقدمہ کے فیصلہ کے تین گھنٹوں کے اندر پھانسی کے تختہ سے لٹکا دیئے گئے۔ اس کے بعد ہی پھر چھ آدمیوں کو لانبی سزائے قید دی گئی۔ جس میں دو آدمی کو تاحیات عبور دریائے شور کی سزا ہے بقیہ ایک آدمی کو چودہ سال کی سزائے قید دی گئی ہے............۔"

جس طرح ولیم ٹیلر نے اپنے خطوط اور پہلے رپورٹ میں اپنے قتل عام کو چھپایا ہے اسی طرح یہاں بھی اس نے سینکڑوں آدمیوں کو پھانسی کی سزاؤں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آج بھی پٹنہ کے چھجو باغ کی زمین پر ان شہیدان ملک وملت کی داستانیں ثبت ہیں۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں وطن کی محبت کے جرم میں سینکڑوں محبان وطن نے پھانسی پائی۔ جب ملک میں امن و امان ہو چکا تو بعد میں پھر جس جگہ میں بنگال

کے لفٹننٹ گورنر کا پٹنہ میں دارالحکومت بھی بنی جو اس جگہ کی خونی یاد کو بھلانے کے لئے انگریزوں کی بڑی عمدہ ترکیب تھی۔

ولیم ٹیلر کا دل قتل عام کے بعد بھی جب نہ بھرا تو اس نے یہاں کے لوگوں کی ادھر ادھر سے دھر پکڑ شروع کرائی۔ یہ سلسلہ ہفتوں رہا غریب امیر سب اس کی زد میں تھے۔ کسی نے اگر ذرا سی مخاصمت کی اور حاکم کے آگے ایک نام بھی کسی کا لیا تو گویا اس نام جانئے کی قسمت پر سزا کی مہر لگ گئی غریبوں کی طرف سے پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا جو ان کے لئے دوڑ دھوپ کرتا مگر ان کے بچاؤ کا بھی ایک موقع نکل ہی آیا۔ ولیم ٹیلر نے ایک بڑے آدمی کی شکایت پر پٹنہ کے ایک معزز رئیس نواب لطف علی خاں کو بھی گرفتار کر لیا۔ ان پر فوری طور پر مقدمہ بھی چلایا اور ان کے لئے بھی سزائے موت تجویز ہونے والی تھی کہ ان کے بہت سے بہی خواہ ولیم ٹیلر کی خصوصیت کی پرواہ کئے بغیر کلکتہ دوڑ پڑے اور ولیم ٹیلر کے ظلم کی داستان وہاں جاکر انگریزی حکومت کے افسران اعلیٰ کے سامنے بیان کیں۔ اس درمیان میں کلکتہ کے احکام بالادست کو بھی اپنے طور پر معلوم ہو چکا تھا کہ ولیم ٹیلر کے مظالم حد سے بڑھ گئے ہیں اور پٹنہ میں امن و امان قائم ہونے کے بعد بھی اس کی غارت گری اور قتل کا بازار گرم ہے۔ اس دوڑ دھوپ کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ فوراً ہی ولیم ٹیلر کو کمشنر کے عہدہ سے معطل کیا گیا اور نواب امیر علی خاں جو قصبہ باڑھ کر رہنے والے اور کوئی عدالت دیوانی کے بڑے کامیاب وکیل تھے اور عوام میں بھی بڑے دیانتدار مانے جاتے تھے ان کی عارضی تقرری ولیم ٹیلر کی جگہ پر کی گئی تھی۔ وہ بھی اس عجلت کے ساتھ کہ ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی تو نواب لطف علی خاں اور ان کے ساتھ مذہبی اور بے گناہ ولیم ٹیلر کے ہاتھ سے کبھی نہ بچتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نواب امیر علی خاں نے پھانسی کا پھندہ نواب لطف علی خاں کے گلے سے عین وقت پر اتارا اور ان کی جان بچائی اور بہت سے دوسرے بے گناہوں کی جانیں بھی ان کی بدولت بچ گئیں اور وہ پٹنہ والوں کے لئے رحمتِ الٰہی ثابت ہوئے۔

ابھی تک ولیم ٹیلر کے خطوط میں پیر علی خاں کا نام واضح طور پر اور بالواسطہ نہیں آیا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا کہ پٹنہ میں تحریک آزادی کے یہی روح رواں تھے اب ولیم ٹیلر ہی کی یہ بھی سن لیجئے۔ اپنے ایک خط میں جو ولیم ٹیلر نے حکومت بنگال کے سکریٹری کو ۴ار جولائی ۱۸۵۷ء میں لکھا اس میں یوں درج ہے۔

"............ جو باتیں پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مہینوں پہلے سے ہی سازشی تنظیمیں بڑے پیانے پر چلائی جارہی تھیں لوگوں کی بحالی اور تقرری ہورہی تھی اور ان کو تنخواہیں باقاعدگی سے دی جارہی تھیں۔ فنڈ بھی جمع کئے جارہے تھے جن سے سازش کے متعلق مصارف پورے کئے جارہے تھے۔ رسل و رسائل کے ذرائع بڑی عمدگی کے ساتھ سازش کے کام کو بڑھانے کے لئے قائم کئے جاچکے تھے۔ جن کی غرض یہ تھی کہ ایک جہاد عیسائیوں کے خلاف کی جائے اور ملک میں مسلم حکومت کو دوبارہ قائم کرنے میں زور اور امداد پہنچائی جائے ...."

اب اپنی کتاب کرائسس (Cricis) میں جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے کچھ دنوں بعد ولیم ٹیلر نے لکھی اس میں مندرجہ بالا باتوں کا تعلق پیر علی خاں سے صاف صاف یوں ظاہر کرتا ہے۔ "... پیر علی خاں کا لوگوں کو مہینوں باقاعدہ تنخواہیں دینا، بہت سے داروغے مقرر کرنا اور بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرنا صرف سڑکوں پر ہنگامہ مچانے کی نیت سے تو نہ تھا۔ جو واقعات ہنگامے کے دور میں ظاہر ہوئے اور پھر سازش کرنے والوں کا خود اقرار، گواہوں کی اجمالی شہادتیں ان سے یہ بات پورے طور پر کھل گئی کہ یہ سازش جو ناکام ہوئی وہ ملک کی ہمہ گیر آتش فشاں بڑی سازش کا ایک حصہ تھی۔ اگر بر وقت اس کو روکنے کی تدابیر اور اقدامات نہ کئے جاتے تو اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے"۔

ولیم ٹیلر کے ان دونوں بیان سے پیر علی خان کی اہمیت ظاہر ہے۔ اب پیر علی خان کی گرفتاری کا قصہ سنئے۔ ۳ر جولائی ۱۸۵۷ء میں پٹنہ میں ہنگامہ شروع ہوا اور

۵؍جولائی کو دو دنوں کے بعد گرفتار ہوئے۔ ان دو دنوں میں ولیم ٹیلر کی غارت گری اور قتلِ عام نے شہر میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ سینکڑوں قتل ہو چکے تھے، ہزاروں اپنے گھروں میں پناہ لیکر مصیبت و آفت میں پڑے کراہ رہے تھے۔ بڑی بیدردی کے ساتھ لوگ پکڑے جا رہے تھے۔ گھروں کے دروازے بند تھے سڑکیں ویران اور سنسان تھیں۔ پیر علی خاں بھی زخموں سے چور تھے۔ مگر ہر جگہ اپنے ساتھیوں کی خبر گیری لینے میں مصروف تھے۔ اکیلے چھپتے چھپاتے ہر جگہ جاتے، لوگوں کو تشفی دیتے اور ان کی مدد کرتے۔ اب ہنگامہ آزادی کا سارا بوجھ اکیلے انہیں پر آگیا تھا۔ انہیں حالات میں یہ گھوم رہے تھے کہ ایک جگہ ان کی مشتبہ حالت دیکھ کر پولس والوں نے ان کو گرفتار کر لیا۔ پھر بھی بغیر لڑے بھڑے گرفتار ہونا ان کو پسند نہ تھا۔ یہ لڑے اور خوب لڑے مگر اکیلے یہ کیا کرتے اُدھر مقابلہ میں پولس کی جماعت تھی۔ جب یہ بالکل مجبور ہوگئے تو گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتاری کے بعد بھی اس آزادی کے علمبردار نے اپنی متانت اور اپنا وقار قائم رکھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس وقت انگریزوں کو ان کی بڑی تلاش ہے اور ہر جگہ سپاہی ان کو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور یہ بھی پولس والوں کے رویہ سے معلوم ہوا کہ یہ صرف شبہ کی بناء پر گرفتار ہوئے ہیں اور گرفتار کرنے والے ان کو مطلق نہیں پہچانتے ہیں پھر بھی جب ان سے ان کا نام پوچھا گیا تو سچے بہادر کی طرح انھوں نے اپنا صحیح نام ہی بتایا۔ پیر علی خاں ۵؍جولائی ۱۸۵۷ء کو گرفتار ہوئے۔ اور ۷؍جولائی ۱۸۵۷ء کو دو دنوں کے اندر ہی ان کا مقدمہ تجویز کر کے پٹنہ کے کمشنر ولیم ٹیلر اور یہاں کے مجسٹریٹ دونوں نے ان کے لئے پھانسی کا فیصلہ کیا اور وہ بھی اس طرح پر کہ اس فیصلہ کے تین گھنٹے کے اندر ان کو پھانسی دی جائے۔ یہ سب واقعات آج بھی سرکاری کاغذات میں گواہوں کے بیان کے ساتھ محفوظ ہیں۔

پیر علی خاں کے کردار کی بلندی ایک تو وہ تھی کہ انھوں نے شبہ میں بے پہچانے پکڑے جانے پر جس کا علم کسی کو بھی نہ تھا انھوں نے پولس والوں کے پوچھنے پر

اپنا صحیح نام بتا دیا تھا اور جھوٹ بول کر چھوٹ جانے کا سہارا نہ ڈھونڈھا تھا۔ اب سب سے بڑھ کر ان کے کردار کی عظمت ملاحظہ کیجئے۔

بے دوا دارو کے رستے ہوئے زخموں کے ساتھ اور دو دنوں تک انگریزوں کے قید کی انتہائی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد، اس حالت میں کہ ان کے کپڑے بدن پر چیتھڑے ہو رہے ہیں اور چیتھڑے انہیں کے خون میں سارے کے سارے بھیگے ہوئے ہیں، زخموں سے خون اور پیپ جاری ہے۔ آنکھیں دھنس گئی ہیں روزانہ پولیس کی مار پیٹ اور مسلسل فاقوں سے چہرہ سُتا ہوا ہے، داڑھی اور سر کے بالوں میں گرد بھری ہوئی ہے، چلتے ہیں تو پاؤں کی بیڑیاں ان کی نقاہت پر فریاد کرتی ہیں۔ دنیا والوں کے سہارے سے دور، صرف ہاتھ کی ہتھکڑیاں ان کے ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور کان یہ آخری حکمنامہ فیصلہ بھی سن چکے ہیں کہ تین گھنٹے کے اندر ان کی زندگی کا چراغ پھانسی کے ہچکولوں سے بجھنے والا ہے پھر بھی جب پیر علی خاں انگریزوں کے سامنے آخری بار پوچھ گچھ کے لئے لائے جاتے ہیں وہ جس حالت میں لائے جاتے ہیں اور جس طرح سامنے جاتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں ان کا حال ان کا بدترین خونخوار دشمن ولیم ٹیلر اپنی کتاب (Crisis) کرائسس میں ایک جگہ پھر یوں بیان کرتا ہے "پیر علی خاں بے خوف اور مستقل مزاج مذہبی دیوانوں کا ایک نمونہ تھا، صورت میں مکروہ جس میں درندگی اور ترش روئی ٹپکتی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ مطمئن اور خوددار اور گفتگو اور کردار میں صاحب عظمت و وقار نظر آتا تھا۔ جب انتہائی سزا کا حکم اس کے خلاف صادر کیا جا چکا تو میں نے اس سے ایسے چند سوالات کرنیکی غرض سے جس سے سازش کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل ہو سکیں اس کو اپنے خاص کمرے میں بلا بھیجا۔ زنجیروں سے خوب جکڑا ہوا یہ میلے اور گندے کپڑوں میں ملبوس جن پر ہر جگہ اس کے پہلو کے زخموں کے خون کے گہرے دھبے تھے وہ میرے اور دوسرے انگریز ساتھیوں کے سامنے لایا گیا۔ اگرچہ اس کو معلوم تھا کہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی ختم ہو چکی

ہے مگر اس کے چہرے سے ذرا سا بھی اضطراب، مایوسی اور خوف نہیں ظاہر ہوتا تھا۔ اس سوال پر کہ کیا وہ اب کوئی ایسا کام کرنے کو تیار ہے جس سے اس کی جان بچ جائے، اس نے بڑے ہی استقلال اور نفرت کے لہجے میں اس کا جواب یوں دیا کہ چند مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں جان کا بچانا عقلمندی کا کام ہے مگر اس کے برعکس چند مواقع ایسے بھی انسان کی زندگی میں آتے ہیں جہاں جان کی پرواہ نہ کرنا ہی شرافت و دیانتداری ہے۔ اس کے بعد اس نے میری سخت گیری پر طنز کرتے ہوئے اپنی تقریر یوں ختم کی۔ تم مجھ کو اور میرے ایسے لوگوں کو روزانہ پھانسی دیتے رہو مگر یاد رکھو کہ میری جگہ پر ہزاروں پیدا ہوتے رہیں گے اور تمہارا ظالمانہ مقصد کبھی حاصل نہ ہوگا۔ میں نے اس شخص کا تذکرہ اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ لکھا کہ اس طرح کے لوگوں سے بھی ہمیں اس ملک میں کبھی کبھی سابقہ پڑتا ہے جن کا مذہبی جنون ان کو بڑا خطرناک بنا دیتا ہے مگر اس کے ساتھ جن کا استقلال اور حوصلے اور عزم راسخ بڑی حد تک ان کو عزت اور تحسین کا حقدار بھی ثابت کرتا ہے۔ بلندی کردار کے اس آخری منظر پر پیر علی خاں کی زندگی کا ڈرامہ ختم ہوا۔ ان کو پھانسی ہوگئی مگر ان کے خون سے قوم کو حیات نو ملی۔ مولانا سالک مرحوم کی ولولہ انگیز نظم کا یہ ٹکڑا اس شہید قوم کے خون کی بھی تشریح کرتا ہے۔

چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخل تاک کی!
کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی حیات ہو!
جو خون ہے شہید کا وہ قوم کی زکوۃ ہے!!

پٹنہ میں ماہ ربیع الاول میں میلاد شریف کی مجلسیں

اور مولانا غلام امام شہیدؔ کی آمد

ماہ ربیع الاول کا پورا مہینہ مسلمانوں کے لئے متبرک ہے۔ اسی ماہ مبارک میں حضرت سرور عالم محمد ﷺ کی ولادت باسعادت ہے۔ پٹنہ میں اور ہر جگہ دنیا کے حصوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں جب یہ ماہ مبارک آتا ہے تو ان پر محبت رسول اکرم ﷺ کا جذبہ طاری ہوتا ہے اور یہ اپنے انداز میں میلاد شریف کی محفلیں ترتیب دیتے ہیں اور حضرت محمد ﷺ کی سیرت کے بیان کے لئے بزم میلاد برپا کرتے ہیں۔ ہر جگہ ڈھنگ جدا ہو تو ہو مگر محبت رسولؐ میں ایک ہی طرح سب کے دل مچلتے ہیں۔ پٹنہ میں ہر جگہ مہینہ بھر امیروں اور غریبوں کے یہاں میلاد شریف کی محفلوں کی دھوم دھام رہتی تھی۔ محفل میلاد کے دن گھروں کو خوب سجاتے، نئے کپڑے پہنتے اور اپنے بچوں اور متوسلین کو نئے کپڑے پہناتے مسلمانوں کے ساتھ اپنے ہندو احباب کو بھی بلاتے۔ محفل میلاد کے ختم ہو جانے کے بعد ہر طرح کی مٹھائیاں بنتیں۔ ہندوؤں کے لئے الگ مٹھائیاں اور پھلوں کا حصہ نکال کر رکھ دیا جاتا جو شریک ہونے والوں کو ہندو ہی کے ہاتھ سے ملتے اور سب خوش خوش واپس جاتے۔ کہیں کہیں محفل میلاد شریف کے اختتام کے بعد کھانے کی دعوت ہوتی اور محفل میلاد منعقد کرنے والا بڑی فراخ دلی کے ساتھ غریبوں اور امیروں کو یکساں عمدہ طرح طرح کے کھانے بلا تخصیص دستر خوانوں پر ساتھ ہی کھلاتا۔ یہ میلاد شریف کی محفلیں کہیں دن میں کہیں رات میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ رات کے وقت جہاں میلاد شریف کی محفل برپا ہوتی وہاں مکانوں کی سجاوٹ بھی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ صرف وہی مکان نہیں جہاں محفل میلاد منعقد ہوتی بلکہ ان گلیوں اور سڑکوں کو بھی سجاتے جہاں پر مکان واقع ہوتا

صدر گلی اور ٹیڑھی گھاٹ کی محفل میلاد شریف بہت مشہور تھی۔ محفل میلاد شریف کے ختم ہو جانے کے بعد معززین، شرفاء، امرا، اور غربا سب کے لئے کھانے کے بڑے بڑے متعدد دستر خوان تیار رہتے۔ امیر اور غریب سب ایک ہی دستر خوان پر کھاتے اور اس میں کوئی تخصیص نہیں ہوتی تھی۔ گیارہ بجے دن سے بڑے بڑے دستر خوان بچھتے اور اٹھتے رہتے تھے اور غروب آفتاب کے وقت تک یہ ضیافت جاری رہتی۔ میر احمد حسین مرحوم اور ان کے بڑے بھائی میر واحد حسین مرحوم دونوں حضرات دستر خوانوں کا چکر لگاکر دیکھتے رہتے کہ کسی دستر خوان پر کوئی چیز کم تو نہیں پہنچی ہے۔ جب میر احمد حسین مرحوم کا انتقال ہو گیا تو ان کے بڑے بھائی میر واحد حسین مرحوم کے یہاں یہ محفل میلاد منتقل ہو گئی۔ وہاں بھی سولہ آنہ یہی انداز رہا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے خان بہادر میر ابراہیم حسین مرحوم نے بھی محفل میلاد شریف کو بڑے حوصلے کے ساتھ اسی انداز میں جاری رکھا۔ جب زمینداری ختم ہو گئی تو اس طرح پر محفل میلاد شریف کے موقع پر سبھوں کی ضیافت بھی نہ رہی۔

مسٹر سید نورالہدیٰ مرحوم کے یہاں بھی بانکی پور میں محفل میلاد شریف بڑے اہتمام سے رات کے وقت ہوتی تھی۔ محفل میلاد شریف کے ختم ہو جانے کے بعد جو حضرات شریک محفل میلاد شریف ہوتے ان کے لئے نفیس کھانوں کا انتظام رہتا۔ مسٹر سید نورالہدیٰ مرحوم بڑے خلوص کے ساتھ سبھوں کو کھانا کھلاتے۔ کچھ لوگ اگر محفل میلاد شریف کی شرکت سے رہ جاتے تو بعد میں جب ان سے ملاقات ہوتی تو مسٹر نورالہدیٰ مرحوم ان سے بڑے مخلصانہ طور پر ان کے یہاں کی محفل میلاد شریف میں شریک نہیں ہونے کی شکایت کرتے۔

غالباً ۱۸۷۵ء کا واقعہ ہے کہ حضرت مولانا غلام امام شہیدؒ جن کے کیف آور بیان میلاد رسول ﷺ کا شہرہ تمام ہندوستان میں تھا اور جو اس وقت کے نعت گوئی کے بھی بادشاہ سمجھے جاتے تھے اور جن کی مولود شہیدی آج تک ہر جگہ محفل میلاد شریف

میں پڑھی جاتی ہے، اپنے ہونہار نوجوان فرزند کے انتقال پر اندوہ گیں ہو کر سکون قلب حاصل کرنے کے لئے حضرت شاہ علی حبیب. نقر علیہ الرحمۃ سجادہ نشیں خانقاہ پھلواری شریف کی خدمت میں پہونچے۔ چونکہ مولانا غلام امام شہید اور میرے نانا میر احمد حسین مرحوم سے دلی ربط اور روحانی تعلق تھا اور یہ دونوں حج بیت اللہ میں ساتھ ساتھ بھی رہے تھے اس لئے حضرت شاہ علی حبیب علیہ الرحمۃ نے میر احمد حسین کو مولانا امام شہید کے پھلواری آنے کے اطلاع دی۔ میر احمد حسین مرحوم فوراً پھلواری شریف پہنچے اور مولانا علامہ امام شہید کو اپنے گھر اٹھا لائے۔ پٹنہ میں مولانا غلام امام شہید کے آنے کی خبر پھیلی تو شہر کے ہر حصہ و محلّہ کے لوگ آکر ان سے تذکرہ رسول اور میلاد پاک کا بیان سننے کی تمنا کا اظہار کرنے لگے۔ اگرچہ مولانا غلام شہید بیٹے کے غم و الم میں چور تھے۔ پھر بھی ہزاروں شائقین کے التماس کو رد نہ کرسکے۔ مولانا راضی ہوئے تو میر احمد حسین مرحوم ہی کے مکان محلہ صدر گلی پٹنہ میں اس محفل سعید و پاک کے منعقد ہونے کا اہتمام ہوا۔ وسعت کے لحاظ سے یہ بڑا وسیع اور کشادہ مکان تھا۔ ہزاروں عاشقانِ رسول کا مجمع ہوا۔ دور دور سے بھی لوگ آئے۔ مولانا غلام امام شہید نے بھی ایسی معجز بیانی کے ساتھ ذکر رسول بیان فرمایا کہ اس محفل میلاد شریف میں شریک ہوئے عوام و خواص علماء و مشائخ سب پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت مولانا محمد سعید صاحب علیہ الرحمۃ، جن کا درجہ اس وقت کے علماء و مشائخ میں بہت اونچا سمجھا جاتا تھا اور وہ اپنے گھر سے بہت کم نکلتے تھے، وہ بھی کھنچ کر اس محفل پاک میں آگئے تھے۔ وہ مولانا غلام امام شہید کے بیان سے ایسا متاثر ہوئے کہ فوراً ہی ایک قطعہ. مولانا امام شہید اور ان کے بیان کے متعلق تحریر فرمایا جس کے چند اشعار تبرکاً یہاں لکھ رہا ہوں۔

شہید آنکہ غلام امام دارد نام امام اہل سخن عمراو بمزید
زبسکہ سُفت بہ نعتِ رو معنی قبول قام بہ شعر نزش خدا بخشید
بیانِ مولد ختم وسل چناں فرمود کہ عرق در عرق شرم گرد مروارید
رسید غلغل مولود خوانیش بہر عرشی خودش بجاہِ نبی در مقام قرب رسید

اس کے علاوہ اس وقت کے دوسرے اکابر اور شعرا نے بھی قصیدے لکھ کر مولانا غلام امام شہید کی خدمت میں پیش کیا۔ محلہ کنگھیا ٹولہ میں قاضی نجم الدین صاحب مرحوم رہتے تھے ۔جب ربیع الاول کا مہینہ شروع ہونے کو ہوتا تو یہ اپنے پورے مکان کی صفائی کراتے اور پورے مکان کی سجاوٹ میں لگ جاتے ۔ لب سڑک ان کے کوٹھے کے باہر نکلے ہوئے چھجے اور بالکنیاں رنگ برنگ کے جھار کونڈیوں، شیشے کی نفیس دیوارگیروں اور قمقموں سے سجی رہتیں۔ان کے مکان سے لگے ہوئے دور تک اور بھی رئیسوں کے مکانات تھے ۔ سبھی اپنے اپنے مکانوں کو اسی طرح سجاتے۔کمروں کو کوٹھے کے چھجوں اور بالکنیوں کو بھی یہ سب جھار کھنڈیوں سے سجتے ۔چند ہندو حضرات بھی اپنے اپنے مکانوں کو سجاتے اور روشنیوں اور روشنوں کا انتظام کرتے ۔ تین دن یعنی ربیع الاول کی دسویں، گیارویں اور بارویں تاریخ کی راتوں میں جب تمام جھاڑ فانوس کونڈیاں قندیلیں اور دیوار گیریں محلہ کے بڑے چھوٹے ایک سے ایک لگے ہوئے مکانات میں اندر باہر روشن کی جاتیں تو بڑا دل فریب نظارہ ہوتا۔ اسی محلہ میں قاضی نجم الدین صاحب مرحوم ایک کشادہ کھلی ہوئی زمین میں انہیں دنوں تک ایک میلہ بھی لگاتے تھے جس کا نام انھوں نے مصطفیٰ بازار رکھا تھا۔یہ میلہ بھی خوب سجا رہتا تھا۔ یہاں ہر طرح کی دوکانیں بڑے قرینے سے لگائی جاتی تھیں ۔ قاضی نجم الدین مرحوم ہر چیز کی نوک پلک کو دیکھتے تھے ۔ حقیقت یہ تھی کی قاضی صاحب ہی کی ترغیب اور ان کی کوششوں سے یہ مصطفیٰ بازار کا میلہ بھی قائم تھا اور تمام محلہ کے مکانوں میں بڑی خوشنمائی کے ساتھ چراغاں بھی ہوتے تھے۔ قاضی صاحب اٹھ گئے تو یہ سب چیزیں بھی ختم ہو گئیں۔

پٹنہ کے سنت سادھو اور مسلمان فقیر

کوڑا شاہ اور بابا بھیکم داس

جس عہد کا ذکر اس کتاب میں ہے اس زمانہ میں فقیروں اور سنت سادھوؤں سے لوگوں کو بڑی عقیدت تھی ۔یا تو اس زمانے کے فقیر اور سنت سادھو بڑے پہونچے ہوئے بزرگ ہوتے تھے یا اس زمانے کے لوگوں کا مزاج ہی ایسا بن گیا تھا کہ ان فقیروں اور سادھوؤں کو خرق عادات باتوں کا مالک سمجھتے تھے اور بہت سی محیر العقول باتوں کو انکی طرف منسوب کر دیتے تھے ۔ بہر حال جو بھی ہو، یہ بات تو ضرور تھی کہ ان فقیروں، سنتوں اور سادھوؤں کی بدولت ہندو اور مسلمان کا رشتہ مضبوط تھا اور یہ سب بھی ہندو اور مسلمان کی اخوت اور ان کے درمیان رواداری اور محبت کا پرچار ہی کرتے تھے ۔

اس وقت پٹنہ سیٹی میں اگر کوڑا شاہ کا نام نکلا ہوا تھا تو بانکی پور میں بابا بھیکم داس کم مشہور نہیں تھے۔

کوڑا شاہ

بندی جان طوائف کا اس وقت پٹنہ میں بڑا شہرہ تھا۔اچھی صورت شکل ہونے کے سبب سے رئیسوں کی منظور نظر بھی تھی ۔ گاتی بھی خوب تھی اور اس کو شعر و شاعری سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ناز تخلص تھا اور ازل لکھنوی سے اصلاح سخن لیتی تھی ۔ جب یہ سن سے اتر گئی تو اس کی بڑی بیٹی جو عرف عام میں گپی کے نام سے مشہور تھی بازار حسن فروشی میں ماں کی دوکان چلانے لگی اور بندی جان اپنی جگہ بیٹی کو دیکر مہاجنی کی دنیا میں سودا اور قرض کا لین دین کرنے لگی۔ ایک طرف تو یہ تھا دوسری طرف اسی مکان کے ایک حصہ میں بندی جان کے بھائی کوڑا شاہ عالم جذب و مستی میں مرجع خاص و عام بنے ہوئے تھے۔ نام اللہ جانے کیا تھا مگر کوڑا کرکٹ کے انبار میں رہنے کے سبب سے کوڑا شاہ مشہور تھے۔

ہر وقت ان کے پاس عقید تمندوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ ہندو اور مسلمان سبھی اپنی حاجت ان کے پاس لیکر آتے اور یہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں بیٹھے ہوئے کبھی تو زمین پر نئے نئے نقش بناتے اور مٹاتے رہتے یا گلہریوں اور شوخ و مانوس چڑیوں سے سرگرم گفتگو رہتے۔ ایک طرف مسلّم اور ٹوٹی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کا انبار لگا رہتا، کسی میں چاول ہوتا تو کسی میں دال، کسی ہانڈی میں مٹھائیاں ہوتیں تو کسی میں روٹیاں بسکٹ اور کلچے ہوتے۔ گلہریاں، چوہے و مانوس چڑیاں بلاروک ٹوک جی بھر کر اپنا پیٹ بھرتیں۔ کوڑا شاہ صاحب کا جی چاہتا تو چھوٹے بچّوں کو پکار کر اپنے پاس بلاتے اور انہیں میں سے ان کو بھی کھلاتے۔ گلہریاں سب سے زیادہ کوڑا شاہ کی منظور نظر تھیں اور وہ ان سے اس حد تک شوخ تھیں کہ ان کے سر اور کاندھوں پر چڑھ جاتیں۔ کبھی ادھر ادھر اگر چلی جاتیں تو کوڑا شاہ بیقرار ہو کر منوا منوا کہہ کر ان کو بڑے پیار سے بلاتے۔ حاجت مند طرح طرح کے کھانے پینے کے نذرانے لاتے۔ ان کے لئے پیسے کوڑی کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہ سب کھانے پینے کے نذرانے انبار لگی ہوئی ہانڈیوں کی زینت ہوتے تھے۔ کوڑا شاہ نقش بنانے کے درمیان آپ ہی آپ بڑبڑاتے بھی جاتے جن میں الٹ پلٹ باتیں بھی ہوتیں اور فحش گالیاں بھی ہوتیں مگر اس وقت ان کا مقصد کوئی نہیں ہوتا۔ کچھ دیر کے بعد جب یہ موڈ گزر جاتا تو آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھتے، اس وقت کوئی اپنی حاجت بیان کرتا تو جواب گالیوں کے اندر ملتا اور یہ حاجت مند کوڑا شاہ کی گالیاں کھا کر اور اپنے مقصد میں خوشخبری کا پیام سن کر واپس جاتا۔ اس وقت کے لوگوں کا بیان ہے کہ کوڑا شاہ جو کہہ دیتے وہی ہوتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی بات غلط نکلی ہو۔ اگر کسی کے جواب میں گالی نہیں ملتی تو سیدھے الفاظ میں اس حاجتمند کے لئے ''نہیں'' کا پیغام ہوتا۔ بڑی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اکثر حاجت مند کے کچھ کہے بغیر بھی کوڑا شاہ خود ہی گالیوں کے ساتھ اس کی بے کہی ہوئی حاجت کے پورا ہونے کی خبر

دیدیتے اور کبھی اس کے ناکامی کا بھی حال بتا دیتے۔ غریب اور کمزور عقیدے والے تو خیر وہاں ہر وقت. مجمع لگائے ہی رہتے تھے مگر پڑھے لکھے وکیل بیرسٹر، سرکاری حکام، ڈاکٹر تجار اور دولتمند رئیسوں سے بھی یہ مجمع خالی نہیں رہتا تھا۔ امتحان کا زمانہ ختم ہو جاتا تو طالب علموں کی جماعت بھی وہاں حاضری دیتی رہتی اور سبھوں کا کام نکلتا رہتا۔ کوڑا شاہ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ لوگوں نے دھوپ اور برسات کے پانی سے بچنے کے لئے درخت کے نیچے ایک چھپر ڈال دیا تھا۔ کوڑا شاہ کا تکیہ تھا۔ وہ رفع حاجت ایک کونے میں کر لیتے تھے جس کو لوگ اٹھا کر پھینک دیتے۔ ان کو کپڑا بدلنے اور حجامت بنانے کا کب ہوش تھا کہ خود سے یہ کام کرتے۔ کسی نے کپڑا بدل دیا، حجامت بنادی تو بنادی یہ ہر حالت میں مگن تھے، بندی جان اور اس کی بیٹی گپی کے طلبگاروں اور گاہکوں کے لئے کوڑا شاہ کی طرف سے ہو کر ان دونوں تک پہونچنے کا راستہ تھا۔ جس وقت اس طرح کا کوئی شوقین حسن کا گاہک ان کے پاس ہو کر گزرتا تو اس وقت گالیوں کے اندر کوڑا شاہ کی گل افشانی سننے کے قابل ہوتی۔ ان کی فحش اور عریاں گل افشانیوں سے نہ بندی جان نہ اس کی بیٹی گپی اور نہ اس کے طلبگار بچتے اور جو کوڑا شاہ کے پاس حاجتمند کھڑے رہتے ان کی ہنسی روکے نہیں رکتی۔ بندی جان اور گپی تو مکان کے دوسرے حصہ میں ہوتیں مگر ایسے شوقین حضرات کا منہ چھپا کر آنا جانا کوڑا شاہ کے پاس سے لپک کر گزرتے ہوئے راستہ طئے کرنا بھی دیکھنے کی چیز تھی۔

یوں کوڑا شاہ کے متعلق سینکڑوں قصے مشہور ہیں مگر یہاں صرف دو واقعات لکھ رہا ہوں۔ میرے دوست بابو سنگھیشور پرشاد ایڈوکیٹ اور سابق رکن بہار مجلس قانون ساز جواب سورگ باش ہو چکے ہیں وہ بھی کوڑا شاہ کے بڑے عقیدت مندوں میں تھے۔ ان کی طالب العلمی کا زمانہ تھا کبھی کوئی حاجت لیکر کبھی یونہی جا کر حاضری دیتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی برادری کا ایک شخص جو دیہات میں رہتا تھا کوڑا شاہ کا نام سنکر پٹنہ آیا۔ یہ آدمی اپنے بھائی کی بیماری کا ہر طرح کا علاج کر کے تھک چکا تھا۔ لوگوں نے

بتایا کہ کوڑا شاہ کے پاس اگر وہ جائے اور کوڑا شاہ اس کو کچھ کہہ دیں تو ضرور شفا ہو جا ئے گی۔ سنگھیشور بابو اس کو کوڑا شاہ کے پاس لے کر پہونچے۔یہ گردن جھکائے زمین پر نقش بنا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے گردن اٹھائی نظر اسی آدمی پر پڑی جو اپنے بھائی کی بیماری میں اس کی صحت کا طالب ان کے پاس آیا تھا۔اس سے قبل کہ وہ حاجتی کچھ کہے کوڑا شاہ نے کہا کہ اب کیا آیا ہے وہاں مرغے کو آگ دی جارہی ہے۔ سینگھیشور بابو کہتے تھے کہ اس وقت اس آدمی کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی۔اس کو سکتہ لگ گیا اور میں بھی حیرت زدہ کوڑا شاہ صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد اس کو واپس لے کر گھر آیا۔اس کی عجب حالت تھی۔ بالآخر وہ آدمی اسی وقت گھر روانہ ہو گیا ہم دونوں کو یقین تھا کہ جو کچھ کوڑا شاہ نے کہا ہے بالکل صحیح ہے۔ ہوا بھی یہی کہ کچھ دنوں کے بعد جب وہ آدمی پھر پٹنہ آیا تو اس نے سنگھیشور بابو سے کہا کہ گھر جا کر معلوم ہوا کہ ٹھیک وہی وقت تھا جس وقت کوڑا شاہ نے میرے بھائی کے مرنے اور جلانے کی خبر دی تھی۔

دوسرا قصہ سنیے منیر کے اطراف کے ایک گاؤں میں منور حسین صاحب ایک چھوٹے موٹے زمین دار رہتے تھے،اسی گاؤں میں دو چار اور بھی زمیندار تھے جن سے درمیان آئے دن منور حسین کے عدالتی اور فوجداری کے مقدمات چلتے تھے۔ایک دفعہ منور حسین صاحب اور دوسرے زمینداروں کے درمیاں ایک بڑی گھن گرج فوج داری ہوئی۔دونوں طرف کے کافی لوگ مجروح بھی ہوئے۔اور دونوں طرف کے ملا کر پانچ سات آدمی مارے بھی گئے۔مخالف زمینداروں نے پولیس کے یہاں زبر دست پیروی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منور حسین صاحب کا اکلوتہ لڑکا اور انہیں کے اور لوگ مدعا علیہ بنائے گئے۔مجسٹریٹ کے یہاں مقدمہ پیش آیا تو اس نے منور حسین کے لڑکے اور دوسرے مدعا علیہوں کو سیشن سپرد کردیا۔ سیشن کے اجلاس میں بھی مخالف زمینداروں نے خوب روپے خرچ کئے۔بڑے بڑے بیرسٹروں کو مقرر کیا اور خوب ہی

پیروی کی۔اس طرف کئی بڑے زمیندار اور روپے کی بہتات۔ادھر منور حسین صاحب کو روپے پیسے کی تنگی۔ غرض جج کے یہاں سے بھی منور حسین مقدمہ ہارے اور ان کے لڑکے اور آدمیوں کو لانبی لانبی سزائیں سیشن کے اجلاس سے ملا۔اس وقت صوبہ بہار بھی بنگال کے ساتھ تھا اور کلکتہ ہائی کورٹ ہی میں بیان کی اپیلیں دائر ہوتی تھیں۔منور حسین صاحب نے اپنے بیٹے اور اپنے دوسرے آدمیوں کی طرف سے کلکتہ ہائی کورٹ میں اپیل درج کی۔اب تو اسی اپیل پر ان کی عزت و آبرو اور جان و مال کا انحصار تھا۔بچارے منور حسین صاحب نے مزید قرض لے کر کلکتہ کے دو ایک بیرسٹروں کے سپرد اپنا مقدمہ کر دیا پہلے تو انکے لڑکے کی ضمانت بڑی مشکلوں سے ہوئی جس سے ان کو کچھ ڈھارس بندھی۔ اب اپیل کے کھلنے کا انتظار تھا۔ ان کے بیرسٹروں نے ان کو تسلی دی تھی اپیل میں مقدمہ ضرور جیتیں گے ۔اب منور حسین صاحب بھی کچھ مطمئن ہو گئے تھے ۔ آخر کار مقدمہ کھلا۔ بحثیں ہوئیں اور فیصلے کی تاریخ ایک ہفتہ کے بعد رکھی گئی ۔ جو دن مقدمہ کے فیصلے کا تھااس دن منور حسین صاحب خدا کو یاد کر رہے تھے۔بار بار جائے نماز بچھا کر اللہ تعالیٰ کو سجدے کرتے اور اس سے کامیابی کی دعا مانگتے۔اتنے میں تاروالا آتا دکھائی دیا۔تار انہیں کے نام سے تھا۔منور حسین صاحب نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے امید و بیم کی حالت میں تار کا لفافہ کھولا۔ایک ہی نظر کو دیکھا تھا کہ ہائے کہہ کر رو پڑے۔ دوسرے لوگ بھی جو ان کے پاس بیٹھے تھے انھوں نے بھی تار کا مضمون پڑھا۔منور حسین صاحب کے بیرسٹر ہی کی طرف سے تار تھا کہ ہائی کورٹ میں مقدمہ ہار گئے۔ اس میں شک کی گنجائش کیا تھی۔ تمام مکان میں کہرام مچ گیا۔ ان کی بیوی پچھاڑیں کھانے لگیں۔ ان لوگوں میں سے جو منور صاحب کے پاس اس وقت موجود تھے ایک آدمی نے یہ کہا کہ کوڑا شاہ صاحب سے رجوع کرنا چاہئے۔ دوسروں نے کہا کہ جب مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا تو اب ان سے رجوع کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ پہلے ہی ان کے پاس جانا

چاہیئے تھا۔ بہر حال جب کوڑا شاہ کا نام آیا تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ اس ناامیدی کی حالت میں بھی منور حسین صاحب خود اس وقت کوڑا شاہ کے پاس جانے کو تیار ہو گئے۔ اب وقت یہ پٹنہ ہی میں رہ کر مقدمہ کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ جس وقت منور حسین صاحب کوڑا شاہ کے پاس پہونچے تو کوڑا شاہ اپنی گلہریوں سے کھیل رہے تھے۔ منور حسین صاحب کو دیکھا تو ان کو مخاطب کر کے ایک بُری گالی دی اور پھر گلہریوں سے کہنے لگے کہ منوا منوا ذرا دیکھ تو یہ کیسا مورکھ ہے۔ تیرے لئے مٹھائی بھی نہیں لایا اور روتا بھی ہے۔ آج تو اس کی خوشی کا دن ہے۔ اس کا بیٹا اور اس کے آدمی تو سب چھوٹ گئے ہیں۔ منور حسین اور ان کے ساتھیوں کو کوڑا شاہ کے اس کہنے پر یقین نہیں آیا اور اسی لئے یہ سب پھر بھی کھڑے رہے۔ کوڑا شاہ نے پھر ایک غلیظ گالی دی اور کہا کہ جاتا کیوں نہیں ہے۔ دیکھ تار والا تیرے یہاں آرہا ہے۔ دوبارہ گالیاں کھا کر یہ گھر لوٹے۔ اب کچھ یقین بھی تھا کچھ شک بھی تھا۔ گھر جیسے ہی پہونچے سچ مچ تار والا آتا دکھائی دیا۔ تار انہیں کے نام کا تھا۔ پڑھا تو کل لوگوں کی رہائی کی خوشخبری تھی اور تار بھیجنے والا انہیں کا لڑکا تھا جو کلکتہ میں مقدمہ کے فیصلے کے لئے رکا ہوا تھا۔ پہلے تار کے بعد اس تار کا آنا عجیب بات معلوم ہوتی تھی ۔مگر کوڑا شاہ کے کہنے پر سب کو یقین تھا اس لئے سب مطمئن ہو گئے تھے۔ وہ دن اور وہ رات گذری تو صبح ہی ریل سے منور حسین صاحب کا لڑکا اور ان کے لوگ خوش خوش کلکتہ سے واپس آئے۔ پہلے تار کے متعلق اخیر میں یہ پتہ چلا کہ فریق مخالف نے منور حسین صاحب کو پریشان کرنے کے لئے جھوٹی خبر تار سے بھجوائی تھی۔

غالباً ۱۹۱۸ء میں کوڑا شاہ نے انتقال کیا اور جس جگہ بیٹھے بیٹھے اپنی زندگی گزاردی تھی۔ اس جگہ لوگوں نے ان کو دفن کر دیا اور ان کی پختہ قبر بھی بنا دی۔ یہاں کچھ عقیدتمند سال میں ایک بار جمع ہو کر ان کا عرس بھی کر لیتے ہیں۔

بابا بھیکم داس

بانکی پور میں باقر گنج محلّہ کو نچلی سڑک پار کر کے دکھن جانب بابا بھیکم داس کی ٹھاکر باری بہت مشہور ہے۔ یہیں محلّہ قدم کنواں کو جانے والی سڑک کے پچھم جانب اس سے متصل ٹھاکر باری کی عمارت ہے جس کے ملحقہ مکانات میں جاتری ہر جگہ سے آکر ٹھہرتے ہیں اور یہیں بہت سے سنت سادھو بھی بسیرا لیتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری تہائی کا زمانہ ہوگا کہ ایک ہندو فقیر ایک افتادہ زمیں میں جہاں اب ٹھاکر باری کی عالیشان عمارت قائم ہے، آکر ٹھہرے۔ اُس وقت آج کل کی طرح وہاں آبادی اور بارونق محلّہ نہ تھا۔ سڑک کے دونوں جانب جگہ جگہ پڑتی زمینیں ملتی تھیں۔ چونکہ شہر کا یہ حصہ نشیب میں واقع تھا جہاں سڑکوں اور گلیوں میں برسات کا کافی پانی جمع ہو جاتا تھا اس لئے لوگ یہاں مکان بنانے کے لئے جلد تیار نہیں ہوتے تھے۔ اسی سنسان علاقہ میں بابا بھیکم داس نے سڑک کے کنارے ایک پڑتی زمین میں قیام کیا اور آسن جما کر یاد الٰہی اور خدمت خلق میں مصروف ہوگئے۔ ایشور کی دھیان گیان سے جو وقت بچ رہتا وہ لوگوں کی خدمت اور ہمدردی میں لگاتے، لوگوں کو اچھی اچھی باتیں بتاتے اور کبھی اپنے تصرف سے لوگوں کا کام نکال کر ان کی حاجت روائی بھی کرتے۔ ان کی سیدھی سادی زندگی میں نہ روپے پیسے کی چاہ نہ نام و نمود کی خواہش تھی۔ یہی باتیں تھیں جنھوں نے لوگوں کو ان کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ کچھ ہی دنوں میں ان کی شہرت پٹنہ سے آگے نکل کر دور دور دیہاتوں میں پہنچی، عقیدتمندوں کا ہجوم بڑھا، چڑھاوے اور نذرانے نقدی اور جنسی شکلوں میں آنے لگے۔ بابا بھیکم داس یہ سب کچھ وہیں پر غریبوں، فقیروں اور حاجتمندوں کو بانٹ دیتے تھے رفتہ رفتہ جہاں پر ان کا آسن تھا اس کے آس پاس جھونپڑے بننے لگے جن میں جاتریوں کے علاوہ کچھ سنت سادھو بھی مستقلاً آکر براجمان ہوگئے اور اپنے کو بابا بھیکم داس کا چیلہ کہنے لگے۔ صبح شام اس جگہ ہجوم بڑھ جاتا۔ سڑک کے کنارے قطار میں لینڈو فٹن، بگھی گاڑیاں، رتھ، میانیاں اور کھٹولیاں

لگی رہتیں جن میں حکام، وکیل، ڈاکٹر، ساہوکار اور رئیسوں کی بھی خوب حاضریاں یہاں ہوتی تھیں۔ بابا بھیکم داس کے یہاں ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال نہ تھا بلکہ جو یہ سوال اٹھاتا تو وہ بابا بھیکم داس کی نظروں میں پاپی سمجھا جاتا۔ بابا بھیکم داس کے پاس جو کچھ دان و نذرانہ آتا اس کو سدابرت کی طرح لٹاتے۔ غریبوں اور فقیروں کو ان کے یہاں سے صبح و شام غلہ بھی ملتا اور پکا پکایا کھانا غریبوں اور مجبوروں اور رات دن تپسیہ کرنے والوں کو ملتا جو خود سے نہ پکا سکتے تھے۔ کھلے میدان میں جو لوگ ایک طرف جمع ہوتے اور درخت کے پتوں پر کبھی پوری ترکاری، کبھی دال بھات چٹنی سبھوں کو یکساں طریقے پر ملتی اور سب حلقہ باندھ کر اپنی جگہ پر اپنے حصہ کا کھانا کھاتے۔ کھانا وافر ہوتا اس پر بھی اور کوئی کھانا مانگتا تو اس کو فوراً ملتا۔ لنگر خانے اور کھانا کھلانے کا یہ انتظام بابا بھیکم داس کے عقیدتمند اور چیلے بڑی خوبی اور خوشی سے انجام دیتے۔ وہاں بھی ذات اور پات اور مذہب کی کوئی قید نہ تھی۔ ایک دفعہ چیتھڑوں لپٹا ایک فقیر جس کے سر اور داڑھی مونچھوں کے بال سفید تھے وہ بھی کھانے میں سبھوں کے شامل تھا۔ کھانے کے درمیان اس نے ذرا بلند آواز میں کہا "اللہ تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ تین دنوں کے فاقے کے بعد آج پیٹ بھر کھانا نصیب ہوا"۔ اغل بغل کے فقیروں اور سادھوؤں نے یہ سنا تو ایک شور مچا۔ بہت سے لوگوں کی ہر طرف سے آواز آنے لگی کہ "ارے یہ ملچھ مسلمان ہے، اس کو نکالو، سارا کھانا بھرشٹ ہوگیا"۔ کھانا چھوڑ کر بہت سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، مارا پیٹا تو نہیں مگر بہت سے لوگوں نے دھکا دیکر اس کو باہر نکال دیا۔ شور سنکر بابا بھیکم داس اپنا آسن چھوڑ کر وہیں پر آگئے۔ سبھوں سے پوچھا کہ یہ شور کیسا تھا جب سنا کہ یہاں ایک مسلمان فقیر گھس آیا تھا اور کھانے میں سبھوں کے ساتھ بیٹھ گیا تھا اسی پر بہت سے لوگوں نے ہنگامہ مچایا یہ سنکر بابا بھیکم داس سبھوں پر بہت خفا ہوئے۔ پھر سڑک پر آکر اس مسلمان فقیر کو تلاش کرنے لگے۔ کچھ دور پر انھوں نے دیکھا کہ وہ مسلمان فقیر سڑک کے کنارے ہکا بکا کھڑا ہے۔ یہ اس کے پاس پہونچے اور

کہنے لگے کہ "بابا معاف کردو یہ لوگ بڑے بھول میں ہیں۔ یہ بھگوان کا نام تو لیتے ہیں مگر اس کی طرح محبت کرنا نہیں جانتے۔" یہ کہہ کر بابا بھیکم داس اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے شامل اپنے آسن کے پاس لائے۔ اس کو وہیں بٹھایا پھر خود جاکر اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے کھانا لائے اور اپنے پاس ہی کھلانے لگے۔ اس کے بعد سبھوں کو جمع کر کے کہا "ہندو اور مسلمان سب بھگوان کے پیدا کئے ہوئے سب بھائی بھائی ہیں۔ جو میری طرح اس بات کو سمجھے وہ میرا ہے نہیں تو اس کو مجھ سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے"۔

ان کے متعلق خرق عادت بھی مشہور تھی۔ ان کی دعاء سے بعض بانجھ عورتوں کے یہاں بچے پیدا ہوتے۔ بیماروں کو شفا ہوتی۔ بیکاروں کو نوکریاں ملتیں۔ مقدمے جیتے جاتے مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر جو چیز ان کی طرف کھینچتی وہ ان کی زبان کی مٹھاس اور ان کی محبت کے اُپدیش تھے جن میں لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے کی ہدایت ہوتی۔ رواداری کی تلقین ہوتی اور صرف بھگوان کو پوجنے کی تعلیم ہوتی جہاں وہ سنسکرت کے سینکڑوں اشلوک پڑھتے جاتے وہاں فارسی اور اردو کے اشعار بھی موقع موقع سے سناتے رہتے۔ گفتگو میں اشعار اس مناسبت کے ساتھ استعمال کرتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جہاں یہ وید و ویداں کے عالم تھے وہاں پر تصوف میں بھی ان کو عبور تھا۔ بہت دن ہوئے ایک مولوی کفایت حسین پٹنہ میں رہتے تھے۔ وہ ایک صوفی منش بزرگ اور مولینا افضل الرحمٰن علیہ رحمتہ کے مریدوں میں تھے۔ اپنا ایک واقعہ لوگوں سے اس طرح بیان کرتے تھے کہ بابا بھیکم داس کے آخری زمانہ میں وہ ان کی شہرت سنکر ان کی ملاقات کے لئے ایک دن ان کے پاس پہنچے۔ بابا بھیکم داس کے ارد گرد معتقدین کا مجمع تھا اور بابا بھیکم داس سنسکرت کے ایک اشلوک کی تشریح بیان کر رہے تھے۔ مولوی کفایت حسین صاحب ایک جگہ بیٹھ گئے اور غور سے بابا بھیکم داس کا بیان سننے لگے۔ یہ ہمہ اوست کے مسئلے کو بڑے مزے میں سمجھا رہے تھے۔ جب بابا بھیکم داس اپنا بیان ختم کر چکے تو مولوی

کفایت حسین کو دیکھ کر پوچھا کہ "بچہ کچھ کہے گا"۔ انھوں نے جواب دیا کہ "بابا صرف آپ کے درشن کو آگیا ہوں"۔ بابا بھیکم داس یہ سن کر مسکرا کر بولے "دیکھ! جو راستہ ترے گرد کا ہے وہی میرا ہے۔ مراد آباد اور پٹنہ کا راستہ ایک ہے"۔ پھر آنکھیں بند کر کے عالم وارفتگی میں یہ شعر پڑھنے لگے۔

کفر و اسلام در رہت پویان　　وحدۂ لا شریک لہٗ گویاں

یہ بابا بھیکم داس کے موحد ہونے کی بھی دلیل تھی۔

ان کے چیلوں میں بابا بدری داس ایسے تھے۔ جب بیسویں صدی کے آغاز میں بابا بھیکم داس کا انتقال ویہانت ہوا تو ان کے بہت سے چیلے اس وقت پٹنہ میں موجود تھے مگر بابا بھیکم داس کی جگہ لینے کے لئے بابا بدری داس سے زیادہ کوئی دوسرا موزوں و مناسب نہ تھا۔ بابا بدری داس اپنے گرو کی جگہ لینے سے بھاگتے مگر زبردستی لوگوں نے ان کو بابا بھیکم داس کی جگہ پر بٹھایا۔ پھر دوسرے ہی دن بابا بدری داس بھاگ نکلے۔ ہر جگہ ان کی تلاش ہوتی رہی۔ آخر برسوں کے بعد پٹنہ سے بہت دور کہیں ملے۔ لوگ ان کو بڑی مشکل سے راضی کر کے لائے اور پھر گدی پر بٹھایا۔

یہ تھے اس وقت کے سنت اور فقیر جو مذہب کو اس طرح دیکھتے تھے۔

کعبہ و دیر میں جلوہ ہے نمایاں ان کا　　دو گھروں کا ہے چراغ اک رخ تاباں ان کا

(فریادؔ عظیم آبادی، استاد شادؔ)

انجمن علم و فضل کی دو روشن شمعیں

جس زمانے کا یہ تذکرہ زیر تحریر ہے اس وقت پٹنہ میں صاحبان علم و دانش کی کمی نہ تھی۔ متعدد عربی کے مدرسے قائم تھے جن کے اساتذہ علمی معلومات میں سند مانے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ عام گھروں میں بھی ہر جگہ صاحبانِ علم نظر آتے تھے۔

رئیسوں سے لیکر غریبوں کی صفوں میں بھی صاحبانِ علم و فضیلت ہر جگہ ملتے تھے۔ انہیں اربابِ فضل و دانش کے درمیان دو ایسے عظیم منارۂ علم و فضل نظر آتے تھے جن کی عظمت کا اعتراف متفقہ طور پر یہاں کے صاحبانِ علم کے دلوں میں موجود تھا۔ یہ دو بزرگ ہستیاں ایسی روشن شمعیں تھیں جن سے سینکڑوں شمعیں جلتی گئیں۔ ان میں سے ایک تو علامہ حکیم عبدالحمید مرحوم کی ذات گرامی تھی اور دوسری حضرت مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم کی جلیل المرتبت شخصیت تھی۔

علامہ حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم پریشاںؔ

انیسویں صدی کا اول دور مغلیہ خاندان کی انتہائی تنزلی کا زمانہ تھا۔ ملک میں ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا خاص کر پنجاب میں جہاں سکھوں نے حکومت قائم کرلی تھی اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ تھااور ہندوستان کے مشرقی اور درمیانی صوبے انگریزوں کے چنگل میں پھڑ پھڑا رہے تھے ہندوستان کا نام نہاد تاجدار دہلی کے لال قلعے میں بیٹھا اپنی بے دست و پائی پر اشکبار تھا۔ ایسی صورت حال میں حضرت سید احمد اور ان کے رفیق سید اسماعیل شہید کی تحریک آزادی اور اس کے لئے جدو جہد شرعی اور اخلاقی لحاظ سے جائز اور بالکل صحیح تھی۔ سکھوں سے جنگ اعلاء کلمۃ الحق کے خاطر شروع ہوئی جہاں مسلمانوں پر ان کے دینی ارکان پر پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ انگریزوں سے ٹکراؤ بھی ہونا ہی تھامگر جلد ہوا کیوں کہ سکھوں نے مجاہدین سے پے در پے شکست کھا کر غالب انگریزوں سے امداد طلب کرلی تھی ۔ اس طرح انگریز بھی مجاہدین کے مقابلہ پر آگئے۔ حضرت سید احمد کی تحریک آزادی نے مسلمانوں کی ملی اور قومی جذبات کو پیدا کر دیا۔ وہ ملک کو انگریزوں کے استبدادی پنجوں سے چھڑانا چاہتے تھے اور پنجاب کے مسلمانوں کو ان کا جائز دینی حق دلانا چاہتے تھے۔ شروع میں یہ کام مشکل تھا مگر وہ روح پھونکی کہ آزادی کے متوالے ملک کے ہر گوشہ سے کھینچ کھینچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے شمالی ہندوستان میں پوشیدہ متعدد تربیتی مراکز کھل گئے جہاں مجاہدین

آزادی ذہنی اور جسمانی تربیت حاصل کرتے تھے اور یہیں سے تربیت پاکر ان کی ٹولیاں محاذ پر جاتی تھیں۔ ملک میں محلہ صادق پور ہی سب سے بڑا تربیتی مرکز تھا۔ تحریک کو چلانے کے لئے یہیں فنڈ بھی جمع ہوتے اور مجاہدین کی بڑی جماعت ترتیب پاتی تھی تبلیغ و اشاعت کے لئے اور جنگ آزادی میں شرکت کے لئے بھیجی جاتی ۔ تمام تربیتی مراکز بڑے پوشیدہ طور پر کام کرتے تھے ۔ صادق پور کے حضرات کا علم و فضل ملک بھر میں مشہور تھا۔ حضرت سید احمد خود دو دفعہ پٹنہ آکر صادق پور میں مقیم ہوئے۔ ان کی آمد نے شہیدان ملت کی روح کی گرمی کو اور تیز کر دیا۔انھوں نے خود بھی دیکھا کی یہاں تحریک کس خوش اسلوبی سے چل رہی ہے ۔ آخری دفعہ آئے تو مولانا ولایت علی صاحب کو اپنا خلیفہ بناگئے جو محاذ و جنگ اور اس کے علاوہ ہر جگہ انکی نیابت کرتے رہے ۔صادق پور علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ مولانا الٰہی بخش صاحب ، مولانا فیاض علی صاحب، مولانا محی علی صاحب ، مولانا احمد اللہ صاحب ، مولانا اکبر علی صاحب ، مولانا عبدالرحیم صاحب وغیرہ یہ سب مولانا ولائت علی کے شریک کار تھے اور حضرت سید احمد صاحب کی تحریک آزادی کے علم بردار بھی۔ان میں سے کچھ تو شہید ہوئے کچھ گرفتار ہو کر حبس دوام کی سزا میں جزیرہ انڈمان بھیجے گئے۔ مولانا احمد اللہ صاحب کو بھی حبس دوام کی سزا ہوئی اور جزیرہ انڈمان ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔ علامہ حکیم عبدالحمید صاحب پریشاںؔ، مولانا احمد اللہ صاحب کے قابل فخر فرزند تھے۔

علامہ حکیم عبدالحمید صاحب ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔اوائل میں درسی کتابیں اپنے چچا مولوی فیاض علی سے پڑھیں۔ جب مولانا فیاض علی صاحب افغانستان چلے گئے تو علامہ حکیم عبدالحمید صاحب نے علم کی تکمیل اپنے والد بزرگوار سے کی اور فارغ التحصیل ہوئے مگر اس پر بھی جب ان کے علم کی تشنگی نہ بجھی تو ۲۶ برس کے سن میں انھوں نے لکھنوء کا سفر کیاجہاں مولانا واجد علی سے جو علمائے لکھنو میں بڑے سربر آوردہ تھے دو بار علوم درسیہ کی تکمیل کی ۔اس کے بعد علم طب میں حکیم طالب علی

سے استفادہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا زمانہ مسافرت میں گزرا۔ لکھنو میں ان کی کتابیں اسباب اور روپئے پیسے لٹ گئے۔ جب پٹنہ واپس آئے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی ۔ گھر واپس آنے کے بعد ان کی شادی شیخ ولایت حسین مرحوم ساکن امتھوا کی صاجزادی سے ہوئی جن سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد علامہ حکیم عبدالحمید صاحب پھر لکھنو چلے گئے ۔کچھ دن وہاں رہے پھر دوسری شادی بھی کی جن سے کوئی اولاد نہ ہوئی ۔ تیسری اہلیہ سے ایک لڑکی مسماۃ آمنہ پیدا ہوئیں جن کے دو صاجزادے حکیم فہیم الدین احمد اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی ۔ایچ ۔ڈی نے پٹنہ کی سماجی ،علمی ،اور ادبی دنیا میں ممتاز جگہ پائی۔اس وقت جب علامہ حکیم عبدالحمید صاحب دوبارہ لکھنو سے واپس آئے تو صادق پور تباہ ہو چکا تھا۔وہاں کے سر بر آوردہ حضرات کچھ تو جنگ آزادی میں شہید ہو چکے تھے یا جزیرہ انڈمان کی زمین کے پیوند بن چکے تھے ۔کچھ واپس بھی آئے تھے اس وقت ان کے لئے سر چھپانے کی جگہ نہیں تھی۔جائیداد انگریزوں نے ضبط کر لی تھیں، سر بفلک عمارتوں کو مسمار کر کے ملبہ بنا دیا گیا تھااور حضرت سید احمد صاحب کی تحریک آزادی کو غلط نام دیکر عوام کو دھوکا دینے کے لئے تحریک کا نام بدل دیا تھا۔ایسی حالت میں علامہ حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنی سکونت کے لئے محلہ خواجہ کلاں کا انتخاب کیا جس کے ارد گرد محلوں میں ان کے دیرینہ احباب رہتے تھے اور یہیں مکان بنا کر انھوں نے باضابطہ طبابت شروع کر دی تھی ۔علامہ حکیم عبدالحمید کے علم و فن کے متعلق کچھ لکھنا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔اس وقت کے کون متراولہ علوم تھے جن کے وہ ماہر نہ ہوں وہ شاعر بھی اور اس سے زیادہ شاعر گر تھے ۔طبیب بھی بلکہ اصلی معنی میں حکیم وقت بھی تھے۔عربی،فارسی ،اور اردو زبانوں میں انکی سند کا سکہ چلتا تھا۔حدیث ، تفسیر،فقہ اور علم طب میں ان سے فتاوے لئے جاتے تھے ۔علم طبیعات ،منطق اور فلسفہ میں ماہر و کامل تھے ۔علم ریاضی ،علم فلکیات، علم کیمیا، علم الاجسام میں حیرت انگیز ادراک تھی۔ علم طب کے تو بادشاہ تھے۔جوانی میں موسیقی سے ماہرانہ لگاؤ تھا۔

غرض ۱۸۵۷ء کے کچھ دنوں بعد جب اہالیان پٹنہ کو سکون میسر ہونے لگا اور انگریزوں کے ظلم وجور کی دہشت ختم ہونے کو آئی تو پھر سے اجڑی ہوئی صحبتیں بسیں تو ان میں علم و ادب کی سب سے بڑی صحبت گاہ میرے نانا میر احمد حسین مرحوم کے دولت کدہ پر قائم ہوئی جس کے روح رواں علامہ حکیم عبدالحمید صاحب تھے۔ان کی ذات علم و فضل کی بارگاہ تھی۔ دور دور سے اہل کمال آتے اور ان کے علم و فن سے بہرہ مند ہو کر واپس چلے جاتے۔سب کاموں سے فراغت کر کے علامہ حکیم عبدالحمید صاحب بلاناغہ بعد مغرب تشریف لاتے پھر دوسرے باکمال حضرات کی آمد شروع ہو جاتی ۔ان کے علاوہ علم طب اور تفسیر و حدیث و فلسفہ کے طالبان علم بھی جناب حکیم صاحب سے استفادہ کے لئے حاضر رہتے ۔یہ جلسہ دس بجے رات میں ختم ہوتا۔شرکائے جلسہ میں شمش العماء مولوی محمد حسین صاحب صادق پوری ،مولوی حافظ فضل حق آزاد ،مولانا عبدالغفور شہباز،مولانا سید رحیم الدین مالک و اڈیٹر اخبار الپنچ،نواب سید محمد آزاد،مولوی عبدالغنی وارثی ،مولوی عابد حسین عابد ،مولانا شوق نیموی ،مولانا محمد کمال عظیم آبادی ،کبھی کبھی مولانا سید شاہ سلیمان صاحب پھلواری ،شمس العلماء مولوی عبدالرؤف صاحب اور جب کبھی موقع ملتا تو شمس العلماء مولوی محمد یوسف رنجور بھی آجاتے ۔یہ کلکتہ میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں رہتے تھے۔سید احمد حسین صاحب جن کے دولت کدہ پر یہ علمی مجلس روزانہ بجتی تھی خود صاحب علم تھے۔ اس لئے یہ مجلس کو قائم رکھنے کی برابر کوشش کرتے رہتے تھے ۔میرے والد سید ضمیر الدین احمد مرحوم جب کلکتہ میں اپنی تعلیم ختم کر کے پٹنہ آئے تو وہ بھی مستقلاً شریک جلسہ رہے۔ان مستقل شرکائے جلسہ کے علاوہ باہر سے جو اہل کمال آتے وہ بھی جلسہ کی رونق اپنی شرکت سے بڑھاتے ۔ سنجر طہرانی ایک بڑا فارسی کا شاعر تھا۔ اپنی قابلیت کے آگے سب کو ہیچ سمجھتا تھا۔ہندوستان آیا تو یہاں کے رئیسوں اور امیروں کی مدح میں قصیدے کہہ کر اچھا کچھ انعام حاصل کیا۔ کچھ دنوں رامپور میں رہا مگر ایک

جگہ بیٹھا نہ گیا تمام بڑے شہروں کی سیر کرتا پھرا۔ پٹنہ آتا تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوتا۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ اپنی قابلیت کے مقابلہ میں جو سب کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا وہ علامہ حکیم عبدالحمید صاحب کا بڑا احترام کرتا تھا اور فارسی زبان میں ان کی سند کے سامنے اس کی زبان بند ہو جاتی تھی۔ یہیں کی صحبتوں میں ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کی تجویز بھی منظور ہوئی۔ اخبار نکالنے کا مولوی سید رحیم الدین صاحب نے ذمہ لیا اور شرکائے جلسہ نے ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا۔ یہی اخبار الپنچ کے نام سے نکلا جس نے پٹنہ کی علمی صحافتی اور ادبی دنیا میں نئی جان ڈال دی۔ اکثر اس جلسہ میں الپنچ کے لئے مضامین بھی لکھے جاتے، تنقیدیں بھی لکھی جاتیں اور سماج کے اصلاح و درستگی کے پر لطف نسخے بھی تجویز کئے جاتے۔ کبھی کبھی اردو، فارسی اور عربی میں شرکائے جلسہ اپنی اپنی نظمیں یا غزلیں یہیں پڑھتے۔ یہیں "قانون شیخ" کا درس علامہ حکیم عبدالحمید صاحب اپنے شاگردوں کو بھی دیتے، قرآن و حدیث کی تفسیر بھی بیان کرتے اور یہیں علم فلکیات، ارضیات، ہئیت و اقلیدس سے لیکر فلسفہ و منطق اور ادب و علم الکلام پر دلچسپ اور پر مغز بحثیں بھی چھڑ جاتیں جن میں حکیم عبدالحمید صاحب ہی کی ذات سب سے نمایاں رہتی۔ اگر کبھی حکیم عبدالحمید صاحب کی طبیعت موزوں ہوتی تو فی البدیہہ اردو، فارسی اور عربی میں اشعار کہنا شروع کر دیتے اور ان اشعار کو ان کے شاگرد جو وہاں بیٹھے رہتے لکھتے جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ "قانون شیخ" بھی پڑھا رہے ہیں، شمش بازغہ کا درس بھی دیتے جا رہے ہیں، متنبی پر تنقید کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ عربی اور فارسی میں لانبے قصیدے اور نظمیں بھی کہتے جاتے ہیں۔ ان کی مثنوی "شہر آشوب" جو اس زمانے میں فارسی شاعری میں معیاری نظم کہلاتی تھی اور جو ہملوگوں کی کم نصیبی سے چھپ کر منظر عام پر نہ آسکی وہ بھی اس صورت سے کہی گئی تھی۔ جب ندوۃ العلماء کا مشہور اجلاس ۱۹۰۰ء میں پٹنہ میں منعقد ہوا جس میں تمام ہندوستان کے مشاہیر علماء و فضلا شریک ہوئے تو

اس میں معرکتہ الآرا قصیدہ جو علامہ حکیم عبدالحمید صاحب نے کہا اور جس کو ان کی جگہ پر مولوی سید شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے پڑھا اور جس کے اکثر اشعار ہندوستان کی علمی مرکزوں میں گونجتے رہے وہ قصیدہ بھی اسی طرح علامہ عبدالحمید صاحب کی فی البدیہہ در فشانی کی ایک مثال ہے۔

۱۹۳۹ء میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی پٹنہ تشریف لائے تو حکیم کالو یاد کر کے مجھ سے فرمانے لگے کہ میاں یقین کرو حکیم عبدالحمید مرحوم کی ہستی ایسی تھی کہ طبیعتیں خود بخود ان کی طرف کھنچتی تھیں۔ ایسی جامع شخصیت بہت دنوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ افسوس نہ بہار نے ان کی قدر جانی اور نہ ہندوستان نے ان کی اہمیت پہچانی۔ وہ علماء کی آبرو اور علم و حکمت کا خزانہ اور متقدمین کے علم و فضل کے آخری نمائندہ رہ گئے تھے۔ اب ان کی جگہ پُر نہ ہو سکے گی۔

حیرت ہو گی اگر کوئی کہے کہ پرانے مدرسہ کا پڑھا ہوا ملا پیچیدہ سے پیچیدہ علوم ریاضی و اقلیدس کے مسئلوں کو چٹکیوں میں حل کر دے سکتا ہے۔ مگر میں نے اس طرح کا امتحان لینے والے سے خود ان کی زبانی یہ واقعہ سنا ہے۔ "میرے چچا مولوی سید کریم الدین احمد مرحوم ۱۸۸۶ء میں کلکتہ کے سینٹ زیویرس کالج میں بی-اے میں جی کورس کے طالب علم تھے اور علم ریاضی وغیرہ میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے وہ کالج میں سائنس کے پروفیسر تھے۔ ایک دن کلاس میں ایک بنگالی لڑکے نے کہیں سے تلاش کر کے Hydrostatistics کا ایک پیچیدہ (مسئلہ) پرابلم فادر لافون کے سامنے پیش کیا اور ان سے کہا کہ پرابلم کو ایک گھنٹہ تک حل کرنے کی کوشش کرتے رہے ان کا گھنٹہ ختم بھی ہو گیا مگر یہ پرابلم لائن لانچل ہی رہا۔ دوسرے دن حل کرنے کا وعدہ کر کے فادر لافون کلاس سے چلے گئے۔ دوسرے دن پھر ان کا کلاس تھا آئے اور Hydrostatistics کے اس پرابلم کو بورڈ پر جا کر لڑکوں کے سامنے حل کر دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ پرابلم واقعی بڑا سخت تھا اور لڑکوں نے بڑی تلاش اور جستجو کے

بعد یہ پرابلم کلاس میں فادر لافون کو اس لئے دیا تھا کہ اگر حل نہ کر سکے تو انہیں سخت شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ کچھ دنوں کے بعد پٹنہ میں جب مولوی کریم الدین صاحب مرحوم چھٹیاں گذارنے اپنے بھائی مولوی ضمیر الدین کے پاس آئے تو ان کے کالج کا یہ تازہ واقعہ ان کے ذہن میں موجود تھا۔ صدر گلی میں علامہ حکیم عبدالحمید صاحب کی صدارت میں اربابِ علم و فن کی روزانہ محفل جمتی تھی۔ ایک دن اتفاق سے گفتگو گھوم پھر کر انگریزی نصاب اور طریقہ تعلیم پر آنکلی۔ جناب حکیم عبدالحمید صاحب فرمانے لگے کہ بھئی اب جو کہو نیا زمانہ ہے نئے لوگ ہیں مگر نصاب تعلیم ہملوگوں کے مدرسوں میں بھی آج کل یونیورسیٹیوں سے کم نہ تھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو جو پختگی علم کی ہملوگوں کے یہاں کے نصاب تعلیم سے آئی تھی وہ انگریزی نصاب تعلیم میں بڑی حد تک مفقود ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ جناب حکیم صاحب میں آپ سے اختلاف تو نہیں کرتا مگر یہ ضرور ہے کہ سائنس کے علوم اور خاص کر علم و ریاضیات وغیرہ میں پرانے مدرسوں کا نصاب یا تو ناقص ہے یا اتنا معمولی رہا ہے کہ اس کا مقابلہ آج کل یونیورسیٹیوں کے نصاب سے کیا جانا مضحکہ خیز ہوگا۔ یہ سننا تھا کہ حکیم صاحب مرحوم کے تیور چڑھ گئے فرمانے لگے۔ جناب آپ نے یہ کیسے کہہ دیا۔ اجی صاحب! میں آج ہی آپ کے انگریز اور انگریزی داں صاحبان کو دعوت دیتا ہوں کہ جس شعبہ علم میں چاہیں مجھ سے آکر مقابلہ کرلیں۔ حکیم صاحب ہانک ڈانٹ کی باتیں برابر کیا کرتے تھے لوگ سنتے اور چپ ہو جاتے تھے۔ مولوی سید کریم الدین احمد مرحوم کہتے تھے کہ اس گفتگو میں مجھے یکایک Hydrostatistics کے اس پرابلم کا خیال آیا جو ایک لڑکے نے فادر لافون کو حل کرنے کے لئے پیش کیا تھا۔ میں نے درمیان میں بات کاٹ کر حکیم صاحب مرحوم سے عرض کیا کہ حضور ریاضی کا ایک (پرابلم) مسئلہ مجھے یاد ہے۔ ہے تو ذرا پیچیدہ مگر پھر بھی اس پر غور فرمایا جائے کہ کس طرح حل ہوگا۔ اور یہ کہہ کر وہ پرابلم (مسئلہ) ان کے سامنے پیش کردیا۔ حکیم صاحب ہنس کر بولے کہ میاں! میرا

امتحان لینا چاہتے ہو۔ خیر یہ بھی کر کے آج دیکھ لو۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ذرا یہ مسئلہ (پرابلم) کاغذ پر لکھ دو میں بھی دیکھوں کیسا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ مولوی سید کریم الدین احمد مرحوم نے فوراً ایک کاغذ پر وہ پرابلم لکھ کر حکیم صاحب کے آگے بڑھا دیا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ بس چار پانچ منٹ حکیم صاحب غور فرمانے کے بعد کہنے لگے کہ کریم میاں ذرا کاغذ اور قلم ادھر تو بڑھانا انھوں نے فوراً ان کے کہنے کی تعمیل کی اور حکیم صاحب مرحوم نے اس **Hydrostatistics** کے پرابلم کو کاغذ اور قلم لیتے ہی تین سطروں (**Three Slaps**) میں حل کر کے رکھ دیا۔ سارے حاضرین مجلس پر سناٹا چھا گیا۔

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ بھی لوگ بیان کرتے تھے۔ اس وقت مسٹر یوبینک (**Mr. Eubank**) پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے اور علم ریاضی کے ماہر مانے جاتے تھے۔ ایک دن علم ریاضی پر بات نکلی اس وقت حکیم صاحب بڑے موڈ میں تھے ایک صاحب نے مسٹر یوبینک کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اور ان کی صلاحیت کی مدح سرائی کرنے لگے۔ حکیم صاحب اس وقت اچھے خاصے موڈ میں تھے۔ جن صاحب نے مسٹر یوبینک کا تذکرہ چھیڑا تھا ان سے حکیم صاحب نے کہا کہ ذرا اپنے یوبینک صاحب سے اس ریاضی کے مسئلہ کا حل تو پوچھئے گا جو میں آپ کو دیتا ہوں۔ وہ صاحب مسٹر یوبینک کے شاگرد رہ چکے تھے اور ان کے قریبی ملنے والوں میں تھے۔ دوسرے دن وہ صاحب مسٹر یوبینک کے پاس گئے اور ان کو یہ بتایا کہ ایک پرانے عربی داں عالم نے ریاضی کا یہ مسئلہ دیا ہے۔ آپ اس کا حل بتائیے۔ مسٹر یوبینک نے ان کے سامنے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی مگر حل نہ کر سکے۔ وہ صاحب پھر حکیم صاحب کے پاس آئے مسٹر یوبینک کی ناکامی بیان کی۔ حکیم صاحب خوب ہنسے اور چٹکیوں میں مسئلہ حل کر کے رکھ دیا۔ مسٹر یوبینک کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے بڑی فراخ دلی سے اپنی شکست تسلیم کر کے حکیم صاحب کی قابلیت کا اعتراف کر لیا۔

فن طبابت میں جو ان کو کمال حاصل تھا اور جس طرح پر معرکتہ الاراء علاج کرتے تھے اس، کے سبب سے صوبہ بہار ہی میں نہیں یہاں سے باہر بھی ان کی مانگ رہتی تھی۔ مہاراجہ ڈمراؤں کی اہلیہ رانی صاحبہ کا علاج جس صورت حال میں انھوں نے کیا وہ حیرت انگیز تھا۔ مہارانی کو حمل تھا۔ وضع حمل کو کچھ دن باقی تھے مگر وضع حمل کے آثار شروع ہو گئے اور درد زیادہ نہ تھا۔ مہاراجہ کا دیوان انگریز تھا۔ مہاراجہ نے اس کے مشورے پر کلکتہ سے انگریز ڈاکٹر، انگریز لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں کو تار دیکر بلایا۔ یہ سب آئے علاج فوراً شروع ہوا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وضع حمل کے آثار ہوتے ہوئے بھی وضع حمل نہ ہو رہا تھا۔ بدن نیلا ہونا شروع ہو چکا تھا اور مہارانی پر غشی طاری ہونے لگی تھی اور بین طور پر مہارانی کی حالت ابتر ہوتی جارہی تھی انگریز ڈاکٹر اور انگریز لیڈی ڈاکٹر آخری علاج آپریشن بتا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پیٹ میں بچہ مر چکا ہے اور زہر اسی سبب سے بدن میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے۔ مہاراجہ آپریشن پر راضی نہ تھے۔ اپنے تردد اور پریشانی میں مہاراجہ نے حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم کو بلا بھیجا۔ یہ اس کے گھر کے مستقل معالج تھے۔ جس وقت حکیم صاحب پہنچے مہارانی کی زندگی سے انگریز ڈاکٹر مایوس ہو چکے تھے۔ مہارانی کا تقریباً تمام بدن نیلا ہو چکا تھااور مکمل بے ہوشی طاری تھی۔ صرف سانس چل رہی تھی۔ حکیم صاحب نے حال سنکر کہا فوراً ایک گہرا ٹب لایا جائے پھر اس طباق میں نیم گرم پانی ڈالا جائے۔ یہ ہو چکا تو حکیم صاحب نے بکس کی پڑیا سے تھوڑا سفوف ٹب میں ڈالا اور مہاراجہ سے کہا کہ آپ اپنی دو مضبوط خادماؤں کو حکم دیجیئے کہ مہارانی کو اس ٹب میں بیٹھائیں اور مضبوطی کے ساتھ ان کو پکڑے رہیں۔ نیچے کے کپڑے علیحدہ کر دیئے جائیں چونکہ مہارانی بے ہوش ہیں اس لئے ان کو اس طرح بیٹھایا جائے کہ پیٹ اور نیچے کا حصہ مکمل طور پر پانی کے اندر رہے اور جب تک میں نہ کہوں مہارانی کو اس طرح بیٹھائے رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد قدرت کا یہ کرشمہ نظر آیا کہ مردہ بچہ خود بخود باہر آگیا۔ مردہ بچے کے ساتھ پیٹ سے آلائشیں بھی نکلنے لگیں اور مہارانی کے بدن کی رنگت اصلی حالت

پر آنے لگی۔اس کے تھوڑی دیر بعد مہارانی کو ہوش بھی آ گیا۔اب مہارانی کو ٹب سے باہر نکال کر مسہری پر لٹا دیا گیا۔کمزوری بہت زیادہ تھی اس لئے حکیم صاحب نے دوسری دوا مہارانی کو دی جو دافع زہر بھی تھی اور بدن میں قوت بھی لانے والی تھی ۔ کچھ دنوں تک حکیم صاحب کا علاج رہااور مہارانی اچھی ہو گئیں۔کلکتہ کے انگریز ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر بڑی حیرت سے حکیم صاحب کا طریقہ علاج دیکھتے رہے اور جب جانے لگے تو حکیم صاحب کی بڑی تعریف بھی کی ۔ حکیم صاحب بڑے ظریف بھی تھے اور بڑے وضع دار بھی تھے ۔خدمت کے لئے چار ملازم تھے۔رات میں جب حکیم صاحب سونے لگتے تو جو خدمتگار ان کی خدمت میں حاضر رہتا اس سے پوچھتے کہ کل کس کی باری ہے جس کی باری ہوتی وہ حکیم صاحب کو اپنا نام بتادیتا۔دوسرے دن حکیم صاحب صبح سے لیکر سونے کے وقت تک اسی خدمت گار کا نام لیکر پکارتے۔یہ اور بات تھی کہ دوسرا خدمت گار حاضر ہو کر کام انجام دیدیتا مگر اس دن صرف ایک مخصوص نام پکارا جاتا۔

ایک دن میرے نانا میر احمد حسین صاحب مرحوم کے یہاں کی مجلس گرم تھی ۔رات کا وقت تھا۔حکیم صاحب مرحوم حسب معمول میر مجلس تھے ۔اتنے میں ایک ملازم نے میر احمد حسین صاحب سے آکر کہا کہ اندر زنان خانہ میں سرکار بی بی صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے حضور کو بلایا ہے ۔میر احمد حسین صاحب اٹھ کر اندر تشریف لے گئے کچھ دیر بعد باہر تشریف لائے تو حکیم صاحب کو ڈھونڈھا۔ ایک صاحب جو وہاں تھے انھوں نے کہا کہ آپ کے جانے کے فوراً بعد ہی جناب حکیم صاحب اپنے ملازم کو جو روشنی لے کر ساتھ آیا اس کو آواز دی وہ آیا تو بلا کچھ کہے سنے اٹھ کر گھر تشریف لے گئے ۔میر احمد حسین صاحب اس پر ہنسے اور اپنے ملازم کو بلا کر حکم دیا کہ پالکی اور چار کہار اور ایک پیادہ کو ساتھ لیکر جناب حکیم صاحب کے یہاں جاؤ اور عرض کرو کہ اندر سرکار بی بی کی طبیعت خراب ہے اس لئے سرکار نے آپ کو آنے کی زحمت دی ہے ۔ تھوڑی دیر بعد حکیم صاحب پالکی پر تشریف لائے اور معالج کی طرح اندر جاکر مریضہ کو دیکھا نسخہ لکھا اور واپس چلے گئے۔یہ حکیم صاحب کا اپنے فن

طبابت کے وقار کو قائم رکھنے اور اپنی خودداری کو نباہنے کی ایک مثال تھی۔

غرض حکیم صاحب مجمع کمالات تھے اور اپنے دور کے ایسے منفرد انسان تھے جس کی مثال آج بھی ملنی مشکل ہے مگر افسوس ہے کہ ان کے تذکرے اب چند ہی اشخاص کی زبانوں پر ہیں،ان کے کمالات جو بے انتہا تھے ان کا تحریری ثبوت کتابی شکل میں ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکا۔ان کی تفصیلات و تالیفات اور ان کے علمی و ادبی سینکڑوں مضامین غالبًا بستوں میں بند پڑے ہیں۔ان کے کارنامے چاہے طبابت سے متعلق ہوں، چاہے دیگر علوم و فنون سے متعلق ہوں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ان کے جاننے والے بھی اٹھ گئے۔اب تو سنی سنائی دو چار باتیں دوہرائی جارہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ حکیم صاحب کی ساری علمی اور ادبی تخلیقات جو بھی موجود ہوں ان کو چھپوایا بھی جائے اور ان پر ریسرچ بھی کیا جائے۔ حکیم صاحب کی اردو ادب اور شاعری سے متعلق بہت سی تحریریں ان کے وقت کے اخبار الپنچ میں مل جائے گی۔ حکیم صاحب ہی اس اخبار کے روح رواں تھے۔شاد اور آزاد کے معرکوں میں پس پردہ حکیم صاحب کہ اصلاحیں کار فرما ہوتی تھیں۔خود حضرت شاد کو اعتراف بھی تھا کہ حکیم عبدالحمید صاحب کے اعتراضات سے ان کو فائدہ بھی پہنچا۔اپنے شعر میں مصلحتًا صاف صاف تو نہ کہا مگر گفتگو میں یہ اعتراف کرتے آئے۔میرا اشارہ حضرت شاد کے اس شعر کی طرف ہے۔

بتا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا !

خدا بھلا کرے اے شآد نکتہ چینوں کا !!

حکیم صاحب کی شاعری کا مجموعہ بھی اگر ایک جگہ سمیٹا جائے تو ایک ضخیم دیوان بن جائے مگر ان کے سارے کلام ایسے برے طور پر منتشر ہیں کہ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے کلام دوچار جگہوں کے علاوہ اور کہاں کہاں ہوں گے۔بہر حال میں حکیم صاحب کا ایک شعر جس میں ان کا تخلص بھی ہے تبرکاً پیش کر رہا ہوں۔

ہماری الجھنوں کو کاکُلِ محبوب جانے ہے

پریشآں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے۔

حکیم صاحب نے لاکھوں کمایا اور جو کچھ کمایا تقریباً سب کو اپنی زندگی میں ہی لٹا گئے۔

۱۹۰۵ء میں حکیم صاحب مرحوم کا انتقال ہوا۔ ملک کے ہر حصہ میں خاص کر دہلی، لکھنو اور پنجاب میں ان کے انتقال پر بڑے بڑے تعزیتی جلسے ہوئے۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کی شخصیت کتنی ہمہ گیر اور ہند گیر تھی۔

شمس العلماء مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم

یہ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے اور علامہ حکیم عبدالحمید صاحب سے چودہ سال بڑے تھے۔ ان دونوں حضرات میں دور کی رشتہ داری بھی تھی ۔ پٹنہ میں مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم اور علامہ عبدالحمید صاحب مرحوم دونوں اپنے تبحر علمی کے سبب سے یہاں کے دوسرے علماء اور فضلاء میں سب سے آگے سمجھے جاتے تھے ۔ عربی اور فارسی علم و ادب کے علاوہ مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم تفسیر حدیث اور فقہ میں پٹنہ ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں بڑا امتیازی درجہ رکھتے تھے ۔ علامہ عبدالحمید صاحب مرحوم ،جو علم و فضل میں مشکل ہی سے کسی کی سیادت ماننے کو تیار ہوتے تھے ،وہ بھی مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم کو علم وادب ،فقہ،حدیث و تفسیر میں مستند مانتے تھے اور مولانا شاہ محمد سعید مرحوم صاحب بھی علامہ عبدالحمید صاحب مرحوم کی علمی قابلیت کے قائل تھے۔

مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم صرف جید عالم ہی نہیں بلکہ بڑے صوفی اور رُشد ہدایت میں پیر طریقت بھی تھے۔ ان کے یہاں ان کے معتقدین اور متوسلین کا ہمیشہ مرجوعہ رہتا تھا۔ صاحب دولت زمیندار بھی تھے ۔اس لئے آنے جانے والے مسافروں اور مہمانوں کے لئے لنگر خانہ بھی جاری تھا اور محتاجوں اور مجبوروں کی مدد بھی کرتے تھے ۔ان کے مکان ہی میں ان کی خانقاہ بھی تھی۔ گھر سے بہت کم باہر جاتے تھے۔ ملنے والے تو خود ہی کھینچ کر ان کے یہاں آجاتے تھے۔ کوئی اولاد نہ تھی اس لئے

بھائی کے نواسے کو متبنیٰ کر لیا تھا جن کا نام نذر الرحمان تھا۔ یہ حافظ بھی تھے اور شاعر و شاعری کے بڑے دلدادہ بھی اور حفیظ تخلص کرتے تھے۔ مولانا شاہ محمد سعید مرحوم سے ان کو بیعت و خلافت ملی اور ان کی بڑی زمینداری بھی ملی مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم کو ان کے تبحر علمی اور فضل و کمال کے باعث جو مقام حاصل تھا اس کا مکمل تذکرہ لکھنا میرے لئے بے حد مشکل ہے کیونکہ ان کی سوانح عمری لکھنے کے لئے جو مواد مہیا ہونا چاہیے وہ بڑی حد تک مہیا نہ ہو سکا۔ یہ قوم کی بد قسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایسے عالم دین اور صاحب فضل و کمال کا تذکرہ مکمل طور پر کہیں نہیں ملتا۔ بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ تذکرہ صادقہ کے مولف مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم صادق پوری پٹنہ نے تذکرہ صادقہ میں ان کے مختصر حالات لکھ کر اس کمی کو ایک محدود حد تک پورا کر دیا۔

مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم نے ابتدائی درسی کتابیں پٹنہ کے ایک جید عالم مولوی مظہر علی مرحوم سے پڑھیں، پھر مولوی ابوالحسن مرحوم منطقی سے، جو موضع بیہورہ، دانا پور ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے، سبق لئے، اس کے بعد لکھنؤ جاکر مولانا محمد سعید صاحب نے ہندوستان کے بڑے محدث اور مفسر مولانا حسن علی سے حدیث و تفسیر کی سند حاصل کی۔ پھر لکھنؤ سے چلے تو کانپور آکر مولانا شاہ سلامت اللہ مرحوم سے مجدداً کتب درسیہ دوبارہ دیکھا اور مقامات مغلقہ کا حل حاصل کیا اور وہیں شاہ نذر محمد صاحب مرحوم سے بیعت حاصل کی۔

اب مولانا شاہ محمد سعید صاحب کو ہر چیز میں سند حاصل ہو چکی تھی۔ پٹنہ واپس آنے پر برابر درس اور تدریس میں مصروف رہتے اور رشد و ھدایت کا فرض انجام دیتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور دو برس مکہ معظمہ میں قیام کر کے آپ نے وہاں کے دو بہت مشہور عالم سید احمد دہلان اور محمد بن سنوسی حسینی الخطائی اور ان کے علاوہ وہاں کے دیگر اکابر علماء سے بھی حدیث کی سندیں حاصل کی۔ مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم باوجود اس کے کہ ہزار ہا مسائل

جزیہ مستغر پر آپ کو درک حاصل تھا اور سینکڑوں حدیثیں آپ کو حفظ تھیں پھر بھی آپ بغیر کتابوں کے دیکھے ہوئے مسئلوں کا جواب نہیں دیتے تھے اور مسئلوں کا جواب دینے میں اس درجہ احتیاط تھی کہ سامنے کتاب کھول کر فرمادیتے کہ کتاب میں یوں لکھا ہے اور اپنی رائے کچھ نہ دیتے۔

مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم کو درس و تدریس کا بیحد شوق تھا۔ خود ان کی اپنی درسگاہ بھی تھی۔ آپ روزانہ فجر سے درسی کتابوں کا درس دیا کرتے۔ بعد نماز ظہر حدیث و تفسیر کا درس ہوتا۔ اس درس گاہ میں امیر غریب سب آکر شریک درس ہوتے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے والوں میں امیر و غریب کی کوئی تفریق نہ تھی۔ ان کے یہاں درس لینے والوں میں میرے نانا میر احمد حسین صاحب مرحوم بھی تھے۔ امیر شاگردوں کو حکم تھا کہ میرے یہاں آؤ تو معمولی شاگردوں کی حیثیت میں آؤ رئیس زادوں کی حیثیت میں نہ آؤ۔ میرے نانا میر احمد حسین مرحوم باوجود پٹنہ کے ایک رئیس زادہ ہونے کے بغل میں کتابیں دبائے روزانہ پاپیادہ مولانا کی درس گاہ میں جاتے تھے۔ اپنی ذاتی درس گاہ کے علاوہ مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم نے الگ سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں انھوں نے مولانا محمد عظیم صاحب کو مدرس اول مقرر کیا تھا ان کے علاوہ ان کے ماتحت اور بھی اساتذہ تھے۔ بہت سے طلباء کے مفت کھانے پینے کا نظم آپ نے خود اپنے گھر کر رکھا تھا اور ان کے دوسرے اخراجات یعنی کپڑوں اور کتابوں کے خود کفیل ہوتے تھے۔

مولانا محمد شاہ سعید مرحوم نے اپنا ذاتی کتب خانہ بھی قائم کیا تھا، جس میں عربی اور فارسی کی بہ کثرت نادر کتابیں اور قلمی نسخے جمع کئے تھے۔ جب حج کے لئے مکہ معظمہ گئے اور وہاں دو سال قیام کیا تو مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ اور دیگر بلاد عربیہ سے ہزاروں نایاب کتابیں اور قلمی نسخے خرید کر لائے مگر افسوس ہے کہ جس طرح ان کا گھر ویران ہوا یہ قیمتی کتب خانہ بھی تلف ہو گیا۔ مولانا کے انتقال کے بعد ان کے جانشیں

حافظ نذرالرحمٰن حفیظ مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے کم سن لڑکے خلیل الرحمٰن بھی گھر کو سنبھالتے سنبھالتے ختم ہو گئے۔اب ان کے کم عمر بچوں نے مٹا ہوا گھر دیکھا۔وہ کیا جانیں کہ پٹنہ میں ان کا گھر کتنی بڑی سیادت کا مرکز تھا۔

مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم صرف بلند پایا عالم وفاضل ہی نہ تھے بلکہ وہ عربی فارسی اور اردو کے بڑے فنکار شاعر بھی اور شاعر گر بھی تھے اور حسرت فارسی میں اور سعید عربی میں تخلص کرتے تھے۔ان کے اشعار اور ان کی اصلاح سند کی حیثیت رکھتی تھی۔افسوس تو اس کا ہے کہ ان کے عربی اور فارسی کے کلام کا مجموعہ جو ان کی زندگی میں مرتب کیا جا چکا تھا وہ بھی نہ چھپ سکا اور یہ بھی پتہ نہیں کہ مجموعہ اب کہاں ہے۔میں آگے بھی کہہ چکا ہوں کہ مولانہ شاہ محمد سعید صاحب مرحوم کے حالات زندگی ابھی تک مکمل طور پر نہ مل سکے ہیں۔یہی حالت ان کے عربی، فارسی کے کلام کی ہے۔کم از کم میری رسائی ان تک نہ ہو سکی۔مولانا کی چند تصنیفات بھی ہیں جن میں قطاس البلاغۃ اور مقصد البلاغۃ بہت قابل قدر کتابیں ہیں جو مشکل ہی سے اب دستیاب ہو سکتی ہیں۔مولانا کے علم و فضل کے ساتھ ان کا زہد و تقویٰ اور ان کی سادہ اور پاکیزہ زندگی ایک مثالی زندگی تھی۔ وہ در حقیقت ایک رفیع الدرجات، باعمل عالم اور ایک بڑے باوقار بزرگ دین تھے۔ ہر طبقہ کو ان کی عظمت کا اعتراف تھا۔اسی لئے اس وقت کی برطانوی حکومت نے بھی ملکہ وکٹوریہ کی سلور جبلی کے موقع پر مولانا کو شمش العلماء کا خطاب دیکر ان کی فضیلت پر مہر سند ثبت کر دی تھی۔۱۸۸۷ء میں مولانا شاہ محمد سعید صاحب مرحوم کا انتقال ہوا اور پٹنہ ایک بلند مرتبت شخصیت کے فیض و برکت سے محروم ہو گیا۔ آخر میں یہ تذکرہ میں خود مولانا کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

مستی و بیخودی ولذت و کیفیت عشق ! ہمہ از تربیت پیر مغانم داد ند !!

اس شعر کے علاوہ مولانا کی کوئی غزل نہ مل سکی اسی پر اکتفا کر کے تبرکاً اس شعر کو پیش کر رہا ہوں۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور پٹنہ

غالباً ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ ایک بزرگ تجارت کے سلسلہ میں صوبہ پنجاب کے ضلع گجرات سے پٹنہ آئے یہ ضلع گجرات کے ایک باعظمت خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جو سعادت وجاحت اور سلسلہ بیعت کے لئے مشہور تھا۔ یہ خود بھی بہت ہی متدین اور متشرع اخلاق و عادات میں بہت ہی منکسر المزاج اور ملنسار تھے۔ محلہ جھاؤ گنج میں جو خواجہ عنبر کی مسجد ہے اسی کے حواشی مکانوں سے ایک میں ٹھہرے۔ ان کی تجارت کاشمیری شال اور جامہ وار کے علاوہ مشک و زعفران کی تھی۔ جلد ہی ان کی وجاہت، پیشہ میں ایمانداری اور اعلیٰ درجے کی چیزوں کی بکری کے باعث ان کی رسائی پٹنہ کے بڑے بڑے گھروں میں ہونے لگی۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے خواجہ عنبر کی مسجد کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے لیااور اس میں جا رہے اور دو چار برس بعد اپنے بچوں اور ایک بھتیجے کو بھی پنجاب سے لے آئے۔ جو ان کی نگرانی میں مکتب اور اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے بھتیجے سید شاہ ضیاء الدین تھے جو حافظ قرآن بھی تھے اور وہ تجارت میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ اور اپنے چچا ہی کی طرح متدین اور متشرع بھی تھے۔ دونوں چچا بھتیجا ساتھ ہی رہتے تھے، کبھی مال کی بکری میں ساتھ جاتے اور کبھی پنجاب سے جو اشخاص آتے وہ ان دونوں سے ملنے کو ضرور ان کے پاس جاتے۔ آس پاس کے سکھ حضرات بھی ان کی تعظیم و تکریم کرتے۔

انہیں دنوں محلہ خانہ باغ پٹنہ میں ایک بزرگ رئیس سید احمد شاہ رہتے تھے۔ ان کا مکان بھی خانہ باغ کہلاتا تھا اور اسی مکان کے نام پر یہ محلہ بھی خانہ باغ کہلانے لگا۔ سید احمد شاہ صاحب نجیب الطرفین سید تھے اور ان کو تلاش تھی کہ کوئی اعلیٰ خاندان کا لڑکا مل جائے تو اپنی صاحبزادی کی اس سے شادی کر دیں۔ جب ماسٹر سید شاہ ضیاء الدین صاحب اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں پٹنہ آئے تو ان کو بہت جچے۔ ان کے یہاں دونوں چچا بھتیجا کا آنا جانا بڑھا تو سید احمد شاہ نے حافظ سید شاہ

ضیاء الدین صاحب کو بہت زیادہ نزدیک سے دیکھا۔لوگوں سے ان کے خاندانی حالات معلوم ہو ہی چکے تھے۔ اب نسبت کا سلسلہ چلا تو بات پکی ہوتے دیر نہیں لگی۔ غرض سید شاہ ضیاء الدین سید احمد شاہ کے داماد بن گئے۔ کچھ دنوں کے بعد سید شاہ ضیاء الدین صاحب کی اہلیہ کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام تو سید شاہ شرف الدین رکھا گیا مگر حافظ سید شاہ ضیاء الدین اس کو عطاء اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہی نام آخر میں ان کا پڑ گیا۔ سید شاہ ضیاء الدین صاحب کے چچا آخر عمر میں ضلع گجرات چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹوں میں ایک صاحب پٹنہ میں ہی رہ گئے اور پولس میں سب انسپکٹر کی ملازمت کر لی ان کا نام سید محمد اسحاق تھا۔ کچھ دنوں کے بعد حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا اس وقت عطاء اللہ شاہ کم سن تھے مگر ان کے والد صاحب نے خود ان کی دیکھ بھال شروع کی۔ اپنی اہلیہ کی زندگی میں ہی خانہ باغ کے قریب محلّہ لنگور گلی میں ایک مکان خرید لیا تھا وہیں رہتے اور شال دوشالہ جامہ دار اور مشک و زعفران کی تجارت کرتے تھے۔ سال دو سال میں پنجاب بھی چلے جاتے۔ کچھ دنوں کے بعد سید شاہ ضیاء الدین صاحب نے دوسری شادی پنجاب میں کی مگر پٹنہ کو پھر بھی نہیں چھوڑا۔ اب سید عطاء اللہ عنفوان شباب کی سرحد میں پہونچ چکے تھے۔ اسی زمانے میں میرے والد مرحوم خان بہادر سید ضمیرالدین احمد صاحب نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے یہاں ان کے اجلاس کامل کے نائب صدر اور ان کے چیف سکریٹری کے عہدے پر فائز ہو کر جانے لگے تو یہ فکر ہوئی کہ میری دیکھ بھال کے لئے کوئی اچھا آدمی مل جائے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں سید شاہ ضیاء الدین صاحب تھے یہ والد مرحوم کے بڑے دوست بھی تھے، بڑے دیانتدار اور بڑے ہمدرد بھی۔ رہ رہ کر میرے والد مرحوم کی نظر انتخاب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب ہی پر ٹھہرتی تھی مگر ہچکچاتے تھے کہ ان سے میری تعلیم اور نگہداشت

صدر گلی میں رہ کر کرنے کی بات ان سے کہیں یا نہ کہیں۔ آخر ایک دن جب حافظ صاحب مرحوم تشریف لائے تو والد مرحوم نے اپنی مشکل ان کے آگے پیش کی جس میں یہ استدعاء بھی تھی کہ بھوپال جب والد مرحوم جائیں تو پٹنہ میں میری تعلم و تربیت اور نگہداشت کا کام حافظ صاحب انجام دیں۔ حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ یہ بات منظور کرلی مگر شرط یہ رکھی کہ باورچی خانہ ان کا اپنا رہے گا۔ جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب اس پر سختی سے مصر تھے۔ آخر انہیں کی بات رہی۔ جناب حافظ صاحب کو والد مرحوم صرف میری تربیت تعلیم و نگہداشت کا کام نہیں سپرد کر گئے بلکہ گھر کا مختار کل بھی ان کو بنا کر گئے۔ اب حافظ سید ضیاء الدین صاحب اپنے مکان لنگور گلی سے میرے مکان محلّہ صدر گلی میں اُٹھ آئے۔ ان کے صاجزادے سید شاہ عطاء اللہ بھی ان کے ساتھ آگئے جن کو میں عطاء اللہ بھائی کہتا تھا۔ سید شاہ عطاء اللہ کی عمر اس وقت اٹھارہ انیس سال کی ہو گی۔ یہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑے ہوں گے۔ انھوں نے بھی قرآن شریف حفظ کر لیا تھا مگر پھر بھی کچے تھے۔ قرآن شریف کی تلاوت اور گردان میں بڑی تساہلی کرتے اور اس کے لئے جناب حافظ صاحب کی ڈانٹ بھی سنتے۔ سید شاہ عطاء اللہ نے ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ صدر گلی آئے تو ہمارا گھر بھرا ہوا ملا۔ ہم سبھوں کا مکان بہت بڑا تھا۔ ایک محلّہ ہی کہیے۔ میرا مکان، میرے ماموں صاحبان کے مکانات زنانے اور مردانے حصے سب ایک ہی حلقہ میں تھے یہاں ان کو ساتھی بھی مل گئے۔ کچھ یہاں کے اقامت پذیر طلباء اور دو تین تو نوجوان میرے ماموں صاحبان یہ سب ان کے ساتھی اور دوست تھے۔ عطاء اللہ شاہ بچپن سے ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی کے آدمی تھے۔ یہاں ان کا خوب جی لگا۔ صبح اور شام حافظ صاحب مجھے قرآن شریف اور دوسری کتابیں پڑھاتے۔ ان

وقتوں میں پڑھنے کے لئے سید شاہ عطاء اللہ بھی پکڑے جاتے۔ اکثر ان کے ساتھ یہ ہوتا کہ تھوڑا سا پڑھ کر یہ جناب حافظ صاحب سے کہتے کہ اب نہیں پڑھوں گا اور حافظ صاحب فرماتے کہ اچھا کتابیں اٹھالو اور جاؤ۔ میں نے دیکھا کہ یہ پڑھنے سے چھٹکارا پانے کی اچھی ترکیب ہے۔ چناچہ ایک دفعہ یہی داؤ میں نے بھی استعمال کیا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے بھی حافظ صاحب سے کہا کہ اب نہ پڑھوں گا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ گلو خلاصی ہو جائے گی مگر میرے اس کہنے پر ایک زلزلہ آیا۔ جناب حافظ صاحب گرج کر بولے تو نہیں پڑھے گا تو تیرا کچومر نکال دوں گا۔ عطاء اللہ کی پیروی کرنے چلا ہے۔ وہ تو سرکش اور باغی بن گیا ہے۔ میں تجھے اس کی طرح غارت ہونے نہ دوں گا۔ حقیقت یہ تھی کہ سید شاہ عطاء اللہ اگرچہ ان کے بیٹے تھے مگر جناب حافظ صاحب مجھے بھی ان سے کم نہ سمجھتے تھے اور بڑی محبت کرتے۔ پھر یہ بات تھی کہ سید شاہ عطاء اللہ بچپن ہی سے آزاد منش اور ایک حد تک سرکش بھی تھے اور اسی لئے جناب حافظ صاحب ان پر زیادہ سختی بھی نہیں کرتے تھے۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے دل جوئی بھی کرتے تھے۔ جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین کی تجارت یہاں بھی جاری تھی۔ کبھی خود معزز خریدار آپ کے پاس آجاتے کبھی یہ ایسے لوگوں کے یہاں جاتے تو ان کے حسب فرمائش شال دوشالے خریدنا چاہتے۔ اگر پسند کی چیزیں نہ ہوتیں تو کاشمیر سے خط لکھ کر منگواتے اور ان کو دیتے۔

جناب حافظ صاحب تقریباً ساڑھے چار سال میرے یہاں مستقل طور پر رہے اور عطاء اللہ شاہ صاحب میرے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے۔ ایک دفعہ میرے ایک ماموں عبدالحفیظ صاحب جو دیہات میں رہتے تھے ان کو اپنے ساتھ دیہات لے گئے وہاں یہ پانچ چھ مہینے رہ گئے۔ دیہات کے لہلہاتے کھیت ان کو خوب پسند آئے۔ دیہات کی ندیوں میں مچھلی کا شکار ان کو پسند آیا۔ بڑے بڑے جال، جسے زمین پر بچھا کر تیتر اور بٹیر پکڑے جاتے ہیں اور جس کو چاتر کہتے ہیں۔ ان سے تیتر اور بٹیر کا شکار کرتے ہیں یہ

خوب مشاق ہوگئے۔ انہیں دنوں جب میرے والد مرحوم بھوپال سے کچھ دنوں کی رخصت لیکر آئے تو وہ عطاء اللہ شاہ صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بھوپال میں یہ آٹھ نو مہینے رہے۔ وہاں کی روداد یہ بڑے مزے میں بیان کرتے تھے۔ جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب صدر گلی میں تھے تو ایک دفعہ چند ہفتوں کے لئے اپنے گھر گجرات پنجاب بھی ہو آئے یہاں انھوں نے عطاء اللہ کی والدہ کے انتقال کے بعد اپنی برادری میں شادی کرلی تھی یہ محترمہ بڑی خدا ترس، عبادت گذار اور حافظ بھی تھیں۔ ان سے جناب حافظ صاحب کو ایک لڑکا بھی تھا۔ جب والد صاحب مرحوم ۱۹۱۱ء میں بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر واپس آگئے تو جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب پھر واپس اپنے واقع محلّہ لنگور گلی چلے گئے مگر ہفتہ میں دو تین دفعہ صدر گلی ضرور آجاتے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب مستقلاً اپنے گھر گجرات پنجاب گئے اور ان کے ساتھ عطاء اللہ شاہ بھی گئے۔ پنجاب ہی میں عطاء اللہ شاہ نے اپنی عربی تعلیم مکمل کی اور مدرسہ سے نکلے تو اپنے ساتھ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت اپنے جلو میں لیکر نکلے۔

تقریباً عطاء اللہ شاہ صاحب کو پٹنہ سے گئے ہوئے نو دس سال ہوئے ہوں گے کہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں اور ان کی بصیرت افروز تقریر دو ایک جگہ ہوئی جس میں لوگوں کا مجمع تھا اور ایک تقریر اسی دن پٹنہ سیٹی کی جامع مسجد مدرسہ پر رات میں ہو گئی یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا جبکہ عدم تعاون کا ہر طرف پر چار تھا اور اسکول و کالج کی تعلیم کا طلباء بائیکاٹ کر رہے تھے۔ اس خبر کو کہ مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں کچھ دیر گذری تھی کہ والد صاحب مرحوم کا ملازم خاص مجھے ان کے کمرے میں بلانے کے لئے آیا۔ جب میں پہونچا تو دیکھا کہ ایک مولانا نما لحیم شحیم بزرگ بیٹھے ہیں، چہرے پر درمیانی درجہ کی داڑھی ہے، کھادی کا کرتہ اور اسی کا پائجامہ ہے اور سر پر چپکی ہوئی کھادی کی گول ٹوپی۔ مجھے دیکھ کر والد

مرحوم نے ان حضرات سے کہا کہ لو میاں بدرالدین آگئے۔ اب مولانا میری طرف پلٹے تو بڑی حد تک چہرہ جانا بچانا نظر آیا۔ وہ لپک کر اٹھے اور مجھے بغل میں داب کر تقریباً زمین سے ایک فٹ اونچا اٹھا لیا اور میرا بھائی میرا بھائی کہتے ہوئے میری ہڈیاں اور پسلیاں چور کرنے لگے۔ بعد میں جب ان کو خود احساس ہوا کہ وہ مجھے زور سے بھینچے ہوئے ہیں تو ہنس کر مجھے چھوڑ دیا اب میں نے بغور دیکھا تو عطاء اللہ تو غائب ہو چکے تھے یہاں مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری بیٹھے ہیں۔ چہرے کا کھلنڈرا پن صاف ہو چکا تھا، پیشانی پر سنجیدگی کی شکنیں تھیں، داڑھی شرعی حد میں تھی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھ کی چمک یہ کہہ رہی تھی کہ ہم وہی عطاء اللہ ہیں جو پہلے تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھ سے میرے پڑھنے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا بی، اے میں پڑھتا ہوں پھر میرے بچپن کے قصے سنانے لگے۔ یہ والد مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے والد صاحب مرحوم سرکاری گروپ کے آدمی تھے کیوں کہ خان بہادر بھی تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کانگریس کے بڑے سرگرم رکن اور پنجاب کے احراری جماعت کے روح رواں بھی تھے مگر ذرہ برابر بھی میرے گھر میں سیاست کا تذکرہ نہ چھیڑا۔ یہ عدم تعاون اور اسکول و کالج کے طلباء سے تعلیم کے بائیکاٹ کا مطالبہ اپنی گفتگو اور تقریروں میں کرتے پھرتے مگر میرے یہاں رہے۔ سوائے نجی حالات پر گفتگو کے سیاست کا ذکر نہ آنے دیا۔ دن بھر میرے یہاں رہے۔ ان کے رفقاء پٹنہ میں ایک دوسری جگہ مقیم تھے اور یہ انہیں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے برس والد مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ ان کا لاہور سے تعزیت کا خط آیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ پانچ چھ برس کے بعد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پٹنہ پھر اپنے دورے پر آئے اس وقت ملک کی آزادی کی پکار اور بڑھ گئی تھی اور سیاست اب عوام میں رچ بس رہی تھی۔ اس دفعہ پٹنہ میں مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری کا استقبال بڑی شدومد سے ہوا۔ جوق در جوق لوگ ان سے ملاقات

کرنے کو اور ان کی تقریر سننے کو امڈ پڑتے تھے۔ تقریریں ایسی ہوتی تھیں کہ گھنٹوں سنتے رہیئے مگر سیری نہ ہو۔ روتوں کو ہنسادیں، ہنستوں کو رلا دیں اور چاہیں تو پانی میں آگ لگا دیں۔ تقریر کرتے وقت عوام کے جذبات کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ جس طرف اور جس طرح چاہیں موڑ دیں۔ ان کی تقریریں صرف ہیجانی نہیں ہوتی تھیں بلکہ تاریخی اور سیاسی مواد کے ساتھ ساتھ مذہبی ہدایات کے سلسلے بھی ان کی تقریروں میں جاری رہتے تھے۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی پر مغز اور پر وقار تقریریں بھی سنی ہیں، حیدر آباد کے بہادر جنگ کو بھی بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کرتے دیکھا ہے مگر وہ معجز بیانی جو دل و دماغ کو سر شار کرتی تھی اسے خدا نے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کے حصّہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پٹنہ سے ان کو بے پناہ محبت تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ پٹنہ ہی میں وہ پیدا ہوئے، ماں کا بیحد و بے پایاں پیار ان کو یہیں ملا، ان کا بچپن اور ان کا عنفوان شباب یہیں کی فضاء میں پروان چڑھا، ان کے ابھرتے ہوئے شعور نے یہیں کے ماحول میں انگڑائی لی اور ان کی صلاحیتوں کی پہلی تربیت یہیں کی آب و ہوا میں ہوئی۔ یہ جب بھی پٹنہ آتے تو یہاں کی ہر تقریر میں اپنے پیارے پٹنہ کی روداد سناتے یہاں کے لوگوں کا ہر تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے اور لوگوں سے کہتے کہ پٹنہ ان کا ویسا ہی وطن ہے جیسا پنجاب ہے۔ وہ اجنبی نہیں ہیں ان کی خمیر بھی پٹنہ ہی کی خمیر سے بنی ہے۔ میرے ایک عزیز ماموں زاد بھائی سید حسین احمد مرحوم پنجاب گئے۔ یہ ۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا۔ لاہور کے اسٹیشن پر آگے جانے کو گاڑی لگی ہوئی تھی۔ ان کو کراچی جانا تھا۔ ابھی ٹرین کے کھلنے میں دیر تھی۔ یہ ایک کمپارٹمنٹ میں جاکر بیٹھ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جماعت چالیس پچاس آدمیوں کی آتی دکھائی دی جس میں ایک شخص بہت نمایاں تھا۔ ادھیڑ عمر کے، اچھے ہاتھ پاؤں کے، یہ مولانا اپنی گفتگو سے سبھوں کو محظوظ کرتے ہوئے مجمع میں سبھوں کے لیڈر معلوم ہوتے تھے۔ حسین احمد مرحوم کا

کمپارٹمنٹ سامنے ہی پڑتا تھا ۔ مولانا صاحب نے سیدھے اسی کا رخ کیا اور آکر اسی کے ایک خالی برتھ پر بیٹھے جو پلیٹ فارم سے لگا ہوا تھا ۔ ساتھیوں میں کچھ تو ان کے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ میں آگر بیٹھے مگر زیادہ تعداد ان کے ساتھیوں کی پلیٹ فارم ہی پر رہی ۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین نے چلنے کی سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی ۔ اب مولانا نے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا تو ایک طرف حسین احمد مرحوم پر نظر پڑی۔ ان کی وضع قطع پٹنہ والوں جیسی نمایاں تھی ۔ مولانا اپنی نشست سے اٹھ کر ان کے برتھ پر آگئے اور پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لارہے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ پٹنہ وطن ہے وہیں سے آرہا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ غریب خانہ پٹنہ کے ایک محلہ صدر گلی میں ہے۔ یہ سن کر مولانا کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کیا تم حسو ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں میں حسو ہی ہوں مگر آپ نے کس طرح سمجھا۔ مولانا نے حسین احمد مرحوم کو بھیجتے ہوئے کہا کہ جسے گود میں کھلایا، جس کے والد صاحب کے ساتھ مہینوں ان کے دیہات پر جاکر ان کے ساتھ رہا، پھر پٹنہ میں بھی ان کا ساتھ رہا اس کو کیوں نہ پہچانتا۔ حسین احمد مرحوم سمجھ گئے کہ یہی عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ نے پٹنہ کے جانے پہچانے لوگوں کا نام لیکر خیریت پوچھی، گھر کے ہر فرد نوکر چاکر دائی ماما سب کا حال فرداً فرداً دریافت کیا۔ پھر پوچھا میرا بھائی بدرالدین کس حال میں ہے۔ مراد مجھ سے تھی۔ حسین احمد نے کہا کہ آج کل وہ بھی لیڈر ہیں۔ اس پر مولانا عطاء اللہ خوب ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہونا ہی تھا ایک بھائی لیڈر تو دوسرا کیوں نہیں ہو مگر سمجھتا ہوں کہ میں تو جمیعت احرار میں ہوں اس لئے بدرالدین ضرور مسلم لیگ میں ہوں گے۔ حسین احمد مرحوم نے کہا کہ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے۔ پھر حسین احمد مرحوم پر زور دینے لگے کہ وہ ایک دن ان کے ساتھ رہیں مگر اپنا ضروری کام بتا کر حسین احمد مرحوم نے معذرت کرلی اور کہا کہ بعد میں وہ مولانا عطاء اللہ شاہ سے ملیں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ جب حسین احمد مرحوم گھر واپس آئے تو مجھے یہ قصہ سنایا۔

غالباً ۱۹۳۷ء میں رہتک جیل سے ایک خط میرے نام آیا۔ مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ رہتک جیل سے مجھے خط بھیجنے والا کون ہے۔ لفافہ چاک کیا تو اندر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خط تھا۔ مجھے آج تک اس خط کا مضمون یاد ہے۔ لکھا تھا میرے پیارے بھائی بدرالدین آج کل جیل کی تنہائی میں تم مجھے یاد آتے ہو، زمانہ دراز سے تمہیں نہیں دیکھا غالباًاس کی کسر بار بار تمہارے یاد آنے سے نکل رہی ہے، قوم کی خدمت کرنیکی سزا مجھے تو قید تنہائی سے ملتی ہے، آج کل بھی وہی سزا ہے۔ تنہائی کو دور کرنے کے لئے میں نے کھادی کے کپڑے کی تھان کو اپنے ہاتھوں سے پیک کر کے تمہارا نام اور پتہ لکھا اور جیل والوں سے کہا کہ تمہارے پاس بھیج دیں۔ اس کو میری یادگار سمجھ کر قبول کر لینا۔ برسوں گزر گئے مگر کھادی کا تھان مجھے نہ ملا۔ غالباً جیل والوں نے اپنے مصرف میں لے لیا ہوگا۔

۱۹۴۰ء میں میں لاہور گیا تو یہ خواہش لے کر گیا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اس وقت مسلم لیگ کا پنجاب میں بڑا زور تھا۔ دوسری مسلم سیاسی پارٹیاں جن میں جمعیت احرار بھی تھی ماند ہو کر رہ گئیں تھیں۔ اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، سارے پنجاب میں امیر شریعت اور جمعیت احرار کے سب سے اونچے لیڈر ہونے کے باوجود بھی پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔ بہر حال میں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ تو جیل میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے بال بچوں کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ مولانا نے امرتسر میں مکان بنا لیا ہے۔ اب ان کے متعلقین وہیں رہتے ہیں۔ لاہور سے پٹنہ آنے کے راستہ میں امرتسر پڑتا تھا۔ مجھے گولڈن ٹمپل، جو سکھوں کی مشہور زمانہ عبادت گاہ ہے، اس کے دیکھنے کی بھی تمنا تھی۔ میں اور میرے دو ساتھی دن بھر کے لئے امرتسر اتر گئے، اسباب اسٹیشن ہی پر کلاک روم میں رکھا اور اسٹیشن پر ہوٹل میں کھا پی لیا، پھر گولڈن ٹمپل دیکھنے کو چلے گئے۔ ایک بڑے حلقہ گاہ میں گولڈن ٹمپل واقع ہے، بیچ میں بہت بڑا تالاب ہے، اس کے چاروں

طرف خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں، تالاب کے بیچ میں بھی کئی سنگ مرمر کی عمارتیں ہیں۔ ایسی دلکش اور پرکشش کہ دیکھا کیجئے۔ کئی عمارتوں میں مقدس صورت مہنت بیٹھے گرنتھ صاحب کی تلاوت کر رہے تھے۔ گولڈن ٹمپل پہونچتے ہی ایک سن رسیدہ مہنت میرے ساتھ ہو گئے تھے اور ہر جگہ ہماری رہبری کر رہے تھے آخر میں وہ سبھوں کو ایک بڑی خوبصورت سنگ مرمر کی عمارت میں لے گئے۔ یہ عمارت تالاب کے وسط میں واقع تھی۔ ایک خوبصورت سبک پل کے ذریعہ سے اس عمارت میں پہونچنا ہوتا تھا۔ میں وہاں پہونچا تو ہمارے راہبر نے کہا کہ یہاں کے جو سب سے بڑے مہنت ہیں انہیں کے پاس آپ کو لے چلتا ہوں۔ اندر ایک سنگ مرمر کے تخت پر ایک باوقار سفید ریش بزرگ کو دیکھا جو گرنتھ جی کی تلاوت میں مشغول تھے۔ انھوں نے ہم تینوں کو دیکھا تو کتاب بند کر دی۔ ہم نے مودبانہ ان کو سلام کیا انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ پٹنہ سے۔ یہ سننا تھا کہ جھٹ اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا میرے ساتھیوں کو باری باری سے اور بڑی محبت سے کہنے لگے کہ آپ پٹنہ شریف سے آئے ہیں اس لئے ہم سبھوں کے سر آنکھوں پر آپ کا آنا ہے۔ آپ تو میرے معزز اور بڑے محبوب مہمان ہیں۔ پھر پوچھا کہ آپ سب کے اسباب کہاں ہیں اور ہمارے رہبر سے کہا کہ بھائی مہمانوں کے اسباب لیجا کر مہمان خانہ میں ٹھیک ٹھاک کر کے رکھو۔ میں نے عرض کیا کہ ہم سب تو سر راہ ہیں، صرف گولڈن ٹمپل کی زیارت کی تمنا کھینچ لے آئی ہے اور آج ہی شام کے وقت پٹنہ روانہ ہو جائیں گے مگر بڑے مہنت صاحب ہم سبھوں کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر ہم سبھوں نے وعدہ کیا کہ دوبارہ آئیں گے تو ان کی خدمت میں دو چار دن ضرور رہیں گے۔ پھر ہم سب وہاں سے رخصت ہوئے۔ آج تک گولڈن ٹمپل کے لوگوں کی محبت کا برتاؤ اور پٹنہ سے ان کی عقیدت اور پٹنہ والوں کے ساتھ ان کا برادرانہ خلوص میرے دل پر نقش ہے۔

گولڈن ٹمپل سے چلے تو دو بج رہے تھے مولانا عطاء اللہ شاہ کا مکان کس محلّہ میں واقع تھا یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا تھا۔ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آخر منزل مقصود تک پہنچ ہی گیا۔ ایک کشادہ گلی سے کچھ آگے بڑھ کر ایک کشادہ جگہ پر ایک نئی عمارت کھڑی تھی۔ سامنے ہی مردانہ نشست کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ جو بند تھا اس کے بغل سے لگا ہوا ایک دروازہ تھا جو زنانہ حصہ میں جانے کا راستہ تھا۔ وہیں پر جاکر میں نے پکارا کہ کوئی صاحب ہیں؟ باہر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ پہلی ہی آواز پر ایک صاحب باہر آئے، تیس پینتیس سال کی عمر ہوگی، متوسط قد کے خوش رو آدمی تھے، چہرے پر خشخشی داڑھی تھی۔ صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ آپ لوگ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ پہلے یہ تو بتائیے کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا یہی مکان ہے کہ نہیں؟ جواب ملا کہ مکان تو یہی ہے اور ان کی اہلیہ اور بچیاں اسی مکان میں ہیں مگر مولانا جیل میں ہیں۔ میں نے کہا کہ مولانا کا جیل جانا معلوم ہے۔ آپ ان کی اہلیہ سے یہ کہہ دیں کہ بدرالدین پٹنہ سے آیا ہے۔ وہ صاحب یہ سن کر اندر گئے پانچ منٹ بعد باہر کی نشست گاہ کھلی، اچھا خاصہ کمرہ تھا، فرنیچر میں صوفے اور کرسیاں سب تھیں۔ ہم سب کمرے میں پہونچے تو تین بچیاں میرے سامنے کھڑی تھیں، بڑی کی عمر نو سال ہوگی، دوسری تقریباً سات سال اور چھوٹی پانچ چھ سال کی۔ سب آکر مجھ سے لپٹ گئیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر ان سبھوں نے مجھے کس طرح پہچانا۔ میں نے سبھی کو پیار کے بعد ان کے نام پوچھے۔ اتنے میں بڑی لڑکی لپک کر اندر گئی اور پھر دو تین منٹ میں باہر آئی اور کہنے لگی کہ امی جان آپ کو سلام کہتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں، آپ کو چار پانچ دن یہاں رہنا ہے۔ میں نے کہا کہ تم اپنی امی جان کو میرا سلام کہو، میں تو صرف تم سبھوں کو دیکھنے کے لئے آگیا تھا، بھائی جان جیل میں ہیں اس لئے رہ کر کیا کروں گا۔ بڑی لڑکی نے جواب دیا کہ امی جان اور ہم سب تو ہیں۔ اباجان ہمیشہ آپ کا ذکر ہم سبھوں سے کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرا ایک بھائی بدرالدین پٹنہ میں ہے۔ اللہ اللہ مولانا عطاء اللہ شاہ کی محبت کہ طویل زمانہ گزرنے پر

بھی ان کی محبت میرے ساتھ کم نہ ہوئی۔ بچیوں کا اصرار کہ میں دو چار روز قیام کروں میرا یہ عالم کہ بچیوں سے گفتگو کے درمیان سارے گذشتہ واقعات کی تصویر نظر کے سامنے کھڑی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بچیوں کو سمجھا رہا ہوں مگر وہ بہ ضد ہیں کہ میں قیام کروں۔ اتنے میں مولانا کی اہلیہ نے بڑا پر تکلف ناشتہ ہم سبھوں کے لئے بھیجا۔ بچیوں کو بھی ناشتہ میں شامل کر لیا۔ وہ صاحب جو پہلے آکر ہم سبھوں سے ملے تھے ان کے متعلق ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا کے سالے ہیں۔ وہ بھی میزبانی میں بچھے جا رہے تھے۔ ناشتہ کر کے میں نے مولانا کی اہلیہ سے اپنی مجبوری کہلا بھیجی کہ آج میرا پٹنہ روانہ ہو جانا بہت ضروری ہے۔ مولانا کی اہلیہ سے تو اجازت حاصل کر لی مگر بچیاں میری جان چھوڑنے پر تیار نہ تھیں۔ آخر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے ہم سب سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے مگر وہ دن اور آج کا دن میں نے پھر ان بچیوں کو نہ دیکھا۔ ملک تقسیم ہو گیا جذبات بدل گئے، لہلہاتے درخت خشک ہو کر پیوند زمین ہو گئے اور ان کی جگہ پر نئے پودے نکل کر تناور درخت بن گئے مگر پرانی یادیں پہلے ہی کی طرح آج بھی دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی گذر گئے۔ میں نے ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انہیں نہیں دیکھا مگر آج بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے قومی خدمات کا ایک طویل اور شاندار ریکارڈ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ جمعیۃ العلماء کو انھوں نے پروان چڑھایا، پنجاب میں امارت شرعیہ انہیں کے دم سے پھلی پھولی، احراریوں کو انھوں نے قوت اور روشنی بخشی، پنجاب میں ملکی سیاست کو اونچی سیڑھیوں پر وہی لائے، انہیں کی معجز بیانی سے ہندوستانی سپوت ملک پر نثار ہونے کے لئے تیار ہو کر سینوں پر انگریزوں کی گولیاں کھاتے تھے۔ انگریزوں کے لئے توپ اور رائفل سے زیادہ خطرناک مولانا عطاء اللہ کی آتش نوائی تھی جو دم کے دم میں نہتے لوگوں کو انگریزوں سے ٹکر لینے کے لئے ان کے رائفل کے مقابل بھیج دیتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ حکومت کے قید و بند کی برابر زینت بنے رہے۔ آج مولانا نہیں ہیں مگر ان کی عظیم المرتبت داستان حیات باقی ہے۔

پٹنہ کے تین سلیمان

(i) حضرت مولانا قاری سید شاہ سلیمانؒ (ii) حضرت مولانا سید سلیمان اشرفؒ (iii) حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جس دور کا میں تذکرہ لکھ رہا ہوں اس دور میں کچھ آگے پیچھے تین سلیمان گزرے اور کافی مدت تک ہم سفر و ہم عصر رہے اور ان تینوں کا واسطہ براہ راست پٹنہ سے بھی لگا رہا۔ تینوں کی شخصیتیں ہمہ گیر تھیں اور یہ تینوں آفتاب بنکر ہندوستان میں ہر جگہ ضیا پاشی بھی کرتے رہے۔ ایک سلیمان تو ہر جگہ اپنی چمک دکھا کر سوادِ پٹنہ کے قرب میں ابدی نیند سوئے، دوسرے کو مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ کی سرزمین میں آسودگی ملی اور تیسرے سلیمان اپنے آبائی وطن سے دور نئے وطن پاکستان میں محواستراحت ہیں۔ یہ تینوں سلیمان بالترتیب حضرت مولانا قاری سید شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سید سلیمان اشرف بہاری اور علامہ سلیمان ندوی دسنوی ثم پاکستانی ہیں۔ حضرت قاری مولانا سید شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی کا تذکرہ خانقاہ سلیمانیہ کے ضمن میں آچکا ہے۔ اب مولانا سید سلیمان اشرف اور علامہ سید سلیمان ندوی کے تذکرے ملاحظہ کریں۔

حضرت مولانا سید سلیمان اشرفؒ

یہ اکثر ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ "وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا۔" اس کو اہالیانِ وطن کی تغافل شعاری سمجھئے، ان کی ناقدرِ شناسی کہئے یا مقدر کا پھل جانئے مگر یہ بات سچ ہے کہ بہت سارے اہل کمال آپ کو ایسے ہی ملیں گے جو گھر سے باہر ہی جاکر چمکے دمکے اور جب باہر والوں نے ان کی قدروقیمت پہچانی تب گھر والوں نے آگے بڑھ کر ان کی قدر و قیمت کو اپنی ہم وطنی کے دامن میں

سمیٹنے کی کوشش کی ۔ یہی بات مولانا سید سلیمان اشرفؒ مرحوم کے ساتھ بھی ہوئی۔ آج صوبہ بہار میں بہت سے ایسے حضرات ہوں گے جو سیّد سلیمان اشرف کو صرف علی گڑھ کے واسطے سے جانتے ہوں گے ۔ ایسے حضرات میں کچھ وہ بھی ملیں گے جن کو اس کی بھی خبر نہ ہوگی کہ اس لعل بے بہا کا معدن یہی سرزمین بہار ہے ۔ مولانا سید سلیمان اشرف برسوں ہندوستان کے علم و کمال کے افق پر آفتاب بن کر چمکتے رہے ، کتنے نئے پودوں نے ان کے جگر کی حرارت سے قوت نموپائی اور کتنی بے نور آنکھوں میں ان کی روشنی سے بینائی آئی مگر افسوس ہے کہ ان کے حالات سے خود ان کا صوبہ کماحقہ ، آگاہ نہیں۔ ان کے علم و دانش کی قدر و قیمت کھلی بھی تو دوسرے صوبوں کے مبصروں کی بدولت کھلی۔ اس میں بڑی حد تک تعجب کی بات بھی نہیں ۔ اگر ہندوستان کے دوسرے حصوں نے اور بالخصوص یوپی اور علی گڑھ نے ان کی صلاحیتوں کا بڑے احترام کے ساتھ برابر اعتراف کیا تو یہ ہونا ہی تھا کیونکہ مولانا نے بھی یوپی اور علی گڑھ کو اپنا سب کچھ دے رکھا تھا ۔ مولانا نے علی گڑھ کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا تھا ۔ وہیں ان کی زندگی کے گراں بہا ایام گزرے ، وہیں ان کی صلاحیتوں نے گل بوٹے اگائے ، ان کی زبان اور ان کے قلم کی گل افشانیوں سے وہیں کے چمن گلزار ہوئے اور وہیں کے محلوں کو انہوں نے رونقیں بخشیں۔ اسی لئے علی گڑھ کو ان کا رتبہ شناس ہونا بھی چاہئے تھا ۔ یہ حقیقت ہے کہ وہاں کے قدر شناسوں نے بھی ان کو وہی رتبہ دیا جو ان کے شایان شان تھا اور وہاں کے اہل قلم حضرات نے مولانا کے متعلق وہی سب کچھ لکھا جو محبت و عقیدت کا قلم لکھ سکتا ہے ۔ مولانا سید سلیمان اشرفؒ نے بھی آخر میں وہیں جان دیکر وہاں کے حضرات میں محبت خریدی ۔ اس لئے ہل جزاء الاحسان الّاالاحسان کی بات سچی اتری ۔ یہ تھا کہ وطن سے دور رہتے ہوئے بھی

مولانا کو وطن کے ذرے ذرے سے محبت قائم تھی ۔ وہ ہر سال بڑی بڑی چھٹیاں اپنے وطن بہار شریف میں گزارنے گھر آتے تو اپنے گھر کی زباں بولتے اور وطن کے ماحول میں کھو جاتے۔ اپنے گھر کی ہر چیز سے ان کو محبت تھی۔ علی گڑھ میں رہتے ہوئے بھی اپنے گھر کی زبان کے محاوروں کو یوپی اور علی گڑھ کی گفتگو میں اس طرح رچاتے کہ مدعیان فصاحت کی طبع نازک پر ان کا بار نہ پڑتا اپنے وطن کے مخصوص پکوان پکواکر گھر سے ساتھ لے جاتے اور وہاں کے لوگوں کو اس محبت اور شیریں کلامی کے ذائقے کے ساتھ کھلاتے کہ ان میں سچ مچ من وسلوا کا مزہ ملتا ۔

۸۰۔۱۸۷۸ء کے لگ بھگ مولانا سید سلیمان اشرفؒ بہار شریف کے ایک محلہ میرداد میں پیدا ہوئے ۔ یہ ان کی نانہال تھی ۔ ان کی سفرسنی میں ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ان کی والدہ نے اپنے ہونہار بیٹے کی داشت پرداخت اور تعلیم کا فرض اپنے ذمہ لیا اور یہ حقیقت ہے کہ جس طرح انہوں نے مولانا کی پرورش اور پرداخت کی اور ان کی تعلیم کے سلسلہ میں کوشاں رہیں اس طرح پرچند ہی ماؤں نے اپنے فرائض انجام دیئے ہوں گے۔ مولانا سید سلیمان اشرفؒ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم بہار شریف ہی میں مولوی رمضان علی صاحب سے حاصل کرکے بہار اسکول میں داخل ہوئے دسویں جماعت میں پہونچے تھے کہ انگریزی تعلیم سے دل اچاٹ ہوا اور پھر عربی کی تعلیم کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ ماں نے بھی ہمت افزائی کی۔ اس لئے مولانا نور محمد صاحب سے باضابطہ عربی میں درس لینے لگے اور اسی درمیان میں ان سے بیعت بھی کرلی۔ مولانا نور محمد کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک مولانا ابوالحسن استھانوی کے پاس تعلیم کا سلسلہ جاری رہا ۔ وہاں کی تعلیم کے بعد مولانا احمد حسین مرحوم کے مدرسہ میں انہوں نے داخلہ تو لے لیا تھا مگر وہاں بھی سیری نہیں

ملتی تھی ۔ انہیں دنوں مولانا ہدایت اللہ صاحب جبروت کے علم و فضل کا دور دور شہرہ تھا ۔ مولانا سلیمان اشرفؒ کانپور سے سیدھے جونپور پہونچے۔ جب یہ مولانا ہدایت اللہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مولانا ہدایت اللہ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیکر اپنے نجی حلقہ درس میں داخل کرلیا ۔ مولانا سلیمان اشرفؒ کی تعلیم یہیں مکمل بھی ہوئی اور یہیں تعلیم کی انا کی تشنہ کامی بجھی ۔ یہ کچھ دنوں تک ، فارغ التحصیل ہونے کے بعد ، مولانا ہدایت اللہ مرحوم کے مدرسہ میں مدرسی کرتے رہے پھر بہار شریف اپنے گھر واپس آگئے۔ گھر پہونچے تو میرے والد سید ضمیر الدین احمد نے ان کو اپنے پاس پٹنہ بلا لیا ۔ اس وقت پٹنہ کی علمی مجلسیں سونی نہیں ہوئی تھیں۔ مولانا یہاں آئے تو یہاں کی علمی مجلسوں میں انہوں نے اپنے لئے ممتاز جگہ بنالی ۔ میر داد شریف میرے والد مرحوم کا آبائی گھر تھا اور یہیں مولانا کی نانہال تھی ۔ رشتہ میں میرے والد مرحوم مولانا کے ماموں ہوتے تھے اور بچپن ہی سے مولانا کی اٹھان دیکھ کر ان کو پیار سے ملا پکارتے بھی تھے۔ مولانا سید سلیمان اشرفؒ پٹنہ ہی میں میرے والد مرحوم کے پاس تھے کہ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی علی گڑھ سے پٹنہ تشریف لائے میرے والد مرحوم اور مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم میں دیرینہ دوستانہ تعلقات تھے ، وہ آئے تو صدر گلی میں میرے والد مرحوم کے یہاں قیام پذیر ہوئے ۔ یہیں مولانا سلیمان اشرف کی صلاحیتوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ میرے والد مرحوم کے عزیز بھی ہیں تو ان کی طرف مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کی شفقت اور بھی بڑھی مولانا سلیمان اشرف کے لئے ایک اچھی ملازمت کی تلاش تھی ۔ اس کا موقع اب اچھا خاصہ ملا۔ میرے والد مرحوم نے مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم سے یہ بات طئے کرلی کہ مولانا سید سلیمان اشرف ان کے ساتھ علی گڑھ جائیں ، کچھ دنوں ان کے

ساتھ رہیں ، کوئی اچھا موقع نکل آیا تو علی گڑھ کالج میں ان کی کوئی جگہ بن ہی جائے گی ۔ چنانچہ مولانا سلیمان اشرف علی گڑھ گئے اور اس طرح گئے کہ ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہوکر رہ گئے ۔ یہ مختصر تذکرہ مولانا کے کل حالات زندگی کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ یہاں تو چند واقعات کو سمیٹ کر ایک اجمالی تذکرہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ۔ مولانا سید سلیمان اشرف کی نجی زندگی کے حالات ، ان کے علمی مشاغل ، ان کی خطابت ، انکی صوفی منشی ، ان کے گھر کی شگفتہ مجلسیں ، ان کے گرد مشاہیر کا مرجوعہ، علمائے ہند میں ان کا مرتبہ، ان کے کردار ان کا وقار ، اپنے لوگوں کے ساتھ ان کی بے لوث محبت ، غیروں کے ساتھ بھی ان کی شفقت و مروت ، ان کی حق بینی اور صداقت پسندی ان سب خصوصیات کا بیان ایک ضخیم دفتر چاہتا ہے ۔ حقیقت میں انہیں خصوصیات نے مولانا کو ان کے ہمعصروں میں اونچا کر رکھا تھا۔ ہم اور آپ بھول جائیں تو بھول جائیں مگر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چپہ چپہ پر ان کی داستان عظمت ہمیشہ ثبت رہے گی ۔ مولانا اپنے معتقدات کے اظہار میں ذرہ برابر بھی نہیں ہچکچاتے تھے ۔ ان کو اپنے علم اور اپنے ایمان پر اعتماد کلی تھا ۔ وہ شک و تشکیک کی منزلوں سے دور ایمان و یقین کی منزلوں میں ہمیشہ رہے ۔ ان کو ہندوستان کے صاحبان علم و فضل سے برابر کی دوستی تھی مگر جہاں ان علماء میں سے کسی کو لغزش کرتے دیکھتے تو بلارعایت ٹوک بھی دیتے ۔ ترک موالات کی تحریک کے دور میں جب اکثر علماء نے فقہی مسائل کے سیاسی تانے بانے بننا شروع کیا جس سے مولانا کے عقیدے کے خلاف ایک نیا مذہبی پیراہن تیار ہونے لگا تو مولانا سے نہ رہا گیا اور انہوں نے اپنے خلوت خانے ہی میں بیٹھے بیٹھے قلم اٹھایا اور اپنے قلم کی جنبش سے اس نئے پیراہن کے سارے تانے بانے ادھیڑ کر رکھ دینے پر بھی عجیب معرکہ تھا ۔ دنیا دیکھ رہی تھی کہ ایک گوشہ نشین مولوی

تندروسیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے اور لوگوں کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آرہی تھی کہ طوفان کی گرج کے خلاف ایک آواز جو کسی گوشے سے اٹھ رہی تھی وہ گرج کی شورش آہنگ کا پہلو دبائے جارہی تھی ۔ بالآخر دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح کچھ ہی دنوں بعد اس گوشہ نشیں مولوی نے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا اور چڑھتے ہوئے دریا کو اتر جانا پڑا ۔ مولانا گرچہ علی گڑھ کالج میں دینیات کے پروفیسر تھے مگر پوری یونیورسٹی پر چھائے رہتے تھے۔ وہ سب سے الگ رہتے تھے مگر لوگ ان کو اپنے سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کہیں نہیں جاتے تھے مگر ان کے یہاں معمولی حیثیت کے لوگ بھی ، بڑے بڑے تعلقدار بھی ، علماء اور فضلاء بھی ، سیاسی رہنمایان بھی اور اعلی حکام بھی آتے رہتے تھے ۔ مولانا سبھوں سے بڑے اخلاق سے ملتے اور اپنی صحبت میں اس بات کو نمایاں طور پر ملحوظ رکھتے کہ مساوات و اخلاق کے ترازو کا پلہ کسی سے ملنے میں کم و بیش نہ ہو ۔ وہ حق بین تھے مصلحت بین نہ تھے اسی لئے حق کے مقابلے میں مصلحت اندیشی کو برابر برا سمجھتے رہے ۔ ان کی یہی حق بینی اور حق پسندی یونیورسٹی سے باہر اور یونیورسٹی کے اندر ہر معرکے میں ان کی کامیابی کی دلیلیں تھیں ۔ ان کو اپنے پرانے عقائد اور اپنے اصولوں پر اعتماد کلی تھا ۔ وہ پیدائش سے خود اعتمادی کی دولت اپنے ساتھ لائے تھے ۔ بچپن میں بھی یہی ان کی خوداعتمادی ان کو ساتھیوں میں ممتاز بنائے رہتی تھی ۔ مولانا کو پاس وضع کا ہمیشہ خیال رہا ۔ ایک بات اگر کبھی خصوصیت سے کر چکتے تو آئندہ بھی اس پر اصرار کے ساتھ قائم رہتے ۔ ان کے شناسا اور ان سے ملنے والے ہزاروں تھے مگر ان کو ہر شخص سے دوستی نہ تھی ۔ جو حقیقت میں ان کے دوست تھے ان کی حیثیت مولانا کی نظر میں بھائی سے کم نہ تھی جس طرح اپنے عزیزوں پر جان دیتے اسی طرح اپنے دوستوں پر نثار ہونے کو تیار رہتے تھے ۔ یہی نہیں

بلکہ دوستوں کی اولاد کو بھی اپنی اولاد سمجھتے تھے جس کی ایک مثال یوں دی گئی کے مولانا کے بچپن کے ایک دوست اور دور کے رشتہ سے ان کے عزیز بھی مولوی سعید الدین احمد مرحوم میر داد کے رہنے والے تھے۔ مولانا تو علم کی تحصیل میں گھر سے باہر نکل کھڑے ہوئے مگر یہ بہار شریف کے اسکول میں اپنی تعلیم ختم کر کے پٹنہ کے انجینئرنگ اسکول میں پہونچے اور یہاں کی تعلیم مکمل کر کے اور سیر ہو گئے۔ بہت دنوں کے بعد جب مولوی سید سعید الدین احمد کا انتقال ہوا تو ان کی موت کی خبر سنکر مولانا بے تابانہ علی گڑھ سے بہار شریف پہونچے۔ دوست کی موت پر خوب روئے پھر سید سعید الدین احمد مرحوم کی بیوی اور بچوں کی تسلی اور دلدہی کرتے رہے اور جب بہار شریف سے واپس علی گڑھ چلے تو ان کے بڑے لڑکے سید منیر احمد کو بیٹا بناکر ساتھ لے گئے اور آخر دم تک ان کے اخراجات کے کفیل رہے، جب سید منیر احمد علی گڑھ سے وکالت کا امتحان پاس کر چکے تو ان کو گھر بھیجا کہ بہار شریف میں رہ کر وکالت بھی کریں اور یہیں سرکاری ملازمت کے لئے کوشش بھی کرتے رہیں۔ اس درمیان بھی مولانا ان کے سولہ آنہ کفیل رہے۔ سید منیر الدین احمد چند دنوں کے بعد حکومت بہار میں منصفی کے عہدے پر ملازم ہوگئے اور ترقیوں کے زینے طے کرنے کے بعد اب رٹائر کر چکے ہیں (ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔) مولانا کا سلوک ان کے ساتھ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ منیر الدین احمد کو بیٹا بنایا تھا تو آخر دم تک اس کی لاج بھی رکھی۔ مولانا کا جب انتقال ہوا تو بہار شریف میں اپنے عالیشان مکان کو، جسے انھوں نے اپنے رہنے کے لئے بنوایا تھا، اور اپنی کمائی کی کافی پس ماندہ رقم بھی سید منیر احمد کو دے گئے مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے حقیقی وارثوں کی بھی حق تلفی نہ کی۔ مولانا کے دادیہالی رشتہ کے قریبی عزیز اور وارث موجود تھے۔ مولانا ان کے لئے بھی روپئے اور کچھ جائداد چھوڑ گئے۔ مولانا کے بڑے بھائی سید انیس اشرف جوانی میں سرکاری ملازم تھے کچھ دنوں کے بعد دماغی امراض میں مبتلا ہوگئے۔ نوکری جاتی رہی۔ مولانا ان کو اپنے ساتھ

ہی کھانا کھلاتے اور اپنے پاس ہی ان کو سلاتے۔ پہلے بھائی صاحب کو کھلاتے تو بعد میں خود کھاتے اگر کہیں یہ پاگل پن میں بہک کر ادھر ادھر نکل جاتے تو مولانا ان کو خود تلاش کرتے پھرتے۔ بڑی خیریت یہ تھی کہ سید انیس اشرف مرحوم بک جھک اور مار پیٹ کرنے والے پاگل نہ تھے۔ جب یہ مرے تو مولانا ان کی موت پر بہت دنوں تک سوگوار اور بے چین رہے۔ پاگل پن کے باعث مولانا کے بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور ادھر مولانا بھی تجرد کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مولانا کی والدہ دیکھتی تھیں کہ اگر مولانا نے بھی شادی نہ کی تو دونوں بھائیوں کا سلسلہ نسب ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس لئے یہ بار بار مولانا پر زور دیتیں کہ شادی کرلیں۔ مولانا ادھر ادھر کا عذر کر کے شادی کا معاملہ ٹال دیتے آخر جب ماں کا اصرار زیادہ بڑھا تو اپنی والدہ کے حکم کو نہ ٹال سکے۔ تقریباً پینتالیس سال کی عمر میں مولانا نے شادی کر لی مگر قسمت میں اولاد سے محرومی لکھی تھی۔ کوئی اولاد نہ ہوئی اور ان کی اہلیہ بھی چند سال کے بعد انتقال کر گئیں۔ ان کی والدہ کا بھی اس درمیان میں انتقال ہو چکا تھا۔ پاگل بھائی بھی مرے تو یہ تنہا ہو گئے۔ ماں اور بھائی کے انتقال کا ان پر کافی اثر تھا۔ ان دونوں کا تذکرہ بار بار بڑی محبت کے انداز میں کرتے۔

مولانا بڑے شیریں گفتار بھی تھے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین یا کوئی معمولی موضوع گفتگو ہو سب پر بڑی شگفتگی کے ساتھ تقریر کرتے۔ ان کی گفتگو میں مزاح بھی ہوتا، ادب کا بھی لطف آتا اور نئے نئے جملے اور محاورات کی عکاسی بھی انکی گفتگو میں نگینہ بن کر چمکتی۔ علم خطابت میں بھی ان کا درجہ ہندوستان کے بڑے بڑے خطیبوں اور مقررین کے مقابلہ میں مانا ہوا تھا۔ یوں تو ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں سیرۃ النبی پر تقریر کرنے کے لئے ان کو بلاوے آتے۔ عوام الناس ہی نہیں بلکہ ان کے پاس علماء کے وفود بھی آتے اور اکثر جگہوں میں آرزو منت کر کے ان کو لے جاتے مگر زیادہ تر یہی ہوتا کہ مولانا اپنی عدیم الفرصتی کا عذر کر کے ٹال دیتے تھے۔

اجمیر شریف ہر سال بڑی عقیدت کے ساتھ جاتے تھے۔ اور ربیع اولال کی اوائل تاریخوں میں وہاں کئی دنوں تک سیرۃ النبی پر مسلسل تقریریں کرتے رہتے۔ ان موقعوں پر مولانا کے بیان اور ان کی تقریر کو سننے کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے یہ تقریریں بھی ایسی والہانہ اور پر کیف ہوتی تھیں کہ مجمع تو مجمع ماحول اور فضا پر بیخودی چھا جاتی تھی۔ جب مولانا کی شدت جذبات سے بھرائی ہوئی آواز دیواروں سے ٹکراتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ در و دیوار سے صلوۃ کی صدائیں آرہی ہیں۔ علی گڑھ سے اجمیر شریف کا یہ سفر ہر سال مولانا بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ تمام مصارف خود برداشت کرتے تھے اور اس سفر پر بہت خوش ہوتے تھے۔ سال میں ایک بار مراد شریف میں بھی سیرۃ النبی پر تقریر کرتے۔ یہاں ہر سال میلاد النبی کا یہ مبارک جلسہ میرے چچا نواب سید نصیر الدین احمد خان بہادر اپنے گھر پر ترتیب دیتے تھے۔ اس جلسہ مبارک کی تاریخ وہی رکھتے جن تاریخوں میں مولانا چھٹیوں میں گھر آتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ کو بھی اس محفل میلاد النبی میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ صبح کے نو بجے نواب نصیر الدین مرحوم کے عالیشان مکان میں صرف بہار شریف ہی نہیں اطراف و جوانب سے آئے ہوئے لوگوں کا بڑا مجمع تھا۔ یہ خبر نکل چکی تھی کہ مولانا سلیمان اشرف کی آج یہاں تقریر ہوگی۔ ٹھیک نو بجے مولانا تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ جیسے جیسے ان کی تقریر بڑھتی گئی مجمع پر بیخودی کا عالم چھاتا گیا۔ ہر شخص نقش بہ دیوار بنا ہوا لذت بیان میں محو تھا۔ آنکھیں مولانا کے باوقار چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ دلوں میں محبت رسول کی طغیانی پیدا کر رہے تھے جس کے جوش و سرمستی میں ہر شخص اپنے سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوگئے، آفتاب نصف النہار سے ڈھل کر پچھم کی طرف نیچے جانے لگا، دوپہر کے دو بج چکے تھے کہ یکایک کسی کو ہوش آیا اس نے دیکھا کہ نماز ظہر کا وقت نکلا جارہا ہے اس نے مجمع کو چونکانے کے لئے ایک گوشے میں کھڑے ہو کر جب زور سے اذان پکاری تو مولانا کی

تقریر سے پیدا شدہ بیخودی کا طلسم ٹوٹا۔

۱۹۲۲ء کی جنوری میں میرے والد مرحوم کا انتقال ہوا تو مولانا علی گڑھ سے پٹنہ تعزیت کے لئے آئے۔ میری طالب العلمی کا زمانہ ابھی کچھ باقی تھا۔ آئے تو مجھے گلے سے لگایا، خود بھی روئے اور مجھے بھی رولایا پھر تعلیم کے متعلق بہت سی ہدایتیں دیتے رہے۔ میرے والد مرحوم کے متعلق فرمایا کہ آج فارسی زبان کا بڑا ستون گر گیا اور ہندوستان کے مسلم عہد کے تاریخ دانوں میں ایک بڑے مورخ کی کمی ہوگئی۔

مولانا صاحب منصف بھی تھے۔ ان کی مطبوعہ تصنیفوں کے ملحیۃ الرجال، السبیل، الانہار، النور، الجح ان کے علاوہ امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت پر تنقید، البلاغ اور ان کی آخری تصنیف ''المبین'' چھپ چکی ہیں۔

ستاون سال کی عمر تھی کہ ۱۹۳۹ء میں یہ آفتاب علم و فضل سواد وطن سے دور علی گڑھ کے افق میں غروب ہوا۔ یہیں سے اس کی ضو فشانیاں بھی سارے ملک میں پھیلی تھیں اور اب یہی اس کا ابدی جائے غروب اور ابدی آرام گاہ بھی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی ۱۸۸۴ء میں ضلع پٹنہ کے ایک مشہور گاؤں دسنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اسکے بعد پھلواری شریف تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے اور کچھ دنوں تک اپنے ہمنام حضرت مولانا سید شاہ محمد سلیمان پھلواروی سے اکتساب علم کرتے رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی یہاں سے چلے تو دربھنگہ کی مشہور علمی درسگاہ مدرسہ امدادیہ میں داخل ہوئے اور یہیں سے براہ راست ندوہ پہونچے۔ اس وقت مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی ذات ندوہ میں مرکز کشش بنی ہوئی تھی اور ہونہار شخصیتیں کھنچ کھنچ کر ان کے پاس آرہی تھیں۔ مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت ندوہ میں اس وقت آفتاب کے مانند تھی جس سے سینکڑوں بڑے بڑے سیارے اکتساب نور کر رہے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی میں بہت سی ابھرتی ہوئی علمی

خصوصیتیں وہی پائیں جو خود ابلتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا شبلی نعمانی زندگی میں بھی اپنے فرائض انہیں کے سپرد کرتے رہتے تھے۔ جب مولانا شبلی نعمانی کا انتقال ہوا تو ان کے صحیح جانشیں مولانا سید سلیمان ندوی ہی تسلیم کئے گئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے طالب علمی کے زمانے کی داستانیں بڑی سبق آموز، بڑی دلچسپ اور بڑی بصیرت افروز ہیں۔ اگر سب لکھی جائیں تو ایک ضخیم تذکرہ ہو جائے۔ ان واقعات کو چھوڑتا ہوں مگر اتنا ضرور لکھوں گا کہ خداداد ذہانت مولانا سید سلیمان ندوی کو بھرپور ملی تھی۔ جب ذہانت کے ساتھ شوق و محنت کا امتزاج ہوتا ہے تو اس حالت میں شخصیت نئے اقتدار میں جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔ یہی امتیازی جوہر مولانا سید سلیمان ندوی کی ذات میں بچپن سے لیکر ان کے آخری زمانے تک پر توفگن رہا۔ استاد کا فضل و کمال اگر ان کو استاد کی طرف کھینچتا تھا تو ان کی ذہنی صلاحیتیں اور تشنگی شوق استاد کو بھی ان کی طرف دل سے مائل کئے رہتی تھی جس کی سب سے بڑی مثال وہ تھی جس نے مولانا سید سلیمان ندوی اور علامہ شبلی نعمانی کے درمیان سے استادی اور شاگردی کا پردہ اٹھا کر شاگرد اور استاد کو ایک کردیا تھا۔ ان دونوں بزرگوں کی سوانح حیات کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو یہ بات صاف جھلکے گی کہ دونوں کی سوانح زندگی بڑی حد تک نامکمل رہے گی اگر اس میں صرف کسی ایک ہی بزرگ کا تذکرہ سامنے لایا جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی بیشتر علمی اور عملی زندگی ان کے صوبے سے باہر گذری اور ان کی عملی اور سیاسی جولانگاہ بھی بہار کے حدود سے باہر ہی رہی مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی علامہ سلیمان ندوی کی سرزمین بہار سے دلی وابستگی قائم تھی۔ اسی لئے ان کی رشتہ داریاں بھی یہیں بڑھتی رہیں۔ علامہ موصوف پٹنہ کی ادبی دلچسپیوں کو بھی کبھی نہ بھولے۔ جب مجھ سے ملاقات ہوتی صدر گلی کے لوگوں کی خیریت پوچھتے اور ان گذری ہوئی صحبتوں کو یاد کرنے لگتے جن میں وہ اپنی نوعمری کے باعث حصہ نہ لے سکتے تھے۔ یہ بھی بڑی حیرت سے کہتے تھے کہ صدر گلی کے مشہور

اور یادگار محلوں کو میں پوری طرح دیکھ بھی نہ سکا جن میں علامہ حکیم عبدالحمید کی شمع علم کی ضونشانی رہتی تھی اور مولانا سید رحیم الدین، سید عبدالغنی وارثی، نواب سید محمد آزاد، عبدالغفور شہباز، مولانا شوق نیموی، مولانا فضل حق آزاد اور سید ضمیر الدین احمد کی ذات سے ان محلوں کی رونق اور دونی ہو جاتی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی جب پھلواری شریف حضرت مولانا سید شاہ محمد سلیمان علیہ الرحمۃ کی خدمت میں علمی درس لینے کے لئے پہونچے تو صدر گلی کی علمی مجلس تقریباً پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ کبھی حضرت مولانا سلیمان صاحب کی معیت میں صدر گلی آتے اور کبھی میرے والد مرحوم کی ملاقات کو خود چلے آتے تھے۔ اس وقت علامہ حکیم عبدالحمید زندہ تھے جس کے سبب سے کچھ نہ کچھ صاحبان علم پھر بھی کھنچ کر آہی جاتے تھے۔ مولانا سید سلیمان اشرف بھی انہیں دنوں پٹنہ پہونچے تھے۔

۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلما کا شاندار اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا۔ صدر گلی ہی کی علمی مجلس اس اجلاس کی سربراہ تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے جب ندوۃ العلما کے اس اجلاس کو دیکھا تو ندوہ کے لئے ان کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی کچھ دنوں کے بعد جب ندوہ کی کشش زیادہ بڑھی تو مولانا احمد احسن صاحب کی معیت میں بالآخر یہ ندوہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ لکھنو پہنچے تو مولانا فاروق چڑیا کوٹی جو اس وقت ندوہ کے مدرس اعلی تھے ان سے فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔ تقریباً اس کے ڈیڑھ سال کے بعد جب علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء کے معتمد ہو کر لکھنؤ تشریف لائے تو مولانا سید سلیمان ندوی نے پہلی مرتبہ ان کو دیکھا اور اسی پہلی ملاقات نے مولانا سید سلیمان ندوی کو علامہ شبلی نعمانی کا گرویدہ بنا لیا۔ یہ عقیدت کی گانٹھ کچھ ایسی لگی کہ روز بروز مضبوط ہی ہوتی گئی۔ شاگرد کی عقیدت کا ساتھ استاد کی محبت نے بھی خوب ساتھ دیا۔ بالآخر دونوں کے درمیان ایسا ابدی رشتہ استوار ہوا کہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی ہمیشہ کے لئے ایک جان دو قلب بن گئے ندوہ کی تعلیم ختم ہوئی مگر علامہ

شبلی نعمانی ان کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی توسیع قیام کے لئے یہ راہ نکالی کہ ندوہ میں جدید عربی کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کچھ مدت تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ الندوہ کی ادارت بھی ان کے سپرد ہوئی۔ الندوہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمن شیروانی کی مشترکہ کوششوں سے نکلا تھا۔ کچھ دنوں تک مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھوں میں اس کی ادارت رہی۔ اس کے بعد یہ کام مولانا سید سلیمان ندوی کو تفویض ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو دوسرے کاموں کی انجام دہی میں الندوہ کی ادارت کے سبب سے رکاوٹ پڑتی تھی جس کے باعث یہ الندوہ سے کبھی کبھی جان چھڑا کر الگ ہو جاتے تھے مگر ادارت کا کام نہیں چلتا تو پھر یہی پکڑے جاتے۔ ۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی نعمانی کا انتقال ہوا ان کے انتقال کے دو برس بعد الندوہ کا اجرا بھی بند ہو گیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی دلی خواہش تھی کہ الندوہ کا دوبارہ اجراء ہو مگر یہ خود دوسرے کاموں میں گھرے ہوئے تھے اور الندوہ کے دوبارہ اجرا کے لئے مواقع نہیں ملتے تھے آخر ایک طویل مدت کے بعد ۱۹۴۹ء میں الندوہ کا اجراء مولانا سید سلیمان ندوی ہی کے ہاتھوں ہوا۔

اس درمیان میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا سید سلیمان ندوی سے الہلال میں تعاون کے لئے بار بار اصرار کیا تو کلکتہ پہونچے۔ الہلال کے ساتھ اگرچہ مولانا سید سلیمان ندوی کی وابستگی مختصر رہی پھر بھی اس زمانے کے الہلال کو پڑھئے تو نظر آئے گا کہ کس طرح اس کے صفحوں میں مولانا سید سلیمان ندوی کی نگارشات پڑھنے والوں کی آنکھوں میں نور اور دلوں میں تپش پیدا کرتی ہیں۔ تھوڑے دن الہلال میں مولانا سید سلیمان ندوی کو کام کرتے ہوئے تھے کہ دکن کالج پونا میں السنہ مشرقیہ کی مدرسی کی پیش کش ان کو کی گئی جس کو انھوں نے قبول کر لیا۔

علامہ شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد ہی مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی میں نیا موڑ آیا۔ جس سے مدارج کے نئے نئے راستے ان کے لئے کھلنے لگے۔ سیرۃ النبی

کی تکمیل، حیات شبلی کی تالیف، دوسری گرانقدر تصنیفات کا سلسلہ معارف کا اجراء اور دارالمصنفین کا قیام یہ سب باتیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ مولانا کی تگ و دو علم و ادب کے میدان تک ہی محدود نہ تھی۔ ان کے عملی کارناموں کا اگر جائزہ لیجئے تو نظر آئے گا کہ ملک و قوم کی محبت سے بھی ان کا دل لبریز تھا اور یہی چیز اکثر ان کو کھینچ کر میدان سیاست میں بھی لے آتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ندوہ نے مولانا سید سلیمان ندوی کو بہت کچھ دیا مگر اس کو بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ندوہ نے بھی بہت کچھ ان سے حاصل کیا۔ جس چمنستان علم و دانش کی آبیاری علامہ شبلی نعمانی نے شروع کی تھی وہ ان کے انتقال کے وقت تک پورے شباب پر نہ آسکا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی ان کے بعد اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کرتے گئے اور اس کا ان کو ثمرہ بھی ملا کہ چمنستان علم و دانش کی بہار انھوں نے اپنی زندگی میں دیکھ لی۔ یہی نہیں بلکہ ایک تصنیفی مرکز کا خاکہ جو علامہ شبلی کے ذہن میں برسوں پلتا رہا تھا اور جس کی داغ بیل انھوں نے اپنے کل شاگردوں کے تعاون سے ڈالی تھی اس کی مکمل تعمیر بھی مولانا سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں عمل میں آئی بلکہ ندوہ کی بڑھتی ہوئی شہرت اور دارالمصنفین کا انتہائی عروج سچ پوچھئے تو یہ دونوں مولانا سید سلیمان ندوی کی مساعی جمیلہ کی رہین منت ہیں۔

تالیف و تصوف اور دوسری علمی تحریکوں کے ساتھ مولانا کو جو دلبستگی تھی۔ وہ تو اپنی جگہ پر تھی۔ ان باتوں کے علاوہ ان کی بے چین حریت پسند طبیعت نے ان کو ہندوستان کی سیاست اور بین الاقوامی مسلم تحریکوں سے بھی وابستہ کر رکھا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی مرحوم کی سرکردگی میں وفد خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے سفر لندن، ۱۹۲۱ء میں بمقام میرٹھ جلسۂ خلافت کی صدارت اور اس کے ساتھ ہی ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ میں ان کی نامزدگی پھر ۱۹۲۲ء میں صوبہ بہار کی خلافت کانفرنس کی صدارت یہ سب باتیں مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اور سیاست کے ساتھ ان کے دلی لگاؤ کی مثالیں ہیں۔ یہ سب یہیں پر نہیں ختم ہوتا بلکہ ۱۹۲۶ء میں

جب کلکتہ میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس منعقد ہوا تو اس کی صدارت بھی مولانا کو تفویض کی گئی۔ اسی سال دہلی میں جلسہ خلافت کی صدارت کا عہدہ ان کے سپرد ہوا۔ اور وفد حجاز کی جب تشکیل ہوئی، جس کے اراکین مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے، تو اس وفد کی صدارت بھی مولانا ہی کے حصہ میں آئی۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ گھر میں ہر طرف تصوف کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ ان کے والد مولوی سید ابوالحسن مرحوم بڑے عالم اور صوفی منش بزرگ تو تھے ہی مولانا کے بڑے بھائی تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آئے۔ اسی لئے بچپن سے ہی یہ رنگ مولانا کی طبیعت پر بھی چڑھا۔ تکمیل علم کے زمانے میں پھر اس کے بعد کچھ دنوں تک بڑے اداروں کے بوجھ اٹھانے کے باعث اور جو کام ان کے استاد نامکمل چھوڑ گئے تھے ان کی تکمیل کی دھن میں مہلت کہاں ملتی تھی، کہ مولانا پر یہ رنگ سولہ آنہ پھوٹ نکلتا۔ بہر حال دل کی تڑپ بڑھتی ہی رہی آخر ایک دن ایسا آیا کہ دنیاوی فرائض کے ہجوم اگرچہ ان کو گھیرے ہوئے تھے یہ معتقدانہ اٹھے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے آستانے پر پہونچے اور اپنے دست طلب ان کے ہاتھوں میں دیکر دل کی تسکین حاصل کی۔

مولانا سید سلیمان ندوی عالم، معلم، مدرس، خطیب، محدث، مفسر، مورخ، سیاستداں صحافی، ادیب، ناقد اور شاعر سب ہی کچھ تھے۔ اتنی جامع الصفات ہستیاں کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔ پورے ہندوستان کے لئے وہ سرمایہ افتخار اور وجہ نازش تھے۔

مولانا کم سنی ہی کے زمانے سے شعر کہنے لگے تھے۔ پہلے سید تخلص کرتے تھے پھر رمزی تخلص کرنے لگے۔ ان کے شروع طالب علمی کا زمانہ پھلواری شریف میں قیام کا زمانہ تھا۔ پھلواری شریف پٹنہ سے لگا ہوا ایک ممتاز قصبہ ہے اگر میونی سپل (بلدیہ) حدود کو ہٹا دیجئے تو پہلے بھی اور آج بھی اس کو پٹنہ ہی میں شامل سمجھئے۔ پھلواری شریف کے قیام کے دنوں میں مولانا بھی پٹنہ کے مشاعروں میں شریک ہوتے

اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ ۱۹۰۲ء میں جب پٹنہ سے "بہار" کا ماہنامہ حافظ نذرالرحمٰن حفیظؔ اور دوسرے اہل ذوق حضرات کی کاوشوں سے نکلا تو باوجود اس سے کہ تحصیل علم کے لئے اس وقت ندوہ (لکھنؤ) جاچکے تھے پھر بھی یہ اس کے قلمی معاون بنے اور لکھنؤ سے برابر اپنی غزلیں اس ماہنامہ میں اشاعت کے لئے بھیجتے رہے ایسی دو غزلوں کے دو چار اشعار یہاں حاضر ہیں۔

شعلۂ غم پسِ مردن جو بھڑک جاتے ہیں   سنگ ھائے لحد کشتہ چٹک جاتے ہیں!
ایسی توبہ سے تو بہتر ہے نہ توبہ کرنا   جس سے کچھ اور بھی میخوار بہک جاتے ہیں!
کیا کہیں ہم کو مزا کیا ہے مئے اشک میں بھی   آنسو پی جاتے ہیں.جب رونے سے تھک جاتے ہیں!!

عاشق گیسو و رخ کو کیا خبر   کفر کیا ہے اور کیااسلام ہے!
خود جفاؤں سے تم اپنی پوچھ لو   کیوں کسی کی لاش پر کہرام ہے!
خود بتاتی ہے کسی کی بیکسی   یہ مزار عاشق ناکام ہے!!

مولانا نے نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی مگر جب ان کی طبیعت پر تصوف کا رنگ گہرا آیا تو اشعار بھی تصوف کے رنگ میں ڈھلنے لگے۔اس کا اندازہ ذیل کے کچھ اشعار سے ملے گا۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں   وہ ایک قطرہ خوں جو رگ گلو میں ہے

جو آج لذت دردنہاں کا جویا ہے   وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے
ادب سے دیکھ لیں عشاق دور سے ان کو   مجال ہے جو کوئی ان کو ہم کنار کرے
تری نگاہ میں دونوں خواص ہیں موجود   کہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

دیدۂ دل اگر ہو باز رازرہے نہ راز میں   جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں

نسخہ اکسیر و داروئے شفا تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے
مہر ہو یا قہر ہو جو کچھ بھی ہو ہر ادا محبوب کی محبوب ہے
اندرون حلقہ پیر مغاں کوئی سالک ہے کوئی مجذوب ہے

اب مسئلہ کثرت و وحدت کو میں سمجھا پاکر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں
سجدہ طرف کعبہ ہے دل تیری طرف ہے اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں

مولانا ہی کو یہ عظمت بھی ودیعت کی گئی تھی کہ وہ جہاں بھی رہے ان کی شخصیت کہیں بھی معرض بحث نہ آئی۔ ہر جھگڑے سے الگ ان کی ذات دلوں کو ملانے والی اور آپس میں محبت و مدارات پیدا کرنے والی تھی ۔وہ ہندوستان سے جب پاکستان چلے گئے تو بھی کسی کی انگلیاں ان پر نہ اٹھیں ۔بات یہ تھی کہ ہندوستان بھی ان کا تھا اور پاکستان بھی ان کا تھا اور یہ دونوں جگہوں کے لوگوں سے محبت کرنے والے ان کے دوست اور بہی خواہ تھے۔

اس دور کے چند مشہور خانوادے

حضرات مشائخ نے دینی اور روحانی طریقوں میں رہنمائی کر کے اپنی قوم کی سماجی زندگی کی اصلاح میں بھی جو حصہ لیا اس کا اثر ہے کہ دولت و حکومت کے جانے کے بعد بھی مسلم قوم کی بہت سی خصوصیتیں بچ رہیں جن سے ابھی تک اس قوم کی امتیازی شان باقی ہے۔ ہر ممتاز خانوادہ شریعت اسلامی کا مرکز تھا۔ وہاں کے ماحول، وہاں کے آداب اور وہاں کی تعلیمات میں دل کو سکون اور روح کو تازگی ملتی تھی اور ساتھ ہی مسلمانوں کے بکھرے ہوئے شیرازوں کی شیرازہ بندی بھی ہوتی رہتی تھی۔ پٹنہ بھی ان بزرگوں کی فیض سے محروم نہ تھا۔ پہلے بھی کتنے بزرگان دین نے یہاں ہدایت کی شمعیں جلا کر ہزاروں تاریک دلوں کو روشن کیا اور پھر اس سر زمین میں اپنی ابدی آرام گاہیں بنا کر محو استراحت ہو گئے۔ ان کے بعد بھی کتنے آئے جو انہیں گزرے ہوئے بزرگوں کے فیوض کی برکتوں سے رہنمائی کی قندیلیں جلاتے رہے۔ انہیں بزرگوں کے تین آستانوں کا تذکرہ پیش نظر ہے۔ جس دور کا تذکرہ لکھ رہا ہوں اس وقت ان خانوادوں کے سجادہ نشیں اپنے علم تقدس اور ہمہ گیر شخصیت کے باعث وہ جاذبیت رکھتے تھے کہ ہر قوم و ملت کا آدمی ان کی طرف کھینچا آتا تھا۔ ان کے علاوہ اس وقت بھی اور آج بھی چند مشہور خانوادے ہیں جن میں حضرت منعم پاک رحمت اللہ علیہ کا خانوادہ متین گھاٹ میں ہے۔ اسی سے لگا رکن الدین عشق رحمتہ اللہ علیہ کا خانوادہ ہے جو تکیہ کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت شاہ ارزاں کی درگاہ اور خانوادہ۔ میں طوالت کے باعث ان کے تذکروں کو چھوڑ رہا ہوں۔

پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ

جب کسی شیخ طریقت کا حلقہ بہت وسیع ہو جاتا ہے اور اس کا گھر تابعین اور معتقدین کا مرکز بن جاتا ہے تو وہ صاحب خانقاہ کہلانے لگتا ہے اور اس کی وفات کے بعد اس کی خانقاہ اور اس کے سلسلے کی مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے اس کا ایک سجادہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ یہی دستور زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔

پھلواری شریف میں حضرت شاہ مجیب اللہ قادری رحمت اللہ علیہ الملقب بہ تاج العارفین کا جب وصال ۱۱۹۱ھ میں ہوا تو آپ کے مرشدین اور مریدین کا حلقہ ملک کے بہت سے حصوں کو سمیٹے ہوئے تھا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ نے جب آپ کی قائم مقامی کی تو اس وقت سجادہ مجیبیہ کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت نعمت اللہ قادریؒ کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ ابوالحسن فرؔد علیہ الرحمہ مسند سجادگی پر بیٹھے۔ یہ بزرگ راہ سلوک و طریقت کے بڑے سالک اور فارسی کے بڑے پایہ کے شاعر بھی تھے۔ حضرت فرد علیہ الرحمۃ کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ نورالعین سجادہ نشیں ہوئے۔ جب ان کا بھی انتقال ہوا تو حضرت ابوالحسن فرؔد کے چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہ علی حبیب نصؔر زیب سجادہ ہوئے۔ حضرت شاہ علی حبیب بھی فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے بعد ان کے دو صاحبزادے یکے بعد دیگرے مسند سجادگی پر بیٹھے۔ بڑے بھائی حضرت عبدالحق گزر گئے تو چھوٹے بھائی حضرت عین الحق نے ان کی جگہ لی۔ حضرت شاہ عین الحق کا رجحان اہل حدیث کی طرف تھا اس لئے سجادگی ترک [illegible] ضلع چھپرہ کے ایک گاؤں حکیم آباد گھگھٹہ میں بال بچوں سمیت جا کر مقیم ہوگئے۔ اب سجادہ مجیبیہ خالی ہوگیا تھا اس لئے خاندان کے اور باہر کے بزرگوں نے حضرت مولانا شاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ کو جو حضرت شاہ علی حبیب نصؔر رحمۃ اللہ علیہ کے مرید، خلیفہ اور منجھلے داماد تھے، مسند سجادگی پر بٹھلایا۔ حضرت مولانا شاہ بدرالدین علیہ الرحمۃ حضرت امیر

عطاء اللہ جعفری کی اولاد میں سے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا سلسلہ نسب شاہ مجیب اللہ قادری رحمۃ اللہ کی اولاد دختری سے بھی ملتا تھا۔ حضرت مولانا شاہ بدرالدین بعد میں صوبہ بہار اور اڑیسہ کے پہلے امیر شریعت بھی بہ اتفاق رائے منتخب ہوئے تھے۔ جب ان کا وصال ہوگیا تو ان کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ محی الدین رحمۃ اللہ علیہ زیب سجادہ ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ تمام لوگوں نے بہ اتفاق رائے ان کو امیر شریعت دوم بھی منتخب کیا۔ آج کل ان کے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ امان اللہ قادری صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ سجادہ مجیبیہ پر رونق افروز ہیں۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو اس زمانہ میں پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ، جس کو بڑی خانقاہ بھی کہتے ہیں، وہاں کے سجادہ رشد و ہدایت پر حضرت مولانا شاہ بدرالدین علیہ الرحمہ متمکن تھے۔ حضرت کی ذات زہد و تقویٰ اور علوم دین میں کامل ہونے کے سبب مرجع خلائق تھی۔ صوبہ ہی کے لوگ نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے لوگ آپ کے آستانے پر آتے، فیوض پاتے اور دلوں میں نور ہدایت کی روشنی حاصل کر کے واپس جاتے۔ یہ آستانہ صرف فیوض روحانی کے لئے مشہور نہ تھا بلکہ دینی علوم کا مرکز ہونے کے لحاظ سے بھی کے بڑے بڑے علمائے کرام کی نظروں میں اور دینی علوم کے دیگر مرکزوں میں بھی یہ اونچا مقام رکھتا تھا۔ یہاں کا کتب خانہ آج بھی اپنی وسعت اور بیش بہا کتابوں کی تعداد کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ علوم دینی کی برکتوں سے حرّیت و آزادی کے جذبات بھی یہاں پرورش پاتے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ نعمت اللہ قادری قدس سرہ کا دور تھا کہ ہندوستان کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد بریلوی اور حضرت سید اسمٰعیل شہید بھی یہاں آئے اور اس آستانے کی فضا میں انھوں نے وہ سب کچھ دیکھا جس کے لئے وہ بیقرار دل رکھتے تھے اور جب یہ حضرات واپس گئے تو قلوب مطمئن کے ساتھ واپس گئے۔ حضرت شاہ بدرالدین علیہ رحمۃ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ خانقاہ کی فضا میں رہنے والوں کا رہن سہن ایسا تھا کہ گزرے

ہوئے زمانے کی خانقاہوں کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا تھا۔ بحمد اللہ یہی امتیازی باتیں اب بھی وہاں باقی ہیں۔ ماہ ربیع الاول جو حضرت سرور کائنات اور خلاصۂ موجودات رسول اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کا مبارک اور مقدس مہینہ ہے اس کے کچھ دنوں قبل ہی سے مجالس میلاد شریف کی تیاریاں بڑے زوروں پر شروع ہو جاتی تھیں۔ پہلی تاریخ سے لیکر مہینہ کی بارہویں تاریخ تک میلاد شریف کی مجلیس، قرآن خوانی، درود خوانی ہوتی، قل ہوتے، موئے مبارک کی زیارت بھی ہوتی اور دن اور رات میں دو وقت سماع کی مجلیس بھی برپا رہتیں، صوبہ اور بیرون صوبہ سے ہزاروں کی تعداد میں عقید تمند آتے۔ پھلواری شریف کے قصبہ میں دور و نزدیک سے سینکڑوں مختلف چیزوں کی دوکانیں بھی آجاتیں۔ کئی دنوں تک بڑا میلہ لگا رہتا اور یہ چھوٹا سا قریہ پھیل کر ایک شہر بن جاتا، جہاں شہر کے ایسی چہل پہل رہتی۔ پھلواری شریف نیا پٹنہ سے پچھم چار پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور آج پٹنہ کی بڑھتی ہوئی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں میں پھلواری شریف بھی پٹنہ کا ایک حصہ بن جائیگا۔ پٹنہ سے قربت کے باعث پٹنہ کی خلقت بھی ماہ ربیع الاول میں وہاں ٹوٹی پڑتی ہے۔ ہزاروں وہاں ربیع الاول کے کل رسومات میں شرکت کے خیال سے قیام پذیر ہو جاتے ہیں اور ہزاروں ایسے بھی ہوتے ہیں جو دن بھر کی رسومات میں شریک ہو کر گھر واپس آجاتے ہیں۔ خانقاہ کی وسیع عمارت جس کے اندر سینکڑوں مہمانوں کے قیام کی گنجائش ہے مہمانوں اور زائرین سے بھری رہتی ہے۔ قصبہ پھلواری شریف کے ہر مکان میں بھی سینکڑوں زائرین آکر ڈیرہ ڈال دیتے ہیں اور ہر صاحب خانہ بھی ایسے مہمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتا اور بڑی خوشی سے ان کی مہمان نوازی کرتا ہے۔ سینکڑوں ایسے بھی ہوتے ہیں جو باغوں میں کھلے ہوئے میدانوں میں اور قصبہ کی متعدد مسجدوں میں اپنے قیام کی جگہیں بنالیتے ہیں۔ خانقاہ کی طرف سے لنگر جاری رہتا، جو چاہتا اس کو کھانا مفت ملتا۔ خدا کا شکر ہے کہ زمانہ کے ردوبدل کے باوجود بھی بہت کچھ پرانی باتیں اب بھی

وہاں نظر آتی ہیں۔ حضرت مولاناشاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ کا آخری زمانہ، میں نے اپنے ہوش میں دیکھا۔ میرے والد مرحوم سے اور حضرت سے گھریلو تعلقات اور مراسم تھے ایک واقعہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کا مجھے یاد ہے۔ میری عمر اس وقت غالباً چھ یا سات سال کی ہوگی۔ میں اپنے عم محترم میر عبدالحفیظ صاحب مرحوم کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت کچھ اور بھی حضرات خلوت میں حاضر تھے۔ میرے ماموں صاحب مرحوم نے میرا تعارف حضرت سے اس طرح کرادیا کہ یہ بھائی ضمیر الدین احمد صاحب کا لڑکا ہے۔ مجھے دیکھ کر حضرت بہت خوش ہوئے اور ہنستے ہوئے پوچھا کہ "میاں تمہارا نام کیا ہے؟" حضرت کے نام سے میں واقف تھا اس لئے میں نے ذرازور دیکر کہا کہ میں بدر الدین ہوں۔ یہ سنکر دیر تک مسکراتے رہے اور کھینچ کر مجھے بغل میں بٹھالیا۔ خلوت نشینی کے باوجود بھی حضرت کے دل میں بڑا قومی درد تھا جس کا مظاہرہ اس آستانے کی آزادی کی تحریک میں کامل طور پر حصہ لینے کی شکل میں برابر ظاہر ہوتا رہا۔ قومی ضرورت نے جب قوم کی شیرازہ بندی کے لئے امارت شرعیہ کا قیام ضروری سمجھا تو حضرت مولانا شاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سبھوں کی نظریں اٹھیں اور باتفاق رائے حضرت ہی صوبہ بہار اور اڑیسہ کے پہلے امیر شریعت منتخب ہوئے۔ چونکہ یہ آستانہ آزادی کی تحریک کا مرکز رہاہے اس لئے رہنما قوم بھی برابر اس آستانے پر حاضری دیتے رہے۔ حضرت مولانا شاہ بدرالدینؒ کے زمانے میں مہاتما گاندھی جب بہار آئے تو ان کو بھی یہاں کی اہمیت اپنے یہاں کھینچ لائی۔

غالباً اس زمانہ کے ماحول کا اثر تھا کہ شعر کہنا بھی علم کی علامت سمجھی جاتی تھی اس کے علاوہ یہ بات تھی کہ صوفیائے کرام نے اکثر و بیشتر اپنی شعر گوئی سے تصوف کے نکات و مسائل بڑی خوبصورتی سے لوگوں کے ادراک و بصیرت کے لئے پیش کئے ہیں اور اپنے اشعار میں تصوف کے پیچ در پیچ مسئلوں کا صحیح حل بھی سمو دیا

ہے۔ حضرت بھی شعر کہتے تھے مگر اتنا نہیں کہ شاعر کہلائیں۔ ان کے شعروں کا مجموعہ ''عرق بادیان'' کے نام سے چھپا ہے جس میں حضرت کا کلام اور حضرت کے جانشین اور فرزند اکبر حضرت مولانا شاہ محی الدینؒ کے کلام بھی شامل ہیں۔ حضرت مولانا شاہ بدرالدینؒ کے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں۔ یہ سب فارسی کے اشعار ہیں۔ مجموعہ میں اردو اشعار نہیں ملتے۔ غالباً حضرت فارسی ہی میں شعر کہا کرتے تھے۔

ایں رشتۂ محبت باتست ہر کے را
تسبیح زاہداں را زنار برہمن را

چوں با آں ترکِ جادو چشم روزے رد بردگشتم
نگاہے کرد و کزسحرش بجان خود عدد گشتم
ہوائے زلف اودارد دل صد چاک چوں شانہ
ہمہ تن چاک چاک اے بدرؔ بہر زلف او گشتم

÷÷÷÷÷÷÷

چہ دم مجنوں زند امروز در وادی عشق من
کہ جذب کہہ ربا دادو خس و خاشاکِ راہ من

دوش جامے نمی آن پیر مغانم دادہ
سرے سالک بہ یکے جرعہ مۓ بکشادہ
در عجب ماندہ ام امشب کہ زفیض ساقی
زاہد صومعہ بر پائے مغاں افتادہ
بدرؔ مست مۓ عرفاں نہ شوی تانہ کنی
رہن خمخانۂ مۓ دلق خود و سجادہ

حضرت شاہ علی حبیب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا شاہ بدرالدینؒ کے خسر بھی تھے اور پیر بھی ۔انہیں سے حضرت مولانا شاہ بدرالدینؒ کو اجازت وخلافت بھی ملی تھی۔اپنے پیر کے وصال پر حضرت شاہ بدرالدینؒ نے فارسی میں متعدد تاریخی قطعے

کہے تھے۔ان میں سے دو قطعے یہاں نقل کرتا ہوں۔

شیخِ ما استاد ما مولائے ما
جاں نشینِ فرد شیخ العارفین
ہم سمی مصطفٰے ص ر مرتضٰی
ہم حبیب خاصِ رب العالمین
چوں ازیں دنیائے فانی رخت بست
عالمے را ساختہ اندوہ گیں
در ہمان رنج و غم و درد و الم
جُست مال رحلتش بدرؔ حزیں
گفت ہاتف رفت ازیں دارِ فنا
نورِ عینِ رحمۃ اللعالمین

۱۲۹۵ھ

دیگر

چوں بہ فرد وس رفت مرشد ما
از تپ ہجر اوست دل بریان
سن میلاد و جانشینی و عمر
باد صالش کنم ز خلق بیان
شدہ۔ شمس الضحی۔ سن میلاد

۱۲۴۹ھ

جانشینی۔ چراغ دین۔ برخواں

۱۲۶۸

بدرؔ۔ روشن زماہ دان عمرش

۴۶

وز چراغ کمال۔ نقل مکاں

۱۲۹۵ھ

پھلواری شریف کی چھوٹی خانقاہ یعنی سجادۂ سلیمانیہ

سجادہ کے قیام کا طریقہ تو گزشتہ صفحوں میں لکھ چکا ہوں کہ جب کسی بڑے بزرگ اہل طریقت کا حلقہ بہت وسیع ہو جاتا ہے تو ان کے مریدین اور معتقدین کی تعداد بڑھ جاتی ہے تو ان کے بعدان کے نام کا ایک سجادہ قائم کر دیا جاتا ہے۔یہی صورت قیام سجادہ سلیمانیہ کی بھی ہوئی۔ حضرت مولانا قادری شاہ محمد سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جو ۱۹۳۵ء کا زمانہ ہے حضرت کے خاندان کے کل افراد نے جن میں خانقاہ عمادیہ پٹنہ سیٹی اور خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین بھی شامل تھے ،نیز حلقہ کے سب لوگ اور بہار اور بیرون بہار کے مشہور صاحبان سجادہ نے مل کر،متفقہ طور پر سجادہ سلیمانیہ کے نام سے ایک سجادہ قائم کر کے حضرت مولانا قادری محمد شاہ سلیمان علیہ الرحمتہ کے منجھلے فرزند مولانا شاہ حسین میاں کو سجادہ نشین بنایا۔ جب مولانا شاہ حسین میاں علیہ الرحمتہ کا انتقال ہوا تو ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا شاہ غلام حسنین ان کی سجادگی پر قائم مقامی کرنے لگے۔

اگر چہ سجادہ سلیمانیہ بعد میں قائم ہوا مگر حضرت مولانا قادری شاہ محمد سلیمان علیہ الرحمتہ کی ذات بابرکات ایسی تھی کہ سچ پوچھیئے تو خانقاہ سلیمانیہ ان کی ذات سے خود بخود بہت پہلے قائم ہو چکی تھی اور عام طور پر لوگوں میں ہر جگہ پھلواری شریف کی خانقاہ سلیمانیہ کا چرچا پھیلا ہوا تھا۔ حضرت مولانا قاری شاہ سلیمان رحمۃ علیہ پھلواروی بھی خانوادہ مجیبیہ اور طریقہ مجیبیہ کے ایک فرد تھے حضرت شاہ مجیب اللہ قدس سرہ سے ان کو بھی دختری جزیت پہنچی تھی۔ آپ کا آبائی رشتہ صوبہ بہار کے مبلغ اول حضرت مخدوم تاج فقیہ منیری رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شادی بیاہ کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان کی شادی بھی حضرت شاہ علی حبیب نصرؔ رحمۃ اللہ علیہ کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی جن سے حضرت کی سب اولاد ہے۔

حضرت شاہ علی حبیب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت کے پہلے کے بھی رشتے تھے۔ حضرت مولانا محمد سلیمانؒ کی والدہ حضرت سلیم چشتیؒ (فتح پور سکری، آگرہ) کی اولاد سے تھیں۔ حضرت سلیم چشتی براہ راست حضرت بابافرید شکر گنجؒ کی اولاد سے تھے۔ حضرت شاہ محمد سلیمان پھلواری کی بیعت اپنے خسر حضرت شاہ علی حبیبؒ سے تھی۔ طریقتاً تعلیماً، مجازاً اور خلافتہً آپ کا وہی سلسلہ ہے جو خانوادہ مجیبیہ اور عمادیہ کا ہے۔

اپنے خاندانی سلسلوں کے علاوہ بھی حضرت شاہ محمد سلیمانؒ نے اپنے دور کے متعدد اور بڑے بڑے اکابر ہند سے تعلیم و اجازت و خلافت حاصل کی تھی۔ ان اکابرین میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ حضرت حاجی امداللہ مہاجر مکیؒ۔ حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی، حضرت شاہ قدرت اللہ ڈیرہ اسماعیل خاں تھے۔ ان کے علاوہ حضرت شاہ محمد سلیمان نے حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محل کی خدمت عالیہ میں بھی رہ کر درس و تعلیم اور اجازت و طریقہ حاصل کیا۔ جس زمانہ کا تذکرہ لکھ رہا ہوں اس وقت پھلواری شریف میں حضرت مولانا شاہ محمد سلیمانؒ کی گراں قدر ہستی بھی موجود تھی۔ خانقاہ عالیہ مجیبیہ کے صاحب سجادہ حضرات گرامی پیر بھائی بھی تھے۔ حضرت مولانا شاہ محمد سلیمانؒ کا فیض بھی صوبہ اور بیرون صوبہ ہر جگہ جاری تھا۔ اور ہر جگہ ہزاروں عقیدت مند اور مرید آپ کے دامن سے وابستہ تھے۔ ہندوستان سے لے کر برما تک عقیدت مندوں اور مریدوں کی کثیر تعداد تھی۔ آپ علم شریعت نبوی میں کامل، قرآن مجید کے حافظ اور مکمل قاری، عربی اور فارسی زبان کے جید عالم اور علم خطابت کے بادشاہ تھے۔ آپ کے وعظ اور میلاد شریف کی مجلسوں میں لوگ دور دور سے کھینچ کر آتے اور اپنا دامن سعادت سے بھر کر جاتے خدائی دین تھی کچھ محسن داؤدی بھی آپ کو حصہ میں ملا تھا۔ قرآن پاک اس طرح پڑھتے تھے کہ سامعین محویت کے عالم میں اپنے کو بھول جاتے۔ جو حضرات عربی جاننے والے ہوتے وہ روتے اور سر دھنتے مثنوی

مولاناؔ ردم کا پڑھنا انہیں پر ختم تھا۔ تمام ہندوستان میں ان کے مثنوی مولانا ردم پڑھنے کی دھوم تھی ۔ آج بھی لوگ کہتے ہیں کہ مثنوی پڑھنے والا ان کے ایسا پھر نظر نہیں آیا محرم کی مجلس پڑھنا اور ان میں اہل بیت کے ابتلا اور مصیبت کا بیان انہیں کا حق تھا۔ چونکہ محبت اہل بیت میں سرشار تھے اس لئے ان کی زبان سے جو الفاظ نکلتے تھے اس میں ایسا درد اور ان کے ہر جملہ میں ایسا نشتر ہوتا تھا کہ سامعین کے دل تڑپ اٹھتے تھے۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے لوگ آتے اور آرزو منت کر کے حضرت کو لے جاتےؔ۔ وعظ کی، میلاد نبوی کی، اور کہیں اہل بیعت کے مصائب کی مجلس ترتیب دی جاتی تھیں۔ خلقت امنڈ پڑتی اور لوگ نقش دیوار بنے ہوئے عالم محویت میں بیٹھے رہتے۔ بیان ختم ہو جاتا مگر سننے والوں کی تشنگی نہ بجھتی۔ ایک دفعہ چند حضرات کی دعوت پر قصبہ نونہرا ضلع غازی پور میں مصائب اہل بیت کی ایک مجلس پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے حضرت زین العابدینؓ کے مصائب کو اس طرح بیان کیا کہ درو دیوار تھرا اٹھے اور پوری فضا سوگوار ہو گئی ۔ مجھ سے نونہرا کے بہت سے حضرات نے کہا ہے کہ اس سے پہلے مصائب اہل بیت کا ایسا بیان کہیں بھی مجلس عزا میں نہ سنا گیا۔ ماہ ربیع الاول میں حضرت کے یہاں بھی خانقاہ میں برابر میلاد کی بڑی بارونق مجلسیں ہوتیں ، قرآن خوانی ہوتی اور سماع کی محفلیں بھی برپا رہتیں یہاں کی مجالس کے وقتوں سے خانقاہ مجیبیہ کے مجالس کے اوقات الگ ہوتے تھے تاکہ زائرین اور عقیدت مند دونوں جگہوں کی مجالس میں شرکت کر سکیں یہی حالت آج بھی قائم ہے۔

حضرت عالم دین ہونے کی حیثیت میں کبھی کبھی سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے مگر اس میں اعتدال پسند تھے۔ مقامات مقدسہ کی متعدد زیارتیں کی تھیں۔ حاجی حرمین شریفین بھی تھے والد مرحوم سے دیرینہ ملاقات و مراسم تھے، اکثر تشریف لاتے تھے، گفتگو میں ایسی دلکشی ہوتی تھی کہ ہر شخص ان کی گفتگو میں کھو جاتا تھا کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ آپ کے کلام شعری میں تصوف کا رنگ بہت گہرا

ہوتا تھا۔ کچھ اردو کچھ فارسی کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ حاذقی آپ کا تخلص تھا۔

روشن ہوئی جو شمع تجلّی مرے دل میں
ہے وادی ایمن کا تماشا مرے دل میں
میں آپ ہی عاشق ہوں تو ہوں آپ ہی معشوق
باقی نہیں اب کوئی تمنا مرے دل میں

دام گیسو میں پھنسایا یار نے
اپنا دیوانہ بنایا یار نے
اپنے عکس و زلف و رُخ سے سربسر
کفرو ایماں سب دکھایا یار نے
حاذقا اپنے تماشا کے لئے
مجھ کو آئینہ بنایا یار نے

عشق را چوں یار میدانیم ما
درد را درکار میدانیم ما
صافیِ ہر میکدہ را بہتر از
جبہٌ و دستار میدانیم ما

جوش زد باز جنوں چاک گریباں مددے
طپش دل مددے راہِ بیاباں مددے
پائے دیوانۂ تو درغسل و زنجیر فتاد
جوش سودا مددے گیسوئے جاناں مددے
راہ گم گشتہ بپا آبلہ ، منزلِ بس دور
خار صحرا مددے خضر بیاباں مددے

از رگِ جانِ من قریب توئی
حیرت است آنکہ باز دورم من
گہہ جو صل تو رازمی گریم
گاہ از ہجر در سر ورم من

حضرت شاہ محمد سلیمان علیہ الرحمتہ نے اپنے پیرو مرشد حضرت شاہ علی حبیب نصؔر رحمتہ اللہ علیہ کی وفات پر متعدد تاریخی قطعے کہے تھے۔ ان میں ایک طویل قطعہ صفت شیخ میں بھی ہے۔ اس کو چھوڑ رہا ہوں،اس کی جگہ پر ایک مختصر سا قطعہ درج کر رہا ہوں۔

یاد من آں رہبر من پیر من
چوں ز دنیائے دنی روتافتہ
سال فصلی گفتم از روے الم
دولتِ قرب الٰہی یافتہ

علمِ خطابت اور علوم دینی میں عبور کی خصوصتیں حضرت مولانا شاہ محمد سُلیمانؒ نے ورثہ میں چھوڑی تھیں۔ چنانچہ یہ دیکھنے کی چیز ہے کہ بجنسہ ان کے سجادہ پر پھلواری شریف میں ان کے صاحبزادے حضرت شاہ غلام حسین ۱۹۶۰ء تک ان کی نمائندگی کرتے رہے۔ اس طرح پاکستان کی علمی فضا بھی مولانا سیّد محمد جعفر اور حضرت مولانا سید حسن مثنی کی خطابت اور علمیت سے جگمگا رہی ہے۔ مولانا سیّد محمد جعفر حضرت مولانا شاہ محمد سلیمانؒ کے چھوٹے فرزند ہیں اور مولانا سید حسن مثنی حضرت محمد سُلیمانؒ کے بڑے فرزند مولانا حسن میاں مرحوم کے بیٹے اور ان کی یاد گار ہیں۔ آج کل خانقاہ سلیمانیہ کی سجادگی حضرت مولانا شاہ غلام حسنینؒ کے صاحبزادے شاہ محمد ریحان چشتیؒ کر رہے ہیں۔

خانقاہ عمادیہ، پٹنہ سیٹی

پرانے پٹنہ کے نافِ شہر میں "شیخ مٹھا کی گڈھی" جس کو اب منگل تالاب کہتے ہیں اسی سے لگی ہوئی ایک عالیشان خانقاہ، ایک مسجد، اس کے متعلقہ مکانات اور ہر طرف سے گھرا ہوا ایک کشادہ احاطہ ہے۔ اس احاطہ کے اندر جو خانقاہ ہے اس کو خانقاہ عمادیہ کہتے ہیں اور یہ خانقاہ سجادہ عمادیہ سے وابستہ ہے۔ سجادہ عمادیہ کی ابتدا حضرت خواجہ عماد الدین قلندر پھلواری شریف سے ہوئی۔ ان کا وصال ۱۱۲۴ھ میں ہوا۔ ان کے مورث اعلیٰ حضرت امیر عطاء اللہ تھے جو دہلی سے آکر پھلواری شریف کے قصبہ میں آباد ہوئے اور انہیں نے ۹۵۶ھ میں پھلواری شریف کی جامع مسجد (المعروف بہ سنگی مسجد) تعمیر کرائی۔ ان کا انتقال ۹۶۴ھ میں ہوا۔

حضرت خواجہ عماد الدین قلندرؒ نے حضرت سید فاضل قلندر ساڈھوری سے دہلی میں بیعت حاصل کی۔ آپ نے سلوک کی ساری منزلیں طئے کیں اور اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ ساڈھورہ ضلع، انبالہ (پنجاب) کا ایک سب ڈویژن ہے۔ حضرت سید فاضل قلندرؒ کا سلسلہ بیعت وطریقت اوپر جاکر حضرت قطب الدین بنیادلی قلندرؒ جونپوال سے ملتا ہے جہاں سے آپ کا قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ،.... طیفوریہ شطاریہ اور قلندریہ سب ہی سلسلے پہونچے لیکن اذکار و اعمال میں تعلیم و تلقین حضرت سید فاضل قلندر..... حضرت عماد الدین قلندریہؒ کو اپنے والد ماجد حضرت شاہ برہان الدین سے انکا سلسلہ قادریہ شطاریہ بھی پہونچا تھا۔ حضرت شاہ بُرہان الدین مرید و خلیفہ حضرت جمال اولیائؒ ساکن کورہ جہان آباد (گیا) کے تھے۔ جب ۱۱۲۴ھ میں حضرت خواجہ عماد الدین قلندر نے انتقال فرمایا تو آپ کے صاجبزادے حضرت خواجہ غلام نقشبندی نوجوان تھے۔ اور اپنے والد ماجد سے اخذ بعیت نہ کر سکے تھے۔ ان کو حضرت شاہ مجیب اللہ قادری پھلواروی نے ان کے والد ماجد کے سلسلہ میں مرید کیا اور اسی سلسلہ میں ان کی بیعت لی اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم و تربیت فرمائی اور اجازت و

خلافت جمیع دسلاسل کی بھی عطا کی نیز ان کو اپنی صاجزادی سے بیاہا۔ حضرت خواجہ غلام نقشبند کو حضرت شاہ مجیب اللہ قادری پھلواروی نے اور خاندان اور سلسلے کے سب بزرگوں نے مل کر سجادہ عمادیہ پر بیٹھایا ۱۱۷۳ھ میں حضرت غلام نقشبند کا انتقال ان کے خسر اور پیر بیعت شاہ مجیب اللہ قادری کی زندگی میں ہوگیا۔ اور کوئی اولاد نرینہ نہ چھوڑی۔ حضرت شاہ مجیب للہ قادری نے ان کی صاجزادی (یعنی اپنی نواسی) کو اپنے بڑے پوتے یعنی اپنے سب سے بڑے فرزند حضرت شاہ عبدالحق کے صاجزادے حضرت شاہ نورالحق تپاںؔ سے بیاہا اور حضرت شاہ نورالحق تپاں کو حضرت خواجہ غلام نقشبندؒ کے بعد سب اہل حلقہ اور اہل خانقاہ کے ساتھ مل کر سجادہ عمادیہ پر بیٹھایا۔ حضرت شاہ نور الحق تپاں کی تمام تر تعلیم و تربیت اور جمیع سلاسل کی اجازت و خلافت ان کے دادا یعنی حضرت شاہ مجیب اللہ قادریؒ سے ان کو پہنچی۔ حضرت مولانا ظہور الحق ظہور پھلواروی زیب سجادہ ہوئے۔ یہ حضرت غلام نقشبندیؒ کے نواسے تھے حضرت مولانا شاہ ظہور الحق کے بعد سے اب تک انہیں کی اولاد میں سجادگی چلی آرہی ہے کچھ دن قبل تک میرے محترم دوست مولانا شاہ صبیح الحق عمادیؒ زینت سجادہ تھے .... اوائل ۱۹۷۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اب ان کی جگہ پر ان کے بڑے صاجزادے عزیز گرامی سلمہٖ قدر شاہ فرید الحق صاحب قائم مقامی کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ نورالحق تپاں اپنی حیات کے آخری دور میں پھلواری شریف کی اقامت ترک کر کے عظیم آباد (پٹنہ قدیم) چلے آئے اور اشرف کے مقبرے میں جو پُرانے پٹنہ کا ایک محلّہ ہے آکر اقامت پذیر ہوئے۔ یہ محلّہ ان کے مریدین اور معتقدین سے بھرا ہوا تھا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد وہاں سے منتقل ہو کر شیخ مٹھا کی گڑھی سے متصل انہوں نے خانقاہ عمادیہ کی تعمیر کرائی اب یہ محلّہ منگل تالاب کے نام سے مشہور ہے

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت شاہ نورالحق تپاںؔ اردو اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے قطعات، مرثیے اور ان کی غزلیں بہت مقبول ہوئیں۔

فارسی کے دو کلیات آپ نے یادگار چھوڑے، اردو مراثی کی کافی تعداد پُرانے بیاضوں میں محفوظ چلی آتی ہے۔ میں حضرت شاہ نورالحق تپاںؔ کی غزلوں سے دو چار شعر درج کر رہا ہوں۔ یہ سوداؔ اور میرؔ کا زمانہ تھا۔ راسخؔ عظیم آبادی حضرت تپاں کے ہمعصر تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا
بیٹھا منھ پھیر کے ہنستا ہے دِوانہ تیرا

لے لیا ہے تو کریں قدر بھی میرے دل کی
آپ برباد نہ یوں، گوہر نایاب کریں

ہم جان رہے تھے کہ فقط زلف ہے آفت
و اللہ غضب ہے تیرے رخسار کا تل بھی

منزلِ مقصود پاوے ہے وہی
جو ترے رستے میں کھویا جائے ہے
اب بلاوا آرہا ہے یار کا
دو قدم بھی جب نہ جایا جائے ہے

لگادی اپنی آنکھوں سے جھڑی خود آخرش میں نے
کہ رستہ کب تلک اے ابر رحمت دیکھتے رہتے
بڑھایا حضرت واعظ نے آخر ہاتھ ساغر پر
فقط بیٹھے ہوئے حضرت سلامت دیکھتے رہتے
بتکدے میں تم پہ کیا گذری تپاںؔ بتلاؤ تو
بیٹھ کر مسجد میں کیوں یادِ خدا کرنے لگے

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ یہ تذکرہ تو میرے تذکروں کے قبل دور کار ہے بہر حال حضرت تپاںؔ کی شاعری کا ذکر بھی اس تذکرہ کے اس سلسلہ کی کڑی ہے جو میں یہاں لکھ رہا ہوں۔

میرے بچپن کے زمانے میں خانقاہ عمادیہ کی رونق حضرت مولانا شاہ رشید الحق علیہ الرحمۃ کے دم قدم سے تھی۔ حضرت کا تعلق باشندگان پٹنہ سے دو طرح پر تھا۔ ایک تو پٹنہ سیٹی میں خانقاہ عمادیہ کی سجادہ نشینی کے سبب سے دوسرا تعلق یہیں کی شاہی عیدگاہ میں عیدین کی نمازوں کی امامت کرنے کے باعث آپ کے زہد و ریاضت اور عبادت کے ساتھ ساتھ آپ کے علم و فضل کا بھی ہر جگہ چرچا تھا۔ اس آستانے سے سینکڑوں بہرہ مند ہوتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ چند حاسدوں کو عیدگاہ میں آپ کی امامت کھلی اور انہوں نے اختلاف کرنا چاہا مگر میرے والد مرحوم خان بہادر سید ضمیر الدین احمد نے ان حضرات کی سخت مخالفت کی اور اس طرح ثابت کر دیا کہ حضرت سے بڑھ کر نمازوں میں امامت کرنے کے لئے موزوں کوئی دوسری ہستی شہر میں نہ تھی۔ یہ بات لوگوں کو ماننی پڑی، حق کی فتح ہوئی، دو چار مخالفین جو تھے ان کو بھی آخر مقتدی بننا پڑا۔ میں نے نوجوانی میں حضرت کو دیکھا تھا بڑی متبرک اور نورانی صورت تھی۔ جس وقت عیدین کی نمازیں پڑھاتے اور عربی اور اردو میں خطبہ دیتے تو سارے نمازیوں پر ایک محویت کا عالم طاری ہو جاتا اور خطبہ کا ہر لفظ دل میں اترتا ہوا معلوم ہوتا۔ مجلس سماع میں بھی کیفیت پر ساری مجلس مکیف ہو جاتی تھی۔ ربیع الاول کی شروع تاریخوں میں روزانہ اس خانقاہ میں پھلواری شریف کی طرح میلاد شریف کی مجلسیں برپا ہوتیں، قل ہوتے، اور بارہ تاریخ کو موئے مبارک رسول اکرم ﷺ کی مردانہ اور زنانہ دونوں جگہوں میں زیارت ہوتی اور قوالیاں بھی ہوتیں حضرت کے عقیدت مندوں اور مریدوں کے علاوہ شہر کے لوگوں کا بڑا اجتماع ہوتا اور ایک میلہ بھی لگا رہتا تھا۔ حضرت کے وصال کے بعد حضرت کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ شاہ

حبیب الحقؒ آپ کے جانشیں ہوئے۔ ان کے زمانہ میں خانقاہ عمادیہ کی رونق اور شہرت اور بڑھ گئی۔ حضرت شاہ حبیب الحق کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا صبیح الحقؒ زیب سجادہ ہوئے۔ آج بھی اس گدی اور خانقاہ کا اعتبار حضرت شاہ صبیح الحق علیہ الرحمۃ کی عظمت ان کی سادہ زندگی ان کے خلوص ان کے زہد و تقویٰ اور عوام میں ان کی پیروی شریعت اور مجالس میں ان کے طرز خطاب کے باعث ہر شخص کے دل میں موجود ہے حضرت شاہ صبیح الحقؒ میرے ہم عمر اور محب صادق تھے۔ میں نے ان کو بہت نزدیک سے دیکھا اسلئے سمجھتا ہوں کہ آج کل کے دور میں ایسی ہستی بڑی مغتنم تھی۔ مگر یہ ہمہ گیر ہستی بھی دین و دنیا کے فرائض ادا کر کے ۱۹۷۴ء میں جوار رحمت الٰہی میں پہونچ گئی۔ اب اس گدی پر ان کی جگہ پر ان کے لائق فرزند اکبر عزیزی جناب شاہ فرید الحق سلمہ، فائز ہیں۔ یہ بہ ہمہ صفت موصوف ہیں اور جس طرح یہ اپنے والد کی نمائندگی کر رہے ہیں اس سے یہی امید ہے کہ جلد یہ ایک بلند پایۂ حیثیت حاصل کریں گے۔ (سید شاہ فرید الحق عمادی کا ۱۷ مارچ ۲۰۰۱ کو انتقال ہوگیا۔ ادارہ)

پٹنہ کا گنگا جمنی سماج اور ہندو حضرات

چند مثالیں

پٹنہ ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں جو تہذیب (کلچر) ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر قائم کی اور جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا اس کے متعلق عام طور سے آج کل ہمارے ہندو بھائیوں کے ذہن میں یہ بات ایک طبقہ کی طرف سے ڈالی گئی ہے کہ جو تہذیب ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں میں مشترک کہی جاتی ہے اور جس کی فضا میں یہ دونوں زندگی بسر کرتے ہیں وہ دراصل مسلمانوں کی باہر سے لائی ہوئی تہذیب ہے جس کو سنوارنے میں صرف مسلمانوں کا ہی ہاتھ تھا۔ اس زہریلے پروپگنڈہ کا تباہ کن اثر آج قومی یک جہتی پر پڑ رہا ہے۔ اور وہ دو برادریاں جو

شیر و شکر ہو کر ایک گنگا جمنی ماحول میں امن و سکون کی زندگی گذار رہی تھیں وہ ایک دوسرے سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سیاسی طور پر اب ہندوستان ایک عظیم قوت بن رہا ہے مگر کوشش کہ ہندوستان ہر طرح پر دنیا کا سب سے بڑا ملک بن کر سامنے آئے، یہ اس وقت تک مشکل ہے جب تک یہ دونوں عظیم برادریاں یعنی ہندو اور مسلمان پہلے جیسا ماحول نہ پیدا کرلیں جس میں ہندو اور مسلمان رہتے ہوئے بھی ایک کے معتقدات، روایات اور جذبات کا احترام ہو رواداری اور محبت کا پرچار ہو، قومی ایکتا یہی ہے جو دنیاوی عظمت حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت ہے ہندوستان کے گنگا جمنی سماج کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی گئیں اور پھیلائی جارہی ہیں کہ یہ صرف مسلمانوں کا ترتیب دادہ سماج تھا اس کی تردید میں اگر آج سے کچھ قبل کے حالات و واقعات پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ہمارے ہندو بھائی چاہے امیر ہوں یا غریب سولہ آنہ اسی سماج کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے جو رنگ مسلمانوں پر چڑھا ہوا تھا۔ سب ایک ہی طرح پر سوچتے، ایک ہی طرح مسائل زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے، شادی و غم کے احساسات سے ایک ہی طرح پر اثر پذیر ہوتے، ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور ایک دوسرے کے مذہب میں کھوج کھوج کر رواداری کا پہلو نکالتے۔ نہ زبان کا جھگڑا اٹھتا اور نہ مسجد و مندر کا قصہ سامنے آتا۔ اسی کتاب کے صفحات میں جہاں شادی بیاہ کی تقریبات کا تذکرہ ہے، شادی و غمی کا بیان ہے، میلوں ٹھیلوں کا مذکور ہے، مذہبی تہوار اور اجتماعات اور شعر و سخن کی محفلوں کی روداد ہے اور روزانہ کی آپس کی نشست و برخاست کی ایک رنگی کا ذکر ہے۔ اسی میں آپ قومی یک جہتی کا نظارہ بھی دیکھیں گے کہ کس طرح گنگا جمنی سماج (اجتماعی تہذیب) نے ہندو اور مسلمان کو برادری، محبت اور خلوص کے رشتہ میں پرو دیا تھا۔ یہاں چند ایسے حضرات کا ذکر نمونتاً پیشِ خدمت ہے جن کی ذات سے اگلے گنگا جمنی سماج کی داستانیں منسلک ہیں۔

کنور سکھ راج بہادر رحمتی

یہ پٹنہ کے بڑے معزز خاندان کے فرد تھے ان کے دادا راجہ پیارے لعل الفتی اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ان اراکین سلطنت میں سے تھے جو بادشاہ کے منظور نظر کہلاتے تھے اور متفرق اعلیٰ عہدوں پر فائز بھی رہے۔ یہ شعرو سخن کے دلدادہ تھے اور صاحبان علم و فن کے سرپرست بھی تھے۔ جب دلی کی آب و ہوا ان کے لئے ناساز گار ہونی شروع ہوئی تو یہ پٹنہ چلے آئے۔ ان کے صاحبزادے کنور ہیرالعل ضمیرؔ بھی شاعر تھے۔ غرض کنور سکھ راج بہادر رحمتی کو شاعری بھی باپ اور دادا سے وراثت میں ملی تھی۔ کنور سکھ راج بہادر کا یہ فیض تھا کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامہ کے بعد پٹنہ کی افسردہ فضا میں پھر روح پھونکی اور انقباض اور اضمحلال کی ان کیفیتوں کو یہاں کے لوگوں کے دلوں سے دور کرنے کی کوشش کی جو ناکامی، ناامیدی اور خوف و ہراس سے پیدا ہوتی تھیں۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشاعروں کی بنیاد رکھی۔ ان کی شعر و شاعری اور ان کے یہاں کے مشاعروں کا تذکرہ اس کتاب میں "شعر و شاعری کی بہار" کے عنوان میں آپ کو نظر آئے گا۔ یہاں پر ان کے کچھ سماجی کارناموں کا تذکرہ مقصود ہے جو عام طور سے سب لوگوں کی نظروں سے آج پوشیدہ ہیں۔ کنور سکھ راج بہادر نے ایک بڑا سا مدرسہ بھی غریب لڑکوں کی تعلیم کے لئے قائم کر رکھا تھا جس میں ہندو اور مسلمان لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ اردو اور فارسی کی عام تعلیم تھی اس لئے فارسی اور اردو کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ابتدائی مذہبی تعلیم میں قرآن شریف اور مسئلے مسائل کی کتابیں مسلمان لڑکوں کو پڑھائی جاتیں اور ہندو مذہب کی ابتدائی تعلیم ہندو لڑکوں کو دی جاتی۔ استادوں میں ہندو اور مسلمان دونوں معلم تھے اور ہندو معلم بھی اردو اور فارسی ہندو اور مسلمان لڑکوں کو پڑھاتے۔ مدرسہ میں ہندو اور مسلمان کی کوئی تمیز یا تخصیص نہ تھی۔ ایک یتیم خانہ بھی انہوں نے قائم کیا تھا جہاں غریب یتیم ہندو اور مسلمان لڑکوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی تھی اور ان کے کھانے

پینے اور کپڑوں کا بندوبست بھی تھا۔ سب ایک ساتھ رہتے صرف کھانے کے موقع پر ہندو لڑکوں کا چوکا الگ لگتا اور مسلمان لڑکوں کا دستر خوان الگ بچھتا۔ کنور سکھ راج بہادر کا ایک ملازم صبح و شام محلے کے غریب ہندو اور مسلمان گھروں میں جاکر ان کی خیر و عافیت پوچھتا۔ یہ ملازم اپنی گشت سے واپس آکر کنور صاحب کو رپورٹ دیتا اور کنور صاحب حسب ضرورت لوگوں کی حاجت روائی کرتے۔ شادی و غمی میں ہندو اور مسلمان دونوں کے گھر جاتے۔ ہندو اور مسلمان کے تہواروں میں یہ انہیں دونوں کی طرح اپنے مکان کو سجاتے اور آنے والوں کی آؤ بھگت بڑی فراخ دلی سے کرتے۔ یہ انہیں کا گھر تھا جہاں چاہے ہندوؤں کا تہوار ہو یا مسلمانوں کا دونوں کا مجمع نظر آتا اور یہ صاحب تقریب بنے ہوئے سب کی خاطر مدارات کرتے نظر آتے۔ مسلمان ملازم کی تعداد ان کے یہاں کچھ زیادہ ہی تھی۔ ہر تہوار کے موقع پر یہ کنور صاحب اپنے کل ملازمین کو بلا تخصیص، کپڑے بانٹتے اور تہواریاں دیتے۔ ان کے داستان گو بھی نوکر تھے جو نوکر تھے جو اکثر نشست کے وقت بھی اور سوتے وقت بھی ان کو داستانیں سناتے۔ داستان امیر حمزہ فسانہ عجائب چار درویش کی کہانی اور گل صنوبر کا قصہ بھی نئے نئے پیرائے میں بیان کرتے۔ گھر کی رہائش تو وہی تھی جو مشترکہ طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں کی تھی۔ ہندو اور مسلمان ملازمین اس طرح پر ساتھ رہتے کہ یہ نہ معلوم ہوتا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ کنور صاحب کی زبان لکھنؤ کی زبان سے نہیں بلکہ دلّی کی زبان سے مماثلت رکھتی۔ صاف ستھری، ادبی الفاظ سے بڑی حد تک بری ہوتی کنور صاحب کی زبان میں داغ کی زبان کا مزہ ملتا تھا۔ ان کے پوتے کنور جگدیش بہادر جو خود بھی شعر و شاعری کے رسیا اور پرانی تہذیب کی یادگار تھے یہ باتیں میں نے انہیں سے سنی ہیں۔

رائے نند لعل

رائے نند لعل کا عالیشان مکان دیوان محلّہ میں تھا۔ پٹنہ کے سر بر آوردہ رئیسوں میں تھے۔ ڈیڑھ دو لاکھ روپے کی سالانہ آمدنی زمینداری کی تھی۔ اسی لحاظ سے

شاہانہ اخراجات بھی تھے، عوام میں دادو دہش بھی تھی۔ عزیز و اقربا کے ساتھ حسن سلوک بھی تھا، متوسلین، مصاحبین اور ملازمین کی ایک بڑی فوج جلو میں موجود رہتی تھی۔ ان کے یہاں ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال نہ تھا بلکہ مسلمانوں کی ہی تعداد زیادہ نظر آتی تھی۔ سر شام صحبت جمتی تو شعر و سخن کا چرچا ہوتا، چٹکلے اور لطیفے بیان ہوتے ،گانے بجانے کی بات نکلتی تو صحبت میں پٹنہ کا باہر سے آیا ہوا کوئی گویا موجود ہی ہوتا، کچھ دیر گانے بجانے سے بھی تفریح ہو جاتی۔ داستان گوئی کا ذکر ہوتا تو ان کا اپنا داستان گو کوئی ٹکڑا داستان کا اپنے انداز بیان میں شروع کر دیتا۔ اس وقت ہر رئیس کے یہاں ایسی صحبتیں ہر روز برپا رہتیں۔ جن میں کھاتے پیتے ،شرفا، تجار اور ذی علم حضرات بھی شریک رہتے۔ کبھی کبھی کوئی رئیس بھی اپنے کسی ہم چشم رئیس کے یہاں پہونچ جاتا۔ ایسے اگر دو چار رئیس اکٹھا ہو جاتے تو پھر اس صحبت میں زلزلہ آجاتا۔ یہ رؤسا اگر کسی صحبت میں ایک جا جمع ہو جاتے تو آپس میں ایسی چٹکیاں لیتے کہ صحبت کشت زعفران بن جاتی۔ رائے نند لعل کے قریبی دوستوں میں نواب لطف علی خاں تھے۔ یہ پٹنہ کے بہت بڑے دولت مند رئیس اور مہاجن بھی تھے۔ انکی مہاجنی کا کاروبار ملک کے بیشتر حصوں میں پھیلا ہوا تھا۔ راجہ مہاراجہ نوابان ان کے مدیون رہتے تھے لاکھوں لاکھ کا کاروبار تھا۔ رائے نند لعل کی دادو دہش اور ان کے اخراجات کبھی انکی آمدنی سے زیادہ ہو جاتے تو یہ اپنے دوست نواب لطف علی خاں سے قرض لے لیتے ۔ بہت دن ہوئے کچھ اگلے لوگوں سے رائے نند لعل کا ایک لطیفہ سنا تھا۔ یہ بڑا پر لطف لطیفہ ہے۔ ایک دن رائے نند لعل اور دو چار رئیس نواب سید لطف علی خاں مرحوم کے یہاں کی صحبت میں موجود تھے۔ بات ادھر ادھر سے ہوتی ہوئی مذہب پر نکل آئی۔ رائے نند لعل نے کہا کہ بھائی ،میرا کیا! مجھے اپنا حشر معلوم ہے۔ گناہ گار ازلی ہوں۔ مروں گا تو سیدھا جہنم میں جاؤں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جہنم میں عذاب ہے۔ ہر طرف آگ بھڑک رہی ہے، گنہ گار ایندھن بنے جل رہے ہیں۔ پانی سے گرم گرم

بھپارے اُٹھ رہے ہیں، گناہ گار پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ وہی گرم پانی پینے کو ملا اور انہوں نے مجبوری میں پی لیا، بس پھر کانوں اور منہ کے ساتھ ساری انتریاں بھی پانی کی حدت سے پگھل کر بہ نکلیں۔ پھر رائے نند لعل اپنے دوستوں کی طرف مخاطب ہو کر یہ بولے کہ سب کچھ سہی، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھیئے کی سارے ارباب نشاط بھی تو وہی ہونگے وہ قتالہ عالم طوائفیں، جن کی ذرا سی مسکراہٹ پر لوگ دین وایمان نثار کر دیتے ہیں، وہ بھی تو وہاں ہوں گی۔ جگہ جگہ ارباب نشاط کا مجمع ہوگا، طبلے ٹھنک رہے ہوں گے ۔ تانیں اڑ رہی ہوں گی۔ ایک طرف نگینہ بائی کے مالکوس کا گانا غضب ڈھا رہا ہوگا، دوسری طرف تارا بائی کی رسیلی آواز میں مینا کی توڑی قیامت برپا کر رہی ہو گی۔ نتھو خاں کی سارنگی سے نکلتے ہوئے بول گانے والے کو سہارا دے رہے ہوں گے ۔ جوگیشہ مہاراج کے طبلوں کی تھاپ کے ساتھ ساتھ تانیں اوراوپر اُٹھتی جارہی ہوں گی۔ میں کبھی اس ٹولی میں جا پہونچونگا، گانا سنوں گا، گانے والی کو بڑھ بڑھ کر چھوٹ دوں گا۔ پھر آگے بڑھ کر دوسری ٹولی میں جا پہونچوں گا وہاں کے پر کیف گانے سے جی خوش ہوگا۔ فرط انبساط میں دل کھول کر وہاں بھی خوب خوب چھوٹ دوں گا۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے رائے نند لعل کے ایک دوست نے پوچھا "یہ تو بتایئے رائے صاحب کہ جنہم میں روپئے آپ کہاں سے لائیں گے کہ خوش ہو کر چھوٹ پر چھوٹ دیا کریں گے۔ رائے صاحب نے مسکرا کر لطف علی خاں کی طرف دیکھا اور پوچھنے والے سے کہا کہ "یہ بھائی صاحب بھی تو ساتھ ہی ہوں گے۔ ان سے قرض لوں گا اور ارباب نشاط کو چھوٹ دوں گا"۔

سب لوگ اس لطیفے پر کھلکھلاکر ہنس پڑے اور نواب صاحب بھی جھینپ کر مسکرادیئے دیکھیئے یہ تھا وہ گنگا جمنی سماج جس میں سب کچھ تھا جو متحدہ قومیت اور قومی یک جہتی کے لئے چاہیے۔

بابو ہیرا لعل

منگل تالاب کی چمن بندی، اس کا انتظام اور اس کی دیکھ بھال یہ سب کام مرتے دم تک بابو ہیرا لعل کے تعلق رہے۔ ایک زمانے میں چوک شکار پور کے قریب گنجان محلوں میں گڑھی تھی جس میں برسات کے دنوں میں ہر طرف سے آکر نالے گرتے تھے۔ اور یہ گندی گڑھی لاکھوں مچھڑوں کی پیدائش اور پرورش گاہ تھی سر منگلیس جب پٹنہ میں سیٹی مجسٹریٹ ہو کر آئے تو یہاں کے لوگوں نے ان کی توجہ اس گڑھی کی طرف دلائی جو شیخ مٹھا نامی ایک صاحب کے نام سے موسوم ہوا شیخ مٹھا کی گڑھی کہلاتی تھی۔ مسٹر منگلیس نے حقیقتاً بڑا کام کیا اس گڑھی کو اچھا خاصہ بڑا سا پیچ کھاتا ہوا تالاب بنوا دیا۔ آس پاس کی زمین حاصل کر کے تالاب کے چاروں طرف سڑکیں نکلوائیں۔ اور ان سڑکوں کے بعد بھی ہر طرف جو کافی زمینیں بچ رہیں ان میں باغ اور چمن لگوائے۔ اس طرح ایک بیضادی شکل کا پارک جس کے وسط میں نصف میل کے دائرہ کا بیضادی تالاب بھی ہے، پٹنہ سیٹی میں بن کر تیار ہوا جو نالے اس گڑھی میں گرا کرتے تھے ان کی نکاسی پختہ نالوں کے ذریعہ کی گئی۔ یہ تالاب "منگل تالاب" کہا جانے لگا اور اس کی دیکھ بھال بھی میونسپلٹی نے انھیں کو سونپ دی تھی اور یہ بھی دلچسپی کے ساتھ اس کا انتظام کرتے تھے۔ صبح کو بھی جاتے اور شام کو بھی وہاں موجود رہتے۔ مالیوں اور مزدوروں کی کمی نہیں تھی۔ خوب صورت روشیں نکلواتے۔ درختوں، شاخوں، کو چھٹوا کر حسین بنواتے۔ اور نئے نئے قسم کے پھول اور درخت لگواتے۔ جب منگل تالاب کی شہرت بڑھی اور یہ اچھی خاصی تفریح گاہ بن گیا تو یہاں کے چند معزز لوگوں نے اس حلقہ میں ایک کشادہ زمین پر ایک کلب کی بنیاد بھی رکھی۔ ان دنوں ہیوز یہاں کے سیٹی مجسٹریٹ تھے یہ کلب انہیں کے نام پر موسوم ہوا۔ چند دنوں بعد اسی کلب میں ساتھ ہی ساتھ ایک کتب خانہ بھی قائم ہوا۔ ان سب کاموں میں بادشاہ نواب صاحب مرحوم، منجھلے نواب صاحب مرحوم خورشید نواب صاحب مرحوم، میرے والد

خاں بہادر سید ضمیر الدین احمد صاحب مرحوم، خاں بہادر شاہ کمال صاحب مرحوم، ہیرا لعل صاحب مرحوم اور خاں بہادر سرفراز حسین خاں مرحوم آگے آگے تھے۔

بابو ہیرا لعل کو سیاست اور رفاہ عام کے کاموں سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ اسی شوق میں اپنی تعلیم بھی نامکمل چھوڑی اور اپنے آبائی سونے چاندی کے روزگار کو بھی پٹنہ میں میونسپلٹی قائم ہو چکی تھی اس لئے یہ پارک اور تالاب میونسپلٹی کے انتظام میں دیئے گئے اور اس وقت سے منگل تالاب پٹنہ کی ایک فرحت بخش عام سیر گاہ قرار پایا۔ پٹنہ میں کوئی سیر گاہ نہ تھی۔ جب یہ سیر گاہ بن کر تیار ہوئی تو شام کی تفریح کے لئے امیر و غریب دونوں کو صاف شفاف ماحول میں سانس لینے کی گنجائش بھی نکل آئی۔ یہاں کے بڑے چھوٹے رئیس ہر شام کو گھر سے نکل کر چوک کا نظارہ دیکھتے ہوئے اپنی فٹن اور لینڈو گاڑیوں میں منگل تالاب پہونچ کر دو چار دفعہ تالاب کا چکر لگاتے، اپنی گاڑیوں سے اتر کر پارک کی چمن بندی کا لطف اٹھاتے اور پھر رات ہوتے ہوتے گھر پہونچ جاتے بعض نوجوان رئیس زادے یہاں آکر گھوڑوں پر شہسواری کی مشقتیں بھی کرتے، یہاں جب ہیوز کلب قائم ہوا تو کلب میں اخباروں اور رسالوں کے علاوہ کھیل و تفریح کے سامان بھی تھے۔ کلب کے ممبران یہاں تاش و گنجفہ بھی کھیلتے۔ بلیئرڈ (انٹا) کھیلنے کا سامان بھی یہان موجود تھا۔ کچھ لوگ جو بلیئرڈ کے دلدادہ تھے وہ یہاں بلیئرڈ کھیلتے۔

بابو ہیرا لعل پٹنہ سیٹی میونسپلٹی کے ممبر تھے اور اپنا سارا وقت یہاں کے رفاہ عام کے کاموں میں دیتے رہتے تھے۔ خیریت تھی کہ باپ دادا کی کمائی کے پس ماندہ روپے گھر میں تھے جو کسی نہ کسی صورت سے آخر دم تک کام دیتے گئے۔ پہلی دفعہ میونسپلٹی کے انتخاب میں کھڑے ہوئے تھے تو ووٹوں کی بڑی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے اور کامیاب ہوئے، پھر تو اس کا چسکہ ایسا لگا، کہ برابر انتخابات لڑتے رہے اور کامیاب ہوتے رہے، اپنے علاقہ میں بڑے ہر دل عزیز تھے اور کیوں نہ

ہوتے، ہر شخص کی خدمت کے لئے ہمہ دم تیار رہتے۔ کسی کی انگلی بھی دکھتی، تو دن میں دو دفعہ جا کر خود اس کی خیریت پوچھتے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہر تہوار میں برابر کا حصہ لیتے۔ شادی بیاہ میں ایسے گھلے ملے رہتے کہ معلوم ہوتا کہ یہی صاحب تقریب ہیں صبح اٹھ کر اپنے حلقہ انتخاب کا بلاناغہ دورہ کرتے۔ امیر غریب سبھوں کے گھر جاتے میونسپلٹی کے متعلق ان کی شکایت سنتے اور جو کچھ ان سے ممکن ہوتا ان شکایتوں کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے، یہی وجہ تھی کہ ان کے علاقہ انتخاب سے ان کے مقابلہ میں کسی کو کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور اپنی زندگی کے آخری دنوں تک یہ بلامقابلہ میونسپل کمشنر چنے جاتے رہے۔ اسکول میں انگریزی جو تھوڑی بہت حاصل کی تھی اسی کے بل بوتے پر انگریزی حکام سے انگریزی میں گفتگو کرنے کا شوق بھی تھا۔ مجھے اپنے بچپن کے زمانے کی بات یاد ہے کہ والد مرحوم کے یہاں اکثر آتے تھے اور جو کچھ انگریز حکام سے ان کو گفتگو کرنی ہوتی تھی اس کی انگریزی بنوا کر لے جاتے تھے۔ کبھی کبھی دھوتی پہنتے تھے مگر شیروانی، اونی فلٹ کیپ، پائجامہ یا پتلون زیادہ تر ان کے لباس ہوتے، پان خوب کھاتے تھے، پان سے منہہ بھرا ہوا، ساتھ ہی ساتھ ایک سیاہ چُرٹ لبوں سے لٹکا ہوا، چہرے پر داڑھی مونچھیں صاف جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔

سچ پوچھئے تو ان ہی کے دم سے منگل تالاب کی رونق اور وہاں کے پارک کی بہار بھی تھی۔ ان کے بعد منگل تالاب کی چمن بندی اور باغ پر خزاں آتی گئی۔ کچھ دن قبل کی بات ہے کہ اسی منگل تالاب کے پارک میں دھوبیوں کے گدھے چرتے نظر آتے تھے اور اسی کی باغ کے درختوں کے سائے میں ڈوم اور خاک روبوں کی ٹولیاں تاڑی کے گھڑوں کے درمیان مست دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ دنوں سے منگل تالاب "گاندھی سرودر" کہلاتا ہے۔ خدا کرے گاندھی جی کے نام پر اس طرح کی قسمت بھی پلٹ جائے۔

ہیوز کلب بھی نئے انقلابات کی زد میں آیا اور اجنبی ہاتھوں میں پہونچ کر ہتیشی لائبریری بن گیا۔ بابو ہیرالعل کی ذات سچ مچ متحدہ قومی تہذیب کی وہ اصلی تصویر تھی جسے اب دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ان کا انتقال ہوا اور اپنے وقت کی بہت کچھ برکتیں اپنے ساتھ لیتے گئے۔

بابو دامودر پرشاد

پٹنہ میں جو کچہری سیٹی کورٹ کے نام سے مشہور ہے،اس کے نزدیک سڑک پر تھوڑی دور دکھن جاکر ایک عالی شان حویلی کے مٹے مٹے کچھ نشانات ملیں گے۔اس حویلی کی نیو کی اینٹیں بھی اب بک چکی ہیں۔اس کے اندرونی احاطہ کی زمین بھی حد بندی کی دیواروں کے ٹوٹ جانے کے سبب سے اب سڑک کے برابر آگئی ہے۔اور پورے مکان کا حصہ اور اس کی ملحقہ زمین بھی غیر مسطح میدان بن کر رہ گئی ہے۔میرے ہوش کی بات ہے جب میں نے اس غیر مسطح زمین پر اصلی عالی شان عمارت دیکھی تھی جس کے آگے بڑا صحن تھا،جس میں خوبصورت چمن بندی تھی اور اس چمن کے چاروں طرف سرخی کوٹی ہوئی سڑک تھی۔مکان کے داخلے کے لئے جو بڑا پھاٹک تھااس کے دونوں طرف دربانوں کے بیٹھنے اور رہنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی جس میں متعدد دربان بیٹھے رہتے تھے یہ چالیس پیتالیس برس قبل کی بات ہے جب یہ عالیشان عمارت قائم تھی۔یہی بابودامودر پرشاد کا رہائشی مکان تھاجہاں وہ اپنے خدام و حشم کے ساتھ رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے۔میں نے بابو دامودر پرشاد کا آخری زمانہ دیکھا ہے۔رہن سہن اور نشست و برخاست میں وہی یکسانیت تھی جو یہاں کے مسلمان اور ہندو رئیسوں میں دیکھی جاتی تھی۔پہلوان جیسا پلا ہوا بدن،رنگ سیاہی مائل،مگر اس پر وجاہت برستی تھی۔یہ تو مسلم امر ہے کہ ہندو رئیس کی تعلیم اردو فارسی ہی میں ہوتی تھی۔دامودر بابو اردو فارسی سے اتنا ہی آشنا تھے جتنا ایک مسلمان ہوتا تھاان کے گھر کے مدرسہ میں جو مولوی صاحب نوکر تھے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو پڑھاتے

تھے۔ملازمین میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے۔دامودر بابو اپنے مذہب کے بھی بڑے پابند تھے۔صبح کو اٹھتے تو سب سے پہلے نہادھو کر اپنے گھر کے مندر میں جاتے۔پھر پوجاپاٹ سے فارغ ہوتے تو سیدھے اپنے کمرے میں جاکر ناشتہ کرتے، کپڑے بدلتے اور پھر مکان کے عالی شان سائبان میں پہنچتے جہاں ان کے ملاقاتی ملنے کو آتے، یہیں گپیں ہوتیں، تفریح و مذاق ہوتا۔یہیں دوستوں کے مجمع میں یہ دو گھنٹے گزارتے۔اس کے بعد ان کی سرشتہ زمینداری کے ملازمین بغل میں بستہ دبائے ہوئے پہونچتے۔ساتھ ہی ساتھ ان کی زمینداری کے رعیت لوگ بھی آکر اپنی اپنی عرضداشت پیش کرتے۔ یہ عرض داشتوں پر اپنے احکامات لکھواتے، کار مصاحبین اور قریبی دوست رہتے۔ اسی درمیان میں آس پاس اور محلے کے لوگ کبھی جھگڑا لے کر تصفیہ کے لئے ان کے پاس آجاتے، ہندو اور مسلمان دونوں کو ان پر بھروسہ تھا۔

بابو دامودر پرشاد آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر تھے۔ایک دفعہ ان کے اجلاس میں ایک مقدمہ آیا۔ مدعی مسلمان تھے اور مدعاعلیہ ہندو تھے۔ دونوں فریق اپنے دعوے کو مضبوط سمجھ رہے تھے، مگر عام طور سے مسلمانوں کے دلوں میں یہ ڈر بھی تھا کہ بابو دامودر پرشاد جو خود بھی ہندو ہیں کہیں ان کے خلاف فیصلہ نہ دے دیں۔ غرض مقدمہ کی سماعت ختم ہوئی اور فیصلہ کی تاریخ دو چار دنوں بعد رکھی گئی۔ جب فیصلہ کا دن آیا اور بابو دامودر پرشاد نے فیصلہ سنایا تو مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی کیونکہ مسلمان مقدمہ جیت گئے تھے۔ بابو دامودر پرشاد نے صرف فیصلہ ہی نہیں دیا بلکہ دونوں فریقوں کو شام کے وقت اپنے یہاں آنے کی دعوت بھی دی۔ شام کا وقت ہوا اور جب دونوں فریق ان کے گھر پہونچے تو ہندوؤں کے لئے الگ اور مسلمانوں کے لئے الگ ناشتہ کا سامان موجود تھا۔ دونوں فریقوں نے ناشتہ کھایا اس کے بعد بابو دامودر پرشاد نے خلوص و محبت کی باتیں کر کے دونوں فریقوں کو گلے ملوادیا۔

عید بقرعید کے موقعہ پر اپنے کل مسلمان دوستوں کے یہاں جاتے اور ساتھ

میں پھلوں اور مٹھائیوں کے خوان ہوتے۔ عید کی مبارک باد دیتے بھی اور لیتے بھی۔ اس دن ان کے یہاں بھی گھر کے سب لوگ صاف ستھرا کپڑا پہن کر بیٹھتے، مکان کو سجاتے کیوں کہ ان کے یہاں بھی مسلمان عید ملنے کو آتے۔ یہ اپنے ہندو اور مسلمان ملازموں کو عیدی بانٹتے ان ہی گھر میں یہ بات مخصوص نہ تھی بلکہ عام طور پر ہر صاحب مقتدرت ہندو کے یہاں یہی ہوتا۔ دیوالی اور ہولی میں بغیر مسلمان دوستوں کے جشن نہیں منایا جاتا تھا۔ دامودر پرشاد اپنا زمانہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ گزار کر چلے گئے۔ ان کے مرنے کے بعد اس گھر میں گھن لگنا شروع ہوا اور آج تو نہ ان کی حویلی کا نشان ہے اور نہ ان کی اگلی خاندانی وجاہت باقی ہے۔

بابو دامودر پرشاد کی مسلم دوستی کا ایک قصہ سنئے۔ ان کے ایک مسلمان دوست کے لڑکے کی شادی تھی۔ یہ دوست بھی ایک رئیس تھے، مگر ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ شادی میں بابو دامودر پرشاد کی حیثیت لڑکے کے باپ ہی کی طرح تھی۔ بارات نکلی تو دولہا کے گھوڑے کی لگام تھامے دولھا کو لے کر دلہن کے گھر تک آئے۔ شادی کی تقریب کئی دنوں چلتی رہی۔ بابو دامودر پرشاد نے ان دنوں اپنے دوست کے گھر ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ یہیں رہتے اور یہیں شادی کے انتظامات کرتے۔ ان کے ملازمین بھی کام کرنے کے لئے موجود رہتے۔ شادی کا انتظام اس خوش اسلوبی سے انہوں نے کیا تھا کہ یہ محسوس ہی نہ ہو سکا کہ دولھا کے باپ موجود نہیں ہیں۔ جب شادی ختم ہوئی، تو انہوں نے اپنے دوست کی بیوی کو مبارک باد کہلا بھیجی، اور دُلہن کے لئے ایک مرصّع زیور بھی بھیجا۔

اپنے محلے میں انھوں نے کئی مکتب قائم کئے تھے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں تعلیم پاتے تھے، بلور گنج کے سپر اور تعزیہ اور وہاں کا اکھاڑہ انھیں کی فیاضی اور عقیدت کی بدولت محرم میں بڑے تزک و احتشام سے نکلا کیا۔

اب ان کی مذہبی رواداری کا ایک واقعہ بیان کر کے ان کا تذکرہ ختم کرتا ہوں

۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں آریہ سماجیوں کی سرگرمیاں پٹنہ میں بھی تیز ہوگئی تھیں، جس سے یہاں کا امن و سکون بھی متاثر ہونے لگا۔ اس سال بقرعید کا زمانہ آیا تو شہر میں افواہیں گشت کرنے لگیں کہ ہندو مسلمانوں کے دو مخصوص محلوں پر حملہ کرنے والے ہیں، جہاں گائے کی مذبح زمانے سے قائم ہے۔ مسلمانوں میں سخت ہراس و پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ بقرعید کی رات محلہ بلور گنج میں بڑی بے اطمینانی سے کٹی۔ عین بقرعید کے دن علی الصباح مسلمان جب گھر سے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ بابو دامور پرشاد اپنے تمام لوگوں کو لے کر محلہ میں موجود ہیں۔ بابو دامودر پرشاد نے مسلمانوں کو تسلی دی، اور ڈھارس بندھائی کہ اگر ہندوؤں نے ان پر حملہ کیا تو یہ اپنے لوگوں کے ساتھ ہندوؤں کا مقابلہ کریں گے۔ اب مسلمان اطمینان کے ساتھ بقرعید کی نماز پڑھیں، گھر پر خوشیاں منائیں اور اپنے عقیدے کے مطابق قربانیاں کریں بجنہٖ اسی طرح پٹنہ کے ایک دوسرے محلہ کے رئیس بابو بھگت نرائن سنگھ نے محلہ بیگم پور میں جاکر مسلمانوں کو تسلیاں دیں کہ وہاں کی بقرعید بھی بڑے امن اور چین سے گذری۔

پٹنہ کی چند ناقابلِ فراموش شخصیتیں

ہر ملک میں، ہر صوبہ میں اور ہر علاقہ میں چند شخصیتیں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو ان کے گذرنے کے بعد بھی ذہنوں میں محفوظ رہ جاتی ہیں اور کچھ اپنا نقش بھی ماحول پر چھوڑ جاتی ہیں جو ان کی یادگار بن کر آنکھوں کے سامنے باقی رہتی ہیں۔ پٹنہ میں بھی ایسی شخصیتیں ابھر کر منظر عام پر آئیں۔ انہوں نے بہت کچھ مقصدِ حیات کو بھی سمجھا، اپنے ماحول کو بھی سنوارا، زندگی کی ہماہمی میں بھی حصہ لیا اور سبھوں کے ساتھ مل کر اس سماج کو بھی استوار کیا، جو ان کے بزرگوں سے ان کو وراثت میں ملا تھا آج ان کے حالات کو پڑھ کر اگر کوئی ان حالات کو سرودِ بے ہنگام کہے تو یہ دوسری بات ہے، مگر ایسا کہنے والا اس سے انکار نہیں کر سکتا، کہ ایسی شخصیتیں پہلے بھی جاذبِ نظر ہی ہیں اور آج بھی ان کے قصے اور حالات جاذبِ نظر ہیں۔

عام طور پر ان بلند شخصیتوں کے کارنامے قوم و ملک پر وہ احسانات ہیں جن کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ پھر اگر غور سے دیکھا جائے تو ان بلند و بالا شخصیتوں میں دو قسم کی شخصیتیں ملیں گی۔ ایک تو وہ جنہوں نے قومی ضروریات میں ایک ضرورت کو چن لیا اور اس کو پورا کرنے میں اپنا وقت، اپنا سرمایہ اور اپنی کوششیں وقف کر دیں۔ ان ہی شخصیتوں میں ایک شخصیت جناب خاں بہادر خدا بخش خاں، سی آئی، ای بانی خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کی تھی۔ دوسری شخصیت مسٹر سید نورالہدیٰ سی، آئی، بانی مدرسۂ عربیہ شمس الہدیٰ کی تھی۔ تیسری شخصیت بابو بشیشر سنگھ وکیل اور زمیندار موضع کلہڑھیا کی تھی جن کی فیاضی اور الوالعزمی سے بہار نیشنل کالجیٹ اسکول اور بہار نیشنل کالج پٹنہ میں قائم ہوئے۔ ان کے علاوہ سر گنیش دت سنگھ سابق منسٹر بہار گورنمنٹ کی شخصیت تھی انہوں نے قوم کے افراد کے لئے ایک بڑی جائیداد وقف کر دی ہے۔ پٹنہ کی دو مخیّرہ خاتونوں میں ایک امام باندی بیگم صاحبہ مرحوم کا نام آج بھی احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انھوں نے مسجد، امام باڑہ اور مدرسہ قائم کر کے تقریباً ایک لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی ان کے اخراجات کے لئے وقف کر دی۔ دوسری مخیّرہ خاتون مسماۃ بی بی محمدی جان نے ایک بڑی عالیشان مسجد پٹنہ میں بنوائی جس سے ملحق مسافروں کے لئے مسافرخانہ بھی ہے اور ایک بڑا مدرسہ بھی ہے۔ پہلے مسافروں کو تین دنوں تک مفت کھانا بھی ملتا تھا اور بڑے پیمانے پر مسلمان بچوں کو تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مسماۃ بی بی محمدی جان مرحومہ نے ان سب کر اخراجات کے لئے اپنی ساری جائداد وقف کر دی، جن کی آمدنی بھی ہزاروں روپے سالانہ کی ہے۔ بے شک یہ شخصیتیں محسناتِ قوم ہیں۔

دوسری بڑی ہستیاں وہ ہیں جنہوں نے ہر شعبۂ زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل میں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ ہر قومی تحریک میں شریک رہے اور یہاں کی سیاسی، علمی ادبی، تعلیمی، ثقافتی اور سماجی تحریکیں ان ہی کے دم سے چلتی رہیں اور ان ہی کے خلوصِ خدمت کی بدولت یہاں کی انجمنوں میں روشنی رہی۔

ایسی ہی چند شخصیتوں کا تذکرہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رائے رادھا کرشن

جناب رائے رادھا کرشن پٹنہ میں ان چند باقیات الصالحات میں سے تھے جن سے پٹنہ میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان برادری اور خلوص محبت کا رشتہ استوار تھا۔ ان کا گھر گنگا جمنی سماج کا وہ منظر پیش کرتا تھا، جس کی ایک جھلک بھی اگر آج نظر آجائے تو لوگ اس کو فردوس نگاہ سمجھیں۔ ان کا خاندان شہنشاہ اکبر کے زمانے سے ہی ہندوستان کے معزز خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ گوڑ گاؤں سے یہ خاندان دہلی میں منتقل ہوا اور خاندان کے ایک فرد رائے رام پرتاپ، جن کے نام کے آخر میں اکبر کی حکومت کے زمانے میں عالی خاندان کا لقب بھی جوڑ دیا گیا تھا، وہی اصل بانی خاندان تھے۔ شاہی دربار میں ان کی بڑی وقعت تھی، شہنشاہ اکبر نے خاص طور پر ان کو نسلاً رائے کے خطاب سے بھی نوازا۔ جس وقت عالی خاندان کا ان کا لقب ملا تھا، صوبہ بہار یوپی اور بہار میں بھی فرمان شاہی کے ذریعہ ان کو بڑی بڑی جاگریں ملیں تھیں۔ یہی نہیں بلکہ شہنشاہ اکبر نے ان کو بڑے بڑے زمردوں اور یاقوتوں کا ایک مرصع ہار بھی عطا کیا تھا۔ ان بیش بہا جواہرات پر شاہی مہریں کندہ تھیں۔

رام رائے پرتاپ کے بعد ان کے جانشین راجہ اندر مان دربار مغلیہ میں دیوان کے معزز عہدے پر فائز رہے۔ ان کی علمی صلاحیت اور وفاداری کی بنا پر ان کو راجہ کا خطاب شاہی دربار سے ملا اور مزید انعام و اکرام میں اضافہ ہوا۔ ان کے صاحب زادے راجہ خیالی رام کا زمانہ شاہان مغلیہ کے انحطاط کا زمانہ تھا مگر انہوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ شاہان دہلی اور انگریزوں کے درمیان مصالحت پیدا کی۔ اس وقت انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا جب بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی شاہ عالم کی طرف سے لارڈ کلائیو، کو تفویض ہوئی، تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے راجہ خیالی رام کو بہار کا نائب صوبہ دار بنایا اور لارڈ کلائیو نے ان کو راجہ بہادر کا خطاب دیا اور شاہ عالم سے استدعاء کی قطعہ الہ آباد کی جاگیر راجہ بہادر خیالی رام کو واپس کر دی جائے اور اس طرح راجہ بہادر خیالی

رام نے پٹنہ میں آکر، کچھ دنوں بعد جب صوبہ بہار کے انتظامات میں گڑبڑی شروع ہوئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے راجہ بہادر خیالی رام اور مہاراجہ کلیان سنگھ کے ساتھ صوبہ بہار کا سالانہ ٹھیکا بعوض انیس لاکھ اکیس ہزار ایک سو نوے روپے کر دیا۔وارن ہیسٹنگس پر برطانوی پارلیمنٹ میں مقدمہ چلنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی بھی بدلی اور صوبہ بہار پھر پورے طور پر کمپنی کے انتظام میں آگیا اور ٹھیکہ داری ختم ہو گئی سرکاری کاغذ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے یہاں راجہ بہادر خیالی رام کی بڑی قدرو منزلت تھی،اسی بنا پر کمپنی نے بذریعہ مقرری استمراری پرگنہ بلیا اور سنڈا راجہ بہادر خیالی رام کے نام مقرری کر دیا تھا۔

راجہ بہادر خیالی رام جب پٹنہ آئے تو اپنے ساتھ ایک مسلمان درویش شاہ عبدالمنان عرف منا شاہ کو بھی لائے۔راجہ بہادر خیالی رام کو ان سے بے حد عقیدت تھی۔یہ عمر بھر راجہ بہادر خیالی رام کے ساتھ رہے اور جب ان کا انتقال ہوا تو پٹنہ ہی میں ان کی تجہیز و تکفین ہوئی۔

یہاں پٹنہ میں بھی راجہ خیالی رام کے گھر میں محفلیں ایسی ہوتی تھیں جیسے کوئی چھوٹا موٹا شاہی دربار لگا ہو۔ان کے گھر کی نشست و برخاست اور گفتگو میں مسلمان عمائدین کے گھروں سے کوئی فرق نہ تھا۔یہ تو بہت دور کی بات تھی کہ کسی کے ذہن میں ہندو اور مسلمان کا سوال کبھی پیدا ہوا۔پٹنہ کی عید گاہ کی تعمیر میں بھی راجہ بہادر خیالی رام کا بڑا حصہ تھا۔اسی طرح سے راجہ بہادر خیالی رام کے متعلق یہ بات سبھوں کی زبان پر تھی کہ۔

اک طرف کفر اک طرف اسلام ادھر منا اُدھر خیالی رام

راجہ بہادر خیالی رام کی چوتھی پشت میں دو بھائی یعنی رائے بہادر رائے جے کرشن اور رائے بہادر رادھا کرشن گذشتہ دور میں بہت مشہور اور صاحب وجاہت گزرے ہیں۔رائے بہادر رائے جے کرشن اپنے بھائی کے سامنے انتقال کر گئے۔ان

کے صاحب زادے رائے وجے کرشن پہلے ہی گزر چکے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو اپنے دو یتیم پوتوں رائے برج،راج کرشن اور رائے گوپال کرشن کو چھوڑ گئے جن کی سر پرستی اور دیکھ بھال رائے رادھا کرشن کرتے رہے۔چونکہ رائے رادھا کرشن خود لاولد تھے اس لئے اور بھی ان یتیموں کے ساتھ ان کی محبت بڑھی ہوئی تھی۔عام طور پر لوگ یہی جانتے تھے کہ رائے برج،راج کرشن اور رائے گوپال کرشن رائے بہادر رادھا کرشن کے اپنے پوتے ہیں۔رائے برج راج کرشن تو وکالت پاس کر کے کچھ دن کچہری کے چکر لگاتے رہے، مگر طبیعت میں آزادی کی ہوا سمائی ہوئی تھی اس لئے ملکی سیاست میں حصہ لینے لگے ،اس کے بعد برسوں مجلس قانون ساز کے ممبر رہے ،میں بھی اس وقت بہار لجسلیٹو اسمبلی کا ممبر تھا۔اکثر میں،نواب زادہ سید محمد مہدی اور رائے برج راج کرشن قانون ساز اسمبلی ساتھ ہی جاتے تھے۔اس کے بہت قبل رائے رادھا کرشن انتقال کر چکے تھے۔اس کے بعد رائے برج راج کرشن بہار لجسلیٹو کانسل کے چیر مین منتخب ہوئے اور بہت دنوں تک رہے۔رائے گوپال کی طبیعت جداگانہ تھی ان کو انگریزی علم وادب سے بڑا شوق تھا۔اسکول اور کالج میں اگرچہ یہ مجھ سے دو کلاس آگے تھے، مگر چونکہ مجھ سے اسی زمانے کی دوستی تھی اس لئے ان کے ادبی مذاق سے واقف تھا۔پٹنہ کالج کے پروفیسر بنرجی ان کے بھی اور میرے بھی استاد تھے۔جب کبھی ساتھ ہو جاتا تو انگریز اور انگریزی داں کی زبان کی غلطیاں جو یہ پکڑتے وہ مجھے بھی بتاتے۔ایک دفعہ سر اسٹیفورڈ کرپس نے غلطی تو مان لی مگر جواب میں لکھا کہ انگلستان میں یہ غلطی اب غلطی نہیں سمجھی جاتی ہے چونکہ رائے برج رائے کرشن اور رائے گوپال کرشن کی تربیت گنگا جمنی سماج کے ماحول میں ہوئی تھی اس لئے دونوں بھائی فارسی خوب جانتے تھے اور بی اے تک کالج میں فارسی ہی پڑھی تھی ۔رائے گوپال کرشن نے دیوان غالب کو ہندی میں لکھا تھااور پھر مجھے پڑھنے کو دیا تھا۔چند برس ہوئے رائے برج راج کرشن کا انتقال ہوا۔یہ دو بیٹے رائے رام کرشن اور دنے کرشن کو چھوڑ گئے۔رائے گوپال کرشن کے

بیٹے رائے اودے کرشن ہیں جو ہائی کورٹ میں وکالت کرتے ہیں ۔ان کے خاندانی حالات باتفصیل ان ہی سے مجھے ملے۔

رائے رادھا کرشن پہلے اپنے عالی شان مکان میں رہتے تھے جو محلّہ متین گھاٹ کے قریب ہے۔ آخر عمر میں اپنے باغ کے مکان میں جس کا نام آنند باغ تھا اٹھ آئے تھے یہ باغ محلّہ متین گھاٹ میں ایک وسیع پستہ پر تھا۔اوپر یہ باغ اور نیچے دریائے گنگا کی روانی عجب بہار دیتی تھی۔ باغ میں داخلے کا جو خوبصورت بڑا دروازہ تھا اس سے ملحق کچھ دور تک ملازمین اور دربانوں کے لئے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ دروازہ سے اندر داخل ہو گئے تو کچھ سیڑھیاں طئے کرنے کے بعد باغ میں آجایئے ،خوبصورت مجسموں کے ہاتھوں میں روشنی کی قندیلیں،بائیں طرف رہائش کے کمرے اور سائبان ملیں گے سامنے کی وسیع زمین پر طرح طرح کے پھولوں کے تختے نظر کو ٹھنڈک پہنچائیں گے دائیں طرف اتر کی جانب بلند پشتے ،اس سے لگا ہوا دریا لہریں لیتا ہوا نظر آئیگا،دریا کی چوڑائی سامنے چار پانچ میل میں پھیلی ہوئی آنکھوں کے سامنے ہو گی جس سے گزر کر خشک اور جاں بخش ہوائیں آپ کو تھپکیاں دیں گی ۔ جاڑا، گرمی اور برسات ہر موسم میں یہاں لطف نظر آئے گا۔ آج بھی مکان وہی پھاٹک سے لگے ہوئے ملازم پیشے لوگوں کی جگہیں وہی، بڑے دروازے پر دربان وہی ، مگر باغ کے تختوں کی اگلی سی دیکھ بھال نہیں۔ پہلے رائے رادھا کرشن صاحب کے زمانے میں کیف نظر کے لئے اس سے بہتر چمن بندی کسی مکان میں نہ تھی۔ پہلے عیش و آرام کی دنیا تھی، آج کل کام کی دنیا ہے۔ کام کی دنیا میں فارغ البالی ہو تو ہو مگر وہ اطمینان قلبی اور لطف دماغی کہاں ۔اگر غم روزگار نہیں تو غم کاروبار ہے۔ کچھ کرو، نہیں تو دنیا اور دنیا کے لوگوں کے ساتھ فارغ البالی بھی منہ موڑلے گی ۔ایسے میں لطف نظر بھی پائندہ اور سکون قلب بھی دائمی نہیں ملتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ رائے رادھا کرشن صاحب کے زمانے کی باتیں انہیں کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ وہ بڑی آن بان سے اپنا زمانہ گزار گئے۔ دن رات حاشیہ نشیں موجود رہتے

جن میں داستان گو بھی، شاعر بھی، بذلہ سنج بھی اور گویے بھی، کچھ ہم بھی آجاتے۔ چونکہ سیدھے سادھے کیریکٹر کے بزرگ تھے اس لئے ہم نشینوں کی دلچسپ صحبتیں ہوتیں۔یاسامنے صحن میں لگے پھولوں کے تختوں کی سیر ہوتی ۔یہ بات بھی تھی کہ ہاتھ کھلاہوا تھا۔کوئی حاجت مند خالی ہاتھ واپس نہ جاتا تھا۔اس لئے اس حد تک اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے اور اپنے وقت کے رئیسوں کی طرح کچھ مقروض بھی رہتے۔اس کے باوجود قومی کاموں میں بھی اکثر اپنے وسائل سے زیادہ ہی خرچ کرتے تھے۔ان کے مشاغل کو دیکھ کر یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی تھی کہ رائے صاحب معاملات ملکی سے باہر رہتے تھے۔اس کی وجہ بھی تھی ان کے ملنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے۔کبھی کوئی بات چھڑ جاتی تو اس طرح حصہ لیتے جیسے کوئی باخبر پر جوش آدمی گفتگو کر رہا ہے۔رائے الفت رائے،جو دیوان محلہ کے رہنے والے اور پٹنہ کے ایک معزز رئیس سلطان بہادر اور بادشاہ بہادر کے قریبی رشتہ دار تھے ،وہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے،اس زمانے میں ہندی اور اردو کا قصہ چل رہا تھا۔یہ بات ایک دن رائے رادھاکرشن صاحب کی صحبت میں نکل آئی۔رائے رادھاکرشن صاحب بولے خدا سمجھے ان سے جو اردو اور ہندی کا جھگڑا نکال بیٹھے ہیں۔ہندی ہندوؤں کی زبان ہو تو ہو مگر وہ قوم کا مشترک کی سرمایہ تو نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہمارے اتحاد کا ڈھانچا کھڑا ہوا ہے اور جس کی بول چال میں فارسی اور عربی کی نزاکت و شیرنی اور سنسکرت کی صلاحیت اور لطافت اپنے قوم کا دل موہ لیتی ہے۔اور زبان کا قصہ کلکتہ کے فورٹ ولیم سے نکلا،یہ چکر انگریزوں نے ۱۸۰۴ء کے بعد چلایا، کہ اپنی گرفت ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں پر اور مضبوط کر لیں۔مگر افسوس ہے کہ پڑھے لکھے ہندی کے طرف دار اس بات کو نہیں سمجھتے مجھے تو خوف معلوم ہوتا کہ جس زبان کے اتحاد پر ہندوستان کی قومیت بنی تھی اگر یہ زبان کا اتحاد ٹوٹا تو کہیں ہندوستان بھی دو حصوں میں تقسیم نہ ہو جائے"

دیکھئے آج سے ستر برس قبل ایک سیدھے سادے پٹنہ کے رئیس نے کیسی

زبردست پیشین گوئی کی تھی۔

رائے صاحب کے پشتہ کی چمن بندی مشہور تھی۔اگرچہ میری عمر کم تھی۔مگر مجھے بھی خواہش تھی کہ اس چمن بندی کا لطف میں کسی دن ان کے یہاں جا کر اٹھاؤں۔شام کے وقت روزانہ کہیں ٹہلنے کے لئے دو ملازموں کے ساتھ کبھی منگل تالاب کبھی دریائے گنگا جاتا تھا۔ایک دن اپنے ساتھ روزانہ کی طرح دونوں ملازموں کو لے کر میں رائے صاحب کے خانہ باغ پہنچ گیا۔کیا خوب چمن بندی تھی۔میں لوٹ پوٹ ہو گیا جاڑے کا زمانہ ،گلاب کے پودوں میں کلیاں لگنی شروع ہو چکی تھی۔ انگریزی پھولوں سے تمام چمن بہشت زار بنا ہوا تھا۔ہلکی ہلکی خوشبو تمام پھیلی ہوئی تھی ۔باہر داخلہ کے دروازے پر متعدد دربان بیٹھے،اندر جانے والوں کے لئے روک ٹوک نہ تھی۔میں سیدھا اندر چلا گیاتھا۔سامنے پھیکی پھیکی دھوپ میں ایک سن رسیدہ بزرگ آرام، کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔دو چار اور آدمی پاس تھے۔انھوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا،پھر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ معلوم ہوا یہی رائے صاحب ہیں ،میں چمن میں ہر طرف ٹہلتا پھرا،چاہتا تھا یہاں سے نہ ٹلوں۔لب دریا بڑی بلندی پر ہے۔دریا میں چھوٹی بڑی کشتیاں آجا رہی ہیں۔کسی کو ملاح کھیتے ہوئے لے جا رہے ہیں ۔کسی کشتی کو، پچھم کی جانب گونج پر لے جا رہے ہیں ،کچھ بڑی کشتی پر بادبان لگا ہوا تھا۔وہ ہوا پر تیرتی ہوئی پورب کی طرف بڑھ رہی تھی۔گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی سیر کے بعد جو میں واپسی کے لئے دروازے کی طرف چلا،تو دیکھا کہ ایک شخص رائے صاحب کے پاس سے اٹھ کر میری طرف آرہاہے۔میں ذرا رکا تو وہ میرے پاس پہنچ گیا اور مجھ سے کہا ”بابو!آپ کو سرکار بلا رہے ہیں “۔میں سمجھ گیا،رائے صاحب نے بلا بھیجا ہے،ان کے پاس پہنچا تو مودبانہ میں نے سلام کیا۔رائے صاحب نے دعا دی ”جیتے رہو“۔پھر پوچھا ”آپ کے والد کا نام؟“میں نے عرض کیا۔”سید ضمیر الدین احمد۔وہ صدر گلی میں رہتے ہیں“۔ یہ سنا تو لڑکھراتے ہوئے آرام کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔دونوں ہاتھ پھیلا دئے۔ اور مجھے بھینچ بھینچ کر گلے لگایا اور کہنے لگے۔”تمہارے والد میرے عزیز دوست میر احمد

حسین مرحوم کے داماد ہیں۔ میں اس رشتہ سے تمہارا نانا ہوا۔" پھر پوچھا، "کیا اپنے والد کو کہے بغیر آئے ہو؟" میں نے ڈرتے ڈرتے ہاں کہی۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں یہاں آنے کی والد صاحب مرحوم کو خبر نہ ہو جائے۔ کہنے لگے "ہم سب شریفوں کے گھر یہ بات بتلائی جاتی ہے کہ بغیر والدین کی اجازت کے گھر کے باہر نہیں جانا چاہیے۔ خیر یہ تو تمہارا گھر ہے، جب جی چاہے چلے آیا کرو۔" پھر مسکرا کر بولے "۔ یہاں کی چمن بندی دیکھنے کو آئے تو گلاب کے درختوں کا ساٹا تیار ہے، جتنے درکار ہیں لے جاؤ"۔ میں نے چار پانچ اچھے گلابوں کے ساٹے ان کے مالی سے لئے۔ چلنے لگا تو سلام کرنے کے لئے رائے صاحب کے قریب آیا تو انھوں نے پوچھا کہ جا رہے ہو؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں" چلتے وقت کہا، کہ والد صاحب سے ضرور کہنا کہ تم یہاں آئے تھے اور میری دعاء اور سلام بھی ان سے کہنا۔" گھر پہنچا تو تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے والد صاحب مرحوم سے عرض کیا کہ آج میں رائے صاحب کے گھر ان کے خانہ باغ کو دیکھنے گیا تھا۔ انہوں نے آپ کو سلام و دعاء کہی ہے۔ والد صاحب مرحوم نے کہا کہ تم بغیر کہے چلے گئے۔ اگر تم مجھ سے کہہ کر جاتے تو میں مختار صاحب کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا اور رائے صاحب تم سے بہت اخلاق سے ملتے میں نے کہا کہ یہ تو ہو چکا۔ پھر سب واقعہ بیان کیا۔ والد صاحب نے کہا کہ بے شک وہ میرے اور تمہارے دونوں کے بزرگ ہیں۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ ایک پیادے کے ہمراہ ایک کہار بہنگی پر دو بڑے خوانچے لایا۔ پیادہ نے ایک خط والد صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے خط پڑھا تو مجھے بلایا اور کہنے لگے "لو میاں! یہ طرح طرح کی مٹھائیاں اور ہر قسم کے پھل رائے صاحب نے تمہارے لئے بھیجے ہیں"۔ رائے صاحب نے خط میں لکھا ہے کہ "تمہارا لڑکا آیا تھا۔ تھوڑی سی مٹھائیاں اور کچھ پھل اس عزیز کے لئے بھیج رہا ہوں"۔

کیا زمانہ تھا، کیسے کیسے ہم لوگوں کے بزرگ تھے۔ ذرا سی ترمیم کے ساتھ یہ شعر ایسے ہی لوگوں پر صادق آتا ہے

یاد گار زمانہ تھے یہ لوگ   یاد رکھیو فسانہ تھے یہ لوگ!

بادشاہ نواب صاحب مرحوم

ان کا اصل نام تو سیّد محمد مہدی حسن خاں تھا مگر بادشاہ نواب کہلاتے تھے۔ پھر یہی نام لوگوں کی زبان پر رہا اور اصل نام لوگ بھول گئے۔ نواب کا خطاب حکومتِ برطانیہ کا دیا ہوا تھا۔ یہ شعر بھی کہتے تھے اور عشرتی تخلص کرتے تھے۔ میر عبداللہ صاحب، بانی خاندانِ روسائے گذری کے پوتے اور نواب لطف علی مرحوم کے بڑے صاحبزادے تھے۔ بادشاہ نواب صاحب کی شخصیت میں تنوع تھا جو ان کے دور کے لوگوں میں سے کسی میں نہیں ملتا تھا۔ بہت بڑی زمینداری تھی۔ ان کے علاوہ پاس میں روپے اور جواہرات تھے جو ترکہ میں انہیں ملے تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو اس وقت بھی لاکھوں کی مالیت کے اثاثے اور لاکھوں روپے چھوڑ گئے۔ پٹنہ کے سماج میں ان کا خاص مقام تھا اور یہاں کی رنگین صحبتوں میں بھی یہ امتیازی شان رکھتے تھے۔ بڑے جذباتی بھی تھے۔ جہاں جس کام کی طرف طبیعت آئی، تو پھر اس کام کو پورا کرکے ہی دم لیتے۔ نئے مکان بنانے کی دھن بندھی تو عالیشان مردانہ اور زنانہ مکان ایسا بنایا کہ بن کر پٹنہ میں اپنی نظیر آپ ہوئے۔ یہ بادشاہ منزل اور بادشاہ محل کی عمارتیں ہیں۔ جب شعر و سخن کی محفلیں سجانے کا خیال آیا تو بڑے بڑے مشاعروں کا ان کے گھر تانتا بندھا جو برسوں قائم رہا۔ اسی ضمن میں سات دنوں کا مشاعرہ بھی تھا جس کی روداد آپ اسی کتاب میں پائیں گے جہاں پٹنہ کے مشاعروں کا تذکرہ ہے۔ ایک دفعہ طبیعت میں ترنگ آئی تو ایک ڈرامٹک کلب قائم کردیا جس میں باہر سے اچھے اچھے ایکٹروں کو ملازم رکھ کر پٹنہ کے نوجوانوں کو اچھے ایکٹر بننے کی تعلیم دلوائی۔ کلب کے لئے تھیٹر کے بیش قیمت سامان اور پردے بنوائے اور پھر یہ کلب اپنے دامن میں ناٹک کی کل رنگینیوں کو سمیٹے برسوں پھولتا پھلتا رہا۔ بادشاہ نواب صاحب اپنے متوسلین اور مصاحبین کی فوج لے کر روزانہ تھیٹر کی بہار دیکھتے اس زمانہ میں پٹنہ میں کئی اور بھی ڈرامٹک کلب قائم ہوئے مگر کوئی بادشاہ نواب کے کلب کی گرد کو نہیں پہنچ سکا۔ پچاسوں نوجوان ایکٹر کا فن سیکھ

گئے اور دوسری دوسری جگہوں میں ایکٹر بن کر تھیٹر کی ملازمت کر کے روزی کماتے رہے۔ یہ سلسلہ عرصہ تک چلا۔ پھر بادشاہ نواب صاحب کے شوق کے ختم ہونے کے ساتھ یہ سلسلہ بھی موقوف ہوا۔ ایک دفعہ مقامات مقدسہ کی زیارت کا شوق ہوا تو اپنے عزیزوں اور احباب کے ساتھ اپنے متوسلین اور مصاحبین و ملازمین کا ایک بڑا قافلہ ترتیب دیا اور زیارت کے لئے چل پڑے۔ قافلے میں ان کے اعزا اور احباب کا خود ان کا اپنا اہتمام تھا مگر پچاس غریب لوگوں اور مساکین اور ملازمین کے اخراجات بادشاہ نواب صاحب کے ذمہ تھے۔ یہ زیارت کا سفر ایک پُر لطف سفر تھا۔ جس کے قصے بھی بڑے پُر لطف تھے۔ زیارتِ عالیہ کے موقع پر بادشاہ نواب صاحب کی داد و دہش بھی خوب رہی اور مقامات مقدسہ میں ان کے نذرانے بڑے قیمتی ہوتے تھے۔ انہوں نے مزارات کے قیمتی دروازے بنوائے اور بہت سی ایسی چیزیں نذر دیں جو آج بھی کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف میں موجود ہیں اور اسی لئے ان جگہوں میں ان کا نام آج بھی لیا جاتا ہے۔ محرم کی شبِ عاشورہ میں اور چہلم کے دن تزک و احتشام سے ذوالجناح نکالتے بہت دنوں تک چمرڈونڈیا کے امام باڑے کا اہتمام اور اخراجات بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ دسویں محرم کی رات میں جب چمروڈنڈیا کی سپَر بڑے اہتمام اور جلوس کے ساتھ پہلام کے لئے تین چار میل کا راستہ طے کر کے رکتے رکاتے چار گھنٹوں کے بعد شاہ ارزاں رحمۃ اللہ علیہ کی کربلا میں پہنچتی تو بادشاہ نواب صاحب بھی یہ مسافت پیدل طے کرتے۔ ایک آدمی ایک آرام دہ کرسی اٹھائے ساتھ ساتھ چلتا۔ جہاں اکھاڑہ تھوڑی دیر کے لئے رکتا وہ کرسی نیچے رکھ دیتا اور بادشاہ نواب صاحب کچھ دیر اس پر بیٹھ کر اپنی تھکن مٹاتے۔

جب ہر یہر چھتر کے میلے کا زمانہ۔ کارتک کے مہینے کی آخری تاریخوں میں آتا، تو بادشاہ نواب کے میلے میں جانے کا اہتمام ہوتا۔ انگریزی بازار میں جہاں دوسرے معززین اور باہر سے آئے ہوئے راجہ مہاراجوں کے کیمپ لگتے وہیں ان کا کیمپ بھی

لگتا تھا۔ ایک وسیع آراضی مستقل طور پر ان کے کرائے میں رہتی تھی اور وہیں ان کا دل بادل خیمہ ایک پختہ بڑے لانبہ چوڑے فرش پر کھڑا کیا جاتا تھا۔ اس خیمے میں متعدد کمرے تھے۔ جن کے دروازے ساگوان کی لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے۔ ایک بڑا ڈرائنگ ہال تھا۔ بغل میں ڈائننگ ہال، ایک آفس کا کمرہ، پھر سونے کے بند کمرے تھے ۔ ان کمروں کو سجانے کے لئے باہر سے فرنیچر لائے جاتے تھے، یہاں بادشاہ نواب صاحب انگریزوں اور مہاراجوں کی دعوت کرتے۔ خیموں میں ان کے احباب اور مصاحبین ٹھہرتے۔ رَوٹیوں میں ملازمین قیام کرتے اور باورچی خانہ کا انتظام بھی ساتھ ہوتا۔ پٹنہ سے ان کی فِٹن اور لینڈو گاڑیاں اور گھوڑے سواری کے لئے لائے جاتے۔ اصطبل ان کے لئے یہیں ان کے کمرے کے احاطہ میں بنایا جاتا۔

بادشاہ نواب صاحب صرف مذہبی رسومات اور دیگر دل چسپی کے کاموں میں ہی نہیں بلکہ قوم کے تعمیری کاموں میں بھی دل کھول کر چندے اور عطیات دیتے تھے۔ اس وقت کا کون سا ادارہ تھا جس کی انہوں نے سرپرستی نہ کی ہو۔ آج بھی ان کے عطیات کی یادگاریں پٹنہ کالج، پٹنہ میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج میں باقی ہیں۔ سب سے بڑی ان کی یادگار تو بادشاہ نواب رضوی ٹریننگ کالج پٹنہ میں موجود ہے جس کو انہوں نے عورتوں کے پڑھنے کے لئے اور استانیوں کی ٹریننگ کے لئے قائم کیا تھا۔ عورتوں کا یہ کالج بلاقید مذہب و ملت برسوں پٹنہ میں تنہا اپنا کام بخوبی انجام دیتا رہا اور آج بھی بڑے آب و تاب سے چل رہا ہے۔ بادشاہ نواب صاحب نے اپنی بڑی جائداد کا ایک تہائی حصہ اس کے اخراجات کے لئے وقف کر کے اس کا انتظام حکومت کے حوالہ کر دیا تھا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ حکومت نے بھی اس کالج کی افادیت کو دیکھتے ہوئے اس کو اپنی سرپرستی میں لیا جس سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔

بادشاہ نواب صاحب مرحوم میں مذہبی رواداری اور خلوص بھی تھا۔ ایک دفعہ پٹنہ میں شیعہ سنی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر سے فیروزہ نامی ایک طوائف آئی اور محلہ

صدر گلی کے نکڑ پر جو شاہ راہ میں ملتا ہے ایک کوٹھ کرایہ پر لیکر اپنا دھندہ چلانے لگی۔ حسین بھی تھی اور اس کا ناچ گانا بھی اچھا تھا۔ چند ہی دنوں میں کافی مشہور ہو گئی۔ جب محرم کا زمانہ قریب آیا تو اس نے اپنے کچھ شیدائیوں سے حضرت امیر علیہ السلام کے تابوت نکالنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان شیدائیوں میں خواجہ کلاں تھانہ کے داروغہ جی بھی تھے .... تابوت نکالنے میں صرف اس کا خدشہ تھا کہ صدر گلی سنیوں کا محلہ ہے اور پہلے یہاں سے کبھی کوئی تابوت نکالنے کی مثال نہیں ملتی۔ بہر حال داروغہ جی ساتھ تھے اور ساتھ ہی نہیں، ان کا زور بھی تھا کہ تابوت ضرور نکلے گا۔ محرم آگیا اور فیروزہ طوائف کے یہاں تابوت نکالنے کا اہتمام ہونے لگا۔ محلّہ کے لوگوں کو جب معلوم ہوا تو ان میں ہل چل مچی۔ لوگ سیّد ضمیر الدین احمد صاحب مرحوم کے پاس پہنچے کہ تابوت رکوانے میں وہ مدد کریں۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ تم کسی کے مذہبی ارکان میں مداخلت کیوں کرتے ہو؟ ان کو تابوت نکالنے دو، مگر ان لوگوں نے یہ نکتہ پیش کیا کہ طوائف کے گھر سے تابوت نہیں نکلنا چاہیئے۔ سیّد ضمیر الدین احمد صاحب مرحوم نے کہا کہ یہی بات تم سب شیعہ حضرات سے کہو۔ شاید وہ مان جائیں یہ مرحلہ بھی ناکام رہا۔ بات چیت میں نویں محرم بھی آ ہی گئی۔ دن گذرا اور رات دسویں کی پہونچی جس کی صبح میں تابوت نکلنا مقرر تھا۔ محلّہ کے سنیوں اور ان شیعوں کے درمیان جو فیروزہ طوائف کے شیدائی تھے، کوئی مصالحت نہ ہو سکی۔ جب سنیوں نے دیکھا کہ فیروزہ طوائف کے گھر سے تابوت نکل کر رہے گا تو انھوں نے رات گئے سیٹی مجسٹریٹ (جو انگریز تھا) کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور کہا کہ اگر تابوت کا نکلنا ردنہ کیا جائے گا تو شیعہ اور سنی کا تصادم ناگزیر ہے۔ بارہ ایک بجے رات میں سیٹی مجسٹریٹ صدر گلی پہنچا، ان لوگوں کا بیان لیا جو وہاں حاضر تھے۔ اس درمیان خورشید نواب صاحب آئے، یہ سید ضمیر الدین احمد کے دلی دوستوں میں اور ان کے ہم خیال تھے کہ تابوت کسی طوائف کے گھر سے نہ نکلنا چاہئے۔ سید ضمیرالدین احمد مرحوم اور خورشید نواب

صاحب مرحوم اس پر متفق ہوگئے کہ بادشاہ نواب صاحب مرحوم سے مل کر صورت حال ان کو سمجھا دینی چاہئے، اگر بات ان کے ذہن میں آگئی تو جھگڑا ختم ہو ہی جائے گا۔ مگر سیٹی مجسٹریٹ صرف اس بات کی شہادت چاہتا تھا کہ پہلے بھی یہاں تابوت نکلا ہے یا نہیں۔ جب اس کی تشفی ہوئی تو اس نے اپنے ہاتھ سے دفعہ ۴۴ کی نوٹس فیروزہ طوائف کے کوٹھے پر جا کے دروازہ پر آویزاں کر دی اور خود واپس چلا گیا۔ ایک انگریز مجسٹریٹ کی دی ہوئی نوٹس کے خلاف عمل کرنے کی کس کو جرأت تھی۔ داروغہ جی بھی گھبرا کر رہ گئے۔ دوسرے دن یہ بات تمام شہر میں مشہور ہو گئی کہ سنیوں نے حضرت امیر علیہ السلام کا تابوت نکلنے سے رُکوا دیا ہے۔ تمام شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ دونوں فریقوں کے تیور لال ہو گئے اور شیعوں کے یہاں ایک جلسہ ہوا جس میں سنیوں اور سیٹی مجسٹریٹ پر مداخلت فی الدین کا مقدمہ چلایا جانا منظور ہوا۔ بادشاہ نواب صاحب ہمیشہ کے جذباتی تھے، اس موقع پر انھوں نے اعلان کیا کہ مقدمہ لڑنے کے لئے لاکھ دو لاکھ خرچ ہوگا وہ اپنے پاس سے کریں گے۔ غرض مقدمہ ہو گیا۔ سیّد ضمیر الدین مرحوم بڑی کشاکش میں اپنے کو محسوس کررہے تھے۔ ایک تو یہ کہ مقدمہ ان کے محلی سنیوں کے خلاف دائر ہوا، پھر جو خلوص محبت اور مذہبی رواداری سنیوں اور شیعوں کے درمیان ہمیشہ سے چلی آرہی تھی وہ ختم ہونے والی تھی۔ وہ اس کا علاج سوچ رہے تھے۔ چناں چہ اس کے دوسرے دن سیّد ضمیر الدین احمد صاحب مرحوم، نواب صاحب مرحوم کے پاس پہنچ گئے۔ بادشاہ نواب صاحب سیّد ضمیر الدین مرحوم کو اپنا عزیز کہتے تھے اور بزرگانہ شفقت کے ساتھ ملتے تھے۔ سیّد ضمیر الدین جب پہنچے تو بادشاہ نواب صاحب سائبان میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ملازم بھی وہیں پر تھے۔ سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم نے بادشاہ نواب صاحب مرحوم کو سلام کیا تو انھوں نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم پھر بھی بیٹھے رہے۔ دو چار منٹ کے بعد بادشاہ نواب صاحب نے رُخ بدلا اور بڑے شکایت آمیز لہجے میں بولے کہ ضمیر

میاں، مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی، کہ تم سبھوں کے مذہبی رسومات و معاملات میں دخل اندازی کروگے۔ سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم نے جواب دیا کہ میں نے تو محلّہ کے لوگوں کو سمجھایا اور وہ اس پر راضی ہوئے کہ شیعہ حضرات سے مل کر معاملہ طے کر لیں گے۔ مگر مصالحت کی گفتگو پر شیعہ حضرات راضی نہ ہوئے۔ بادشاہ نواب صاحب نے کہا کہ کیسی مُصالحت؟ کیا سنی یہ چاہتے تھے، کہ ہم اس پر راضی ہو جائیں، کہ امیر علیہ السلام کا تابوت نہ نکلے؟ سید ضمیر الدین مرحوم نے جواب دیا کہ ہاں ایک طرح پر کہا جا سکتا ہے مگر اصل بات جو آپ کے گوش گذار نہیں کی گئی ہو یہ تھی کہ سنّی ایک طوائف کے گھر سے، جہاں رات دن زنا ہوتا رہتا ہے، حضرت امیر علیہ السلام کا تابوت نکلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ یوں تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمیشہ آپ کے یہاں تابوت کے جلوس میں سنی حضرات بھی شامل رہتے ہیں۔

یہ بات سنتے ہی بادشاہ نواب بڑے زور سے چونکے۔ پھر آگے بڑھ کر والد مرحوم کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگے عزیزم واللہ! میں پہلے سوچ نہ سکا تھا کہ ایک طوائف کے گھر سے امیر علیہ السلام کے تابوت کے نکلنے میں واقعی بڑی بے حُرمتی ہے۔ جب تو سُنیوں کا اعتراض بالکل صحیح تھا۔ اس کے بعد، انھوں نے اعلان کر دیا کہ یَہاں کے شیعہ سُنی کے مقدمہ سے ان کا اب کوئی تعلق نہیں، اس کے بعد یہ مقدمہ خود بہ خود ختم ہو گیا۔

لوگ بادشاہ نواب صاحب کو سنکی بھی کہتے تھے۔ اگر وہ واقعی سنکی ہوتے تو جو کچھ وہ کر گئے اس سے بہتر طور پر کرنے والا مجھے آج کل کے عقل مندوں میں کوئی نظر نہیں آتا۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک تہائی جائداد بی، این آر ٹریننگ کالج کے لئے وقف کر چکے تھے۔ دوسری تہائی جائداد اور عالی شان مکانات اور عزا خانہ وہ محرم کے رسومات کے لئے وقف کر گئے اور تیسری تہائی اپنے بھائی بہن کے لئے چھوڑ گئے۔ غالبًا ۲۰-۱۹۱۹ء میں ان کا انتقال ہوا اور پٹنہ کے سماج سے ایک بڑی متنوع شخصیت اُٹھ گئی۔

خان بہادر سید ضمیر الدین احمد مرحوم

میرے والد خان بہادر سید ضمیر الدین احمد مرحوم ۱۸۶۲ء میں بمقام بہار شریف ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ قصبہ بہار شریف کی جو تاریخی حیثیت ہے اسی سے ظاہر ہے کہ بہار شریف کے نواح میں یادگار زمانہ ''نالندہ یونیورسیٹی'' قائم تھی جہاں ہندوستان سے باہر کے طلباء آکر تعلیم حاصل کرتے تھے اور یہی بہار شریف مدتوں تک ہندو راجاؤں کا دارالحکومت بھی رہا تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کے عہد میں بھی اس کی امتیازی حیثیت قائم رہی، کیوں کہ اس دور میں یہ شرفا، نجبا، اور علما، وصوفیائے کرام کا مرجع تھا۔

سید ضمیرالدین احمد مرحوم کے والد سید کرامت حسین مرحوم کے آٹھ صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں تھیں۔ بڑے صاحب زادے سید امیرالدین احمد مرحوم دوسرے نواب خان بہادر سید نصیرالدین احمد مرحوم تیسرے سید کبیرالدین احمد مرحوم، چوتھے خان بہادر سید ضمیرالدین احمد مرحوم کے متعلق یہ تذکرہ زیر تحریر ہے۔ پانچویں سید کریم الدین مرحوم چھٹے سید وحیدالدین مرحوم ساتویں خان بہادر سید سعید الدین احمد مرحوم، اور آٹھویں سید حمید الدین احمد مرحوم ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ۔ مولوی کرامت حسین مرحوم کی بڑی صاجبزادی کی شادی مولوی سید عنایت کریم مرحوم زمیندار موضع برتھو ضلع پٹنہ سے ہوئی تھی اور دوسری صاجبزادی کی شادی سید شاہ شرف الدین احمد مرحوم سے ہوئی تھی جو حضرت مخدوم شعیب رحمتہ اللہ علیہ کی گدی کے سجادہ نشین تھے۔ حضرت مخدوم شعیب رحمتہ اللہ علیہ حضرت مخدوم الملک شرف الدین رحمتہ اللہ علیہ بہاری کے چچازاد بھائی اور خلیفہ تھے۔ ان کی گدی اور خانقاہ قصبہ شیخپورہ ضلع مونگیر صوبہ بہار میں ہے۔

سید ضمیر الدین احمد نے خاندانی روایات کے مطابق فارسی اور عربی مستند اساتذہ سے گھر ہی میں پڑھی، ان سے فراغت کے بعد انگریزی شروع کی۔ کچھ دنوں بہار کے اسکول میں پڑھنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے پٹنہ کالجیٹ اسکول

سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔اس سے آگے کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے مشہور پریسیڈینسی کالج کلکتہ میں داخلہ لے کر بی اے تک کی تعلیم مکمل کی۔اس وقت کے پریسیڈنسی کالج کی شہرت بلاوجہ نہیں تھی۔والد سید ضمیر الدین احمد مرحوم فرماتے تھے کہ اس کالج میں کیمرج اور آکسفورڈ سے ذی علم پروفیسر لائے جاتے تھے۔طالب العلموں کو کیمبرج اور آکسفورڈ کالجوں کے ڈھنگ پر تعلیم دی جاتی تھی۔کالج کے کامن روم میں ہندوستان کے اخبارات اور پرچے بھی آتے تھے مگر طالب علموں کو پڑھنے کے لئے نہیں ملتے تھے۔انگلستان کے اخبارات اور طرح طرح کے میگزین کامن روم کی میزوں پر رکھ دیئے جاتے تھے اور انگریز پروفیسر انھیں پڑھنے کی ہدایت کرتے اور وجہ یہ بتاتے کہ ہندوستان کے اخبارات اور پرچوں میں ناقص انگریزی زبان لکھی جاتی ہے اور صحیح انگریزی زبان انگلستان کے اخبارات اور وہیں کے پرچوں کے ہی پڑھنے سے حاصل ہوسکتی ہے انگریز پروفیسر ان انگریزی زبان کے معاملے میں اکثر دوسرے انگریز کو بھی آنکھ نہیں لگاتے تھے۔سید ضمیرالدین احمد مرحوم نے یہ واقعہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ایک دن بی،اے کے کلاس میں انگریز آئی،سی،ایس افسر کی زبان دانی کی بات نکل آئی اور ایک طالب العلم نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ یہ انگریز افسر انگریزی کے کسی انگریز پروفیسر سے زبان دانی کے معاملہ میں کم نہیں ہے۔اس وقت بی،اے کا کلاس پروفیسر رو (PROFESSOR ROE) لے رہے تھے۔یہ بات سنتے ہی تلملا اٹھے اور جھنجلا کر بول اٹھے،کہ تم نیم تعلیم یافتہ آئی،سی،ایس افسروں سے میرا مقابلہ کیوں کرتے ہو۔کلکتہ کے قیام کے زمانے میں جب سید ضمیرالدین احمد مرحوم تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ان کا آنا جانا قصبہ باڑھ (ضلع پٹنہ) کے سابق باشندہ نواب سید امیر علی مرحوم کے یہاں اکثر ہوتا رہتا تھا۔نواب صاحب مرحوم سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے قریبی رشتہ دار تھے اور کلکتہ کے بڑے مشہور وکیلوں میں ان کا نام شمار ہوتا تھا۔اسی زمانے میں وہ حکومت ہند کے اصرار پر معزول واجد علی شاہ کے یہاں جو کلکتہ کے ایک

علاقہ مٹیا برج میں قیام پذیر تھے ،وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔ نواب سید امیر علی مرحوم کی وساطت سے سید ضمیرالدین احمد مرحوم کی حاضری بھی کبھی واجد علی شاہ کے حضور میں ہو جاتی تھی ۔اس سلسلہ میں سید ضمیر الدین احمد مرحوم کی ملاقات شہزادہ سلیمان قدر سے ہوئی جو واجد علی شاہ کے چہیتے بھتیجے تھے اور کلکتہ میں الگ ایک عالی شان مکان میں رہتے تھے۔ شاہزادوں میں سب سے زیادہ انھیں کی عزت کی جاتی تھی۔ اسی زمانہ میں نواب سید امیر علی مرحوم کے بڑے صاحب زادے نواب زادہ سید اشرف احمد خاں بہادر ہوگلی امام باڑہ کے متولی مقرر ہوئے تھے۔ یہ امام باڑہ ہندوستان کے بڑے مشہور امام باڑوں میں سے ہے جس کو ایک ایرانی تاجر مرزا محسن نے قائم کیا تھا اور اس کے اخراجات کے لئے لاکھوں روپے کی آمدنی وقف کر دی تھی۔ مرزا محسن نے اس کے علاوہ بنگال و بہار میں مسلمان طلباء کی تعلیم کے لئے بھی لاکھوں روپے کی آمدنی الگ سے وقف کر دی تھی۔ ہوگلی کلکتہ سے لگا ہوا ایک شہر ہے،اور سید ضمیر الدین احمد مرحوم کبھی کبھی وہاں چلے جاتے تھے۔ ماہ محرم میں اور خاص کر عشرہ کے دنوں میں ایران و عراق سے بڑے بڑے عالم آتے۔ ہوگلی امام باڑہ کی مجلس اس وقت تمام ہندوستان میں منفرد سمجھی جاتی تھی۔ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں سر عبدالرحیم سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے ہم عصر تھے اور تعلیم کے لحاظ سے ایک سال آگے تھے۔ سر عبدالکریم غزنوی سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے ہم سبق اور کلاس فیلو تھے۔ ان دونوں حضرات سے سید ضمیرالدین احمد مرحوم کے مراسم آخری دم تک قائم رہے۔ سر عبدالرحیم کی شادی پٹنہ میں مولوی محمد یحیٰ صاحب وکیل کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ سر عبدالرحیم جب کبھی پٹنہ آتے تو سید ضمیر الدین احمد مرحوم سے ملنے کے لئے محلّہ صدر گلی ضرور آتے تھے۔

سید ضمیر الدین احمد مرحوم کی شادی ۱۸۸۲ء میں پٹنہ کے ایک معزز اور متمول گھرانے میں میر احمد حسین مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ پریسیڈینسی کالج

سے تعلیم ختم کر کے سید ضمیر الدین مرحوم بیر سڑی کی تعلیم کے لئے انگلستان جانے والے تھے کہ چند دنوں کی علالت کے بعد ان کے والد سید کرامت حسین کا قصبہ بہار میں انتقال ہو گیا۔ اور اس طرح فوری طور پر کچھ دنوں کے لئے انگلستان کا یہ سفر رک گیا مگر اتفاق دیکھئے کہ اس کے بعد سید ضمیر الدین احمد مرحوم بھی بیمار پڑے، علالت نے طول کھینچا، سال بھر بیمار رہنے کے بعد اچھے ہوئے تو ان کے سسر میر احمد حسین مرحوم کے مشاغل اور مصروفیتوں میں ان کی امداد سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے لئے زنجیر پا بنتی گئیں اور انگلستان جانے کی اسکیم اگر مستقلاً ختم تو نہیں ہوئی، مگر ہر مرتبہ ضرور ملتوی ہوتی گئی۔ آخر میں میر احمد حسین مرحوم کے انتقال کے بعد چونکہ اس گھر میں سید ضمیر الدین احمد مرحوم سب سے بڑے تھے، پورے گھر کا بوجھ ان ہی کے کاندھوں پر آن پڑا۔ بالآخر یہ پٹنہ ہی کے ہو کر رہ گئے۔

انگلستان کا جانا تو رہ گیا مگر یہاں کی علمی، اصلاحی اور سیاسی مجلسیں سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم کے لئے بڑی تربیت گاہیں ثابت ہوئیں، جن کی بدولت ایسے باکمالوں کی فیض صحبت سے جو ہر شعبۂ زندگی میں ممتاز تھے، ان کو بھی ہر جگہ صفِ اول میں جگہ ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۸۵۷ء کا طوفان گذر چکا تھا۔ اس کی تباہ کاریوں کے آثار بہت کچھ مٹ چکے تھے، ملک نے اطمینان کی سانس لی تھی، طبیعتوں کا بہاؤ جو رک گیا تھا، اس کے سوتے پھر کھلنے لگے تھے اور علم و ہنر کی بساط پر نئے مُہرے ابھر رہے تھے۔ اس موقع پر دہلی، لکھنؤ، کلکتہ اور دوسری مرکزی حیثیت کے شہروں کے دوش بدوش پٹنہ کی سر زمین بھی اپنے نونہالوں کو آغوشِ تربیت میں پروان چڑھا کر آگے بڑھا رہی تھی۔ نشاۃِ ثانیہ کے دوَر کا آغاز ہو چکا تھا۔ بکھرے ہوئے شیرازوں کو پھر سے جمع کرنے کی فکر ہو رہی تھی۔ مایوسیوں کو امید سے بدلنا تھا، گری ہوئی طبیعتوں کو سہارا دے کر اُبھارنا اور جو اعضاء شل ہو کر رہ گئے تھے ان میں دوبارہ حرکت پیدا کرنی تھی۔ کام کٹھن تھا مگر خدا کے بندے اس کام میں لگ چکے تھے، مستقبل کا ڈھانچہ بن رہا تھا،

اس کو خوبصورت بنانے کے لئے نئے نئے منصوبے سوچے جا رہے تھے۔ قدرت جب طبیعتوں میں کام کرنے کی امنگ بھرتی ہے تو کام کی انجام دہی کے لئے راستے بھی تجویز کر دیتی ہے۔ وقت کی پکار کے ساتھ طبیعت خود ہی صحافت اور تالیف و تصنیف و تحقیق کی طرف مائل ہونے لگی۔ مسائل وقتی اور روائتی پردوں میں چھپے ہوئے تھے ان کے حل کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ زندگی کے حقائق کو نئے زاویۂ نظر سے پرکھا جانے لگا۔ عروج و زوال کے اسباب پر محققانہ طور پر بحثیں جاری ہوئیں پرانی عینکیں آنکھوں سے اتریں تو بدلے ہوئے ماحول کا اندازہ بھی ملا اور صحیح جگہ لینے کی فکر بھی پیدا ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے یہاں کی دولت لوٹ لی تھی، قومی وقار چھین لیا تھا اور ملکی سیاست سے دور رکھنے کے لئے اعضاء کو بڑی حد تک مفلوج کر چکے تھے، مگر ذہنی پرورش میں انھوں نے پھر بھی تعاون کیا۔ سب سے بڑھ کر جو بڑی چیز انھوں نے دی وہ احساس مذمت تھا۔ انگریزوں کا بخشا ہوا یہی پہلو کام آیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احساس مذمت جاگا تو گذشتہ تاریخ کے اوپر ناقدانہ نظر پڑنے لگی۔ اُبھرتی ہوئی قوموں کی تاریخ کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا جس کے باعث وسعت نظر نے تحریک آزادی کے لئے نئی راہیں اور نئے مواقع ڈھونڈ نکالے۔ صرف یہی نہیں بلکہ نئے اقدار کے سانچوں میں جذبات و کردار بھی ڈھلنے لگے۔ دماغ جب کام کرنے لگا تو مفلوج اعضاء میں بھی حرکت شروع ہوئی اور اس طرح طبیعت کا میلان وقت کا تقاضا بنتا گیا۔

آج کل کی طرح اُس زمانے میں بہت کم ایسے قومی ادارے تھے جن کی سرپرستی میں وقتی ضرورت کے مطابق نوجوانوں کی بڑی تعداد میں تعلیم دینے کی گنجائش ہوتی اور ان میں قومی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت نکلتی۔ نہ تو ایسے وسیع وسائل تھے جن کے ذریعہ سے نئے افکار کی ملک میں تبلیغ ہوتی۔ اس وقت پٹنہ میں گنتی کے چند محبانِ ملک و ملت تھے ان ہی کا گھر علم و دانش اور اصلاح و تبلیغ کا مرکز تھا اور ان ہی حضرات کے حوصلے سے تعمیری، رفاہی، ادبی اور اصلاحی تحریکیں چل رہی تھیں۔

اُن حضرات کا پُر خلوص جذبہ اور اُن کے یہاں کی مجلسیں اہل کمال کو ان کے یہاں کھینچ لاتی تھیں۔ پٹنہ میں ایسا مرکز میر احمد حسین مرحوم کا گھر تھا۔ یہ میرے نانا تھے اور شہر کے بڑے متموّل اور بڑے صاحب عزت و وقار رئیس تھے۔ محلّہ صدر گلی اس وقت پورا انھیں کا تھا۔ ان کے یہاں کی صحبتوں میں علماء، صلحا، مشائخ اور ادباء، شعراء صحافی اور دیگر ہمدردانِ ملک و ملت سبھی شریک ہوتے۔ اس لئے ہر طرح کی تحریک سب سے پہلے یہیں پہنچتی اور یہیں اس کی توسیع و اشاعت کی اسکیمیں بنتیں۔ میر احمد حسین مرحوم خود بڑے صاحبِ علم تھے اور نادرد نایاب کتابوں کے جمع کرنے کے بڑے شوقین بھی تھے ان کا اپنا ایک کتب خانہ بھی تھا۔ کئی دفعہ حج کو گئے۔ جب گئے مکہ و معظمہ اور مدینہ طیبہ سے نادر و نایاب قلمی کتابیں بڑی قیمتوں پر خرید لائے۔ ان کے انتقال کے بعد بہت دنوں بعد ان کے بڑے صاحبزادے سید عبدالمجید مرحوم نے ان کا ذاتی کتب خانہ خدا بخش مرحوم کی لائبریری کے سُپرد کر دیا۔ سید ضمیر الدین احمد مرحوم اپنی طالب العلمی کے زمانے میں جب کلکتہ سے چھٹیوں میں آتے تو صدر گلی اپنی سسُرال بھی آتے اور طالب علمانہ طور پر شریک مجلس ہوتے۔ جب اُن کی تعلیم ختم ہو گئی اور اُن کے انگلستان جانے کا پروگرام تعطّل میں پڑا تو بڑی حد تک مستقل طور پر یہ صدر گلی پٹنہ آگئے باضابطہ طور پر یہاں کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے۔ میر احمد حسین نے جو قومی خدمت اپنی زندگی میں انجام دی اُن میں ان کا نمایاں کارنامہ پٹنہ میں محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی کا قیام تھا جس کی غرض وغایت پٹنہ اور صوبہ میں مسلم تعلیمی ادارے قائم کرنے تھے۔ اسی سلسلہ میں پٹنہ میں محمڈن اینگلو عربک اسکول قائم کیا گیا۔ اس کام میں شمس العلماء محمد حسین صاحب صادق پوری بہت آگے تھے۔ ان کو میر احمد حسین کا پورا تعاون حاصل تھا۔ دوسرا کام پٹنہ میں اصلاح قومی کے لئے ایک ایسے اخبار کا اجراء تھا جو ہر طبقہ میں طنز و ظرافت کے لحاظ سے مقبول عام بھی ہو اور ادبی، اصلاحی اور سماجی تحریکوں کو تقویت بھی پہنچائے۔ آپس میں مشورہ کے بعد اخبار اودھ پنچ لکھنؤ

کے ڈھنگ پر پٹنہ میں اخبار ''اڈپنچ'' کی داغ بیل پڑی، اور اس کا اجراء میر احمد حسین مرحوم کے گھر سے ہوا۔ اخبار ''اڈپنچ'' کے لئے مضمون نگاروں کی کمی نہیں تھی۔ یہاں کی روزانہ مجلسیں اہل کمال سے بھری رہتیں، جن کے سربراہ علامہ حکیم عبدالمجید مرحوم تھے۔ ہر ہفتہ نئے نئے مضامین اور فکاہات تیار ہوتے جن سے اخبار ''اڈپنچ'' مزین ہوکر بڑے آب و تاب سے نکلتا۔ مولانا سید رحیم الدین مرحوم دسنوی بڑے پائے کے عالم اور مضمون نگار تھے، عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں ان کو عبور تھا۔ اخبار کا اجراء سولہ آنہ ان کے تعلق تھا۔ اخبار ''اڈپنچ'' کی مقبولیت بڑھ گئی تھی کیونکہ یہ صرف ادب اور مصلح اخلاق ہی نہیں تھا بلکہ اس کی اشاعتوں میں طنز و ظرافت کی چاشنی کے ساتھ ایسے مضامین بھی ہوتے تھے جن سے علمی، سیاسی اور سماجی رجحانات کی راہیں بھی واضح ہوتی تھیں۔ میر احمد حسین مرحوم کا انتقال ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد اخبار ''اڈپنچ'' کا دفتر صدر گلی ہی میں رہا، اور میر احمد حسین مرحوم کے یہاں کی مجلسیں بجنسہ قائم رہیں۔ فرق اتنا بھر ہوا کہ میر احمد حسین مرحوم کی جگہ پر اب سید ضمیر الدین احمد مرحوم آگئے۔ صدر گلی کی مجلس میں کچھ تو سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے بزرگ تھے اور کچھ ان کے احباب تھے۔ ان کے احباب میں تین حضرات کی حیثیتیں کافی نمایاں تھیں۔ ایک مولوی سید رحیم الدین مہجور جن کے ہاتھوں میں اخبار ''اڈپنچ'' کی ادارتیں تھے۔ دوسرے مولوی سید عبدالغنی صاحب مرحوم تھے جو بعد میں حیدر آباد چلے گئے اور وہاں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ تیسرے سید عبدالغفور شہباز تھے۔ یہ تینوں حضرات ''اڈپنچ'' ہی کے مضمون نگار نہ تھے بلکہ ان کے مضامین کی مانگ ملک کے دوسرے جرائد اور رسائل میں بھی تھی۔ سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے مضامین بھی ''اڈپنچ'' میں کبھی کبھی شائع ہوتے۔ اس کے علاوہ دوسرے رسالوں میں بھی ان کے مضامین نکلتے چونکہ ان کو انگریزی زبان پر کافی دسترس تھی اس لئے انگریزی اخباروں اور پرچوں میں بھی اُن کے

مضامین چھپتے۔ لندن سے ایک انگریزی میگزین ''انڈیا'' کے نام سے نکلتا تھا، جو ہندوستانیوں کے حقوق کا بڑا علمبردار تھا۔ اس میگزین کے ایڈیٹر مسٹر مورس اسٹیفینس Mr. Morris Stephens جو کیمبرج یونیورسیٹی میں تاریخ ہند کے پروفیسر تھے۔ اس میگزین میں بھی سیّد ضمیرالدین احمد کے مضامین چھپتے تھے۔اگرانگریزی اور اردو کے رسالوں اور پرچوں سے سیّد ضمیرالدین احمد مرحوم کے سب مضامین اکٹھا کئے جاتے تو متعدد کتابیں تیار ہو جاتیں مگر اپنے شائع شدہ مضامین کو جمع کر کے رکھنے کا انھیں کبھی خیال بھی نہ ہوا۔ برسوں بعد جب ان کا انتقال ہو چکا تھا، مجھے ان پرچوں، رسالوں اور اخبارات کی تلاش ہوئی تو پتہ چلا کہ بہت سی کتابوں کے ساتھ یہ پرچے بھی تلف ہو چکے ہیں۔ پٹنہ سے ایک ماہانہ رسالہ ''بہار'' کے نام سے نکلتا تھا۔ حافظ نذرالرحمٰن صاحب حفیظ اس کے مالک اور مدیر بھی تھے۔ اس رسالہ میں قسط وار سید ضمیر الدین احمد مرحوم کا ایک مضمون یوروپ کے جدید فلسفہ پر ایک سرسری نظر'' دو سال تک نکلتا رہا اور اختتام تک پہنچتے پہنچتے یہ مضمون مکمل ہوا جو ڈھائی تین سو صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ اپنے آخری ایام میں سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے چاہا کہ اس مضمون کو جمع کر کے ایک کتاب کی شکل میں پیش کردیں۔ رسالہ ''بہار'' کو بند ہوئے متعدد سال گذر چکے تھے بڑی کدوکاوش کے بعد وہ تمام پرچے مل گئے جن میں یہ مضمون قسط وار شائع ہو تارہا۔ ان ہی دنوں سید ضمیر الدین احمد مرحوم سخت بیمار پڑے۔ یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا۔ چند مہینے بیمار رہ کر ان کا انتقال ہوگیا۔ میں اس وقت پٹنہ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔ میرے لئے یہ حادثہ ایک عظیم مصیبت تھی۔ اپنے والد سید ضمیر الدین مرحوم کے انتقال کے بعد میں پھر بانکی پور چلا آیا کیونکہ امتحان کا زمانہ سر پر تھا۔ امتحان کے بعد مجھے خیال آیا کہ ''بہار'' کے شماروں میں سے مضمون یکجا کر کے کتابی شکل میں چھپوا دینا چاہیئے۔ اب ان رسالوں کو گھر پر ڈھونڈتا ہوں، تو ان کا پتہ نہیں۔ نہ معلوم کوئی صاحب ذوق ان رسالوں کو پرانی یادگار سمجھ کر لے اڑے تھے، یا نوکروں نے ردّی سمجھ کر ان کو بازار میں بیچ ڈالا تھا۔

سید ضمیر الدین احمد مرحوم کو تصوف سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ دو تین الماریاں صوفیائے کرام کے مکتوبات، ملفوظات، تعلیمات اور دیگر بیش بہار تصوف کی کتابوں سے بھری تھیں، لوگ کہتے تھے کہ تصوف کی کتابوں کا جو ذخیرہ ان کے پاس تھا، دوسری جگہ ایسا ذخیرہ مشکل ہی سے ملتا تھا۔ دوسرے حضرات کو اگر ضرورت ہوتی تو وہ بھی یہیں آکر ان ہی کتابوں سے استفادہ کرتے۔ سید ضمیر الدین مرحوم کو حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاری رحمۃ اللہ علیہ سے دلی ارادات تھی۔ ان کے تذکرے اور سوانح حیات پر ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام "سیرۃ الشرف" ہے۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ آج اس کی طباعت واشاعت کو پچھتر سال ہوگئے ہیں، مگر اس کی مانگ اب بھی ہے سینکڑوں جلدیں اُن کی زندگی میں ختم ہوچکی تھیں، چند جلدیں باقی تھیں جن کو میں نے ان حضرات تک پہنچا دیا جن کو دینے کے لئے سید ضمیر الدین احمد صاحب نے اپنے انتقال کے قبل مجھے حکم دیا تھا۔ کتاب "سیرۃ الشرف" کی افادیت کے پیش نظر ۱۹۴۰ء میں جب مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم پٹنہ تشریف لائے تو مجھ سے ملے اور مانگ کی کہ اگر ایک جلد اس کتاب کی ہو تو میں انھیں دوں، تاکہ دارالمصنفین میں یہ کتاب "سیرۃ الشرف" پھر چھپ جائے۔ میں نے اُن سے وعدہ بھی کرلیا مگر اس وقت میں ایک بڑھتی ہوئی سیاسی سرگرمی میں گھرا ہوا تھا جس کے باعث یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندوی کو نہ بھیج سکا۔ مخدوم الملک شرف الدین بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ سوانح حیات مغربی انداز کی سوانح پر لکھی گئی ہے جو مشرقی طرز کی سوانح عمریوں کی خامیوں سے پاک و صاف ہے۔ اس میں مخدوم الملک کے صحیح حالات زندگی، ان کی تعلیمات اور ان کے پیدا کردہ ماحول کے حالات روزانہ ملتے ہیں۔ اسی طرح ان کی مجلسوں کی روداد بھی سامنے آتی ہے جہاں قرآنی آیات پر مبنی تزکیہ کے معمولات نفس و قلب کے اصول بتائے جاتے۔ عبودیت کی شرطیں بیان کی جاتیں اور حق العباد کی تشریح کی جاتی ۔ اس سوانح حیات کے مطالعہ سے یہ

بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت مخدوم الملک کی زندگی ایک قرآنی زندگی تھی۔ وہ انسان ہوتے ہوئے صرف اپنے اعلی کردار اور سچے پیرواسلام ہونے کے باعث اعلی مقام پر پہنچے تھے۔ ان ہی کی طرح اگر کوئی دوسرا بھی اسلامی اخلاق کا حامل ہو اور ان ہی کی طرح اپنے کردار میں بلندی پیدا کرلے تو وہ بھی اعلی درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ حضرت مخدوم الملک کی مجلسیں عام ہوتی تھیں جس کا نتیجہ تھا کہ دور دور تک ان کی تبلیغ و اشاعت کے اثرات پہنچنے لگے تھے اور بعد میں ان کے مکتوبات و ملفوظات قلمبند ہوکر عام لوگوں سے ہوکر بادشاہوں کے مطالعے میں بھی داخل ہوگئے تھے۔ سیرت الشرف کی اس انفرادیت نے اس کتاب کے چھپتے ہی، دیگر سوانح حیات میں اس کو ممتاز بنادیا تھا۔ بعد میں حضرت مخدوم الملک کے دیگر سوانح نگاروں نے بہت کچھ اس کتاب سے لئے ہیں۔ پچھتر سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد اس کی افادیت اپنی جگہ پر ہے اور سب سے بڑی سرٹیفیکٹ سیرت الشرف کے لئے یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے بڑے مایہ ناز مستند عالم و محقق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے چند بزرگان دین کے سوانح حیات جو لکھے ہیں ان میں حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاری کا تذکرہ شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔ جس میں انہوں نے سیرت الشرف ہی سے بہت زیادہ اقتباسات لئے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم اس کا دیباچہ ہے جس میں اسلامی تصوف پر سیر حاصل تبصرہ ہے جس کی روشنی میں حضرت مخدوم الملک کے مسلک اور ان کی تعلیمات اور ارشادات کا بیان ہے۔

سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے مسلم دور حکومت کی ایک تاریخ بھی اردو میں لکھی ہے جو ۱۹۰۱ء میں کتابی شکل میں شائع بھی ہوئی۔ اس کا نام "کوکبہ ملوکی و مملوکی" ہے۔ سلطان شہاب الدین غوری کے فتح ہندوستان کے

بعد سلطان قطب الدین ایبک کے دور حکومت سے یہ تاریخ شروع ہوتی ہے اور خلجیوں کے دور حکومت کے ساتھ ساتھ یہ کتاب ختم ہوجاتی ہے۔ اس کا دوسرا حصہ کچھ دنوں تک نامکمل پڑارہا۔ آخر میں سید ضمیر الدین احمد مرحوم اس کا دوسرا حصہ لکھنا چاہ رہے تھے کہ بیمار پڑے اور ان کا انتقال ہوگیا۔ مسلم دور حکومت کی اگرچہ نامکمل تاریخ ہے، مگر جتنے عرصہ کی یہ تاریخ ہے، واقعات کی صحت اور تفصیل کی وضاحت کے لحاظ سے اس دور کی مستند اور مکمل تاریخ ہے۔ تاریخی واقعہ نگاری کے علاوہ اردو ادب میں بھی اس کا پایہ بلند ہے۔ زبان کی روانی اور سلاست میں محمد حسین آزاد کی زبان کا چٹخارہ ملتا ہے۔ ناقدین کی رائے میں محمد حسین آزاد کی زبان کی اتباع میں اگر اردو ادب میں کوئی کتاب پیش کی جاسکتی ہے تو یہی کوکبہ، ملوکی و مملوکی ہے۔ اس کتاب سے کچھ اقتباسات پیش کر رہا ہوں!

"...... یوں تو محمود سبکتگین اور شہاب الدین غوری کی فوجوں نے بارہا ہند کے دشت وجبل روند ڈالے تھے مگر وہ صرف ٹڈی دل کی طرح باری باری سے آئے، سبزوں پر بیٹھے، چرے چگے اور چلے گئے۔ محمود سبکتگین ایسا تیز قدم تھا کہ آندھی کی مثال آیا اور بگولہ کی طرح واپس چلا گیا۔ شہاب الدین شمال کی پہاڑیوں سے شعلہ کی طرح اٹھا، بھڑکا، بھکا، جلایا دھواں بن کر اڑ گیا۔ یہ قطب الدین تھا کہ آسمان ہند پر چمکا دمکا، دہلی میں مرکز گزیں ہوگیا اور پھر نہ ٹلا۔ ۵۸۹ھ میں قطب الدین ایبک نے دہلی کے سرپرِدار الملکی کا تاج رکھا اور یہاں کے تخت پر بیٹھ کر جہاں گیری سے جہاں بانی کرنے لگا اور جو سہرا عملاً قطب الدین ایبک کے سر بندھا صدیوں تک اس کا پھول نہ کمھلایا اور مدتوں اس کی شمیم عالم کے لئے شامہ نواز رہی۔

سلطان قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد سرداروں کے درمیان

حصول سلطنت کے متعلق جو جھگڑا ہوا اس کا بیان یوں کرتے ہیں ۔!

...... قطب الدین ایبک مر گیا اور اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا دکھائی دینے لگا۔ تاج الدین یلدز بھی زنانہ تو تھا نہیں ، میدان کارزار میں عمر گزاری تھی، کب چوکتا ۔ پنجاب اور لاہور پر ٹوٹ پڑا اور دم کے دم میں بالادست کے سارے صوبے مار لئے ۔ مگر یہ فتح چند روزہ ہی ثابت ہوئی ۔

ناصر الدین قباچہ اور شمس الدین التمش اس پر چڑھ دوڑے ۔ تاج الدین یلدز کو کبھی فتح اور کبھی شکست نصیب ہوتی ۔ پنجاب اور لاہور پر کبھی یہ اور کبھی وہ قابض ہوتے رہے۔ ابھی تاج الدین کے تاج پر اقبال کی کرنیں پڑ رہی ہیں اور ابھی ناصر الدین نصرت کے پھر پرے اڑا رہا ہے اور اسی کے بعد شمس الدین فیروزی اور فتحمندی کا آفتاب بن کر چمک رہا ہے غرض اپنی اپنی باری سے ان تینوں نے ان صوبوں میں فتح کا ڈنکا بجایا۔ بالآخر برسوں کی میدان گیری اور یلغاروں کے بعد التمش کے سر آخری فتحمندی کا سہرا بندھا۔ تاج الدین یلدز گرفتار ہوا ، بدایوں بھیجا گیا جہاں شہید ہوکر زمین کا پیوند ہوا۔

ایک اقتباس اور ملاحظ ہو ۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے ولی عہد شاہزادہ محمد سلطان کی تاتاری مغلوں سے جنگ اور شاہزادہ کی شہادت کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں ۔

...... شاہزادہ ، ممینہ اور میسرہ کو ترتیب دے کر خود قلب لشکر میں قائم ہوا ۔ مغل دریائے لاہور کو پس پشت ڈال کر شاہزادے کی فوج کے مقابل صف آرا ہوئے۔ سلطانی جوانوں نے گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں اور دشمنوں کے قلب لشکر میں جاکر دھواں دھار ہوگئے ۔ دم کے دم میں ہزاروں کھیت پڑے ۔ شاہزادہ کے لشکر میں فتح کا نقارہ بجا ، ظہر کا وقت ہوچکا تھا ۔ شاہزادہ گھوڑے سے اترا ۔ ادھر اس نے تحریمہ صلوۃ باندھا ادھر مغلے پھر لام باندھ کر اور

گھونگھٹ دے کر شاہزادے پر آئے۔ شاہزادہ اپنے رکاب کے سواروں کو لے جھپٹا۔ دونوں طرف کے جوان ایک دوسرے سے چھری کٹاری ہوگئے۔ ایسا رن پڑا کہ الاماں۔ ابھی لڑائی ترازو کے تول ہو رہی تھی کہ یکایک شاہزادے کو موت کا گولا لگا اور وہ گھوڑے سے گرا۔

ساری کتاب واقعات کے تسلسل اور زبان کی روانی سے اور بھی واضح اور دلچسپ ہوتی جاتی ہے چھوٹے چھوٹے واقعات میں بھی اس طرح جان آتی ہے کہ وہ نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے زمانے تک اردو یا انگریزی میں کوئی مکمل اور تفصیلی تذکرہ یا سوانح شیر شاہ سوری کا نہ چھپا تھا۔ انھوں نے بڑی تحقیق کے ساتھ یہ کام شروع کیا تھا اور شیر شاہ کی زندگی کے واقعات اور کارناموں کو بڑی کدوکاوش کے بعد یکجا جمع کیا۔ یہ کتاب جب مکمل ہوئی تو مسٹر اولڈہم جو سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے دوست بھی تھے اور پٹنہ ڈویژن کے برسوں کمشنر رہ چکے تھے، اس وقت پنشن لے کر لندن جاچکے تھے۔ ان کے اصرار پر سید ضمیر الدین نے شیر شاہ کی بدولت لندن میں چھپنے کے لئے بھیج دی۔ اس کے کچھ دنوں بعد سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ میری ناعاقبت اندیشی دیکھئے کہ چند لوگوں کے مشورے پر میں نے شیر شاہ کی لائف کامسودہ واپس منگوا لیا۔ مسٹر اولڈھم نے پہلے تو مجھے میری ناعاقبت اندیشی کی طرف توجہ دلائی اور لکھا کہ لندن میں یہ تذکرہ زیادہ عمدہ طریقے پر چھپے گا۔ مگر یہاں لوگوں نے مجھے یہ تاثر دیا کہ ہندوستان میں طبع ہونے کے بعد ہاتھوں ہاتھ اس کی جلدیں فروخت ہوجائیں گی اور اس کتاب کی قدر زیادہ ہوگی بہرحال میرے اصرار پر مسٹر اولڈھم نے یہ مسودہ مجھے واپس بھیج دیا۔ بطور عقیدت اپنے ایک بزرگ کو جو ہر طرح سے اس کتاب کا تعارف لکھنے کے اہل تھے، میں نے یہ مسودہ ان کے حوالے کیا مگر ہوا یہ کہ مسودہ ان کی دوسری

کتابوں اور الماریوں میں ایسا گم ہو گیا کہ باوجود تلاش کے ان کو نہ مل سکا۔ وہ سخت نادم تھے اور میں بھی اپنی حماقت پر غمگین تھا۔ اس مسودہ کے علاوہ میرے پاس دوسرا مسودہ بھی نہیں تھا۔ اسی درمیان میں میرے ان بزرگ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے چند برسوں کے بعد ان کے صاجزادے نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ مسودہ ایک الماری میں بڑی احتیاط سے رکھا ہوا مل گیا۔ یہ احتیاط غالباً ہمارے بزرگوں نے اس لئے برتی ہوگی کہ یہ دوسرے کے ہاتھ نہ لگے۔ بہرحال چالیس سال کے بعد یہ ملا۔ میرے خیال میں اس کتاب کی اہمیت ختم ہوچکی تھی کیونکہ چند سال قبل شیر شاہ کے متعلق دو تین کتابیں طبع ہوکر بازار میں آچکی تھیں۔ ادھر چند سال ہوئے گفتگو میں اس مسودے کا ذکر پروفیسر حسن عسکری صاحب سے نکل آیا۔ میں نے انہیں اس مسودے کے متعلق بتایا کہ سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے جس کدوکاوش سے شیر شاہ کی لائف لکھی، وہ میری ناعاقبت اندیشی اور غفلت سے نہ چھپ سکی۔ پروفیسر سید حسن عسکری سرجادوناتھ سرکار کے بعد ہندوستان میں مسلم دور حکومت کے سب سے زیادہ مستند تاریخ داں مانے جاتے ہیں۔ ان سے گفتگو کے چند ہی روز بعد پروفیسر شرما جو مدھیہ پردیش یونیورسٹی میں تاریخ ہند کے ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں، پٹنہ آئے۔ ان سے پروفیسر حسن عسکری نے اس مسودے کا ذکر کیا۔ یہ دونوں حضرات ڈاکٹر قیام الدین احمد کے یہاں جب چائے پر آئے تو اس مسودے کو دیکھا تھا۔ اس موقع پر میں بھی موجود تھا۔ پروفیسر حسن عسکری اور پروفیسر شرما نے مسودہ کو دیکھ کر مجھ سے کہا کہ باوجود ایک طویل عرصہ کے گذر جانے کے شیر شاہ کی اس سوانح حیات میں چند اہم باتیں ایسی ہیں جو ابھی تک دوسرے تذکروں میں نہیں آئی ہیں اور ان چند واقعات کی وہ صحیح تفصیل بتاتی ہے جو تاریخ دانوں کے ذہن میں مبہم رہی ہیں اور اب تک صاف نہ ہو سکی ہیں۔ دونون نے اصرار کیا کہ اس

سوانح حیات کو میں چھپوادوں۔ بہر حال شیر شاہ کی سوانح حیات ابھی تک نہ چھپ سکی ہے جس میں ایک حد تک میری اسکت اور زیادہ تر کچھ موانعات کا دخل ہے۔

سر ہنری دھیلر بہار کے گورنر تھے، انھیں تاریخ کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ ان ہی کے باعث بہار ریسرچ سوسائٹی کا قیام پٹنہ میں عمل میں آیا۔ یہ بہار کی گذشتہ تاریخ کو ڈھونڈھ کر پیش کرنے کے لئے اور تاریخی کتابیں وستاویزیں، زمین سے بر آمد ہونے والے مجسمے، ظروف اور دیگر اشیاء کی ہیئت اور ساخت اور نقش و نگار، ان کے عہد کا تیقن نیز ان میں سے اکثر پہ کندہ عمارتیں ان سب پر غور کرتے اور اس طرح تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو ملاتے۔ تحقیق کی روشنی میں بہار ریسرچ سوسائٹی میں زیادہ زور گذرے ہوئے ہندوؤں دور کی تہذیب اور حکومت کی تاریخ کو مکمل کرنے پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس دور کی باضابطہ تاریخ نہ ہونے کے باعث ہندو دور حکومت اور دور تہذیب کا نقشہ مکمل طور پر نظر کے سامنے نہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مسلم دور حکومت کی تاریخی عمارتیں اور کھنڈرات میں سے بھی مزید مسلم تاریخی شواہد ڈھونڈنے جاتے ان کے علاوہ شاہی فرامین اور تاریخی دستاویز جو منظر عام سے پوشیدہ تھیں ان کو بھی تلاش کر کے سامنے لایا جاتا تھا۔ سید ضمیر الدین احمد مرحوم کی تاریخ دانی اور فارسی زبان پر عبور نے ان کو مسلم دور حکومت کے آثار قدیمہ کی تحقیق میں بہت سی سہولتیں دے رکھی تھیں۔ بہت سی تاریخی دستاویزیں اور شاہی فرامین اور کتابوں کی یہ بھی وضاحت کرتے اور ان کے پڑھنے میں جو دقتیں ہوتیں انھیں بھی حل کرتے ہندوستان کی تاریخ کا درمیانی دور جو مسلم عہد حکومت پر مشتمل ہے اس کے بہت بڑے تاریخ داں سر جادوناتھ سرکار بہت سی باتوں کی تاریخی واقفیت کے لئے سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے معترف تھے۔ ان دو حضرات میں برابر تبادلہ خیالات ہوتا رہتا۔ پٹنہ کے ایک اور تاریخ داں پروفیسر سادار تو سید ضمیر الدین احمد مرحوم کو اپنا گرُوہی کہتے تھے۔ میں ان کا پٹنہ کالج میں شاگرد تھا۔ جب سید ضمیر الدین احمد مرحوم کا تذکرہ نکلتا تو پروفیسر سادار

بڑے احترام سے ان کا نام لیتے۔ پٹنہ میں دو اور سربرآوردہ حضرات تھے جن کو مسلم دورِ حکومت کے نوادر اور تاریخی شواہد سے بے حد دلچسپی تھی۔ ایک تو پٹنہ کے بڑے اونچے درجے کے بیرسٹر پی سی مانک تھے جو نسلاً آرزمینن (ARZMENIAN) تھے۔ ان کے والد ہندوستان چلے آئے اور کلکتہ کے باشندہ بن گئے اور یہیں کے ہو رہے تھے۔ دوسرے صاحب پٹنہ سیٹی کے دیوان بہادر رادھاکرشن جالان تھے۔ یہ ماڑواری تھے اور ان کا کلکتہ اور پٹنہ میں بڑا کاروبار تھا۔ یہ دونوں حضرات بڑی قیمتیں دے کر تاریخی نوادرو دستاویزیں اور فرامین اور اہم تصنیفات کے قدیم مسودے خریدتے اور ان کو لے کر کبھی خود سید ضمیرالدین احمد مرحوم کے پاس آتے اور کبھی ان کو بلا بھیجتے اور ان سے ان چیزوں کی تاریخی حیثیت کو متعین کراتے۔ بہار ریسرچ سوسائٹی اپنا ایک جرنل بھی نکالتی تھی۔ یہ جرنل اب بھی نکلتا ہے۔ اس میں کبھی کبھی تحقیقی مقالے سید ضمیرالدین احمد مرحوم کے بھی چھپتے۔ ان مقالوں میں سے دو مجھے یاد ہیں، ایک تو داود خاں پنی کے متعلق تھا جو پٹھان دور حکومت کا بڑا زبردست فوجی جنرل تھا۔ اس کی فتوحات کا سلسلہ بہار تک پھیلا ہوا تھا۔ گیا ضلع میں قصبہ داود نگر اسی کے نام سے بسایا گیا تھا۔ تاریخوں میں کہیں کہیں داود خاں کا نام تو آتا ہے مگر اس کے متعلق مفصل حالات نہیں ملتے تھے۔ بڑی تحقیق سے سید ضمیرالدین احمد مرحوم نے اس کے حالات بہار رسرچ سوسائٹی جرنل میں شائع کیا جو تاریخ دانوں کے حلقہ میں بہت مقبول ہوا اور یہ مقالہ ایک کتابچہ کی شکل میں سیکڑوں کی تعداد میں بہار رسرچ سوسائٹی نے الگ سے بھی شائع کیا۔ سید ضمیرالدین احمد مرحوم کا دوسرا مقالہ وہ تھا جو راسخ عظیم آبادی کے کلام پر تبصرہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ راسخ عظیم آبادی کی شاعرانہ حیثیت وہی سمجھی جاتی ہے جو میر تقی میرؔ کی ہندوستان میں مانی جاتی ہے۔ اس زمانے میں راسخ عظیم آبادی کا نام تو زبان پر آتا تھا مگر اردو ادب کی کتابیں ان کے حالات سے خالی تھیں۔ سید ضمیر احمد مرحوم نے راسخ عظیم آبادی کے حالات بھی انگریزی میں لکھے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے تحقیق

انداز میں تبصرہ بھی کیا تھا۔ یہ مقالہ بھی بہار رسرچ سوسائٹی میں شائع ہوا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں مقالہ بھی کتابچہ کی شکل میں ہی چھپا، جس کی بنیاد پر بعد میں چند مقالہ نگاروں نے راسخ عظیم آبادی پر بہت سے مضامین لکھے اسی زمانے میں سرہنری وھیلر نے سید ضمیر الدین احمد مرحوم سے فرمائش کی کہ وہ طبقات اکبری کا ترجمہ انگریزی میں مکمل کریں اس سے پہلے کلکتہ کے ایک نامی پروفیسر نے طبقات اکبری کا ترجمہ شروع کیا تھا مگر طبقات اکبری کی ادق فارسی سے گھبرا کر انھوں نے ترجمہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے طبقات اکبری کا ترجمہ شروع کیا، یہ اسی زمانہ کی بات ہے جب وہ شیر شاہ کی سوانح پر تحقیقات کر رہے تھے۔ اور اس کو مکمل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ دونوں کام یعنی طبقات اکبری کا انگریزی میں ترجمہ اور انگریزی ہی میں شیر شاہ کی سوانح حیات کی تکمیل میں اگر چہ وقت زیادہ لگا مگر یہ دونوں کام ہوتے رہے۔ آخر میں طبقات اکبری کا ترجمہ جب آخری مراحل پر پہنچا تو سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے اس کو وہیں پر چھوڑا اور شیر شاہ کی سوانح حیات کو مکمل کرنے میں یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہوگئے۔ شیر شاہ کی لائف تو مکمل ہوگئی، مگر طبقات اکبری کا آخری مختصر حصہ انگریزی میں ترجمہ ہونے سے محروم رہا، کیوں کہ سید ضمیر الدین احمد مرحوم سخت بیمار پڑے اور چند مہینوں کی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

مولانا سیّد سلیمان اشرف مرحوم کہا کرتے تھے، کہ فارسی زبان دانی کی نعمت سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے عطا فرمائی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد فارسی زبان کا ایک ستون گر گیا۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ غالباً ۱۹۰۸ء میں بمبئی کے مقتدر پارسیوں نے فارسی زبان کے متعلق ایک بڑی اہم اور کار آمد کانفرنس بلائی۔ دعوت پر ایران سے بھی بہت سے زباندان آئے۔ ہندوستان کے بھی منتخب لوگ مدعو تھے۔ سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم اُن دنوں بھوپال میں تھے، یہ بھی خاص طور سے مدعو کیے گئے۔ کانفرنس کی

کئی نشستیں ہوئیں جن میں ہر نشست کے لئے ممتاز صاحب علم الگ الگ صدر ہوتا تھا۔ ایک نشست کے صدر سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم بھی منتخب ہوئے۔ اس نشست میں جو موضوع تھا وہ یہ تھا "عربی ادب پر فارسی زبان کا اثر"۔ انھوں نے اپنا خطبہ صدارت جو پڑھا وہ بہت مقبول ہوا۔

اسی ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سن لیجئے کمال الدین سنجر طہرانی فارسی کے بڑے پُر گو اور قادر الکلام شاعروں میں گذرے ہیں۔ ایران کے رہنے والے مستند اہل زبان اور صاحب فضل و کمال تھے مگر ساتھ ہی ساتھ قسمت کے بڑے ہیٹے بھی تھے۔ عمر کا ایک معتدبہ حصہ گھر کے باہر ہندوستان میں گزرا کچھ دن رام پور کے دربار سے منسلک رہے۔ وہاں لوگوں سے نہ نبھی تو ہندوستان بھر کا چکر لگاتے رہے۔ پٹنہ ان کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ یہ گویا مرکز ثقل تھا۔ گھوم گھام کر کچھ دنوں کیلئے پٹنہ آتے، یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور ارباب علم سے صحبتیں رہتیں اور پھر یہ دوسری جگہوں کا چکر لگانے کے لئے نکل پڑتے۔ ہر جگہ نوابوں، راجاؤں اور رئیسوں کی شان میں قصیدے کہتے اور انعامات پاتے۔ ان ہی سے ان کی گذر بسر کی کفالت فارغ البالی کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ علمی فضیلت و شاعری کے ساتھ یہ بڑے پایہ کے خوشنویس بھی تھے لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کاغذ پر عقد پر دیں کا دفتر کھلا ہوا ہے شکل و صورت کے بڑے وجیہہ، آداب مجلس میں طاق، بڑے بذلہ سنج اور بڑے خوش گفتار تھے۔ اردو بھی کچھ بول لیتے تھے اور لکھنو والوں کے اتباع کوشش کرتے تھے جب فارسی کا کوئی لطیفہ اردو میں کہنے کی کوشش کرتے تو اردو فارسی کے جملوں کو ملا کر جوبات زبان سے نکلتی وہ بعض دفعہ خود ایک لطیفہ ہو جاتی۔ یہ سب کچھ تھا مگر ان کی نازک مزاجی اور ان کے غرور نے ان کو کہیں کا نہ رکھا تھا ایران میں بھی اپنے ہموطن شعراء سے بات بات پر لڑتے رہتے بے دھڑک سبھوں پر اعتراض کر دیتے اور کسی کو آنکھ نہ لگاتے۔ جب ان پر نرغہ زیادہ ہونے لگا تو ایران کو چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے۔ صرف قصیدہ ہی نہیں

ہر صنف شاعری میں کامل تھے۔ ان کے بہت سے قصیدے چھپ بھی گئے ہیں اور کچھ ان کے ممدوحوں کے گھر محفوظ بھی رہ گئے ہیں۔ مگر کثیر تعداد اُن قصیدوں اور ان کے دیگر اصناف شاعری میں کہے ہوئے کلام کی مفقود ہو چکی ہے۔ ایک دفعہ میرے والد سید ضمیر الدین احمد مرحوم کی شان میں انھوں نے ایک قصیدہ کہا۔ یوں تو پہلے بھی کئی قصیدے یہ کہہ چکے تھے اور اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے قصیدے ان کو پیش کر بھی چکے تھے۔ مگر یہ قصیدہ جو اس دفعہ لکھ کر لائے اس کو پڑھنے سے قبل اپنی شاعرانہ فضیلت پر ایک مختصر لکچر بھی انھوں نے دے ڈالا۔ جیسا میں نے سُنا ہے قصیدہ واقعی خوب تھا، اس وقت سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم کے پاس کچھ صاحبان علم حضرات بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ قصیدہ میں لفظ ''مرزغن'' جس معنی میں سنجر طہرانی نے استعمال کیا تھا وہ سیّد ضمیرالدین احمد صاحب کو کھٹکا۔ اس لفظ کو سنجر ''اُبلتا ہوا جامِ شراب'' کے معنی میں استعمال کر گئے تھے جو سیاق و سباق میں معنی سے بہت دور پڑتا تھا۔ سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے ''ہوں'' کہہ کر سنجر کی طرف دیکھا۔ بھلا اس اعتراض کی سنجر کو کہاں تاب چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بولے تو کچھ نہیں، مگر قصیدے کو لپیٹ کر جیب میں رکھا اور یہ جا وہ جا۔ سیّد ضمیر الدین احمد صاحب ان کو پکارتے بھی رہے مگر وہ کہاں سنتے ہیں۔ علامہ حکیم عبدالحمید مرحوم، حافظ فضل حق آزاد اور مولانا رحیم الدین مرحوم وغیرہم جو اس وقت پٹنہ میں فارسی زبان کے ماہر مانے جاتے تھے جب ان تک یہ قضیہ پہنچا تو ان سبھوں نے بھی ''مرزغن'' کا وہی معنی بتایا جو ضمیر الدین احمد مرحوم کہتے تھے، مگر سنجر طہرانی کہاں ماننے والے تھے۔ وہ ''مرزغن'' کے ساتھ اپنے شعر کے متعلق اپنے ہی مفہوم پر اڑے رہے۔ اس زمانے میں آقا کاظم شیرازی کے علاوہ جو کلکتہ میں رہتے تھے بڑے بڑے دیگر اساتذہ اور کامل اہل زبان ایرانی کلکتہ، رام پور، اور حیدر آباد میں موجود تھے، لوگوں نے ''مرزغن'' کے معنی کے اختلاف کو ان بزرگوں کے پاس فیصلہ کے لئے بھیج دیا اور استدعاء کی کہ وہ جو فیصلہ کریں وہ بھیجنے والوں کے پاس بھیج دیں۔ اتفاق دیکھئے

سبھوں نے "مرزغن" کا وہی معنی لکھ بھیجا جو سید ضمیر الدین احمد مرحوم کہتے تھے۔ سنجؔر طہرانی بھی پٹنہ میں موجود تھے۔ شدہ شدہ فیصلہ کی خبر ان کو بھی ملی اب اس کو مصلحت سمجھئے یا اعتراف شکست، اس کے دو چار دن کے بعد یہ سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم کے پاس آئے۔ یہ بڑے اخلاق کے ساتھ سنجؔر طہرانی سے ملے سنجؔر نے جیب سے ایک نیا قصیدہ نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ علامہ حکیم عبدالحمید مرحوم اور دوسرے حضرات بھی موجود تھے۔ قصیدہ واقعی لاجواب تھا۔ اس قصیدے سے چند شعر اقتباس کر کے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

اَلا اے ساربانِ آہنی دل خدا را از شتر بکشائے محمل!
شتر باناں مکن دیگر جرس را ہمی برگردنِ اشتر حمائل!
فرزلشکن جرس رَا تاکہ دیگر بگو شم ناید آواز جلاجل!
کہ خواہم لمحہ، گریم خرد شم چو رعدہا بطہ و چوں ابر دابل

تشبیب کے اور بھی چند شعر میں، جن کو چھوڑ رہا ہوں۔ ان کے بعد قصیدے کی طرف گریزیوں ہے۔

خرد پرور ضمیر الدین احمد زنسل پاک یٰسین دمزمّل!
جہاں دارد امیر گیتی آرا ملک منظر نکو کردار فاضل!!

کچھ اور اشعار چھوڑنے کے بعد۔

فلک باصد ہزاراں چشم انجم نخواہد دید چوں دے فرد قابل!
سبق گیرد دبستانِ کماشل جریر و اخطل و اعشی و دعبل!
زبان کے در بر نقطش کشاید ظہیر و عمعق و فطران و مقبل!!

مشو رنجیدہ از بیچارہ سنجر نباید اور اکرد باطل!
الاتا در جہاں باشد مدارس الاتا بحث گردو از مسائل!
الاتا در رواقِ طاقِ گردون فروزاں باشد از اختر قنادل!!
شوی مائل تو بر مقصود ز ایزد شوم من از تو بر مقصود مائل!!

اس قصیدے میں سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم کی علمی صلاحیت کا بھی اعتراف تھا اور اپنا زور کلام بھی دکھانا تھا۔ یہ قصیدہ پرانے کاغذات میں تلاش کرنے پر مجھے ملا۔

سید ضمیر الدین احمد کی سماجی اور مجلسی حیثیت بھی مسلم تھی۔ پٹنہ میں جو تحریک اُٹھتی اس کے محرکوں میں ان کا نام بھی ہوتا اس وقت پٹنہ میں ہر تحریک تقریباً ہندو اور مسلمان کی مشترکہ تحریک ہوتی تھی۔ بانکی پور اور پٹنہ سیٹی میں کوئی فرق نہ پہلے تھا نہ اب ہے مگر یہ بات ضرور تھی کہ پٹنہ سیٹی کے لوگوں کی ہی اعانت و عطیات سے تحریکیں چلتیں اور اسکیمیں مکمل ہوتیں۔ علمی، ادبی اور سماجی اسکیموں کی وہ رپورٹیں جو آج سے ساٹھ ستر برس قبل کی ہیں یا اس کے بعد کی بھی ہیں ان کو اگر دیکھیے تو یہ بات نظر آئے گی کہ ان کو بر سر کار لانے میں ہندو اور مسلمان کس طرح دوش بدوش کام کرتے تھے۔ جب شیخ مٹھا کی گڑھی اس وقت کے انگریز سیٹی مجسٹریٹ مسٹر مینگلس (Mr. Mangles) کی کوششوں سے مینگلس ٹینک (Mangles Tank) یا منگل تالاب بنا اور اس کے آس پاس کی ملحقہ زمین جو غلاظت کا بھنڈار تھیں ان کو صاف کر کے پارک بنایا گیا اور پھر بعد میں اس جگہ جو کلب ہیوز کلب ایک انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نام پر قائم ہوا اس کے قائم کرنے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے جن میں ایک سید ضمیر الدین احمد مرحوم بھی تھے۔ پٹنہ کالج، پٹنہ سیٹی اسکول، انجیئرنگ اسکول باری باری سے سید ضمیر الدین احمد مرحوم ان کے مجلس انتظامیہ کے ممبر ہوتے رہے۔ اگر کوئی حکومت کی طرف سے کمیٹی قائم ہوتی تو یہ اس

کے ممبر ہوتے۔ جب پٹنہ یونیورسیٹی کے قیام کا وقت آیا تو اس کے قیام کے لئے جو کمیشن بنا اس کے یہ ممبر بھی تھے۔ جن ریذیڈنشیل یونیورسیٹی کی پہلی اسکیم اختلافات کی بنا پر ترک کر دی گئی اور پٹنہ شہر کے حدود کے اندر پٹنہ یونیورسیٹی قائم ہوئی تو یہ بھی پٹنہ یونیورسیٹی کے پہلے سینٹ کے بنیادی ممبر ہوئے اور کچھ دن یونیورسیٹی میں ممتحن بھی رہے۔ آنریری مجسٹریٹوں کے بنچ کے تاحیات یہ مستقل صدر بھی تھے۔ اور صوبہ بہار اور اڑیسہ کی حج کمیٹی کے سکریٹری بھی تھے۔ اس وقت یہ کمیٹی بڑے اختیارات اور بڑے اثرات کی حامل کمیٹی تھی۔ جب لارڈ چیمسفورڈ اور مسٹر مینٹیگو اصلاحات حکومت پر ہندوستان کے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے ہندوستان آئے تو جو وفد ان سے ملنے کو کلکتہ گیا اس کے ایک اہم رکن یہ بھی تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب ولی عہد برطانیہ ہندوستان آئے تو پٹنہ میں ان کو ایڈریس پیش کرنے کے لئے انہیں کا نام چنا گیا تھا مگر سید ضمیر الدین احمد مرحوم اپنی شدید بیماری کے سبب سے اس تقریب میں شریک نہ ہو سکے۔ جب گورنر بہار پٹنہ یونیورسیٹی میں کسی آثار قدیم کے معائنہ کے لئے آئے تو ان کے گھر آتے اور ان کو ساتھ لے جاتے۔ برسوں تک یہ پٹنہ میونسپلٹی کے بھی ممبر رہے۔ یہ شروع ہی سے محمڈن ایجوکشن کمیٹی اور محمڈن اینگلو عربک اسکول کی مجلس انتظامیہ سے وابستہ رہے۔ انہیں کی سکریٹری شپ کے زمانے میں محمڈن اینگلو عربک اسکول کی نئی عمارت مولوی سید محمد یعقوب صاحب اور سیر کی نگرانی میں تعمیر ہوئی۔ کچھ دن کے بعد ضمیر الدین احمد صاحب کو ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال یعنی سلطان جہاں بیگم صاحبہ کی طلبی پر بحیثیت چیف سکریٹری اور نائب صدر اجلاس کامل بھوپال جانا پڑا تو انہوں نے حافظ سید شاہ ضیاء الدین مرحوم کو جو مولانا حافظ عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے پدر بزرگوار تھے اور جنکی شادی سیٹی کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی تھی ان کو میرا اتالیق بنا کر میری دیکھ بھال کی استدعاء کی۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین مرحوم پٹنہ میں کشمیری شال اور مشک و زعفران کی تجارت کرتے تھے اور اپنے مکان محلّہ لنگور ٹولی گلی

میں رہتے تھے۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال کی ہوگی اور مولانا حافظ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اٹھارہ انیس سال کے ہوں گے۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب مرحوم اپنے صاحبزادے عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ اٹھ کر صدر گلی میں آگئے مگر یہاں بھی کھانا پینا سب کچھ ان کا اپنا رہا۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول کے متعلق سید ضمیرالدین احمد مرحوم نے یہ بات بہتر سمجھی کی صدارت کے عہدے پر نواب سر فراز حسین خاں کو اپنا جاں نشیں بنادیں۔ جو سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ بھوپال میں سید ضمیر الدین احمد مرحوم تقریباً ڈھائی تین سال رہے۔ نائب صدر اجلاس کامل کا عہدہ صرف انہیں کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ صدر اجلاس کامل خود بیگم صاحبہ مرحومہ تھیں۔ اس طرح نائب صدر کا عہدہ ایک طرح پر وزیر اعظم کا ہی عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے بیگم صاحبہ بھوپال کے ریاست سے باہر جانے پر دوچار دن ان کی نیابت بھی کی۔ جب یہ بھوپال سے واپس آئے تو نائب صدر کا یہ عہدہ بھی ختم کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ضمیر الدین احمد مرحوم بیک وقت چیف سکریٹری کا عہدہ بھی سنبھالے رہے۔ ان کے واپس آنے کے بعد بیگم صاحبہ مرحومہ نے چیف سکریٹری کا عہدہ اپنے صاحبزادے نواب سر حمید اللہ خاں مرحوم کو تفویض کر دیا تھا۔

چونکہ گھر پر زمینداری کے انتظام میں سید ضمیر الدین احمد مرحوم کی غیابت میں دقتیں پڑ رہی تھیں اسلئے انہوں نے بجبوری اپنا استعفیٰ ڈھائی تین سال کی ملازمت کے بعد بیگم صاحبہ مرحومہ کے سامنے پیش کیا۔ بیگم صاحبہ استعفیٰ منظور کرنے پر مطلق تیار نہ تھیں۔ سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے ان کو اپنی مجبوریاں سمجھائیں کہ کس طرح ان کی غیر حاضری میں ان کے گھر کے انتظامات درہم برہم ہو رہے ہیں۔ بالآخر بیگم صاحبہ مرحومہ راضی ہوئیں، پروانۂ خوش نودی ملا اور یہ شرط بھی عائد کی گئی کہ

اگر گھر کے انتظامات درست ہو جائیں تو پھر سید ضمیر الدین احمد بھوپال واپس آجائیں۔

۱۹۱۲ء میں الہ آباد ایکزبیشن کے اندر سید ضمیر الدین احمد مرحوم کی ملاقات بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال سے اچانک ہوگئی۔ بیگم صاحبہ مرحومہ ایکزیبیشن دیکھنے کے لئے ایکزیبیشن (نمائش) کے وسیع احاطے میں جو میلوں میں پھیلا ہوا تھا اپنی موٹر کار پر تشریف لائی تھیں۔ نواب سر حمید اللہ خاں مرحوم، جو بیگم صاحبہ مرحومہ کے صاحبزادے اور بعد میں ان کے جانشین بھی ہوئے، وہ موٹر پر ساتھ تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ سید ضمیر الدین مرحوم بھی اس زمانے میں مشہور زمانہ اور یادگار ایکزی بیشن دیکھنے کو الہ آباد پہنچے تھے۔ میں بھی باوجود اپنی کمسنی کے ان کے ساتھ تھا ایکزی بیشن کے حدود میں ایک جگہ سید ضمیر الدین مرحوم اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ گزر رہے تھے کہ ایک بڑی اعلیٰ درجے کی موٹر کار ان کے پاس کچھ دور پر آکر رکی اور نواب سر حمید اللہ خاں دروازہ کھول کر اترے۔ سید ضمیر الدین احمد صاحب مرحوم نے جب ان کو موٹر سے اترتے دیکھا تو لپک کر ان کی طرف بڑھے۔ دو تین منٹ ان سے گفتگو کرنے کے بعد سید ضمیر الدین احمد مرحوم موٹر کے بالکل قریب آگئے۔ موٹر کے اندر ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے ان کو سلام کیا پھر ضمیر الدین احمد مرحوم صاحب سے اور ان سے کچھ باتیں ہونے لگیں۔ ہم لوگ کچھ دور پر کھڑے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد سید ضمیر الدین احمد صاحب سامنے ان معزز خاتون کو سلام کیا۔ نواب سر حمید اللہ خاں مرحوم باہر ان کے بغل ہی میں تھے۔ وہ پھر دروازہ کھول کر موٹر کار کے اندر ہی جاکر بیٹھ گئے۔ اور سید ضمیر الدین احمد مرحوم کو سلام کیا اور موٹر کار آگے بڑھ گئی۔ سید ضمیر الدین احمد مرحوم جب ہم لوگوں کے پاس آئے تو انہوں نے بیان کیا کہ موٹر کار کے اندر بیگم صاحبہ بھوپال تشریف رکھتی تھیں اور وہ نوجوان جوان کے ساتھ تھے وہ ان کے صاجزادے نواب سر حمید اللہ خاں تھے۔ گفتگو کے متعلق کہا کہ بیگم صاحبہ کا اصرار تھا کہ تم بھوپال آجاؤ مگر میں نے بلطائف الحیل ان کے آفر (پیشکش) کو بہ مشکل یہ

کہہ کا ٹالا کہ اگر مجھے گھر کے معاملات سے فرصت ملی تو ضرور بھوپال آجاؤں گا۔

اسی ضمن میں پہلے یہ لکھنا بھول گیا کہ بھوپال سے آنے کے بعد ہی ہزہائنس مہاراجہ صاحب گوالیار نے سید ضمیر الدین احمد مرحوم کو ایک گراں قدر ملازمت کی پیش کش کی جس کو انہوں نے بحیلہ احسن ٹال کر انکار کر دیا تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ سید ضمیر الدین احمد مرحوم بھوپال سے آنے کے بعد کسی دیسی حکومت میں ملازمت کرنے کو تیار نہ تھے۔

۱۹۲۱ء کے آخری مہینوں میں سید ضمیر الدین احمد مرحوم بیمار پڑے، بیماری نے طول کھینچا اور ۱۹۲۲ء کے جنوری کے مہینہ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور صدر گلی کے خاندانی مقبرہ محلّہ کٹرہ میں اپنے پیرومرشد حاجی خدابخش رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ ان کے انتقال پر گورنر اور بڑے بڑے انگریز حکام، بیگم صاحبہ بھوپال، مہاراجہ گوالیار اور ہندوستان کے بہت سے معززین، علماء اور مشائخ کے تار و خطوط آتے رہے۔ چند ادبی اور سماجی حلقوں میں تعزیتی جلسے بھی ہوئے۔

----☆☆☆----

ڈاکٹر سچتا نند سنہا

ضلع شاہ آباد کے ایک گاؤں مُرار (Murar) میں سچتا نند سنہا ۱۸۷۱ء میں ایک کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ کون جانتا تھا کہ یہ نونہال بڑا ہو کر اپنے وقت کا ایک بڑا ناقد، ایک بڑا گراں مایہ ادیب، گراں قدر جرنلسٹ ہونے کے علاوہ ایک ایسی گراں قدر ہستی کا حامل بھی ہوگا جس کی صدارت میں ہندوستان کا دستور سیاسی قومی نمائندوں کی کلی اتفاق کے ساتھ منظور ہو کر ملک کے وقار و یکجہتی کا ضامن ہوگا۔ ان کی ابتدائی تعلیم پٹنہ اور انتہائی تعلیم بھی پٹنہ ہی میں ہوئی۔ جب ۱۸۸۹ء میں مسٹر سنہا انگلستان سے بیرسٹری کی سند لے کر آئے تو ہندوستان میں بیرسٹروں کی کمی نہ تھی۔ تقریباً ہر معزز خاندان کا دو ایک فرد بیرسٹری کی سند لے کر یا کم از کم کچھ دنوں کے

لئے انگستان کی ہوا کھا کر واپس آ رہا تھا۔ سچ پوچھئے تو انہیں لوگوں نے کہیں تو بالواسطہ اور کہیں بلاواسطہ ہندوستان میں آزادی کا بیج بویا۔ مسٹر سچتا نند سنہا پہلے کچھ دنوں تک الہ آباد میں بیرسٹری کرتے رہے۔ ان کی شادی پنجاب کے ایک بہت بڑے متمول گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کی اہلیہ اپنے میکے سے بڑی دولت اور جائیداد ساتھ لائی تھیں۔ کچھ دنوں بعد مسٹر سنہا الہ آباد چھوڑ کر پٹنہ آگئے۔ اس وقت سر سید علی امام اور مسٹر سید حسن امام پٹنہ میں بیرسٹری کر رہے تھے۔ ان دونوں سے جب مسٹر سنہا کی ملاقات کی تجدید ہوئی تو محبت اور دوستی کا رشتہ اتنا مضبوط ہوتا گیا کہ صُلبی برادری بھی اس کے آگے ہیچ معلوم ہونے لگی۔ سید علی امام بڑے بھائی تھے، مسٹر سچتا نند سنہا منجھلے بھائی اور مسٹر سید حسن امام چھوٹے بھائی۔ ہر جگہ یہ تینوں بڑے منجھلے اور چھوٹے بھائی کہلاتے تھے۔ اس وقت دماغ میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ اٹوٹ رشتہ بعد میں خاندان در خاندان چلتا رہے گا۔ سیاسی تحریکوں میں تینوں ساتھ ساتھ نظر آتے، پھر سیاسی تحریک میں تینوں کی معاونت ساتھ ساتھ ہوتی۔ نجی معاملوں میں بھی یہ تینوں ایک دوسرے کے مشیر اور مددگار رہتے۔ اس زمانے کے ماحول کے مطابق مسٹر سچتا نند سنہا نے فارسی کی مکمل تعلیم گھر پر مولویوں سے حاصل کی تھی، اس میں ان کو اعلیٰ درجے کی دست گاہ تھی۔ انہوں نے جو گنگا جمنی سماجی محفلیں اپنے زمانے میں دیکھی تھیں اپنی آخری عمر میں ان کی یاد کو اپنے سینے سے لگائے رہے بلکہ اپنے آخری زمانے میں بھی ایسی محفلیں جماتے۔ یہی وجہ تھی کہ سچتا نند سنہا کے یہاں ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال نہ تھا۔ اور ان کے یہاں کی کسی تقریب میں یا ان کی اٹھائی کسی تحریک میں ہندو اور مسلمان کا امتیاز نظر نہ آتا تھا۔ سچتانند سنہا کو اللہ تعالی نے دولت بھی دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ان سے بھی زیادہ دولت مند بیوی بھی دی تھی۔ بیرسٹری تو برائے نام تھی مگر یہ تحریک میں سر سید علی امام اور حسن امام کے مددگار کی حیثیت سے ساتھ رہتے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ سر سید علی امام اور حسن امام جب اونچے اٹھے تو سچتانند

سنہا بھی ان کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ سر علی امام اور مسٹر حسن امام بیرسٹری میں لگے رہے اور تمام ہندوستان میں ان دونوں نے اپنے نام کا ڈنکا بجایا۔ ادھر مسٹر سچتانند سنہا بھی اپنی صحافت اور علمی صلاحیت سے تمام ہندوستان میں روشناس ہوئے۔ ''ہندوستان ریویو'' کے بانی اور ایڈیٹر مسٹر سنہا ہی تھے۔ ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ انگلستان میں بھی ''ہندوستان ریویو'' اپنے مضامین کے لحاظ سے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر چنتا منی کے ساتھ مسٹر سنہا الہ آباد کے انگریزی اخبار انڈین پیپل(Indian People) کے جوائنٹ ایڈیٹر بھی بہت دنوں رہے۔ یہ اخبار آخر میں ''لیڈر'' کے نام سے موسوم ہوا۔ان سب کے علاوہ اور بھی انگریزی اخبارات اور معزز رسالوں میں مضمون چھپتے اور تمام ہندوستان میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔سب سے پہلے سچتانند سنہا کے جوہر ہندوستان میں کھلے جس کی وہ ادارت بھی کرتے تھے۔ اوراس میں دیگر مضامین بھی لکھتے تھے۔ آگے چل کر ان کے اعلیٰ مضامین کی مانگ انگریزی کے ہر معیاری پرچوں میں ہونے لگی۔انہوں نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد ان کے نام پر ایک بہت بڑے کتبخانہ کی بنیاد رکھی اوراپنی زندگی ہی میں اس کو صوبہ کا بہت بڑا کتبخانہ بنا کر عوام کے لئے پیش بھی کر دیا۔یہ کتبخانہ آج بھی آب و تاب کے ساتھ قائم ہے اور سچتانند سنہا کی متوفی بیوی کے نام پراس کا نام رادھیکا سنہالائبریری ہے۔ اس کتب خانے میں ہزاروں کتابیں انہوں نے خرید کر جمع کیں اور ہر سال سینکڑوں کتابوں کا اضافہ اپنی زندگی میں کرتے چلے گئے۔ ان کے وسیع مطالعہ پر حیرت ہوتی تھی۔ ان کی زندگی میں ان کی لائبریری کی جس کتاب کو اٹھا کر دیکھیئے تو اس میں مسٹر سچتانند سنہا کے مطالعے کے آثار شروع سے آخر تک نظر آتے۔

مسٹر سنہا مخلص قوم پرست تھے۔ علی امام اور سید حسن امام کے ساتھ مل کر کانگریس کو بہار میں آگے بڑھاتے رہے۔ اور جب پٹنہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس منعقد ہوا تو مسٹر حسن امام اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس اجلاس

میں بھی مسٹر سنہا آگے آگے تھے۔ جس زمانے میں سر علی امام وائسرائے کی ایکزیکیٹو کانسل کے ممبر اور لارڈ ہارڈنگ وائسرائے تھے تو صوبہ بہار کو بنگال سے الگ کرنے کی تجویز سر علی امام نے حکومت ہند کے سامنے پیش کی اور اس پر زور دے کر صوبہ بہار کو بنگال سے الگ کرایا۔ اس معاملے میں مسٹر سچتانند سنہا سر علی امام کے سب سے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ علی امام صوبہ بہار کے معمار اوّل تھے۔ ان کے ساتھ ہی مسٹر سچتانند سنہا کا بھی نام آتا ہے۔

جب سر علی امام اور مسٹر حسن امام ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے بعد ہی یہ عملی سیاست سے علیحدہ ہو گئے تھے مگر ہندوستان کی بھلائی کا جو معاملہ پیش آتا تو اس میں مدد کرنے سے پیچھے نہ رہتے تھے۔

مسٹر سچتانند سنہا کی صلاحتیں ہر جگہ ان کے کام آتیں۔ جب صوبہ بہار کے گورنر کی ایکزیکیٹو کانسل کے ممبر ہوئے تو بڑے پائے کے ناظم ایڈمنسٹریٹر ثابت ہوئے۔ جب پٹنہ یونیورسیٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو یونیورسیٹی کے انتظامات کو بہتر طریقے پر چلایا کئے اور اس کے صلے میں L.L.D کی اعزازی ڈگری یونیورسیٹی نے ان کو دی تھی۔ ان سب اعزاز سے بڑھ کر اعزاز تو یہ تھا کہ مسٹر سنہا ہندوستان کی آزادی کے وقت میں ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی (انڈین کانسچوانٹ اسمبلی) کے صدر ہوئے اور انہیں کی دستخط سے ہندوستان کے جدید آئین کا نفاذ ہوا۔

فارسی اور اردو کے سینکڑوں اشعار ان کو یاد تھے۔ موقع موقع سے ان کو گفتگو کے درمیان اس طرح بر محل پڑھتے کہ طبیعت پھڑک اٹھتی۔ ڈاکٹر اقبالؔ کے دوست تھے اور ان کے بڑے مداح بھی تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی شاعری پر ایک تنقیدی کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کے اشعار بھی مسٹر سنہا کو خوب یاد تھے اور مزہ لے کر ان کو خوب پڑھتے تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ کے معترف تھے مگر ان سے سیاست میں اختلاف تھا۔

جوانی میں ورزش کا شوق تھا اور یہ شوق آخری عمر تک قائم رہا۔ ہمیشہ دو ایک پہلوان اُن کی خدمت میں رہتے تھے۔ چونکہ اپنی صحت کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے اس لئے بڑھاپے میں بھی ٹاٹھے تھے۔ رادھیکا سنہا لائبریری سے ملحق ان کا عالیشان مکان تھا۔ کھلانے پلانے کا بڑا شوق تھا۔ آئے دن باہر سے مہمان بھی ان کے یہاں آتے رہتے تھے۔ لباس اور وضع قطع سے امتیاز مشکل تھا۔ پاؤں میں کبھی چوڑی دار پائجامہ، کبھی خالطہ پائجامہ، بدن پر گرمیوں کے دنوں میں ململ کا کرتہ پہنتے جس پر سوزن سے کٹاؤ اور پُھول بنے ہوتے۔ کبھی شیروانی اور کبھی اچکن پہنتے۔ سر پر لکھنؤ کے پلّے کی ٹوپی ہوتی۔ انگریزی کے بہت اچھے مقرّر تھے۔ مگر اردو میں بھی خوب تقریر کرتے تھے۔ ان کا آخری زمانہ تھا اور ۱۹۴۶ء میں وہ بھی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسی زمانہ میں میں بھی اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا تھا۔ اسمبلی میں جو تقریر وہ کرتے تھے وہ انگریزی میں کرتے تھے مگر غالباً ۱۹۴۸ء میں ایک دن جب سید امین احمد مرحوم اسمبلی میں اپنی لانبی اردو کی تقریر ختم کر چکے تو مسٹر سنہا ان کے بعد تقریر کرنے کو کھڑے ہوئے تو اردو ہی میں اس دفعہ انہوں نے شروع کی ان کی تقریر کا پہلا جملہ مجھے آج تک یاد ہے۔ تقریر یوں شروع کی۔ ابھی مرے دوست بڑی اچھی تقریر کر چکے ہیں۔ آگے ان کے فروغ پانا سورج کو چراغ ہے دکھانا۔

پر بحر سخن صدا ہے باقی　　دریا نہیں کار بند ساقی

تقریر کیا تھی معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت و بلاغت کا دریا لہریں لے رہا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ جب انکی تقریر ختم ہوئی تو اسمبلی میں ان سے بہتر اردو میں تقریر کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ اردو کے اشعار پڑھتے جاتے تھے جو اتنے بر محل ہوتے تھے کہ جو حضرات اردو کی دانست نہ رکھتے وہ بھی ان کی تقریر پر محو ہوتے۔ ہر لفظ میں ادب کا چٹخارا تھا۔ اتنی شستہ اور رنگین تقریر تھی کہ اس کا مزہ آج تک مجھے یاد ہے۔

اسمبلی میں تقریروں کی رپورٹنگ کا اس وقت یہ قاعدہ تھا کہ انگریزی میں جو تقریریں ہوتی تھیں وہ تو من و عن انگریزی ہی میں رپورٹ ہو کر اردو میں چھپتی تھیں۔ مگر ہندو اگر خالص اردو میں بھی جو تقریر کرتے تھے وہ ہندی میں لکھی جاتی تھیں اور ہندی ہی میں ہندی کی تقریر سمجھ کر چھپتی تھیں۔ چھپنے سے پہلے تصیح کے لئے ہر تقریر مقرر کے پاس بھیجی جاتی تھیں۔ تماشہ دیکھئے کہ مسٹر سچتا نند سنہا کی خالص اردو میں ان کی ادبی تقریر باقاعدہ ہندی میں لکھی گئی اور ان کے پاس ہندی ہی میں تصیح کے لئے بھیجی گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے کا واقعہ ہے کہ مسٹر سنہا نے جب اپنی تقریر ہندی میں لکھی ہوئی دیکھی تو غصہ میں رپورٹر کے آگے پھینک ماری اور بولے کہ میں نے تو اردو میں تقریر کی تھی یہ ہندی میں کہاں سے نکل آئی۔ رپورٹر نے معذرت کے ساتھ قاعدہ کا حوالہ دیا تو اور بگڑے کہ یہ قاعدہ و قانون ہندی والوں کے ساتھ برتو میں اردو ہی بولتا ہوں اور اسی میں اپنی تقریر کی رپورٹنگ چاہتا ہوں۔ نہ معلوم اس کے بعد کیا ہوا مگر یہ تو سبھوں کو معلوم تھا کہ مسٹر سنہا ہندی لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہیں تھے۔

ایک دفعہ میں ان کے پاس گیا دو چار اشخاص اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگے۔ اتنے دن کہاں رہے اب تو آتے بھی نہیں ہو۔ میں نے جواب دیا کہ اسمبلی میں تو نیاز حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ ہنسکر فرمایا کہ اسمبلی اور گھر میں فرق ہے پھر سیاست پر باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ ابھی چھوڑو سیاست کو اور میری طرف مخاطب ہوئے اور کہا اس سیاست کے پھیرے میں تم نے تو اردو فارسی ادب کا مطالعہ تو نہیں چھوڑا؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ اب وقت ہی نہیں ملتا پہلا پڑھا لکھا کچھ دماغ میں مگر ابھی باقی ہے۔ فوراً فرمائش ہوئی کہ میرؔ کا کوئی اچھا شعر سناؤ۔

کچھ نہ دیکھا پھر بجز ایک شعلہ پر پیچ و تاب

شمع تک ہم نے بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

یہ شعر سنا تو پھڑک اٹھے پھر فرمایا کہ غنیمت ہے کہ سیاست سے تمہارے دماغ میں ابھی خشکی نہیں پیدا ہوئی ہے۔

ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کے پاس کچھ لوگ ہوتے اور نجی باتیں ہوتیں تو شعر و شاعری کا بھی ذکر نکل آتا۔ خود بھی استادوں کے شعر پڑھتے اور دوسروں سے بھی فرمائش کرتے تو کوئی اچھا سا اردو فارسی کا شعر سناؤ۔ حافظہ اتنا اچھا تھا کہ اگر لوگ اچھا شعر سنانے سے قاصر رہ جاتے تھے تو خود کسی استاد کا معیاری شعر پڑھ دیتے۔ ان کا ایک واقعہ اور سُن لیجئے۔ ایک دفعہ نواب زادہ سید محمد مہدی نے مجھ کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ آپ میر تقی میؔر کا کوئی پھڑکتا ہوا شعر تو سنایئے میں نے پوچھا کہ کیوں؟ خیریت تو ہے؟ کہنے لگے کہ ابھی مسٹر سنہا نے اپنے یہاں سے مجھے ٹیلی فون کیا ہے اور ایک ایسے شعر کی فرمائش کی ہے۔ میں نے نواب زادہ کو ایک دو شعر پڑھ کر سنائے تو انہوں نے جواب میں میؔر کا یہ شعر پڑھا۔

میرے تغیر حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

میں نے نواب زادہ کو کہا کہ یہی شعر بہتر ہے آپ مسٹر سنہا کو یہی شعر پڑھ کر سنا دیجئے۔ چنانچہ نواب زادہ نے ان کو یہی شعر سنایا اور وہ پھڑک اُٹھے۔

گھر پر انگریزی فیشن کا کُل سامان تھا، پورا صاحبی ٹھاٹھ باٹ تھا مگر حقیقت میں پرانے فیشن کے بڑے دلدادہ تھے۔ یہ بھی غالباً ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کا قصہ ہے کہ بہار اسمبلی اس سال بڑی گرمیوں تک چلتی رہی۔ گرمی کی شدت کے سبب سے اسمبلی کا اجلاس شام میں ہوتا اور دس بجے رات تک چلتا رہا۔ گرمی میں بدن پر زیادہ کپڑا بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایک دن میں صرف کُرتا اور پائجامہ ہی میں اسمبلی کے اجلاس کی

شرکت کے لئے چلا گیا۔ شیر وانی اس دن سخت بھاری معلوم ہو رہی تھی۔ اندر جاکر میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ مسٹر سنہا کی جگہ بھی میری نشست سے قریب ہی تھی۔ وہ کچھ پہلے ہی آگئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ جب اسمبلی کا اجلاس تھوڑی دیر کے لئے ملتوی ہوا تو میں باہر نکلا۔ مسٹر سنہا بھی باہر آئے اور مجھے لپک کر پکڑا اور کہنے لگے کہ بدرالدین یہ تم نے احمقوں کی کیوں وضع بنالی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ گرمی میں زیادہ کپڑا تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے اور پھر آجکل تو یہ بڑے لیڈروں کی وضع بھی ہے۔ چڑھ کر بولے کہ چھوڑو ان کانگریسیوں کو انہوں نے تو اپنے باپ دادا کی وضع چھوڑ کر نہ جانے کہاں کی وضع اختیار کی ہے۔ نہ اِدھر کے ہیں اور نہ اُدھر کے۔ اگر تم کو اس گرمی میں شیروانی جبر ہو تو انگرکھا پہنو۔ صرف کرتے اور پائجامہ سے شریفانہ ستر پوشی نہیں ہوتی۔ دیکھو میں نے خود انگرکھا اور لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی پہن رکھی ہے۔

سید علی امام اور سید حسن امام کے انتقال کے بعد جو اُن کے روحانی بھائی تھے یہ بہت دنوں تک زندہ رہے۔ سر سید علی امام اور سید حسن امام کے بعد لوگ اب انہی کو ان دونوں کا قائم مقام سمجھتے تھے۔ سر سید سلطان احمد رشتہ میں سر سید علی امام اور سید حسن امام کے چچا ہوتے تھے۔ اگرچہ سلطان ان دونوں سے عمر میں بہت کافی چھوٹے تھے مگر پرانی تہذیب و روایت کے بڑے دلدادہ تھے۔ سر سید علی امام اور سید حسن امام ہائیکورٹ ہو، سیاسی انجمن ہو یا نجی صحبت ہو ہر جگہ سید سلطان احمد کو چچا کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ مسٹر سچتا نند سنہا بھی اسی لئے سر سید سلطان احمد کو ہمیشہ چچا ہی کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ یہ سر سلطان احمد سے سن میں بہت بڑے تھے۔ شاید ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت سر سید سلطان احمد وائسرائے ہند کی ایکزی کیوٹیو کانسل کے ممبر تھے۔ گرمیوں میں شملہ میں حکومت کا قیام تھا۔ اسی زمانہ میں مسٹر سچتا نند سنہا بھی شملہ پہنچے۔ ایک دن وائسرائے کے یہاں ڈنر تھا۔ اس میں سر سلطان احمد اور دوسرے اعلیٰ

حُکام کے ساتھ مسٹر سچدانند سنہا بھی مدعو تھے۔ ڈنر کے درمیان گفتگو میں مسٹر سچدانند سنہا نے سر سید سلطان احمدؒ کو چچا کہہ کر مخاطب کیا تو وائسرائے چونکے اور مسٹر سنہا سے پوچھا آپ ہندو ہیں اور سر سلطان مسلمان ہیں پھر یہ کس طرح آپ کے چچا ہوگئے۔ مسٹر سنہا نے ہنس کر جواب دیا کہ میرے یہاں ہندو اور مسلمان کا سوال ہی نہیں میں روابط کو خون کے رشتہ سے زیادہ مضبوط سمجھتا ہوں۔ غالباً ہندو مسلم اتحاد اور وضع داری کی اس سے بہتر مثال نہیں دی جاسکتی۔

اپنے لڑکے آر کے سنہا کی شادی کرنے لگے تو ایک دن مسٹر سید عبدالعزیز بیرسٹر کے یہاں آئے۔ ان کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اور پیار سے عجوؔ کہتے تھے۔ کہنے لگے کہ عجو! تمہارے بھتیجے کی شادی ہے، میں دو باتوں کے لئے تمہارے یہاں آیا ہوں۔ ایک تو یہ کہ کسی اچھے انشا پرداز سے اس شادی کا اردو میں رقعہ لکھوادو۔ میں صرف انگریزی اور اردو میں رقعہ چھپوا کر تقسیم کروں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ دعوت کے لئے جس طرح تم اپنے مغلیہ ڈنر دیتے ہو اس طرح کا انتظام کردو۔ میں نہ تو پوری کچوری کھلاؤں گا اور نہ سولہ آنہ انگریزی کھانا دوں گا۔ مسٹر عبدالعزیز مرحوم نے مسٹر سچدانند سنہا سے کہا کہ بھائی صاحب اردو میں رقعہ تو ابھی لکھوائے دیتا ہوں۔ سید عبدالرحیم جو میرے سکریٹری ہیں بڑے اچھے انشا پرداز ہیں وہ ابھی لکھ دیں گے اور مغلیہ ڈنر کا وہی انتظام کریں گے۔ اس کے بعد سید عبدالرحیم کو وہیں مسٹر عبدالعزیز مرحوم نے بلا بھیجا وہ آئے تو اردو میں ایک اچھا رقعہ لکھنے کو ان سے کہا۔ سید عبدالرحیم نے کچھ غور کے بعد وہیں پر رقعہ کا مضمون لکھ کر مسٹر سچدانند سنہا کے سامنے پیش کیا۔ مسٹر سچدانند سنہا نے رقعہ پڑھا تو سید عبدالرحیم سے بولے کہ میاں کس طرح کا تم نے رقعہ لکھا ہے نہ تو شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے اور نہ اس کے بعد نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اس رقعہ کو درست کردو اور عمدہ کارڈ پر چھپنے کے لئے چھاپہ خانہ میں بھیج دو کہ وقت پر مجھے مل جائے۔

۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہزاروں کی تعداد میں شریک جنازہ تھے۔ پٹنہ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ دریا کے کنارے جب تک ان کی اَرتھی کو آگ نہ دی گئی ہزاروں کا مجمع ادب سے کھڑا رہا۔ حکومت نے بھی ان کے جنازے میں پورا سرکاری اعزاز برتا اور ملٹری نے سلامی دی۔

☆☆☆☆☆☆☆

سَر سَیّد سُلطان احمد

یہ بات جانتے ہوئے کہ اس وقت کے قانون داں طبقوں میں ایسی اور بھی ہستیاں موجود تھی جن کی علمی صلاحیت، خطابت اور جاذبیت اور ان کی حیات بخش بے جان مقدمات میں جان ڈال دیتی تھیں اور کتنے مایوسانِ انصاف صحیح طور پر اپنے حق کو پہنچتے تھے۔ ان کا شہرہ تمام ہندوستان میں پہونچا ہوا تھا اور ملک کے ہر حصہ میں بڑے بڑے مقدمات میں شدت سے ان کی مانگ رہتی تھی، ایسی حالت میں میرا صرف سر سید سلطان احمد مرحوم کو چن کر ان کا تذکرہ لکھنا شاید بہتوں کو تعجب انگیز معلوم ہوگا مگر حقیقت یہ ہے کہ جہاں سر سید علی امام، سید حسن امام، سید وصی احمد، پی آر داس، پی-سی-مانک، سر فخر الدین، سوشِل مادھو ملِک، دوارکا ناتھ مشر، سید عبدالعزیز اور محمد یونس کا پیشہ قانون میں ان کی عظمت و صلاحیت کا تذکرہ آتا ہے ہر پڑھا لکھا بڑی عقیدت کے ساتھ ان کا نام لیتا ہے۔ لیکن اس تذکرے میں میں نے صرف اسی بات پر بَس نہیں کیا ہے۔ وہ دَور جس کا ذکر اس مضمون میں کر رہا ہوں وہ نشاۃ ثانیہ کا دور تھا۔ اس دور میں تمام قابل فخر صلاحیتیں کھل کر اُبھر رہی تھیں یا اُبھر چکی تھیں جس میں سب سے زیادہ مقبول وہ صلاحیت تھی جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ اس دور کی ہماہمی اس لحاظ سے اور بھی بڑھی ہوئی تھی کہ اس وقت یہاں مغرب و مشرق کے سماج کا سنگم بن گیا تھا۔ اگرچہ الگ مشرقی تہذیب کے تمام اقدار بھی قائم تھے اور انگلستان سے آئے ہوئے کچھ انگریزی داں طبقے میں مغربی تہذیب بھی جگہ بنا چکی تھی اس کے

باوجود اکثر یورپ کے تعلیم یافتہ افراد کی مغربی تہذیب اور رہن سہن میں بہت کچھ مشرقیت پائی جاتی تھی۔ ایسے ہی لوگوں کے یہاں جاکر اور ان سے گفتگو کرنے میں عوام کو اجنبیت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ سر سلطان احمد کی ذات بھی ایسی ہی تھی۔ ان کا مکان باوجودیکہ ظاہری رہن سہن کے اعتبار سے مغربی معاشرت کا نمونہ معلوم ہوتا تھا مگر اپنے گھر میں وہ ہندوستانی معلوم ہوتے تھے۔ کبھی قمیض کبھی کرتا، پاؤں میں خالطہ پائجامہ، جاڑا ہوا تو کاشمیری شال کاندھے پر، بیٹھے ہوئے حاضرین سے گفتگو کرتے نظر آتے۔ لوگوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے۔ مغربی تہذیب کے دلدادہ بھی، کبھی کوئی انگریز بھی اور پھر ہندوستانی بھی۔ ڈریسنگ گاؤن بھی پہنتے تھے مگر اس کا استعمال کم ہی ہوتا تھا۔ مقدمات اور سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی۔ یہ اپنی علمیت اور خوش بیانی سے سبھوں کو محو رکھتے۔ سر سلطان احمد نجی گفتگو میں پکے ہندوستانی معلوم ہوتے اور پورا خاندان اسی ماحول کا دلدادہ تھا جس کو ہندوستانیوں نے مِل جُل کر بنایا تھا اور جس کو گنگا جمنی سماج کہتے ہیں جس کے مٹتے ہوئے آثار آج بھی قائم ہیں۔

سر سلطان احمد ۱۸۸۰ء میں اپنے آبائی گاؤں موضع پالی ضلع گیا میں پیدا ہوئے۔ بھائیوں میں یہ منجھلے تھے ان کے بڑے بھائی سید ہادی حسین مرحوم بھی بیرسٹر تھے۔ سر سید سلطان احمد کے والد سید خیرات احمد صاحب گیا میں وکالت کرتے تھے اور بڑے نامی وکیلوں میں تھے۔ سر سید سلطان احمد نے بی-اے تک پٹنہ کالج میں تعلیم حاصل کی پھر انگلستان چلے گئے۔ جہاں سے بیرسٹری کی سند ۱۸۹۵ء میں حاصل کی پھر ہندوستان آکر کلکتہ ہائیکورٹ میں وکالت شروع کی۔ کلکتہ ہائیکورٹ میں ان کی پریکٹس بارہ تیرہ برس رہی جہاں وہ اپنی صلاحیت کے باعث ڈپٹی لیگل ری ممبرینسر (Deputy Legal Remambrancer) بھی مقرر ہوئے پھر جب ہائیکورٹ ۱۹۱۶ء میں پٹنہ میں قائم ہوا تو کلکتہ ہائیکورٹ سے پٹنہ ہائیکورٹ میں منتقل ہوگئے۔ یہاں بھی پہلی دفعہ ڈپٹی لیگل ری ممبرینسر کا عہدہ ملا۔ اس کے بعد وہ پٹنہ ہائیکورٹ میں

گورنمنٹ ایڈوکیٹ ۱۹۱۷ء میں مقرر ہوئے اور ۱۹۳۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس وقت پٹنہ ہائیکورٹ میں ایڈوکیٹ جنرل کا عہدہ قائم نہیں ہوا تھا۔ اسی درمیان میں ایک سال کے لئے ہی پٹنہ ہائیکورٹ کے جج بھی مقرر ہوئے پھر خود ہی اس عہدے سے اکتا کر الگ ہو گئے۔ انہیں دنوں ان کی پریکٹس طوفانی رفتار پکڑ چکی تھی۔ اور یہ ہندوستان کے بڑے بڑے قانون دانوں کی صف میں جگہ بنا رہے تھے۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں شانہ بشانہ ان کے ساتھ نظر آنے لگے۔ درمیان میں دوسری ذمہ داریاں بھی ان کے اوپر آپڑتی تھیں یہ ایجوکیشن کمیشن کے ممبر ۱۹۲۹ء میں مقرر ہوئے پھر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک پٹنہ یونیورسیٹی کے وائس چانسلر رہے۔ یہاں انہوں نے اپنا شاندار ریکارڈ چھوڑا ہے۔ پھو گول میز کانفرنس میں جاکر ہندوستانیوں کی نیابت کی۔ ۱۹۳۲ء میں بہار کے گورنر کی اکزیکوٹیو کانسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ دو دفعہ وائسرائے کی اکزیکوٹو کانسل کے ممبر ۶ سال تک رہے۔ بعد میں چیمبر آف پرنس کے قانونی مشیر ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک رہے۔ واپس آئے تو پھر اپنی شاندار قانونی پریکٹس شروع کر دی۔ یہ بات ان کے دیکھنے والوں میں عجیب معلوم ہوگی کہ درمیان میں جب کبھی اپنی پریکٹس چھوڑ کر دوسرے عہدوں پر فائز ہوتے رہے مگر جب واپس پیشہ میں آئے تو موکلوں کا میلہ فوراً ہی لگ جاتا تھا۔ یہ بات ان کی قانونی صلاحیت و علیمت کی سب سے بڑھ کر سند رہی تھی اور شروع سے آخر تک ان کا اخلاق، ان کا خلوص، ان کی لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت اور ان کی عظیم قانون دانی اور نکتہ رسی ان سب نے ان کو امتیازی حیثیت دے دی تھی۔ سچ پوچھئے تو ان کی ہستی ایک مثالی شخصیت تھی جس کی مثال ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی۔

پٹنہ میں جب ہائیکورٹ قائم ہوا تو سر سلطان احمد بیرسٹری کرنے کے لئے کلکتہ ہائیکورٹ سے پٹنہ ہائیکورٹ آگئے۔ اس وقت صوبہ کی عدالتوں میں سر سید علی امام، حسن امام اور مسٹر پی۔ سی۔ مانک چھائے ہوئے تھے۔ کلکتہ ہائیکورٹ میں صوبہ بہار

کے مقدمات کی پیروی کے لئے صوبہ بہار ہی میں نہیں بلکہ بنگال میں بھی سر سید علی امام اور سید حسن امام کی مانگ رہتی تھی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے وکیلوں میں ان دونوں کا بڑی اہمیت کے ساتھ نام لیا جاتا تھا۔ ایسے میں جب کلکتہ ہائیکورٹ میں سر سلطان احمد اپنی جگہ بنا رہے تھے ان کا پٹنہ ہائیکورٹ آنا اور اجنبی ماحول میں وکالت کے پیشہ کا آغاز کرنا اور چند ہی دنوں میں یہاں کے بڑے سر بر آوردہ وکیلوں میں ان کا بھی شمار ہونا کرامت سے کم نہیں۔ سر سلطان کی احمد کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جیسا بھی مقدمہ ہو وہ معمولی سی بات بھی مؤکلوں کی خندہ پیشانی سے سنتے، ان کو مطمئن کرتے اور اس طرح مقدمہ میں دلچسپی لیتے گویا ان کا اپنا مقدمہ ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ ایک وکالت پیشہ شخص جتنی اہمیت اور شہرت حاصل کرتا ہے وہ اپنی اہمیت اور عظمت سے بھی اپنے مؤکل کو مطمئن اور مرعوب کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر وکیل وکالت کو ایک پیشہ ہی سمجھ کر کام کرتے ہیں جس میں ذاتی دلچسپی وکیل کی نہیں پائی جاتی۔ سر سلطان کا اصول جیسا میں اوپر لکھ چکا ہوں مختلف تھا۔ مقدمہ کے ختم ہو جانے کے بعد مؤکل ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ غرض سر سلطان احمد نے تھوڑے ہی دنوں میں پٹنہ ہائیکورٹ میں سرفہرست وکلاء کے ساتھ اپنی جگہ بنا لی۔ ساتھ ہی ساتھ سرکاری طبقہ اور عوامی طبقہ میں بھی اپنی وجاہت، دیانت داری، صلاحیت، وسیع المشربی، عام ہمدردی اور انکساری کے سبب ہر جگہ مقبول ہوتے گئے۔ وہ ہر وقت آفس نشین نہ تھے۔ اگر آفس میں کام کرتے ہوتے تو آفس کھلا رہتا۔ ہر جگہ ان کے آس پاس قانون کی کتابیں بھیلی ہوتیں، سامنے آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک مؤکل کے کاموں سے نپٹ کر دوسرے کی طرف مخاطب ہوتے، ان کی سنتے، کاغذات پڑھتے، پھر جرحی سوالات کرتے۔ جب مطمئن ہو جاتے تو جو نکتہ ان کو اہم معلوم ہوتا اس کا تطابق نظیروں میں سے ڈھونڈھکر نکالتے۔ یہ کام ختم ہوتا تو پھر تیسری پارٹی کی طرف متوجہ ہوتے رہتے۔ ہائیکورٹ جانے کا وقت آجاتا تو اُٹھ جاتے۔ دوسری طرف سائبان میں

ان کے ملاقاتیوں اور دیگر ضرور تمندوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ دس پندرہ منٹ ان سے باتیں کرنے کے بعد اپنی خواب گاہ میں جاکر کچہری کے کپڑے پہنتے، پھر باہر آکر لوگوں سے معذرت کر کے ہائیکورٹ چلے جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی ضرور تمند جبکہ یہ آفس میں مقدمات کے کاغذات دیکھ رہے ہوتے آفس کے اندر پہونچ جاتا مگر واہ ری تہذیب و انکساری ان کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں نظر نہ آتیں۔ سر سلطان مختصر طور پر اس ضرور تمند سے باتیں کرتے اور جو کچھ کرنا ہوتا اس کا ضرور تمند سے وعدہ کر لیتے پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔

ہائیکورٹ سے آنے کے بعد دو تین گھنٹوں تک ان کے یہاں دربار لگا رہتا۔ خوبصورت مرمریں سائبان میں صوفے اور آرام کرسیاں لگی رہتیں۔ اس وقت بڑے بڑے کلکتہ کے سیٹھ ساہوکار، اوپر درجے کے سرکاری عہدہ دار، وکیل، رئیس حتیٰ کہ چھوٹے بڑے راجہ مہاراجہ سبھی ہوتے مگر سب سے زیادہ ہمت افزادہ نظارہ ہوتا جب اس مجمع میں شکستہ حال لوگ بھی انہیں لوگوں کے شامل بیٹھے نظر آتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر آدمی کی زبان پر ان کا چرچا رہتا۔ مشہور تھا کہ سر سلطان احمد کنگ میکر آف بہار ہیں اور یہ حقیقت بھی تھی۔ سینکڑوں کو ہر شعبہ میں نوکریاں انہیں کے توسط سے ملیں، کتنے ہائی کورٹ کے جج انہیں کے اثر و رسوخ سے بنے۔ صرف یہی نہیں ضرور تمندوں کے کام بھی ہمیشہ انہیں کی سفارش سے نکلتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ سنئے۔ ایک دن میرے ایک دوست اپنے ایک عزیز کو لیکر میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ سلطان احمد صاحب کے یہاں چلکر ذرا انکی سفارش کردو۔ یہ واقعہ غالباً ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۲ء کا ہے۔ اصلی سفارش تو راجہ صاحب گڑھ بنیلی سے کرنی تھی جن کے نام میرے دوست کے عزیز اپنی ایک بڑی جائداد اٹھارہ بیس ہزار سالانہ آمدنی کی بیع الوفا (Conditional sale) کر چکے تھے اور اس کی مدّت کے ختم ہونے میں اب پندرہ بیس دن باقی رہ گئے تھے۔ اپنے دوست سے کہا کہ اتنی بڑی سفارش کے لئے ان

کے بہت قریبی دوستوں سے کیوں تحریک نہیں کرتے ۔ اگر چہ سلطان احمد صاحب مجھے عزیز رکھتے ہیں لیکن میرا ان کا کیا جوڑ، وہ ہر طرح مجھ سے بڑے ہیں۔ اس لئے ان پر میرا اثر ہی کیا پڑے گا۔ میرے دوست نے کہا کہ ان کے قریبی دوستوں سے مل چکا۔ انہیں کے مشورے پر تمہارے پاس آیا ہوں۔ سبھی کہتے ہیں لہ سلطان احمد صاحب تم کو بہت عزیز رکھتے ہیں وہ تمہاری بات نہ ٹالیں گے ۔ بہر کیف اللہ تعالیٰ کا نام لے کر دوسرے دن میں اپنے دوست اور ان کے عزیز کے ساتھ سلطان احمد صاحب کے یہاں پہونچ گیا۔ وہ اپنے اتروالے کشادہ سائبان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے ملنے والوں کا مجمع تھا، کئی سیٹھ ساہوکار تھے، کئی بڑی صنعتوں کے سربراہ تھے، کچھ وکیل بیرسٹر تھے، کچھ اور ملنے والے۔ ہر آدمی اپنے کچھ کام ہی سے آیا تھا۔ کسی کو مہاراجہ دربھنگہ سے سفارش کرانی تھی، کسی کو حکومت ہند کے حکّام سے سلطان احمد صاحب کے ذریعہ کام نکالنا تھا، کسی کو ان کے توسط سے حکومت سے بڑے ٹھیکے یا پرمٹ حاصل کرنا تھا۔ وکیلوں اور بیرسٹروں کو ان سے کسی بڑے مقدمے کے سلسلے میں کاغذات دکھاکر اور وقت مقرر کر کے ان سے مشورہ لینا تھا یا اپنے مؤکل کے لئے ان کو مقرر (انگیج) کرنا تھا۔ سلطان صاحب نے مجھ کو دیکھا اور میں نے ان کو سلام کیا تو کہنے لگے "بیٹھو تم سے بعد میں باتیں کروں گا۔ رفتہ رفتہ یہ مجمع چھٹتا گیا۔ سب تقریباً اپنے مقصدوں میں کامیاب ہی گئے۔ اب شام کا وقت قریب ہی آگیا تھا۔ سلطان احمد صاحب نے باتفصیل حال پوچھا۔ راجہ صاحب گڑھ بنیلی کے پاس سفارش کرنے کے متعلق جب میں نے ان سے کہا تو کہنے لگے اب تم آئے ہو تو کہنا ہی پڑے گا اور مَیں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ کام ہوجائیگا۔ کیونکہ راجہ صاحب کا کام بھی میری سفارش پر اٹکا ہوا ہے۔ وقت بڑھانے کی مدت پوچھی تو میرے دوست کے عزیز نے چھ ماہ کی مدت بتائی۔ سلطان احمد صاحب نے اپنے اسٹینو کو بلایا۔ اس وقت راجہ صاحب گڑھ بنیلی کے نام سفارش ڈکٹیٹ کرایا جس میں جائداد وغیرہ کی تفصیل کے ساتھ چھ مہینے کے لئے وقت بڑھانے کی

سفارش تھی۔ میرے دوست کے عزیز کو خط حوالہ کرتے ہوئے سلطان احمد صاحب نے کہا کہ آپ جلد جا کر راجہ صاحب سے خود ملئے گا انشاء اللہ تعالیٰ آپ کا کام ضرور ہو جائے گا۔ خط حوالہ کرنے کے بعد سلطان احمد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا پروگرام ہے۔ میں نے جواب دیا یہاں روزہ افطار کرنے کے بعد گھر جاؤں گا۔ سلطان احمد ہنسے اور فرمانے لگے کہ عزیزم بغیر کہنے سے تمہارا افطار آجائے گا۔ پھر آدمی کو بلایا اور کہا کہ اندر زنان خانے میں کہہ دو کہ بدرالدین آئے ہیں اور دو آدمی ان کے ساتھ ہیں۔ افطار کا سارا سامان باہر بھیجدیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد خانپوش سے ڈھکی ہوئی دو بڑی بڑی سینیوں میں افطار کی چیزیں آئیں۔ سائبان میں ایک بڑی میز پر افطار کے متعدد قسم کے سامان لگائے گئے۔ مغرب کا وقت آیا ہم تینوں نے روزہ کھولا اور سلطان احمد صاحب نے بھی تبرکاً دو ایک چیز کھائی اور بولے کے بدرالدین تمہارے طفیل میں میں بھی اس وقت روزہ دار بن گیا۔ اس کے بعد ہم سب واپس گھر لوٹے۔ چند دنوں کے بعد میں معلوم ہوا کہ راجہ صاحب گڑھ بنیلی نے مطلوبہ چھ مہینے کی مہلت میرے دوست کے عزیز کو دے دی۔

ہمدردی اور شرافت نوازی کے جذبے کی پرورش شریف خاندانوں میں بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم کا درجہ سمجھا جاتا تھا اور ایک شخص کا اعلیٰ کردار انہی خوبیوں کے معیار پر تولا جاتا تھا۔ ہم چشموں میں چشمک کے اور فخر و افتخار کی جنگ برابری والوں میں لڑی جاتی تھی۔ مگر عوام کے ساتھ برتاؤ میں اور اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ معاملات میں سیر چشمی، رعایت، مساوات، امداد، ہمدردی اور شرافت نوازی ہر وقت لوگوں کی نظروں کے سامنے ہوتیں۔ ان میں رشتہ داری، دوستی اور شناسائی کا سہارا نہیں لیا جاتا تھا۔ جو بھی ہمدردی اور امداد کے لئے آتا بلا پس و پیش اس کی مدد کرتے اور اس کا کام نکالنے کی کوشش کرتے۔ اس انسانی ہمدردی کا ایک واقعہ سنئے۔ ایک دن میں سلطان احمد صاحب کی خدمت میں گیا ہوا تھا دو چار اشخاص اور بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب دکھن والے سائبان میں تھے۔ برساتی یعنی پورٹیکو سے ہو کر

کوری ڈور طے کرنے کے بعد دلھن کے سائبان میں آنے کا راستہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ کوری ڈور طے کرنے کے دروازہ سے ایک شخص آنا چاہتا تھا پھر جھجک کر ہٹ جاتا تھا۔ سلطان احمد صاحب کی بھی اس پر نظر پڑی۔ انہوں نے اس شخص کو مخاطب کر کے کہا کہ آجایئے آپ جھجھکتے کیوں ہیں؟ اب اس شخص کو آنے کی ہمت ہوئی۔ پاس پہونچا تو دیکھا کہ ایک فلاکت زدہ شریف آدمی ہے۔ میلی سی شیروانی، میلا پائجامہ، سر کی ٹوپی بھی میلی، چپّی لگا ہوا جوتا، کمھلائی صورت آکر کھڑا ہوا۔ سلطان احمد صاحب نے بڑے اخلاق اور خلوص سے کہا کہ تشریف رکھئے اور فرمایئے کہ آپ کس غرض سے آئے ہیں۔ وہ شخص بیٹھ تو گیا پھر بھی کچھ ہراساں تھا۔ سلطان احمد صاحب نے پھر فرمایا کہئے کہئے آپ گھبراتے کیوں ہیں اس گھر کو اپنا گھر سمجھئے۔ وہ شخص کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا حضور بڑی مصیبت میں ہوں اور آپ کی خدمت میں بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔ سلطان احمد نے فرمایا۔ پہلے تو اطمینان سے بیٹھئے پھر باتیں کیجئے۔ وہ شخص بیٹھ گیا پھر کہنے لگا۔ حضور میں دانا پور ریلوے ڈویزن میں کلرک ہوں۔ سوائے نوکری کے کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی کا نہیں ہے، تین چار بچے بچیاں ہیں، بیوی ہے اور میں ہوں۔ مشاہرہ تو زیادہ نہیں تھا مگر کسی طرح بُرے بھلے اسی میں بسر کرتا تھا۔ دو مہینے ہوتے ہیں کہ کچھ کلرک مدّ تخفیف میں آگئے۔ ان میں سے ایک میں ہوں۔ میں نے اپنے بڑے صاحب کے یہاں نظر ثانی کے لئے درخواست دی مگر درخواست نامنظور ہوئی۔ اب فاقہ ہے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حضور کے پاس آیا ہوں کہ حضور اگر سفارش کردیں تو کام نکل جائے۔ سلطان احمد صاحب دو ایک منٹ چپ ہو کر غور کرتے رہے۔ پھر بولے میاں میں تو آپ کے بڑے صاحب کو نہیں جانتا ہوں نہ ان کا نام جانتا ہوں۔ اُس شخص نے نام بتایا تو سلطان صاحب نے سر ہلایا اور کہا کہ بھئی میرے لئے یہ نام بھی نیا ہے۔ بہر حال آپ کی سفارش ضرور کروں گا۔ پھر انہوں نے اپنے اسٹینو مصطفیٰ کو بلایا اور کہا کہ میں لکھواتا ہوں یہ خط لکھو۔ یہ خط دانا

پور کے ریلوے ڈویژن کے سپرنٹنڈنٹ کے نام تھا۔ اس میں سلطان احمد صاحب نے لکھا کہ اس خط کو لیجانے والے میرے بہت قریبی رشتہ دار ہیں۔ مد تخفیف میں یہ کلرکی کے عہدے سے ہٹا دے گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان کے معاملہ پر نظر ثانی کر کے ان کو بحال کرلیں گے۔ یہ خط لکھوا کر اور اپنی دستخط بنا کر سلطان احمد صاحب نے اس شخص کے حوالہ کیا اور کہا کہ آپ بلا جھجک یہ خط اپنے بڑے صاحب کو دیجئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھئے۔ وہ حضرت چلے گئے۔ اس کے کچھ دیر بعد اور لوگ بھی اُٹھ گئے تو میں نے سلطان احمد صاحب سے پوچھا کہ یہ حضرت جن کو آپ نے خط لکھ کر دیا ہے کیا آپ کے رشتہ دار تھے۔ سلطان احمد صاحب ہنسے اور کہنے لگے ان صاحب کو میں جانتا تک نہیں ہوں۔ آج ہی ان کی شکل دیکھی ہے مگر میں نے رشتہ داری کے متعلق جو لکھا وہ بھی غلط نہیں ایک انسان کا دوسرے انسان سے برادرانہ رشتہ تو ہے ہی۔ بہر کیف کچھ دنوں کے بعد وہ حضرت پھر نظر آئے بہت خوش تھے نوکری پر بحالی ہو چکی تھی۔ سلطان احمد صاحب اس زمانہ میں وائسرائے کی ایگزیکٹیو کانسل کے ممبر تھے۔ سلطان احمد صاحب ہندوستان کے بڑے کامیاب بیرسٹروں میں تھے۔ مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے علاوہ اعلیٰ انگریزی سوسائٹی میں بھی ان کی بڑی اہمیت تھی، مگر نجی اور سماجی تقریبوں میں شرکت کرتے تو ہمیشہ ہندوستانی لباس میں جاتے۔ ان کو اپنے سماج اور تہذیب کی ہر چیز پسند تھی۔ اعلیٰ قدروں کے مداح اور خود اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ اُنھوں نے سگریٹ، پان، حقہ، شراب ان چیزوں کو کبھی منہ نہ لگایا۔ چائے کبھی نہیں پیتے تھے، مجلس میں اگر کبھی چائے پیش کی جاتی ہو تو مجبوراً شاید پانی پی لیتے ہوں۔

ان کے دم سے پٹنہ میں ہندوستانی موسیقی کی زندگی تھی۔ دور کے گویے ان کے یہاں سلام کرنے کو جاتے اور انعام پاتے۔ بہتوں کو انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت دلوادی۔ ان کے زمانے میں موسیقی کی محفلوں کا رواج باقی تھا۔ ہر جگہ خاص

طور سے یہ مدعو ہوتے تھے۔ ان کے شریک محفل ہونے سے محفل میں جان پڑ جاتی تھی۔ جب ان کا مکان سلطان پیلیس بن کر تیار ہوا تو انھوں نے ایک بڑا "ایٹ ہوم" یا "گارڈن پارٹی" پھر پٹنہ میں میں نے نہیں دیکھی۔ سلطان پیلیس کی عالی شان عمارت، اس کے بڑے بڑے مزیّن کمرے، اس کے خوبصورت سائبان، پھر سلطان پیلیس کا جگمگاتا ہوا بڑا وسیع اور حسین لان، رنگ برنگ، کے مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شام کا وقت آیا تو ریڈیو کا سٹ " لان کے پاس ایک اونچی جگہ پر لا کر رکھ دیا گیا۔ یہ پہلا ریڈیو سٹ تھا جو پٹنہ میں اس وقت آیا تھا۔ اس میں لاؤڈ اسپیکر لگا دیا گیا۔ کلکتہ کے ریڈیو اسٹیشن والوں سے مل کر انتظام سلطان احمد صاحب نے کیا تھا کہ نورجہاں بائی جو بڑے اونچے درجہ کی گانے والی تھی وہ شام کے وقت چیت گانے کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ کرے۔ جب نورجہاں بائی کی آواز ریڈیو سے اُبھری تو ہر شخص خاموش ہو گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ نورجہاں بائی نے بھی چیت خوب گائی۔ آدھے گھنٹے کا یہ پروگرام بڑا دلکش پروگرام تھا۔

اپنے بیٹے سیّد نجم الحسن مرحوم کی شادی میں جو تکلفات سلطان احمد صاحب نے برتے اور جس مشرقی انداز پر شادی کا انتظام کیا اس کا اہتمام ادر انتظام اور شان و شوکت دیکھنے والوں کو اگلے دنوں کی شادیوں کا پُر لطف سماں عالم تصوّر میں آج بھی سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے۔ سانچق اور بارات کی دھوم دھام اور جلوس کے تزک و احتشام سے شہر پٹنہ کی سڑکوں پر بہار آگئی تھی۔ ہاتھیوں کی قطار، ہودا اور عماری کسے ہوئے جن پر ہودا یا عماری نہیں ان پر زر کار جھولیں پڑی ہوئیں۔ اونٹوں کی الگ لانبی قطار، کسی پر مخمل سجی ہوئی کوئی خالی، سواروں کے پرے کے پرے زرق برق لباس میں ملبوس۔ شہ سواری عجیب منظر پیش کرتی تھی۔ کوتل کے گھوڑے چاندی اور گنگا جمنی زیورات میں غرق، طرح طرح کے باجے اور بینڈ، بیچ بیچ میں گل تراشی کی بہترین صنعت دکھاتے ہوئے کاغذی پھولوں کے رنگ برنگی تختے۔ بارات کے ساتھ خود سلطان

احمد صاحب اور معززین شہر جن میں ہندو اور مسلمان، امرا،شرفا، وکلا، اطباء اور ڈاکٹران، اعلیٰ افسران اور عوام۔ شہر کا گشت لگا کر بارات مغرب کے وقت چھوٹے نواب صاحب کے دولت کدہ گذری پر پہنچی۔

اسی شادی کے سلسلے میں دو روز کی محفل نشاط دولہن کو لانے کے بعد اپنے گھر سلطان پیلیس میں سلطان احمد صاحب نے سجائی۔ سلطان پیلیس کے اتری جانب جو بڑا وسیع خوبصورت لان ہے، وہیں بڑا خوبصورت اور کشادہ ناچ گھر قائم کیا تھا۔ آرائش و زیب و زینت میں بڑا پُر تکلف تھا۔ اعلیٰ درجے کے بڑے اور چھوٹے بلجیم کٹ کے طرح طرح کے شیشوں کے جھاڑ فانوس اور شیشے کی قندیلیں، دروں میں زرنگار پردے، جلی آئینے اور شیشے کی رنگ برنگی دیواریں، تمام ناچ گھر میں بڑی بڑی ایرانی قالین، غرض ناچ گھر دلہن بن گیا تھا۔ مہمانوں میں خاص و عام سبھی تھے۔دو دن رات کھانے کی عام دعوت تھی۔ ناچ گھر مہمانوں سے بھرا تھا اور طعام گھر بھی۔ گانے والوں میں بڑے اونچے درجے کی طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ کلکتہ سے نورجہاں بائی، بنارس سے مجیدن بائی اور جے پور سے گوہر بائی۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ ایک دن میں سلطان احمد صاحب کے یہاں گیا، ان کے کچھ اور احباب بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو میں سلطان احمد صاحب کے یہاں کی شادی کا تذکرہ نکل آیا۔ سلطان احمد صاحب کہنے لگے کہ اس شادی کے بعد میرے کچھ انگریز اور ہندوستانی دوستوں نے مجھ پر اعتراض کیا کہ بھئی تم ہندستان کے بڑے کامیاب اور نامور بیرسٹر بھی ہو، بڑے سیاست داں بھی ہو۔ انگلستان کے تعلیم یافتہ اور مغربی تہذیب سے آشنا، پھر تم نے مٹنے والی مشرقی تہذیب کے انداز میں اگلے رسم و رواج کے مطابق بارات بھی نکالی، شادی کا کل انتظام اسی ڈھنگ پر کیا اور اس سے بڑھ کر پُرانی روش پر راگ و رنگ کی محفل بھی سجائی۔ یہ باتیں ہم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں۔سلطان احمد صاحب نے کہا کہ میں نے یہ جواب دیا کہ دنیا میں خوشی اور

غم کا بڑا اثر دماغ پر ہوتا ہے اور دماغ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے یہ دیکھا گیا ہے کہ وفور غم و خوشی میں عجیب عجیب حرکتیں اکثر لوگوں سے صادر ہو جاتی ہیں اور وفور خوشی و غم کے جذبے سے فہم ادراک دب جاتے ہیں۔ نجم الحسن سلمہٗ کی شادی کی خوشی میں میرا طول و تکلف سے شادی کا اہتمام کرنا اور محفل رقص و سرود سجانا وفورِ مسرت و خوشی کا میرے لئے جذباتی پہلو تھا۔ جہاں عقل دفور جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے۔

سلطان احمد صاحب اور لیڈی سلطان کی کنبہ پروری بھی مثالی تھی۔ اس میں قریب و دور کی رشتہ کی تفریق نہ تھی۔ سب سے یکساں برتاؤ اور سلوک اور ان کی شادی و غم میں برابر کی شرکت۔ سلطان احمد صاحب کے یہاں پہنچنے پر اس کا احساس بھی جاتا رہتا تھا کہ ان کے یہاں کون ہندو ہیں اور کون مسلمان۔ اب یہ شخصیت بھی فسانہ بن کر رہ گئی ہے۔

سلطان احمد صاحب آخری دم تک بڑی عزت و وقار کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر گئے نظام حید آباد نے اپنی اولاد اور متوسلین کے لئے جو لاکھوں لاکھ روپیہ کا وقف قائم کیا تھا۔ اس کی کمیٹی کے صدر سلطان احمد صاحب اپنی زندگی کے آخری لمحے تک رہے۔ یہاں سے ان کو پانچ ہزار ماہانہ ملتے تھے ان کی قانونی پریکٹس اپنی جگہ پر تھی۔ سلطان احمد صاحب کو اپنی جائے پیدائش پالی سے بڑی محبت تھی۔ یہیں ان کے پُرانے دیہی گھر میں ۲۸ر فروری ۱۹۶۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔



علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد

عظیم آباد (پٹنہ) کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کی عظمت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور دوسری جگہوں کے مشاہیر کے گُن گاتا رہتا ہے۔ اس کی مثالیں چند در چند موجود ہیں۔ راسخ عظیم آبادی اپنے لوگوں کی بے اعتنائیوں کا شکار رہے۔ بیدل عظیم آبادی کے حالات پر مشکل ہی سے ابتداء میں تحقیق و تفتیش پر

کوئی رسالہ یا مضمون بہار میں شائع ہوا۔ یہی بات علامہ سید سلیمان اشرف کے متعلق کہی جا سکتی ہے، جب دوسرے صوبوں کے لوگوں نے ان کی عظمت کو اجاگر کیا تب ہم چونکے۔ خدا بھلا کرے ماضی قریب کے سوانح نگاروں اور ناقدوں کا، جو بہار کی بلند ہستیوں کے باہر میں پھیلے گراں قدر کارناموں کو سمیٹ کر منظر عام پر لے آئے اور اس طرح بہار کے لوگوں کو اپنے قابل فخر بزرگوں پر فخر کرنے کا موقع دیا۔ اب زمانہ بہت بدل چکا ہے اور یہاں کے نوجوان طبقے میں بحمد اللہ یہ لگن پیدا ہو چکی ہے کہ دوسرے کاملین کے ساتھ اپنے یہاں کی باکمال ہستیوں سے متعلق تحقیق اور ریسرچ کی راہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ یہی بے اعتنائی علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے ساتھ بھی ہوتی رہی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کم از کم ایک محدود طبقہ ان کی عظمت کو زندہ رکھنے کے لئے کچھ کام کرتا رہا، پھر بھی جتنا بھر کام ان کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لئے ضروری ہے ابھی تک اتنا کام نہیں ہو سکا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان کی زندگی کے کارناموں اور ان کی تخلیق کی عظمتوں کے متعلق باتفصیل مضامین لکھے جائیں۔ یہ مضمون جو آپ کے سامنے ہے ایک بالکل ہی مختصر تذکرہ ہے جو میں تبرکاً پیش کر رہا ہوں۔ اگر میری زندگی نے میرا ساتھ دیا تو ان کی عظمت و بزرگی اور علمیت کا مکمل جائزہ آپ کے سامنے آئندہ پیش کروں گا۔

یہ علامہ حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم کے چھوٹے نواسے تھے اور ان کے بڑے چہیتے بھی تھے۔ یہ دو بھائی تھے۔ بڑے حکیم فہیم الدین احمد مرحوم جو اپنے نانا سے علم طب حاصل کر کے اور فارغ التحصیل ہو کر طبابت کی طرف متوجہ ہوئے۔ چھوٹے نواسے علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد تھے۔ یہ شروع ہی سے بڑے ذہین و متین تھے اور انھوں نے ذوقِ علم اور اس کے ساتھ قوت یادداشت اپنے نانا علامہ حکیم عبدالحمید مرحوم سے ورثہ میں پائی تھی۔ ان کے والد شاہ واعظ الدین مرحوم ساکن امتھوا ضلع گیا کا جوانی میں انتقال ہوا۔ حکیم فہیم الدین احمد اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد اس وقت صغیر

الحسن تھے۔ علامہ حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم اپنی صاحبزادی اور دونوں نواسوں کو اٹھا کر اپنے یہاں لے آئے۔ پھر یہ دونوں یہیں کے ہوگئے۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد گھر پر عربی کی تعلیم اور علم طب حاصل کرنے کے بعد مغربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ سائنس سے ان کو بے حد لگاؤ تھا۔ بی، اے تک تعلیم حاصل کی۔ پھر دوبارہ عربی زبان و ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ علامہ حکیم عبدالحمید اس وقت بقید حیات تھے۔ وہ بڑی رضا و رغبت کے ساتھ زبانی شرح و نکات بتاتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر عظیم الدین احمد قرآن شریف کی مختلف سورتیں اور آیات بھی حفظ کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ علامہ عظیم الدین احمد قریب قریب حافظ قرآن بن گئے تھے ۔ علامہ حکیم عبدالحمید مرحوم نے ان کو بھی علم طب بڑی کدوکاوش سے پڑھایا تھا اور عربی زبان کے نکات اور اس کی ماہیت و مخرج اور ساتھ ہی ساتھ عربی زبان و الفاظ کی تحقیق کا جذبہ ان میں پیدا کر دیا تھا جس سے عام طور پر عربی دان نابلد رہتے ہیں ۔ اس بنیادی تعلیم کا نتیجہ یوں ظاہر ہوا کہ علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے جب خدا بخش خاں کے مشہور زمانہ اور بیش بہا پبلک اورینٹل لائبریری میں کتب عربیہ اور فارسیہ کی کٹلگنگ (فہرست) یورپ کے عالموں کے مذاق کے مطابق تیار کی تو ڈاکٹر ڈینی سن راس (Dr. Denison Ross) جو مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل تھے اس کٹلگنگ (فہرست) کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حکومت ہند سے سفارش کر کے علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کو یورپ جاکر مزید تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ دلوایا۔ حکومت ہند نے عربی فائیلولوجی میں (علم الا اشتقاق) میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لئے ان کو لندن بھیجا، مگر جن صاحب کو حکومت ہند نے ڈاکٹر عظیم الدین احمد کو مشورہ دینے کے لئے خط لکھا تھا انھوں نے ڈاکٹر عظیم الدین احمد سے کہا فائیلولوجی کی بہتر تعلیم کے لئے لپزگ یونیورسیٹی جرمنی جانا ہوگا۔ بہتر ہے کہ آپ یہاں لندن میں کچھ دنوں جرمن زبان سیکھ لیں پھر فائلولوجی کی تعلیم کے لئے جرمنی جائیں ۔ چنانچہ چند مہینوں کے اندر علامہ ڈاکٹر عظیم

الدین احمد نے جرمنی زبان پر بھی قدرت حاصل کرلی اور پھر جرمنی جا کر وہاں کی لیزگ یونیورسیٹی سے پی،ایچ،ڈی کی ڈگری لے آئے۔جرمنی سے واپس آکر علامہ ڈاکٹرعظیم الدین احمد پانچ سال تک لاہور یونیورسیٹی میں ملازمت کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسیٹی میں آگئے اور یہاں یونیورسٹی میں شعبہ عربی و فارسی کے انچارج مقرر ہوئے علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی عالمگیر علمی صلاحیت اور ذہانت اس سے سمجھئے کہ اردو،انگریزی،عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ جرمن زبان اور سنسکرت زبان کے بھی ماہر تھے جس طرح ان کو عربی اور فارسی زبان سے شغف تھا اسی طرح سنسکرت زبان سے بھی ان کو انس تھا۔وید،رامائن اور گیتا ان سب کا مطالعہ کرتے تھے۔وہ ان کو پڑھ کر اپنے ہندو دوستوں اور مسلمان دوستوں کو بھی سناتے رہتے تھے۔جرمن زبان کی کتابیں ان کے مطالعہ میں ایسی ہی رہتی تھیں جیسے انگریزی زبان کی کتابیں۔گیتا کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ آسمانی کتاب ہے اور کرشن جی پیغمبر کا درجہ رکھتے ہیں۔گیتا میں وہ تلقین اور احکامات نظر آتے جو بائبل اور قرآن مجید میں ہیں۔

اگلے زمانے میں یونیورسیٹوں کا ماحول جو وہاں کے استادوں کی شفقت، محبت اور خلوص سے قائم تھا، یہی ماحول اس زمانے میں صحیح معنی میں محبت کرنے والی ماں کا آغوش کہلاتا تھا۔اس ماحول کا تھوڑا بہت دلفریب نظارہ میں نے بھی پٹنہ کالج میں دیکھا تھا۔اگرچہ ہندوستان میں سیاسی انقلاب کی لہریں اٹھیں افراتفری میں پرانی قدریں ناپید ہونے لگی پھر بھی پٹنہ کالج میں انگریز اور ہندوستانی پروفیسروں کا اپنے شاگردوں کے ساتھ پرانا رویہ قائم تھا اور دلی خلوص اور محبت کے برتاؤ میں فرق نہ آیا تھا۔پروفیسران اپنے شاگردوں کی ہر طرح سے مدد کرتے اور جب کوئی شاگرد اپنے کسی پروفیسر کے گھر جاتا تو اس کو وہاں اپنے گھر کا لطف ملتا تھا اور کچھ دیر اپنے پروفیسر کے گھر والوں میں رہ کر یہ بھول جاتا کہ یہ اپنا نہیں پروفیسر صاحب کا گھر ہے کلاس میں اگر کسی شاگرد سے قصور ہو جاتا تو پروفیسر محبت کے لہجے میں اس کی تنبیہ کرتا اور اس کو اس کی غلطی بتا کر

اور دوبارہ ایسی غلطی نہ کرنے کی تاکید کر کے بات ختم کر دیتا۔

علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے ایک نیا مکان پٹنہ سٹی محلّہ خواجہ کلاں میں پنے آبائی مکان سے ملحق تعمیر کرایا تھا جس میں آسائش کے لئے ہر چیز موجود تھی۔مکان کی تعمیر میں انہوں نے اپنی طبعی نفاست اور ذوق سلیم کا ثبوت پیش کیا تھا۔فرنیچر قیمتی اور سب جاذب نظر رکھتے تھے فرنیچر کی مناسبت سے قالین ان ہی کے مقابلے کی بچھائی تھیں۔قلمی تصویروں اور تاریخی قلمی مرسع و مطلا مکتوبات خوبصورت فریموں میں کمروں کی زینت بڑھاتے تھے۔ چھتوں سے آویزاں نظر فریب الکٹرک کے جھاڑ بڑے خوشنما نظر آتے تھے۔ سب سے نیچے کی منزل کے ہال کمرے میں دوسری بہار نظر آتی تھی۔سفید کمرے کی چھت سے آویزاں کٹ گلاس کے بڑے بڑے خوبصورت جھاڑ جن میں موی شمعوں کی جگہ پر لانبے لانبے بلب جھاڑوں کے فانوسوں میں لگے ہوئے تھے۔پورے کمرے کی سفید قالین پر سفید ہی پھول کاڑھے ہوئے تھے۔یہ ہال کمرہ شاہ جہاں کے جشن ماہتابی کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ عمارت سے لگا ہوا خوبصورت پائین باغ تھا جس کے حواشی میں بھی مکانات بنے ہوئے تھے جس میں موٹر گراج بھی تھا۔ علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کو پھولوں کا بڑا شوق تھا۔صبح اور شام چمن کی دیکھ بھال میں گزارتے اور مالی کو ہدایت دیتے جاتے کہ پھولوں کے تھالے اور گملے موقع موقع سے لگائے۔بہت قسم کے پھول یہ خود تلاش کر کے منگاتے تھے۔

علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد تقریباً گوشہ نشیں ہی تھے۔پانچ میل کی مسافت پر پٹنہ کالج تھا۔موٹر سے جاتے اور وہاں سے آتے تو وقت کا زیادہ حصہ آنے والے ملاقاتیوں میں گزرتا یا چمن کے گل گشت میں ۔ بعد مغرب کا وقت ہر طرح کے آنے جانے والوں کے لئے وقف تھا۔ ان میں پٹنہ سیٹی کے احباب،ہندو اور مسلمان دونوں ان کے ساتھی ،کالج کے اساتذہ اور طالبان علم۔طالب العموں میں ہندو طلباء کی تعداد بھی ان کے یہاں آنے والوں میں کافی رہتی تھی۔کچھ تو سعی سفارش کے لئے آتے

اور کچھ ایسے بھی تھے جن کی یہ مالی معاونت بھی کرتے تھے۔

ایک استاد کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی نجی زندگی بھی بڑی پر کشش اور جامع تھی۔ شہر ہی کے نہیں بلکہ باہر کے بھی علماء، مصنفین اور اہل قلم ان کے پاس آتے رہتے تھے اور کتابی اور تفسیری مسائل کا حل ان سے حاصل کرتے تھے۔ قرآن مجید اور حدیث میں علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا ادراک اور ان کی نظر بہت دور تک پہنچی ہوئی تھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ، علماء، فقہاء اور مفسرین ادق مسائل لے کر ان کے پاس آتے اور مطمئن ہو کر واپس جاتے۔ مگر واہ پردہ پوشی، اس کا تذکرہ علامہ موصوف نہ کسی سے کرتے اور نہ دوسروں کے سامنے مسائل چھیڑنے کی اجازت دیتے۔ علامہ موصوف مذہبی مسائل میں بڑے روادار اور بیحد وسیع المشرب تھے۔ وہ صرف مسلمان تھے اور ہر عقیدہ کو گلے لگالیتے تھے ان کی رواداری اور بے تعصبی ایسی تھی کہ ان سے ملنے والا اور ان سے گفتگو کرنے والا ان کو اپنا ہی ہم عقیدہ سمجھنے لگتا تھا۔ بہت سے اہل تصوف ان کو بڑا صوفی منش سمجھتے تھے، شیعہ حضرات ان کو اپنے سے بہت قریب پاتے تھے اور اہل حدیث ان کو اپنے ہی حلقہ کا ایک بڑا عالم مانتے تھے اور اگر آپ مجھ سے حقیقت پوچھیئے تو وہ قرآن مجید اور حدیث شریف کے احکام پر عمل کرتے وقت اور کسی طرف نہیں دیکھتے تھے۔

علامہ موصوف برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ زیادہ تر تو اپنی زیر تصنیف معرکتہ الارا کتاب کی تدوین اور تصنیف میں لکھتے، پھر دوسرے پر مغز مقالے اور مضامین لکھتے، تاکہ وہ حضرات جن کے لئے مضامین اور مقالے لکھے جاتے اپنے نام سے چھپوائیں۔ اس طرح علامہ موصوف نے کتنوں کو صاحب قلم بنادیا۔

ان کی عمر بھر کی کمائی عربی زبان کا وہ کتابی مسودہ ہے جس میں وہ ایامِ جاہلیت کی فصیح و بلیغ اصطلاحی زبان کا جائزہ غائت نظر سے لیتے ہوئے قران مجید کی زبان تک پہنچتے ہیں اور عربی زبان کی تحقیق میں کہیں کہیں الفاظ کے وہ معنی پیش کرتے ہیں جو

اکثر قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیر سے مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر زبیر صدیقی جو بڑے پائے کے عربی کتابوں کے مصنف اور بڑے مشہور عربی زبان کے ماہر تھے۔ ایک دفعہ علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی متذکرہ بالا کتاب کے متعلق کہنے لگے کہ یہ ایسی کتاب علامہ موصوف نے لکھی ہے۔ جس کے مقابلے کی کتاب عرب ممالک کے علماء نہ لکھ سکیں گے۔ ابھی تک یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے مگر معلوم ہوا ہے کہ اب ان کے چھوٹے صاحبزادے پروفیسر کلیم الدین احمد اس کی طباعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔[1]

علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد بالطبع شاعر تھے۔ نہ انھوں نے کبھی کسی مشاعرہ کے لئے غزل کہی اور نہ کسی کی فرمائش پر کوئی نظم لکھی تنہائی میں جب خیالات کا ہجوم ہوتا تو بعض خیالات شعر میں ڈھل جاتے۔ اپنی شعر گوئی پر پردہ ڈالنے کے لئے جب ان کی کوئی غزل یا نظم چھپنے کے لئے کسی رسالے میں جاتی تو یہ اپنے تخلص کی جگہ پر صرف "صدائے خاموش" لکھ دیا کرتے۔ ان کے اشعار کا مجموعہ برسوں بکس میں پڑا رہا۔ آخر ان کے انتقال کے کچھ سال پہلے ان کے صاحبزادے پروفیسر کلیم الدین صاحب نے ان کے اشعار کے مجموعے کو "گلِ نغمہ" کے نام سے چھپوا دیا۔ اپنے اشعار میں بھی اپنی نظموں میں بھی، اپنی غزلوں میں بھی علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے اپنی انفرادیت پورے طور پر قائم رکھی ہے۔ ان کی شاعری گل و بلبل کی شاعری نہیں اس آفاقیت ہے اور ان جذبات کی ترجمانی ہے جو انسان کو خالقِ کائنات کی طرف سے ودایت کئے گئے ہیں تاکہ وہ خلافت ارضی کو کامیابی کے ساتھ چلا سکے۔ چوں کہ یہ ایک مختصر تذکرہ ہے اس لئے میں علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے اشعار کا نمونہ یہاں پیش نہ کروں گا۔ علامہ ڈاکٹر عظیم الدین سوائے کالج کے کہیں آتے جاتے نہ تھے مگر ان کا حسن اخلاق، ان کی تواضع، ان کی رواداری اور ان کی ایمانداری اور پھر ان سب کے ساتھ ساتھ ان کی ہر موضوع پر دلچسپ گفتگو لوگوں کو کھینچ کر ان کے یہاں لے جاتی تھی۔ یہ ان کی ایمانداری کا اثر تھا کہ جب خاندان گذری کا وہ مشہور مقدمہ جو بادشاہ

---

[1] پروفیسر کلیم الدین احمد کا ۱۹۸۸ء میں انتقال ہو گیا۔ (ادارہ)

نواب مرحوم کے وقف کے متعلق تھا، آخری مرحلے پر آیا تو دونوں فریق یعنی نواب زادہ سیّد محمد مہدی صاحب مرحوم اور سیّد ضامن صاحب مرحوم کی نظیر انتخاب مقدمے کے آخری فیصلے کے لئے تنہا فیصلہ کرنے والے کی حیثیت سے علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد پر ہی پڑی اور پریوی کانسل کے فیصلے کا تتمہ ان ہی کے فیصلے پر ہوا۔

یہ بڑی حیرت کی بات ہے جس کو میں شروع میں بھی لکھ چکا ہوں کہ بہار اپنے باکمالوں کی وہ عزت نہیں کرتا اور ان کو وہ اہمیت نہیں دیتا جو باہر کے لوگ بہار کے باکمالوں کو عزت و اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے لاہور کا ایک واقعہ یاد ہے جب میں وہاں گیا تھا جس کو تقریباً چالیس سال کا عرصہ گذرا وہاں ایک علمی اور ادبی تقریب میں میری ملاقات خلیفہ شجاع الدین مرحوم سے ہوئی۔ میرے لاہور جاتے وقت علامہؒ ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کسی تقریب میں تمہاری ملاقات خلیفہ شجاع الدین سے ہو تو ان کو میرا سلام پہونچا دینا۔ جب میری ملاقات ایک علمی اور ادبی تقریب میں ہوئی ان کے دوست کا سلام پہنچا دیا خلیفہ شجاع الدین مرحوم اپنے دوست کا پیغام اور سلام سن کر بہت خوش ہوئے، مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم کون ہو۔ میں نے کہا کہ میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا رشتے میں بھائی ہوتا ہوں۔ پھر تو خلیفہ صاحب مجھ سے لپٹ ہی گئے اور میری ملاقات اس تقریب میں بہت سے صاحبانِ علم و فضل سے کرائی اور علامہ موصوف کے سلام بھیجنے کا تذکرہ بھی کیا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ علامہؒ ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم کے نام پر عقیدت میں گردنیں جھک رہی تھیں۔ دوسرے دن کے لئے خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے اپنے یہاں رات کے کھانے پر مجھ کو آنے کی دعوت دی۔ میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرے علاوہ اور بھی تیس چالیس معزز حضرات کھانے پر مدعو ہیں۔ یہاں صرف ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی علمی صلاحیت، ان کی شخصیت کی جاذبیت اور ان کے مزاج کی شگفتگی کا ذکر ہوتا رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ زندہ دلانِ لاہور ہر قابل توجہ شخصیت کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۱۹۴۹ء میں علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد پر یکایک فالج کا دورہ پڑا۔ دورہ بہت سخت تھا۔ غشی کی حالت طاری تھی۔ تمام اعضاء مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ لوگوں کو خبر ہوئی تو ہر طبقے کے لوگ عیادت کو پہنچنے لگے۔ ان کے مکان پر بھیڑ لگی رہتی، لوگ ایک نظر دیکھتے۔ پھر رنج و غم میں ڈوبے ہوئے ان کے پاس سے واپس آتے۔ عیادت کرنے والوں کا تانتا۔ صبح سے مغرب شام تک لگا رہتا۔ یہ حالت چار پانچ روز تک رہی، پھر ان کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو کر اعلیٰ عِلیین میں جا پہنچی۔

اِنا للهِ وَ اِنَا اِلَیہِ رَاجعُونَ ط

مِسٹر سَیّد عبد العَزیز

غالبؔ مرحوم نے کہا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بہت زیادہ گذرے ہوئے زمانہ کو چھوڑ یئے۔ ماضی قریب کا زمانہ بھی، جو ہندوستانی روایات پر مشتمل ہندو مسلم کلچر کی مشترک سماج کی روداد ہے۔ اپنے اندر وہ رنگینی، جاذبیت اور فرحت بخش خصوصیات رکھتا ہے، جس پر زندگی کی دوسری سور قربان ہوں۔ ماحول تو انسان کے ذہن اور کردار سے بنتا ہے۔ کسی ماحول کو سمجھنے کے لئے آپ ان شخصیتوں کو پرکھئے جنھوں نے ایسے ماحول کی تربیت و تعمیر میں حصہ لیا اور بڑھ کر خود اس کی تاریخ کا ایک جزو بن گئے۔ ایسی چند شخصیتوں کا مختصر تذکرہ آپ بھی پڑھ چکے ہیں۔ ان ہی میں مسٹر سیّد عبدالعزیز مرحوم بیرسٹر بھی تھے۔ ان کے والد حکیم سیّد حفاظت حسین مرحوم پھلواری شریف ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ حکیم صاحب مرحوم کی شادی نیورہ میں ہوئی۔ اس طرح مسٹر سیّد عبدالعزیز مرحوم کی نانیہال نیورہ میں ہوئی۔ حکیم سیّد حفاظت حسین مرحوم بہ سلسلہ ملازمت جے پور کی ریاست میں مہاراجہ بہادر کے طبیب خاص تھے اور جے پور دربار میں ان کی بڑی آؤ بھگت تھی۔

مسٹر سید عبدالعزیز ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان سے بڑی ایک بہن تھیں جن کی شادی شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب ساکن شاہو بگہہ سے ہوئی تھی۔ مسٹر سیّد عبدالعزیز کم سن ہی تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ مہاراجہ جے پور نے مسٹر عبدالعزیز کو مزید تعلیم و پرورش کے لئے جے پور بلا بھیجا۔ مگر یہ نہ گئے۔ پہلے کچھ دن جسٹس شرف الدین کے ساتھ رہے، پھر ۱۸۸۳ء میں سر علی امام کے ساتھ رہنے لگے۔ پہلے پٹنہ کالج میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور اس کے بعد ہزاری باغ سینٹ کالمبس کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں انگلستان چلے گئے، وہیں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر کے ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد محدود ہی ہے جنھوں نے اپنے زور بازو اور اپنی ذاتی صلاحیت سے اور بغیر دوسروں کی سرپرستی کے ملک اور سوسائٹی میں اپنے لئے اونچی جگہ بنائی۔ مسٹر سید عبدالعزیز ایسے ہی لوگوں میں تھے۔ ایک تو طبعتاً کسی کی سرپرستی چاہتے نہ تھے دوسری بات یہ تھی ان کو اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ تھا اور سمجھتے تھے کہ محنت اور استقلال سے اگر کام کیا جائے تو ترقی کی راہیں خودبخود کھلتی جاتی ہیں۔ چند ہی سال میں مسٹر سید عبدالعزیز کا شمار پٹنہ کے سربرآوردہ وکیلوں میں ہونے لگا، اور ابھی دس سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ مسٹر عبدالعزیز کا شہرہ صف اول کے فوجداری کے وکیل کی حیثیت سے تمام صوبہ میں پھیل گیا۔ سیشن کے مقدمات بڑی تعداد میں ان کے پاس آنے لگے جن میں اکثر کو وہ اپنے دوستوں کے حوالہ کردیتے، کیوں کہ ان سب مقدمات کے لئے ان کے پاس وقت کی گنجائش نہ تھی۔ اب وہ فیس بھی وہی لینے لگے تھے جو بڑے بڑے وکلاء لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں قوتِ گویائی بھی دی تھی۔ سیشن کے مقدمات میں، جو اکثر پیچیدہ اور خون کے مقدمات ہوتے تھے۔ مقدمہ کے اختتام پر اُن کا "جوری سے خطاب" (Jury Address) لاجواب

ہوتا تھا۔ لوگ دوسرے کاموں کو چھوڑ کر ان کا جوری سے خطاب سننے کو آتے تھے۔ ان کی خطابت سامعین کو موہ لیتی تھی اور تقریباً نوے پچانوے فی صد فیصلہ یہ اپنے مؤکل کے حق میں لینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

مسٹر سیّد عبدالعزیز کی ہر دلعزیزی اور ترقی کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بڑے صاف گو اور پیشہ میں بڑے ایماندار تھے۔ ۱۹۲۸ء میں یہ حکومت ہند کی طرف سے مشہور زمانہ میرٹھ کانسپریسی کیس (Meerut Consperacy Case) میں وکیل مقرر ہوئے کچھ دنوں تک اس مقدمہ میں انھوں نے کام کیا اور محسوس کیا کہ حکومت ہند کے چلائے ہوئے اس مقدمہ میں جان نہیں ہے۔ باوجودیکہ یہ معلوم تھا کہ یہ مقدمہ بہت دنوں تک چلے گا اور مسٹر سیّد عبدالعزیز کو اس مقدمہ میں گراں فیس بھی مل رہی تھی، پھر بھی مسٹر عبدالعزیز نے وائسرائے سے ملاقات کر کے ان کو مشورہ دیا کہ میرٹھ کانسپریسی کیس اٹھا لیا جائے کیونکہ مقدمہ بیحد کمزور ہے۔ چنانچہ حکومت ہند نے یہ مقدمہ واپس لے لیا۔

مسٹر سیّد عبدالعزیز کو شروع میں سیاست سے دلچسپی نہیں تھی، صرف سماجی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ ہمیشہ سے ان کا حلقہ احباب بھی بڑا تھا۔ ان کی ترقی کے ساتھ یہ حلقہ بھی بڑا ہوتا گیا۔ ان کے یہاں ہندو اور مسلمان سبھوں کی آؤ بھگت تھی۔ اگر ان کے گھر کو احباب سے ملنے کی جگہ کہیئے تو سچ ہے۔ لوگ بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے گپیں کرتے رہتے۔ لیکن یہ مقررہ وقت پر اٹھ کر مقدمات کے کاغذ کو دیکھنے کے لئے اپنے آفس میں چلے جاتے اور جب کام ختم ہو جاتا تو پھر شریک مجلس ہو جاتے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مسٹر عبدالعزیز کو سیاست سے دلچسپی نہ تھی یہ بالکل ٹھیک ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۲۶ء میں ان کو زبردستی سیاست میں لانے والے سر سیّد علی امام تھے۔ بہار مجلسِ قانون ساز کی ممبری کے لئے سید علی امام نے مسٹر سیّد عبدالعزیز کو اصرار کر کے پٹنہ کے حلقہ سے انتخابی مقابلہ میں پٹنہ کے مشہور بیرسٹر محمد

یونس کے مقابلہ میں کھڑا کیا۔ مسٹر عبدالعزیز پٹنہ میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔ یہ مقابلہ انھوں نے بڑی آسانی سے جیت لیا۔ مسٹر سید عبدالعزیز کی بیرسٹری یا وکالت جو کہیئے عروج پر تھی، ساتھ ہی ساتھ ان کی ہر دلعزیزی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ ۱۹۳۴ء کی جنوری میں یہ حکومت بہار کے وزیر مقرر ہوئے۔ یہ عین وہی زمانہ تھا جب صوبہ بہار تباہ کن زلزلہ کی لپیٹ میں آیا تھا، پٹنہ اور دوسرے علاقوں اور شہروں میں سینکڑوں آدمی مر گئے، ہزاروں چھوٹے بڑے مکانات گر گئے تھے، زمینیں شق ہو گئی تھیں۔ اور ان سے چشمے جاری ہو گئے تھے۔ سردی بھی عین شباب پر تھی اور دیہاتوں کا دورہ کیا۔ کپڑے، کمبل دوائیاں، خیمے اور روٹیاں حکومت کی طرف سے کافی تعداد میں تقسیم کرائیں اور ہزاروں من غلے تقسیم ہوئے۔ اس وقت تمام قومی اداروں نے بھی بڑا کام کیا۔ حکومت اور قومی اداروں کے ریلیف نے بڑی حد تک لوگوں کی بے سروسامانی دور کی۔ فوری ریلیف کا کام ڈھنگ پر چلا تو مستقل مکانات کی تعمیر اور آبادکاری کا کام حکومت نے بھی اور قومی اداروں نے بھی شروع کیا۔ ۱۹۳۶ء میں بہارِ مجلسِ قانون ساز کے انتخاب کے موقع پر مسٹر سیّد عبدالعزیز نے ایک سیاسی پارٹی بنائی جس کا نام یونائیٹڈ پارٹی رکھا۔ ایک دوسری پارٹی بھی انڈیپنڈنٹ پارٹی کے نام سے بن چکی تھی۔ اس دفعہ بھی مسٹر سیّد عبدالعزیز پٹنہ کے انتخابی حلقہ سے کھڑے ہوئے۔ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے امیدوار مولوی سید عبدالحفیظ وکیل تھے۔ یہ بھی پٹنہ کے ہر دلعزیز وکیلوں میں تھے۔ اس دفعہ برابر کی ٹکر تھی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یہ دونوں حضرات جو تمام سیاسی، سماجی اور رفاہی کاموں میں برابر ایک دوسرے کے شریک کار رہتے تھے اس دفعہ مقابل بن کر آمنے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں کا انتخاب کے لئے ٹکرانا پٹنہ والوں کے لئے پریشانی کا سبب رہا۔ جب انتخاب کا نتیجہ نکلا تو مسٹر سیّد عبدالعزیز مقابلہ تو جیت گئے تھے، مگر صرف دوڈھائی سو ووٹوں سے جیتے تھے۔

مسٹر سیّد عبدالعزیز کی طبیعت بڑی جدت اور اختراع پسند تھی۔ حکومت

بہار کے وزیر رہے تو کاٹج انڈسٹریز کو صوبہ میں پھیلا دیا اور گھریلو چیزوں کی صناعی اور کاریگری کے لئے نئے ڈھنگ کے ڈیزائن بنوائے جس سے بہار کاٹج انڈسٹریز کی بنی ہوئی چیزوں کی مانگ تمام صوبے میں ہونے لگی۔ مکان کے دروں کے پردے جو بنتے تھے ان کا جواب نہ تھا۔ ملک سے باہر یہ پردے پسند کئے جانے لگے اور ان کے آرڈر ملنے لگے۔

مسٹر سیّد عبدالعزیز نے شادی نہیں کی جو کماتے وہ سب خرچ ہی کر دیتے۔ مکان بنانے کا بے حد شوق تھا۔ نئے نئے مکانوں کے نقشے اپنے سامنے بنواتے، پھر ان ہی نقشوں پر نئے مکان کی داغ بیل ڈالتے سب سے عالی شان نئے ڈیزائن کا ان کا مکان محل" دلکشا "آج بھی گاندھی میدان کے آمنے سامنے ہے۔ اگرچہ اب یہ عالی شان مکان مہاراجہ ہتھوا کی ملکیت ہے مگر آج بھی لوگ جانتے ہیں کہ اس حسین و خوبصورت بڑے مکان کو بنانے والے اور اس کے پہلے مالک مسٹر سیّد عبدالعزیز تھے۔

مئوکلوں کے علاوہ ان کے یہاں ہر شعبۂ زندگی کے لوگ آتے۔ کچھ اپنے کام کے سلسلہ میں آتے جن کو مسٹر سیّد عبدالعزیز سے سفارش کرانی ہوتی اور کچھ اس لئے کہ ان کے یہاں روزانہ اچھے لوگوں کی نشست ہوتی تھی۔ مسٹر سیّد عبدالعزیز غریب اور حاجتمندوں کی مدد بھی کرتے، مگر اس طریقے پر کہ دوسروں کو خبر نہ ہوتی۔ ایک گروپ وہ بھی تھا جو بلا ضرورت بھی روزانہ خالی وقتوں میں ان کے یہاں آتا۔ ان میں سے اگر کوئی روز کا آنے والا دو تین دن ناغہ کرتا تو یہ اس کی خیریت دریافت کراتے، کبھی اپنی موٹر بھی اس کو لانے کے لئے بھیج دیتے۔ ان کے یہاں کی بیٹھک میں ہندو مسلمان سبھی ہوتے تھے۔ ان کا دستر خوان ہمیشہ کشادہ رہا۔ اصرار کے ساتھ یہ لوگوں کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔

مسٹر سید عبدالعزیز دوستی کو ہر ممکن طریقے پر نباہتے تھے، مگر ایک بات

یہ بھی تھی، کہ کچھ لوگوں کی طرف سے اگر ان کے دل میں گرہ پڑجاتی، تو مشکل سے کھلتی تھی، اگرچہ دیکھنے والے اس کو محسوس نہیں کر سکتے تھے۔ ہر کام میں چندہ دیتے اور سماجی کام کرنے والوں کی ہمت افزائی اور مدد بھی کرتے۔ سیاسی اختلاف کو دوستی میں کبھی روکاوٹ نہیں بننے دیتے۔ بیشتر موقعوں پر یہ دوستی کو مقدم رکھتے۔ قریبی دوستوں سے وکالت کے کاموں کے لئے فیس بھی نہیں لیتے تھے۔ ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ چین کے مسلمانوں کا ایک مشن ہندوستان آیا۔ غالباً یہ ۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا۔ یہ مشن ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کر رہا تھا۔ جب اس مشن کے پٹنہ آنے کے پروگرام کی خبر مسٹر سیّد عبدالعزیز کو ملی تو انھوں نے خط لکھ کر اس مشن کے لوگوں کو اپنے یہاں ٹھہرنے کے لئے مدعو کیا۔ یہ دعوت چینی مسلم مشن کے لیڈر نے قبول کر لی۔ جب مشن کے لوگوں کے آنے میں دو دن باقی رہ گئے تو مجھے بلا کر مسٹر سیّد عبدالعزیز نے کہا کہ چینی مشن دو دنوں میں پٹنہ آ جائے گا مجھے اس کی میز بانی کرنی ہے۔ مگر میں ایک کش مکش میں پڑگیا ہوں۔ مجھے کل ہی بھاگل پور خون کے ایک پیچیدہ مقدمہ میں سیشن میں جانا ہے۔ یہ مقدمہ میرے ایک بہت نزدیکی ہندو دوست، جو کانگریسی ہیں، ان کے عزیز قریب کے خلاف ہے، جس میں مجھے استغاثہ کے خلاف کام کرنا ہے۔ اگر کسی دوسرے کا یہ مقدمہ ہوتا تو میں مقدمہ کے کاغذات واپس کر دیتا اور آنے والے مشن کے لوگوں کی خاطر خواہ میزبانی کرتا۔ مگر مشکل یہ ہے، کہ میرے دوست کا عزیز اس مقدمہ میں بری طرح پھنسا ہوا ہے اور میں نے پکا وعدہ کر لیا ہے، کہ میں اس کی طرف سے وکالت کروں گا۔ دوستی کی بناء پر میں نے فیس لینے سے بھی انکار کر دیا ہے، ایسی صورت میں میں مقدمہ نہیں چھوڑ سکتا، اس لئے پٹنہ میں تم میری طرف سے چینی مشن کے لوگوں کی میزبانی کرو۔ مشن کے لوگ میرے ہی

مکان میں ٹھہریں گے اور کھانے پینے اور ہر طرح کی آسائش کا انتظام رہے گا۔ تم میری مجبوری کی معافی مانگ لینا۔ غرض مہمان آئے۔ مسٹر سیّد عبدالعزیز کل سامان کر ہی گئے تھے۔ یہ مشن والے تین چار دن مسٹر سیّد عبدالعزیز کے مکان میں ٹھہرے۔ ان کی دعوت حکومت بہار کے طرف سے بھی ہوئی۔ مہمانداری کے سلسلہ میں مجھے بھی مسٹر سیّد عبدالعزیز کے مکان میں مہمانوں کے ساتھ رہنا پڑا۔ ان چینی مہمانوں کے ساتھ دو تین دن رہ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ چینی مسلمان اسلامی روایات کے سختی سے پابند ہیں۔ ان میں صرف دو تھے جو انگریزی جانتے تھے، میں صرف انہی سے باتیں کرتا تھا۔

۱۹۴۱ء میں مسٹر سیّد عبدالعزیز، نظام حیدرآباد کی دعوت پر حکومت حیدرآباد کے وزیر ہوکر گئے۔ یہ تین سال وھاں وزیر رہے۔ مسٹر سیّد عبدالعزیز غسل کرتے ہوئے غسل خانہ میں گر گئے۔ یہ پہلے ہی سے عرق النساء کے مریض تھے۔ گرنے سے سخت چوٹ آئی تھی۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ نظام حیدد آباد نے ایک ہزار روپے پنشن مقرر کردی۔ حیدر آباد میں دوسرے شعبوں کے ساتھ امورِ مذہبی کا شعبہ بھی ان کے سپرد تھا۔ ان کی دزارت کے زمانے میں میں حیدرآباد گیا، تو مسٹر سیّد عبدالعزیز نے مجھ سے فرمایا کہ حیدرآباد میں ہندوؤں کے مذہبی مقامات پر جاکر پرستش گاہوں کو ضرور دیکھو۔ چنانچہ میں نے بہت سے مندر، مٹھ اور مذہبی مقامات جاکر دیکھے۔ وہاں کے منتظمین اور لوگوں سے حکومت کی دلچسپی اور امداد کے بارے میں پوچھا تو سبھوں نے یہی کہا کہ جو سہولت، مدد اور ہمدردی مسٹر سیّد عبدالعزیز سے مل رہی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

یوں تو مسٹر سیّد عبدالعزیز رفاحی کاموں میں بڑھی ہوئی دل چسپی بھی لیتے اور مدد بھی کرتے تھے، مگر صوبہ میں سب سے پہلے بلائنڈ ریلیف کیمپ کھول کر غریب اور نادار، آنکھ سے معذور لوگوں کی جو خدمت انھوں نے کی، وہ ہمیشہ ایک تاریخی مثال

رہے گی۔ اپنے مکان کے سامنے گاندھی میدان میں سینکڑوں روٹیاں، خیمے اور شامیانے کرایہ پر منگوا کر لگاتے۔ نزدیک و دور ہر جگہ اعلان کراتے کہ فلاں تاریخ سے فلاں تاریخ تک غریبوں کی آنکھیں مفت بنیں گی، جس کے لئے ہندوستان کے بڑے ڈاکٹر متھراداس کو موگا سے بلایا گیا ہے، لوگ آکر مفت آنکھیں بنوائیں۔ بہت سے غریبوں کو دوائیں بھی مفت اور چشمے بھی تقسیم کرتے اور ناداروں کے مفت کھانے کا انتظام بھی کرتے۔ ہفتہ دس روز ڈاکٹر متھراداس کا رہنا سہنا ان ہی کے ساتھ ہوتا۔ ڈاکٹر متھراداس کے اخراجات اور فیس بھی ان ہی کے ذمہ ہوتی۔ یہ بلائنڈ ریلیف کیمپ کئی سال تک مسٹر سیّد عبدالعزیز کی طرف سے چلتا رہا۔ ہر سال ہزاروں روپے اس رفاہِ عام میں خرچ کرتے۔ اس کے بعد دوسرے بہی خواہانِ قوم نے مسٹر سیّد عبدالعزیز کی تقلید میں چند جگہوں میں بلائنڈ ریلیف کیمپ قائم کرنا شروع کردیا۔ چند سال کے بعد مسٹر سیّد عبدالعزیز نے اپنا کیمپ بند کردیا۔

مسٹر سیّد عبدالعزیز کے یہاں کھانے پر باہر سے آئے ہوئے دو ایک مسلمان تو ہوا ہی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مقامی حضرات بھی ان کے یہاں ضرور ہوتے تھے۔ ان کا دستر خوان مہمانوں سے کبھی خالی نہ رہا۔ سال میں اپنے یہاں ایک بڑی پُر تکلف دعوت کرتے جس میں عمائدین شہر اور معززین شریک ہوتے۔ اس دعوت کا نام مسٹر سیّد عبدالعزیز نے "مغلیہ ڈنر" رکھا تھا۔ یہ دعوت پٹنہ میں بہت مشہور تھی۔ مغلیہ طرز کے کھانے پکائے جاتے۔ دعوت میں شرکت کیلئے سینکڑوں لوگ مدعو کئے جاتے۔ جن کھانوں کا تذکرہ لوگوں نے صرف سنا تھا وہ کھانے بہتات کے ساتھ دستر خوان پر موجود ہوتے۔ آج بھی بلائنڈ ریلیف کیمپ اور مغلیہ ڈنر کے تذکرے مسٹر سیّد عبدالعزیز کے نام کیساتھ آہی جاتے ہیں۔

مسٹر سیّد عبدالعزیز نے جو کمایا اور خوب کمایا اس کو جی کھول کر خرچ بھی کیا۔ کئی سال تک پاؤں کی مجبوری سے چلنے پھرنے سے معذور رہے، مگر آخر دم تک ان کے

احباب کا مجمع ان کے ساتھ رہا۔ یہ آخری زمانہ بھی ان کا بڑے وقار کے ساتھ گذرا۔ ان کا انتقال جنوری ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ ان کے مکان کے سامنے گاندھی میدان میں بہت بڑی جماعت کے ساتھ ان کی نمازِ جنازہ ہوئی اور ان کی میت نیورہ میں سپردخاک کردی گئی۔

پٹنہ میں اس دور کی مختلف تحریکیں

۱۸۵۷ء کی قومی تحریک کی ناکامی نے جہاں قوائے ملکی پر برے اثرات الے وہاں یہ بھی ہوا کہ سماجی ماحول بھی اس زلزلے میں آہستہ آہستہ بدلنا شروع ہوا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ملک و قوم کو سہارا دینے کے ۔لئے موقع شناس کچھ ایسے صاحب فکر اور اہل عزم حضرات نکل آئے کہ ان کے جذبہ حب قومی اور ان کی دوراندیشانہ جرآت سے ہندوستان اور ہندوستانیوں کا مستقبل جو مایوسیوں کے گردو غبار سے ڈھک گیا تھا، اس کا کارآمد خاکہ ان بزرگوں کی رہنمائی سے پھر نظر کے سامنے آنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کا طوفان گذر چکا تھا اور ان کی تباہ کاریوں کے آثار بہت کچھ مٹ چکے تھے اب مصلحان قوم کی فکر و کاوش سے ملک میں ذہنی انقلاب کا دور شروع ہوا۔ سب سے پہلے بکھرے ہوئے شیرازوں کو جمع کرنے کی فکر ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ مایوسیوں کو امید سے بدلنا بھی تھا۔ گرتی ہوئی طبیعتوں کو سہارا دے کر ابھارنا اور جو اعضاء شل ہو چکے تھے، ان میں صحیح طور پر کام کرنے کی حرکت پیدا کرنی تھی۔ کام کٹھن تھا مگر یہ خدا کے بندے اس کام میں لگ گئے۔ مستقبل کا ڈھانچہ بنایا جانے لگا اور اس کو خوبصورت بنانے کے لئے طرح طرح کے نقش و نگار سوچے جانے لگے۔ قدرت جب طبیعتوں میں کام کرنے کی امنگ بھرتی ہے تو کام کی انجام دہی کے لئے راستے اور رہنمائی بھی پیدا کردیتی ہے۔ یہ وقت کی پکار تھی کہ خود طبیعتیں

بھی صحافت، تصنیف و تحقیق اور علم و تعلیم کی طرف مائل ہونے لگیں۔ جو مسائل اور روایتیں پردوں میں چھپی ہوئی تھیں ان پر سے پردے ہٹائے جانے لگے، جو مضامین ناحل شدہ پڑے تھے، ان کے حل کرنے کی کوشش شروع ہوئی، زندگی کے حقائق کو نئے زاویۂ نظر سے پرکھا جانے لگا اور عروج و زوال کے اسباب پر محققانہ طور پر بحثیں جاری ہو گئیں۔ پرانی عینکیں آنکھوں سے اتریں تو نئے ماحول کا اندازہ بھی ہوا اور اس کے ساتھ اپنے لئے صحیح جگہ لینے کی فکر بھی پیدا ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے یہاں کی دولت لوٹ لی تھی، قومی وقار چھین لیا تھا، ملکی سیاست سے دور رکھنے کے لئے اعضاء کو مفلوج کر دیا تھا، مگر ذہنی پرورش میں انھوں نے پھر بھی تعاون کیا۔ سب کچھ لے کر انھوں نے جو بڑی قیمتی چیز دی وہ احسان مدنیت تھا۔ انگریزون کا بخشا ہوا یہی پہلو کام آیا نتیجہ یہ ہوا کہ احسان مدنیت جاگے تو نئے اقدار کے سانچوں میں جذبات بھی ڈھلنے لگے۔ اس نئے ماحول میں مصلحان قوم کی رہنمائی سے جب دماغ کام کرنے لگاتو مفلوج اعضاء میں بھی حرکت شروع ہوئی اور اس طرح طبیعت کا میلان خود وقت کا تقاضا بن گیا۔ علمی تحریکیں شروع ہوئیں، معاشرتی نظام درست کیا جانے لگا، سماج کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ادارے قائم ہونے لگے، علم و ادب میں نئی روح پھونکی جانے لگی اور نئے ڈھنگ پر نقصانات کی تلافی کا سلسہ شروع ہو اور نصاب تعلیم کا نقشہ تیار ہونے لگا۔

تعلیمی تحریک

کچھ تو وقت کا تقاضا بھی تھا پھر ترقی یافتہ حکمراں طبقہ کے ساتھ میل جول جب بڑھا تو اس کو دیکھ کر دلوں میں نئے علوم کو حاصل کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ انگریزی داں طبقہ کی انگریزوں کو ضرورت بھی تھی تاکہ ملک میں جو حکومت کے چھوٹے چھوٹے شعبے قائم ہو رہے تھے۔ ان میں انگریزی پڑھے لکھے ہندوستانیوں سے کام

نکالا جائے۔ چنانچہ ملک کی مرکزی جگہوں میں جب انگریزوں نے اسکول اور کالج کھولنے شروع کئے تو کافی تعداد میں ان کو پڑھنے والے بھی ملنے لگے۔ان اسکولوں اور کالجوں کی طرف جہاں حکمراں قوم کی زبان کی تعلیم نے ہندوستانیوں کو کھینچا۔ وہاں مغربی تعلیم کی وہ افادیت بھی ان کے سامنے آگئی جس کے ذریعہ سے قوموں میں نئی نئی تحریکوں کا سراغ بھی ملتا تھا اور ابھرتی ہوئی جمہوریت کے نظریوں کا پتہ بھی چلتا تھا،اور اس وقت جو رہبران قوم تھے انہوں نے بھی مغربی تعلیم پر زور دیااور حکومت کے قائم کردہ اسکولوں اور کالجوں کی کمی کو دیکھ کر مغربی تعلیم کے لئے بہت سے مدارس خود بھی کھولے اور قوم کے چندوں سے بھی کھلوائے خوش حال طبقے سے لوگ بڑی تعداد میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اور یوروپ کی ترقی یافتہ قوموں کا انداز فکر اور ان کی طرز معاشرت کو دیکھنے کے لئے بھی بڑی تعداد میں انگلستان جانے لگے۔یہی وہ زمانہ تھا کہ راجہ رام موہن رائے اپنی طرز پر مغربی تعلیم کے لئے زور دے رہے تھے۔دوسری طرف سرسید احمد خاں مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی تحریک چلارہے تھے اور جو نقصان مسلمانوں کو مغربی تعلیم کے بائیکاٹ سے پہنچ رہا تھااس کی تلافی کے لئے مسلمانوں کے واسطے ایک مرکزی ادارہ کے ساتھ ساتھ ہر جگہ اسکول کھولنے کے لئے مسلمانوں کو مشورے بھی دے رہے تھے اس وقت ۱۸۶۳ء میں حکومت نے پٹنہ کالج اور پٹنہ کالجیٹ اسکول قائم کیا تھا جو سولہ آنہ انگریز پرنسپل کی نگرانی میں چلتے تھے،مگر اس سے تعلیم کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی تھی۔ تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو دیکھتے ہوئے بنگالی ہمدرداں قوم کی ایک ساعت یہاں بہار کی مختلف جگہوں میں متعدد اسکول کھول رہی تھی ،چناچہ ۱۸۸۲ء میں ٹی کے گھوش اکیڈمی کے نام سے بانکی پور میں ایک اسکول کھلا،دوسرااسکول ۱۸۹۵ء میں اینگلو سنسکرت اسکول کے نام سے قائم ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں رام موہن رائے سیمنری کا افتتاح ہوا۔ یہ تینوں اسکول بنگالی ہمدرداں قوم کے رہین منت تھے۔اس سے قبل ۱۸۸۳ء میں بابو بشیشر سنگھ نے بہار

نیشنل کالجیٹ اور بہار نیشنل کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ اسکول اور کالج بانکی پور میں تھے، اصل پٹنہ جو پٹنہ سٹی کے نام سے آج موسوم ہے، وہاں صرف گورنمنٹ کا ایک اسکول پٹنہ سیٹی اسکول کے نام سے قائم تھا۔ اس وقت پٹنہ سیٹی کے طالبان علم کی سہولت کے خیال سے بھی اور پھر اس لئے بھی کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسے اسکول کی ضرورت ہے جہاں مغربی تعلیم کے ساتھ دینیات اور عربی کی تعلیم بھی ان کو ملتی رہے۔ مارچ ۱۸۸۴ء میں شمس العلماء مولوی محمد حسین مرحوم نے صادق پور کے محلہ میں محمڈن اینگلو عربک اسکول کی بنیاد رکھی اب خدا کے فضل سے اس اسکول کے ساتھ ایک ڈگری کالج بھی ممبران محمڈن ایجوکیشن کمیٹی کے اغراض و مقاصد کے تحت بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ جس وقت شمس العلماء مولوی محمد حسین مرحوم نے ۱۸۸۴ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول کی داغ بیل ڈالی اس وقت ان کے اہم شریک کار میر احمد حسین مرحوم رئیس پٹنہ تھے، جن کے تعاون سے اسکول معرض وجود میں آیا۔ اسکول قائم ہو چکا تو اس کے اغراض و مقاصد کو حکومت کے سامنے پیش کر کے اسے منظور کرانے کے لئے محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی بنائی گئی جس میں نواب بہادر ولایت علی خاں مرحوم، خاں بہادر خدا بخش خاں بہادر مرحوم اور خاں بہادر قاضی رضا حسین مرحوم بھی شریک ہوئے محمڈن اینگلو عربک اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر ایک سال شمس العلماء مولوی محمد حسین ہوئے اور اس کے سکریٹری میر احمد حسین صاحب رہے۔ دوسرے سال میر احمد حسین صدر ہوئے اور شمس العلماء اس کے سکریٹری ہوئے۔ جب تک یہ دونوں زندہ رہے یہی دونوں پھیرا پھاری سے اسکول کے روح رواں مجلس انتظامیہ صدر اور سکریٹری بنتے رہے۔

یوں تو پٹنہ کالج، پٹنہ میڈیکل اسکول اور پٹنہ انجینرنگ اسکول پٹنہ میں انگریزی حکومت کے قائم کردہ تعلیمی ادارے تھے مگر ان کے قیام میں بھرپور چندہ دینے والے اس وقت کے ہندو اور مسلمان رئیسان شہر دونوں ہی تھے۔ پٹنہ کالج اور اس

وقت کا پٹنہ کالجیٹ اسکول پرتگالیوں کی بنائی ہوئی اس عمارت میں قائم ہوا تھا۔ جس میں پہلے پرتگالیوں کی تجارت کا کاروبار ہوتا تھا، اور جو دریائے گنگا کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کالج اور کالجیٹ اسکول کے قیام میں بھی مسلمان روسائے شہر خاص کر نواب بہادر ولایت علی خاں اور نواب لطف علی خاں پیش پیش تھے۔ میڈیکل اسکول قائم کرنے کے لئے اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر بنگال نے پٹنہ میں تمام عمائدین صوبہ بہار کو جمع کیا۔ غالباً اس وقت تین لاکھ کا چندہ اس میڈیکل اسکول کے قائم کرنے کے لئے حکومت جمع کرنا چاہتی تھی۔ مہاراجہ دربھنگہ، مہاراجہ بیتیاء مہاراجہ ڈمراؤں اور مہاراجہ ہتوا وغیرہ کے علاوہ ہندو اور مسلمان زمیندار اور رئیس بھی جمع تھے۔ اس جلسہ کی صدارت لیفٹیننٹ گورنر خود کر رہے تھے اور ان کا انگریز سکریٹری ہر راجہ مہاراجہ اور رئیس کے سامنے فہرست لے کر جلسہ میں گھوم رہا تھا اور سب حاضرین جلسہ اپنی حیثیت اور اپنی توفیق کے مطابق اپنے نام کے سامنے رقم لکھتے جاتے تھے۔ اس وقت سب سے بڑی رقم مہاراجہ ہتوا نے اپنے نام کے آگے پچیس ۲۵ ہزار روپیہ لکھا تھا

۔جب بہت سے راجہ مہاراجہ اور رئیس اپنے نام کے سامنے چندہ کی رقم لکھ چکے تو یہ فہرست نواب لطف علی خاں کے پاس آئی۔ نواب صاحب موصوف نے لیفٹینیٹ گورنر کے انگریز سکریٹری سے کہا کہ آپ پہلے، تمام حاضرین سے چندہ کی رقومات لکھوالیں تو میں اپنے نام کے سامنے جو رقم مناسب سمجھوں گا لکھ دوں گا۔ تھوڑی دیر میں چندہ کی فہرست مکمل ہوگئی تو انگریز سکریٹری آخر میں اس فہرست کو لیکر نواب لطف علی خاں کے پاس پہنچا۔ سب ملا کر وعدہ کی ہوئی اور لکھی ہوئی چندہ کی رقمیں دو لاکھ تک پہنچی تھیں۔ ایک لاکھ کی رقم ابھی بھی باقی تھی کہ تین لاکھ کی مطلوبہ رقم پوری ہو۔ اس رقم کو اس جلسہ میں نواب لطف علی خاں اور نواب بہادر ولایت علی خاں نے پوری کردی۔ فہرست مکمل ہو چکی تو جلسہ میں لیفٹینیٹ گورنر نے جب تمام وعدہ کئے ہوئے چندہ کی رقموں کو چندہ دینے والوں کے نام سے پڑھا تو مہاراجہ دربھنگہ اور مہاراجہ ہتوا

بھی نواب لطف علی خاں اور نواب بہادر ولایت علی خاں کی اس فیاضی پر حیران رہ گئے۔
جہاں اب پٹنہ انجینئرنگ کالج ہے وہیں بہت زمانہ ہوا پٹنہ انجینئرنگ اسکول حکومت نے قائم کیا تھا۔ یہ زمین مولوی محمد حسین خاں رئیس رسول پور کی تھی۔ یہ مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ یہ زمین لال باغ کے نام سے مشہور تھی۔ یہ زمین محمد حسین خاں نے حکومت کو مفت میں پیش کردی۔ چندہ کی رقموں میں یہاں بھی نواب بہادر ولایت علی خاں اپنے چچا لطف علی خاں اور مہاراجہ دربھنگہ کے دوش بدوش تھے۔ پٹنہ انجینئرنگ اسکول سے ملحقہ زمین پر حکومت کا پہلے قبضہ تھا۔ جس میں انجینئرنگ اسکول کے پرنسپل کا مکان تھا۔ اس سے لگا ہوا مٹے مٹے آثار میں وہ باغ اور مقبرہ آج بھی موجود ہے جو میر افضل کے مقبرہ اور باغ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی میں ایک مسجد بھی ہے جس پر لگے ہوئے کتبے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ فرخ سیر اسی باغ میں تخت پر بٹھائے گئے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کی تعلیم کے لئے بادشاہ نواب صاحب مرحوم نے علم دوستی اور فیاضی کا سب سے بڑھ کر یوں ثبوت دیا کہ اپنی بڑی زمینداری کا ایک حصہ وقف کر کے انھوں نے پٹنہ میں عورتوں کی تعلیم کے لئے ایک انگریزی اسکول قائم کیا جس میں انٹرینس تک کی تعلیم کا انتظام بھی تھا اور عورتوں اور بچیوں کی تعلیم دینے کی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی اسی سبب سے تعلیم یافتہ استانیاں ان تعلیمی اداروں کو بھی ملنے لگیں جہاں بچوں کی تعلیم کے لئے صوبہ میں ہر جگہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر انتظامات ہونے لگے تھے۔ پٹنہ میں یہ پہلا زنانہ اسکول تھا اور اس کا نام بھی "بادشاہ نواب رضوی ٹریننگ کالج" ان ہی کے نام پر رکھا گیا۔ آخر میں حکومت نے اس اسکول اپنے انتظام میں لے لیا اور آج تک پرانے بانی کے نام سے ساتھ بڑی امتیازی شان سے قائم ہے۔ چوں کہ مہاراجہ بتیا کی بنائی ہوئی ایک عمارت لب دریائے گنگا واقع ہے اس لئے بتیا اسکول کے نام سے بھی بڑی حد تک مشہور ہے۔

اس کے بعد دو بڑی فیاض اور علم دوست ہستیاں اور بھی ملتی ہیں۔ ایک

تو مسٹر سید نورالہدیٰ سی، آئی، ای کی ہے اور دوسری ہستی سر گنیش دت سنگھ کی ہے۔ سر گنیش دت سنگھ انگریزی حکومت کے زمانے میں جب وزراء کا تقرری ہونے لگا تھا تو بہت دنوں تک حکومت بہار کے ایک وزیر رہے تھے۔

صوبہ بہار میں عربی تعلیم کے لئے متعدد مدرسے قائم تھے جن میں ہر مدرسہ کی حیثیت مقامی تھی اور جہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد طلباء اپنے ہی مدرسوں سے سند حاصل کیا کرتے تھے۔ عربی کی تعلیم کے مدرسے بہت سے اوقاف سے بھی وابستہ تھے۔ غالباً ۱۹۱۶ء میں مسٹر نورالہدیٰ نے اپنے مکان مصلح پور میں ایک بڑی پرتی اراضی میں عربی کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، اس کے لئے ہزاروں روپیوں کی رقم سے مدرسہ کے لئے ایک عالی شان عمارت بنوائی۔ طلباء کے لئے مفت قیام و طعام کا بھی سامان کیا اور وہیں باجماعت نماز کی غرض سے ایک عظیم الشان دو منزلہ مسجد بھی بنوائی۔ اسی مدرسہ کے لئے ملحقہ ہوسٹل، غریب طلباء کے مفت کھانے کے اخراجات کے واسطے او پھر مسجد کے ضروری اخراجات کے لئے بھی انہوں نے ایک بڑی جائداد وقف کردی۔ مدرسہ کا نام اپنے والد میر شمس الہدیٰ مرحوم کے نام پر مدرسہ شمس الہدیٰ رکھا اور مدرسہ اور ہوسٹل کے متعلق جو جائداد انھوں نے وقف کی، اس کا انتظام حکومت بہار کے سپرد کیا۔ مسٹر نور الہدیٰ کی یہ کاروائی بڑی دانشمندانہ ہوئی، کیونکہ جب انگریزی حکومت کے سامنے مسلمانون کی دینی اور عربی تعلیم کا مسئلہ پیش کیا گیا اور ان تعلیمات کو فروغ دینے کا سوال اٹھا تو مدرسہ شمس الہدیٰ صوبہ بہاز کا مرکزی ادارہ تسلیم کیا گیا اور حکومت نے بھی کثیر رقم ہر سال اس کے اخراجات کے لئے منظور کر لیا۔ مدرسہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو دیکھتے ہوئے بعد میں اس کی پرانی عمارت کے پاس ہی حکومت نے ایک عظیم الشان مدرسہ کی عمارت بھی بنوائی۔ اب یہی مدرسہ صوبہ میں عربی اور فارسی میں ریسرچ کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور یہیں فارسی اور عربی کی

ڈائرکٹوریٹ بھی مستند اور اعلیٰ درجہ کے پروفیسروں کی دیکھ بھال میں قائم ہے۔

سر گنیش دت سنگھ نے اپنی کمائی اور زمینداری کا بڑا حصہ سنسکرت کی تعلیم اور اس کے طلباء کے لئے وظیفہ کے واسطے اپنی زندگی میں وقف کردیا تھا جس کی دیکھ بھال اور انتظام وہ خود کرتے تھے۔ سر گنیش دت سنگھ صاحب اولاد تھے اس لئے تعلیمی کام میں قومی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک بڑی معتد بہ جائیداد کا وقف کرنا اور الگ سے کمائے ہوئے روپیوں میں سے کافی رقم نکال کر اس کار خیر میں حصہ لگا دینا حد درجہ کی فیاضی تھی۔ مسٹر نورالہدیٰ لاولد تھے،ان کے سامنے قومی مفاد کا پورا کرنا بلا شبہ بڑا فریضہ تھا مگر سر گنیش دت سنگھ نے جس طرح ہر دو فرائض ایک ساتھ پورے کئے یعنی ایک تو اولاد کے لئے بھی ترکہ چھوڑنا اور پھر جائیداد کا معتد بہ حصہ تعلیمی کاموں کے لئے وقف کر دینا در حقیقت بڑا قابل تحسین کام تھا۔

سماجی ، صحافتی اور ادبی تحریکیں

پٹنہ میں علمی اور تعلیمی تحریک جو اٹھی اور جو اس کے علمبردار تھے ان کا حال تو علمی تحریک کے سلسلے میں آگے لکھ چکا ہوں۔اب سماجی ، صحافتی اور ادبی تحریکوں کا حال سنیئے۔ان تحریکوں کے لئے اس وقت کوئی خاص ادارہ نہ تھا۔بلکہ حلقے بنے ہوئے تھے جہاں ہر تحریک سے متعلق گفتگو ہوتی بحثیں ہوتیں اور مختلف تحریکوں کو آگے بڑھانے کی راہیں ہموار کی جاتیں۔ساتھ ہی ساتھ ملکی ترقی اور اصلاحات کی راہیں بھی سوچی جاتیں۔اس وقت سیاست کی طرف تامل سے قدم اٹھتے تھے اس لئے سماجی، صحافتی اور ادبی تحریکوں میں زیادہ گرمی تھی،ان ہی تحریکوں میں سہولت بھی تھی اور آئندہ کے لئے ہر طرح کی دماغی نشوونما کی زیادہ گنجائش بھی ان ہی میں پیدا کی جاسکتی تھی۔سیاست میں قیدوبند کی مشکلات ابھی تک نظر کے سامنے تھیں اور ۱۸۵۷ء کی خوں چکاں داستان اور انگریزوں کے انسان سوز مظالم کی گونج کراہ کراہ کر کانوں میں آتی

رہتی تھیں۔یہی وجہ تھی کہ مصلحان قوم نے سماج میں اصلاح کی تحریکیں سب سے زیادہ مقدم سمجھیں۔اسی تحریک میں گری ہوئی ہمتوں کو ابھار کر بر سر کار لانا تھا اور مستقبل کے لئے نئے انداز میں نوجوانوں کے واسطے زندگی کی قدروں کا علمی خاکہ تیار کرنا تھا،اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اگر ایک طرف محبان وطن کی جدو جہد سے اچھے اچھے تعلیمی ادارے کھل رہے تھے تو دوسری طرف سماج کی اصلاح و دماغ کی نشود نما اور شعور و مدنیت پیدا کر کے ان سب کو آگے بڑھانے کے لئے نئے انداز فکر میں تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ اخبار اور وسائل کے اجراء کی طرف بھی قوم کے قدم اٹھنے لگے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ پٹنہ میں متعدد اخبارات جاری ہوئے اور علمی تحریکیں بڑھتی چلیں۔اس وقت پٹنہ میں جتنے اخبارات نکلے وہ تقریباً سب اردو کے اخبارات تھے۔اردو ہی ہندو اور مسلمان کی مشترک زبان تھی ،اس لئے ان اخبارات کے نکالنے والے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔پٹنہ کے دو معزز وکیل بابو بشیشر سنگھ اور بابو گر وپر شاد سین نے پٹنہ سے یکے بعد دیگرے اردو میں دو اخبار نکالے۔ بابو بشیشر سنگھ تو بہاری تھے مگر بابو گرو پرشاد سین بنگالی وکیل تھے ہندو بنگالیوں کا الگ سے بھی اردو میں ایک تیسرا اخبار قاصد کے نام سے ۱۸۷۴ء میں نکلا۔

پٹنہ میں سب سے پہلا اخبار اردو میں نکلا وہ تہلکا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں ابوتراب کے اہتمام سے یہ اخبار کچھ دنوں تک چلتا رہا۔ ۱۸۶۵ء میں سید محمد اسماعیل کی ادارت میں پٹنہ سے ایک اور اردو میں اخبار نکلا۔اس کا نام عظیم الاخبار تھا۔ان سب کے علاوہ اور بھی اخبارات نکلتے گئے جن میں سب سے زیادہ مقبول الپنچ ہوا۔ چند اخباروں کے تذکرے حسب ذیل ہیں۔

پٹنہ کے اخبارات

ان ہی دنوں کلکتہ میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام مذاکرہ علمیہ تھا جس کی ایک شاخ پٹنہ میں بھی قائم ہوئی۔یہ غالباً ۱۸۷۴ء کا زمانہ تھا مہینے میں ایک دفعہ تو ضرور

نہیں تو دو دفعہ اس انجمن کے اراکین آپس میں ملتے، بدلتے ہوئے حالات اور نئے نئے علوم و فنون پر بحثیں کرتے اور عوام میں نئے علوم کو پھیلانے کی راہیں سوچتے۔ پٹنہ میں میر ابو سعید صاحب اس انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان ہی کی وجہ سے پٹنہ میں کچھ دنوں یہ انجمن زندہ بھی رہی۔

اس کہ کچھ دنوں کے بعد پٹنہ سے شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب صادق پور نے ایک ہفتہ وار اخبار پٹنہ گزٹ نکلا کچھ دنوں تک نکلا مگر کچھ دنوں تک نکلنے کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔

ان میں سب سے پہلے سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور کی طرف سے ۱۸۶۹ء میں ایک اخبار نکالا گیا تھا۔اس کا نام اخبار "الاخبار" تھا۔اس سائنٹفک سوسائٹی کے دوسرے مقصدوں کے علاوہ یہ بھی اس کا ایک مقصد تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ایک اردو یونیورسیٹی بھی قائم کرے۔اس سوسائٹی کے ممبر ہندو اور مسلمان دونوں تھے بلکہ ہندو ممبران کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی اور اس میں بھی ممبر تھے۔ اس سوسائٹی کا بھی اخبار اردو ہی میں نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر منشی اجودھیا پرشاد قصبہ منیر کے رہنے والے تھے جو پٹنہ سے اٹھارہ بیس میل پچھم ایک آباد تاریخی قصبہ ہے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ اخبار بھی ختم ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ اردو یونیورسیٹی کے قیام کی تحریک اور اسکیم بھی ختم ہوگئی۔ مظفر پور کے اس سائنٹفک سوسائٹی کا تذکرہ گارسان وناسی نے بھی اپنے ۱۸۶۹ء کے خطبات میں کیا ہے۔ اس گارسان وتاسی کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پٹنہ میں سب سے پہلا اردو کا جو اخبار نکلا وہ "چشمۂ علم" تھا۔ یہ ۱۸۶۹ء کی جنوری میں شائع ہوا تھا اور مہینہ میں دوبار نکلتا تھا۔ مگر یہ غلط ہے۔

۱۸۱۸ء میں بابو بشیشر سنگھ اور بابو گرو پرشاد سین پٹنہ کے دو معزز اور کامیاب وکیلوں نے پٹنہ میں دو اخبار نکالے۔ ایک تو انگریزی زبان میں تھا دوسرا اردو میں یہ دونوں ہفتہ وار اخبار تھے۔ انگریزی اخبار کا نام "انڈین کرانکل" تھا اور دوسرے کا نام "اردو انڈین کرانکل" تھا۔ بعد میں "اردو انڈین کرانکل" کے سلسلے میں ان حضرات کے

ساتھ پٹنہ کے تیسرے معزز اور نامور وکیل مولوی یحیی صاحب کا نام آنے لگا۔ یوں تو اس اخبار کی انتظامیہ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں مگر انتظامیہ کمیٹی سے باہر اس اخبار کے سرپرست اور مالی معاون ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اخبار اس وقت ملکی مفاد کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مفاد کا یکساں طور پر نگہبان تھا۔ ایک بات یہ تھی کہ اردو ہی حکومت کی ثانوی زبان مانی گئی تھی اور ہر جگہ اردو ہی بلا تخصیص ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان بنی ہوئی تھی اس لئے اسی زبان میں اخباروں کی مانگ بھی زیادہ تھی۔ اردو کرانکل پہلے جاری ہو چکا تھا اس کے بعد انگریزی میں انڈین کرانکل نکلا۔ انگریزی انڈین کرانیکل کچھ زیادہ دنوں تک چلا مگر اردو کرانیکل کی زندگی کئی سال تک قائم رہی۔ ۱۸۸۶ء میں یہ اخبار ختم ہوا تو اس کی جگہ ان ہی کے مالکانِ اخبار نے جو اردو کرانیکل نکالتے تھے اردو بہار ہیرالڈ اور انڈین کرانیکل نکالا۔ یہ اخبار بھی زیادہ دنوں تک نہ چلا۔ جو زمانہ اردو انڈین کرانیکل کے شباب کا تھا ان ہی دنوں اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالغنی وارثی اور پھر مولوی سیّد رحیم الدین رہے۔

مولوی عبدالغنی وارثی موضع استھانواں کے رہنے والے تھے۔ جو سابق ضلع پٹنہ اور نئے ضلع نالندہ کا ایک بڑا مردم خیز اور مشہور قصبہ ہے۔ بعد میں مولوی عبدالغنی وارثی سلطنتِ آصفیہ حیدر آباد میں ملازم ہو کر چلے گئے اور ترقی کر کے ڈپٹی اکاؤنٹنٹ کے معزز عہدہ تک پہنچے۔ مولوی سیّد رحیم الدین موضع دسنہ کے رہنے والے تھے جس کی شہرت سی تو پہلے بھی، مگر اس موضع دسنہ کو اپنے نام سے زندگی دوام بخشنے والے علامہ سیّد سلیمان ندوی بعد میں نکلے۔ موضع دسنہ، موضوع استھانواں سے ملحق ایک دوسرا قصبہ ضلع نالندہ میں ہے۔ یہ دونوں قصبے دو تین برسوں سے نئے ضلع نالندہ کے حصے ہیں۔ پٹنہ ضلع کے جنوب مشرقی حصے کو علیحدہ کر کے اس نئے ضلع کی تشکیل ہوئی ہے مولوی سید رحیم الدین نے بعد میں پٹنہ سے اخبار "الپنچ" نکالا، جو تمام ہندوستان میں اخبار "اودھ پنچ" کا ہمسر مانا جاتا تھا۔

جب تک مولوی سیّد عبدالغنی وارثی اور مولوی سیّد رحیم الدین کے ہاتھوں میں اخبار اردو انڈین کرانیکل کی ادارت رہی یہ خوب پھلا پھولا۔

اس کے اداریئے بڑے بصیرت افروز ہوتے تھے اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ، ملکی، قومی اور ساتھ ہی ساتھ بین الاقوامی مسائل پر رائے زنی بھی ہوتی تھی۔ اس دور کے اخباروں میں اردو انڈین کرانیکل کو جو امتیازی حیثیت حاصل تھی، اس کی وجہ اس کی جرآت تنقید اور ملکی سیاسی حالات پر منتقی دلائل کے ساتھ اس کے ایڈیٹوریل میں اس کے بے لاگ تبصرے تھے۔ آج اس آزادی کے زمانے میں بھی اگر اس گذرے ہوئے اردو انڈین کرانیکل کے اکثر افتتاحیے پیشِ نظر رکھے جائیں تو شاید ہی اس سے زیادہ بے باک اور جرأت مند افتتاحیئے آج کے اخباروں میں آپ کو نظر آئیں گے۔

ان ہی دنوں ۱۸۸۵ء میں ایک دوسرا اردو کا اخبار ''نسیم'' کے نام سے جاری ہوا مگر اس کی زندگی بہت مختصر نکلی۔ ۱۸۸۷ء میں منشی عابد حسین نے ایک اخبار 'انیس' کے نام سے نکالا، کچھ دنوں چل کر یہ بھی ختم ہوا۔

اخبار الپنچ

۱۸۸۵ء کا زمانہ تھا۔ صدر گلی میں ایک مجلس علم و ادب میر احمد حسین مرحوم کے گھر قائم تھی۔ پٹنہ کے اربابِ فن کے لئے یہ ایک مرکز بن گیا تھا۔ یہیں اس زمانے میں اخبار ''الپنچ'' کی داغ بیل پڑی۔ مولوی سید رحیم الدین نے بڑی جرأت کے ساتھ اس اخبار کے اجراء کی پیش کش اپنی طرف سے کی۔ اہالیانِ مجلس کو یہ بات بے حد پسند آئی۔ مالک تو سیّد رحیم الدین رہے مگر مالی معاونین میں بہت سے لوگ نکل آئے۔ قلمی معاونین کی بھی کمی نہیں تھی اس وقت بھی پٹنہ علم و ادب کا گہوارہ تھا، چنانچہ مسٹر شرف الدین (جو بعد میں جسٹس شرف الدین ہوئے) کی رائے سے یہ بات طے پائی کہ اصل ہیڈ کوارٹر تو اخبار ''الپنچ'' کا صدر گلی رہے، مگر اشاعت کے لئے اس کا صدر دفتر بانکی پور میں قائم کیا جائے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ دونوں جگہوں کے

سرپرست اس اخبار کو اپنا اخبار سمجھتے ہوئے بے دریغ اس کی خدمت کرتے رہیں۔

اخبار الپنچ کے اجراء کا بڑا مقصد سماج میں اصلاح کی کوششوں کو تیز سے تیز تر کرنا تھا اور اس میں یہ اخبار سولہ آنے کامیاب بھی رہا۔ آقا الپنچ، بھیا الپنچ، مولا الپنچ۔ سب کے گرو گھنٹال الپنچ، ایسے ہی اور کتنے القاب کے ساتھ مراسلوں میں اس کے مضمون نگار اس کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ طنز و ظرافت کی چاشنی کے ساتھ اصلاحی، تنقیدی اور اخلاقی مضامین لکھنے والے آج کل تو خال خال ہی نظر آتے ہیں مگر اس وقت ادب لطیف کا اٹھتا ہوا شباب ان ہی رنگین مضمون نگاروں کی جھرمٹ میں پروان چڑھا۔ تنقید و تنقیص اور اصلاح کا کڑوا سبق آسانی سے حلق کے نیچے نہیں اترتا، مگر الپنچ کے ایڈیٹر اور اس کے قلمی معاونین کا یہ کمال تھا کہ ہنستے ہنساتے وہ اصلاح و تنقید کی تلخ گولیاں ظرافت کی چاشنی میں اس طرح لپیٹ کر کھلاتے کہ منہ کا مزہ نہ بگڑتا۔ لکھنؤ کا اودھ پنچ اور اودھ اخبار اگر یہ دونوں صحافت اور ادب کی جان تھے تو یہاں کا الپنچ بھی صحافت اور ادب کی آبرو تھا۔ الپنچ کو نکلے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، کہ اودھ پنچ اور الپنچ میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ مضامین کی یکسانیت، پالیسی کی ہم آہنگی اور زبان و ادب کے چٹخاروں نے دونوں کے مضمون نگار بھی جلد ہی مشترک کر دیئے۔ اسلوب تحریر میں پہچان مشکل تھی، کہ لکھنے والا لکھنوی ہے کہ عظیم آبادی، علامہ فضل حق آزاد، مولانا شوق نیموی، مولوی عبدالغفور شہباز، مولانا شاہ محمد اکبر داناپوری، خاں بہادر ضمیر الدین احمد ابو الخیر رحمانی، منشی عابد حسین عابد شمس العلماء محمد یوسف رنجور س، س، دسنوی، صغیر لکھنوی، عشرت گیاوی اور بھی بہت سے حضرات جو اودھ پنچ اور اودھ اخبار کے مضمون نگار تھے وہ الپنچ کے بھی تھے۔

الپنچ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ گلی کوچوں کے معمولی جھگڑوں کی واردات سے لے کر سیاست کے الجھے ہوئے مسائل تک سب اس کے زیر تبصرہ رہتے اور ان پر مضامین ایسے پیرایہ میں لکھے جاتے کہ ایک معمولی واقعہ کی روداد بھی پڑھنے

والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ الپنچ کا دامن ہر طرح کی خبروں کے لئے پھیلا رہتا تھا۔ اس کے خصوصی نامہ نگار ضروری خبروں کے ساتھ دل چسپ خبروں کی رپورٹیں بھی اخبار کے لئے بھیجتے اور یہ سب خبریں بڑے ظریفانہ انداز میں چھپتے، جہاں اخلاقیات کا معلم الپنچ بن گیا تھا وہاں ادب و شاعری کا میدان بھی اس کی جولانگاہ تھا۔ تقریر، تنقید، تبصرہ تنقیص اور اصلاح کا اس اخبار میں دفتر کھلا ہوا تھا شاعری پر جہاں کڑے اعتراضات ہوتے تو اس کے ساتھ شعروں پر بڑی استادانہ اصلاحیں بھی کی جاتیں، زبان کی خامیوں پر سخت گرفت ہوتی اور غلط اصلاحوں کے استعمال پر غلطی کرنے والوں کا بڑی بے باکی کے ساتھ مضحکہ اڑایا جاتا۔ اس وقت ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اس معلم اخلاق و ادب، الپنچ، اخبار کی تنقیدوں، اصلاحوں اور اعتراضات کو ذاتی مخاصمت کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر کچھ ہی دنوں بعد اس طبقے کو چپ ہو جانا پڑا، کیونکہ "الپنچ" کی تنقیدوں، اصلاحوں اور اعتراضات کا سودمند اثر عظیم آباد کی مختلف ادبی انجمنوں پر پڑنے لگا تھا اور سچا ذوقِ سلیم پیدا ہونے کے سبب سے یہاں کے شعراء اور ادباء خود بھی شعروادب کی اصلاح میں حصہ لینے لگے تھے۔ دن گذرتے کچھ دیر نہیں لگتی، وہی "الپنچ" جس نے پہلے اصلاح و اعتراض کا بازار کھول رکھا تھا کام پورا ہونے کے بعد اسی کی طرف سے اب مستحقین کو اعتراضات کی جگہ پرستائش اور فضیلت علم و دانش کی سندیں بھی ملنے لگی تھیں۔ اس وقت عظیم آباد کی فضائے شاعری میں یوں تو بہت سے کاملانِ فن چمکتے دمکتے نظر آتے تھے، مگر ایک ہستی ایسی ابھر رہی تھی جو آخر میں فخر بہار بنی۔ یہ حضرت سید علی محمد شادؔ تھے۔ الپنچ کی کڑی نظر ان ہی پر رہا کرتی تھی۔ ظاہر میں کچھ لوگوں نے اس کو ذاتی مخاصمت سمجھا مگر حقیقت تو یہ تھی کہ اخبار الپنچ کی بے لاگ تنقیدوں نے ہی حضرت سید علی محمد شادؔ کو راستہ بتا کر ان کو ان کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

جس کا اعتراف خود حضرت شاد نے بعد میں یوں کیا۔

خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا　　　بتا دیا مجھے بیچ بیچ کے راستہ چلنا

اس شعر میں ذرا شکوہ کی تلخی بھی ہے جس سے کسی شاعر کی شاعرانہ فطرت کو جدا نہیں کیا جاسکتا، مگر جیسے جیسے دن گزرتے گئے یہ تلخی بھی ختم ہوتی گئی۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا، کہ سب کے دل آئینے کی طرح صاف ہوگئے۔ اس کا بیان بادشاہ نواب کے ایک مشاعرے کی روداد میں آئے گا اور اس کے علاوہ اخبار الپنچ کے بانی اور روح رواں مولوی سید رحیم الدین کے انتقال پر حضرت شاؔد نے جو نظمیں لکھیں ان سے بھی یہ بات آپ کو جھلکتی ہوئی دکھائی دے گی کہ دل کی کدورتیں بعد میں بالکل صاف ہو گئی تھیں۔

انیسویں صدی کے اختتام کے قریب اخبار الپنچ کچھ تو مالی مشکلات کی وجہ سے اور کچھ اپنے مالک اور ایڈیٹر مولوی سید رحیم الدین کی مسلسل علالت کے باعث کچھ دنوں کے لئے بند ہو گیا۔ ۱۹۰۲ء میں "الپنچ" کا اجراء اس کے ہزاروں مشتاقوں کے اصرار پر ہوا تو اس دفعہ مولانا خیر رحمانی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہ پہلے بھی اس کے بڑے سرگرم قلمی معاونین میں سے تھے۔ اسی سال مولوی سیّد رحیم الدین کا انتقال ہوا۔ کچھ دنوں ان کے بغیر کسی طرح "الپنچ" نکلتا تو رہا، مگر مولوی سیّد رحیم الدین کے ساتھ اس کی روح بھی نکل چکی تھی۔ آخر میں اس کو ہمیشہ کے لئے بند ہی ہو جانا پڑا۔

مولانا ابوالکلام آزاؔد مرحوم اور "الپنچ"

الپنچ کی ہر دلعزیزی اور اس کے معیار کی بلندی کے ضامن بہار اور یوپی کے بڑے بڑے پختہ کار اہل قلم مضمون نگار تھے وہاں آسمانِ علم و دانش پر ابھرتے ہوئے وہ سیارے بھی تھے بعد میں جن سے نظریں خیرہ ہوتی رہیں۔ اس کا ایک ثبوت پیش کرتا ہوں جو حد درجہ دلچسپ بھی ہے اور تاریخی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ۱۹۰۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی عمر غالباً تیرہ سال کی تھی۔ مگر وہ اپنی اس کمسنی کے باوجود طلباء کی جماعت کو پیچھے چھوڑ کر تیزی کے ساتھ اہلِ علم اور اہلِ قلم کے طبقے کی طرف بڑھ رہے

تھے اور ان کی خداداد صلاحیتیں علماء و ادباء اور شعراء کی جماعتوں میں اب ان کی جگہ متعین کرنے لگی تھیں، اسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزادؔ "احسن" کے نامہ نگاروں کی حیثیت میں ملتے ہیں۔ کلکتہ میں جو ایک عظیم الشان مشاعرہ ۱۹۰۲ء میں شمس العلماء محمد یوسف رنجورؔ اور مولانا وحشتؔ کی سرکردگی میں ہوا تھا، ان کی روداد مولانا ابوالکلام آزادؔ نے "احسن" کو اپنے قلم اور اپنے نام سے بھیجی تھی جو احسن کے صفحوں میں آب و تاب کے ساتھ چھپی۔ روداد طویل ہے مگر اس سے کچھ اقتباس لے کر پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ مولانا کی کم عمری کا زمانہ تھا مگر دیکھئے کہ اس وقت بھی کس خود اعتمادی کے ساتھ وہ لکھتے ہیں۔

" دراصل اس مشاعرے کے بانی ہمارے محترم دوست جناب مولانا محمد یوسف صاحب رنجورؔ جعفری چیف مولوی بورڈ آف اکزامزس کلکتہ ہیں، جن سے ناظرین احسن کو متعارف کرانے کی ضرورت نہیں ...."

"............ اور مشاعرہ شروع ہوا۔ ابتداء میں اکثر صاحبوں نے غزلیں سنائیں اور حسب قاعدہ اپنے کلام کے مطابق داد لی۔ اتنے میں جناب شمسؔ اور جناب حمید صاحبان اور جناب شہرت عظیم آبادی تشریف لائے اور دو ایک صاحبوں کے بعد ہمارے یکرنگ دوست جناب مولوی رضا علی وحشتؔ نے غزلیں سنانی شروع کیں۔ ابتداء میں انھوں نے چند فارسی اور اردو کی رباعیاں سنائیں جن کا مزہ کوئی آزاد کے دل سے پوچھے۔ رباعیوں کے بعد انھوں نے اپنی فارسی غزل پڑھی، جس کا ہر شعر لاجواب اور لطیف زبان میں ڈوبا ہوا ہے۔

ارادتے کہ مرابا توہست می دانی محبتے کہ ترابا من است می دانم!
مرا تو دوست شماری پرچہ می گوئی کہ دوستی تو با دشمن است می دانم!
بہ بزم او تپش دل بلا سبب نہ بود نگاہِ برق سوئے خرمن است می دانم!
ادائے او پئے فہمیدن است می فہم جفائے اُو پئے دانستن است می دانم!
بہ وحشتؔ ایں ہمہ لطفش بلا سبب نہ بود ادائے تازۂ دل بردن است می دانم!

اس کے بعد انھوں نے اردو کی غزلیں جن کے چار شعر یاد رہ گئے۔

جاں اُن کی اداؤں پہ نکلتی ہی رہے گی   یہ چھیڑ جو چلتی ہے تو چلتی ہی رہے گی
گرمیٔ شوزش دل مرگ سے ناچار نہیں   نالۂ مرغِ گرفتار گرفتار نہیں
حسن یہ تیرے کرشمے ہیں کہ باایں ہمہ شوق   طاقت دید نہیں، قوت گفتار نہیں
چاہتے ہو کہ میں پھر کھاؤں فریب غمزہ   لب پہ اقرار کہاں ہے اگر انکار نہیں

پھر اسی طرح کی دو غزلیں سنائیں جو بہت خوب اور زبان و مضمون دونوں کا لطف لئے ہوئے تھیں، اہل مجلس نے خوب دل کھول کر داد دی اور اس طرح ان کی غزل خوانی ختم ہوئی۔ ان کے بعد اور بہت سے لوگ غزلیں سناتے رہے مگر چوں کہ ان میں سے اکثر حضرات سے میری شناسائی نہیں تھی اس لئے نہ تو نمونہ کلام دے سکتا ہوں اور نہ ان کا نام کہہ سکتا ہوں...... ان کے بعد ہی ہمارے مکرم منشی آبد صاحب نے نہایت عمدہ نعتیہ غزلیں پڑھیں...... ان کے بعد مجی جناب سید حسین صاحب سلیم لکھنوی نے ایک دو رباعیاں اور زبان کے رنگ کی غیر طرح مگر نہایت ہی پُر لطف ایک غزل سنائی...... ان کے بعد خاکسار (ابوالکلام آزاد) کی باری تھی، جیسا کہ مشاعرہ کا دستور ہے میں نے چند رباعیاں فارسی اور اردو کی لکھی تھیں مگر غلطی سے وہ کاغذ ضائع ہو گیا اور رُباعیاں نہ سنا سکا۔ ایک رُباعی اس وقت یاد آگئی ہے جسے ناظرین کے لئے پیش کرتا ہوں۔

دردِ ہر لطفِ اونہ شد طبعم سیر   بربالا رَوم کہ خود نہ بالاست نہ زیر!
اے عمر برد برد کہ تو زیاد   اے مرگ بیا بیا کہ یادِ توبہ خیر!

اور فارسی کے چند شعر جو مشاعرہ سے کچھ پہلے لکھے تھے، اس کے بعد سنائے جن میں پانچ یہ ہیں۔

کن زگریہ اگر منع چشم گریاں را! ردا ابود کہ نہ دیدی شبانِ ہجراں را
توانم آنکہ کنم ضبط آہ وافعاں را مگر بگو چیست چشم گریاں را
الٰہی چشم فسوں ساز را چہ ہستی ہاست کہ مست دبے خبر انداخت ہوشیار را
دریں مشاعرہ حرفم نمی تواں فہمیدہ چہ طور گویم الٰہی بیان پنہاں را
بُرو بُرو تو طبیبا چرا نہ من آئی بغیر مرگ دوا نیست درد ہجراں را

...... پھر ایک اردو غزل تازہ افکار کے چند شعروں کی پڑھی جس کے چند شعر یہ ہیں۔
ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے ایسوں کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے
یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے
ہم آپ کی محفل میں نہ آنے کو نہ آتے کچھ اور ہی سمجھے تھے ہوا اور ہی کچھ ہے
بیخود بھی ہیں ہشیار بھی ہیں دیکھنے والے ان مَست نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
آزاد ہوں اور گیسوئے پیچاں میں گرفتار کہدو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے

...... طرحی غزل پڑھنے کے قبل میں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ غزل میں نے جس بے سروسامانی میں لکھی ہے اس کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ۔ مطلع تک ابھی نہیں لکھا جو کچھ لکھا ہے سنائے دیتا ہوں کیونکہ بعض علمی تالیفات کا شغل چھوڑ کر میں اس فضول شغل کو اختیار نہیں کیا کرتا...... میرے بعد مولوی غلام یاسین صاحب آہ دہلوی نے باوجود علالت طبع کے بعضے دوستوں کے اصرار سے غزل پڑھنی شروع کی ...... ان کے بعد ہمارے محترم دوست مولوی محمد یوسف صاحب جعفری رنجور بانی مشاعرہ نے اپنی طرحی غزل سنائی جس کی تعریف نہیں ہو سکتی ...... ان کے بعد مولوی ابو محمد شمس رئیس کلکتہ کی باری تھی ...... ان کے بعد جناب شہرت عظیم آبادی نے

جندر باعیوں کے بعد دم لے لو قدم لے لو" کی استادانہ غزل سنا کر خوب ہی دادلی، اور طرحی غزل کا کیا کہنا، سبحان اللہ! ...... ان کے بعد حافظ عبدالحمید حمیدؔ نے نہایت ہی عمدہ اور دلچسپ دو تین فارسی رباعیاں سنائیں اور ایک تصوّفانہ بے مثل غزل پڑھ کر طرحی غزل پڑھنی شروع کی ...... صبح ہوگئی تھی، تقریباً پانچ بج گئے تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ واہ! کیا اچھی مجلس تھی، کیسے کیسے باکمال رونق افروز تھے، کیا کیا شعر پڑھے گئے، کس کس رنگ کے شعر سنائے گئے۔ ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است کا کتنا اچھا مصادق تھا یہ مشاعرہ! ۔ واقعی جلسہ کے ایسے ہی فوائد ہیں ورنہ ہم کہاں، اور کہاں شمسؔ اور حمیدؔ۔ ہاں۔ اے صَبا ایں ہمہ آوردۂ تست!

اے مشاعرہ! اے ہمارے دلوں کو زندہ کرنے والا! ایشائی شاعری کے جنازے کو دھوم سے نکالنے والا! خدا تجھے زندہ رکھے، باسلامت رکھے، تجھ پر اتفاق کا سایہ اور شاعروں پہ تیرا سایہ رہے۔ زمانہ ہم سے پھر جائے مگر تو ہم سے نہ پھریو! تیرا ہی ایک آسرا ہمیں ابھی ایشیائی شاعری کا نام لیوا بتا رہا ہے۔ تیرا ہم پر کرم ہے، تجھ سے ہمارا بول بالا ہے۔

راقم خادم احباب

ابوالکلام محی الدین احمد آزادؔ دہلوی مقیم کلکتہ

اخبار "مشیر بہار"

۱۹۳۱ء میں صوبہ بہار و اڑیسہ بنگال سے کٹ کر نیا صوبہ بن چکا تھا اور پٹنہ نے بھی اس نئے صوبہ کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل کرلی تھی اس لئے یہاں بھی سیاست میں گرمی آنے لگی تھی اور سیاسی مانگیں بڑھنے لگی تھیں، انگریزی میں یہاں کے لوگوں کے مطالبات کی ترجمانی ایک انگریزی اخبار "بہاری" کرتا تھا۔ اردو میں اس وقت کوئی اخبار نہ تھا۔ پٹنہ کے سربرآوردہ مسلمانوں نے ۱۹۱۳ء کے آخر میں ایک مجلس مشاورت بلائی۔ بہ اتفاق رائے یہ بات منظور ہوئی، کہ کم از کم ایک ہفتہ وار اردو اخبار

بھی پٹنہ سے نکلنا چاہیئے۔ اس کے لئے ایک بورڈ آف دائرکٹرس بناء جس کے ممبر مسٹر سیّد حسن امام مرحوم، مسٹر وصی احمد مرحوم مولوی فخرالدین وکیل مرحوم، مولوی نور الحسن مرحوم، مسٹر عبدالحکیم مرحوم، مولوی سیّد محبوب اشرف مرحوم اور میرے والد مرحوم خان بہادر سیّد ضمیر الدین احمد تھے۔ ان کے علاوہ دو چار اور بھی معزز حضرات اس بورڈ میں شامل تھے۔ ان سب حضرات نے آپس میں ہی چندہ کی رقم فراہم کی اخبار کے لئے اغراض ومقاصد بھی ترتیب دیئے اور اخبار کا منیجنگ ڈائرکٹر میرے والد مرحوم کو منتخب کیا۔ پٹنہ سیٹی سے اس اخبار کے نکلنے میں اس وقت زیادہ سہولتیں تھیں اور پھر میرے والد مرحوم چونکہ پٹنہ سیٹی ہی میں رہتے تھے اس لئے ہر وقت ان کی نگرانی بھی حاصل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ پٹنہ سٹی اخبار "مشیر بہار" کا مقام اشاعت بھی مقرر ہوا۔ ایک اچھے ایڈیٹر کی تلاش ہوئی تو مولانا ظفر الملک علوی جو لکھنؤ کے بڑے مقتدر صحافی تھے، ان پر نظر انتخاب پڑی۔ مولانا ظفر الملک علوی کا اپنا ماہنامہ رسالہ 'الناظر' اس وقت بڑی آب و تاب کے ساتھ لکھنؤ سے نکلتا تھا مگر مولانا کے سیاسی خیالات کا بوجھ یہ ادبی رسالہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مولانا ظفر الملک علوی سیاست میں اعتدال پسند نہ تھے۔ ان کے سیاسی خیالات کی شدت نے اس وقت کے سیاست دانوں میں ان کا درجہ اونچا کر رکھا تھا۔ ان سے جب اخبار "مشیر بہار" کی ادارت کی باتیں طے ہونے لگیں تو یہ بات بھی ان سے کہی گئی، کہ اخبار "مشیر بہار" کے مضامین واداریہ میں ان کو اعتدال سے کام لینا ہوگا۔ مولانا ظفر الملک پٹنہ آگئے۔ اخبار کی ادارت بھی انھوں نے سنبھال لی۔ کچھ دنوں اعتدال کی حد میں اداریے بھی لکھے جاتے رہے اور قومی مطالبوں پر بھی سنجیدہ طور پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس وقت یہاں کی سیاسی جماعتوں میں اعتدال پسند جماعتیں ہی زیادہ نمایاں تھیں۔ یکایک ۱۹۱۴ء میں کانگریس میں ہیجان اُٹھنے لگے۔ سیاست کی گرمی تیز ہوئی تو مولانا ظفر الملک علوی کب پیچھے رہنے والے تھے، ان کے دو چار اداریئے بھی بڑے تیز نکلے۔ ان سے شکایت کی گئی تو آئندہ کے لئے انھوں نے

اپنے سابق رویہ پر چلنے کا وعدہ کیا مگر انگریزی حکومت کی نظران افتتاحیوں پر پڑ چکی تھی۔ دھڑ سے حکومت نے اخبار ''مشیر بہار'' سے ضمانت کی ایک بڑی رقم طلب ہی کرلی ضمانت دے دی گئی اور اخبار ''مشیر بہار'' بھی پھر اعتدال کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا چلا اچانک مولانا ظفرالملک علوی بہکے اور ایک بڑا گرماگرم افتتاحیہ ''مشعل خانہ کے عنوان سے انھوں نے لکھ مارا۔ پھر کیا تھا۔ دوبارہ پھر اخبار سے ضمانت طلب کی گئی۔ اس دفعہ بھی ضمانت ادا کر دی گئی، مگر اس کے ساتھ ہی مولانا ظفرالملک علوی بھی لکھنؤ سدھارے۔ ان ہی دنوں میر حسیؔر رسالہ ''ادیب'' الہ آباد کی اڈیٹری سے مستعفی ہو کر مضافات پٹنہ کے گاؤں میں آگئے تھے۔ وہ اخبار ''مشیر بہار'' کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اب یہ اخبار پورے طور پر انگریزی حکومت کی نظر پر چڑھ چکا تھا۔ اس کی ذرا سی تیزی حکومت کی طبیعت پر گراں گذرنے لگی تھی۔ ایک معمولی افتتاحیہ پر پھر اخبار سے ضمانت طلب ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ مطبع پر بھی ضمانت کی ایک بھاری رقم عائد کر دی گئی۔ یہ دار سخت تھا، اخبار ابھی تک پورے طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ حکومت کے پے بہ پے دار ہونے لگے تھے۔ مالی رقم کی ادائیگی الگ، یہاں تو اس کے بورڈ میں جو اعتدال پسندوں کی اکثریت تھی وہ بھی حکومت کی کڑی نظر سے گھبرا اٹھی تھی۔ آخر ۱۹۱۵ء میں اخبار بند ہوا اور بے چارے میر حسیؔر اپنے گھر گئے جو قصبہ باڑھ کے قریب ضلع پٹنہ میں شامل تھا۔ میر حسیؔر کی صحت پہلے ہی خراب ہو چکی تھی، چند سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنے دور زندگی میں بڑا کام کیا تھا، وہ نادر اور نایاب کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع کرتے رہے۔ خود بھی بڑے قابل اور مصنف اور بھرپور ادیب تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی تصانیف بھی نہ چھپ سکیں۔ ان کی کتابوں کے ذخیرہ کے ساتھ ان کی تصنیفوں کو بھی ایک مدت تک ان کے اعزہ سینے سے لگائے محفوظ رکھے رہے، مگر ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فساد میں جب ان کی بستی لٹی تو ان کا گھر بھی لٹا اور میر حسیر مرحوم کا سارا علمی خزانہ بھی لٹ لٹا کر ختم ہو گیا۔

اخبار ''مشیر بہار'' میں دو ایک صفحہ ہمیشہ ادبی مضامین اور مشاہیر شعراء کی شاعری کے لئے بھی مخصوص رہتا تھا۔ حضرت اکبرالہ آبادی میرے والد مرحوم کے دوستوں میں تھے، ایک دفعہ میرے والد مرحوم نے اخبار ''مشیر بہار'' کے لئے حضرت اکبر الہ آبادی سے ان کے کلام کی فرمائش کی۔ ان ہی دنوں حضرت اکبر الہ آبادی کے ایک عزیز فرزند کا انتقال ہو گیا تھا۔ جواب میں انھوں نے والد مرحوم کو اپنے درد و غم کی داستان لکھ بھیجی اور فرمائش پوری کرتے ہوئے اپنے دو نئے شعر بھی لکھ بھیجے۔ دیکھئے رنج و غم کا انھوں نے نفسیاتی پہلو سے ان دو شعروں میں کیسا لطیف تجزیہ کیا ہے۔

جو رنج و غم کا موقع ہو تو غمگیں ہو ہی لیتے ہیں صفائی کے لئے اشکوں سے منہ کو دھو ہی لیتے ہیں
مصیبت میں تو ہم کو عقل خاموشی سکھاتی ہے مگر فطرت کا کرتے ہیں ادب اور رو ہی لیتے ہیں

حضرت اکبر الہ آبادی کے یہ دو شعر آپ اُن کی کلیات میں نہیں پائیں گے۔
میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ میں نے یہ دو شعر ''مشیر بہار'' کے پرچے میں اس وقت پڑھے تھے، خدا کا شکر ہے کہ حافظہ میں محفوظ رہ گئے! •

اردو کے ماہنامے

انیسویں صدی کا آخری دور اخبارات سے زیادہ ماہنامہ رسالوں اور ادبی گلدستوں کی پیداوار کا زمانہ تھا۔ ادارۂ تحقیاتِ اردو نے اس کی فہرست جو مکمل کی ہے اس کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایسے کتنے پرچے کس تیزی کے ساتھ اُبھرے اور پھر تھوڑی ہی مدت میں ختم ہوئے اور دوسرے پرچوں نے اس طرح ان کی جگہ لی۔ سب کا ذکر تو یہاں ناممکن ہے، چند برچوں کا ذکر سن لیجئے۔
ان ہی دنوں مولوی حسن علی نے ایک پرچہ ''نورالاسلام'' نکالا۔ کنور سنگھ راج بہادر رحمتی کوئی ماہانہ پرچہ تو نہیں نکالتے تھے، مگر اپنے یہاں کے بڑے مشاعروں

کی روداد ایک گلدستہ کی شکل میں چھپوا کر تقسیم کراتے جس کا نام انھوں نے تحفۂ رحمتی رکھا تھا منشی عابد حسین عابد بھی کوئی ماہانہ پرچہ شائع کرتے تھے جس میں مشاعروں کی غزلیں اور کچھ ادبی مضامین بھی ہوتے تھے۔ یہ ختم ہوا تو انھوں نے "نالۂ عشاق" کے نام سے دوسرا پرچہ نکالا۔ یہ زیادہ مقبول ہوا۔ حافظ فضلِ حق آزاد مرحوم نے بھی ایک ماہانہ پرچہ نکالا جس کا نام "تاج" رکھا تھا اس میں تنقید کچھ تنقیص، کچھ غزلیں، کچھ نظمیں اور ادبی مضامین بھی ہوتے تھے۔ ان دنوں جو ماہانہ پرچے نکلے، ان میں دوسرے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ایک تو ماہانہ "ادیب" اور دوسرا پرچہ ماہانہ "بہار"۔

ماہانہ ادیب

۱۸۹۹ء میں سید علی سجاد نے نواب نصیر حسین خاں خیاؔل کے تعاون سے ایک ماہانہ "ادیب" کے نام سے شائع کیا۔ علی سجاد حسین اچھے نثر نگار تھے۔ اس پرچے میں خود بھی مضمون لکھتے تھے۔ دوسروں سے بھی اور خاص کر کے نواب نصیر حسین خیاؔل سے بھی مضامین لکھواتے تھے۔ اردو کے ادیبوں کو نئے خیالات اور نیاز ادیۂ فکر دینے والوں میں نواب نصیر حسین خیاؔل مرحوم کی ہستی ناقابل فراموش ہے اور یہ سچ ہے کہ ان کے انداز تحریر نے جو اردو ادب پر نقوش چھوڑے ان کی نقل ان کے بعد دوسروں سے ممکن نہ ہو سکی۔ ماہانہ 'ادیب' کے مضامین میں ان کی مغربی طرز تحریر اور مغربی طرز افکار کو اردو ادب میں سمونے کی سعی۔ بلیغ کے نمونے ملتے ہیں۔ چنانچہ اسی ماہانہ "ادیب" میں شیکپیئر کے ایک مشہور ڈرامہ "مڈسمر نائٹس ڈریم" (Mid summer nights dream) کے کچھ حصہ کا انھوں نے ایسے شگفتہ انداز میں ترجمہ کر کے شائع کیا کہ شیکپیئر کے ڈرامے کی لطافت اس کے ترجمے میں بھی سولہ آنے قائم رہی۔ اس ڈرامہ کے ترجمہ میں حضرت خیاؔل کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ جس مقام پر شیکپیئر کی شاعری آفاقیت کی حدوں تک پہنچی ہے اسی مقام پر ان کا ترجمہ بھی پڑھنے والوں کو لے جاتا ہے۔ پریوں کی ملکہ کو جب پریاں لوری دے کر سلاتی ہیں وہ منظر تو بہر حال ڈرامہ

کی جان ہے۔ مگر پریوں کی وہ لوری بھی شیکسپیئر کی شاعری کا ایک اچھوتا شاہکار ہے۔ ڈرامہ کا ماحول، اسُ کی نفاست اور نرم وُسبک اور خواب آور انداز میں لوری کے بول ان کو بجنسہٖ قائم رکھتے ہوئے حضرت خیالؔ کا اردو زبان میں اس کا بامحاورہ ترجمہ کرنا درحقیقت ان کی فنی انفرادیت پر دال ہے۔ افسوس ہے کہ یہ پرچہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔

ماہنامہ "بہار"

۱۹۰۳ء میں حافظ نذر الرحمٰن مرحوم نے اپنے دوستوں کے اصرار اور ان کے اشتراک سے ایک ماہنامہ "بہار" کے نام سے نکالا۔ اس میں پٹنہ کے شعراء کی غزلیں چھپتی تھیں اور اس کے آخر کے کالموں میں ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ ماہنامہ "بہار" ہر آئندہ مہینہ کے لئے ایک مصرعہ طرح شائع کر کے شعراء سے اس پر غزلیں کہنے کی فرمائش کرتا اور وقت پر جب یہ پرچہ نکلتا تو شعراء کی طرحی غزلیں اس میں شائع ہوتیں۔ مولوی ابوالخیر رحمانی دربھنگوی جو مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم کے آخری زمانے میں "الپنچ" کی ایڈیٹری کا کام سنبھالے ہوئے تھے۔ ان ہی کی نگرانی اور نگہداشت میں ماہنامہ "بہار" بھی نکلتا تھا۔ منشی عابد حسین عابدؔ جو شروع سے لے کر اپنے آخری دنوں تک اخبار "الپنچ" کے کاتب اور خصوصی مضمون نگار بھی تھے اور صحیح ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وہ مولوی سیّد رحیم الدین کے نفس ناطقہ بھی تھے وہ بھی مولوی خیؔر رحمانی کے ساتھ اس پرچے کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ماہنامہ "بہار" صوبہ بہار ہی میں نہیں بلکہ بنگال اور یوپی میں بھی بڑی مقبولیت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس لحاظ سے دیکھیں تو اس زمانے میں جتنے اردو کے ماہنامے شائع ہوئے، ان میں ماہنامہ "بہار" ہی سب سے زیادہ ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ماہنامہ "بہار" کے شروع پرچوں میں سے ایک میں مولوی سیّد رضا علی وحشتؔ مرحوم کی ایک طرحی غزل بھی شائع ہوئی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

خوشی کی تجھے زندگانی مبارک مجھے زندگی سے خفا کرنے والے

اس پرچے میں اور بھی دوسرے شہروں کے ممتاز شعراء کی طرحی غزلیں کبھی کبھی چھپتی تھیں، جس سے یہ صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ماہنامہ ہر جگہ مقبول بھی تھا اور کثیر الاشاعت بھی تھا، یہ ماہنامہ کئی برسوں تک چلتا رہا۔ یہ بھی "الپنچ" ہی کے دفتر سے شائع ہوا تھا۔ اس پرچے کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ شاعروں کی گروہ بندی سے ہمیشہ الگ رہا بلکہ ہر گروہ کے شاعروں کو ان کا صحیح مقام بھی دیتا رہا۔ اس وقت کچھ لوگ اس بات کو بڑے تعجب سے دیکھتے تھے، کیونکہ جہاں اخبار "الپنچ" پر حضرت شاؔد کے خلاف گروہ بندی کا وہ الزام لگاتے تھے وہاں یہ دیکھ کر خاموش بھی ہو جاتے تھے کہ ماہنامہ "بہار" جو "الپنچ" کی در حقیقت ایک شاخ کہا جا سکتا تھا اس میں گروہ بندی کا کہیں شائبہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

پٹنہ میں ندوۃ العلماء کا اجلاس

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان مغربی تعلیم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو چکا تھا وہ علمائے دین جنھوں نے کچھ دنوں پہلے مغربی تعلیم پر کفر کے فتوے دیئے تھے اب وہ بھی مغربی تعلیم کے متعلق اپنے فتوے کے جواز کی غلطی محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ مسلمانوں کی مغربی تعلیم کی طرف سے بے توجہی نے ان کو برادرانِ وطن کے مقابلہ میں بہت پیچھے کر رکھا ہے، اپنی اجتہادی غلطی کا اعتراف اس وقت کے سنجیدہ علماء نے بالاعلان کیا۔ ندوۃ العلماء تو علماء کی خاص جماعت تھی۔ اس کا سالانہ اجلاس بڑے اہتمام سے ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے لئے مغربی تعلیم کا مسئلہ بھی علماء کے سامنے تھا۔ وقت کی ضرورت پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اگر اب بھی مسلمانوں نے مغربی تعلیم کی طرف پوری توجہ نہ دی تو اپنے قومی وقار کے ساتھ ملک میں اپنی سماجی حیثیت بھی کھو بیٹھیں گے۔ چنانچہ اس مسئلے کی امتیازی خصوصیت کو دیکھتے ہوئے ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں منعقد ہونا منظور ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں جو عظیم الشان اجلاس ندوۃ العلماء کا پٹنہ میں ہوا، وہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی میرے

والد مرحوم خاں بہاد سید ضمیر الدین احمد مرحوم کے دوست تھے، مولانا کی تحریک ہی پر میرے والد مرحوم نے پٹنہ کے اکثر ممتاز حضرات سے مشورہ کرکے اس سال ندوۃ العلماء کے اجلاس کو پٹنہ میں مدعو کرنے کی تجویز منظور کرائی۔ اس وقت پٹنہ بھی علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ علامہ حکیم عبدالحمید مرحوم بھی زندہ تھے، جن کی تبحر علمی اور فن طبابت کا شہرہ ہندوستان میں ہر جگہ پھیلا ہوا تھا اور جن کی شخصیت ہر علمی کانفرنس کی کامیابی کی ضمانت دار سمجھی جاتی تھی۔ پٹنہ میں عمائدین شہر کی ایک استقبالیہ کمیٹی بنی۔ ندوۃ العلماء کے اجلاس کے منعقد ہونے کی خبر جب مشتہر ہوئی تو یہاں کے لوگوں نے اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے دل کھول کر چندے دیئے۔ یہی نہیں بلکہ صوبہ بہار کی دوسری جگہوں میں بھی جوش و خروش کی لہر اٹھی۔ اس اجلاس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پٹنہ کے انگریزی داں حضرات بھی، وکلاء بھی، بیرسٹر بھی، تجار ورئیسان شہر بھی، سب مل کر اس اجلاس کو تاریخی طور پر کامیاب بنانے میں تعاون کر رہے تھے۔ پٹنہ کے رئیسوں کے بڑے بڑے عالی شان مکانات باہر سے آنے والے مندوبین کے لئے مخصوص کر دئے گئے تھے۔ جہاں مہمانوں کے لئے ہر طرح کا سامان مہیا تھا۔ ہر مکان میں الگ باورچی خانہ اور الگ الگ رضاکاروں کے دستے متعین تھے تاکہ مہمانوں کو بروقت ہر طرح کی سہولتیں آسانی سے ملتی رہیں۔ محلہ کنگھیاٹولہ میں مولوی سیّد محبوب اشرف مرحوم کا عالی شان مکان اجلاس کے لئے چنا گیا تھا۔ پٹنہ کے لوگوں کے بڑھے ہوئے حوصلے کی خبر ندوۃ العلماء کے اراکین کو بھی پہنچ چکی تھی۔ تمام ہندوستان میں اس اجلاس کی اہمیت کی اشاعت بھی ہو چکی تھی اس لئے تمام ہندوستان کے علمی اداروں کے نمائندے مشاہیر علماء اور مذہبی رہنما بھی بڑی تعداد میں آئے اور یہاں آکر جب پٹنہ اور بانکی پور کے نوجوانوں کا جوش اور ان کی رضاکارانہ خدمتیں دیکھیں، تو بے حد متاثر ہوئے۔ مولانا شبلی نعمانی تو یہ جوش دیکھ کر ایسے متاثر ہوئے تھے، کہ جب پٹنہ والوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے برسر اجلاس کھڑے ہوئے تو آبدیدہ ہو

گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی گفتگو میں بار بار اس نیک ساعت کا تذکرہ فرماتے تھے جب کہ انھوں نے میرے والد مرحوم کو پٹنہ میں ندوۃ العلماء کے اجلاس کو مدعو کرنے کی ترغیب دی تھی، یہی نہیں، بلکہ جب اجلاس کے اختتام پر وہ پٹنہ والوں کو شکریہ ادا کرنے لگے تو ان کی تقریر پٹنہ والوں کے لئے ایک طویل قصیدہ خوانی بن گئی۔ میں نے ان لوگوں سے جو اجلاس میں شریک تھے اور جنھوں نے اس کی کامیابی میں حصہ لیا تھا۔ سنا ہے کہ ایسا پرجوش اجلاس اور اس کے جو اہتمام اور سامان کئے گئے تھے وہ سوائے دو چار سیاسی اجتماعات اور کانفرنسوں کے کسی اور دوسری کانفرنس میں نظر نہ آئے۔

ندوۃ العلماء کے اس اجلاس کو باہر سے آنے والے اکثر حضرات نے تاریخی اجلاس کا لقب دیا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ شاید ہی کوئی شخص ہو جو مدعو ہونے پر اس اجلاس میں شریک نہ ہوا، اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ یہ اجلاس مغربی تعلیم یافتہ حضرات اور مشرقی تعلیمات کے ماہر حضرات کا قابل دید سنگم تھا۔ دونوں کی فاضلانہ اور بصیرت افروز تقریریں سننے کے قابل تھیں۔ ہر تقریر میں مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلے پر تعمیری پہلو کا ذکر تھا اور ہر لفظ میں اتفاق کا آہنگ تھا جس میں لفظ اختلافات ہی ساقط ہو چکا تھا۔ اس وقت علی امام سر "تو نہ تھے مگر بیرسٹروں کی جماعت کے تمام صوبہ میں وہی سب سے بڑے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی تقریر علماء کرام کو اتنی پسند آئی کہ جب وہ تقریر ختم کر کے بیٹھے، تو خاموشی پسند علماء کی جماعت سے تعریف اور پسندیدگی کا سیلاب امنڈ پڑا تھا۔

اجلاس کی نشست تین دن رہی۔ ہر نشست میں ہزاروں کا مجمع بڑے ذوق و شوق سے موجود رہتا اور تمام کارروائیوں میں بڑی دل چسپی کے ساتھ حصہ لیتا۔ علماء کے علاوہ اجلاس میں انگریزی داں وکیلوں کی بھی تقریریں ہوئیں۔ مغرب کے تعلیم یافتہ بیرسٹروں نے بھی تقریریں کیں اور شعراء نے بھی ندوۃ العلماء کے استقبال اور علماء کی شان میں اردو فارسی اور عربی میں قصیدے کہے۔ علامہ حکیم عبد الحمید کا عربی

میں کہا ہوا قصیدہ آج تک زبان اور کلام کے لحاظ سے معرکتہ الآراء کہا جاتا ہے۔ مسٹر نصیرالدین حسین بیرسٹر جو چند دنوں قبل بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے انگلستان سے واپس آئے تھے۔ انھوں نے فارسی میں ایک بہت ہی اچھی اور قابلانہ نظم ندوۃ العلماء کے متعلق پڑھی۔ کوٹ پتلون میں صاحب بنے ہوئے جب یہ اپنی فارسی کی نظم پڑھنے کے لئے ڈائس پر آئے تو بڑے جوش اور خاص ایرانی لہجے میں انھوں نے نظم پڑھنی شروع کی۔ ایک صاحب بہادر کا بڑی اچھی فارسی میں ایک مرصع نظم پڑھنا بڑا مسحور کن تھا۔ وہ پورے مجمع پر چھاگئے۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ سنجر طہرانی ایران کے مشہور شاعر بھی اجلاس میں موجود تھے۔ انھوں نے برسر اجلاس بڑھ کر ان کا منہہ چوم لیا تو بڑا قہقہہ پڑا۔ یہ اجلاس بہت سی تعمیری تجویزوں کے ساتھ ختم ہوا مغربی تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور مسلمانوں کو اس تعلیم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے مشرقی تعلیم کے حاصل کرنے پر بھی اور دینی تعلیمات سے بھی گہرا تعلق رکھنے کے لئے زور دیا گیا۔ مسلمانوں کے ہر فرقہ اور جماعت کو آپس میں اتحاد رکھنے کی بھی تلقین کی گئی۔ مدرسوں اسکولوں اور کالجوں کے قیام کے لئے بھی تجویزیں پاس ہوئیں اور پرانے نصاب تعلیم میں حسب ضرورت وقت کے مطابق ترمیم و توسیع کے بھی قدامات بتائے گئے۔

اس اجلاس کی یادگار میں سینکڑوں قندیلیں، فانوس، لمپ کے غبارے اور شیشے کی بیٹھکیاں بنائی گئی تھیں، جن پر بڑے خوبصورت اور اُبھرے ہوئے حرفوں میں "اجلاس ندوۃ العلماء پٹنہ ۱۹۰۱ء" کندہ تھا۔ اجلاس کے موقع پر قندیلیں، فانوس، لمپ اور بیٹھکیاں اجلاس کے پنڈال میں اور مندوبین کی رہائش گاہ میں بھی برابر جلتی رہیں۔ جب اجلاس ختم ہوا تو لوگوں نے مجلس استقبالیہ سے ان کی اچھی قیمتیں دے کر یادگار کے لئے ان کو خرید لیا۔ اب بھی دو ایک قندیلیں اور بیٹھکیاں پٹنہ میں کہیں نہ کہیں یادگار کے طور پر محفوظ مل جاتی ہیں۔

پٹنہ میں انجمن ترقی اُردُو کا قیام

دنیائے ادب کا یہ ایک حادثہ ہی تھا کہ اردو زبان جو ہندوستان میں ہندؤوں اور مسلمانوں کے اتحاد اور میل جول کی پیدوار تھی اور جس کو پروان چڑھانے میں دونوں فرقوں کا برابر کا حصہ تھا۔ عین اس وقت جبکہ یہاں آزادی کی تحریک جڑ پکڑنے لگی تھی اردو کے ساتھ ہندی کا جھگڑا بھی کچھ نمایاں طور پر دکھائی دینے لگا۔ یہ بیسویں صدی کے شروع دور کا زمانہ تھا۔ اگرچہ اس وقت ہندی کے پرچار میں اردو کی مخالفت صاف صاف سامنے نہیں آئی تھی مگر ہندو اور مسلمان جو اس مشترکہ قومی سرمایہ وارثت کو سینے سے لگائے ہوئے تھے ان کو صاف نظر آنے لگا کہ ہندی کی یہ بڑھتی ہوئی تحریک کچھ دنوں بعد اردو کو پیچھے دھکیل دے گی اور مشترکہ سماج کی بنیادوں کو بھی ہلا دے گی، اسی لئے اس وقت اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لئے کچھ سنجیدہ ہندوٗں اور مسلمانوں نے الگ سے ایک مہم چلانی شروع کی۔ ہندوٗں میں سب سے آگے علامہ کیفی چڑیا کوٹی تھے اور ان ہی کے دوش بدوش مسلمانوں میں سے سب سے زیادہ نمایاں ڈاکٹر عبدالحق کی ذات تھی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لئے جو کچھ کیا، وہ سبھوں پر ظاہر ہے۔ اس وقت وہ حیدر آباد سے انجمن ترقی اردو کی تحریک چلا رہے تھے اور ہر جگہ اس کی شاخوں کو پھیلانے کے لئے مرکزی جگہوں میں وہاں کے سربرآوردہ حضرات کی توجہ منعطف کرا رہے تھے چنانچہ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے پٹنہ میں میرے والد مرحوم خاں بہادر سید ضمیرالدین احمد کو بھی لکھا کہ یہاں بھی وہ انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ قائم کر لیں۔ اسی تحریک پر میرے والد مرحوم نے پٹنہ میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی۔ انجمن کے بانی اور پہلے صدر کی حیثیت میں انھوں نے انجمن ترقیٔ اردو کی تنظیم و اشاعت کے لئے پٹنہ کے تین ابھرتے ہوئے باصلاحیت نوجوانوں کو ممدّ و معاون بنایا۔ یہ قاضی عبدالودود، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور سیّد محمود شیر تھے۔ اگرچہ یہ تینوں اپنی تعلیم کی آخری منازل میں تھے مگر پٹنہ میں ان سے زیادہ موزوں کار آمد اور

انجمن نے دلچسپی رکھنے والا نوجوانوں میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا تھا۔ انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو پھر سرپرستوں کی کمی بھی نہیں رہی۔ یہاں کے تعلیم یافتہ حضرات اور معزز رئیساں شہر مل کر سب اس تحریک کو چلانے لگے جن میں ہندو حضرات بھی تھے۔ ۱۹۲۲ء کے شروع میں سیّد ضمیر الدین احمد کا انتقال ہو گیا۔ اس سے کچھ دنوں پہلے قاضی عبدالودو صاحب بیرسٹری کے لئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان جا چکے تھے۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب بھی پی، ایچ، ڈی کی تیاری کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے چکے تھے۔ ان تینوں میں صرف سیّد محمود شیر صاحب رہ گئے تھے جو ابھی ابھی وکالت کی تعلیم یہاں حاصل کر چکے تھے۔ سیّد ضمیر الدین احمد کے انتقال کے بعد انجمن ترقیٔ اردو کی خدمت خان بہادر سیّد ابراہیم حسین مرحوم نے اپنے ذمہ لی اور جب تک وہ زندہ رہے انجمن ترقی اردو کے فروغ کے لئے کوشاں رہے۔ کئی سال کے بعد جب قاضی عبدالودود صاحب کیمبرج یونیورسیٹی سے اقتصادیات میں ٹرائی پوس اور لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے تو اردو کی ترقی اس کے فروغ کی لگن اس وقت بھی ان کے دل میں باقی تھی چنانچہ انجمن ترقیٔ اردو کو چلانے میں وہ پھر آکر شریک ہوگئے۔ پٹنہ سٹی میں منگل تالاب جو ایک سیر گاہ ہے وہیں بہت دنوں پہلے یہاں کے چند حوصلہ مند رئیسوں نے ایک کلب کی بنیاد رکھی تھی اور اس کی ایک بڑی عمارت کھڑی کر دی تھی۔ اس کلب کے ممبر ہندو اور مسلمان دونوں تھے، جہاں شام کے وقت سب مل جل کر بیٹھتے اور "کلب لائف" کا مزہ اٹھاتے۔ اس کلب کے آگے کھلے ہوئے میدان میں کبھی کبھی بڑے بڑے جلسے بھی ہوتے جن میں باہر سے آئے ہوئے معزز حضرات کی تقریریں بھی ہوتیں، اس کلب کا نام پٹنہ کے انگریز مجسٹریٹ کے نام پر ہیوز (Hugh's) کلب رکھا گیا تھا اور یہ ہیوز کلب کہلاتا تھا۔ پہلے تو بہت دنوں تک اس کلب کی چہل پہل خوب رہی مگر جب بانیانِ کلب کا شوق پورا ہو چکا تو کلب کی رونق بھی گئی۔ اب یہاں کلب کا وہ حصہ جاذبِ توجہ رکھا گیا تھا جو لائبریری کہلاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس لائبریری کا نام بھی الگ سے رکھ

دیا گیا اور ہیوز کلب لائبریری سے یہ لائبریری اب ہتیشی لائبریری ہو گئی۔ انجمن ترقیٔ اردو پٹنہ میں جب قائم ہوئی اس کا دفتر بھی ہیوز کلب کی عمارت کے ایک حلقہ میں بنایا گیا۔ اس وقت ایک طرف عمارت میں ہتیشی لائبریری تھی اور عمارت کے دوسرے حصے میں انجمن ترقیٔ اردو کا دفتر اور اس کا اپنا کتب خانہ تھا۔ ہتیشی لائبریری چوں کہ انجمن ترقیٔ اردو سے بہت پہلے کلب کی عمارت میں قائم تھی اس لئے عمارت کی دیکھ بھال بھی اسی سے متعلق چلی آتی تھی۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ عمارت ہیوز کلب کی ہے اور اس کی حقیقت اور ملکیت پر ہر شخص کا مساویانہ حصہ ہے۔ مگر ۱۹۳۰-۳۲ء کا واقعہ ہے کہ یکایک انجمن ترقیٔ اردو کے ارکان کو پتہ چلا کہ ہتیشی لائبریری کے چلانے والوں نے اندر ہی اندر پوری عمارت کی حقیقت اور ملکیت کو ہتیشی لائبریری کے نام سرکاری اور میونسپلٹی کے دفتروں میں درج کرا لیا ہے اور اب انجمن ترقی اردو کا دفتر اور اس کی ملحقہ لائبریری ہتیشی لائبریری کے کارکنوں کے رحم وکرم پر ہے۔ ادہر انجمن کی طرف سے احتجاج ہوا تو ہتیشی لائبریری والوں نے انجمن کو ہٹانے کے لئے مقدمہ بھی دائر کر دیا، اب انجمن ترقی، اردو کے دفتر اور لائبریری کو ہیوز کلب کی عمارت میں مستقل طور پر قائم رکھنے کے لئے ہتیشی لائبریری کے کارکنوں کے خلاف مقدمہ لڑنے کی تجویز سامنے آئی۔ پرانے ثبوت پورے طور پر موجود تھے کہ عمارت ہتیشی لائبریری کی نہ تھی بلکہ یہ عمارت ہیوز کلب کی ملکیت تھی جس کو مل جل کر ہندوؤں اور مسلمانوں نے قائم کیا تھا اور مشترکہ طور پر یہی دونوں اس کی حقیقت کے مالک تھے اور انجمن کو بھی اس عمارت میں رہنے کا وہی حق تھا جو ہتیشی لائبریری کو تھا۔ انجمن ترقی اردو کے ممبروں کا ایک طبقہ مقدمہ لڑنے کا حامی تھا مگر دوسرا طبقہ اس لانبے سلسلہ مقدمہ بازی کو پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اس جھگڑے سے الگ ہو کر انجمن ترقی اردو کی اپنی نئی عمارت بنانے پر مصر تھا۔ انجمن ترقی اردو کے سب ممبر بالآخر ہم خیال نہ ہو سکے اور ان دو متضاد خیالوں کے حامیوں میں اسی لئے مصالحت نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی عبدالودود صاحب کا گروپ انجمن کی لائبریری کو اٹھا کر بانکی

پور لے گیا اور وہیں انجمن کا ایک دفتر بھی قائم کر دیا اور دوسرا گروپ جس کے سربراہ خان بہادر سید ابراہیم حسین تھے، اس نے وہیں منگل تالاب کے ایک حصہ میں حکومت سے زمین حاصل کر کے انجمن ترقی اردو کی عمارت کی بنیاد رکھی اور جب یہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو خان بہادر سید ابراہیم حسین صاحب نے شریمتی سروجنی نائیڈو کو جو اس وقت حکومت اتر پردیش کی گورنر تھیں ان سے اس نئی عمارت کی افتتاح کرایا، سچ پوچھئے تو یہ دو گروپ برائے نام تھے۔ اصل میں ایک طرف قاضی عبدالودود صاحب تھے اور دوسری طرف خان بہادر سید ابراہیم حسین صاحب تھے۔ دونوں انجمن ترقی اردو کے بہی خواہ تھے، مگر دونوں کا نظریۂ عمل جدا جدا تھا۔ اس تصادم کا نتیجہ یہ ہوا کہ پٹنہ میں ترقی اردو کی دو انجمنیں قائم ہو گئیں۔ پٹنہ سیٹی کی انجمن ترقی اردو اپنی نئی عمارت میں پٹنہ سیٹی کی نمائندگی کرتی رہی اور دوسری انجمن جس کا دفتر بانکی پور پہنچ گیا تھا اس کا دعوی رہا کہ صوبہ بہار کی وہی نمائندہ انجمن ہے، کچھ دنوں کے بعد بانکی پور کی انجمن ترقی اردو میں بھی بجوگ پڑا۔ ایک نئی انجمن ریاستی انجمن ترقی اردو کے نام سے پرانی انجمن کے مقابلے میں آگئی۔ کچھ دنوں تو یہ کشمکش رہی مگر اب ۱۹۵۵ء کے بعد ریاستی انجمن ترقی اردو ہی صوبہ کی نمائندہ انجمن ہے اور اسی نے صوبہ بہار میں محمد ایوب مرحوم ایڈوکیٹ کے دور صدارت میں بہت سے مفید کارنامے انجام دیئے ہیں اور یہی اردو کی بقا کے لئے یونیورسٹیوں اور حکومت کے آگے بڑے اہم مطالبات پیش کرتی رہی ہے۔ افسوس ہے کہ محمد ایوب ایڈوکیٹ کا انتقال ایسے وقت میں ہو گیا، جبکہ ان کی ضرورت زیادہ تھی نہیں تو بہت سی کارآمد اسکیمیں جو اردو کے فروغ اور بقا کے متعلق انہوں نے تیار کی تھیں اب تک ان پر عمل بھی شروع ہو جاتا اب یہ دونوں انجمنیں پٹنہ میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ دونوں الگ رہتے ہوئے بھی اگر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تو بہت سے مسائل جن سے آج زبان اردو دوچار ہے وہ حل بھی ہو سکتے ہیں اور کوئی بین کارنامہ جو پٹنہ کی ترقی اردو کی انجمنیں ابھی تک پیش نہیں کر سکی ہیں وہ معرضِ وجود میں آجائے۔

پٹنہ کے بھولے ہوئے ادبی دور کو زندہ کرنے کی کوشش

اردو نمائش اور ادارہ تحقیقات اردو کے کتب خانہ کا قیام

اس کو بھی زمانہ کا انقلاب سمجھئے ، کہ گزرے ہوئے دور کی محفل ادب کے سجانے والوں کو ہم رفتہ رفتہ بھولتے گئے اور بھولتے جاتے ہیں ۔ یہی وہ معماران ادب اور صاحبان فکر و نظر تھے ، جنہوں نے گری ہوئی طبیعتوں کو سنبھالا ، خیالات میں بلندی اور وسعت پیدا کی اور آنے والے دور کی مطابقت کے لئے قومی شعور کو تربیت دے کر بلند ، باصلاحیت اور اثر انداز بنایا۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ بدلتے ہوئے ماحول میں بھی انہوں نے وہ مستقل رنگا رنگ محلات تعمیر کئے جن کے پھیلاؤ میں حال اور مستقبل کی سیاسی ، سماجی ، اخلاقی ، علمی اور ادبی انجمنوں کے لئے پوری پوری گنجائش نکلی ۔ غالبؔ مرحوم نے سچ کہا ہے

"سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں"

یہاں بھی یہی حال ہے ۔ ہم اپنے دماغوں پر زور بھی دیں تو ان گزرے ہوئے بزرگوں میں صرف دو چار کے ہی نام زبان پر آئیں گے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کتنے اور بھی پیمبران فکر و سخن اور امامان علم و ادب عظیم آباد اور صوبہ بہار میں تھے جن کے کارناموں اور ناموں پر گمنامی کے پردے پڑے رہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کو منظر عام پر لانے کا احساس چند دن ہوئے کچھ باہمت علم دوست حضرات کو ہوا جن میں سرفہرست قاضی عبد الودود ہیں ۔ پھر سابق جج خلیل احمد ، پروفیسر کلیم الدین احمد ، پروفیسر حسن عسکری ، ڈاکٹر اختر اورینوی ، پروفیسر سید حسن ، قاضی محمد سعید اور شاہ جعفر حسین ایڈوکیٹ ہیں ۔ ان کے علاوہ اور بھی چند باہمت حضرات ہیں انہیں حضرات کی جدوجہد سے نومبر ۱۹۵۹ء میں ادارہ تحقیقات اردو کے ماتحت ، جس کا وجود بھی قاضی عبد الودود صاحب کی ہمت اور کوشش کا رہون منت ہے ، اپنی نوعیت کی پہلی اردو

نمائش بڑی کامیابی کے ساتھ پٹنہ میں منعقد ہوئی۔ اس نمائش کی غرض و غایت یہ تھی کہ جب سے اردو زبان کی داغ بیل پڑی اس وقت سے لے کر بعد کے زمانے تک کے مصنفین، مورخین، صحافی، ادباء شعراء اور دوسرے اہل قلم حضرات کی تصنیفوں اور ان کی تخلیقی کارناموں کو یکجا جمع کر کے ان کا جائزہ لیا جائے اور عوام کے سامنے ان کی نمائش بڑے پیانے پر کی جائے اسی اردو نمائش کے ساتھ ادارہ تحقیقات اردو کے کتب خانے کا افتتاح کی رسم بھی رکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا ایک ایسا کتب خانہ بھی مستقل طور پر قائم ہو جائے جہاں اردو کے نوادر اور اہم پرانی تصنیفات ایک تحفہ کے طور پر جمع کر کے محفوظ رکھی جاسکیں تاکہ تحقیق و تفتیش کرنے والوں کو ان سے استفادہ کرنے میں اور حوالہ ڈھونڈنے میں سہولت پہنچتی رہے۔ یہ معمولی کام نہ تھا کہ چاہا اور ہو گیا۔ اس کے لئے نمائش کے منتظمین اور ان کے معاونین کو سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ صوبہ کے تمام کتب خانوں اور متعدد علمی اداروں سے نمائش کے لئے عملی تعاون اور کارآمد علمی نوادر حاصل کرنا اور صاحبان علم سے اپیل کر کے اور مختلف جگہوں میں ان کے یہاں جاکر علمی نوادر اور پرانی کتابوں، دستاویزوں اور پرچوں کو لانا، یہ ایسے کام تھے کہ ان میں مہینوں لگ گئے۔ اخراجات کا بار چند صاحب ذوق حضرات نے خوشی سے برداشت کیا، جس کے لئے چندے کی ضرورت نہ پڑی، مگر ان سب سے بڑھ کر سچ پوچھئے تو اس وقت کے صوبہ بہار کے گورنر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہمت افزائی تھی۔ ان کی سرپرستی اور مفید مشوروں اور ان کی ذاتی دلچسپی نے اس مشکل کام کو بہت کچھ آسان بنادیا۔ ڈاکٹر سری کرشن سنگھ آنجہانی وزیر اعلی بہار نے اردو نمائش کی صدارت کی اور ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار نے اس کے افتتاح کی مبارک رسم ادا فرمائی۔ انجمن اسلامیہ کے وسیع احاطہ میں نمائش کا خوبصورت اور کشادہ پنڈال صوبہ اور بیرون صوبہ سے آئے ہوئے معزز مہمانوں اور ہندو اور مسلمان علم دوست حضرات سے بھرا ہوا تھا۔ انجمن اسلامیہ کی وسیع عمارت کے اندر نمائش کے لئے پرانی قلمی اور چھپی ہوئی

کتابیں، پرانے رسائل اور پرچے، دستاویزیں، وصلیاں، مخطوطے، جنتریاں، سرکاری محکموں کے کاغذات مشاہیر کے خطوط وغیرہ بڑے سلیقے سے مختلف میزوں میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ اردو نمائش جو ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کی پہلی نمائش تھی، ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ادارہ تحقیقات اردو کے کتب خانہ کا قیام بھی تحقیق و تفتیش کے کاموں کے لئے کچھ کم اہم اور ضروری نہ تھا۔ ان کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے دو چار ٹکڑے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے خطبہ افتتاحیہ سے یہاں پر نقل کر رہا ہوں جن سے اردو نمائش اور ادارہ تحقیقات اردو کی اہمیت اور ان کی کاروائیوں کی ایک جھلک آپ کے سامنے آجائے گی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے منتظمین اردو نمائش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا .... آج جن کاموں کے افتتاح کے سلسلے میں آپ نے مجھے یاد فرمایا یعنی اردو نمائش اور ادارہ تحقیقات اردو کا افتتاح، یہ دونوں ایسے کام ہیں کہ اگر آپ افتتاح کی دعوت نہ بھی دیتے تو بھی ان کو دیکھنے اور جاننے کو جی ضرور چاہتا۔ نمائش کے متعلق یہ دعوی ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ اپنی نوعیت کی پہلی نمائش ہے۔ اس کو دیکھنے والوں کے سامنے اردو زبان کی تاریخ کا نقشہ آجائے گا۔ اس کے ماضی کے تحصیلات سے اس کے امکانات واضح ہوں گے اور اردو ادب کا وطن کے سرمایہ علم و ادب میں جو اونچا مقام ہے وہ کچھ کچھ سامنے آجائے گا اور اردو ادب کو قومی زندگی کی ترقی و تہذیب میں کسی دوسری ہندوستانی زبان سے پیچھے نہ رہنے کا ولولہ پیدا ہوگا جو نہایت ہمت افزا ہے" اس نمائش میں طرح طرح کی دلچسپ چیزیں آپ کو دیکھنے کو آئیں گی۔ ایک طرف قلمی کتابیں ہیں تو دوسری طرف چھپی ہوئی چیزیں۔ قلمی چیزوں میں اردو کے مخطوطے ملیں گے، مشاہیر کے خطوط، ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں، ان کے مرقعے، سب سامنے آئیں گے۔ ۱۸۸۵ء سے پہلے کے سرکاری محکموں اور عدالتی کاغذات بھی آپ دیکھیں گے۔ خطاطی اور کتابت کے اچھے اچھے نمونے بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے اور ادب اردو اور تاریخ اردو سے متعلق

فارسی اور ہندی کے قلمی نسخے بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ دوسری طرح کی بہت سی چھپی ہوئی چیزوں ہوں گی جو اب نایاب ہیں۔ پرانی چھپی ہوئی نظم و نثر کی کتابیں، پرانے رسائل اور اخبار، پرانے ادبی گلدستے، علمی اور ادبی انجمنوں کی روودادیں، اردو لغت، لسانیات اور تاریخ اردو کی کمیاب کتابیں، پھر علوم و فنون کی نئی و پرانی کتابیں، اسلام اور دوسرے مذہبوں پر اردو کی پرانی کتابیں، جنتریاں اچھی چھپائی کے نمونے اور دیوناگری، رومن یا دوسری لپیوں (رسم الخط) میں اردو کی کتابیں ایسی نمائش کا افتتاح کرنے پر کسے خوشی نہ ہوگی، لیکن نمائش تو ایک عارضی چیز ہے۔ خاص کوشش سے یہ سب چیزیں آپ کے لئے یکجا کرلی گئی ہیں۔ دوسری چیز جس کا افتتاح مجھے کرنا ہے وہ مستقل چیز ہے وہ ہے ادارہ تحقیقات اردو کا اپنا کتب خانہ۔ یہ نو عمر ادارہ بڑا ہونہار ادارہ ہے، چند سال کے اندر ہی اس نے قابل قدر کام کیا ہے اور بہت کچھ امیدیں تحقیق علمی کی اس سے وابستہ ہیں، یہ خالص تحقیقاتی ادارہ ہے جسے سیاست سے سروکار نہیں۔ یہ صفت بھی آج کل کمیاب کتابوں سے کم کمیاب نہیں۔ یہ کئی تحقیقاتی کتابیں شائع کرچکا ہے اور کئی زیر طبع ہیں۔ جدید اصول لغت نگاری محققانہ کتابیں شائع کرنا، اردو ادب کی مختلف تحریکوں اور مختلف ادوار کی تاریخ پر مقالات تیار کرنا، اردو نظم و نثر کی پرانی قابل قدر کتابوں کے مستند نسخے شائع کرانا، یہ بھی منجملہ ان اہم کاموں کے ہیں جو ادارے نے اپنے ذمے لئے ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو بھی ادارے سے بہت مدد اور ہدایت ملتی ہے۔ پانچ اصحاب جو ادارے سے متعلق ہیں، اردو میں پی ایچ ڈی کی سند کے لئے تحقیقی مقالوں پر کام کر رہے ہیں جن میں سے تین عنقریب اپنے اپنے مقالے پیش کردیں گے۔ ادارے کے ساتھ ملک کے بعض ممتاز محقق وابستہ ہیں اور اس ادارے کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی صدارت کی ذمہ داری قاضی عبد الودود صاحب کے ذمے ہے۔ قاضی صاحب نے قابل رشک یکسوئی کے ساتھ تحقیق علمی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ اور اس کے متعلقہ مسائل

پر ان کو جو عبور حاصل ہے، ان کا علم اس باب میں جتنا وسیع اور حاضر ہے، ان کی نظر جتنی گہری اور تیز ہے، اور تحقیق کے بوجھل کام کے لئے ان کے اندر جو شگفتگی ہے، اس نے انہیں محققین کی صف اول میں ایک بلند درجہ دیا ہے۔ بہار ان پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ ان کی نگرانی میں مجھے یقین ہے کہ یہ ادارہ بہت گراں قدر خدمات اردو سے متعلق تحقیقات کے میدان میں انجام دے سکے گا۔ ...... "اردو کی تاریخ پر تحقیقاتی کام مجھے اس وجہ سے اور بھی اہم دکھائی دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادنیٰ تامل سے یہ بات بالکل روشن ہوجائے گی کہ اردو نہ کسی فرقے کی زبان ہے، نہ کسی مذہب کی زبان ہے، نہ کسی حکومت کی زبردستی چلائی ہوئی زبان ہے، نہ کسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان ہے۔ یہ تو جنتا کی بولی ہے، لوگوں کی زبان ہے، آپس میں میل جول کا پھل ہے، میلوں ٹھیلوں، بازاروں، منڈیوں کی ریل پیل میں رلی ہوئی زبان ہے، زندگی کے بیوپار کے کانٹوں میں تلی ہوئی زبان ہے، چیزوں کے لین دین کے ساتھ وچاروں کے لین دین کا نتیجہ ہے۔ یہ فقیروں اور سنتوں کی زبان ہے جو اپنے پریم سے چھلکتے ہوئے دل کی بات اوروں تک پہنچانے کے لئے بکل تھے اور جن کی من موہن باتیں سننے کو عام لوگ کان لگائے رہتے تھے اسی لئے یہ محبت اور پریم کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے، میل ملاپ کی زبان ہے، اس کا دل بھی بڑا ہے۔ اس کی جھولی بھی بڑی ہے۔ یہ نئے انداز سے چمکتی نہیں، نئی بات پر بدکتی نہیں، لفظوں سے گھنیاتی نہیں، وچاروں سے چھوت چھات نہیں کرتی" .... "اردو چون کہ دیس کے کسی ایک علاقے میں محدود نہیں ہے، ہر جگہ ہی اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے موجود ہیں، اس لئے اس کو وحدت قومی کے پیدا کرنے میں سب سے آگے ہونا چاہیئے، لیکن پچھلی تاریخ نے اس میں بھی بہت سے پیچ ڈال دیئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ مسلمانوں کی زبان ہے، کوئی کہتا ہے یہ پردیسی زبان ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ خالی مسلمانوں کی زبان ہے نہ پردیسی زبان ہے" .... "کوئی فہرست نہیں بنائی ہے، جو نام اس وقت یاد آگئے وہ لیتا ہوں

اور پوچھتا ہوں کہ تربھون ہجرؔ، جوالا پرشاد برقؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، پروفیسر رام چندر، سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برجموہن دتاتریہ، نسیمؔ، چکبستؔ، سرور جہان آبادی، فراقؔ گورکھپوری، منشی نولکشور، لالہ سری رام صاحب، خمخانۂ جاویدؔ، منوہر لال زتشی، دیانرائن نگم کی زبان ہے کوئی مسلمان کی زبان کیسے بتاتا ہے۔ اور اس زبان پر تنگ دلی اور فرقہ پرستی کی تہمت کیسے باندھ سکتا ہے؟ جس زبان میں آریہ سماج کا تمامتر مذہبی لٹریچر موجود ہو، جس سے عیسائیوں نے اپنے مذہب کی خدمت کا پورا کام لیا ہو اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر تنگ دلی تنگ نظری کی پرورش کرنا کون سی دیانت ہے، کون سی فراست ہے؟ پھر اردو نہ بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے، ذرا بھی دیکھئے تو قدم قدم پر اس کی شہادت ملتی جائے گی۔ لسانی نقطہ نظر سے اس کے افعال اور حروف اور عام ضرورت کے اسم، سب ہندی ہیں، اس کی آوازوں پر کان دھریئے تو ایران و عرب سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ آوازوں کی بہت بڑی تعداد خالص ہندوستانی ہے۔ عربی لفظوں میں جو سامی آوازیں آئی ہیں انھیں بھی بول چال میں ہندیا لیا ہے۔ لکھائی میں بھی اس کے پردیسی ہونے پر زور دیا جاتا ہے، درجنوں ہندوستانی آوازوں کے ظاہر کرنے کا اس میں سامان ہے۔ اس میں ڑ، ڈ، ٹ، ٹھ، دھ، بھ، جھ، چھ اور گھ کیا پردیسی آوازوں کے نشان ہیں؟ ...... ”دوستو! شاید یہاں اردو دوست زیادہ جمع ہوں، آپ سے یہ کہنا ضروری ہے کہ آپ کا فرض ہے اپنی عزیز زبان دوست کی روح کو آپ کسی حال میں مسخ نہ ہونے دیں۔ کوئی اس روح سے ناواقف ہو تو اسے بتائیں کہ روح کیا ہے، اس روح کو تازگی بخشیں کہ ایک اچھی سماجی زندگی کے بنانے میں آپ کا ادب کسی اور سے پیچھے نہ رہے۔ زبان اور ادب کا مقابلہ یہ نہیں کہ کسی سے روٹھ گئے، کسی کو بُرا سمجھ لیا، کسی کو دبا دیا۔ اس میں جیت اسی کی ہے جو خدمت کے میدان میں اوروں سے بازی لے جائے۔ مقابلہ اس میں کیجئے کہ کس زبان کے گیت قوم کے دلوں کو گرماتے ہیں، کسی کا ادب صالح اقدار کی ترویج کا ذریعہ بنتا ہے۔ کون اچھے آدمی، اچھی

ریاست اور اچھے سماج کے بنانے میں اس کو عدل و انصاف، صداقت و امن کی بنیادوں پر مضبوط کرنے میں غلطی کرنے پر، جرأت سے ٹوکنے میں، نیکی کو فراخدلی سے سراہنے میں، دماغوں کو تنگ نظری اور تنگ دلی کے جالوں سے صاف کرنے میں، علم کی سرحدیں آگے بڑھانے میں، آدمیوں نے جن سچائیوں کا سُراغ لگایا ہے کہیں لگایا ہو، کسی نے لگایا ہو، ان سے اپنے ہم وطنوں کے ذہن کو منور کرنے میں جذبہ قومی کو ایک قومی اور مؤثر جذبہ بنانے میں وطن اور اہل وطن کی اچھائیوں اور خوبیوں سے وہ ذہنی وابستگی پیدا کرنے میں جو قومی وفاداری کی جڑ ہے، کون زبان دوسری زبان سے زیادہ کارگر ہے۔ یہ نیکی کا مقابلہ ہے اس میں جیت اور ہار نہیں ہوتی۔ اس میں مقابلہ کرنے والے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں، اور دوسرے کے آگے بڑھ جانے پر بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہیں جتنا خود اپنے آگے نکلنے پر۔"

میری التجا ہے اور امید ہے کہ تاریخی اتفاقات نے اردو ہندی کے تعلق میں جو گتھیاں سی ڈال دی ہیں، وہ اردو اور ہندی دونوں کے کام کرنے والے اپنی سوجھ بوجھ اور صاف دلی سے اس طرح سلجھائیں گے کہ یاد بھی نہ رہے گا کہ کبھی الجھنیں پیدا ہوئی تھیں۔ محبت سے کہتے ہیں کہ ٹوٹے دل جڑتے ہیں اور ایسے جڑتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں بال پڑا تھا۔

دل شکستہ در آں کوے می کنند دُرست!
چناں کہ می نہ شناسی از کجا بشکست!!

صحافی مصنّفین اور نثر نگار

پٹنہ کے شعر و سخن کی محفلیں اگر شعر و ادب کا گہوارہ تھیں اور یہاں کے شاعروں نے اگر اردو زبان کا دامن جواہر پاروں سے بھرا تو یہاں کے صحافیوں، نثر نگاروں اور مصنفین نے بھی یہاں اور یہاں سے باہر رہ کر، گراں قدر مضامین، مقالے

اور رنگ برنگ کی تصنیفات سے زبان و علم میں بہت کچھ چمک دمک پیدا کی اور اس سے بڑھ کر وقت کے تقاضے کے مُطابق نئے رجحانات، نئی تحقیقات اور اُبھرتے ہوئے علوم متداولہ سے ملک کو بڑی حد تک روشناس کرایا۔ اس وقت یہاں ایسے بہت سے اہل قلم اور صاحب علم حضرات موجود تھے جن کے علمی کارناموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ایک ضخیم دفتر بن جائے، ان میں کچھ حضرات کا تذکرہ اس کتاب میں آچکا ہے، اور بقیہ حضرات میں سے چند لوگوں کا تذکرہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

مولوی سیّد رحیم الدین مہجورؔ ایڈیٹر ''الپنچ''

مولوی سیّد رحیم الدین مہجورؔ بھی مولوی سجاد حسین کی طرح آسمان صحافت پر خوب چمکے، جن کی روشنی میں کتنے ادبی ستارے پروان چڑھتے گئے۔ اگر سجاد حسین مرحوم اودھ پنچ کے روح رواں تھے تو یہاں بہار میں سیّد رحیم الدین مرحوم ''الپنچ'' کی حیات کے ضامن اور اس کی شگفتگی میں نکھار پیدا کرنے والے تھے۔ مولوی سجاد حسین مرحوم کے اکثر و بیشتر جو مضامین اور افسانے نکلے وہ کتابی شکل میں ان کے نقوش پائدار بنے، مگر افسوس ہے کہ مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم کی قلمی کاوشیں رسالوں ہی میں سر بمہر بند پڑی ہیں۔

مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم سابق ضلع پٹنہ اور موجودہ ضلع نالندہ کے مشہور گاؤں دسنہ میں ۱۸۵۸ء پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی صوبہ بہار میں علم و فضل کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم کے آباواجداد کئی پشتوں سے یہیں آکر بسے تھے لیکن آج یہ بستی لٹ لٹا کر صرف معمولی سی بستی رہ گئی ہے، بہرکیف مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم نے گھر اور پھر بہار شریف جاکر عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ علم کی تشنگی کم نہ ہوئی تو بھوپال گئے، کچھ دنوں تک وہاں حدیث و تفسیر کا درس لیتے رہے، پھر پٹنہ آکر مولانا محمد کمال

صاحب مرحوم سے دوبارہ درسی کتابیں ختم کیں، اور یہیں ان کی دستار بندی بھی ہوئی۔ انگریزی انٹرنس تک پڑھی تھی مضمون نگاری کا شوق شروع ہی سے تھا اس لئے طبیعت برابر اس کی طرف متوجہ رہی۔ میرے والد مرحوم خان بہادر سیّد ضمیر الدین احمد مرحوم کے دلی دوستوں میں تھے، یہ ان کو اپنے ساتھ اپنی سسرال صدر گلی پٹنہ سیٹی لائے۔ میرے دوماموں سیّد عبد المجید اور سیّد عبد الحفیظ کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ یہ دونوں رئیس زادے جب سبق کی طرف کم دھیان دیتے تو ان دونوں کی خوب خبر لی جاتی تھی۔ آخر یہ دونوں زدوکوب سے عاجز ہو کر ایک دن گھر سے بھاگ نکلے۔ آرہ تک پہنچے تھے کہ پکڑ لئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم سے ان کو گلو خلاصی ہوئی اور اب ان کی جگہ مولوی سیّد عبد الغفور شہباز نے ان دونوں کو پڑھانے کا کام سنبھالا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر میرے نانا میر احمد حسین صاحب مرحوم مولوی سیّد رحیم الدین سے بہت محبت کرنے لگے تھے اس لئے مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم کا قیام صدر گلی میں ہی رہا۔ اس وقت علامہ حکیم عبد الحمید پریشان کی علمی اور ادبی صحبتیں بھی صدر گلی میں جمتی تھیں۔ پٹنہ کے مشاہیر کے علاوہ باہر سے بھی صاحبان علم وفن آکر شریک ہوتے رہتے تھے۔ مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم بھی اس صحبت کے ایک اہم رکن تھے۔ اس زمانے میں پٹنہ سے ایک اردو اخبار، اردو کرانیکل، بڑی آب و تاب سے نکلتا تھا پہلے اس میں مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم بہ حیثیت مضمون نگار کام کرتے رہے پھر صدر گلی ہی میں انہوں نے ۱۸۸۵ء میں اخبار "الپنچ" کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے 'الپنچ' نکالا تو ان کو گھر بیٹھے قلمی معاونین اور قدرداں بھی ملے۔ تھوڑی ہی دنوں میں اخبار کا صدر دفتر بانکی پور منتقل ہو گیا۔ مگر یہ بہت دنوں تک اس کے بعد بھی صدر گلی ہی میں مقیم رہے۔ یہیں اپنے رفقائے کار کے ساتھ بیٹھ کر یہ اخبار کے لئے مضمون لکھتے اور اپنے رفقائے سے بھی لکھواتے۔ مولوی سید رحیم الدین مرحوم نے اخبار "الپنچ" کے مالک اور مدیر کی حیثیت میں اپنی ذمہ داریوں کو جس

حُسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا، اس کا ثبوت آج بھی اخبار "الپنچ" کے بند ہو جانے کے باوجود اس کی پائدار شہرت سے ملتا ہے، مگر جو چیزیں آج نظروں سے پوشیدہ ہیں وہ ان کا صحافی جوہر، ان کے اعلیٰ و علمی اور ادبی مقالے اور ان کے شاعرانہ کلام میں، اس وقت کی صحافت میں انھوں نے نئی نئی راہیں پیدا کیں، ادب میں تازہ اور صحت مند روح پھونکی اور فرسودہ فضاء کو بدلنے میں انہوں نے اپنے قلم کے زور سے جو کیا وہ اکثر بڑے بڑے انقلابی بھی نہیں کر سکے ہیں۔

صحافت کے ساتھ ساتھ ان کی علمی صلاحیت بھی مستند مانی جاتی تھی۔ کچھ دنوں تک یہ پٹنہ کے بی این کالج میں فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ اپنی علمی صلاحیت کے باعث یہ کلکتہ اور الہ آباد یونیورسٹیوں کے ایف۔ اے، بی۔ اے اور ایم اے کے عربی اور فارسی کے امتحانات میں برابر ممتحن بھی ہوتے رہے۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے الپنچ کی ادارت کا کام مولوی ابوالخیر خیّر دربھنگوی کے سپرد کردیا تھا، اس کا سبب ان کی خرابی صحت تھی۔ مولوی ابوالخیر خیر دربھنگوی مرحوم بھی حسن اتفاق سے اس کے لئے بہت موزوں آدمی ان کو ملے تھے جو بڑی کامیابی کے ساتھ الپنچ کو چلاتے رہے۔

مولوی سیّد رحیم الدین مرحوم کا انتقال پٹنہ ہی میں جولائی ۱۹۰۳ء میں ہوا۔ وہ ضیق النفس کے پرانے مریض تھے۔ انتقال کے وقت ان کی تقریبا ۴۴۔۴۵ سال تھی، اور جب یہ اٹھے تو یہاں ہر طبقہ میں ان کی جگہ خالی رہ گئی، کیونکہ یہاں کے صحافیوں، عالموں، صوفیوں، شاعروں اور نثر نگاروں میں ان کی ممتاز جگہ تھی۔ یہ سنجیدہ اور بلند پایہ عالم بھی تھے فقیر منش صوفی بھی تھے نکتہ ترس شاعر بھی تھے اور صاحب طرز انشاء پرداز بھی تھے۔

مولوی عبد الغنی وارثی

موضع دسنہ سے متصل شریف مسلمانوں کی ایک دوسری بستی بھی ہے جو اپنے مشاہیر کے سبب سے دسنہ سے کم مشہور نہیں۔ اس کو استھانواں کہتے ہیں۔ آج کل یہ دونوں گاؤں اپنے اصلی باشندوں پر نوحہ کناں ہیں۔ یہ دونوں بستیاں رہ گئیں مگر جن کے سبب سے ان کی عظمت تھی اور جن کے علم و کمال کے باعث ان کو مرکزیت کا درجہ حاصل تھا وہ یا تو گزر گئے یا اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسری جگہوں میں جا بسے۔ ۱۸۵۸ء کے لگ بھگ مولوی سیّد عبدالغنی وارثی یہیں ایک شریف گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اوائل میں یہ پٹنہ کے ادبی اور علمی حلقوں میں بھی خوب چمکے۔ اور جب یہاں سے ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد دکن گئے تو ملک کے دوسرے ممتاز اہل قلم حضرات کی صف میں انہوں نے جگہ بھی پائی۔ یہ عربی اور فارسی میں فارغ التحصیل تھے اور انگریزی زبان پر بھی اچھا عبور رکھتے تھے۔ عربی کی تعلیم آرہ میں مکمل کر کے یہ علی گڑھ گئے۔ اس وقت علی گڑھ کے مدرستہ العلوم کا اسکول ایک جھونپڑے میں انگریزی تعلیم کا درس دے رہا تھا۔ اسکول کی تعلیم ختم کر کے مولوی عبدالغنی وارثی پٹنہ آئے اور صدر گلی میں مقیم ہوئے۔ صدر گلی میں ان کا قیام بھی میرے والد مرحوم خان بہادر سیّد ضمیر الدین احمد کی دوستی کے سبب سے تھا۔ مولوی عبد الغنی وارثی پٹنہ میں علامہ عبد الحمید پریشاںؔ کے علمی اور ادبی حلقہ کے ایک ممتاز رکن بن گئے اس حلقے کی علمی اور ادبی صحبتیں اس وقت نصف النہار پر تھیں۔ بہت سے صاحبان کمال سمٹ کر اس حلقے میں آگئے تھے۔ سچ پوچھیے تو مولوی عبد الغنی وارثی کے جوہر ان ہی صحبتوں میں نمایاں ہونے لگے۔ کچھ دنوں بعد جب بابو بشیشر سنگھ نے پٹنہ سے اخبار اردو "کرانکل" نکالا تو مولوی عبد الغنی وارثی اس اخبار کی ادارت کا فرض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب مولوی رحیم الدین مرحوم نے اخبار الپنچ نکالا تو یہ اس کے بھی ایک ممتاز قلمی معاون بنے رہے۔ ان ہی دنوں لکھنو کے اودھ پنچ اور

اودھ اخبارات میں بھی مولوی عبدالغنی وارثی کے مضامین بڑے آب و تاب سے نکلتے تھے۔ حیدر آباد جو اس وقت اردو زبان میں مرکزیت کا درجہ حاصل کر چکا تھا، وہاں کے اخباروں، پرچوں اور رسائل میں بھی مولوی عبدالغنی وارثی کے مضامین کو اہمیت دی جانے لگی تھی، کچھ دنوں بعد اپنی صلاحیت کی بدولت مولوی عبدالغنی وارثی کو حکومت حیدر آباد سے جب مترجم کے عہدے کی پیشکش آئی تو یہ اس کو قبول کر کے مستقلا حیدر آباد چلے گئے۔ اپنے عہدہ مترجمی کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی مولوی عبدالغنی وارثی نے بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جب ترقی کر کے یہ اسسٹنٹ اکاؤنٹ جنرل مقرر ہوئے اس وقت بھی ان کی تصنیف کا سلسلہ جاری رہا۔ انہوں نے عربی کے بیش بہا کتابوں کے ترجمے بھی اردو کی سلیس زبان میں بڑی قادرالکلامی کے ساتھ کئے۔ یہ سب تصنیفیں چھپیں بھی اور لوگوں نے ان کی قدر و قیمت کا اعتراف بھی کیا

جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی نے حیدر آباد میں علمی بزم قائم کی جس کے اراکین میں مولانا عبدالحلیم شرؔر اور مولوی عزیز مرزا وغیرہ تھے۔ اس وقت بھی اس علمی بزم نے مولوی عبدالغنی وارثی کے دم قدم سے فروغ پایا اور یہ اس کے بھی سرگرم رکن رہے۔

مولوی عبدالغنی وارثی صحافی، ادیب اور مضمون نگار ہونے کے ساتھ مذہبی مسائل کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے سلجھاتے تھے۔ اردو ادب میں ان کی طرز تحریک ایک انفرادی حیثیت رکھتی تھی جو کہ ان کی زبان کی قادرالکلامی کے لحاظ سے بھی آج تک مستند سمجھی جاتی ہے۔

مولوی عبدالغنی وارثی تیس بتیس برس حیدر آباد میں رہے مگر اپنے گاؤں استھانواں سے ان کی بے پناہ محبت ہمیشہ قائم رہی۔ یہ ہر سال ایک مہینہ کے لئے حیدر آباد سے استھانواں آتے اور جب چھٹیوں کے دن ختم ہونے لگے تو واپسی میں دو تین دنوں تک صدر گلی پٹنہ سیٹی میرے والد مرحوم کے پاس آکر وقت گزارتے۔ اس

وقت میں دیکھتا کہ یہ دونوں بزرگ کس طرح رشتۂ اخوت و محبت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ مولوی عبدالغنی وارثی کے دونوں صاحبزادے مسٹر محی الدین مرحوم اور تقی الدین مرحوم نے بھی میرے ساتھ تقریباً اسی خلوص و محبت کا جذبہ قائم رکھا جو ان کے والد مرحوم کو میرے والد مرحوم سے تھا۔

مولوی عبدالغنی وارثی حیدرآباد سے پنشن لے کر گھر لوٹ آئے اور اس کے تھوڑے دنوں بعد ۱۹۱۸ء میں موضع استھانواں میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً اکسٹھ باسٹھ سال کی تھی۔

سیّد افضل الدین احمد

مصنف فسانۂ خورشیدی

۱۸۵۷ء سے بہت قبل کی بات ہے۔ یہ قصبہ باڑھ، پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ سید امیر علی نے کلکتہ کے صدر دیوانی عدالت میں وکالت شروع کی، اپنی خداداد ذہانت اور صلاحیت سے روز بروز اس پیشے میں اونچے اٹھتے گئے اور ایک دن وہ آیا، کہ صدر دیوانی عدالت کے بڑے کامیاب وکیلوں اور صوبہ بنگال و بہار کے معززین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ سیّد امیر علی کو یہ گونہ اعزاز حاصل تھا، کہ وہ پبلک میں بھی ہر دلعزیز اور اس کے بہی خواہ سمجھے جاتے تھے اور حکومت کو بھی ان پر اعتماد اور ان کی صلاحیتوں پر بھروسہ تھا جس کا اعتراف بعد میں حکومت نے ان کو نواب اور سی، آئی کا خطاب دے کر کیا۔ جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت کامیاب ہوکرناکام ہوچکی تھی تو ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ پٹنہ کی حالت بھی اس وقت تشویشناک تھی۔ پٹنہ کا انگریز کمشنر ٹیلر (Taylor) یہاں کے لوگوں سے انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔ ہزاروں ہندوستانیوں کے خون سے اس کی درندانہ تشنگی ابھی تک نہیں بجھی تھی، سینکڑوں بے

گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھ چکے تھے اور سینکڑوں کی گردنوں میں پھانسی کے پھندے ڈالنے کا روزانہ حکم دیا جارہا تھا۔ اس میں شرفاء، رؤسا، علماء اور متوسطین ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ ٹیلر (Taylor) اپنے انتقام کی دھن میں کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔ آخر تنگ آکر پٹنہ کے کچھ سربرآوردہ لوگوں نے جو حکومت کے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے کلکتہ میں لارڈ کیننگ کو جو اس وقت گورنر جنرل تھے ٹیلر کی دھاندلی کی طرف متوجہ کرایا۔ اور اس کے ظالمانہ اور بڑھے ہوئے انتقامی جذبے کے ثبوت بھی پیش کئے۔ اس وقت حکومت بھی مصلحت وقت سے درگزر پر تیار ہو چکی تھی۔ گورنر جنرل نے مصلحت کے پیش نظر ٹیلر کو فوراً ہٹانا ضروری سمجھا اور اس کو معطل کر کے فوری چارج لینے اور سینکڑوں بے گناہوں کے خلاف جو احکامات صادر ہو چکے تھے ان پر نظر ثانی کرنے کے لئے جس شخص کو مقرر کیا گیا، وہ یہی نواب سیّد امیر علی تھے۔

پٹنہ کے لوگوں کو ان سے انصاف کی جو امید تھی وہ سولہ آنے پوری ہوئی۔ رات ہی رات نواب سیّد امیر علی نے ٹیلر سے کمشنری کے عہدے کا چارج لیا۔ اسی رات میں سینکڑوں کے محضر قتل پر نظر ثانی کی اور صبح ہوتے ہی جو لوگ پھانسی کے تختے پر چڑھائے جانے والے تھے، سبھوں کے لئے رہائی کا حکم دے دیا۔ ان ہی پھانسی سے بچنے والوں میں نواب سیّد لطف علی خان بھی تھے جن کی داد و دہش اور قومی امداد کی داستانیں یہاں کے بہت سے تعلیمی اداروں پر ثبت ہیں۔ اس کے چند سال بعد جب سابق شاہ اودھ حضرت واجد علی شاہ جو اس وقت مٹیا براج کلکتہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان کی مالی انتظامات الجھنے لگے تو حکومت ہند نے نواب سیّد امیر علی کو وزیر السلطان کا لقب دے کر واجد علی شاہ کا مشیر مقرر کیا۔ پہلے تو نواب سیّد امیر علی اپنی کامیاب وکالت چھوڑنے پر تیار نہ تھے مگر بعد میں اس شرط پر انہوں نے یہ عہدہ قبول کرلیا کہ وہ وکالت سے کلیتاً دست بردار نہ ہوں گے۔ اس عہدے کا قبول کرلینا نواب سیّد امیر علی کے لئے بڑا مہنگا پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ واجد علی شاہ کے اخراجات میں

فراغت آئی سابق شاہ اودھ کو اطمینان بھی مل گیا، مگر نواب سیّد امیر علی کو بادشاہ کے اخراجات کو پورا کرنے میں بار بار اپنی وکالت سے حاصل کردہ جائدادوں کی کفالت بھی مہاجنوں کو دینی پڑی۔ اس وقت تک بادشاہ کے اپنے ساتھ لائے ہوئے جواہرات اور لائی ہوئی رقمیں بھی ختم ہوچکی تھیں، جن کے ذریعہ سے واجد علی شاہ اپنے حوصلے پورے کرتے تھے۔ مٹیا برج کا محلّہ جو اب بڑھ کر چھوٹا سا لکھنو بن گیا تھا وہاں کے شاہی محلات اور ہزاروں نوکر پیشے جو لکھنو سے کھینچ کر یہاں آگئے تھے ان سب کی کفالت شروع ہی سے حکومت ہند کی اس مقرر کردہ پنشن سے ناممکن تھی جو واجد علی شاہ کو سالانہ ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب نواب امیر علی کا انتقال ہوا تو ان کی ساری جائداد مہاجنوں کے یہاں گروی تھی۔ واجد علی شاہ کو سب خبر تھی کہ نواب امیر علی اپنی جائدادوں کو رہن رکھ کر ان کے اخراجات پورے کر رہے ہیں۔ ان کو اس کا بھی یقین تھا کہ حکومت ہند ان قرضوں کو ادا کردے گی۔ جب نواب امیر علی کا انتقال ہوا تو اسی یقین کے ساتھ واجد علی شاہ نے نواب سیّد امیر علی کی جائدادوں کی واگذاشت کے لئے ان کے قرضوں کی وصولی کی طرف حکومت ہند کو توجہ دلائی، حکومت ہند نے وعدہ بھی کرلیا کہ جلد ہی یہ قرضے حکومت ہند ادا کردے گی، مگر نواب سیّد امیر علی کے ورثاء کی بد قسمتی سے چند ہی دنوں کے بعد واجد علی شاہ کا بھی انتقال ہوگیا اور انگریز حکومت کا وعدہ بھی دفتر پارینہ ہوکر ان کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ آخر یہی ہوا کہ نواب سیّد امیر علی کی ساری جائداد قرض میں تلف ہوگئی۔

نواب سیّد امیر علی کے تین صاحبزادے تھے۔ سب سے بڑے نواب زادہ خان بہادر سیّد اشرف الدین احمد سی۔ آئی۔ ای، جو برسہا برس ہوگلی امام باڑے کے متولی رہے اور جب اس عہدے سے سبکدوش ہوکر باڑھ آئے، تو وائسرائے کی امپیریل کونسل کے ممبر بھی نامزد کئے گئے۔ چند برسوں کے بعد باڑھ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ دوسرے سیّد افضل الدین احمد تھے جو فسانۂ خورشیدی کے مصنف ہیں۔ بہت دنوں تک

یہ انسپکٹر آف رجسٹریشن بھی رہے تیسرے صاحبزادے سیّد احسن الدین احمد ڈی، ایس، اور صوبہ بہار و اڑیسہ کے اکسائز کمشنر اور انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن تھے، آخر میں یہ لیفٹیننٹ گورنر بہار کی ایکزیکٹیو کانسل کی ممبری کا چارج لینے والے ہی تھے کہ قلب کی حرکت بند ہو جانے سے کلکتہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہاں مجھے سیّد افضل الدین احمد کا تذکرہ پیش کرنا ہے جن کا شمار بہار کے باکمال نثر نگار میں آتا ہے۔ سیّد افضل الدین احمد ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ میں ان کو اچھے معلموں سے فارسی اور کچھ عربی کی تعلیم دلوائی گئی اور انگریزی کی تعلیم کے لئے انگریز معلم رکھے گئے۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ فورٹ ولیم کالج قائم ہو کر باکمالوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا تھا اور کلکتہ اردو کا بڑا مرکز بن رہا تھا۔ ایک طرف فورٹ ولیم کالج کا قیام، دوسری طرف حضرت واجد علی شاہ کے طفیل میں مٹیا برج کی صورت میں لکھنو کے حسین و دلکش خدوخال بنگالہ میں بھی اردو کی چمک دمک پیدا کر رہے تھے۔ انگریزی کی تعلیم کلکتہ میں عام ہو چکی تھی اور اس تعلیم کی بدولت انگریزی تہذیب بھی اونچے گھرانوں میں رائج ہونے لگی تھی۔ غرض کلکتہ اس وقت مشرقی اور مغربی تہذیب کا سنگم بنا ہوا تھا۔ سیّد افضل الدین جب شعور کو پہونچے تو ان کے والد نواب سیّد امیر علی، واجد علی شاہ کے یہاں وزیر السلطان کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ سیّد افضل الدین احمد کا آنا جانا محلات شاہی میں بھی ہونے لگا۔ لکھنؤ کے شاہزادگان جو کلکتہ میں آکر بس گئے تھے، پھر ٹیپو سلطان کے خاندان کے افراد کا ان سبھوں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا، مٹیا برج کا ماحول جو اس وقت لکھنؤ کی تہذیب اور کلچر پر پہلو مارتا تھا اسی ماحول کی آغوش میں سیّد افضل الدین احمد کی جوانی کے دن گذر رہے تھے۔ یہ طبیعت کے رنگین مزاج بھی تھے، ان کے والد کے گھر دولت کی فراوانی بھی تھی، اس لئے یہ بھی نواب زادوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ سیّد نواب امیر علی کے انتقال کے بعد ان کی تقریباً سب جائدادیں نیلام ہو گئی تھیں، پھر بھی جائدادوں کے ٹکرے پارچے بہت کچھ باقی ادھر اُدھر منتشر

تھے۔ ان ہی کو برسوں سمیٹ کر سیّد افضل الدین احمد کلکتہ میں فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے، اور کلکتہ کی عیش کی زندگی کی بہاریں لوٹتے تھے۔

اس زمانے میں پنڈت رتن ناتھ سرشآر کے ناول "سیر کہسار" "جامۂ سرشآر" اور فسانۂ آزاد" ملک میں مقبول ہونے لگے تھے۔ سید افضل الدین احمد کے دل میں بھی گدگدی اٹھی اور کلکتہ کے مسلم اُمراء، نواب زادوں اور بیگمات کی معاشرت کے ماحول کی تصویر انھوں نے بھی "فسانۂ خورشیدی" میں کھینچ کر کھڑی کر دی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشآر اور سیّد افضل الدین احمد کی زبان و بیان کے موازنہ سے قطع نظر کر کے یہ دیکھنا ہے کہ کس حد تک سیّد افضل الدین احمد کلکتہ کے مسلم امراء کی سوسائٹی کا خاکہ پیش کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ واجد علی شاہ کے دم قدم سے مٹیا بُرج آباد ہو کر دوسرا لکھنؤ بن گیا تھا۔ لکھنؤ کی زبان و معاشرہ کے اثرات خاص کلکتہ کے افراد پر بھی پڑے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کلکتہ کی اس وقت کی سوسائٹی میں ایک بات اور بھی فاضل اور نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ یہ مغربی تہذیب کی جھلک تھی جس سے اس وقت تک لکھنؤ نا آشنا تھا۔ سیّد افضل الدین احمد نے بڑی چابکدستی سے کلکتہ کی اس وقت کی سوسائٹی کی تصویر کھینچی ہے جس میں کچھ مغربی اور مشرقی تہذیب سے بڑی حد تک نا آشنا اس خطہ ملک میں بھی جہاں بنگالی کلچر اور ساتھ ہی انگریزی تہذیب آگے بڑھ رہی تھی۔ لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت نے بھی اثر جما لیا تھا اور کلکتہ کے ایک معتدبہ حصہ میں لکھنؤ کی زبان و معاشرت نے بھی گل بوٹے کھلائے تھے۔ اس بدلتے ہوئے زمانہ میں ایسی معاشرت کا افسانہ بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اسی دور کی سوسائٹی کا فیض ہے کہ آج بھی صوبائی عصبیت، تقسیم ملک اور زبان کے جھگڑے کے باجود کلکتہ میں پھر بھی اردو کا مرکز باقی ہے اور تباہ و خستہ حال مٹیا برج کے آثار صنادید کی آغوش میں کچھ نہ کچھ لکھنؤ کی جھلک مل جاتی ہے۔ غرض فسانہ خورشیدی، تصویر کشی کے لحاظ سے اپنے وقت کے کلکتہ کی سوسائٹی کی مکمل تصویر ہے۔ اس کی زبان کو

سلاست و روانی کے اعتبار سے بھی معیاری کہئے اور دلچسپی کے لحاظ سے پڑھئے تو بغیر ختم کئے کتاب کو ہاتھ سے نہ رکھئے یہ کتاب پہلی بار ۱۸۸۶ء میں شمسی پریس پٹنہ میں چھپی۔

سیّد افضل الدین احمد کا لگاؤ باڑھ سے مرتے دم تک قائم رہا۔ وہ اس کو کبھی نہ بھولے کہ یہی ان کی آبائی جگہ تھی۔ بہار شریف ان کی سسرال تھی اور پٹنہ میں ان کی برادریاں تھیں، اس لئے وہ پٹنہ بھی آتے، یہاں کی رنگین صحبتوں کا بھی آکر لطف اٹھاتے۔ کلکتہ میں رہے، مگر پٹنہ اور باڑھ کو اپنا گھر سمجھا کئے۔ ان کی صاجزادی کی شادی یہیں ضلع پٹنہ کے رہنے والے بیرسٹر سیّد نصیر الدین حسین سے ہوئی تھی۔

سیّد افضل الدین احمد ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۴ء میں ان کا انتقال ہوا اردو ادب میں 'فسانہ خورشیدی' کی زبان اور اس وقت کی معاشرتی داستان ایک امتیازی اور کامیاب تصنیف ہے اور افضل الدین احمد کا درجہ فسانہ نگاری میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد مولوی عبدالحلیم شرؔر اور پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ سے کم نہ تھا۔ گزری ہوئی تہذیب کا مرقع جو انہوں نے فسانہ خورشیدی میں قلم بند کیا ہے وہ آئندہ دور میں بھی پرانی ہندوستانی تہذیب کی نشان دہی کرتا رہے گا۔

سیّد نصیر حسین خاں خیالؔ

سید نصیر حسین خاں خیالؔ کی ذات بھی دنیائے ادب کے لئے کچھ کم باعث فخر د افتخار نہیں۔ اگر ایک طرف ماموں (حضرت شادؔ) کی شاعری میں زندگی کے گوناگوں تجزئے اور ان کی غزلوں میں نئے افکار اور مسائل زندگی کی بندو کشاد میں نئے اندازے ملتے ہیں تو دوسری طرف بھانجے (نصیر حسین خیال) کی نثر نگاری بھی اچھوتے اسلوب بیان و زبان میں ایک بڑے صحت مند ادب کی تصویر پیش کرتی ہے۔ نصیر حسین خاں خیالؔ حضرت علی محمد شادؔ کے بھانجے تھے۔ نصیر حسین خیالؔ کے والد کا نام سید جعفر حسین خاں تھا۔ یہ پٹنہ کے معزز شرفاء میں تھے۔ ۱۸۷۸ء میں نصیر حسین خیالؔ

پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ محلّہ حاجی گنج ان کا مولد و مسکن تھا۔ نصیر حسین خیالؔ کی ابتدائی زندگی کو دیکھنے والے اس وقت بھی یہ صحیح اندازہ لگاتے تھے کہ یہ کم سن لڑکا جو نو عمری میں بھی الفاظ کے تلفظ اور زبان کی صحت میں گفتگو کرتے وقت مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ آخر میں ضرور ہی ایک بڑا ادیب بھی اور ایک صاحب طرز انشا پرداز بھی ہوگا۔ نصیر حسین خیال نے عربی فارسی تو گھر پر پڑھی مگر انگریزی کی انتہائی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی مگر ان کے ذوق مطالعہ نے یہ کمی بھی پوری کردی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے ذوق علم نے ان کو فرانسیسی زبان سے بھی آشنا کر دیا۔

ان کی جوانی کا زمانہ پٹنہ میں اردو فارسی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہر جگہ مشاعرے ہوتے تھے اور ہر پڑھا لکھا آدمی اس شعر و شاعری کے ماحول میں شاعر بنا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ بھی حضرت شادؔ کی شاعری سے کچھ دن استفادہ کرتے رہے مگر شاعری ان کے مزاج کے موافق نہ پڑی۔ یہ پہلے ہی سے اچھوتے اور نئے مضمون نثر میں لکھتے اور اپنے نو عمر ساتھیوں کو سُناتے اور خوب واہ واہ ہوتی۔ اس ہمت افزائی نے ان کی نثر نویسی کے شوق کو اور بڑھایا ور جب ان کے سن شعور نے خیالات میں پختگی لائی تو ان کے قلم سے افادیاتی مضامین نکلنے لگے۔ کم سنی ہی میں ان کے اکثر مضامین حیدر آباد دکن کے ایک رسالہ "حسن" میں اکثر ان کے فرضی نام چھپتے سے رہے۔ ان کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا کہ سید علی سجاد جو محلّہ مغل پورہ پٹنہ کے رہنے والے اور ان کے دوست تھے انہوں نے ۱۸۹۷ء میں ایک ماہانہ "ادیب" کے نام سے پٹنہ سے نکالا۔ اس ماہانہ "ادیب" میں جو مضامین نصیر حسین خیالؔ نے لکھے وہ منفرد تھے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ نو عمری میں انہوں نے اردو زبان کو وہ اسلوب عطا کیا جو اسلوب زبان و ادب کو اکثر مصنفین اور نثر نگار اپنی پختہ سالی میں دے سکے ہیں۔ بہت زمانے کی بات ہے ایک دن مجھے "ادیب" کے چند پرانے پرچے مل گئے تھے۔ ان میں شکسپیئر کے مشہور ڈرامہ مڈسمر نائٹس ڈریم "Mid-Summer Nights Dream" کا اردو ترجمہ نصیر

حسین خیالؔ کا لکھا ہوا بھی موجود تھا۔ میری نظر میں شکسپیئر کا انگریزی اور یجنل ڈرامہ بھی تھا مگر مجھے حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ نصیر حسین خیالؔ کے ترجمے میں بھی وہی جذبات کی رو، وہی الفاظ کی ہم آہنگی وہی زبان کی سلاست اور اس کے گیتوں میں وہی مٹھاس اور رس ہے جو شکسپیئر کی ڈرامہ نگاری کی اصلی روح ہے۔ اس سین کا ترجمہ تو انتہائی نظرافروز اور مسحور کن ہے۔ جہاں پریوں کی ملکہ بستر خواب پر استراحت کرتی نظر آتی ہے اور اس کی سہیلیاں لوری گا کر اس کو سلاتی ہیں۔ اس لوری کے ترجمے کی بڑی ندرت یہ ہے کہ خواب آور نازک اور سبک الفاظ بڑی قادرالکلامی کے ساتھ ترجمے میں لائے گئے ہیں اور اس کی لے کو بھی انگریزی شاعری کی بحر سے اس طرح ہمکنار کر دیا ہے کہ اس کی اصلی اور یجنل بولی اپنی جگہ پر قائم ہے مجھے افسوس ہے کہ اس وقت ''ادیب'' کے وہ پرچے مجھے نہ مل سکے کہ میں اس سے کچھ اقتباس پیش کروں

۱۸۹۹ء میں نصیر حسین خیالؔ کی شادی خانہ آبادی کلکتہ میں ہوئی۔ شادی کے بعد وہ کلکتہ میں جب رہنے لگے تو ان کی ادبی زندگی کے ساتھ ان کی سماجی اور سیاسی زندگی کا بھی دائرہ وسیع ہونے لگا۔ ان کی ادبی زندگی کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اب تک جو دریا کوزہ میں بند تھا وہ کلکتہ جاتے چھلک گیا تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کلکتہ کی زندگی نے جو ان کو فراغت مہیا کی اس سے ان کی مصروفیت سہ چند بڑھ گئیں۔ اب ایک ادیب کی حیثیت کے علاوہ ان کی سماجی اور سیاسی مصروفتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ اور ادبی، سماجی اور سیاسی انجمنوں میں ہر جگہ ان کا مقام بھی بن گیا تھا، پھر بھی یہ ضرور تھا کہ ادیب کی حیثیت دوسری حیثیتوں پر غالب تھی اور یہ ہونا بھی تھا اس لئے دلی لگاؤ تو ان کو ادب ہی سے تھا اور سماجی سیاسی تحریکوں میں ان کو تھوڑا بہت حصہ لینا وہ اس وقت کی شخصی وجاہت اور امارت کا مشغلہ تھا۔

جب نصیر حسین خیال انگلستان گئے اور ان کے آنے کی خبر کیمبرج یونیورسٹی کے اراکین کو ملی تو کچھ ارکانِ مجلس وفد لے کر ان کے پاس آئے اور کیمبرج یونیورسٹی کی مجلس میں تقریر کرنے کی ان سے استدعاء کی۔ نصیر حسین خیالؔ نے جو خطبہ (ایڈریس) مجلس میں دیا وہ اردو زبان کے لئے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے جو وہاں کے پرچہ "نوائے کیمبرج" میں بڑی آب و تاب سے چھپا اور اردو نواز حلقوں میں ہر جگہ مقبول ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ میں جب اردو کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کی صدارت نصیر حسین خیال ہی نے کی۔ اس کانفرنس میں ان کا خطبہ صدارت بھی آج تک ایک یادگار، اردو کا ادبی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بہت سے نادر اور گرانقدر مضامین جو اکثر رسالوں اور پرچوں میں چھپتے رہے وہ دوبارہ منظر عام پر نہ آسکے۔ کاش یہ مضامین نظر کے سامنے آجائیں تو اردو زبان میں بیش بہا اضافہ ہو جائے۔

فردوسی پر ان کی گرانمایہ تصنیف "داستان عجم" بہر کیف شائع ہو گئی مگر بڑی حسرت کی بات یہ ہے کہ ان کی سب سے بیش بہا اور بصیرت افروز تصنیف اردو زبان کی تاریخ کا ایک ہی حصّہ اور "مغل اردو زبان" چھپا اور ان کا دوسرا حصّہ نہ چھپ سکا۔

نصیر حسین خیال ایک بڑے صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ زبان میں سلاست و بلاغت اور تحریر میں وہ روانی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا امنڈ رہا ہے۔ زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت اور انفرادیت نے ہمعصروں میں ہی نہیں، بعد کے نثر نگاروں میں بھی ان کی جگہ بہت اونچی کردی اس مختصر تذکرے میں گنجائش تو نہیں، پھر بھی تھوڑا سا اقتباس اور ان کی تصنیف "اردوئے معلیٰ" سے پیش کر رہا ہوں، دیکھئے اور ان کی زبان دانی اور قادر الکلامی کا اندازہ لگایئے۔

"شاہ جہاں کو زبان اردو پر وہی حق و دعویٰ ہے کہ جو کسی صناع کو اپنی صنعت و کاریگری پر ہوا کرتا ہے اور جب تک یہ بڑی قومیں (ہندو اور مسلمان) زندہ ہیں، اپنے اس ہندی شہنشاہ کی اس بے مثل صناعی اور اپنی قومیت کی نشانی کو یاد کر کے اس کی روح

کو خوش کرتی رہیں گی۔

تاج، جمعہ مسجد اور قلعہ معلیٰ کی شاندار عمارتوں کے ساتھ اس اردوئے معلیٰ کی یادگار عمارت بھی اسی فیاض و سیر چشم بادشاہ کے مبارک نام سے قائم رہے گی اور یہ (شاہجہاں) اردو کی گود میں پیدا ہوئے اور اسی کے دامن میں پلا۔ اذاں کے بعد جو پہلی آواز اس کے کانوں میں پڑی وہ اسی زبان کی صدائے خوش تھی۔ زچہ گیری اور چھٹی چلہ کے گیتوں، راگوں اور لوریوں کے دھیمے سروں میں اس نے اپنی اسی مادری زبان کے الفاظ سنے اور یہ اسی کا اثر تھا کہ خدیجۃ الزمانی (دادی) کی گود میں رہ کر بھی جب زبان چھوٹی تو دادا کو شاہ بابا اور باپ کو بھائی کہنے لگا۔

شاہجہاں آباد بن چکا تھا اور بادشاہ کے مبارک قدم ادھر آئے تو اردوئے معلیٰ کا شیر خوار بھی دامن دولت سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ آیا۔ اس دن سے یہ طفل لال قلعہ میں اور شاہجہاں کے ایسے سرپرست کی نظر کے سامنے پلنے اور بڑھنے لگا........ شاہجہاں نے اس شیر خوار پر صرف زبانی مہر شفقت نہیں دکھائی بلکہ دلی الفت سے اسے گود میں لیا۔ اور منہہ سے منہہ ملا کر ہمیشہ اسے پیار کیا۔ جب شاہجہاں آگرہ میں زچ ہوا تو گوشۂ تنہائی میں اپنے اس طفل (زبان اردو) سے کھیلتا اور جی بہلایا کرتا........"

کلکتہ اگرچہ نصیر حسین خیالؔ کا گھر بن گیا تھا مگر جب موقع ملتا تو یہ پٹنہ ضرور آتے تو اپنے بچپن کے ساتھیوں کو بھی ڈھونڈ کر نکالتے۔ نوجوانوں سے ملتے تو نثر نگاری کی تلقین کرتے۔ ان کے آنے سے پٹنہ کے ادبی حلقوں میں چہل پہل بڑھ جاتی۔

ان کا انتقال ۱۹۳۴ء میں ہوا تو پٹنہ کیا ہندوستان کا ایک اور آفتاب ڈوب گیا اور ادبی دنیا میں ایک صاحب طرز انشاء پرواز کی جو جگہ ان کی موت سے خالی ہوئی وہ خالی ہی رہی۔

سیّد سجاد حسین اور ان کی کتاب ’’محل خانہ‘‘

سیّد سجاد حسین محلہ مغل پورہ پٹنہ سیٹی کے رہنے والے تھے۔ بڑے خوش مزاج، خوش خلق اور دوست پرست آدمی تھے۔ ایک حد تک فارغ البال بھی تھے۔ اس وقت شعر و شاعری کا چلن اور چرچہ ہر جگہ عام تھا۔ یہ تھے بھی یار باش۔ ہر صحبت اور ہر مجلس میں ان کی پذیرائی ہوتی۔ سخن فہم بھی تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

سیّد سجاد حسین نے نواب نصیر حسین خیالؔ کے تعاون سے ایک ماہنامہ ’’ادیب‘‘ پٹنہ میں جاری کیا۔ مقصد یہ تھا کہ مغربی فکر و ادب سے مشرقی ادب کی آبیاری کی جائے۔ بڑی حد تک نواب نصیر حسین خیالؔ کے ان مضامین میں جو ’’ادیب‘‘ میں نکلتے رہے اس کی نشان دہی ملتی ہے۔ سجاد حسین کی طرز نگارش بھی بڑی دل کش و دل چسپ تھی۔ افسوس ہے ’’ادیب‘‘ کے ماہنامے اب نہیں ملتے جن سے کچھ اقتباسات لے کر پیش کیے جائیں۔ نصیر حسین خیالؔ تو ہندوستان کے چوٹی کے انشاء پردازوں اور نثرنگاروں میں اپنی جگہ بنا گئے۔ مگر غریب سیّد سجاد حسین کے جاننے والے بھی اب نہیں ملتے۔ ان کی کوئی تصنیف بھی منظر عام پر نہ آسکی۔ ان کی ایک تصنیف ’’محل خانہ‘‘ کا تذکرہ بار بار یہاں کے ادیبوں اور نثر نگاروں کی زبان پر آتا ہے۔ مگر یہ تذکرہ بھی ایک سنا ہوا فسانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ نے فسانۂ آزاد، سیر کہسار اور جامِ سرشارؔ لکھ کر جو لکھنؤ کی بیگماتی زبان اور وہاں کا ماحول پیش کیا۔ اس سے متاثر ہو کر سیّد افضل الدین احمد نے ’فسانۂ خورشیدی‘ لکھا۔ یہ کتاب چھپی بھی اور اپنے وقت میں مقبول بھی ہوئی۔ اس طرح پٹنہ میں سیّد سجاد حسین مرحوم نے ’’محل خانہ‘‘ ایک کتاب لکھی جس میں لکھنؤ کی بیگماتوں کی زبان کا پُر لطف چٹخارہ بھی ہے اور صحیح محاورے بھی ہیں۔ یہ کتاب بھی لکھنؤ کے محل خانوں کی زبان اور طرز رہائش کی عکاسی کرتی ہے۔ جنھوں نے یہ کتاب دیکھی ہے ان کا بیان ہے کہ جو بیگماتی زبان اور محل

خانوں کا اندرونی ماحول پنڈت رتن ناتھ سرشار نے لکھا ہے اس میں جو زبان کی اکثر غلطیاں اور ماحول کا مرقع نظر آتا ہے۔ اس کی جگہ پر یہی کتاب "محل خانہ" [ا] صحیح بیگماتی زبان کا خزانہ ہے اور اس کے ماحول کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ نہ جانے کن مواقع کی بناء پر یہ کتاب سجاد حسین مرحوم کی زندگی میں نہ چھپ سکی۔ ان کا انتقال ہوا تو گھر میں صرف اپنی بیوی کو چھوڑ گئے۔ کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی غریب بیوہ اس کتاب کو برسوں سینے سے لگائے رہیں۔ کتاب کے شائقین آتے تو پڑھنے کو یہ کتاب کسی کو مشکل سے دیتی تھیں۔ شرط یہ لگا رکھی تھی کہ پڑھو تو یہیں آکر پڑھو اور واپس مجھ ہی کو دے جاؤ۔ کبھی کتاب کی طباعت کی بات نکلتی تو کچھ حضرات اس کا وعدہ بھی کر لیتے۔ بہر حال کل وعدے ہی نکلتے گئے۔ معلوم ہوا ان کی بیوی کے آخری زمانے میں سجاد حسین صاحب کے عزیز دوست نے یہ کتاب ان کی بیوی سے مانگی اور لے کر چمپت ہو گئے۔ جب دو ایک ادبی ادارے کے اراکین کتاب "محل خانہ" کو چھپوانے کے لئے ان کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب اب ان کے پاس نہیں بے چاری بوڑھی بیوہ آہ داد بلا کر کے رہ گئیں۔ خدا جانے دھوکہ دے کر کتاب لے جانے والے حضرت نے اس کتاب کا کیا حشر کیا۔ اس کا پتہ برسوں بعد آج بھی نہ چل سکا۔ اس طرح اردو ادب کا ایک شاہکار شائقین کی نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔[ا]

(ا۔ کتاب "محل خانہ" بہار اردو اکاڈمی نے شائع کر دی ہے اس کی کاپیاں دستیاب ہیں۔ ادارہ)

پٹنہ میں شعر و شاعری کی بہار

پٹنہ میں حضرت شاہ رکن الدین عشقؔ، راسخؔ، محمد باقر حزیںؔ، جوششؔ، راجہ رام نرائن موزوںؔ، حضرت شاہ نورالحق تپاںؔ، اشرف خاں فغاںؔ، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشقؔ اور راجہ اجاگر سنگھ الفت کا دور پہلے گزر چکا تھا مگر ان کی بچھائی ہوئی بساطِ شعر و سخن کی رونق ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ یہی زمانہ تھا کہ یکایک سارے ملک میں ایک خونی طوفان اٹھا۔ ملک میں امن و سکون کی فضا درہم برہم ہوئی۔ لاکھوں بسے گھر

ویران ہو گئے ۔ سجی سجائی محفلیں اجڑ گئیں، اہل ثروت کے ساتھ کتنے کاملینِ فن بھی تلوار کے گھاٹ اتر گئے اور کتنے جلاوطن ہوئے ۔ ۱۸۵۷ء کے اس خونی طوفان کا اثر جب رفتہ رفتہ کم ہوا تو اس کے کچھ دنوں بعد پٹنہ والوں نے بھی سکون کی سانس لی اور یہاں کی بکھری ہوئی ادبی صحبتیں پھر سے جمنے لگیں۔

یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ تھا، اس وقت یہاں نواب جعفر حسن خاں فیض کی ذات شعراء کے لئے منبعِ فیض بنی ہوئی تھی ۔ بڑے کامل فن شاعر تھے مگر کوئی خصوصی حلقہ شاگردوں کا انہوں نے قائم نہیں کیا تھا۔ البتہ اس وقت اصلاح دینے والے استادوں میں وزیر علی عبرتیؔ اور شاہ الفت حسین فریادؔ بہت مشہور تھے ۔ وزیر علی عبرتیؔ کے شاگردوں میں نواب محمد علی خاں حیرتی، نواب محمد حسین خاں ہجرتیؔ، سید امیر جاں فرقتیؔ، منشی ہر یہر ناتھ محنتیؔ اور نواب بادشاہ نواب عشرتیؔ تھے ۔ شاہ الفت حسین فریادؔ کے بھی بہت سے شاگرد تھے مگر سب میں بلند پایہ شاگرد سید علی محمد شادؔ عظیم آبادی تھے ۔ جنہوں نے استاد کا نام ملک بھر میں اونچا کیا۔ سید شاہ محمد سعید حسرت کا نام بھی پرانے استادوں میں مشہور تھا۔ ان کی علمی عظمت اور صلاحیت سبھوں پر بالا تھی اور شاعری میں استادانِ فن بھی ان کے یہاں آکر ان سے اپنے شعروں کی صحت کی سند لیتے تھے۔

لکھنو کی طرح پٹنہ میں بھی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے حسن بیان اور ان کی ندرت خیال نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ غالبؔ کا انداز فکر بھی اب جگہ جگہ مقبول ہونے لگا تھا۔ غرض کہ دلی اور لکھنو کے ساتھ یہاں کی شاعری بھی نئی کروٹ لینے لگی تھی، زمانہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پرانے استاد اٹھے جا رہے تھے اور ان کی جگہ پر ان کے شاگرد اب فضائے شاعری پر چمکنے لگے تھے ۔ مستقبل طور پر باہر سے آنے والے اور یہاں کی بزمِ سخن کو رونق دینے والے بہت سے شعرائے کرام تھے ۔ ان باہر سے آنے والے دو چار استادوں کے حلقہ ھائے تلامذہ بھی یہاں قائم ہو گئے

تھے۔ ایسے ممتاز شاعروں میں وحید الہ آبادی، سخی دہلوی، مرزا نادر شوخی، ماہر لکھنوی، شمشاد لکھنوی اور حکیم آغا حسن ازل لکھنوی تھے۔ مرزا شاغل دہلوی اور حفیظ جونپوری نے تو بہت دنوں تک پٹنہ ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ خواجہ فخر الدین حسن سخن شاگرد غالب یہیں شادی بیاہ کر کے مستقلا آباد ہو گئے تھے۔

دہلی کے مکتبہ شاعری کی چھاپ تو بہت پہلے سے پٹنہ کی شاعری پر تھی مگر اب لکھنو کی خصوصیات اور روایات شاعری کی بھی نمائندگی لکھنو سے آنے والے شعرائے کرام اور مرزا دبیر اور ان کے صاحبزادے مرزا اوج کر رہے تھے۔ میر انیس کے خاندان کا اپنا مکتبہ شاعری سب سے الگ دلی اور لکھنو کے مکاتب شاعری پر مشتمل تھا۔ جس کی نمائندگی ان کے خاندان کے افراد سے پٹنہ میں ہوتی تھی۔ یہ سب تھا مگر پٹنہ کی شاعری کا مزاج کچھ ایسا تھا کہ اس میں اس کی اپنی انفرادیت برابر نمایاں رہتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ پٹنہ کے مکتب شاعری نے دلی اور لکھنو کے مقابلہ میں اپنی جداگانہ حیثیت قائم کر رکھی تھی۔

باہر سے آنے والے کچھ استاداں فن سخن گوئی نے اپنے شاگردوں کے جو حلقے قائم تھے ان میں سب سے بڑا حلقہ وحید الہ آبادی کے شاگردوں کا تھا جس میں شاہ مبارک حسین مبارک، شاہ محمد اکبر داناپوری اور میر محمد باقر صاحب باقر ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ سخی دہلوی کا بھی ایک چھوٹا سا حلقہ تھا جس میں شاہ نور الرحمٰن نور عرف شاہ لال صاحب نمایاں تھے۔ مرزا نادر شوخی کے حلقہ تلامذہ میں مولوی صنعت اللہ صنعت عظیم آبادی اور عشرت گیاوی تھے شمشاد لکھنوی کے شاگردوں میں زیادہ تعداد گیا کے شاعروں کی تھی۔ حکیم آغا حسن ازل لکھنوی جو وزیر علی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ان کے شاگردوں میں بشارت کریم اختر بہاری دنیائے شاعری میں اچھے مشہور ہوئے۔ مائل لکھنوی کے شاگردوں کا حلقہ پٹنہ میں محلہ مغل پورہ اور محلہ گزری کے دولت مند اصحاب پر زیادہ مشتمل تھا جن میں منجھلے نواب صاحب غنیمت تھے۔

نواب جعفر حسن خاں فیض، وزیر علی عبرتؔ اور شاہ الفت حسین فریادؔ کے اٹھ جانے کے بعد پٹنہ میں شعراء کے نئے مختلف حلقے بہت سے قائم ہوئے۔ ان میں دو حلقے کافی ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ایک تو حضرت صغیر بلگرامی کا حلقہ تلامذہ تھا جو پہلے سے قائم تھا اور اس کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ اس میں نواب سلطان مرزا سلطانؔ صغیر بلگرامی کے چہیتے شاگردوں میں تھے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ سلطان صاحب بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ دوسرا حلقہ بعد میں قائم ہوا یہ حضرت شادؔ عظیم آبادی کے شاگردوں کا حلقہ تھا۔ انہیں دنوں حضرت صغیر بلگرامی نے اس کا دعوی کر دیا کہ شادؔ عظیم آبادی انکے شاگرد ھیں۔ حضرت صغیر بلگرامی کے اس دعوے کا اثر حضرت شاد عظیم آبادی کے حلقہ تلامذہ پر پڑا تھا اس لئے اس دعوے کی پرزور تردید حضرت شادؔ کی طرف سے ہوئی۔ یہ جھگڑا بہت دنوں تک چلتا رہا۔ اگرچہ حضرت صغیر بلگرامی کے دعوے میں ذرہ برابر بھی جان نہیں تھی۔ ادھر حضرت شادؔ کی شاعری بھی شباب پر تھی اور ان کی شاعری نے استادانہ رنگ بھی اختیار کرلیا تھا اس لئے ان کا حلقہ تلامذہ بڑھتا ہی گیا جس میں ہندو اور مسلمان شاعروں کی تعداد ترقی کرتی گئی۔

انہیں دنوں حضرت داغؔ دہلوی کی شاعری کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا انداز بیان، ان کی معاملہ بندی اور ان کی زبان کا چٹخارا عوام و خواص دونوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ پٹنہ کے اکثر نوجوان شاعروں کو ان کا رنگ بہت پسند آیا اور بہت سے حضرات خط و کتابت کے ذریعہ حضرت داغؔ کے شاگرد ہوتے گئے۔ یہاں مبارک حسین مبارکؔ، مسٹر نصیر الدین نصیرؔ اور مولوی نظام الدین بلخیؔ داغؔ کے شاگردوں میں خوب چمکے۔

ان سب حلقوں سے زیادہ ممتاز اور ذی اثر وہ ادبی حلقہ تھا جس کے روح رواں علامہ حکیم عبد الحمید پریشاںؔ تھے۔ حکیم صاحب دیگر علوم و فنون پر بھی عبور رکھنے کے علاوہ اردو فارسی اور عربی کے گراں قدر شاعر بھی تھے۔ یہ حلقہ ادب استادی

اور شاگردی کی بناء پر قائم نہیں تھا۔ بلکہ مصلحانِ فن اور ناقدانِ ادب و شعر کا یہ حلقہ تھا جس میں ہر فرد علوم متداولہ کا ماہر اور شعر و ادب میں مستند استاد کی حیثیت رکھتا تھا ۔اس حلقہ کی رونق حافظ فضل حق آزادؔ ، مولانا عبد الغفور شہباز ، مولانا عبد الغنی وارثی ، نواب سید محمد آزاد ، مولانا شوق نیموی ، خاں بہادر خدا بخش خاں' جمیلؔ ، مولانا سید رحیم الدین حسرتؔ ایڈیٹر الپنچ ، منشی عابد حسین عابدؔ ، شمس العلماء محمد یوسف رنجورؔ اور میرے والد مرحوم سیّد ضمیر الدین احمد کے دم سے تھی اس ادبی حلقہ کی غرض و غائت زبان کی اصلاح ، خیال و فکر میں تنوع اور نئے انداز سے شعر و ادب میں نئی روح پھونکنا تھی۔ سچ تو یہاں کے شعر و ادب کے نشاۃِ ثانیہ کی ابتداء اسی حلقے سے ہوئی۔

پٹنہ میں اس وقت بھی شعر گو پردہ نشیں خواتین موجود تھیں۔ مشاعروں میں اگرچہ ان کی شرکت نہیں ہو سکتی تھی مگر ان کے اشعار صاحبانِ ذوق تک پہونچ جاتے تھے ۔ شعر کہنے والی طوائفیں بھی تھیں۔ جو یہاں کے استادوں سے اصلاحیں لیتیں ، اپنے مشاقوں کے جھرمٹ میں مشاعرے کرتیں ، اور محفلوں میں اپنی غزلیں لہک لہک کر گاتیں ، پردہ نشیں خواتین شاعرات میں رضیہ خاتون جمیلہؔ کا درجہ بہت اونچا تھا۔ یہ خاں بہادر خدا بخش خاں جمیلؔ کی اہلیہ تھیں۔ دوسری پردہ نشیں خاتون جمالؔ تخلص کرتی تھیں۔ یہ محلہ کیواں شکوہ کی رہنے والی تھیں۔ تیسری امیر النساء نام غریبؔ تخلص تھا۔ طوائفوں میں زہرہ بائی ، بندی جان تخلص نازؔ اور صاحب جان ان کا معشوق تھا۔ شاعرات میں اس وقت اور بھی تھیں۔ طوالت کے خوف سے ان کا تذکرہ چھوڑ رہا ہوں۔

پٹنہ کے مشاعرے

آج جس ماحول میں اور جس طرح مشاعرے ہوتے ہیں، وہ طریقہ اور شکل پٹنہ کے گذرے دنوں کے مشاعروں کی نہ تھی۔ اس دور میں مشاعرے پٹنہ میں دو طرح پر ہوتے تھے۔ ایک تو کسی مخصوص حلقہ کا مشاعرہ جو مختلف جگہوں میں آئے دن ہوتا رہتا تھا جس میں اس حلقہ کے استاد سے متعلق اسی حلقہ کے شعراء طرحی غزلیں

اور نظمیں پڑھتے تھے۔ ایسے مشاعروں میں بالعموم باہر کے شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا۔ دوسری طرح پر جو مشاعرہ ہوتا تھا، وہ عام مشاعرہ ہوتا تھا۔ پٹنہ کے کسی صاحب لیاقت استاد سخن یا ذی وجاہت قدرداں سخن کی طرف سے منعقد کیا جاتا تھا۔ ایسے مشاعرہ میں اچھے خاصے اخراجات اٹھتے تھے۔ کیونکہ اس میں شہر کے تمام شعراء کو اور باہر کے شعراء مدعو کئے جاتے تھے۔ باہر کے شعراء کے لئے خاصا مہمان داری کا اہتمام کیا جاتا تھا، یہ مشاعرہ آٹھ بجے شب میں منعقد ہوتا اور رات بھر چلتا رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ صبح کی پہلی جھلک کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے ملتوی ہو کر پھر دس بجے دن سے شام تک جاری رہتا۔ ایسا ہونا شعراء کی تعداد پر منحصر ہوتا تھا۔ جس جگہ یہ مشاعرہ منعقد کیا جاتا وہ جگہ ایک خاصی بڑی تقریب کی جگہ بن جاتی۔ مکان کی خوب صفائی کی جاتی، شعراء کے بیٹھنے کے لئے کشادہ صحن میں بڑا شامیانہ لگایا جاتا جس کو ہر طرف سے قناتوں سے گھیر دیتے، شامیانے کے اندر صاف شفاف چاندنی کے فرش، کہیں قالینوں کے فرش ہوتے، اگر صرف چاندنی کے فرش ہوتے تو ان کے چاروں طرف کنارے کنارے لانبی لانبی قالینیں بچھاتے، ان پر لگاتار سفید براق گاؤ تکئے لگے رہتے، شامیانے سے آویزاں شیشے کے رنگ برنگے جھاڑوں اور قندیلوں میں موم بتیاں چڑھا دی جاتیں، جن کی روشنی میں شامیانے کا پنڈال دمکتا رہتا، پنڈال کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت کنول کا شمعدان بھی روشن کر کے رکھ دیا جاتا۔ صاحب مشاعرہ چشم براہ شامیانے کے دروازے پر کھڑا آنے والوں کا استقبال کرتا۔ ہر ٹولی کے استاد اپنے شاگردوں کا حلقہ بنا کر بیٹھتے۔ اہالیان مشاعرہ کے آگے چاندی یا شیشے کے بڑے طشتوں میں پان کی گلوریاں سفید صافیوں سے ڈھکی ہوئی رکھ دی جاتیں، دوسرے طشت میں چکنی ڈلیاں، الائچیاں اور قوام کی شیشیاں رکھی ہوتیں، جگہ جگہ فتح پیچ اور پیچوان لگا دیئے جاتے جن کی چلموں کا مشکبار دُھواں شائقین کو اپنی طرف متوجہ کئے رہتا۔ اگر گرمی کے دن ہوتے تو مشاعرے کے درمیان تھوڑی دیر پر برف میں ٹھنڈے کئے ہوئے طرح طرح کے

شربتوں کا دور چلتا رہتا۔ اگر سردی کا موسم ہوتا تو گرم گرم چائے کی پیالیاں رہ رہ کر سارے پنڈال میں گردش کرتی رہتیں۔ مشاعرے کا آغاز صاحب مشاعرہ اپنی طرح غزل سے کرتا۔ مصرعہ طرح مشاعرے کے ایک مہینہ قبل ہی تمام شعراء کو دعوت ناموں کے ساتھ بھیج دیا جاتا تھا۔ صاحب مشاعرہ کے پڑھنے کے بعد نومشق شاعروں کی باری آتی، پھر پختہ کار شعراء اپنی اپنی غزلیں سُناتے۔

پڑھنے والوں کی علی الترتیب فہرست صاحب مشاعرہ تیار کر لیتا تھا۔ نام پکارنے کا رواج نہ تھا۔ اس لئے فہرست کی مطابقت سے پڑھنے کے لئے صاحب مشاعرہ یا اس کی ایما پر کوئی دوسرا آدمی بیچ بیچ میں رکھی ہوئی شمع کو اٹھا کر پڑھنے والے کے سامنے لے جاتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ شمع حاضر ہے غزل عنایت ہو۔ اسی طرح یہ شمع ساری محفل میں ہر پڑھنے والے کے سامنے گھومتی رہتی جو استاد ہوتے وہ آخر میں اپنی غزلیں پڑھتے۔ یہیں پر صاحب مشاعرہ کو اکثر دقت بھی پیش آتی کہ وہ استادوں میں سے پہلے کس کے آگے شمع لے جائے۔ ہر استاد یہ چاہتا کہ وہی سب سے آخر میں اپنی غزل پڑھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی تنک مزاج استاد سب سے پیچھے نہیں پڑھوائے جانے پر خفا ہو کر بغیر پڑھے مشاعرے سے اٹھ جاتا۔ مگر جو سنجیدہ استاد ہوتے وہ آگے پیچھے پڑھنے کا خیال نہیں کرتے۔ مشاعروں میں اکثر شعر کے پردوں میں آپس کی چوٹیں بھی چلتیں۔ کبھی شعر پر، کبھی مضمون کی بندش پر، کبھی لفظ کی صحت پر، اعتراضات بھی ہوتے مگر بڑے قاعدے کے ساتھ۔ اعتراض کرنے والا یوں کہتا۔ "حضرت پھر تو پڑھئے۔" اس پر پڑھنے والا بھی چونک پڑتا اور دوسرے سنبھل کر بیٹھتے۔ عام طور پر شعروں پر خوب واہ واہ ہوتی۔ مگر اچھے شعروں پر استادوں کی صرف گردنیں ہل جاتیں۔ اگر ان کے منہ سے کبھی واہ نکل جاتی تو یہ شعر کی عام پسندیدگی کی سند سمجھی جاتی۔ کچھ عروضی شاعر ایسے بھی ہوتے جو مشاعرے میں بیٹھے بیٹھے ہر شعر کا صرف طول و عرض ہی ناپا کرتے۔

اس وقت کے شعراء اور صاحب ذوق حضرات کی فہرست اٹھا کر دیکھئے تو ہندو اور مسلمان دونوں کی تعداد برابر نظر آئے گی۔ اور آئے دن جو مشاعرے ہوتے رہتے ان کے بانی بھی کبھی ہندو ہوتے اور کبھی مسلمان ہوتے۔ آج اگر مہاراجہ جے گوپال سنگھ ثاقبؔ کے یہاں مشاعرہ ہے تو اس کے دوسرے دن نواب محمد علی خاںؔ حیرتی کے یہاں محفل سخن گرم نظر آرہی ہے۔ شاہ مبارکؔ حسین مبارکؔ، نواب ہادی علی خاں فائزؔ، نواب محمد حسین خاں ہجرتیؔ اگر بزم مشاعرہ سجاتے تو کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ، راجہ گنگا پرشاد بدرؔ اور رائے درگا پرشاد شادؔ بھی اپنے یہاں مشاعروں میں کچھ کم اولوالعزمی نہیں دکھاتے۔ ان لوگوں کے علاوہ دوسرے ہندو اور مسلمان روسائے شہر، تجار اور وکلاء بھی مشاعروں کے دلدادہ اور شعر و شاعری کے رسیا تھے جن کے سبب سے پٹنہ کی گنگا جمنی شعر و سخن کی محفل دور دور تک ملک میں مشہور تھی۔

کنور سکھ راج بہادر کے یہاں ایک مشاعرہ

اس زمانے میں کنور سکھ راج بہادر رحمتیؔ کے یہاں کے مشاعرے سب سے زیادہ مشہور تھے، یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد پٹنہ کی بکھری ہوئی ادبی انجمنوں کو پھر سے سجانے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ آج جہاں کنور سکھ راج بہادر رحمتیؔ کا نام آتا ہے وہاں انکی رئیسانہ داد و دہش، علم پروری اور ان کی زندگی کے شاعرانہ رنگین ماحول کی یاد بھی ساتھ ہی ساتھ لاتا ہے۔ یہ راجہ پیارے لال الفتیؔ کے پوتے تھے۔ راجہ پیارے لال الفتیؔ اپنے علم و دانش کے علاوہ شعر و شاعری میں بھی کافی مشہور تھے۔ یہ شاعر بھی تھے اور شعراء اور صاحبان علم کے سرپرست و قدرداں بھی تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد سلطنت میں متفرق معزز عہدوں پر دلّی میں فائز رہے۔ آخر عمر میں جب حکومت کی ہوا بگڑتی ہوئی دیکھی تو دلّی سے پٹنہ چلے آئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو گئے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۰ (ہجری) میں ہوا۔ فارسی میں بھی ان کا چھپا ہوا دیوان موجود ہے مگر فارسی میں ان کی مثنوی "نیرنگ تقدیر" سب سے مقبول و

مشہور ہوئی۔ افسوس ہے کہ اس مثنوی کے نسخے اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے ہیں۔ کنور راج بہادر رحمتؔی نے اپنے دادا کا فارسی دیوان اور یہ مثنوی بھی چھپوائی تھی۔ راجہ پیارے لال الفتؔی کے بیٹے کنور ہیرالال بھی شاعر تھے اور ضمیرؔ تخلص کرتے تھے۔ اس طرح دیکھئے تو کنور سکھ راج بہادر رحمتؔی کو شاعری باپ دادا دونوں سے ترکہ میں ملی تھی۔

کنور سکھ راج بہادر رحمتی کے یہاں ہر مہینے عام مشاعرہ ہوتا۔ باہر کے شعراء بھی مدعو ہوتے اور پٹنہ کے بھی سب شعراء شریک رہتے۔ ان مشاعروں میں ہندو اور مسلمان شعراء کی سخن سنجی نئے نئے گل بوٹے کھلاتی تھی۔ یہاں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں غزلیں پڑھی جاتیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں اردو اور فارسی میں غزلیں پڑھتے اور مل کر داد سخن دیتے۔ کنور سکھ راج بہادر رحمتؔی اپنے یہاں کے ماہانہ مشاعروں میں بہتر سے نوجوان شاعر پروان چڑھے۔ حضرت علی محمد شادؔ عظیم آبادی کی اوائل شاعری انہیں مشاعروں میں پھلی پھولی۔

اگست ۱۸۷۸ء میں کنور سکھ راج بہادر نے حسب معمول اپنے یہاں کے ایک ماہانہ مشاعرہ کے دعوت نامے مصرعہ طرح کے ساتھ ہر جگہ شعراء کے نام بھیجے۔ حضرت داغؔ دہلوی خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے اور انہوں نے مشاعرے میں شرکت کی دعوت قبول بھی کر لی تھی، کنور سکھراج بہادر طبعاً، نسبتاً اور وراثتاً ہر طرح پر شاعر تھے۔ ان کی اولوالعزمی کا کیا کہنا اس دفعہ مشاعرے میں اہتمام بھی کچھ زیادہ کیا گیا تھا۔ آپ اس مشاعرے کا کچھ حال منشی عبدالحق انجم کی لکھی ہوئی روداد سے ملاحظہ فرمائیں جس کا تھوڑا سا اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ منشی عبدالحق انجم مرزا رجب علی بیگ سرورؔ لکھنوی مصنف "فسانہ عجائب" کے شاگرد تھے اور محلہ سلطان گنج کے رہنے والے تھے۔ دیکھئے اسلوب بیان اور عبارت آرائی میں انہوں نے اپنے استاد کا حق کس قدر ادا کیا ہے "۲۴ اگست ۱۸۷۸ء کو حسب معمول مشاعرہ اور شاعران مشرق و نازک خیالان مغرب کا ہجوم واژدہام ہوا۔ اس ہیچمدان پنبہ دہن کفش بردار ارباب سخن کے نام نامہ

آیا، قاصد فرخندہ قدم فٹن سواری کو ساتھ لایا، بعد آٹھ بجے سوار ہوا اور پہنچا دیکھا کہ قدم قدم پر دورویہ جھاڑ قد آدم کھڑے ہیں۔ گلاس سرخ و سبز چار سمت جڑے ہیں۔ سبحان اللہ! اس مکان رشکِ خیال کا کیا کہنا کہ جس کی صورت ظاہری کا یہ حال ہو کہ یک نظر دیکھنے سے باطن کا دفع ملال ہو، اس کے اندر کی توصیف تو بیرون از تحریر ہے دبری از تقریر۔ ادھر قدم اٹھایا ادھر سراپائے خلد بریں نے مرقع چشم میں نقشہ جمایا۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی "کا مضمون مد نظر ہوا۔ دیوار گیری کی بیٹھک اگر شاہ چین یا خازن علییّن کو نظر آئے، کنول دل ہو جائے، گھڑی ہر جگہ اپنے قرینے سے جڑی، جس گھڑی انسان پاس جائے پیروں کھڑا رہ جائے، ایک پل چھوڑنے کو جی نہ چاہے ایسا محو ہو جائے، آئینے خوش آئین اس درجہ سجل کہ دیدہ اسکندر حیران و خجل، صفامین مقابل دل صاحب دل، یہ سامان دیکھ کر یہ شعر پڑھتا ہوا اندر آیا۔

چناں صفائے عمارت کہ در تماشائش ۔ بدیدہ باز نہ گردد نگاہ از دیوار !

دیکھا کہ ہر شاعر نام دار ورئیس شہر باوقار مسند مغرق پر جلوہ گر ہے۔ چکنی ڈلی و الائچی ہر ایک کے پیش نظر ہے۔"

مشاعرہ بڑا شاندار رہا اور اس میں حضرت داغ کی شرکت بھی یقینی سمجھی جاتی تھی مگر عین وقت پر ان کا معذرت نامہ آیا اور انہوں نے کسی ضروری کام کے بناء پر نہ آنے کی معافی چاہی۔ پھر بھی انہوں نے اپنی دو غزل طرح میں مرزا شاغل دہلوی کے پاس بھیج دی تھی جو مشاعرے میں پڑھی گئی۔ حضرت داغ کی بھی غزل کا مطلع اور ان کا ایک شعر اس جگہ درج کرتا ہوں۔

اللہ رے تلون ابھی کیا تھے ابھی کیا ہو ۔ شوخی ہو تو شوخی ہو حیا ہو تو حیا ہو
بدلوں نہ کبھی اور حسینوں کی ادا ہے ۔ وہ کینہ بھی اچھا جو ترے دل میں رہا ہو

مرزا شاغلؔ دہلوی داغؔ دہلوی کے شاگرد بھی اور سوتیلے بھائی بھی تھے۔ ان کا بھی ایک شعر سن لیجئے۔

کچھ یاس سے تسکین دلِ مضطر کو ہوئی تھی!
پھر چھیڑ دیا ہائے تمنا کا برا ہو!!

یہ مشاعرہ حسب قاعدہ کنور سکھ راج بہادر رحمتیؔ بانی مشاعرہ کی غزل سے شروع ہوا ان کا یہ مطلع اچھا تھا۔

جب سلسلہ جنباں یہ تری زلف رسا ہو　　عاشق ترا کس طرح نہ زنجیر بپا ہو

منشی کملا پرشاد عاجزؔ نے اپنے رنگ میں یہ شعر بھی خوب کہا ہے۔

ہم عشقِ بتاں چھوڑ تو دیں حضرت ناصح　　پر عمر بسر کرنے کی صورت کہو کیا ہو

اس وقت منشی اننت رام الفت پٹنہ کے اچھے شاعروں میں تھے۔ ان کا ایک شعر اور ان کا مقطع حاضر ہے۔

لازم نہیں یوں غیر سے تفریح کی باتیں　　بڑھ جائے ہنسی میں جو کوئی بات تو کیا ہو
الفتؔ جو وہ بت ہو گیا ہے غیر کا مانوس　　جانے دو اسے تم بھی کسی غیر کو چاہو

اس مشاعرے میں استادوں نے دو غزل کہی تھیں پڑھنے والے بہت تھے۔ تذکرہ مختصر کرتا ہوں۔ حضرت وحید الہ آبادی کا ایک مطلع اچھا تھا وہ سن لیجئے۔

سن کر جسے بے چین وہ بانی جفا ہو　　ایسا تو پھڑکتا ہوا مضمون وفا ہو

حضرت شادؔ عظیم آبادی کا بھی یادگارِ مشاعرہ شعر خوب ہے۔

حالت وہ ردی دیکھ کے کہتے ہیں ہماری
اے شادؔ مرے سر کی قسم ہم کو نہ چاہو

حضرت داغؔ دہلوی پٹنہ آتے ہیں

ان ہی دنوں حضرت داغ دہلوی کی غزل سرائی کی ملک میں دھوم تھی ۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ ان کی زبان کی رعنائی نے جو رنگ برنگ کے پھول کھلائے اور ان کی شگفتہ مزاجی نے غزل کی زمینوں میں جس انداز سے طرح طرح کے گل بوٹے اگائے ان سے اردو کی گلستاں شاعری میں نئی بہاریں آئیں ۔ اپنے شعروں میں معاملہ بندی سے وہ مرقع پیش کر دکھایا کہ حسن و عشق لگاوٹ کے پردوں میں ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرتے نظر آنے لگے ۔ بچپن سے قلعہ معلیٰ کی پاک دھلی ہوئی زبان میں ان کی شاعری پروان چڑھتی گئی اور غالبؔ و ذوقؔ و مومنؔ کے سائے میں پھلتی پھولتی رہی ، اس لئے ان کی زبان کی حلاوت ، محاوروں کی لطافت اور خیالات کی شگفتگی و نزاکت کا کیا کہنا ۔ محاوروں کے دامن میں طویل سے طویل عرض مدعا کو سمیٹ کر بڑے حسن کے ساتھ دو لفظوں میں پیش کردیتے اور زندگی کے گوناگوں مسائل کو بھی کبھی اپنے اشعار میں اس طرح حل کرکے سنا دیتے ، کہ فلسفی اور صوفی بھی حیران و ششدر رہ جاتے ۔ ہندوستان کے ہر حصہ میں ایک بڑی تعداد ان کی شاعری کی گرویدہ ہو رہی تھی ۔ بڑے بڑے شہروں میں جہاں بھی تزک و احتشام کے مشاعرے ہوتے تو ان سے بہ منت شرکت کی درخواست کی جاتی اور یہ ہر بلاوے پر کچھ نہ کچھ عذر کرکے مشاعروں کی شرکت ٹال دیتے ۔ پٹنہ والوں کے دلوں میں بھی بڑی لگن تھی ، کہ اس تاجدار غزل کو قریب سے دیکھیں اور خود ان کی زبان سے ان کی غزلوں کو سن کر لطف سخن اٹھائیں ۔ یہاں کے مشاعروں میں اور خاص کرکے کنور سکھ راج بہادر رحمتؔ کے کئی مشاعروں میں ان کو خصوصی دعوت نامے بھیجے گئے ، مگر حسب معمول جواب میں ہر مرتبہ ان کا عذر نامہ ہی آتا گیا ۔ یہ تو خدا بھلا کرے حضرت داغ کی حسن پرست اور عشق پسند طبیعت کا کہ بالآخر پٹنہ والوں کی دلی تمنا ۱۸۸۲ء میں بر آئی ۔ منّی بائی حجابؔ کے عشق کی کشش جب حضرت داغؔ کو رام پور سے

کلکتہ لے چلی تو ہر جگہ کے لوگوں سے جو آنے کے وعدے کر رکھے تھے وہ بھی یاد آئے۔ پہلے دلی گئے جہاں محبت بھری گود میں ان کے بچپن نے کروٹ لی تھی اور جس کے رنگین ماحول میں ان کی جوانی کا رنگ روپ نکھرا تھا۔ لال قلعہ کو دیکھا تو سینہ پر ایک تیر سا لگا۔ شہر کا جائزہ لیا تو آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ مشتاقوں کی یہاں کمی نہ تھی مگر آنکھیں دیکھی ہوئی صورتوں کو ترس رہی تھیں۔ پرانے احباب آئے تو ان سے گھل مل کر روئے۔ جتنے دن یہاں رہے ان میں زیادہ وقت گزری ہوئی باتوں کے تذکرے میں کٹا، دعوتیں بھی ہوئیں شعر و سخن کی صحبتیں بھی جمیں مگر ان کو تو وحشت سی تھی۔ دلی کی آبادی میں بھی ان کو ویرانی نظر آتی تھی۔ آخر وہاں سے چل پڑے اور لکھنو آئے۔ یہاں لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دو چار دن یہاں ٹھہرے اب کانپور کا نمبر تھا۔ یہاں بھی دو چار دن رک کر کے الہ آباد پہونچے، احباب کے اصرار پر دو چار دن یہاں بھی قیام کیا۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو دیار جاناں کے راستے میں اب صرف پٹنہ ہی روک تھا۔ پھر یہاں کے لوگوں کی نیاز مندی بھی سامنے تھی۔ پٹنہ کو کس طرح بھولتے بیگم پور پٹنہ سیٹی اسٹیشن پر جب ان کی ریل رکی تو دونوں طرف کے پلیٹ فارم مشتاقوں سے بھرے ہوئے نظر تھے۔ لوگوں نے بڑی گرم جوشی سے خوش آمد کہا۔ خوب خوب ہار پہنائے اور ساتھ لے کر ان کو حضرت باقر کے گھر تک لائے۔ حضرت میر محمد باقرؔ عظیم آبادی جو محلہ گڑھیا کے رہنے والے تھے، ان سے حضرت داغؔ سے خط و کتابت کے ذریعہ پہلے سے مراسم قائم تھے اسی بنیاد پر حضرت داغؔ کی قیام گاہ ان ہی کے گھر چنی گئی۔ اس موقع پر سب سے بڑی بات یہ نظر آئی کہ ہر حلقہ اور مکتبہ شاعری کے شعراء مجموعی طور پر بھی اور الگ الگ بھی حضرت داغؔ کی مہمانی کے منتظر تھے اور یہ جب تک پٹنہ میں قیام پذیر رہے، سب ان کو اپنا معزز مہمان سمجھا کئے۔ حضرت داغؔ نے اپنی مثنوی "فریاد داغ" میں رام پور سے کلکتہ تک اپنے سفر کا حال بھی لکھا۔ جب یہ رام پور سے چلے تو میر قطب الدین اشکؔ ان

کے ہمراہ تھے ۔ یہ میر قطب الدین اشک حضرت داغ کے مونس ودم ساز اور محبوب شاگرد بھی تھے ۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

میرے ہمراہ میر قُطب الدین اشکؔ ریزاں بہ حالت غمگین

جب پٹنہ پہنچے تو اس کے متعلق یوں کہا۔

میر باقر کے گھر قیام ہوا خوب دعوت کا اہتمام ہوا

اپریل کے مہینے میں یہ سفر شروع ہوا تھا۔ دلّی، کانپور لکھنؤ اور الہ آباد ہوتے ہوئے جب حضرت داغؔ پٹنہ پہنچے تو مئی کا مہینہ آگیا تھا۔ دن میں لُو کی ہر طرف گرم بازاری رہتی تھی۔ رات میں گرم ہوائیں چین نہیں لینے دیتی تھیں، ان کی شکایت یوں کی ہے۔

کیا قیامت تھی شہر کی گرمی کاش گنگا میں ڈوبتی گرمی

دریائے گنگا شہر کے کنارے بہتا ہے اس پر گرمی کی یہ حالت تھی

ان کے اعزاز میں پہلا عام مشاعرہ حضرت میر باقرؔ کے گھر پر ہوا۔ پٹنہ کے سب شعراء بلا تخصیص یہاں جمع ہوئے۔ شعراء نے اپنی اپنی غزلیں پڑھیں اور عوام و خواص نے حضرت داغؔ کو غزل پڑھتے ہوئے اپنے کانوں سے سُنا۔ جو غزل حضرت داغؔ نے یہاں پڑھی وہ ہر جگہ مقبول ہوئی۔ بعد میں اس غزل پر غزل ہر جگہ لوگوں نے کہیں، حتّٰی کہ حضرت امیر مینائی نے بھی اس پر غزل کہی ان کا مقطع ہے۔

امیر اچھی غزل ہے داغؔ کی جس کا مطلع یہ ہے بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

حضرت داغ کی غزل کے دو چار شعر درج کر رہا ہوں۔ اس غزل کا مقطع تاریخی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس میں ان کے پٹنہ آنے کا ذکر بھی بڑے مزے میں آگیا ہے۔

بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
الٰہی کیوں نہیں اٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں
نگاہِ شوخ و چشم شوق میں در پردہ چھنتی ہے
کہ وہ چلمن میں ہیں نزدیک ہم چلمن کے بیٹھے ہیں
قسم دے کر انہیں سے پوچھ لو تم رنگ ڈھنگ اس کے
تمہاری بزم میں کچھ دوست بھی دشمن کے بیٹھے ہیں
یہ اٹھنا محفل میں ان کا رنگ لائے گا
قیامت بن کے اٹھیں گے بھبھوکا بن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اس مشاعرے کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر شخص کی خواہش تھی حضرت داغ میرے گھر بھی آئیں، ماحضر تناول فرمائیں اور کچھ سنیں اور سنائیں: اسی درمیان میں محلہ مغل پورہ کے چند صاحب ذوق رئیسوں نے حضرت داغ کے اعزاز میں ایک دوسرا عام مشاعرہ کیا۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ حضرت داغ کو بہ منت راضی کیا تھا کہ وہ بھی مصرعہ طرح پر ایک غزل ارشاد فرمائیں گے۔ مصرعہ طرح یہ تھا۔
"آباد کبھی خانہء زنداں نہیں دیکھا" یہ مشاعرہ بھی بڑا کامیاب رہا۔ تمام

اساتذہ اور شعراء شریک مشاعرہ تھے۔ رات بھر محفل سخن گرم رہی۔ حضرت داغ نے جو طرحی غزل پڑھی اس کے چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اس کعبۂ دل کو کبھی ویراں نہیں دیکھا — اُس بُت کو کبھی اللہ کا مہماں نہیں دیکھا

کیا ذوق ہے کیا شوق ہے سو مرتبہ دیکھوں — پھر بھی یہ کہوں جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

جب ہاتھ پڑا وصل میں شوخی سے کسی کا — پھر ہم نے گریباں کو گریباں نہیں دیکھا

کہتے ہو کہ بس دیکھ لیا ہم نے ترا دل — دل دیکھ لیا اور پھر ارماں نہیں دیکھا

کیوں پوچھتے ہو کون ہے یہ کس کی ہے شہرت
کیا تم نے کبھی داغؔ کا دیواں نہیں دیکھا

حضرت داغؔ کا قیام پٹنہ میں آٹھ دن رہا۔ ظاہر میں تو پٹنہ کی بڑھتی ہوئی خاطر تواضع سے گھبرا گئے تھے جس کو یوں مثنوی میں لکھتے ہیں۔

آٹھ دن کی جو سیر پٹنے کی یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی

مگر وجہ تو اور تھی۔ پورب سے چلنے والی ہواؤں کے جھونکے بار بار پیام یار لا رہے تھے۔ منزل مقصود اب نزدیک آگئی تھی۔ آٹھ دن جوں توں کاٹ کر وہ کلکتہ روانہ ہوئے اور یہاں پٹنہ کے لئے ان کی آمد ایک ادبی تاریخ بن گئی۔

ڈاکٹر مبارک حسین مبارکؔ عظیم آبادی اس وقت تقریباً تیرہ سال کی عمر کے تھے، انہوں نے حضرت داغ کی غزل سرائی بھی پٹنہ میں سنی تھی اور ان کا آنا بھی ان کو یاد تھا۔ وہ بڑے مزے میں حضرت داغؔ کی آمد کا حال بیان کرتے تھے۔ میں نے براہ راست یہ تذکرہ ان ہی سے سنا۔ اس وقت اپنی کمسنی کے سبب سے وہ حضرت داغؔ کے شاگردوں کے زمرے میں شامل نہ ہو سکے مگر کئی سال کے بعد شاگرد بنے اور بڑی حد تک انہوں نے اپنے استاد کے رنگ کو اپنی شاعری میں فروغ دیا۔

بادشاہ نواب صاحب کے یہاں کا ایک مشاعرہ

خدا بخشے بادشاہ نواب صاحب کو، ان کی ذات بھی پٹنہ کے لئے بڑی غنیمت تھی، جو کام کرتے بڑی اولوالعزمی کے ساتھ کرتے۔ بڑے جذباتی بھی تھے۔ جہاں اپنی عزت یا پٹنہ والوں کی عزت پر حرف آتا دیکھتے تو تلملا اٹھتے اور پھر اس کے استحفاظ میں بوروں کے منہ کھل جاتے اور اس وقت تک دم نہ لیتے جب تک معترض کے منہ سے بھی عذر خواہی کے الفاظ نہ نکلنے لگے ہوں۔ دولت کی بہتات تھی اس لئے جو کام کیا اس کی ایک مثال قائم کردی۔ اس جگہ جو واقعہ لکھ رہا ہوں اس کی ابتداء ایک شخص نامعلوم کے بھیجے ہوئے ایک پوسٹ کارڈ سے ہوئی۔ اگست کی آخری تاریخوں میں ۱۹۰۲ء کا زمانہ تھا کہ بادشاہ نواب صاحب مرحوم کے نام ایک پوسٹ کارڈ آیا۔ مرقوم تھا کہ جناب سید بادشاہ نواب صاحب تسلیم۔ سنتا ہوں کہ آپ مشاعرہ کرنے کو ہیں۔ آپ لوگ پوربی ہو کر شعر کہنا کیا جانیں۔ استادوں کی غزل دیکھ کر تک میں تک ملا دیجئے گا۔ یہ اللہ نے لکھنو و دہلی پر ختم کیا ہے۔ بھلا آپ اور یہاں کے جو اچھے شاعر ہیں، یہ طرح بھیجتا ہوں، ان میں کچھ بھی اگر موزوں کردیں تو میں اپنی ناک بدتا ہوں اور یوں تو واہیات بکنے کو سب موجود ہیں۔ کدر کی گنتی نہیں ہے۔ میں یہاں کے اچھوں کو کہتا ہوں۔ میں غریب الوطن ہوں۔ مشاعرے میں میرا جوہر دیکھئے گا مگر ان طرحوں میں اگر آپ لوگ کہیں تو حال معلوم ہو۔ فقط ۲۵ اگست ۱۹۰۲ء

(۱) قد ناپتی ہے زلفِ رسا سر سے پاؤں تک

(۲) ہمراہِ سر تار سر دوش ہوئی دھوپ

(۳) موت کا پیغام ہے اپنے لئے تاخیر صبح

(۴) پرنور صورتِ رخِ روشن ہے آفتاب

(۵) تمہارے کوچے میں میری تربت برائے نام و نشاں رہے گی

(۶) پر جھاڑتے ہیں مرغ سحر بولتے نہیں

اس پوسٹ کارڈ کو پڑھ کر بادشاہ نواب صاحب مرحوم کو کہاں تاب۔ فوراً ان ہی طرحوں کے ساتھ انہوں نے ایک عظیم الشان مشاعرے کا اعلان کر دیا۔ ہزاروں اشتہارات اور اعلانات فوراً چھپے اور ہر جگہ تقسیم ہوئے۔ مشاعرے کی تاریخ ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء رکھی۔ مشاعرے کی جگہ ان کا عالی شان مکان بادشاہ منزل قرار پائی اس کا بھی اعلان ہوا کہ مشاعرہ پانچ سات دن چلے گا۔ شہر میں بھی اور باہر بھی سینکڑوں دعوتی رقعے شعراء اور صاحبان ذوق کو بھیجے گئے۔ ان کا خلوص دیکھ کر "الپنچ" اخبار نے بھی ان کا پورا ساتھ دیا اور شہر کے معززین حضرات اور ہر طبقے کے ممتاز نمائندوں نے بھی لبیک کہی۔ پٹنہ کے ہر حلقہ کے سب شعراء کو ایک جگہ جمع کرنے کی یہ خداداد ترکیب ہاتھ آئی تھی کیونکہ اس وقت مشاعروں کی مختلف ٹولیاں ایک دوسرے پر سخت اعتراضات پھیل چکا تھا مگر اب گمنام چیلنج کرنے والے نے پٹنہ کی عزت پر حملہ کردیا تھا۔ ایسی حالت میں پٹنہ کی عزت کا سوال ذاتی وقار پر غالب آیا۔ سبھوں کو مل جل کر پٹنہ کی عزت بچانی تھی۔ ہوا بھی یہی کہ ایک دم دل کی کدورتیں دھلیں، شعراء کے مختلف حلقے ٹوٹے اور اس موقع پر سبھوں نے فراخ دلی سے صرف عظیم آباد کے شاعروں کا ایک حلقہ بنایا۔ سب سے بڑی بات یہ نظر آئی، کہ الپنچ، جو حضرت علی محمد شاد کا سب سے بڑا نکتہ چین تھا اور ان پر اعتراض کرنے والا تھا، اس نے محبت و رفاقت کا ہاتھ حضرت شاؔد کی طرف پہلے بڑھایا اور حضرت شاؔد اور ان کے حلقہ شاعری کے افراد بھی گذشتہ باتوں کو بھول کر الپنچ سے گلے آملے۔

بادشاہ نواب صاحب مرحوم خرچ کے لئے نئے موقعے ڈھونڈتے ہی رہتے تھے، یہ موقع خوب ملا۔ باہر سے آنے والوں کے لئے رہائش کا پورا سامان، کھانے پینے کی آسائشیں قیام کے لئے اچھی جگہیں، باہر سے بھی شعراء کافی تعداد میں آئے۔ علامہ حکیم عبد الحمید پریشاؔن باوجود اپنی ضعیف العمری شریک مشاعرہ ہوئے۔ اب شہر میں کس کی مجال تھی کہ مشاعرہ سے ہٹے۔ مشاعرے میں ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے

، بیرسٹر بھی ، وکیل بھی ، ڈاکٹر بھی حکیم بھی ، سرکاری ملازم بھی ، تجاّر بھی اور رئیس و زمیندار بھی ۔ ایسا نمائندہ مشاعرہ پٹنہ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ علامہ حکیم عبد الحمید پریشاںؔ ، حضرت شوقؔ نیموی ، حضرت محمد علی شاد ، حضرت حافظ فضل حق آزادؔ ، حفیظ عظیم آبادی بھی اور حفیظ جونپوری بھی میر محمد باقرؔ اور خان بہادر مولوی خدا بخش خاں وکیل المتخلص بہ جمیلؔ ، نواب شمس العلماء سید امداد امام اثرؔ ، حضرت شاہ محمد اکبر اکبرؔ داناپوری ، یہ سب تو استادوں میں تھے ۔ ان کے علاوہ سینکڑوں پٹنہ کے وہ ابھرتے ہوئے شعراء تھے جو چند دنوں کے بعد یہاں کے افق شاعری پر استاد ہو کر چمکے ۔ باہر سے حضرت احقرؔ بہاری اور حضرت شاہ امین سجادہ نشیں بہار شریف کے صاحبزادے بھی آئے ۔ گیا سے بھی شاعروں کا بڑا قافلہ مولوی سید خیرات احمد وکیل اور حضرت عشرتؔ گیاوی کے ساتھ آیا۔ اس طرح آرہ ، مظفرپور اور دوسرے شہروں سے شعراء آتے گئے ، صوبہ سے آنے والوں میں (سر) سید علی امام ، مسٹر حسن امام ، مسٹر نصیر الدین حسین نصیرؔ (جسٹس) ، سید شرف الدین ، وکیلوں میں مولوی محمد یحیی وکیل ، مولوی غلام قادر وکیل وغیرہ خان بہادر سید فضل امام ، سرفراز حسین خان ، میرے والد خان بہادر سید ضمیر الدین احمد ، مولوی سید عبد المجید ، سید ابراہیم حسین ، میر یوسف حسین اور مولوی سید عابد حسین ، تاجروں میں منت خاں صاحب سب سے آگے آگے اور ان کے ساتھ لکھی میاں تاجر بھی تھے ۔ حضرت عبد الغفور شہبازؔ اس وقت غالباً اورنگ آباد کالج دکن میں پروفیسر تھے ۔ انہوں نے ہر طرح میں اپنی غزلیں اس مشاعرے کے موقع پر بھیج دی تھیں جو مشاعرے میں پڑھی گئیں: ۔

مشاعرے کے دن گزری کے بازاروں اور وہاں کی دوکانوں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ لوگوں نے دکانوں کو بھی سجایا تھا۔ دوکانوں میں کہیں جھاڑ اور کونڈیاں بھی تھیں ، جہاں پر عظیم آباد کے شہر پناہ پچھمی پھاٹک کی یادگار کا ستون ابھی تک کھڑا ہے وہاں سے لے کر باوٗلی ہال کی طرف جانے والی سڑک تک خوشنما جھنڈیوں ، جگہ جگہ

خوبصورت محرابوں اور نظر فریب کاغذی اور ابر کی قندیلوں کا سر پر چھایا ہوا آسمان نظر آتا تھا۔ گزری کی شاہراہ کے سامنے بادشاہ منزل کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ سڑک سے بادشاہ منزل تک جو راستہ گیا تھا اس کے دونوں طرف بانسوں کے پاڑھ باندھ کر شامیانے تانے گئے تھے، جن میں جھاڑ اور کونڈیاں آویزاں تھیں اور دوکاندار مزے کا بیوپار کر رہے تھے۔

اس مشاعرے کی شہرت پٹنہ سے نکل کر دور کے علاقوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ مشتاقان سخن کی ریل پیل تھی۔ یہ مشاعرہ چھ دنوں تک جاری رہا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو گیارہ بجے دن میں شروع ہوا اور گیارہ بجے رات میں ختم ہوا۔ یہ پہلا دن تھا اس کے بعد اسی پروگرام کے ساتھ مسلسل پانچ دنوں تک چلتا رہا، اخبارات میں یہ نوٹس بھی نکالی گئی کہ گمنام اور غریب الوطن شاعر جنہوں نے نوازش نامے سے سید بادشاہ نواب کو یاد کیا ہے وہ ضرور کھلے بندوں مشاعرے میں آئیں۔

مشاعرے کا افتتاح بادشاہ نواب صاحب عشرتؔ بانی مشاعرے نے اپنی اس رباعی سے کی۔

کیا شکر عنایات فراواں ہوئے کیوں چشم نہ شرمندہ احساں ہووے
بخشی مجھے آبرو ہوئی روشن بزم اے عشرتؔ کیوں بزم نہ خنداں ہووے

سب سے بڑھی ہوئی مشاعرے کی بہار تو یہ تھی کہ شادؔ آزادؔ اغل بغل بیٹھے تھے، ان کے پاس ہی حضرت شوقؔ نیموی تھے۔ حکیم عبدالحمید پریشاںؔ بھی سامنے ہی صدر میں جلوہ افروز تھے۔ حضرت شادؔ پر سب سے زیادہ اعتراض کرنے والوں میں حضرت فضل حق آزادؔ اور مولانا شوق نیموی، حضرت شادؔ کے ساتھ شیر و شکر ہو کر مل رہے تھے، مختلف ٹولیوں کا یہاں پتہ بھی نہ تھا۔ عجب میل ملاپ کی یہ بزم سخن تھی۔ جس وقت حضرت شوقؔ نیموی نے یہ رباعی پڑھی تو فضا خوشی کی تالیوں سے بہت دیر تک گونجتی رہی۔

ہے اہل کمال سے یہ پٹنہ آباد شاگرد کے شاگرد یہاں ہیں استاد
کامل ہیں یہاں سینکڑوں اہل سخن یہ ہیں وہ ہیں شادؔ ہیں وہ آزادؔ

پٹنہ پر نکتہ چینی کرنے والے گمنام اور غریب الوطن شاعر صاحب نے اپنے نام سے نوٹس تو ضرور دیکھی ہوگی مگر مشاعرے میں کھلے بند آنے کی ہمت نہ کر سکے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو اپنچ میں ان کا ایک مرسلہ شائع ہوا جس میں انہوں نے پٹنہ کے شعراء کو کم بضاعت کہنے پر معافی مانگی تھی اور لکھا تھا کہ حقاً اور ایماناً کہتا ہوں کہ اگر لکھنو اور دلی کے اچھے شاعر کہتے تو ایسا ہی کہتے ...... شادؔ آپ کے شہر میں باعثِ فخر ہیں۔ بنا میاں، افروز میاں، احقرؔ بہاری، آزادؔ، شوق نیموی، مولوی امداد امام اثرؔ، حفیظؔ، تبسمؔ، بیتاب وغیرہ سب کی غزلیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ میں نے بڑے بڑے معرکے لکھنو و دہلی کے دیکھے ہیں اور رام پور میں بھی بہت رہا ہوں۔ میں شاگرد میر وحیدؔ مرحوم کا ہوں"۔ دوسرے مراسلے میں لکھا کہ آپ لوگ میرے قصور کو معاف فرمائیں اور یہ خط سب کے سامنے پڑھ دیں"۔

"غرض کہ یہ مشاعرہ بڑی شان سے ختم ہوا، جس کی چہل پہل برسوں لوگوں کو یاد رہی۔

نواب جعفر حسن فیض و شاہ الفت حسین فریادؔ

اس دور کے سب مشاعروں کا تذکرہ لکھنا ممکن بھی نہیں اور یہ کتاب میں نے اس غرض سے ترتیب بھی نہیں دی ہے۔ میری غرض تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے زمانے کا کچھ حال قلمبند کر کے اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر دوں۔ جس میں پٹنہ کی سماجی، ادبی، ثقافتی اور اٹھتی ہوئی تعلیمی تحریکوں کی لہر بھی آنکھوں کے سامنے آجائے اور گذری ہوئی صحبتوں کا خاکہ بھی تصور میں ابھر آئے، اسی ضمن میں گذرے ہوئے دور کے کچھ ممتاز شاعروں کا تذکرہ بھی کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو صاحبانِ سخن اور اربابِ فن اس جگہ چھوٹ جائیں ان کی تحقیر حاشا و کلا مقصود نہیں۔ اس میں زیادہ تر میری کم بضاعتی ہے کہ میں ان کے احوال تک نہ پہنچ سکا۔ اور کچھ اس تذکرے میں طوالت کا خوف بھی اس درمیان میں آیا ہے اس کو ناظرین میری ایماندارانہ معذرت سمجھیں۔

نواب سیّد جعفر حسن فیضؔ

نواب سیّد حسن فیضؔ کا مکان محلہ سنگی دالان میں تھا۔ پٹنہ کے معزز روسائے شہر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علمی صلاحیت اور شاعرانہ عظمت کے لحاظ سے بھی یہ امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور مصحفی کے شاگرد تھے۔

پٹنہ والوں کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اپنے باکمالوں کو جلد بھول جاتے ہیں۔ اکثر یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ایسے فراموش کردہ باکمالوں کی قدرومنزلت جب پٹنہ سے باہر ہونے لگی، اس وقت پٹنہ کے لوگوں نے ان کی طرف توجہ کی ہے۔ زمانہ بدلتا جارہا ہے اور اب بڑے شکر کا یہ مقام آگیا ہے کہ یہاں کے صاحب صلاحیت محققین بھی اپنے صوبہ کے گمشدہ جواہر پاروں کے احوال کو کرم خوردہ بستوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے میں مشغول ہیں۔ اس طرح کے ایک پرانے بستہ سے نواب سیّد جعفر حسن فیضؔ کا تذکرہ بھی نکل آیا۔ یہ ایک خاندان کا اجمالی تذکرہ ہے، جس میں گذرے ہوئے دنوں کے کچھ لوگوں کا ذکر ہے۔ سیّد نجات حسین خاں جو نواب سیّد جعفر حسن فیضؔ کے عزیزوں میں تھے انھوں نے فیضؔ کی زندگی میں یہ تذکرہ لکھا، دوسرے لوگوں کا حال بھی جو اس میں مذکور ہے، وہ بھی ان ہی کے خاندان کے افراد تھے۔ اس تذکرے کا نام "تذکرۃ الابرار" ہے اور یہ فارسی زبان میں ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے "تذکرۃ الابرار" کا خلاصہ جولائی ۱۹۶۲ کے "معاصر" میں شائع کیا۔ تذکروں کی ضمن میں نواب سیّد جعفر حسن فیضؔ کا جو ذکر آیا ہے ان کے ساتھ ان کی کچھ غزلیں بھی درج ہیں۔ محمود علی خاں صباؔ عظیم آبادی جو فیضؔ کے خاندان سے ہیں انھوں نے مجھ سے کہا کہ فیضؔ کی جو غزلیں "تذکرۃ الابرار" میں منقول ہیں وہ ان کی جوانی کی غزلیں ہیں۔ بعد کے زمانے کے کلام کا ذخیرہ جو فیض نے اپنے انتقال کے وقت چھوڑا وہ ان کے سالے شاہ تفضل حسین پٹنہ سے قصبہ محمودہ لے گئے۔ غرض یہ تھی کہ فیضؔ کے کلام کا ذخیرہ ضائع ہونے سے بچ جائے اور وقت آنے پر کتابی شکل میں شائع ہوسکے۔

اب اس کو اتفاق وقت یا جو جی چاہے کہیئے کہ قصبہ محمودہ میں بجائے محفوظ رہنے کے یہ ذخیرہ اس طرح بابرسماں حالی میں پڑا رہا۔ اس درمیان میں شاہ تفضل حسین کا بھی انتقال ہوگیا۔ مدت کے بعد جب اس کی کھوج ہوئی تو یہ ذخیرہ گل سڑ کر خاک کا ڈھیر ہو چکا تھا۔

بہر حال "تذکرۃ الابرار" کا جو خلاصہ قاضی عبدالودود صاحب کی کوشش سے منظر عام پر آیا اس سے مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ جو حالات نواب سیّد جعفر حسن فیض کے متعلق میں نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے اس کی بہت کچھ تصدیق ہوگئی اور سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ جو کلام فیضؔ کا لوگوں کی نظر سے پوشیدہ تھا وہ سب تو نہیں ہو آسکا، کچھ حصہ نظر کے سامنے آگیا۔

نواب سید جعفر حسن فیضؔ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت عظیم آباد بھی دولت وثروت علم و فضل اور شعر و شاعری کا گہوارہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ماحول کی رنگینی اور رقص و سرود کی محفلوں کو سجانے میں بھی لکھنؤ، دلّی اور حیدر آباد سے کم نہ تھا۔ فیضؔ کی جوانی رنگین ماحول میں پھلی پھولی۔ ان کے یہاں بھی راگ اور رنگ کی انجمنیں سجائی جاتیں۔ جہاں شاہدان نازک ادا کے جلووں کی نقاب کشائی ہوتی اور لہراتی ہوئی تانوں کی فضا میں جوانی کی امنگیں پروان چڑھتیں۔ شریف خاندانوں کے افراد کی طرح ان کی تعلیم بھی اس وقت کے لحاظ سے پختہ بنیادوں پر ہوئی تھی، جہاں علوم متدلرلہ انھوں نے حاصل کیا وہاں موسیقی سے بھی ان کو قلبی لگاؤ تھا۔ ورزش، کشتی گیری، بانک پٹہ، گھوڑے کی شہسواری اور تیراکی میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔

چوں کہ فیضؔ کو شاعری سے دلی تعلق تھا، جوانی میں اپنے اشعار سے حُسن و عشق کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے۔ جب پختہ مزاجی آئی تو زندگی کے مسائل اور کائنات کے اسرار کی پردہ کشائی کرنے لگے۔ اب یہ جوانی کی سرحدوں کو پار کر چکے تھے اس لئے جوانی کے مشاغل کو چھوڑا اور مذہب کی سنجیدگی کو اپنایا۔ ان کے مطالعے میں اب حدیث و تفسیر و فقہ کی کتابیں رہنے لگیں۔ مذہبی شغف اور بڑھاپا تو ۱۲۵۶ھ میں پٹنہ

سے لکھنؤ گئے اور اس وقت وہاں کے مجتہد العصر مولانا سیّد حسین کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے علوم دینیہ حاصل کیا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں حاضر رہ کر پٹنہ واپس آئے۔

۱۸۶۶ء میں فیضؔ کا انتقال ہوا۔ عذر کا ہنگامہ ان کے سامنے ہوا تھا۔ فیضؔ اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے۔ پٹنہ کو انھوں نے بُری طرح لٹتے دیکھا۔ عذر کے واقعات سے جس طرح ان کی شاعری متاثر ہوئی ہو گی، افسوس ہے کہ اس کا اندازہ ہم ان کے کے اشعار سے نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے اس زمانے کے اشعار ان کے دوسرے مجموعہ کلام کے ساتھ تلف ہو چکے ہیں۔

تذکرۃ الابرار کا خلاصہ جو قاضی عبدالودود صاحب نے ترتیب دیا ہے اس میں فیض کے دو خمسے اور انتیس غزلیں ہیں۔ غزلوں میں سے چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔

۱ گہ چاک ہے گہہ پارہ گہے تارِ پریشاں
عاشق کے گریباں کو گریباں نہیں کہتے

۲ تدبیر مرض بھی ہے مرض سے نہیں کچھ کم
ہم فیضؔ کسی درد کا چارہ نہ کریں گے

۳ خود سائی پہ تری محو ہے عالم پیارے
آئینہ بھی اسی عالم کا تماشائی ہے

۴ ہم گرفتار بھی ہو کر نہیں سمجھے افسوس
کون سی بات کا صیاد تمنائی ہے

۵ بعد مرنے کے بھی بلبل سے محبت نہ گئی
سایۂ گل میں ہم اڑتے ہوئے پر دیکھ چکے

۶ ساتھ اک سوختہ جاں تھا وہی مجنوں ہو گا
دشت میں ناقہ لیلیٰ کا گذر دیکھ چکے

۷ جب رگ جاں نہیں آتی ہے نظر فیضؔ تمہیں
تو ان آنکھوں سے تم اس بُت کی کمر دیکھ چکے

۸ دامن تلک بھی تیرے نہ پہنچی ہماری خاک
ہم سے صبا کے دل میں بھی کیسا غُبار تھا

۹ دل بستگی خزاں سے جو اپنی ہوئی ہے فیضؔ
اب یاد بھی نہیں ہے کہ ذوق بہار تھا

۱۰ ہے نشے میں بھی وہی آن وہی اس کا غرور
مست ایسا کوئی ہشیار نہ دیکھا نہ سُنا

۱۱ واشد دلِ دیوانہ کو گلگشت سے کیا ہو
باغ اور ہے صحرا کی فضا اور ہی کچھ ہے

۱۲ ہے وصل کا کس دل کو نہیں ذوق مگر فیضؔ
غم کھانے کا ہجراں میں مزا اور ہی کچھ ہے

شاہ الفت حسین فریادؔ

شاہ الفت حسین فریادؔ کا یہ تذکرہ یہاں تبرکاً لکھ رہا ہوں۔ ان کے احوال زندگی سیّد علی محمد شادؔ نے "حیات فریاد" میں لکھ کر اپنی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے جس سے بہت کچھ ان کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر روشنی پہونچتی ہے۔

شاہ الفت حسین فریادؔ ۱۲۱۹ھ میں پٹنہ میں پیدا ہوئے اور اپنی علمی صلاحیت کے باعث فضلائے عظیم آباد میں ایک اونچی جگہ حاصل کی۔ عالی خاندان ہونے کے باعث امرائے وقت سے بھی ان کو برادری تھی۔ نواب میر فیضؔ علی خاں جو امرائے عالمگیری میں تھے ان کے نانہالی بزرگ تھے۔ ان رشتوں کے علاوہ حضرت فریادؔ اپنے زمانہ میں منصب عالی پر بھی فائز رہے، چنانچہ ناظم بنگال و بہار کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار

میں ان کی سفیر کی حیثیت بڑی اہم تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت فریاؔد فضلائے وقت میں ہونے کے علاوہ سیاست میں بھی آگے تھے اور دونوں طبقوں میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ان دوباتوں کے علاوہ فن شاعری میں بھی یہ مسلم الثبوت استاد تھے۔ فارسی اور اردو میں انھوں نے ہر صنف میں شاعری کی ہے۔ فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی اس لئے اکثر فارسی ہی میں شعر کہتے تھے، مگر اردو شاعری میں بھی مستند مانے جاتے تھے۔ فارسی میں انھوں نے مثنوی بھی کہی ہے۔ قصیدہ گوئی میں بھی یہ اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ اگرچہ بڑانہ تھا، مگر جو تھے وہ اچھے شعر کہنے والے تھے۔ ان میں دو تو بہت ممتاز گذرے ہیں۔ ایک تو خان بہادر علی محمد شاؔد عظیم آبادی، دوسرے شمس العلماء نواب سید امداد امام اثرؔ اور ان دونوں کی شہرت عالمگیر ہے۔ حضرت شاؔد عظیم آبادی نے ان کے متعلق اپنا حق شاگردی یوں ادا کیا، کہ حضرت فریاؔد کو بہار کے شعراء کی صف اول میں لے آئے۔ چونکہ حضرت فریاؔد کا واسطہ صوفی خاندان سے تھا اس لئے ان کی شاعری پر تصوف کا رنگ غالب ہے جس کی تشریح ان کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

کعبہ و دَیر میں جلوہ ہے نمایاں ان کا
دو گھروں کا ہے چراغ اک رُخ تاباں ان کا

حضرت فریاؔد کے صاحبزادے مسٹر ہمایوں مرزا انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تو حیدر آباد (دکن) میں اپنی پریکٹس شروع کی اور وہیں شادی کر کے آباد ہوگئے پھر وہیں کچھ برسوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ مسٹر ہمایوں مرزا کی اہلیہ مسز صغری ہمایوں چونکہ حیدر آباد ہی کی تھیں اس لئے وہ وہیں رہیں۔ ان کو سیاست سے بڑی دلچسپی تھی اور میں نے اسی سلسلہ میں ان کو دیکھا بھی۔ ایک دفعہ جب میں حیدر آباد گیا تو ان کے یہاں بھی میں نے حاضری دی تھی۔

حضرت فریاؔد کا انتقال ۱۲۹۴ ہجری میں ہوا۔ اس وقت پٹنہ بڑے بڑے علماء و فضلاء سے آباد تھا، پھر بھی ان کی جگہ جو خالی ہوئی وہ خالی ہی رہی۔

کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ

کنور سُکھراج بہادر رحمتیؔ کا ذکر ان کے یہاں کے مشاعروں کے بیان میں پہلے آچکا ہے اس لئے میں ان کے متعلق بیان کردہ بات کو دُہرانا فضول سمجھتا ہوں۔ چونکہ ان کے حوصلے اور ان کے ذوق و شوق نے شعر و شاعری کے چرچے کو دوبارہ پٹنہ میں بڑی حد تک فروغ دیا اور وہ یہاں کے مشاعروں کے صرف بانی ہی نہیں تھے، بلکہ ایک پختہ کار شاعر بھی تھے، اس لئے فارسی اور اردو کے ان کے چند شعر اس تذکرہ کے پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کیلئے پیش کر رہا ہوں۔

۱ آئینۂ دل میں ہے میرے یار کی تصویر　　گردن جو کبھی میں نے جھکائی نظر آئی

۲ جمال یار کی وہ شمع روشن ہے سر محفل

نظر جس کی پڑے دم بھر میں وہ پروانہ بنتا ہے

۳ کسی کی مست آنکھوں پر ہے رحمتیؔ شاید　　کہ اس کے خاک سے بنتا ہے ساغر دیکھتے جاؤ

۴ یوں جستجوئے یار میں ہے بیقرار دل　　بھولا ہوا پھرے کوئی جس طرح راہ کا

سوز دروں سے جل کے جو سُرمہ ہے میری خاک　　چشم بتاں ملا مجھے گوشہ پناہ کا

۵ جب سلسلہ جنباں یہ تری زلف رسا ہو　　عاشق ترا کس طرح نہ زنجیر بپا ہو

سنتا ہوں کسی نے اسے بھجوائی ہے مہدی　　ایسا نہیں غیروں کا کہیں رنگ جما ہو

۶ ہمیں چشم از صبا دارم کہ ایں خاکستر مارا

بر دازرہ کہ گاہے آمدِ جانانہ می گردد!

۷ بوسۂ یار چہ سازم طلب از شوقِ وصال

کہ بہ ایں لطف ملاقات حجاب است امروز

بر لب بام بیا بہر تماشہ اے شوخ

نالہ ام اشک وہ چنگ و رباب است امروز

شعر و شاعری میں درجہ متعین کرنا میرا مقصود نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ کنور سکھراج بہادر رحمتی کے یہاں کے مشاعرے پُرانی تہذیب و تمدن اور ہندو مسلم خیالی کے مثالی مشاعرے ہوتے تھے۔ کنور سکھراج بہادر رحمتی کو بھی ہم اگر ہندوستان کے گنگا جمنی سماج کا معمار کہیں تو پورے طور پر بجا ہوگا۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے دلدادہ تھے اور اس وقت ان کے رفقائے کار اور ان کے ہم خیال بھی ایسے تھے جو اس دور کی ادبی فضا کو مل جل کر بہار بناتے رہتے تھے۔ ۱۸۷۷ء کے لگ بھگ کنور سکھراج بہادر رحمتی نے جو ایک فارسی طرح میں مشاعرہ منعقد کیا اس کی طرح غزلیں بھی مجھے ان کے "تحفۂ رحمتی" کے ایک پرچے میں ملیں۔ اس مشاعرے میں ہندو اور مسلم شعراء نے غزلیں کہیں۔ حضرت مولانا شاہ محمد سعید حسرتؔ، جن کے علم و فضل کا پورا پٹنہ معترف تھا، انھوں نے بھی طرح میں غزل کہی۔ اس وقت تک اردو کے ساتھ فارسی زبان بھی ہندو اور مسلمان کی مشترکہ زبان تھی۔ اس مشاعرے میں غزلیں پڑھنے والے کافی تھے۔ میں ان سے صرف چند حضرات کے اشعار یہاں نقل کر رہا ہوں۔

کنور سکھ راج بہادر رحمتی

شمع رویاں کہ بہ دل سوز نہانم دادند ‏ ‏ تابیاں حال کنم نیز زبانم دادند
باد وصد ناز و کرشمہ بسوال بوسہ ‏ ‏ عار کردند مگر لب بہ دہانم دادند
چاک کردم چو کتاں پیرہن صبر و شکیب ‏ ‏ جلوہ چوں ماہ بہ چشم نگرانم دادند

جناب شاہ محمد یحییٰ صاحب یحییٰ

فیض عشق است کہ آزاد و شدم از تکلیف
دل کہ بے خطر از سود و زیانم دادند

مولانا شاہ محمد سعید صاحب حسرت

مستیٔ دبے خودیٔ ولذت و کیفیت عشق ہمہ از تربیت پیر مغانم دادند
اول از بوسۂ آن لب دہنم بربستند بعد ازاں آگہی از رازِ نہا دادند
صید معنی چوحزیں میکم اکنوں حسرتؔ دست و باز دبشکنند کما دادند

مہاراجہ جے گوپال سنگھ بہادر ثاقبؔ

باز ایں شیشہ دل رابہ سر سنگ زدند یاد از سندلی ہائے بتانم دادند
بخت یادرشہد اے ثاقبؔ مہجور بہ خیر مژدۂ وصل ازاں جان جہانم دادند

مہاراجہ گنگا پرشاد بدرؔ

دل بدا دند مگر صاعقہ کردار تپاں چشم دادند مگر اشت فشانم دادند
شکوۂ نیست بجز شکر و صبوری اے بدرؔ گرچہ صد داغ بدل ماہ رخانم دادند

منشی ہر یہر ناتھ محتیؔ

گفتم از ساقیِ کوثر کہ بدہ آب زلال بادۂ ہوش مرا مبغچگانم دادند
محتیؔ ہرزہ مپوبدیۂ عشق بلاست کوچہ یار مرا جائے امانم دادند

سیّد امیر جان فرقتیؔ

حسن گفتار کلیمی بہ زبانم دادند جلوۂ برق تجلی بہ بیانم دادند
عیش می خواستم از رنج نشانم دادند آرزو بود بہارم کہ خزانم دادند
فرقتیؔ دل جو نبودے بہ برم خوش بودے دل چہ دادند مرا دشمن جانم دادند

کنور سکھ راج بہادر رحمتیؔ کو کچھ غزلیں ادھر ادھر کچھ گلدستوں اور پرچوں میں مل جاتی ہیں مگر ان کا دیوان مجھے باوجود تلاش کے بھی نہ ملا۔ غالباً وہ چھپا ہی نہیں۔ یہ تو ان کا

خلوص نیت تھا، کہ اس دور کے کچھ مشاعروں کا حال اور اس دور کے بہت سے ہندو اور مسلمان شعراء کے کچھ اشعار ان کے گلدستہ "تحفۂ رحمتی" سے مل جاتے ہیں۔ اب یہ گلدستے بھی نایاب ہو رہے ہیں۔ چند سال قبل تک ان کے خاندان کے نام لیوا کنور جگدیش بہادر زندہ تھے۔ وہ بھی شعر کہتے تھے اور مشاعروں کا ان کو بھی شوق تھا۔

بابو کملا پرشاد عاجزؔ

دیوان محلّہ کے رہنے والے تھے اور پٹنہ کے رئیسوں میں تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ سُنا ہے کہ بڑے پُر گو تھے۔ مگر ان کا دیوان کیا ہوا، پتہ نہیں چلتا۔ یہ کنور سکھ راج بہادر کے خاص دوستوں میں تھے۔ اُن کی ایک غزل کے دو تین شعر سُن لیجئے۔

قسم ہے جب تک دم میں دم ہے کبھی نہ ترک وفا کریں گے
کرو جو جورو جفا وہ کم نہیں کچھ اس کا ہمیں الم ہے

جوان نام خدا جو ہونگے تو اک قیامت بپا کریں گے
چلن لڑکپن کے ہیں نرالے ابھی سے چلتے ہیں بانکپن سے

رفوہوں کس طرح زخم دل کے یہ چاک کب تک سیا کریں گے
جنوں کے ہاتھوں سے تنگ آئے بہل آئی تو ٹوٹے ٹانکے

نہ کر تو عاجزؔ بتوں سے الفت اگرچہ ہے اُن کی بھولی صورت
یہی ازل سے ہے اُن کی فطرت ہمیشہ جورو جفا کریں گے

حضرت وحیدؔ الہٰ آبادی

ان کو آج کی دنیائے شاعری استاد جانتی ہے، مگر زندگی میں ان کی واجبی قدر نہ الہٰ آباد نے کی نہ لکھنؤ نے۔ ان کی زندگی میں بھی یہی عظیم آباد پٹنہ تھا جس نے ان کی شاعرانہ عظمت کو سب سے پہلے پہچانا۔ چوں کہ ان کو بھی پٹنہ سے دلی لگاؤ تھا اور یہاں کی ادبی صحبتیں ہمیشہ ان سے رچی بسی رہتی تھیں اس لئے میں ان کا تذکرہ پٹنہ کے

شعراء کے ضمن میں لکھ رہا ہوں۔ حضرت وحید الہٰ آبادی کا پٹنہ میں زیادہ تر قیام جناب شاہ مبارک حسین مبارکؔ کے یہاں رہتا تھا جو محلہ لودھی کٹرہ کے ایک صاحب وجاہت اور ذی مقتدر رئیس تھے۔ مبارکؔ شعر و سخن کے دل دادہ تھے، شعر بھی کہتے تھے، شاعری کی محفلیں بھی سجاتے تھے اور یہ حضرت وحید الہٰ آبادی کے شاگردوں کا حلقہ پٹنہ میں کافی بڑا تھا۔ ان کے شاگردوں میں شاہ مبارک حسین مبارکؔ، میر محمد باقرؔ شاہ محمد اکبر اکبر داناپوری، ملا محمد ضمیر، قاضی نجم الدین، غلام علی رکن، امام الدین امامؔ، وجیہہ الدین باقرؔ، آصف حسین آصفؔ، فرحت حسین فرحت، اور بہت سے پٹنہ میں ان کے شاگرد تھے۔ میں ان کی غزلوں سے چند شعر یہاں نقل کر کے لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار ان غزلوں کے ہیں جو انھوں نے اپنی دوسری غزلوں کے علاوہ پٹنہ کے متعدد مشاعروں میں پڑھیں۔

۱ نظر نہ جائے گی اب اپنے ماسوا کی طرف
خراب ہو کے بہت آئے ہیں خدا کی طرف

۲ چمن سے جائیں گے پھر خاک اڑانے صحرا میں
ذرا بہار کا رنگ اسکے سال دیکھ تو لیں

۳ آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

اے جنوں تنگ ہوئی وسعت صحرا مجھ سے
اب کہاں جائے طبیعت کوئی بہلانے کو

میں نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

معطر ہے اسی کوچے کی صورت اپنا صحرا بھی
کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

۵ اس میکدے میں کتنے سُوپا کے مست ہیں
کتنے فقط شراب کی بُوپا کے مست ہیں

۶ جو ہیں پاؤں کے آبلے اُن سے پوچھا
ہمیں کیا خبر کس بیاباں میں ہم تھے

۷ تمام خلق کو اب بے وفا سمجھنے لگے
طبیعت اُن سے پھری تو خراب ہو کے پھری

۸ نظر جو دزدؔ تری جلوہ گاہ سے بھی گئی
بھٹک گئی وہ کچھ ایسی کہ راہ سے بھی گئی

۹ در گذرے خلد سے ترے در کی زمیں تو ہے
شکر اس کا ہے کہ اپنا ٹھکانہ کہیں تو ہے!

۱۰ سُن کر جسے چین وہ بانئ جفا ہو
اتنا تو پھڑکتا ہوا مضمون وفا ہو

۱۱ محبت بھی ہوا کرتی ہے دل بھی دل سے ملتا ہے
یہ سب ہوتا ہے لیکن آدمی مشکل سے ملتا ہے

۱۲ مجھ سے پردہ نہ کرو شاہد رَعنا ہو کر
دور سے آیا ہوں مشتاقِ تماشا ہو کر

۱۳ کب آئے ہو، کیا کام ہے، جاؤ گے، رہو گے
اتنا بھی نہ پوچھا تری محفل میں کسی نے

افسوس ہے کہ حضرت وحید الہٰ آبادی کے کلام کا بڑا حصہ نذر آتش ہو گیا۔ انکا آخری زمانہ تھا کہ ان کے گھر میں آگ لگی۔ حضرت وحید الہٰ آبادی آگ لگتے ہی گھر سے باہر آگئے۔ جب شعلے ان کے مخصوص کمرے کی طرف جانے لگے تو ان کو اپنے کلام کا مجموعہ یاد آیا۔ یہی ان کی زندگی بھر کی کمائی تھی باہر سے پلٹ کر کمرے میں پہنچے آگ تیز ہو چکی تھی کمرے سے نکل نہ سکے۔ جب آگ بجھی تو لوگوں نے دیکھا کہ یہ بھی اور ان کا سارا مجموعہ کلام بھی جل کر خاک ہو چکا تھا۔

مرزا نادر شوخیؔ رامپوری

مرزا نادر شاہ خاں نام تھا۔ یہ غالبؔ کے شاگردوں میں تھے، مگر تلمذ کا سلسلہ مختصر رہا۔ تلاش معاش میں بنارس آئے اور وہاں سے پٹنہ پہونچے، پھر یہیں سے گاہے گاہے کلکتہ بھی جاتے رہے۔ پٹنہ میں مہینوں ان کا قیام رہتا تھا۔ ان کا یہاں ایک چھوٹا سا حلقہ تلمذ بھی قائم تھا۔ یہاں کے مشاعروں میں صبغتؔ اللہ اور دو ایک اور بھی ان کے شاگرد تھے۔ گیا میں حضرت گیاوی کو ان سے تلمذ حاصل تھا۔ پٹنہ اس وقت شعر و شاعری کا ایک ممتاز مرکز تھا۔ باہر کے شعراء بھی یہاں آتے تو پٹنہ والے آنکھوں پر بٹھاتے۔ ان کی کماحقہ، قدر کرتے جس میں عصبیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ مرزا نادر شوخیؔ کے ساتھ بھی پٹنہ والوں نے وہی کیا جو دوسرے باکمالوں اور باہر کے شعراء کے ساتھ کرتے تھے، ان کی بھی عزت کی، ان کو بھی آگے بڑھایا مگر مرزا صاحب پٹنہ کے شعراء کو نیچا ہی سمجھتے رہے، فخر و مباہات میں اپنی ایسی باتیں کہہ جاتے، جو پٹنہ کے شاعروں کو گراں گذرتی۔ ایک دفعہ مرزا صاحب نے ایک مطلع ارشاد فرمایا اور اپنے اس مطلعے کے متعلق یہ کہا "میرے اس مطلع کے جواب میں کوئی ایسا ہی مطلع کہہ دے تو میں جانوں ذرا مرزا صاحب کا یہ مطلع بھی ملاحظہ فرمالیجئے"۔

شامیانہ جو میرے دل کی صفاء ہوتی   دھوپ چھن چھن کے مری قبر میں آئی ہوتی

حضرت صفیرؔ بلگرامی اور پٹنہ کے دوسرے ممتاز شاعروں نے یہ مطلع سنا، تو خوب ہنسے اور اس مطلع کو بے معنی اور مہمل قرار دیا۔ مرزا صاحب نے یہ سُنا تو بپھر گئے۔ تو خوب پھر انھوں نے سبھوں کو دیا کہ ایک جگہ مقرر ہوا اور مطلع پر بحث کی جائے۔ چنانچہ جگہ بھی مقرر ہوئی اور وقت اور دن کا بھی تقرر ہو۔ حضرت صفیرؔ بلگرامی اور دوسرے شعراء جب وہاں پہنچے تو مرزا صاحب غائب تھے۔ ان کی قیام گاہ پر آدمی بھیجا گیا تو پتہ چلا، کہ وہ سیدھے رامپور روانہ ہوگئے ہیں۔ ان کے دو تین شعر اگلے لوگوں سے سنے سنائے ہوئے حاضر خدمت ہیں۔

بنا کروں کوئی میخانہ جی میں ہے شوخیؔ   کہ بعد مرگ زمانے میں یادگار رہے

کچھ روز جوانی کے مزے لینے دے زاہد   دو چار برس میں تو قیامت نہیں آتی!

حضرت صفؔیر بلگرامی

الحسینی و الواسطی بلگرامی شاہ آباد کے رہنے والے تھے۔ شیخ امان علی، سحؔر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد ہوئے۔ سیّد فرزند احمد ان کا نام تھا جو محتاج تعارف نہیں۔ شاعری میں ان کی استادانہ حیثیت مسلّم الثبوت ہے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ پٹنہ میں بھی اور پٹنہ سے باہر بھی ان کے شاگردوں کا وسیع حلقہ تھا اور متعدد کار آمد کتابوں کے مصنف و مؤلف بھی تھے جن کی تعداد ساٹھ تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی متعدد تصنیفوں میں "رشحات صفیر" آج بھی صحیح اردو جاننے میں رہنمائی کر رہی ہے۔ الفاظ کے صحیح محل استعمال میں اساتذہ کے شعروں کے اسناد، تذکیر و تانیث میں بھی اساتذہ کی زبان سے ان کی صحت کا ثبوت 'یہ سب باتیں پورے شرح و بسط کے ساتھ رشحات صفیر میں پڑھنے والوں کو ملتی ہیں۔ اسی لحاظ سے اردو لغت میں اس کتاب کا پایہ آج تک بہت اونچا ہے۔ حضرت صفؔیر بلگرامی کا قیام زیادہ تر پٹنہ ہی میں رہتا تھا اور یہاں کی ادبی محفلوں کی گرمی بڑی حد تک ان کی مرہون کرم رہتی تھی۔ ان ہی دنوں حضرت صفؔیر بلگرامی اور حضرت شاؔد کے درمیان استادی اور شاگردی کا جھگڑا اٹھا۔ حضرت صفؔیر بلگرامی کا دعویٰ تھا کہ حضرت شاد نے اپنی غزلوں پر ان سے اصلاحیں لی ہیں اور حضرت شاؔد کا لکھا ہوا اعتراف نامہ بھی پیش کرتے ہیں۔ حضرت شاؔد کو ان باتوں سے قطعی انکار تھا۔ یہ جھگڑا بہت دنوں تک چلتا رہا۔ پٹنہ میں دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک حضرت شاؔد کی طرفداری کرتا تھا، دوسرا حضرت صفؔیر بلگرامی کے دعوے کی سچائی کا قائل تھا۔ یہ ضرور تھا کہ حضرت صفؔیر بلگرامی کے شاگرد نواب سیّد تجمل حسین خاں عرف سلطان مرزا سلطاؔن صاحب اور حضرت شاؔد میں ہمعصری کے سبب سے بڑا یارانہ تھا۔ جوانی کے دن تھے۔ ساتھ مل کر غزلیں کہتے، ساتھ مل کر موسم کی بہاریں لوٹتے اور ساتھ مل کر محفل عیش و نشاط سجاتے۔ حضرت صفؔیر بلگرامی اور حضرت شاؔد کا جھگڑا رفتہ رفتہ ختم ہو گیا، مگر ان دونوں حضرات کے گذر جانے کے

بعد پھر اس جھگڑے کو حضرت صفیؔر بلگرامی کے پوتے مولوی سیّد وصی احمد بلگرامی نے س۔ش۔ص کے عنوان سے ایک مزید مضمون لکھ کر دوبارہ زندہ کیا۔ یہ مضمون ماہنامہ "ندیم" گیا میں چھپا اور کچھ دنوں تک اس کی دھوم بھی رہی۔۔ 'س' سے مراد سلطان مرزا سلطان تھے۔ 'ش' سے حضرت شاؔد کے تخلص کا پہلا حرف اور 'ص' صفیر بلگرامی کے نام کی رہنمائی کرتا تھا۔ مضمون ادیبانہ تھا مگر اصل مقصد میں لوگوں کی تشفی نہ کرسکا۔ میری مراد پٹنہ کے رہنے والوں سے ہے۔ یہاں عام طور پر حضرت صفیؔر بلگرامی کے دعوے پر لوگوں کو یقین ہی نہیں تھا۔ مولوی سیّد وصی بلگرامی نے جو بھی ثبوت پیش کیا وہ حضرت شاؔد اور سلطان مرزا سلطاؔن کے یارانہ سے یہ بات اخذ کر کے پیش کیا تھا کہ جب یہ دونوں اس طرح شیر و شکر تھے تو یہ کافی ثبوت تھا کہ سلطان مرزا سلطاؔن کی طرح حضرت شاؔد بھی صفیؔر بلگرامی کے شاگرد تھے یہ گھوم گھام والا استدلال بھی عجیب تھا۔

حضرت صفیؔر بلگرامی کی زبان میں کافی لکنت تھی۔ اشعار پڑھنے میں الفاظ زبان سے الجھنے لگتے تھے اور مشاعروں میں اشعار کا پڑھنا ان کے لئے مصیبت ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پٹنہ کے مشاعروں میں انھوں نے اپنی لکنت کی معذرت رباعیوں میں بھی کی ہے۔ آپ کے ملاحظہ کے لئے میں دو رباعیاں پیش کر رہا ہوں۔

کیا کہئے کہ طبع کیسی گھبراتی ہے   لکنت مرے کہنے میں نہیں آتی ہے
اس عقدے کا باعث سخن تر ہے صفیؔر   بھیگے جو گرہ اور بھی جم جاتی ہے

دُوسری رباعی میں بڑے مزے کی تشریح کی ہے۔

ہے باعث مہر و آشنائی لکنت   اس پردہ نشیں کو میرے بھائی لکنت
افشانہ ہو رازِ محبت کا صفیؔر   بارے یہ زباں کے کام آئی لکنت

اب ان کے کچھ شعر بھی سُن لیجئے۔

۱۔ کسی حالت میں اے واعظ نہیں نقصان رندوں کا
جو شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر پیانہ بنتا ہے

۲۔ کیا کیا گلوں پہ دورۂ افلاک ہو گئے
مُرجھائے، سوکھے، ٹوٹے گرے خاک ہو گئے۔

۳۔ بادۂ عشرت ہوش رُبا تھارات جو میں نے جام لیا
بارے یہ جرأت ساقی نے کی دوڑ کے مجھ کو تھام لیا

۴۔ راز الفت کا بیاں کس نے کیا کیا جانیں
ایک میں ایک ہو تم بس کوئی آیا نہ گیا

۵۔ بھلا تم تو بھلے ہو، میں بُرا ہوں محبت جھوٹ، میرا چاہنا جھوٹ

۶۔ آئے وہ میرے گھر تو رقیبوں کو لے کے ساتھ
یارب قبول یوں بھی کسی کی دعا نہ ہو

۷۔ بہار میں گل و بلبل سے کیا ہے سرگوشی یہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی

۸۔ تعزیر میں میری نہ کمی کر ستم ایجاد وہ آج ہی ہو جائے جو کچھ روز جزا ہو

حضرت صفیر بلگرامی کو نظم و نثر لکھنے پر پورا قابو تھا۔ ان کی تصنیفات میں تذکرۂ جلوہ خضر، بوستانِ خیال کی دس جلدوں کا اردو میں ترجمہ نہایت قابل قدر ہے۔ آٹھ اردو کے دیوان جن میں دو دیوان ان کی زندگی میں چھپے۔ "رشحات صفیر" معرکتہ الآرا تصنیف جس کا تذکرہ پہلے ہی کر چکا ہوں، اور تصنیفات میں تین فارسی کے دیوان، چار فارسی کی مثنویاں، قصائد ، رباعیات، قطعات اور وسوخت ان کے علاوہ ہیں۔ صفیر بلگرامی کا انتقال پٹنہ ہی میں نواب سلطان مرزا صاحب کے گھر میں ہوا۔ یہ ۱۸۹۰ء کا زمانہ تھا۔

حضرت سخنؔ دہلوی

پورا نام خواجہ سید فخرالدین حسن اور سخنؔ تخلص تھا۔ دلی کے رہنے والے تھے، وہاں کے اہل زبان اور اہل قلم کے درمیان پروان چڑھے۔ شاعری کا شوق ہوا تو حضرت غالبؔ جو اس وقت دلی میں موجود تھے۔ ان کو شاعری میں استاد اور رہنما بنایا۔ ۱۸۳۳ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ بہار کی خاک دامن کش تھی۔ دلی اور لکھنؤ کے بعد پٹنہ آئے۔ اسی کو گھر بنایا اور یہیں ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ ان کی پہلی شادی لکھنو میں ہوئی تھی۔ اس تعلق سے کبھی لکھنؤ میں رہتے اور کبھی دلی میں۔ دلی اُن کو جان سے زیادہ پیاری تھی، اس پر ناز کرتے تھے اور جب کبھی دلی اور لکھنؤ کی بات نکل آتی، تو سسرال پر وطن ہی کو فوقیت دیتے تھے۔ دلی اور لکھنؤ کی زبان اور بیان کے معاملہ میں "باغ و بہار" اور "فسانہ عجائب" کا جھگڑا ان ہی کی توجہ سے زندہ ہوا۔ ۱۲۷۴ھ میں ایک داستان "سروش سخن" کے نام سے لکھی اور دلی کی زبان کے متعلق میر امنؔ دہلوی کی جانب داری کر کے مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کو تیکھا جواب دیا۔ یہی نہیں بلکہ 'سروش سخن' میں یہ بھی دکھایا کہ اگر دلی کے اہل زبان چاہیں تو عبادت آرائی اور قافیہ پیمائی کی مملکت میں بھی شانِ کج کلاہی دکھا سکتے ہیں چنانچہ اپنی رنگین بیانی اور سحر نگاری کا ڈنکا مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کی اقلیم سخن میں بجایا اور ایسی مقفٰی اور مسجّی عبارت لکھی کہ ان کی اس عبارت آرائی نے اس وقت کے لکھنؤ کے زباندانوں میں تہلکہ ڈال دیا۔

"سروش سخن" میں خاص بات جو نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ سخن دہلوی کے یہاں داستانِ نگاری میں توازن ہے۔ مواقعات کا لحاظ ہر جگہ انھوں نے کیا ہے، نہ بے موقع طول بیانی کی ہے کہ داستان پڑھنے والا اکتا جائے اور نہ بیان میں بے محل ایسا اختصار برتا ہے کہ داستان کا مزہ ہی ختم ہو جائے۔ سخنؔ دہلوی نے یہ داستان پڑھنے والوں کے دلوں کی دھڑکنوں کا اندازہ لگا کر لکھی ہے، تاکہ پڑھنے والے کے دل کی

دھڑکن واقعات کی رفتار کے ساتھ بڑھتی گھٹتی رہے۔ اسی کو SUSPENCE کہتے ہیں جو اچھی داستان نگاری کے لئے بہت ضروری ہے۔ اپنی کتاب "سروش سخن" میں سخن دہلوی اس لحاظ سے حد درجہ کامیاب ہیں۔

اگر "سروش سخن" میں سخن دہلوی کی عبارت آرائی کی طرف آیئے، تو یہ بھی دیکھئے گا کہ سروش سخن میں قافیہ پیمائی کا سلسلہ شروع سے آخر تک ہے مگر اس کے باوجود سخن دہلوی نے بڑے اعتدال سے اور بڑی چابکدستی کے ساتھ قافیہ پیمائیاں کی ہیں اور وہ اس طرح پر کہ داستان کا ہر جملہ قافیہ پر ٹوٹتا تو ہے مگر ان میں قافیوں کی مہمل بھر مار نہیں، بلکہ جملوں کے درمیان جس طرح قافیوں کولائے ہیں ان کو پڑھنے سے زبان کی حلاوت اور کانوں کو ترنم کا لطف ملتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی سخن دہلوی کی طرز نگارش بہت اعلیٰ ہے۔

اب "سروش سخن" کے دو تین مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"آرام دل نے کہا اے محمود! بے کسوں کا اللہ ولی ہے۔ غور کرو کہ ہم تنہا نہیں یہ ہماری خوش اقبالی ہے، حضرت عشق ہمراہ ہیں، علمبردار نالہ و آہ ہیں چترِ داغ جنون سر پر ہے، دلِ بے تاب رہبر ہے، رُخ فرہاد و جنوں رکاب میں ہیں، جانِ وامقِ ناشاد زمرہ احباب میں ہے اس شان و شوکت کی سواری ہے، یہ سب تیاری ہے، پھر کیوں کسی کو ہمراہ لیتا، کس واسطے تکلیف دیتا.........."

ایک دوسری جگہ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کا نمونہ دیکھئے۔

"آنکھ لگنے کا نام جب صنوبر کے گوش زد ہوتا تو بے اختیار کلیجے میں درد ہوتا۔ اپنے حال کو خیال کر کے چیخیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا، مگر کیا کرے افشائے راز کے سبب ڈرتی تھی، زیادہ بے چین ہوتی تو در پردہ آہوں سے ربط کرتی تھی ...."

سخن دہلوی کی قادر الکامی کا ایک نمونہ سروش سخن میں یہ بھی ملتا ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ داستان کے بیان کے درمیان ایک جگہ وہ صنعت عاطلہ میں بھی نثر نگاری پر اتر آئے ہیں۔ یہ بھی ذرا ملاحظہ کر لیجئے۔

"حاصل کلام آرام دل سوگرام رو راہ الم اور سر سر دار آوارۂ عالم ہوا۔ اس کا طالع کم رسا محروم رہا مدعائے وصال موہرم رہا۔ گو کہ اسدم آرام دل کا سہور محو کا عالم اور دگر حال ہوا مگر سہل ہوا اس کو وہ، کہ ہر کس کو محال ہوا............"

سروش سخن کی تصنیف کے تیرہ سال بعد جعفر علی شیون لکھنوی نے ۱۲۸۹ھ میں ایک کتاب "طلسم حیرت" لکھی جس کا مقصد اصل میر امن دہلوی اور ان کے حمایتی سخن دہلوی پر لعن طعن کرنا تھا۔ جعفر علی شیون کو لکھنؤ کی جانب داری کرنی تھی وہ تو انہوں نے کی مگر اس ضمن میں تکلیف اور سخن سازی کے پردوں کو چاک کر کے آخر میں پھبتیوں پر بھی اتر آئے پھر اس سے بھی جی نہ بھرا تو ابتذال کی حدوں سے بھی بڑھ کر دشنام دہی تک جا پہونچے۔

بہر حال دلی اور لکھنؤ کی یہ جنگ جس نے ادبی دنیا میں کچھ دنوں تک ہنگامہ مچا رکھا تھا اس کے اثرات رفتہ رفتہ کم ہو گئے اور جب سکون کے ساتھ ناقدین ادب کو میر امن "دہلوی کی باغ و بہار" اور مرزا رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب پر تنقید نظر کرنے کا موقع ملا تو خواجہ سید فخر الدین حسن سخن دہلوی اور میر جعفر علی شیون لکھنوی کی داستانوں پر بھی ان کی توجہ گئی اور داستان پر تنقید نگاری کے لئے ضروری بھی تھا کیوں کہ دلی اور لکھنو کے طرز داستان نگاری کے اسلوب کے یہ دونوں الگ الگ آئینہ دار تھے جس کی بنیاد میر امن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور نے ڈالی تھی۔ حقیقت کو سامنے رکھئے تو یہ بات تنقید کے پردے سے صاف جھلکتی ہے کہ خواجہ فخر الدین حسن سخن دہلوی کا درجہ داستان نگاری میں سرور سے کم اونچا نہیں ہے اور شیون کے مقابلہ میں تو یقینی بہت بلند ہے۔

خواجہ صاحب نے سروش سخن، کے علاوہ بچوں کے لئے نصیحتوں سے بھری ایک کتاب تہذیب النفوس، بھی لکھی جو سیدھے سادھے الفاظ میں دلی کی زبان کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاعری میں بھی خواجہ سید فخرالدین حسن سخن نے دو تین دیوان چھوڑے ہیں۔ مگر ان کا ایک ہی دیوان جو ۱۳۰۲ھ میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا وہ میری نظر سے گذرا ہے، اس میں غزلوں کے علاوہ قصیدے، استادوں کی غزلوں پر خمسے، مسدس، اور قطعات ہیں۔ شروع دیوان میں غالبؔ کی ایک تقریظ اردو میں جو انھوں نے سخن کے دیوان کے لئے لکھی تھی، وہ بھی شامل ہے۔

سخن دہلوی نے اپنی پہلی لکھنؤ والی اہلیہ کے انتقال کے بعد شاہ آباد (آرہ) میں دوسری شادی کی۔ وکالت کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ کچھ دنوں وکالت کرتے رہے پھر صوبہ بہار میں منصفی کا عہدہ قبول کر کے سرکاری ملازم ہو گئے۔ جب ان کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا، تو انہوں نے تیسری شادی پٹنہ میں کی۔ ان کی یہ تیسری اہلیہ میر نجف علی وکیل کی پوتی تھیں۔ سخن دہلوی کو تینوں بیویوں سے اولادیں تھیں۔ اسی لئے ان کی اولادیں لکھنؤ، آرہ، اور پٹنہ تینوں جگہوں میں آباد ہیں۔ لکھنؤ اور آرہ کی اولاد میں سے کچھ لوگ بھوپال جا کر آباد ہو گئے، سخن دہلوی کو چونکہ بہار میں سرکاری ملازمت ملی اور یہیں ان کی دو شادیاں بھی ہوئیں، پھر پٹنہ کو گھر بھی بنا لیا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنی زندگی میں لکھنؤ اور دلی کو بھی نہیں چھوڑا۔ زبان کے معاملہ میں وہ دلی کی زبان پر فخر کرتے تھے، کیوں کہ یہی ان کی مادری زبان تھی، پٹنہ کے مشاعروں میں شریک ہوتے، تو دلی کے شاعر کی آن بان سے شریک ہوتے۔

ان کی غزلوں کے دو چار شعر بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

ضعف سے طاقت گفتار نہیں ہے ورنہ تنگ میں بھی تجھے اے وسعت صحرا کرتا

۲ بے سبب میں بھی رقیبوں سے الجھ پڑتا ہوں — مجھ میں اے جاں تری شوخی کا اثر آہی گیا
ہائے رے حبِّ وطن راہزنی کی تونے — یاد غربت میں بھی اپنا مجھے گھر آہی گیا
۳ کیوں سکوں تجھ کو بجائے طپشِ شوق ہوا — صدمہ کیا اور کوئی اے دلِ شیدا پہونچا
۴ ہو گئے جامہ سے باہر، نہ رہا تن کا ہوش — غصہ دلوا کے انھیں خوب تماشا دیکھا
۵ پاس جو کچھ تھا ہوا نذر ترے دستِ جنوں — آستیں میری، گریباں مرا، داماں میرا!
۶ پہنچنے دینگے یہ دیر و حرم نہ مقصد تک — انہیں کو میرے لئے سنگِ راہ ہونا تھا
۷ اِک یقیں میرا کہ کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہے — اک ترا وعدہ کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں
۸ اس محبت کا برا ہو کہ تجھے اے ظالم — یاس میں بھی بڑے ارمان سے ہم دیکھتے ہیں
۹ سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر — ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے
۱۰ وعدۂ حشر پہ تسکین ہو کیوں کر دل کو — تم وہاں بھی تو یہ کہدو گے نہیں یاد مجھے

حضرت مرزا مشاغل دہلوی

پورا نام شاہ محمد آغا عرف مرزا مشاغل تھا۔ آپ کے والد کا نام مرزا تراب علی تھا۔ مرزا مشاغل اس طرح حضرت داغ دہلوی کے دوسرے باپ سے سوتیلے بھائی تھے۔ آدمی صوفی منش اور آزاد طبیعت تھے۔ جب دلی کی صحبتیں اجاڑ ہوتی گئیں، تو یہ گھبرا کر دلی سے پٹنہ چلے آئے اور بہت دنوں تک پٹنہ میں رہے مشاغل دہلوی کو میر باقر سے بہت یارانہ تھا۔ پٹنہ میں کچھ دنوں اِدھر اُدھر رہ کر بخشی محلہ میں میر باقی کے پاس اٹھ آئے۔ یہاں بھی ان کا اپنا انتظام تھا۔ خوش حال تھے اس لئے آزاد منشی کے ساتھ دن گزارتے تھے۔ پٹنہ میں ان کے احباب کا وسیع حلقہ تھا۔ آدمی بڑے خوش مزاج بھی تھے اور مرنجاں مرنج بھی۔ سبھوں سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور جس جگہ جاتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ طبیعت بھی شگفتہ تھی اور ان کا کلام بھی شگفتہ ہوتا تھا۔ لوگوں کے سامنے اپنی غزلیں پڑھتے تو سبھوں کو پھڑکا دیتے اور مشاعروں میں

چھا جاتے ۔ ان کو اپنی زبان پر فخر تھا۔ زبان کے معاملے میں ہمیشہ دلی کی جانب داری کرتے ۔ یہی دلی ان کا گھر بھی تھا۔ جس زمانے میں مرزا مشاغل پٹنہ میں قیام پذیر تھے ، لکھنو کے شعراء بھی کافی تعداد میں پٹنہ میں موجود تھے ۔ ادبی صحبتوں اور مشاعروں میں دلی اور لکھنو کی بات نکل آتی تو مرزا مشاغل ان ادبی صحبتوں اور ان مشاعروں میں دلی کی زبان کی پورے طور پر نمائندگی کرتے ۔ مرزا داغ کے شاگرد تھے اس لئے ان ہی کی طرح معاملہ بندی سے شعروں میں جان ڈالتے اور محاوروں کی لطافت سے زبان دانی کا کمال دکھاتے۔ مرزا داغ بھی ان کو محبوب رکھتے تھے۔ کنور سکھراج بہادر کے یہاں ایک مشاعرے میں مرزا داغؔ نے شرکت کرنے کا وعدہ کیا تھا، مگر جب حسب وعدہ پٹنہ نہ آسکے تو اپنی دو غزلہ ، مشاعرے کی طرح میں پڑھنے کے لئے انھوں نے مرزا مشاغلؔ کے پاس پڑھنے کے لئے بھیج دی اور اس مشاعرہ میں مرزا مشاغلؔ ہی نے مرزا داغؔ کی نیابت کرتے ہوئے ان کی دو غزلہ پڑھی۔ پھر مرزا داغ جب ۱۸۸۲ء میں پٹنہ آئے تو ان کو یہاں کھینچ کر لانے میں بھی مرزا مشاغلؔ کا ہی ہاتھ تھا۔ مرزا داغؔ کا میر باقرؔ کے گھر قیام بھی مرزا مشاغلؔ ہی کے سبب سے ہوا، کیوں کہ مرزا مشاغلؔ خود بھی ان دنوں میر باقرؔ ہی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔

کافی دنوں کے تک یہاں رہ کر مرزا مشاغلؔ پٹنہ سے چلے تو گئے ، مگر اپنے پیچھے شعر و شاعری کی صحبتوں کی رنگین داستان چھوڑ گئے۔ زمانے کی رفتار سے یہ داستانیں بھی مٹتی گئیں۔ یہ باتیں میری پیدائش سے بہت پہلے کی ہیں۔ آج جب مرزا مشاغلؔ کا تذکرہ لکھنے بیٹھا ہوں تو ان کے حالات کے متعلق بتانے والا بھی اب کوئی نہیں ملتا ہے۔ صرف یہ ہے کہ اب بھی کچھ لوگوں کو ان کا نام یاد ہے۔ ان کے اشعار کا بھی یہی حال ہے۔ دو تین شعر میری نظر سے گزرے ہیں میں ان ہی پر ان کے تذکرہ کا اختتام کرتا ہوں۔

۱۔ تم پاؤں زمیں پر تو رکھو سوچتے کیا ہو   کچھ فرض یہی ہے کہ قیامت ہی بپا ہو

کچھ پاس سے تسکیں دل مضطر کو ہوئی تھی   پھر چھیڑ دیا ہائے تمنا کا برا ہو

۲ مقام عشق کی ہم پہلی چوکھٹ اس کو کہتے ہیں جسے سمجھے عبادت خانہ شیخ و برہمن اپنا
جہاں گردی میں صورت آشنا جب کوئی ملتا ہے نظر پڑتے ہی پھر جاتا ہے آنکھوں میں وطن اپنا

ان کے استاد کے رنگ میں بھی بھرپور ان کا یہ شعر سن لیجئے۔
نہ ہو کیوں کر گماں تم پر پرائے دل چرانے کا
کہ عادت ہے تمہیں، اکثر چراتے ہو بدن اپنا

حافظ فضل حق آزاد

۷-۱۹۰۶ء کا زمانہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ تقریباً دو چار دن پر دو صاحب میرے والد مرحوم کے یہاں آتے تھے اور والد مرحوم اور ان دونوں سے بڑے مخلصانہ اور برادرانہ انداز سے ملتے تھے۔ یہ دونوں حضرات لانبے چوڑے، گورے چٹے اور خوش وضع۔ ایک کی داڑھی منڈی ہوئی، چہرے پر تمکنت اور وقار، آواز میں بلند آہنگی، دوسرے صاحب کے چہرے پر کچی پکی داڑھی سنجیدہ صورت اور گفتگو میں متانت۔ یہ دونوں بزرگ سگے بھائی تھے جو بزرگ داڑھی کی الجھن سے آزاد تھے وہ حافظ فضل حق تھے اور ان کا تخلص آزاؔد تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی جو داڑھی کے پابند تھے وہ شمس العلماء حافظ مُحب الحق تھے۔ اس وقت دونوں بھائی مستقل طور پر پٹنہ میں رہتے تھے۔ حافظ مُحبؔ تو پوری زندگی پٹنہ میں بسر کر گئے مگر حافظ فضلِ حق آزاد ۱۴-۱۹۱۳ء میں پٹنہ چھوڑ کر اپنے گاؤں شاہو بگہہ چلے گئے جہاں سے آکر اکثر یہ پٹنہ میں بھی کچھ رہ جاتے تھے مگر ان کا مستقل گھر اب شاہو بگہہ ہو گیا تھا، جو یوں بھی ان کا اصلی وطن تھا۔

حضرت فضلِ حق آزاؔد جب گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کر چکے تو عربی اور فارسی کی انتہائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پٹنہ چلے آئے۔ ان کے ایک عزیز میر لطیف حسین محلہ رانی پور میں رانی پور اسٹیٹ کے تحصیل دار اور مختار عام بھی تھے،،

حضرت فضل حق آزاد بہت دنوں تک رانی پور میں ان کے ساتھ رہے۔ خان بہادر قاضی سید رضا حسین کی یہیں سسرال تھی اور ان کی اہلیہ رانی پور اسٹیٹ کی شریک مالکہ بھی تھیں اس لئے قاضی رضا حسین صاحب بھی یہیں رہتے تھے۔ حضرت فضل حق آزاد پر قاضی رضا حسین کا کافی اثر پڑا۔ چوں کہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے اس لئے یہ بھی قاضی صاحب کے ساتھ قومی تحریکوں میں شریک ہونے لگے اور یہ جذبہ جب اور بڑھا تو ان تحریکوں کو کامیاب بنانے کے لئے یہ بھی باہر جانے لگے۔ ایک دفعہ سر سید کے ساتھ جامعہ علی گڑھ کے لئے چندہ جمع کرنے حیدر آباد بھی گئے اس وفد میں مولانا شبلی اور مولانا حالی بھی شریک تھے۔

قرآن شریف کا حفظ حضرت آزاد نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں ختم کر لیا تھا۔ پٹنہ میں جب تحصیل علوم کی تکمیل ہو چکی تو ان کے وہی عزیز میر لطیف حسین نے اپنی وساطت سے ان کی شادی بھی پٹنہ کے ایک معزز اور دولت مند گھرانے میں کرا دی۔ شیخ فضل الرحمٰن رئیس پٹنہ ان کے سالے تھے۔ کچھ دنوں بعد حضرت آزاد نے محلہ پیر بہوڑ میں ایک بڑا مکان بنوا لیا اور یہیں رہنے لگے۔

انیسوی صدی کی آخری چوتھائی کا زمانہ ہندوستان میں قومی تحریکوں کے ابھرنے کا اور ادب و شعر کے پھلنے پھولنے کا زمانہ تھا۔ مغرب کی ہوائیں یہاں پہونچیں تو یہاں کے ماحول بھی اس سے متاثر ہوئے جس سے خیالات میں تنوع پیدا ہوا، بصارت میں وسعت آئی اور گردوپیش کے حالات اور واقعات سے اثر پذیر ہو کر شاعری بھی نئے اسلوب کے ساتھ، نئے افکار میں ڈھلنے لگی۔ چونکہ حضرت فضلِ حق آزاد درد مند دل رکھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑے خوشگوار شاعر اور قوم کے ہمدرد بھی تھے اس لئے ادب اور شعر کے ذریعہ سے بھی قوم کی اصلاح کی تحریک کی اشاعت کرنی چاہتے تھے۔ میرے نانا میر احمد حسین مرحوم کے گھر جو مجلس علم و ادب علامہ حکیم عبدالحمید مرحوم کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔ حضرت فضلِ حق آزاد اس

کے سرگرم ممبر بھی تھے۔ اخبار "الپنچ" اور دوسرے ممتاز ماہنامے جو پٹنہ سے نکلتے تھے ان کے روح رواں ہونے کے علاوہ ہندوستان کے بہت سے رسالے، اخبارات اور علمی جریدوں میں بھی ان کے مضامین، قومی اور موضوعاتی نظمیں اور غزلیں بڑی مانگ کے ساتھ شائع ہونے لگی تھیں، ۱۹۰۲ء میں انھوں نے اپنا ایک ماہنامہ "تاج" بھی نکالا، جو کئی سال چلا اور ملک بھر میں مقبول ہوا۔

حضرت فضلِ حق آزاد شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ تعلیم کی مشکل راہیں بھی بڑی حد تک مطالعہ، ذہانت اور اپنی ذاتی کدوکاوش سے طے کی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ کسی کے سامنے نہ اپنی گردن نیچی کرتے تھے اور نہ کسی کو اپنے سے اونچا دیکھ سکتے تھے۔ خود اعتمادی طبیعت میں حد درجہ تھی اس لئے اپنی جنگ خود لڑتے تھے اور اس جنگ میں کسی کو اپنا معین و مددگار بنانا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ علمی مجلس ہو کہ بزم شاعری، ان کی حرف گیری سبھوں کو چونکائے رکھتی تھی۔ پٹنہ میں شآد اور آزآد کے معرکے بہت دنوں تک جاری رہے۔ جب ادھر میل ملاپ ہوا تو قوم کے ابھرتے ہوئے شاعر و مفکر علامہ اقبال سے نظریۂ فکر و عمل کے معاملے میں ٹکر لینے لگے۔ شآد و آزآد کا قضیہ تو صرف زبان و شاعری اور ان کے لوازمات اور اسلوب تک محدود تھا، مگر علامہ اقبآل سے ان کا تصادم زبان کے علاوہ سراسر اختلاف مواقف کی بنیاد پر تھا۔ قوم کی اصلاح کی راہ جس طرح پر علامۂ اقبآل پیش کرنے لگے تھے وہ سر سیّد احمد خاں کے مدرسۂ فکر کی متعین کی ہوئی راہ سے بالکل مختلف تھی۔ حضرت فضل حق آزاد جو سر سیّد کے مدرسہ فکر کے پیرو تھے، وہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے یہ ضروری سمجھتے تھے، کہ مغربی اقوام کے علوم و خصائل کو اپنا کر مادی دنیا میں ترقی اور کامیابی حاصل کی جائے۔ ایک شکست خوردہ قوم کو جس نے اپنے پرانے ہتھیار اپنے مغربی فاتحین کے سامنے ڈال دیئے تھے اسی قوم کو ابھارنے اور اونچا اٹھانے کے لئے حضرت آزاد یہ نسخہ تیار کرتے تھے کہ شکست خوردہ قوم پہلے مغرب کے اقوام کی تہذیب ان کے فلسفہ اور

ان کے علوم و ہنر کو سیکھتے، پھر ان کے مقابل بنے، علامہ اقبالؔ ایک حکیم قوم و ملت کی طرح مسلم قوم کی شکست خوردگی، اس کی پسپائی اور ان کی پستی کے اسباب پر نہ تھا بلکہ جس کے استعمال سے ہر زمانے میں اقوامِ عالم کے قویٰ کی صحت مند تعمیر ہو سکتی ہے علامہ اقبال کو اپنے بتائے ہوئے نسخہ پر ناز تھا جس کے تیر بہدف ہونے کی مثالیں وہ گذشتہ تاریخ کے اوراق سے پیش کرتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ یہ نسخہ حکیم الحکماء خالق کائنات کا ترتیب دادہ ہے، اس لئے اس کے فوائد ازلی اور ابدی ہیں۔ اقوام مغرب کی مادّی صحت مندی کو وہ کھوکھلا بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ ان قوموں کے اندر روحانیت کا فقدان ہے۔ جس کے سبب سے ان مادیت پرست قوموں کا ہیولی سوائے ایک خوش نما بے روح ڈھانچہ کے اور کچھ بھی نہیں۔ حضرت فضلِ حق آزادؔ نے علامہؒ کی اصلاحی نظموں پر جوابی نظموں میں تلقین بھی کی ہے، کبھی ان پر برس بھی پڑے۔ مگر علامہ اقبال نے جواب الجواب کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ غالباً حضرت فضل حق آزاد کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے خاموش رہے۔ اس یکطرفہ تصادم سے صرف ایک بات اچھی نکل آئی یعنی حضرت آزاد کی نظموں میں شاعری کے لحاظ سے اچھی نظموں کا اضافہ ہوتا گیا۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پٹنہ کے ادبی ماحول کی پرورش میں حضرت فضل حق آزاد کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے اعتراضات، زبان کی خامیوں پر ان کی گرفت اور مضامین کی غلطیوں پر بے دھڑک ہر جگہ ان کی نکتہ چینی۔ ان سب کا یہ اثر ہوا کہ زبان کی صحت الفاظ کے بر محل استعمال، عروض کی دانست بز علمی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت سبھوں نے محسوس کی اور شعر کہنے اور نثر لکھنے میں محتاط ہوتے گئے۔ ان باتوں سے نومشقوں کی صحیح لائن پر تعلیم بھی ہوتی گئی اور مشاق سنبھل کر آگے بڑھنے لگے۔

مشاعروں میں حضرت فضل حق آزادؔ جہاں نوجوان شاعروں کو گریس مارک دیکر ان کی تعریف کرتے تھے اور ان کی ہمت بڑھاتے تھے۔ وہاں استادوں کی گرفت

کرنے کی تاک میں بھی لگے رہتے تھے۔ مشاعروں میں ان کی آمد استادوں میں ہیجان پیدا کردیتی تھی ۱۹۲۳ء کا واقعہ مجھے یاد ہے ۔ میرے بڑے ماموں سید عبدالمجید صاحب مرحوم کے مکان میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا۔ رات اور اس کے دوسرے دن کی نشست تھی، حضرت شاؔد کے آنے کے اعلان کے بعد یہ اعلان ہوا کہ حضرت فضل حق آزاؔد بھی شریک مشاعرہ ہوں گے۔ اس خبر سے بڑی ہلچل ہوئی ۔ نوجوان شعراء تو خوش تھے کہ ان کو بڑھ بڑھ کر داد دینے والا۔ ایک مسلم الثبوت استاد آرہا ہے، مگر استاد ان فن کے درمیان سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ رات کے مشاعرے میں نہ حضرت شاؔد آئے اور نہ حضرت آزاؔد صبح کے وقت لوگوں کو خبر ملی کہ حضرت آزاد علیل ہوگئے ہیں اس لئے نہ آئیں گے۔ اس خبر کے بعد ہر شخص نے محسوس کیا کہ سارے بزم مشاعرے میں جو ایک ہیجان تھا اس کی جگہ اطمینان و سکون نے لے لی تھی۔

حضرت فضل حق آزاد کی ادبی محفلیں اگر دلچسپ تھیں تو ان کی نجی محفلیں بھی بڑی رنگین رہتی تھیں۔ گلستان علم و ادب میں اگر چہچے بلند بانگ تھے تو بزم نشاط میں بھی ان کے قہقہے اہالین بزم کے قہقہوں سے اونچے اٹھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کے ہر گوشہ بساط کی بہاریں لوٹیں اور جی بھر کر لوٹیں، اور اب اس سے زیادہ کہنا بے ادبی ہے۔

شعر و شاعری سے الگ حضرت فضل حق آزاؔد کے قابلانہ مضامین جو ہندوستان کے ممتاز رسالوں اور اخباروں میں نکلتے رہے اگر ان کو بھی کھوج کھوج کر جمع کیا جائے تو سرمایہ علم و ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔ ان مضامین کے علاوہ حضرت آزاد نے کئی کارآمد کتابیں تصنیف کی تھیں جو ان کی شاعری کے مجموعوں کی طرح شرمندہ طباعت نہ ہو سکیں۔ یہ بات شاید عام طور پر لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ حضرت فضل حق آزاؔد فارسی کے بھی بڑے بلند پایہ شاعر تھے۔

زندگی میں ان کے کلام کے نہیں چھپنے کا باعث خود حضرت فضل حق آزاؔد تھے۔ جب دیوان شاد پٹنہ میں پہلی بار چھپا تو یہاں کے بہت سے صاحبان ذوق کی

خواہش ہوئی کہ اب حضرت آزاد کا مجموعہ کلام بھی چھپنا چاہیئے ۔انجمن ترقی اردو بہار کے ارکان بھی اور دیگر حضرات بھی متعدد بار ان کے پاس گئے اور ان کے کلام بھی چھاپنے کی اجازت مانگی ۔ کبھی کبھی حضرت آزاد راضی بھی ہوئے ،کلام کا پشتارہ صندوق سے نکالا بھی پھر کچھ سوچ کر حضرت آزاد نے داخل دفتر کر دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت فضل حق آزاد زندگی بھر دوسروں کی شاعری پر کڑی تنقیدیں کرتے رہے،اب اگر ان کا کلام منظر عام پر آیا تو لوگوں کو بھی ان کے کلام پر سخت تبصرہ اور تنقید کرنے کا موقع مل جائیگا جس کے لئے یہ تیار نہیں تھے۔

حضرت آزاد گراں گوش تو پہلے ہی ہو چکے تھے آخر عمر میں بصارت بھی ختم ہو گئی تھی۔ سن بھی زیادہ آگیا تھا اس لئے ہاتھ پاؤں کھینچ کر دنیا کے ہنگاموں سے الگ شاہو بگہہ میں بیٹھے رہے چھیاسی سال کو پہنچے تو شاہو بگہہ ہی میں ان کا انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا۔

حضرت آزاد نے ہر صنف شاعری میں ندرت اور صلاحیت سے شاعری کی۔ ہر صنف شاعری میں ان کے کلام کے نمونے پیش کرنا اس جگہ ممکن نہیں ،کیونکہ یہ مختصر تذکرہ طوالت کا متحمل نہ ہوگا۔اس لئے پہلے آپ دو چار بند ان کے لکھے ہوئے مرثیوں سے سنیئے جس میں انھوں نے حضرت انیؔس اور حضرت دبیؔر کے رنگ میں کہنے کی بڑی کامیابی سے کوشش کی ہے۔

حضرت انیس کے رنگ میں تین بند ملاحظہ ہوں، پہلے دو بند میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔

وہ خوبرد کہ چشم فلک جن سے تھی خنک وہ نازنین کہ پھول سے بھی تھے کہیں سبک

اک ان کی بانکپن میں رئیسوں کی سوتزک ہنستے تھے .جب تو برق ملاتی تھی تک سے تک

عقدے دلوں کے جن کے تبسّم سے کھلتے تھے

کانٹوں میں کھنچ گئے وہ جو پھولوں میں تلتے تھے

یہ تارو پود ہستئی نا پائیدار کیا دم ہے کھیل دم کا بھلا اعتبار کیا
ناداں فروغ جلوہ بے اعتبار کیا یعنی ثبات زندگی مستعار کیا
کاغذ کی ناؤ جس کا بھروسہ کوئی نہیں
پانی کا بلبلہ کہ ابھی ہے ابھی نہیں

اب اس بند میں حضرت امام حسین کے صبر و ثبات سے عزم کی کیفیت دیکھیے۔

فاقوں میں رہ کے روح کو تھی تازگی وہی کھلا گئے تھے پھول پہ بو باس تھی وہی
تیور وہی ،مزاج وہی،عزم بھی وہی حق کی طرف دھیان وہی تندہی وہی
یاد خدا میں دل ہمہ تن غرق اب بھی تھا
آگے جو حال دل تھا بلا فرق اب بھی تھا

اب ذرا مرزا دبیر کے شکوہ الفاظ کا پر تو ذیل کے دو بند میں ملا حظہ فرمائیں صبح کی منظر کشی کرتے ہیں۔

تیغ سحر علم ہوئی بھاگی سیاہ زنگ غل حلب میں طعمہ ماہی ہوا نہنگ
خوداک طرف تھے لشکر انجم کے ہوش دنگ آتا تھا ایک رنگ تو جاتا تھا ایک رنگ

فولاد سیم،مشک طبا شیر ہوگیا
کافور قیر، دودہ شب تیر ہو گیا

اُڈا خم افق سے جو سیلاب سیم ناب بے آب تھے نجوم فلک کے دُر خوش آب
ساتوں طبق چمک اٹھے صاف اٹھ گیا حجاب تھے سیم گوں خیام تو تھی نقری طناب
باد سحر نسیم خوش انفاس بن گئی
صحرا کی ریگ ریزۂ الماس بن گئی

حضرت فضل حق آزاد کو ہر طرح کی نظموں کے لکھنے پر پوری قدرت تھی۔ بیانیہ نظمیں، موضوعاتی نظمیں اور اصلاحی نظمیں ان میں سے جن کو اٹھا کر پڑھیے، اس

میں ان کی انفرادیت ساتھ قادر الکلامی کے نمونے ملتے جائیں گے۔ جہاں تک نظموں کے لکھنے کا تعلق ہے حضرت آزاد ہندوستان میں نظم نگاروں میں صف اول کے نظم نگار ہیں۔ ان کی نظموں میں تخیل کی رفعت، جذبات کا زور اور مناظر فطرت کی کامیاب مصوری کے ساتھ ساتھ سلاست و روانی اور تشبیہ و استعارے کی ندرت ناظرین کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے، نمونے کے طور پر ان کی موضوعاتی میں سے دو نظمیں حاضرِ خدمت ہیں۔

نسیم صُبح کی حسرت

اُف یہ جمال جوش گل اُف یہ بہار رنگ و بو　　نغمۂ عندلیب کے بجتے ہیں تار چار سو
پھولوں کو گدگدا گئی آہ یہ کس کی آرزوا　　لالے کا ہو گیا جگر کس کے فراق میں لہو

چشم پر آب بن گئی شبنم لالہ اِک طرف
بھر گیا خون خام سے گل کا پیالہ اِک طرف

راز چمن نہ کھل سکا لاکھ ادھر اُدھر پھری　　خانہ بخانہ شاخ شاخ دشت و جبال ودَر پھری
کس کو خبر کہ بے خبر آہ کدھر کدھر پھری　　ہاتھ لگا نہ مدعا شام پھری سحر پھری

لغزشِ گام ہوگئی ،صَرف خرام ہو گئی
یوں ہی نسیم صبح کی عُمر تمام ہو گئی

پیام دوست

سب سے بلند آسماں اس سے بلند بام دوست   عرش بریں مقام ہو کس کو کہوں مقامِ دوست
ورد زبانِ خار و گل شام و پگاہ نامِ دوست   کس نے سُنا جو دے گیا پیکِ صبا پیام دوست

شورش جذب و شوق سے ہوش کسی میں کب رہا
غنچہ جو کھِل چلا تھا کچھ خندہ بہ زیر لب رہا

نرگس شوخ دیدہ کی آنکھ جھپک سکی نہ پھر   آگے اُمنگ پر کلی کوئی چٹک سکی نہ پھر
نکہت گل بھی دو قدم چل کے مہک سکی نہ پھر   چپ جو ہوئی تو عندلیب کُھل کے چہک سکی نہ پھر

عالم باغ رنگ و بو آئینہ بن کے رہ گیا
حُسن ازل مجاز کے پردے میں چھُن کے رہ گیا

اب آئیے اُن کی غزلوں کے کچھ اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ان جواہر پاروں میں کہیں آپ کو غالبؔ کے افکار کی چمک نظر آئے گی، کہیں آتش کی آزاد منشی کی صوفیانہ جھلک دکھائی دے گی۔ اور کہیں مومنؔ خاں کی معاملہ بندی کا رنگ نظر کے سامنے گھوم جائے گا۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی اپنی انفرادیت ہر جگہ صاف نمایاں ہو گی اور ان کی یہی انفرادیت ان کو اونچا مقام دیتی ہے۔

۱۔ اللہ بچائے تمہیں دشمن کی دعاء سے   کمبخت کہیں مانگ نہ لے تم کو خدا سے
۲۔ پھول ہو تم اور کانٹا ہے رقیب   پھر وہی کانٹا گلے کا ہار ہے
۳۔ پرشش سے قیامت کی اتنا جو ڈراتا ہے   اللہ وہاں واعظِ کیا اور خدا ہوگا
۴۔ جہاں پر منتہی ہونے کا تھا قسمت کا افسانہ   دل ایذا طلب نے پھر وہیں سے ابتدا کر دی
۵۔ ہوئے مراحل ہستی کہاں تمام آزادؔ   ہنوز قافلہ اپنا میانِ راہ میں ہے
۶۔ وہ دن قرارِ ضبط و سکوں کے گذر گئے   اب چھیڑ کر تو دیکھ لے دردِ نہاں مجھے
کہتی ہیں پردے پردے میں اُن کی تجلیاں   اِک راز دار چاہیئے اے راز داں مجھے

ے اٹھائیں خضر کا احسان کیوں خدا کے لئے

خود اپنی گمشدگی کو نہ رہ نما کر لیں

ادا شناس ہیں کیا رہروانِ کوچۂ دوست

پڑے جو خاک بھی آنکھوں میں تو تیا کر لیں

۸ سیراب کیا رگ گلو نے خنجر سے کمی نہ کی لہو نے

وحشت میں بھی قید کا ہے عالم گھیرا ہے خیالِ چار سو نے

لالے کو کہاں نصیب وہ داغ جو دل کو دیئے ہیں آرزو نے

جاری ہو لین دین ساقی ساغر نے لیا، دیا سُبو نے

کونین کے دھو لیئے ہیں دفتر آزاد اک حرف آرزو نے

۹ شب نشاط ہے ساقی صراحیٔ مۓ لا چراغ آنکھوں میں روشن ہو جس سے وہ شے لا

۱۰ وہ کھل کھلا کے ہنس جو پڑا میری چھیڑ پر غنچہ سا تنگ تھا جو دہن پھول بن گیا

۱۱ گلشن حُسن کی تھم کر بھی ہوا تیز ہوئی زیر لب بھی وہ ہنسی ولولہ انگیز ہوئی

۱۲ یہ کس طرح کہوں کہ خدا سے دعا نہ مانگ اے بے خبر خدا سے خدا کے سوا نہ مانگ

۱۳ سختیٔ دہر سے شکوہ نہیں کوئی ہر گز ہے شکایت دلِ آرام طلب سے ہم کو

۱۴ یہ ہستی کیا ہے بس اِک خواب آشفتہ کی انگڑائی

جھپک ہے دیدۂ بے خواب کی خواب عدم ہے کیا

۱۵ آئینہ خانہ نے گھبرایا انھیں خود نمائی آج دھوکا کھا گئی

۱۶ شوخی تری سنبھلنے نہ دے گی مجاز کو اے، برقِ شوخ تو ہی چھپا اپنے راز کو

یہ تو اردو میں ان کی شاعری کے نمونے ہیں، اب ذرا حضرت فضل حق آزاد کی فارسی زبان میں بھی قادر الکلامی کے نمونے دیکھئے۔ قصیدہ گوئی فارسی زبان میں شاعری کی بہت اہم مشکل صنف مانی گئی ہے۔ انوری، ظہیر فاریابی، خاقانی اور قاآنی کے مقابلے میں حضرت فضل حق آزاد کو لانا مقصود نہیں لیکن یہ تو ضرور کہوں گا کہ قصیدے کا شکوہ، تشبیب میں فکر و زبان کا زور ان کی جگہ ایران کے بڑے شعراء کی صنف میں خود متعین کرتا ہے۔ انھوں نے قصیدے اور غزل گوئی میں بھی کمال کر دکھایا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی میں ان کے قطعات، مثنوی اور دوسری نظمیں بھی ایسی ہیں جو ان کی علمی صلاحیت کے ساتھ ان کی شاعرانہ رفعت تخیل پر دال ہیں، چوں کہ تذکرہ طول ہوتا جارہا ہے اس لئے میں حضرت فضل حق آزاد کے ایک قصیدے کے چند شعر پیش کر کے یہ تذکرہ ختم کر رہا ہوں۔ اس قصیدے میں انھوں نے خاقانی کا رنگ بڑی کامیابی کے ساتھ اس طرح اختیار کیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قصیدہ خاقانی کا نہیں ہے۔

خسروِ خاور بغرق تاجِ شہی برگرفت　　ظلمتِ شب بشرق نور سحر در گرفت
نُہ طبقِ خاک راشعشۂ در زر گرفت　　قُبّۂ افلاک را نور سحر زد بہ سیم
لخلخہ بیزد نسیم نکہت گل سر گرفت　　شعشۂ ریز دز فور طنطنہ خیز دز خاک
قطرہ بہ پابندگی صورت گوہر گرفت　　ذرّہ بہ رخشندگی تابشِ خورشید یافت
نخلِ گلستاں زگل بادہ بہ ساغر گرفت　　ساغر گلگون مل رنگِ گلستاں شکست
دایۂ فصلِ بہار آمد و در برگرفت　　سبزہ کہ بیگانہ وار رفتہ سوئے جوئبار
شاہد گل را چمن در زروز یور گرفت　　زلفِ سمن رانسیم دے ہمہ شب تاب داد
شد گرہ اندر گرہ نالہ کہ سر بر گرفت　　شد گہرا اندر گہر ژالہ کہ برگل فتاد

خان بہار علی محمدّ شادؔ عظیم آبادی

بہار کی سر زمین ہمیشہ سے مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر دور میں ایسی ہستیاں ملتی جائیں گی جنھوں نے ہر شعبۂ زندگی پر اثر ڈالا ہے اور وہ صرف بہار ہی کے لئے نہیں ہندوستان کے لئے بھی باعث افتخار ثابت ہوئی ہیں۔ شعر و شاعری کے دُنیا میں بھی اگلے وقت کے ودّیا پتی، قتیلؔ اور بیدلؔ کے بعد کاملینِ فن کے پیدا ہونے کا یہاں سلسلہ باقی رہا۔ زمانہ مابعد میں جس کی ایک کڑی حضرت شادؔ عظیم آبادی ہیں۔

حضرت شادؔ عظیم آبادی ۱۸۴۶ءء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی جائے پیدائش محلہ حاجی گنج متصل محلہ دھولپورہ ہے جو اصل ہے پہلے وہ دولپورہ کہلاتا تھا اور اہل دول کا مسکن تھا۔ یہ خاندان بھی پٹنہ میں دوسرے امراء اور شرفاء کے خاندانوں کا ہمسر مانا جاتا تھا۔ نواب غلام حسین خاں مؤلف سیَر المتاخّرین حضرت شادؔ عظیم آبادی کے دادا کے بھائی تھے۔

حضرت شادؔ کی ابتدائی تعلیم شرفاء کے بچوں کی طرح ثقہ اور صاحب علم استادوں کے ذریعہ سے ہوتی رہی۔ فارسی اور عربی کی انتہائی تعلیم حضرت شادؔ نے مولوی سیّد اعظم علی پھلواروی، مولوی لُطف علی عظیم آبادی اور سیّد مہدی شاہ سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ طب کی کتابیں میزان الطب وغیرہ حکیم محمد وصی اور حکیم محمد علی لکھنوی سے پڑھیں۔ ادبیات اور شعریات میں حضرت شادؔ کے رہنما کچھ دنوں میر تصدق حسین اور وزیر علی عبرتیؔ رہے مگر عربی کے ساتھ شاعری کے ان کے اصل استاد الفت حسین فریادؔ تھے۔ ۱۸۵۶ءء میں ایک اسکول پٹنہ میں کھلا تو اس میں حضرت شادؔ کا داخلہ کرا دیا گیا مگر وہاں ان کی طبیعت نہ لگی اور اسکول کو چھوڑ کر پھر مشرقی تعلیمات میں منہمک ہو گئے۔

حضرت شادؔ کے زمانے میں شعر و شاعری کا چرچا بچپن ہی میں مکتب خانے سے شروع ہو جاتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ بچوں کو اساتذہ کے اشعار

بھی یاد کرائے جاتے تھے اور ان کو آپس میں بیت بازی کا بھی شوق دلایا جاتا تھا چنانچہ بچپن ہی سے حضرت شادؔ کو بھی شاعری کا چسکہ لگا۔ بڑے ہوئے تو اساتذہ کے دیوان راتوں کو پڑھتے اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے مگر یہ سب اپنے والد سید عباس مرزا صاحب سے چھپ چھپ کر کیا کرتے تھے۔

جب حضرت شادؔ کی جوانی کا دور آیا تو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بہت کچھ آثار مٹ چکے تھے اور بکھری ہوئی پریشان ادبی صحبتیں پھر سے جمنے لگی تھیں۔ ان صحبتوں میں اکثر حضرت شادؔ بھی شریک ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے، مگر حقیقت پوچھئے تو یہ کنور سکھراج بہادر رحمتؔی کے یہاں کے مشاعرے تھے جن میں پٹنہ کے تقریباً تمام شعراء سمٹ آتے تھے۔ یہیں اپنی غزلیں پڑھ کر حضرت شادؔ پَروان چڑھے تھے۔

ان ہی دنوں حضرت فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی اور حضرت شادؔ عظیم آبادی کے درمیان استادی اور شاگردی کا قضیہ اٹھا۔ حضرت صفیرؔ بلگرامی حضرت شادؔ کو اپنے شاگردوں کے زمرے میں گنتے تھے اور حضرت شادؔ کو اس سے سراسر انکار تھا۔ اس وقت جناب سلطان مرزا سلطان کے گھر بھی ادبی صحبتیں خوب خوب جمتی تھیں اور عیش و نشاط کی محفلیں بھی سجائی جاتی تھیں۔ سلطان مرزا نواب بہادر سیّد ولایت علی خاں کے فرزند تھے۔ اصل نام تو تجمل حسین خاں تھا مگر پیار کا نام سلطان مرزا تھا۔ یہ بڑے ملنسار خوش خلق اور رنگین مزاج تھے اور حکومت کے کاموں میں بھی آگے آگے رہتے تھے۔ حضرت شادؔ کی ہم عمری کے سبب سے ان سے بڑا یارانہ تھا۔ دونوں کی جوانی بھی دیوانی۔ افتادِ طبیعت میں چوں کہ دونوں کے یکسانیت تھی اس لئے بزم نشاط اور محفلِ ادب میں دونوں ساتھ ساتھ حصہ لیتے اور شعر و شاعری بھی کرتے۔ جناب سُلطان مرزا کے یہاں حضرت صفیرؔ بلگرامی کا اکثر قیام رہتا تھا اور جناب سلطان مرزا اُن کے شاگرد تھے۔ چوں کہ حضرت شادؔ کی آمد رفت بھی تقریباً روزانہ جناب سلطان مرزا کے یہاں رہتی تھی اس لئے ہو سکتا تھا کہ حضرت شادؔ لفظ دو لفظ کے لئے لفظی

مشورے کے باعث صفیر بلگرامی کے ممنون ہوں مگر اس سے تو تلمذ کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا ہے۔ آپس کی صحبتوں میں بھی ایک دوست دوسرے دوست کو کبھی کبھی کسی ایک لفظ کے رکھنے یا ہٹانے کا مشورہ دے دیا کرتا ہے۔ غالباً کبھی ایسا ہوا ہوگا۔ اور حضرت صفیر نے اسی کام کو کافی سمجھ کر حضرت شآد کا نام اپنے شاگردوں کی فہرست میں ٹانک لیا ہوگا۔ اب میں اپنی کہوں، یہ حقیقت ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے بزرگوں سے بھی اور دوسرے حضرات سے بھی یہی سُنا کہ حضرت شآد کو حضرت شاہ الفت حسین فریآد ہی سے تلمذ تھا۔ اس سے اگر آگے بڑھئے تو حضرت شآد کی شاعری کا رنگ خود فیصلہ کرتا ہے کہ ان دنوں حضرات کا اسلوب جُدا، آہنگ جُدا اور اندازِ فکر بھی جُدا ہے اور شاعرانہ مزاج ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا ہے۔

حضرت شاد کی شاعری میں زندگی کے ہر دَور کی جھلک نمودار ہے۔ جوانی کی رنگینی بھی ہے، پختہ عمری کی فلسفانہ سنجیدگی بھی اور بڑھاپے کا حزن اور افسردگی بھی جب ان کی عمر بھرپور جوانی میں تھی تو انھوں نے زندگی کی بہاریں بھی لوٹیں۔ سلطان مرزا اور یہ ایک دوسرے کے ہمراز دمساز تھے۔ یوں تو یہ دونوں شاعری کیا کرتے تھے مگر ایک دفعہ ایک ہی بحر اور ردیف و قافیہ میں الگ الگ دونوں نے غزل کہی۔ دونوں کی غزلوں میں جوانی کی سرمستیوں کا ابال ہے۔ عہد شباب کی گذری ہوئی بہاروں کا ماتم بھی ہے۔ دوچار شعر حضرت شاد کی غزل کے سنئے۔ پہلے شعر میں حسن کے نازو غمزہ کی تصویر پیش کی ہے۔

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے، لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں، اُف ری جوانی ہائے زمانہ

اس ذیل کے شعر میں وصال یار کے لئے اپنی تڑپ کی کیفیت لکھی ہے۔

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز اُس کی دُعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

پھر مقطع میں جوانی کے گذر جانے کا رونا ہے۔

شآد نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی

تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

حضرت شاد کا حضرت صفیر بلگرامی سے استادی اور شاگردی کا جھگڑا جب دب دبا گیا تو پھر دوسرا جھگڑا ان سے اور الپنچ کے قلمی معاونین سے زبان و فکر اور اسلوب شاعری کے متعلق شروع ہوگیا اور یہ جھگڑا برسوں چلتا رہا۔ میرے خیال میں اس جھگڑے کی بنیاد حضرت شآد کی اس ذرا سی غیر محتاط طرز نگارش پر تھی جو انہوں نے اپنی کتاب نوائے وطن کے شروع کے ایک صفحہ میں زبان دانی اور زبان کی صحت کے متعلق لکھی تھی کتاب نوائے وطن جب ۱۸۸۴ء میں چھپی تو یہاں کے بہت سے صاحبان قلم کو اس کتاب کا یہ ٹکڑا کھٹکا :۔

”مادری زبان کی فصاحت اگر ڈھونڈنی ہو تو زیادہ تر دو قسم کے لوگوں میں ڈھونڈو۔ شاہزادوں میں اور اعلی خاندان کے امراء میں پہلے طبقے کے لوگ تو تمہارے صوبے میں نام کو بھی نہیں مگر دوسرے طبقے میں اب بھی کوئی نہ کوئی باقی ماندہ نکل آتا ہے۔ میں اپنے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ انھیں ایسے لوگوں میں صرف کیا ہے اور اکثر زبان کی الٹ پھیر پر غور کرتا رہتا ہوں۔“

کوئی دلی والا اگر یہ کہتا تو صحیح ہوتا کیونکہ اردوئے معلیٰ خاص دلی کے قلعہ معلیٰ کی پرورش یافتہ زبان ہونے کے سبب سے شاہزادوں اور قلعہ معلیٰ سے تعلق رکھنے والے امراء کی سندی زبان بے شک ہوسکتی تھی مگر عظیم آباد میں زبان کی اس طرح قید بالکل غلط تھی۔ یہاں اردو زبان اگر پھلی پھولی تو ان صاحبان علم اور کاملین فن کا طفیل تھا جو زیادہ تر دلی کو عسرت و پریشانی کے سبب سے چھوڑ کر عظیم آباد میں آکر بس گئے تھے اور اردو زبان کی میراث بھی ان ہی حضرات سے عظیم آباد کے خواص و عوام نے ترکہ میں پائی تھی۔ بہر حال ”نوائے وطن“ میں حضرت شآد کی تحریر کا

مذکورہ بالا ٹکڑا ایک فتنہ انگیز چنگاری ثابت ہوا۔ حضرت آزاؔد عظیم آبادی کو تکرار اور جنگ کا ایک مشغلہ ہاتھ آیا۔ ان کے ساتھ اس جنگ میں حضرت آزاؔد عظیم آبادی کی ایسی صلاحیت اور علمیت رکھنے والے اور دوسرے حضراتؔ بھی شامل ہوگئے جن میں سید رحیم الدین حسرؔت ایڈیٹر الپنچ سید عبدالغفور شہبازؔ، سید عبدالغنی وارثی اور حضرت شوقؔ نیموی بہت نمایاں تھے۔ اندر اندر علامہ حکیم عبدالحمید پریشاںؔ تھے جو اپنے تبحر علمی کے باعث ہندوستان میں مشہور تھے۔ وہ شاعر بھی تھے مگر اس سے بڑھ کر شاعر گر اور زبان کے محقق تھے میں یہاں پھر کہوں گا کہ اس ادبی جنگ میں ان حضرات کو یا دوسرے الپنچ کے قلمی معاونین کو حضرت شاؔد سے کوئی ذاتی خصومت نہ تھی ۔ حضرت شاؔد پر اعتراض کرنیوالے ان کی شاعرانہ فکر کے مداح تھے، مگر ان کے فن اور زبان کے نقائص پر کڑی تنقیدیں کر کے ان کے افکار کو اور بلند اور ان کی شاعری کی زبان کو اور بھی پاک و صاف دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ دنوں تک تو معترضین کی نکتہ چینوں پر خود حضرت شاؔد کو بھی خصومت اور مخالفت کا دھوکا رہا، اور وہ گھبرا کر یہ کہہ اٹھے۔

گلوں نے خاروں کے چھیڑنے پر بجز خموشی کے دم نہ مارا
شریف الجھیں اگر کسی سے تو پھر شرافت کہاں رہے گی

مگر جب تنقیدوں کی افادیت پر کچھ دنوں کے بعد آپ کی نظر گئی تو بڑی کشادہ دلی سے اس کا پورا اعتراف بھی کرلیا۔

بتا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا   خدا بھلا کرے اے شاؔد نکتہ چینوں کا

اس جھگڑے کے متعلق جوان کا اپنا خیال تھا وہ بھی سن لیجئے۔

اتفاقات سے پیش آتے ہیں جھگڑے اے شاؔد   ورنہ دشمن کوئی میرا نہ کوئی حاسد ہے

میری بات کا دوسرا ثبوت بادشاہ نواب صاحب مرحوم کے یہاں کے اس تاریخی مشاعرے کی روداد میں بھی ملے گا جو ۱۹۰۲ء میں منعقد ہوا اور جہاں حضرت شاؔد اپنے اگلے معترضین کے ساتھ خلوص و محبت کی فضا میں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے نظر

آئے۔ حضرت شوقؔ نیموی نے جو لکھنؤ میں حضرت جلال لکھنوی سے ادبی معرکہ جیت چکے تھے اور پٹنہ میں حضرت شادؔ کے بڑے نکتہ چینوں میں کہلاتے تھے اس مشاعرے میں انھوں نے جو رُباعی پڑھی وہ بھی سو فیصدی میری بات کی تصدیق کرتی ہے وہ رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

ہے اہل کمال سے یہ پٹنہ آباد شاگرد کے شاگرد یہاں ہیں استاد
کامل ہیں یہاں کے سینکڑوں اہل سخن یہ ہیں وہ ہیں وہ شادؔ ہیں وہ آزاد

حضرت شادؔ کی طویل زندگی میں ان کے تقریباً سبھی ساتھی اُٹھ گئے تھے۔ اسی کے متعلق ایک جگہ بڑی حسرت سے کہتے ہیں۔

مسافروں نے بندھے جگ کو اپنے توڑ دیا قریب گھر کے جو پہنچے تو ساتھ چھوڑ دیا

اُن کے ساتھیوں میں صرف فضل حق آزادؔ رہ گئے تھے مگر وہ بھی پٹنہ سے دور شاہو بگہہ میں جا بسے تھے۔ جب یہ پٹنہ آتے تو حضرت شادؔ کے یہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے۔ اس وقت کی ان دونوں کی آپس میں ملاقات بھی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ خبر ہوئی کہ حضرت فضلِ حق آزادؔ آئے ہیں یہ سنتے ہی حضرت شادؔ بے تابانہ ان کی طرف بڑھتے۔ معانقہ ہوتا، اس کے بعد حضرت شادؔ اپنے مہمان کو لئے ہوئے اپنے خاص کمرے میں پہنچ جاتے جہاں شعر و شاعری سے زیادہ گذرے ہوئے زمانے کا تذکرہ چھڑتا، کبھی گذشتہ زندگی کی لغزشوں پر قہقہے لگتے۔ کبھی پُرانی صحبتوں پر حسرت و غم کا اظہار کیا جاتا۔ اس درمیان میں مشاعرہ باہر دالان میں جاری رہتا۔ مشاعرہ ختم ہونے کے قریب دونوں کمرے سے نکلتے۔ حضرت شادؔ کا اصرار ہوتا کہ حضرت آزاد آخر میں غزل پڑھیں اور یہ حضرت شادؔ کے آخر میں پڑھنے پر مصر رہتے۔ حضرت شادؔ ہی آخر میں اپنی غزل پڑھ کر مشاعرہ ختم کرتے۔ اب تو سوائے شاہ محمد حسن بسملؔ عظیم آبادی، عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی اور سید مظاہر علی مظہرؔ[1] کے

[1] یہ تمام ہستیاں اب دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں (ادارہ)

حضرت شاؔد کا کوئی ایسا شاگرد نہیں ہے، جو ۱۹۲۸ء تک قریب قریب روزانہ حضرت شاؔد کی خدمت میں حاضری دیتا رہا ہو۔ حضرت شاؔد کے یہاں کے مشاعرے کا حال میں نے انھیں سے سنا۔ جب ۱۹۲۷ء میں حضرت شاؔد کا انتقال ہوا تو حضرت فضل حق آزاد زندہ تھے۔ ایسا ساتھی جس سے ادبی جنگ بڑی مدت تک اور پھر صلح کے بعد شعر و سخن کی محفلوں میں ان سے شعر سننے اور ان کو شعر سنانے کا لطف ملتا رہا ہو۔ ان کے مرنے پر حضرت آزاؔد کو رنج و غم نہ ہوا ہوگا۔ ان ہی دنوں جب پٹنہ میں حضرت شاؔد کی موت پر ایک عام تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تو حضرت آزاؔد نے اپنی چھوٹے صاحبزادے عزیز الحق عزیؔز کی معرفت اس جلسہ میں پڑھنے کے لئے ایک تعزیتی نظم بھیجی جس کے ہر شعر میں حضرت شاؔد کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار تھا اور ان کی شاعرانہ صلاحیت کی تعریف تھی چنانچہ جلسے میں یہ نظم پڑھی گئی اور بے حد مقبول ہوئی۔

۱۸۹۷ء میں حضرت شاؔد ایک دفعہ دہلی گئے اور وہاں سے پانی پت بھی پہنچے۔ اس وقت مولانا الطاف حسین حالؔی پانی پت میں موجود تھے، ان ہی دنوں حضرت شاؔد نے ایک نظم میلاد نبوی کے متعلق لکھی تھی۔ جب حضرت شاؔد نے یہ نظم حضرت حالؔی کو سنائی تو وہ بے حد خوش ہوئے اور سر سیّد کو جو اس زمانے میں علی گڑھ میں تھے ایک خط لکھ بھیجا کہ وہ حضرت شاؔد کو علی گڑھ میں مدعو کر کے میلاد نبوی والی نظم ضرور سنیں، چنانچہ یہی ہوا۔ سر سیّد کا پانی پت ہی میں حضرت شاؔد کو دعوت نامہ موصول ہوا، جس میں علی گڑھ آنے اور نظم پڑھنے کی استدعاء تھی۔ حضرت شاؔد جب علی گڑھ پہنچے تو وہاں ایک جلسہ ترتیب دیا گیا اور حضرت شاؔد نے اپنی نظم بڑے لطف کے ساتھ سامعین کو جلسے میں سنائی۔ یہی نظم بعد میں ظہور رحمت کے نام سے چھپی جس کے دو چار بند میں اس جگہ نقل کر رہا ہوں۔

سر تاجِ عرش نعت رسولِ زماں کی ہے آنکھوں کا ہے جو نور تو لذت زباں کی ہے
زیبائش کلام ہے زینت بیاں کی ہے شہرت ملائکہ میں اسی داستاں کی ہے

وہ کون ہے جو مدح میں رطب اللساں نہیں
عالم میں ذکر ختم رسل کا کہاں نہیں

ان کے علاوہ کون شفیع الوریٰ ہوا عالم میں نام خواجہ ہر دوسرا ہوا
یہ قرب بھی کسی کو نہ اُن کے سوا ہوا گر ہم سخن ہوا تو انھیں سے خدا ہوا

پردہ وہ تھا کہ جس سے عیاں اصل نور تھا
حائل نہ طور تھا نہ کہیں نخل طور تھا

نعت میں اور بھی بہت سے بند ہیں اُن کو چھوڑتا ہوں۔ اب "ساقی نامہ" کے دو تین بند سنئے۔

ہاں ساقیا کدھر ہے ادھر لایئے طہور دے جلد جام نور میں بھر کر شراب نور
اُس آفتابِ رُخ کا دکھا دے ہمیں ظہور ہر کاہ جس کے جلوے سے بن جائے کوہ طور
ظاہر اسی کے حسن سے کل کائنات ہو عارض سے دن ہو زلف کے سائے سے رات ہو
ساقی تری دلا میں ترے رند مست ہیں سرشار کیف ساغرِ بزم الست ہیں
آنکھیں ہیں بند دھیان میں ساغر بدست ہیں کیوں ہوں نہ مئے پرست کہ سب حق پرست ہیں۔
مینا و جام و خم کے طرف لو لگائے ہیں مجرے کے واسطے ترے میخوار آئے ہیں
ہم مئے کشوں کی تجھ پہ فدا جان ساقیا دے بادۂ دلا ترے قربان ساقیا
بھولیں گے حشر تک نہ یہ احسان ساقیا شکر خدا کہ ہم ہیں مسلمان ساقیا

مئے دے کے خسروی کا ہمیں تخت و تاج دے
کل پر نہ ٹال جو تجھے دینی ہے آج دے

حضرت شاؔد کے آخری زمانے میں نواب سراج الدین سائل دہلوی پٹنہ تشریف لائے۔ یہاں کی ایک ادبی صحبت میں حضرت سائل نے جو غزل پڑھی، اس کا مطلع بھی خوب رہا۔

سائل آیا نہ کہو معتقد شاؔد آیا حاجبِ بابِ اثر، خادم امداد آیا

ملاحظہ کیجئے۔ ایک اہل زبان استاد فن نے کس طرح اپنی عقیدت کا خراج حضرت شاؔد کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اسی مطلع میں شمس العلماء نواب سید امداد

امام اثر کی عظمت کا بھی اعتراف ہے اور اسی میں میر عنایت حسین امداؔد جو حضرت شاؔد کے پرانے شاگرد تھے، ان کے ساتھ دلی تعلق کا بھی اظہار کیا ہے۔

حضرت شاؔد نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ فارسی میں بھی ان کی نظمیں، قطعات، قصیدے اور غزلیں ہیں مگر اردو کے کلام کے مقابلہ میں یہ بہت مختصر ہیں۔

حضرت شاؔد کے اردو کے کلام میں ہر قسم کی متعدد نظمیں، مرثئے، مثنویاں، قطعات اور رباعیاں موجود ہیں، مگر حضرت شاؔد کے ساتھ یہ بات غنیمت رہی کہ انھوں نے صرف غزل گوئی کو اپنا سرمایہ شاعری سمجھا اور اپنی غزلوں میں مردہ رنگ کو چھوڑ کے نفسیاتی پہلو نکالے جن کی دسعت میں انھوں نے میؔر کی آفاقیت، دردؔ کے تصوت کا عرفان اور غالبؔ کے فلسفے کا ادراک پایا اور پھر ان کو باہم ترتیب دے کر اپنی شاعری کا مزاج بنایا جس سے مکتبہ شاؔد کی بنیاد پڑی۔

حضرت شاد گراں مایہ اور خوشگو شاعر تھے اور اچھے نثر نگار بھی اردو نثر میں آپ کی تصنیف اور تالیف کردہ بہت سی کتابیں ہیں جن میں ان کا ناول ''صورت الخیال'' اور ان کی دوسری کتاب ''صورت حال'' ساتھ ہی ساتھ تاریخ مگدھ اور تاریخ جدید صوبہ بہار بھی اونچے درجے کی کتابیں ہیں۔

ان کے شاعری کے مجموعے مختلف طور پر چھپے۔ غزلوں کے چار دیوان ہیں۔ کلامِ شاؔد ان کی زندگی میں چھپا۔ پھر اُن کے شاگرد حمیؔد عظیم آبادی مرحوم نے غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''میخانۂ الہام'' کے نام سے چھپوایا۔ اس کے کئی سال بعد ان غزلوں کے دو اور مجموعے ''بادۂ عرفان'' اور ''میکدۂ عرفان'' شائع ہوئے۔ مرثیے بھی ان کے چھپ چکے ہیں۔ ان کی طباعت اور اشاعت بھی حمیؔد عظیم آبادی کی کوششوں پر ہوئی۔

آخر میں اب حضرت شاؔد کی چند غزلوں کے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں۔

۱۔ خم ہیں لبریز سمجھ بوجھ کے پی اے مئے خوار

کوئی گرتے ہوئے پکڑے گا نہ بازو تیرا

صف آخر میں ہوں میں وا اَسفا اے قاتل

خوف یہ ہے کہ تھکا جاتا ہے بازو تیرا

۲۔ حقیقت نے تو اپنی سی بہت کی ہر طرح ڈھانکا

مگر گھبرا کے پردہ کھول دیتا ہے مجازان کا

۳۔ اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئیگا تو میں مرنے سے در گذرا مرے کس کام آئیگا

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی خم آئیگا، صُراحی آئیگی، تب جام آئیگا

۴۔ نہ جاں بازوں کا مجمع تھا نہ مشتاقوں کا میلا تھا

خدا جانے کہاں مرتا تھا میں جب تو اکیلا تھا

۵۔ ہزار مجمعِ خوبانِ ماہ رو ہوگا نگاہ جس پہ ٹھہر جائے گی وہ تو ہوگا

۶۔ زبان حال سے کہتا ہے ساری داستاں شب کی

رخِ حسرت زدہ دیکھو چراغِ صبح گاہی کا!

۷۔ دے کے تہی سُبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا

مل نہ گیا ہو ساقیا دُرد کہیں زلال سے تو نے ہلا کے جامِ مئے دل کو مرے ہلا دیا

۸۔ نقش کر میرے زمانے ترے جی میں جو آئے

میں تو سادہ لئے اس دل کا نگینہ آیا

۹۔ گستاخ تھا وہ پہنچ گیا پروانہ شمع تک میں بد نصیب تھا مجھے مانع ادب رہے

۱۰۔ چونک غافل کہ نمایاں ہے سحر پیری کی چاہتا کیا ہے کہ اس سے بھی سویرا ہوتا

۱۱۔ مطلب یہی ہے کہ بس کہ ہمیں منہ لگایئے منہ تک رہا ہے دیر سے پیمانہ آپ کا

۱۲۔ ویران کیجئے کہ دلوں کو بسایئے میکش تمام آپ کے، میخانہ آپ کا

۱۳۔ مغبچے ہیں میئر، متبسم ساقی پینے والے تجھے پینے کا نہ انداز آیا

۱۴۔ جکڑے ہوئے ہیں دونوں جہاں قیدیوں کی طرح

اللہ رے سلسلہ تری زلف دراز کا !

۱۵۔ کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا

مرتے مرتے ہوش کیا باقی تیرے دیوانے میں تھا

۱۶۔ کیا جانیں رند فقر ہے کیا احتیاج کیا

بوتل بھری ہوئی ہے گلے تک، امیر ہیں !

۱۷۔ تا قیامت رہے آئینۂ سلامت یارب ہر حسیں کو ہے یہ دعویٰ کہ سکندر ہم ہیں

۱۸۔ تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

۱۹۔ اسیر جسم ہوں میعاد قید لا معلوم یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سُنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں مزا تو یہ ہے نہ منزل نہ راستہ معلوم

کچھ اپنے پاؤں کی طاقت بھی چاہئے اے پیر یہی نہیں تو مددگارئ عصا معلوم

۲۰۔ ڈھونڈو گے اگر سکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر

دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاؔد یہ کہلا بھیجا ہے

آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

۲۱۔ ہمیں کیا ہوا کہ بدل گئے بڑی حیرتوں کا مقام ہے

کہ وہی فلک ہے وہی زمین وہی صبح ہے وہی شام ہے

میں فدائے ساقئ مہ لقا یہی میکشی کا ہے مسئلہ

وہی حکم دے تو حلال ہے وہی روک دے تو حرام ہے

۲۲۔ خموشی میں مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے

تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

۲۳۔ کام آئی تری اعجاز بیانی قاصد　　اس نے خوش کر تو دیا وعدہ فردا کر کے

اور کیا میری تمنا تھی فقط یہ کہ تجھے　　دل میں رکھ لوں کسی تدبیر سے اپنا کر کے

۲۴۔　　ہزار نقش قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے

جو تجھ سے چھوٹے ہیں انکو تیری تلاش اے کارواں رہے گی

۲۵۔ دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار　　جب تک شراب آئی کئی دور چل گئے

۲۶۔ کونسی بات نئی اے دل ناکام ہوئی　　شام سے صبح ہوئی صبح سے پھر شام ہوئی

۲۷　　آخر ہے عمر ضیق میں دل بھی ہے جان بھی

مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

۲۸　　کھنچتا ہے جب بلبل اک طرف اک سو صبا

دم گھٹا جاتا ہے کیا پھولوں کی بو مشکل میں ہے

۲۹۔　　طریق عشق کی منزل تو ایک رستے لاکھ

قدم قدم پہ بھٹکنے کا ڈر، معاذ اللہ

خموں کے کھول دیئے منہ زہے کرم ساقی

میں پی تو لوں گا مگر اس قدر معاذ اللہ

۳۰۔　　نگاہ شوق مجنوں فرش سے تا عرش جاتی ہے

کہاں تک پردہء محمل چھپائے روئے لیلا کو

۳۱۔　　تف ایسے قتل پہ مجھ سخت جاں کے اے قاتل

جو بڑھ کے غیر تری آستیں دراز کرے!

مرے حسابوں تو عاشق نہیں حریص ہے وہ

فراق و وصل میں کچھ بھی جو امتیاز کرے!!

۳۲۔　　ساتھ دل کے جو نہ امید لگا رکھتا میں

پھر یہ حضرت کہیں ڈھونڈے بھی میسر ہوتے

۳۳۔　　جھک کے صیاد نے جب پیار سے چہرہ دیکھا

نو گرفتاروں کی اک عید تہہ دام ہوئی

۳۴۔ کچھ نہ تھی داستان باغ و بہار

صرف بلبل کی خوش بیانی تھی

۳۵۔ ترا میہماں ہوں جہاں بٹھا سر عرش و روئے زمیں سہی

مجھے بیٹھ رہنے سے کام ہے کوئی جا نہیں تو نہیں سہی

میں درحرم کے شگاف سے تجھے جھانک لوں تھی یہی ہوں

یہ نہ ہو تو درِ صومعہ جو قریب ہو تو وہیں سہی

صف اولیں تو ہے خاص صف دہاں پاؤں جائے کہاں شرف

صف آخریں سے بھی دور تر جو اشارہ ہو تو وہیں سہی

۳۶۔ بچاکے ہاتھ الگ سے الگ سبو لیتے

تھی کیا مجال کہ ساقی کا ہاتھ چھو لیتے

مبارک حسین مبارکؔ

۱۸۵۷ء کے قبل اور بہت دنوں بعد بھی دولتمند رئیسوں کا گھر اپنے حلقہ میں ایک چھوٹی سی ریاست کانمونہ معلوم ہوتاتھا۔ انھیں گھروں سے آس پاس کے رہنے والے سینکڑوں غریبوں کی پرورش ہوتی ۔اپنے حلقہ میں رفاح عام کاکام ان ہی کی توجہ اور فیاضی سے پتہ چلتا، حلقے کی مسجدیں ،امام باڑے، خانقاہیں، مدرسے اور ورزش گاہیں ان سب کی تعمیر اور نگہداشت سب ان کے ذمہ ہوتی۔ ان اداروں میں مذہبی امور بھی انجام پاتے اور غریب بچوں کی دماغی اور جسمانی نشوو نما کی ساری سہولتیں بھی مفت میں ملتیں بہت سے رؤساء تو شاہی زمانے کے امراء اور معزز عہدہ داروں کے خاندانوں سے تھے جن کے بزرگ پٹنہ (عظیم آباد) آکر بس گئے تھے۔کچھ ایسے بھی تھے کہ مضافات عظیم آباد پٹنہ کے دیہاتوں کے بڑے بڑے زمیندار تھے مگر بعد میں ان میں سے اکثر حضرات نے عظیم آباد پٹنہ کی رنگین صحبتوں اور دلچسپیوں کو پسند کر کے عظیم آباد پٹنہ کو گھر بناکر یہیں رہ پڑے تھے۔شان و شوکت میں یہ پٹنہ کے

پرانے خاندانی امراء سے کم نہ تھے، بلکہ سچ پوچھئے تو ان نئے بسنے والوں کی مالی حالت پرانے بسنے والے امراء سے کچھ زیادہ ہی بہتر تھی۔ کیوں کہ پرانے امرا کی دولت میں گھن لگ چکا تھا اور یہ نئے بسنے والے اپنے اپنے دیہاتوں سے اندوختہ دولت و ذریعہ دولت ساتھ لائے تھے۔ ان کے یہاں دوسرے مشاغل کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی چرچا رہتا۔ خود بھی پڑھے لکھے ہوتے اس لئے شعر بھی کہتے اور شاگردی میں کسی سے منسلک ہوتے۔ ان رئیسوں کی بدولت عوام میں بھی شعر و شاعری مقبول ہو رہی تھی۔ شعر و شاعری میں ہندو بھی مسلمانوں کے دوش بدوش تھے۔

شاہ مبارک حسین مبارکؔ ان ہی نئے بسنے والوں کے ایک خاندان سے تھے۔ محلہ لودی کٹرہ میں عالیشان حویلی میں رہتے تھے۔ نوکری پیشہ ملازمین کے لئے الگ مکانات تھے۔ شاہ مبارک حسین مبارک اپنے وقت میں پٹنہ کی رنگین صحبتوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے اور عمر بھی کافی پائی۔ گھر میں دولت کافی تھی، جو چاہا کیا اور داد عیش و عشرت بھی بڑھ چڑھ کر دی۔ پٹنہ کے کہلاتے تھے، مگر دیہات میں بسنے والے اپنی برادری کے لوگوں اور رشتہ داروں کا سولہ آنہ خیال رکھتے تھے۔ ان کا مکان ان کے رشتہ داروں کے لئے ایک مہمان سرا تھا۔ غریب بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی سامان فراہم تھا جہاں نادار بچے مفت کھانا پاتے تھے۔ ان کے یہاں صرف رنگین صحبتیں نہ جمتی تھیں بلکہ علما و مشائخ سے بھی بڑی راہ و رسم تھی۔ وہ بھی ان کے یہاں آتے رہتے تھے۔ اس طرح دنیاوی عیش و عشرت میں یہ دینی کاموں سے بھی غافل نہ رہتے تھے۔ شاہ مبارک حسین مبارکؔ شعر و سخن کے بڑے دلدادہ تھے۔ آئے دن ان کے یہاں مشاعرے ہوتے باہر سے جو باکمال شاعر آتا اس کی بڑی آؤ بھگت کرتے۔ مشاعروں کا سلسلہ ان کے یہاں آخری وقت تک چلتا رہا۔ بڑی بات یہ تھی کہ پٹنہ میں جو شاعروں کے چند گروہ بن گئے تھے، یہ ان میں سے کسی کے ساتھ منسلک نہ تھے۔ ان کے یہاں کے مشاعروں میں سب پڑھنے والوں کو یکساں داد ملتی اور سب کی

قدر کی جاتی۔ شاہ مبارک حسین مبارکؔ حضرت وحید آلہ آبادی کے شاگرد تھے حضرت وحیدؔ برابر پٹنہ آتے رہے۔ پٹنہ میں ان کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ قائم تھا۔ جب حضرت وحیدؔ پٹنہ آتے تو کافی دنوں تک رہتے۔ شاہ مبارکؔ حسین بڑی عزت کے ساتھ ان کو اپنا مہمان بناکر رکھتے شاہ مبارک حسین مبارکؔ کا دیوان مرتب تو ہوا مگر چھپ نہ سکا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صاحب لے اڑے، اور دیوان اس طرح غائب ہوا کہ پھر نہ ملا۔ شاہ رفیع الدین صاحب ایڈوکیٹ جو ان کے پوتے ہیں وہ مجھ سے کہنے لگے کہ دیوان کا چرانے والا برسوں ہم سبھوں کی نظر میں رہا مگر واہ رے اس کی بے غیرتی، کہ ہم سبھوں کی شرافت پسندی کے باوجود اس نے کبھی دیوان کا تذکرہ بھی نہ کیا۔ شاہ مبارک حسین مبارکؔ کا انتقال ۱۳۴۰ھ میں ہوا۔ ان کے صاحبزادے خان بہادر شاہ محمد کمال صاحب مرحوم بھی اچھے شاعر تھے، مگر ان کے دیوان کا بھی یہی حشر ہوا۔ کسی صاحب کے ہتھے اس طرح چڑھا کہ پھر اس کا سراغ بھی نہ ملا۔

اب تبرکاً آپ بھی شاہ مبارک حسین مبارکؔ کے چند شعر سن لیجئے۔

۱ وہ جو اس جشن خسروی میں نہیں　　کتنے ساماں ہیں دل کسی میں نہیں

واہ رے لطف رنگ بے رنگی!　　سب میں ہے اور پھر کسی میں نہیں

اپنا منہ دیکھ کر ہے کس سے حجاب　　اور کوئی تو آرسی مین نہیں

۲ نظر جب دیکھ کر تجھ کو تری محفل سے آتی ہے

تو کیا آنکھوں میں پابوسی کی حسرت دل میں آتی ہے

۳ قدم تو دیر میں شان حرم نگاہ میں ہے　　میں اور راہ مین ہوں فکر اور راہ میں ہے

۴ دل میں وطن کی یاد ہے ہم دل کے ساتھ ہیں

غربت میں ہم جہان بھی ہیں منزل کے ساتھ ہیں

وہ جو نامور تھے زمانے میں کہیں ذکر سن لو فسانے میں

مجھے دیر ہوگی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں

شمس العلماء نواب سید امداد امام اثرؔ

’ بڑی مشکل ہے کہ شمس العلماء نواب سید امداد امام اثرؔ کو اگر پٹنہ کے صرف ادبی حلقہ کے ساتھ مخصوص کروں تو یہاں اس وقت کے دوسرے ادارے اور دوسری انجمنیں ان کے بغیر سونی دکھائی دیں گی ۔نواب صاحب ۱۸۴۹ء میں ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں کرائے پر سرائے میں پیدا ہوئے جہاں ان کے اجداد آکر بہت دنوں پہلے بس گئے تھے۔ نواب صاحب کا خاندان شاہان مغلیہ کے دور میں بھی بڑا معزز رہا، اس طرح خاندانی وجاہت میں ان کا گھرانہ صوبہ بہار میں بڑ امتیاز سمجھا جاتا رہا ہے۔ خان بہادر سید وحید الدین مرحوم صدر اعلی تھے۔ اور اس کے علاوہ بڑے صاحب اثر ورسوخ بھی تھے۔ غدر کے ہنگامہ کے قبل اور بعد بھی انگریزی حکومت میں یہ سب معزز عہدوں پر رہے۔اس کے علاوہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ نواب صاحب قابل باپ کی آغوش میں پلے۔ خداداد صلاحیت ملی تھی، جس نے ان کو ہر شعبہ علم میں پروان چڑھایا سلف اور خلف دونوں طرف سے قدرت نے ان کو بڑا خوش قسمت بنایا تھا۔ باپ ان کے سید وحیدالدین صدر اعلی بڑے قابل ،معزز اور بڑے نیک نام تھے ۔بیٹے سر سید علی امام اور سید حسن امام شہرت و قابلیت و افتخار میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ سر سید علی امام اور مسٹر سید حسن امام کے ایسے بیٹے کسی کو ملیں تو اس کی خوش بختی کی انتہا نہیں ،مگر نواب صاحب کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ مشہور ہوئے تو اپنی ہی وجاہت اور علمی صلاحیت کی وجہ سے ۔یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بیٹوں کے طفیل میں ان کو نام آوری ملی بلکہ ان ہی سے بہت سی صفتیں جو ان کے بیٹوں نے حاصل کیں ،وہ ان کے لئے کامیابی میں بڑی حد تک معین و مددگار ہوئیں ۔نواب صاحب کچھ دنوں تک پٹنہ کالج میں علوم مشرقیہ کے پروفیسر رہے۔ یہی زمانہ تھا جب انھوں نے سر سید علی امام اور مسٹر سید حسن امام کو انگلستان بھیجا کہ وہاں جاکر یہ دونوں بیرسٹری کا امتحان پاس کریں۔

نواب صاحب کی مختلف حیثیت تھی اور ہر حیثیت ممتاز اور کامیاب بھی رہی ۔ مصنف ، مولف ،شاعر ، نثار ، تنقید نگار، وکیل، پروفیسر ، حکیم ' ڈاکٹر، زمیندار، کاشتکار ،باغبان ،اور بڑے شکاری جس حیثیت سے ان کو دیکھئے یہ مکمل ہی تھے۔ ایسی ہمہ گیر شخصیت شاید ہی کہیں ملے گی غرض ہر محفل میں جو صفین بچھتی تھیں یہ اس کی صف اول میں ہوتے تھے۔ بیٹوں کے اقبال نے ان کو بھی مرفہ الحال بنادیا تھا،اب ان کی زندگی بھی بڑی ہم آہنگی سے چلتی تھی ۔وقت گزاری کے لئے کاشتکاری بڑے پیمانے پر باغبانی، شیروں کا شکار، دوائیں بانٹنا ،پھر دوستوں اور ہم خیالوں کی صحبت میں شعر و شاعری ۔اگر کچھ وقت ملتا تو اس میں تصنیف و تالیف کا کام ہوتا رہتا۔جو شخص نواب صاحب کو دیکھتا ان کی خوش وقتی پر رشک کرتا ۔اب ذرا دیکھیے کہ خوش قسمتی کس طرح پلٹا کھاتی ہے ۔ عین اس وقت جبکہ عمر کی انتہائی منزلیں بڑے اطمینان و سکون سے طے کر رہے تھے، یکے بعد دیگرے چھ مہینوں کے اندر سر سید علی امام اور مسٹر سید حسن امام کا انتقال ان کے سامنے ہوا۔ نواب صاحب خود نوے کے قریب پہنچ رہے تھے جہاں اپنے لڑکوں کی انتہائی کامیابی اور شہرت انھوں نے دیکھی، آخر عمر میں ان کے مرنے کا غم بھی ان کو سہنا پڑا۔ لگاتار تھوڑی مدت کے اندر یہ دو جانکاہ صدمے ہوش و حواس کھونے کو کم نہ تھے مگر ان کے صبر کی بھی انتہا نہ تھی ۔بڑے صبر و شکر کے ساتھ یہ صدمے سہہ گئے مگر کمر ٹوٹ گئی ،زندگی بے معنی معلوم ہونے لگی۔ آخر ایک سال کے اندر ۱۹۳۵ء میں یہ بھی انتقال کر گئے ۔

نواب صاحب کو کسب معاش سے فراغت مل چکی تھی ۔ اس کی کو پورا کرنے کے لئے سر سیّد علی امام اور مسٹر سیّد حسن امام موجود تھے۔ جب پٹنہ کالج کی پروفیسری چھوڑی تو کبھی وکالت سے جی بہلایا، کبھی ڈاکٹری میں وقت گنوایا، کچھ دنوں زمینداری کے ساتھ کاشتکاری کرتے رہے۔ اس سے طبیعت بھر گئی تو اپنے چھوٹے بھائی سیّد یوسف امام کے تعلق زمینداری کے ساتھ کاشتکاری کا انتظام کرکے باغات

لگانے لگے اور ان باغوں کی باغبانی کرنے لگے۔ پٹنہ اور کرائے پر سرائے کو چھوڑ کر آبگلہ جو گیا شہر کے مضافات مین ہی ہے، جا کر بسے اور گیا کو اپنا ہیڈ کواٹر بنالیا۔

یہ سب کام تو تھے ہی مگر تصنیف و تالیف کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ علمی اور ادبی صحبتیں بھی جمتی رہی تھیں اور ہلکی پھلکی سماجی اور سیاسی تحریکوں میں بھی حصہ لیتے رہتے تھے۔ پٹنہ سے وابستگی کم نہیں ہوئی تھی۔ مہینہ میں دو چار دفعہ یہاں بھی آنا جانا ضروری تھا بلکہ ہفتہ کہیئے، تو ٹھیک ہو گا۔ ان کے یہاں کی صحبتوں سے گری ہوئی طبیعتوں کو سہارا ملتا اوراس دور کے علمی اور ادبی تقاضے بھی پورے ہوتے۔ان کی کتاب کاشف الحقائق اردو شاعری پر اچھی تنقیدی کتاب ہے، اس کے علاوہ اور بھی متعدد تصانیف ان کے قلم سے نکلیں، جن میں طب، زراعت اور باغبانی پر کار آمد کتابیں ہیں۔دو ایک کتابیں مذہبی جھگڑوں پر بھی انھوں نے لکھی ہیں۔ عربی میں بھی مہارت تھی اور فارسی میں اعلیٰ درجہ کی صلاحیت تھی انگریزی زبان پر دسترس رکھتے تھے، ان کی شخصیت بہت پر کشش تھی۔ چہرے سے وقار اور وجاہت حد درجہ نمایاں، کشیدہ قامت ایسے کہ جس مجمع میں جائیں اس میں اونچے نظر آئیں۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے بذلہ سنج اور بڑے خوش تقریر بھی تھے۔ ان کی گفتگو میں ایسا مزہ ملتا تھا کہ سنتے رہیئے اور جی نہ بھرے۔ اپنے زمانے کی مختلف دبستانِ شاعری کے ٹکراؤ سے ہمیشہ الگ رہے۔ چنانچہ اس کو خود کہتے ہیں۔

جھگڑوں سے شاعری کے ہمیشہ الگ رہا
شاید نہ صلح کُل کوئی ہوگا مری طرح

شاہ الفت حسین فریاؔد سے ان کو بھی شاعری میں تلمذ تھا، اس واسطے سے یہ حضرت شاؔد عظیم آبادی کے استاد بھائی تھے۔ پٹنہ میں جو معرکے حضرت شاؔد اور الپنچ سے چلتے رہے ان میں انھوں نے کسی کی بھی پاسداری نہیں کی۔ غالباً اس کے متعلق اوپر والا شعر انھوں نے فرمایا۔

مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ان کا گھر خود شعر و سخن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ شعراء خود کھنچ کر یہاں آتے تھے اور اُن کے یہاں کی پُر لطف صحبت میں اپنے اپنے اشعار سُنا کر دادِ سخن جی بھر کے پاتے تھے۔ خود ان کی مانگ دوسری جگہوں کی صحبتوں میں اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ لوگ چشم براہ رہتے تھے کہ یہ آئیں اور ان کو آنکھوں پر بٹھائیں۔ ان کے قدرداں اور ان کی صحبت کے متمنی ہندو اور مسلمان ہی نہیں بلکہ اس وقت کے انگریز بھی تھے جن کو اردو، فارسی اور شعر و سخن سے کافی دلچسپی تھی۔

نواب سّید امداد امام اَثر کو شاعری بڑی عزیز تھی، مگر شکار کا شوق اس پر غالب رہا۔ آپ کے پاس طرح طرح کی رائفلیں اور بندوقیں ہر طرح کے شکار اور ہر موقع کے لحاظ سے موجود تھیں۔ یہاں کے راجے مہاراجے اور نوابوں کے ساتھ شکار میں اکثر ان کا بھی کیمپ لگتا۔ انگریزوں کے ساتھ بھی مل کر شیروں کا شکار کھیلتے۔ دھنواں منواں کا جنگل شیر کے شکار کے لئے گیا اور ہزاری باغ کے درمیان بہت مشہور ہے۔ وہاں کیمپ لگائے جاتے، جنگل میں ہانکا ہوتا، درختوں پر مانچے باندھے جاتے، ایک مانچے پر خود رائفل اور بندوق لے کر بیٹھتے، دوسرے مانچوں پر ان کے اور احباب بیٹھتے، سبھوں کو ہدایت ہوتی، کہ ایسی خاموشی کے ساتھ بیٹھو کہ ہاتھ پاؤں تک نہ ہلیں، شیر ذرا سی آواز میں ہوشیار ہو جائیگا تو زد پر نہ آئے گا۔ ممکن ہوتا تو پہلی گولی خود چلاتے۔ دوستوں کے ساتھ بڑی رعایت ہوتی۔ اگر ان کو پہلی گولی چلانے کی نواب صاحب اجازت دیتے۔ کبھی ان کا لحاظ کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں، جبکہ اسّی سال سے بھی اوپر پہنچ چکے تھے، اپنے شکار کے واقعات برابر لوگوں سے ایسی رنگین بیانی کے ساتھ کہتے تھے کہ، ان کے سننے میں شعر و شاعری کا لطف آنے لگتا تھا۔

نواب صاحب مرحوم کا ایک دیوان اُن کی زندگی میں چھپا۔ یہ ان کے پہلے دور کا کلام ہے۔ ان کے آخری زمانہ کا کلام ابھی تک نہ چھپ سکا اور نہ لوگوں کے

سامنے آسکا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کیوں کہ خود نواب صاحب اگر چاہتے تو اپنے روپے سے دوسرا دیوان چھپوا سکتے تھے، اس کے علاوہ ان کی اولاد خود بھی دولتمند تھی، جو کچھ روپے لگا کر ان کی یاد کو منظر عام پر لا سکتی تھی۔

اب میں نواب صاحب کے کچھ اشعار آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو زیادہ تر ان کے پہلے دیوان سے اقتباس ہیں۔

؎ شام کو جب چراغ جلتے ہیں دل جلے سَیر کو نکلتے ہیں

؎ ذرّہ ذرہ غیرت خورشید ہے کس نے جھانکا روزنِ دیوار سے

؎ مری طرف سے عدو کی طرف کیا منہ کو نکالا آپ نے یہ رُخ نیا حیا کے لئے

زباں کھلی ہی نہیں اضطراب دل سے آہ اُٹھائے رہ گئے ہاتھوں کو ہم دُعا کیلئے

؎ نالہ کرتا ہے تقاضائے جفائے تازہ اس سے مقصود نہیں شکوۂ بیداد مجھے

؎ اپنی ہو حق سے نہ کر محفل رنداں برہم تو ہی اے شیخ بڑا حق کا شناسا نکلا

تول کر رہ گئے شمشیر دو دم کیا معنی حوصلہ اس میں ہمارا نہ تمہارا نکلا

؎ چشم مجنوں سے اگر پردۂ غفلت اُٹھ جائے اپنے ہی دل میں جمال رخ لیلیٰ دیکھے

میں ہوں اے قیس وہ مجنوں کو بہ چشم عبرت پھاڑ کر پردۂ محمل مجھے لیلیٰ دیکھے

؎ جنبش پا سے ہے انداز قیامت برپا

ساتھ محشر تری رفتار لئے پھرتی ہے

کوہ کن خود تو سبکدوش ہوا پر شیریں

سر پہ الزام کا کہسار لئے پھرتی ہے

؎ جفائیں ہوتی ہیں گھٹتا ہے دم ایسا بھی ہوتا ہے

کرم ہم پر جو ہے تیرا ستم ایسا بھی ہوتا ہے!

عدو کے آتے ہی رونق سدھاری تیری محفل کی

معاذ اللہ! انسان کا قدم ایسا بھی ہوتا ہے

نہ کر شکوہ ہماری بے سبب کی بد گمانی کا

محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

ہمیں بزم عدو میں وہ بلاتے ہیں تمنا سے

کرم ایسا بھی ہوتا ہے ستم ایسا بھی ہوتا ہے

نواب صاحب فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کے دیوان میں کچھ فارسی کی غزلیں ہیں، ایک مختصر سی مثنوی ہے، دو منقبت میں قصیدے ہیں۔ یہ سب ضمیمہ کے طور پر دیوان کے آخر میں شامل ہیں اور اس سے یہ ظاہر ہے کہ انھوں نے باضابطہ طور پر اردو شاعری پر توجہ دی۔ نمونہ کے طور پر ان کے دو چار فارسی کے اشعار بھی درج ذیل کر رہا ہوں:۔

ے داد دلم چہ سوز کہ شمع حریم دوست شب را بہ رنگ من نتواند سحر کند

از جذب عشق دور مپندار اے اثر لیلیٰ اگر بہ وادئ مجنوں گزر کند

ے زگر چوں نہ آب شود زہرۂ عدد یکساں بود گریستن و ناگریستن

ے جرنتوں ضمانیست بذاتت عجیب آفتابی دلے خاصیت جربا داری

حضرت شوق نیموی

درمیانہ قد، سانولا رنگ، داڑھی نہ لانبی نہ خشخشی بلکہ قرینے کی درمیانی، معمولی مگر صاف ستھرا لباس، گفتگو میں متانت، یہ تھے مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی مرحوم جو پٹنہ کی علمی اور ادبی انجمنوں میں اور تمام مشاعروں میں اکثر محشر بدوش نظر آتے تھے۔ وضع سیدھی سادی تھی، ظاہر میں عالمانہ تکبر کا پتہ نہ تھا، مگر جب بھر جاتے تو ہر بات میں عالمانہ تبحر جھلکنے لگتا۔ کہیں پر گرفت کرتے تو آخری دم تک نہ چھوڑتے۔ نئی پرانی منطقی دلیلیں پیش کر کے خاموش کر دیتے۔ سنا ہے کبھی کبھی وضع اسناد بھی بحثوں میں خود کر لیا کرتے تھے اور ان کے بل بوتے پر سامنے کا معرکہ جیت لیتے تھے۔

موضع نیمی پٹنہ سے چند میل پورب شریفوں کی ایک پرانی بستی ہے، وہیں ۱۲۷۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش ان کے تاریخی نام ظہیر السلام سے نکلتی ہے۔ حضرت شوقؔ نیموی عربی میں فارغ التحصیل تھے۔ درسیات کی کل کتابیں حضرت مولانا شاہ محمد سعید علیہ الرحمتہ، حافظ محمد عبداللہ مرحوم اور مولانا عبدالحیٔ مرحوم فرنگی محلی کے زیر تعلیم رہ کر ختم کیں۔ اس پر بھی جب علم کی تشنگی نہ بجھی تو علم طب کی طرف توجہ کی اور حکیم سید باقر مرحوم سے علم طب تکمیل کی شاعری سے ادبی لگاؤ رکھتے تھے۔ حضرت شمشاد لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے اور منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی انہوں نے کچھ فیض پایا تھا۔

حضرت شوقؔ کی طبیعت کی جولانی علمی انجمنوں کو اور شعر و سخن کی محفلوں کو بھی ان کی جولان گاہ بنائے رکھتی تھی۔ مذہبی مسائل اور مذہبی عقائد پر جیسی ان کی زبان چلتی تھی ویسا ہی ان کا قلم بھی چلتا تھا۔ مذہبیات سے متعلق ان کی متعدد تصنیفیں ہیں۔ شعر و ادب کے متعلق بھی اور صحت زبان کے اصول پر بھی انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن سے ان کے مسلم الثبوت استاذ اور بلند پایہ محقق ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اودھ پنچ اور الپنچ کے مستقل اور ممتاز مضمون نگار تھے اور ان دو اخباروں کے علاوہ ملک کے دوسرے مشہور اور سربرآوردہ اخبارات اور رسائل ان کے مضامین کو بڑی وقعت کے ساتھ چھاپتے تھے۔

پٹنہ کے شعر و سخن کے معرکے بڑی حد تک ان کے دم سے بہت دنوں تک جاری رہے، مشاعروں میں کسی شاعر کو ٹوک دینا، زبان اور لفظ کی صحت کا جھگڑا اٹھانا ان کیلئے آئے دن کی باتیں تھیں۔ یہی نہیں بلکہ حضرت شوقؔ نیموی کی ہمت دیکھئے کہ لکھنؤ گئے تو حضرت جلالؔ لکھنوی سے بھی، جو اس وقت ناسخ اسکول کے استاد کہلاتے تھے، صحت زبان کے معاملے میں بھڑ گئے یہ معرکہ بڑا دلچسپ بھی اور بڑا سنسنی خیز بھی تھا۔

حضرت شوقؔ کے اعتراضات ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوئے جس کا نام سرمہ تحقیق تھا۔ شاگردوں کو آگے بڑھا کر حضرت جلالؔ لکھنوی، ان کی آڑ میں جواب دیتے تھے مگر ہر جواب پٹ پڑتا تھا۔ جب یہ معرکہ بہت طول کھینچا تو حضرت جلالؔ لکھنوی کے شاگردوں نے ایک گمراہ کن خط حضرت شوقؔ نیموی کی طرف سے رسالہ "نغمہ بہار" مورخہ فروری ۱۸۸۹ء میں چھپوادیا جس میں حضرت شوقؔ نیموی کا جعلی معافی نامہ درج تھا۔ یہ جعلی خط بھی بڑا مزیدار تھا۔ ذرا اس کا مضمون سنئے :۔

"یہ جدید رسالہ "سرمہ تحقیق" لکھ کر اور ہدیئہ ناظرین کر کے نہایت نادم اور بکمال پشیمان ہوں اور ہر بار اپنے اوپر نفریں کرتا ہوں کہ یہ کیا نادانی اور جہالت مجھ سے سرزد ہوئی کہ میں ایک قصبے کا رہنے والا اور قصبہ بھی وہ کہ عظیم آباد کے مضافات سے ہے لکھنو کے مضافات سے بھی نہیں۔ محاورات اہل زبان سے اس قدر نابلد کہ چھان بنا کی جگہ چھان بین اکثر بول گیا ہوں اور علی ہذالقیاس اور محاورے بھی میری زبان پر ہیں کہ خلاف روز مرہ فصحائے لکھنو ہیں ۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ ۔اور مچلکا لکھتا ہوں کہ اب کبھی ایسا امر مجھ سے وقوع میں نہیں آئیگا۔"

المشتہر محمد ظہیرالدین شوقؔ نیموی عظیم آبادی

حضرت شوقؔ کب رکنے والے تھے انھوں نے فوراً اخبار "مشیر قیصر" میں اس جعلی خط کی تردید کی۔ چھان بین کے صحیح محاورے پر حضرت تپشؔ دہلوی جو اس اخبار کے ایڈیٹر تھے، انھوں نے حضرت شوقؔ نیموی کی ہمنوائی کی اور صاف صاف لکھا کہ جعلی خط لکھوا کر حضرت جلال نے اپنی خفت مٹانی چاہی ہے سو وہ مٹ نہیں سکی ۔اگر ہمت ہے تو رسالہ سرمہ تحقیق کا جواب دیں ۔ پگڑی الجھ چکی تھی، مضامین اور اعتراضات کی بھرمار دونوں طرف سے شروع ہو گئی ۔ حضرت شوق نیموی کی جرآت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ لکھنو میں بیٹھ کر سارے معرکے تنہا لڑتے گئے ۔سند کے لئے کھوج کھوج کر استادوں کے ایسے ایسے اشعار نکالے کہ مخالفین کو چپ ہی ہونا پڑا اس

جنگ کے درمیان جب حضرت شوؔق نیموی کا ایک دوسر رسالہ ”ازاحۃ الاغلاط“ نکلا اور نواب رامپوری کی نظر سے گزرا تو انھوں نے حضرت شوؔق کو بڑی قدر دانی کے ساتھ لکھنؤ سے رامپور بلا بھیجا۔ حضرت شوؔق نیموی رامپور پہنچے تو ایک قصیدہ نواب رام پور کی مدح میں لکھ کر پیش کیا۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے۔ یہ قصیدہ حضرت شوؔق کے دیوان میں موجود ہے۔ نواب رامپور نے خلعت مرحمت فرمایا۔ انعام عطا کیا اور حضرت شوؔق نیموی کو اس اصرار تاکید کے ساتھ رخصت کیا کہ وہ سال میں دو بار ضرور رامپور آیا کریں۔

حضرت شوق نیموی کی طبیعت جنگجو ضرور تھی ،اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر ان کے دیکھنے والوں کو میں نے کہتے سنا ہے کہ وہ بڑی حد تک انصاف پسند اور ملنسار بھی تھے۔ اگر بحث و مباحثہ کی تلخی مٹ جاتی تو اپنے مخالفین کے کمال کا اعتراف بھی کرتے تھے چنانچہ جب حضرت شاؔد عظیم آبادی سے ۱۹۰۲ء میں میل ملاپ ہوا اور باد شاہ نواب صاحب مرحوم کے مشہور چھ طرحی مشاعرے میں پٹنہ کے مختلف گروہ کے کل شعراء دلی کدورتوں کو صاف کر کے اس مشاعرہ میں شریک ہوئے تو حضرت شوؔق نیموی نے اس مشاعرے میں جو رباعی پڑھی وہ میرے بیان کی پوری طور پر تصدیق کرتی ہے۔ رباعی یہ ہے۔

ہے اہلِ کمال سے یہ پٹنہ آباد   شاگرد کے شاگرد یہاں ہیں استاد
کامل ہیں یہاں کے سینکڑوں اہلِ سخن   یہ ہیں وہ ہیں یہ شاؔد ہیں وہ آزاؔد

حضرت شوؔق نیموی کے شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ اس میں دہلی کے ایک شاہزادے مرزا زبیر الدین زبیؔر بھی نظر آتے ہیں جن کی تصنیف موجِ سلطانی ”مہاراجہ دربھنگہ“ نے چھپوائی تھی۔ اسی کتاب میں شاہزادہ زبیر الدین زبیؔر نے حضرت شوؔق نیموی کے ساتھ اپنے رشتہ تلمذ کا ذکر بھی کیا تھا۔ حضرت شوق نیموی

کے آخری زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں کہتے ہیں"..... وہ (شوق نیموی) بہت جی لگا کر اصلاح دیتے تھے اور بعض اوقات غزل کے ساتھ ایک صفحے کے قواعد بھی جن کا تعلق اشعار زیر اصلاح سے ہوتا تھا، لکھتے تھے۔.."

حضرت شوقؔ نیموی نے زیادہ عمر نہ پائی، چوالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور اس وقت ہندوستان کے اکثر مشہور شعراء نے ان کی رحلت کی تاریخیں کہیں۔ تاریخ کہنے والوں میں حضرت عبدالعلی آسیؔ، حضرت جلیلؔ مانکپوری اور حضرت مارہروی وغیرہ بھی تھے۔

جہاں تک حضرت شوقؔ نیموی کی شاعری کا تعلق ہے، یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے مملکتِ شاعری پر صرف اپنے تبحّر کے زور پر قبضہ جما لیا تھا۔ حق پسند اور صاف گو ہو تو ان کے ایسا ہو کہ اپنی شاعری کے متعلق اور اپنے دیوان چھپوانے کے بارے میں خود کہتے ہیں "مگر حق بات تو یہ ہے کہ موجودہ دیوان بھی باوجود اس قدر انتخاب کے پسند نہیں، پھر چھپواؤں تو کیا چھپواؤں" غرض ان کی زندگی میں ان کا دیوان نہ چھپ سکا۔

جب ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں ان کا انتقال ہوا تو لوگوں کو یہ خواہش ہوئی کہ ان کا دیوان چھپ ہی جائے۔ اب ان کی غزلیں اکٹھا کی جانے لگیں تو پتہ چلا کہ بہت سی غزلیں ضائع ہو چکی ہیں اور بہت سی نظموں کا پتہ ہی نہیں ہے۔ بہر حال جس طرح ممکن ہو ان کے کلام کو ایک جا جمع کر کے ایک دیوان مرتب ہوا اور یہ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ فارسی میں ایک نعتیہ قصیدہ صنعتِ مسجع میں ہے۔ باقی کچھ قصیدے اردو میں ہیں، کچھ رباعیاں ہیں اور قطعات ہیں۔ قبل اس کے کہ میں ان کی غزلوں میں سے چند اشعار آپ کے سامنے پیش کروں، آپ ان کی کچھ رُباعیاں سُن لیجیے۔

ے عاشق وہی جس کے ہولبوں پر دم سَرد ہے عشق اسی کو جس کا چہرہ ہو زرد
شاعر وہی جس نے چوٹ بھی کھائی ہے ہے شعر اسی کا جس کے دل میں ہو درد

ے وحشت نے پٹک پٹک کر سر پھوڑ دیا ناصح نے سخت کہہ کے دل توڑ دیا
آخر نہ اٹھا بتوں کا بارِ غمِ عِشق بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑ دیا

ے جب جَور میں بھی شانِ ادا نکلے گی ٹوٹے ہوئے دل سے آہ نکلے گی
وہ کوسنے کو بھی جو اٹھائیں گے ہاتھ اے شوق مرے دل سے دعا نکلے گی

اب اُن کی غزلوں کے کچھ اشعار بھی سُن لیجئے:-

۱ ستم و جَور کی فریاد سے ہم در گذرے ایسے گھبرائے ہوئے تم سر محشر کیوں ہو

۲ اس مقدرّ کو ہمارے نہ مقدرّ کہئے کسی معشوق کا بگڑا ہوا تیور کہئے
مجھ کو دیکھا جو بُرے حال تو منہہ پھیر لیا رحم دل اب انھیں کہیئے کہ ستمگر کہیئے

۳ دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا

۴ مجھ کو سمجھایا اسی کے سامنے ناصح مشِفق کی بھی کیا بات ہے

۵ دل بھی مجھے ملا تو بڑا بے وفا ملا کم بخت یہ بھی اس بُت کافر سے جا ملا

۶ ہیں یہ نیر نگیاں زمانے کی ایک رات ان کی اک ہماری رات

۷ آنکھ میں رہ نہ کہلاؤ گے تم پردہ نشیں خانۂ دل میں رہو صاحب عصمت کیطرح

۸ فتنۂ حشر بھی لیتا ہے بلائیں اُٹھ کر کس قیامت کی ادا ہے تری انگڑائی میں

۹ جو تم کو جانتے ہیں اور بھی ہیں مشکل میں یقین والوں سے بہتر گمان والے ہیں

۱۰ دل رمز آشنا ہی کچھ حقیت تک پہنچتا ہے
کوئی سمجھے گا کیا چشم فسوں گر کے اشاروں کو
تمہارے وعدۂ فردا میں پہلو ہے قیامت کا
تسلی ہو تو کیوں کر ہو تمہارے بیقراروں کو

۱۱ جفا ہو یا وفا ہو تیرے پابند رضا ٹھہرے

جو تڑپایا تو تڑپے ہاتھ دل پر رکھ دیا ٹھہرے

۱۲ تیرا اِسلام مرا کفر برابر اے شیخ تیری تسبیح کا رِشتہ مرے زنار میں ہے

شاعری میں سچ پوچھئے تو حضرت شوق نیموی کا نام ان کی مثنوی حُسن اور شیام سُندرہ کے سبب سے مشہور ہوا۔ "مثنوی سوز و گداز" بھی اس کا نام ہے یہی سوز و گداز اُس کے بیان میں ہر جگہ کار فرما ہے۔ بہت دنوں تک اس مثنوی کے اشعار پٹنہ کے ہر شخص کی زبان پر تھے۔ کہانی اور ساتھ ہی ساتھ انداز بیان بھی اس قدر درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے کہ کچھ لوگوں کو آج تک اس کہانی کے سچ ہونے پر یقین ہے۔ "سوز و گداز" کے علاوہ بھی حضرت شوقؔ نیموی کی اور بھی چند مثنویاں ہیں جو معمولی درجے کی ہیں۔

علی انور شاہ

علی انور شاہ محلّہ خواجہ کلاں کے رہنے والے خوش حال بزرگ تھے۔ ان کو شعر و شاعری کا جنون تھا، ہر مشاعرہ میں ضرور شریک ہوتے تھے اور خود بھی اپنے گھر پر آئے دن مشاعرہ کرتے تھے۔ یوں بھی ہر وقت دو چار شاعروں کو سمیٹے ہوئے بزمِ سخن گرم کئے رکھتے تھے، راستہ بھی چلتے تو ذہن میں اشعار کو ترتیب دیتے چلے جاتے۔ راستے میں کسی سے ملاقات ہو تو علیک سلیک کے بعد مزاج پرسی کرتے اور شعر سنانے لگتے۔ ان کے شاگردوں کا ایک چھوٹا سا حلقہ بھی تھا۔ کچھ دنوں حضرت غالبؔ سے تلمذ کا شرف ان کو حاصل رہا۔ پھر حضرت دبیرؔ لکھنوی سے استفادہ کرنے لگے۔ یہ ان کے لئے آسان بھی تھا کیونکہ حضرت دبیرؔ مرثیہ خوانی کیلئے پٹنہ آتے تھے اور یہ ان کے دامن سے لگے ہوئے ہر وقت ان کی حضوری میں رہتے تھے۔ عمر بھر شاعری کا پیچھا انھوں نے نہیں چھوڑا۔ دمِ آخر شاعری سے ایسی نفرت ہوگئی کہ جب مرنے لگے، تو یہ وصیت کر گئے کہ ان کا سارا کلام دریا بُرد کر دیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے اشعار دو چار جو پُرانے حضرات کو یاد رہ گئے ہیں، ان کے سوا اب ڈھونڈنے

سے بھی نہیں ملتے ہیں۔ ان کا زمانہ بھی کنور سکھراج بہادر اور حضرت صفیر بلگرامی کا زمانہ تھا۔ پرانے لوگوں سے سنا ہے کہ اپنی پوری جائیداد انھوں نے شعر و شاعری کی نذر کر دی تھی اور جس زمانہ میں شاعری کا شوق بڑھا ہوا تھا، ان کے یہاں کے مشاعرے بڑے رنگین ہوا کرتے تھے۔ اب ان کے دو چار اشعار بھی سُن لیجئے:-

۱۔ مائل حسن پرستی ہے طبیعت اپنی   خلق میں عشق بتاں سے ہوئی خلقت اپنی

۲۔ من و سلویٰ ہے توکل میں جو آگے آیا   روز اللہ کے گھر ہوتی ہے دعوت اپنی

۳۔ دل پہ قابو نہیں بے بس ہیں علی انور شاہ   آہی جاتی ہے حسینوں پہ طبیعت اپنی

۴۔ کچھ ایسے واقعات مرے دل کے ساتھ ہیں   جیتے تو ہیں مگر بڑی مشکل کے ساتھ ہیں

میر محمد باقر، باقؔر عظیم آبادی

یہی باقؔر ہیں جن کے متعلق حضرت داغؔ نے اپنی مثنوی ”فریاد داغ“ میں اپنے پٹنہ کے قیام کے بارے میں کہا تھا۔

میر باقؔر کے گھر قیام ہوا   خوب دعوت کا اہتمام ہوا

پٹنہ میں میر محمد باقر، باقؔر عظیم آبادی کا زمانہ بھی وہی تھا جو حضرت شادؔ اور آزادؔ کا زمانہ تھا۔ محلہ گور ہٹہ پٹنہ سیٹی میں رہتے تھے۔ حد سے زیادہ منکسر مزاج ، خلیق اور وضع قطع میں نستعلیق تھے۔ مشاعروں میں جاتے تو صدر سے دور کہیں کسی ایک گوشہ میں بیٹھنے کی کوشش کرتے۔ مگر لوگ ان کو اٹھا کر صدر مقام میں لا کر بیٹھا دیتے۔ صوفی منش تھے، پیری مریدی کا بھی سلسلہ تھا، جہاں مریدوں کا حلقہ تھا وہاں شاعری میں بھی شاگردوں کا ایک چھوٹا سا حلقہ بنا رکھا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے اس فن میں بھی پٹنہ میں بہت اچھے اچھے ان کے شاگرد تھے، جھگڑے بکھیڑے کے آدمی نہ تھے، سب سے جھک کر ملتے تھے اور یہی ان کی ہر دلعزیزی کا سبب بھی تھا۔ مرزا شاغل دہلوی بہت دنوں تک ان کے ساتھ ان کے مکان میں رہے۔ اسی قربت و

ربط کے باعث جب حضرت داغ ۱۸۸۲ء میں پٹنہ آئے تو حضرت باقر ہی کے یہاں مقیم ہوئے۔

حضرت باقر پٹنہ کے خوش حال لوگوں میں تھے۔چوں کہ دل کے صاف بھی ، خلیق بھی اور احباب پرست بھی تھے اس لئے دوستوں سے ان کا گھر ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔پٹنہ میں شاعری کے جھگڑوں سے بھی ہمیشہ کنارہ کش رہے ،اس لئے ان کے گھر پر جو برابر شعر و سخن کی صحبت گرم رہتی تھی، اس میں زیادہ تر ان کے شاگرد اور ان کے احباب ہی شریک رہتے تھے۔حضرت وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے اس لئے کچھ استاد کے رنگ سے بھی اثر پذیر ہوئے اور کچھ ان کے تصوف کا رنگ ان کی شاعری میں جھلکا۔دو رنگوں کا امتزاج ان کی شاعری میں نمایاں طور پر ظاہر ہے۔۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا، اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال سے اوپر جا چکی تھی۔

ان کی زندگی مین ان کا دیوان چھپا اور مقبول ہوا۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار بھی آپ ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ نظر بد کا نہ کر خوف اٹھا رخ سے نقاب
حسن جاناں! ہے مرا عشق نگہبان تیرا

۲۔ دیکھنے کے لئے یوں سارا زمانہ دیکھا
جب تجھی کو نہیں دیکھا تو بھلا کیا دیکھا

۳۔ ہم نہ کہتے تھے کہ طوفاں ہیں یہ آنسو باقر
رونے پر آئے تو کیا بہ گیا دریا دیکھا

۴۔ جلوہ دکھلانے کا اب کونسا وقت آئے گا
آپ خلوت میں ہیں کیا زینت محفل ہو کر

۵۔ کچھ حال غریبوں کی مصیبت کا نہ پوچھو
ہر بات پہ رو دیتے ہیں غربت بھی ہے کیا چیز

۶۔ انھیں جب چاہنے والوں کی صورت ہی سے نفرت ہے
تو پھر حیرت یہ ہے کیونکر کسی کے دل میں رہتے ہیں

۷ وہ ہزار پردہ میں گو رہے وہ ضیا نہیں ہے کہ چھپ سکے
میں نثار اس کے جمال کے کہ نہاں بھی ہے تو نہاں نہیں

۸ نہ نکلا کام جب تدبیر سے کچھ
تو اب تقدیر بے ساماں کو دیکھیں

۹ شکایت مقتضیٔ عشق ہے اس کا گلہ کیوں ہے
زباں پر عاشقِ بیدل کے کیا کچھ دل سے آتی ہے

۱۰ گئی تھی جانبِ راہِ ثواب اپنی نگاہ
ہوا حجاب جو حائل گناہ سے بھی گئی

۱۱ مجاز لاکھ حقیقت کا رنگ دکھلائے
مگر وہ بات کہاں فرق راہ راہ میں ہے

۱۲ کس غضب کی ہے تجلی کہ ٹھہرتی نہیں آنکھ
دیکھ سکتا ہی نہیں جلوۂ جاناں کوئی

۱۳ یہی تسکین کو مضطر ہمیں ہونے نہیں دیتی
کہ اس کا ہر جگہ پر لاابالی کارخانہ ہے

۱۴ اس کے زانو پہ مرا سر ہے خدا کی قدرت
کیا سے کیا ہوگئی دم بھر میں حقیقت میری

۱۵ میرے نزدیک تو ہے آپ کی خواہش کا نام
میں سوا اس کے نہیں جانتا قسمت کیا ہے

سیّد عبد الغفور شہباز

انیسویں صدی کے آخری دَور میں جن حضرات نے اردو نظم و نثر میں مغرب کی روح پھونکی، فرسودہ اور پیش پا افتادہ خیالات کو ہٹا کر ان میں نئی جان ڈالی اور ادب کو صحتمند اور توانا بنا دیا وہی حضرات اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت شہباز بھی ان ہی باکمالوں میں سے ایک تھے۔ مگر یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ بڑا حصہ ان کی بکھری ہوئی ادبی تخلیقات کا منظر عام پر نہ آسکا۔ ان ادبی تخلیقات میں ان کے علمی ادبی اور اصلاحی مضامین ہیں، ان کے انشائی مقالے ان کی طنز و ظرافت سے بھری نظمیں ہیں اور ان ہی میں موضوعاتی اور نیچرل شاعری کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔ ان

میں سے کچھ تو لوگوں کے پاس بیاضوں میں بطور یادگار رہ گئے کچھ گزشتہ دور کے معیاری ادبی پرچوں میں اور الپنچ اور اودھ پنچ کی پرانی فائلوں میں بند پڑے ہیں اور ان میں صرف ایک حصہ وقتاً فوقتاً چھپ کر کتابی شکلوں میں لوگوں کے سامنے آیا۔ کاش اگر ایسا ہو جائے کہ حضرت شہباز کی وہ کل ادبی تخلیقات جن میں نظم و نثر کے جواہر پارے شامل ہیں اور جو ابھی تک بکھری ہوئی ادھر ادھر گنج سر بستہ کی شکل میں دفن ہیں، جمع کر کے شائع کر دی جائیں تو ادب کے ہر پہلو میں جو اضافتیں ان کے قلم سے ابھرتی گئیں، وہ آج کل کے نئے لکھنے والوں کی منزل کو اور بھی آسان بنادیں۔

مولوی سید عبدالغفور شہباز ۱۸۶۰ء سے قبل پیدا ہوئے۔ موضع سرمہرہ جو باڑھ سب ڈویژن کا ایک حصہ ہے اور ضلع پٹنہ میں شامل ہے، وہی ان کا مولداور وطن بھی تھا عربی اور فارسی کی تعلیم ختم کر کے انھوں نے جب انٹرنیس کا امتحان پاس کیا تو اس کے بعد کچھ دنوں تک تلاش روزگار میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرے۔ ان کی پریشانی دیکھ کر ان کے نسبتی بھائی سید عبدالعزیز سب جج جو اس وقت مظفر پور میں تھے انھوں نے حضرت شہباز کو اپنے پاس مظفر پور میں بلالیا۔ اسی زمانے میں سیّد محمد آزاد، جو بعد میں نواب بھی ہوئے اور بنگال، بہار اڑیسہ کے انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن بھی ہوئے، وہ بھی ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر وہیں تعینات تھے۔ یہیں حضرت شہباز کی نواب محمد آزاد سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت سیّد محمود آزاد بھی جو نواب سیّد محمد آزاد کے بھائی تھے وہ بھی کلکتہ سے مظفر پور اپنے بھائی کے پاس آئے ہوئے تھے۔ سیّد محمد آزاد بڑی صلاحیت کے آدمی تھے۔ غرض ان دونوں بھائیوں کی ملاقات نے حضرت شہباز کے لئے ادبی دنیا کا دروازہ کھول دیا۔ مظفر پور میں قیام کے دوران حضرت شہباز کی ادبی صلاحیت اور طرز نگارش نے سیّد محمود آزاد اور نواب محمد کو ان کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ جب کلکتہ سے اخبار "دارالسلطنت" کے اجراء کی بات طئے ہوئی تو ان دونوں بھائیوں نے نواب بہادر عبداللطیف خاں سے سفارش کر کے حضرت شہباز کو

اخبار ''دارالسلطنت'' کا ایڈیٹر مقرر کرادیا۔ یہ ۸۳-۱۸۸۲ء کا زمانہ تھا۔ حضرت شہباز کی ادارت نے اخبار کو بھی اور خود ان کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔ اخبار کے ادرایئے اور اس کے مضامین کے باعث اخبار ہر جگہ مقبول ہوا اور ساتھ ہی ساتھ حضرت شہباز کا شمار بھی بلند پایہ مضمون نگاروں میں ہونے لگا۔ کچھ دنوں بعد احباب کے اصرار سے ایک دوسرا جریدہ ''نمائش'' کلکتہ سے نکالا، یہ بھی بہت مقبول ہوا، ان ہی دنوں میرے والد خان بہادر سیّد ضمیر الدین احمد کلکتہ پریسیڈنسی کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، نواب بہادر عبدالطیف اور سیّد محمود آزاد کے یہاں بھی ان کا آنا جانا تھا، والد مرحوم سے حضرت شہباز کے تعلقات کلکتہ میں اور بھی بڑھتے گئے۔ ۱۸۸۵ء میں جب نواب بہادر عبدالطیف خاں بھوپال میں وزیر مقرر ہوئے تو وہ حضرت شہباز کو بھی اپنے ساتھ بھوپال لے گئے۔ اسی سال میرے والد مرحوم بھی کلکتہ پریسیڈنسی کالج میں اپنی تعلیم پوری کر کے پٹنہ آگئے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت شہباز نے بھوپال چھوڑا تو پٹنہ آئے۔ اس وقت نواب سیّد محمد مظفر پور سے پٹنہ آگئے تھے۔ حضرت شہباز کا پٹنہ میں ان ہی کے یہاں قیام ہوا۔ اس زمانے میں اخبار ''الپنچ'' کا اجراء مولوی سیّد عبدالرحیم کر چکے تھے اور یہ اخبار ان کی ادارت میں پٹنہ ہی میں نہیں بلکہ صوبہ بھر میں اور اس سے باہر بھی مقبول ہو رہا تھا اور لکھنؤ کے ''اودھ الپنچ'' اخبار کے مقابلے کا اخبار سمجھا جانے لگا تھا۔ مولوی سیّد رحیم الدین اپنے اخبار ''الپنچ'' میں مشغولیت کے باعث میرے دو ماموں اور مولوی سیّد عبدالمجید صاحب اور مولوی سیّد عبدالحفیظ صاحب کو تعلیم دینے کی خدمت سے سبکدوش ہو چکے تھے، میرے نانا میر احمد حسین صاحب کو ایک معلم کی فکر تھی کہ وہ ان کے دونوں لڑکوں کو صدر گلی میں رہ کر تعلیم دے سکے۔ میرے نانا میر احمد حسین صاحب نے جب میرے والد سے یہ غرض بیان کی تو والد مرحوم کی نظر حضرت شہباز کی طرف گئی جو اس وقت پٹنہ میں موجود تھے، چنانچہ میرے والد مرحوم نے حضرت شہباز کو راضی کر کے میرے دونوں ماموں کی تعلیم ان کے سپرد کرادی۔

اسی سلسلے میں حضرت شہبازؔ نواب سیّد محمد کے یہاں سے صدر گلی اٹھ آئے۔ مولوی سیّد رحیم الدین کے تعلقات الپنچ اخبار نکالنے کے بعد بھی صدر گلی سے ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت صدر گلی ہی اخبار الپنچ کا صدر دفتر تھا۔ یہیں اخبار کے کُل مضامین مرتب ہوتے تھے اور اس کی پالیسی بنتی تھی۔ علامہ حکیم عبدالحمید پریشاںؔ کی علمی اور ادبی صحبتیں یہیں صدر گلی میں میرے نانا میر احمد حسین صاحب کے گھر روزانہ بعد مغرب منعقد ہوا کرتی تھی جن میں مولوی سیّد رحیم اُلدین، مولوی عبدالغنی وارثی، شمس العلماء مولوی محمد حسین صادق پوری منشی عابد حسین عابد اور اکثر نواب سیّد محمد اور حافظ فضل حق آزادؔ بھی حصّہ لیتے رہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد میرے والد سیّد ضمیر الدین احمد حضرت شوقؔ نیموی، حافظ نذرالرحمٰن وغیرہ بھی اس ادبی صحبت میں شریک ہوگئے۔ صدر گلی کی یہ ادبی صحبتیں سولہ آنہ حضرت شہبازؔ کے مزاج کے مطابق نکلیں، سچ پوچھئے تو پٹنہ ہی میں حضرت شہبازؔ کو پٹنہ میں رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ صدر گلی میں رہنے کے زمانے میں انھوں نے انگریزی تعلیم بی، اے پاس کر کے مکمل کرلی چند سال تک صدر گلی کی ادبی صحبتیں رفتہ رفتہ سُونی ہوتی گئیں۔ سب سے پہلے شمس العلماء، مولوی محمد حسین صادقپوری کا انتقال ہوگیا، کچھ دنوں بعد ۱۸۹۲ء میں میر احمد حسین نے رحلت کی، اُن کے انتقال کے بعد مولوی عبدالغنی وارثی حکومت حیدر آباد میں ملازم ہوکر حیدر آباد چلے گئے۔ یہ حیدر آباد پہنچے تو انھوں نے حضرت شہباز کو بھی وہاں کھینچا۔ حضرت شہباز حیدر آباد میں پہلے تو ہوم ڈیپارٹمنٹ میں مولوی عزیز مرزا کی ماتحتی میں مترجم کے فرائض انجام دیتے رہے مگر کچھ دنوں ہی میں یہ اورنگ آباد کالج میں علم کیمیا (کیمسٹری) کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔ حضرت شہبازؔ کے لئے یہ تقرری اچھی نکلی کیونکہ اورنگ آباد ہی میں ان کو بہت کچھ تالیف و تصنیف کا موقع ملا۔

حضرت شہبازؔ حیدر آباد دکن کے اورنگ آباد کالج میں کئی سال رہے۔ اس کے بعد ریاست بھوپال سے جب ان کو سر رشتہ تعلیمات کے ڈائرکٹر کے عہدے

کی پیش کش آئی، تو یہ بھوپال چلے گئے۔ بھوپال ہی میں ان کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا۔ ان کی یہ بیوی دہلی کی تھیں۔ بیوی کے انتقال کے بعد حضرت شہآز بھی سخت بیمار پڑے اور بھوپال کی نوکری کو خیر باد کہہ کر اپنی سسرال دہلی چلے گئے۔ ان کی بیماری کی خبر جب کلکتہ میں نواب سید محمد کو اور ان کے دوسرے احباب کو ملی تو سبھوں نے اصرار کیا کہ یہ کلکتہ چلے آئیں۔ یہ کلکتہ آئے تو ان کا باقاعدہ علاج شروع ہوا، مگر ان کی زندگی کے ایام ختم ہو چکے تھے۔ ۱۹۰۸ء کے نومبر کے مہینے میں فالج کے ایک سخت دورے میں حضرت شہباز کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا۔

سب سے پہلے بہار میں جن حضرات نے نئے انداز اور نئے اسلوب میں نظمیں لکھیں، وہ حضرت فضل حق آزاد اور حضرت عبدالغفور شہآز ہیں۔ ان دونوں کا زمانہ بھی ایک تھا اور مدتوں پٹنہ میں ان کی باہمی ادبی نشستیں بھی چلتی رہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ یہ دونوں ملک میں اصلاحی اور اخلاقی تحریک کے علمبردار بھی تھے اور فکر و تخیل میں نئے رجحانات کے زبردست طرفدار بھی، مگر ان کے باوجود نظم نگاری میں دونوں کی تکنک یا اسلوب جو کہیئے بڑی حد تک مختلف ہے، اگر فضل حق آزؔاد کی نظموں میں الفاظ کی شوکت اور بلاغت کا طنطنہ ملتا ہے تو شہآز کی نظموں میں زبان کی سادگی اور پُرکاری کا حُسن نظر آتا ہے۔ فضل حق آزؔاد دماغوں پر چھا جانا چاہتے ہیں اور شہآز دلوں میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فضل حق آزؔاد اپنی نظموں کے لئے اونچے اونچے مضامین ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور شہآز پیش پاافتادہ چیزوں میں فطرت کے حُسن کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ مجھے شہآز کی شاعری پر تبصرہ مقصود نہیں۔ یہاں تو ان کی زندگی کا ایک مختصر تذکرہ پیش کر رہا ہوں، جس کے ضمن میں ان کی شاعری بھی لازمی طور پر آجاتی ہے۔

شہآز اپنے عصری ماحول سے کافی طور پر متاثر تھے۔ یہی زمانہ تھا کہ اصلاح قومی کی تحریکیں چل پڑی تھیں اور کامیابی بھی ہو رہی تھیں۔ سر سید احمد خان

کے ساتھ کام کرنے والے اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے پیغاموں کو ادب و شعر میں سمو کر قوم کے سامنے پیش کرتے تھے جن میں مولانا حالی اور مولانا شبلی پیش پیش تھے۔ شہباز کے دل میں بھی قوم کا درد تھا ان کی آنکھیں قوم میں اصلاح و تعلیم کی روح کو کار فرما دیکھنا چاہتی تھیں، چنانچہ ان کی شاعری مین اکثر و بیشتر قومی اصلاح کے نسخے ملیں گے۔ان کے رباعیات کا بھی ایک گراں قدر ذخیرہ ہے۔یہ رباعیاں مروجہ فکر و نظر سے ہٹ کر اس طرح لکھی گئیں کہ ان میں زندگی کے مختلف نفسیاتی پہلو نمایاں ہوئے اور لوازمات زندگی کے تجربے نئے اقدار میں اجاگر کئے گئے۔ ان رباعیوں میں مغربی طرز فکر کی پوری جھلک ہے۔شہبازؔ سے پہلے کسی نے ایسے انداز فکر میں کبھی رباعیاں نہیں کہی تھیں۔ رباعیوں میں اس نئی طرز فکر کے بانی شہبازؔ ہی ہیں۔ اگر نظموں کی طرف آیئے تو ان میں نظیر اکبر آبادی کی بصیرت اوران کے مشاہدات کی جھلک ملے گی۔ اکبر الہ بادی کے طنز و ظرافت کی بھی کہیں کہیں چاشنی ملے گی، ان کے زبان کی روانگی میں تو اکبر الہ آبادی کی زبان و سلاست کا پورا بہاؤ نظر آتا ہے۔

شہباز نے ہر صنف میں شاعری کی مثنوی بھی کہی جس کا نام ”پنجہ خورشید“ ہے۔مسدس بھی کہے اور نظمیں بھی کہیں، جن میں فطری اور موضوعاتی دونوں طرح کی نظمیں موجود ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی انفرادیت ہے جن میں شوخی بھی ہے نزاکت بھی ہے اور اصلاحی تلقین بھی۔ انگریزی نظموں کے ترجمے بھی ان کے کلام میں ہے جن میں شاعری کی روح تبدیل قلب کے بعد ویسی ہی تازہ اور شگفتہ نظر آتی ہے۔شہبازؔ کا کمال انگریزی کی ایک نظم ”دی ہرمیٹ“۔(The Hermit) کے ترجمہ میں اور زیادہ نظر آتا ہے۔انھوں نے اس نظم کو بھاشا میں ترجمہ کر کے حسن میں چار چاند لگادیے ہیں۔

اب ایک بات اور سنئے۔ شہباز سنجیدہ، صاف ستھری اور طنز و ظرافت والی شاعری جہاں کرتے تھے وہاں ہزل گوئی میں بھی بڑی استادی سے کامیاب شاخسانے

لگاتے تے، مرزا ادبیر کے ایک شاگرد مشیرؔ لکھنوی ہزل گوئی میں بہت مشہور تھے۔ انھوں نے ایک "شہر آشوب" لکھا جس میں ایک مغلے اور ایک طوائف کا قصہ بڑی عریانی کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ یہ "شہر آشوب" مغلے اور طوائف کی جنگ پر بلا فیصلہ ختم ہوتا ہے۔ شہباز نے اس شہر آشوب کا تتمۂ "قاضی کا فیصلہ" لکھ کر اور آگے بڑھا دیا ہے۔ ہزل گوئی میں زبان و بیان کی عُریانی اور وہ بھی لکھنؤ کے طرز فکر کے اندر جو شہباز نے "قاضی کا فیصلہ" کے نام سے تتمۂ میں پیش کیا ہے وہ مشیرؔ لکھنوی کی زبان و فکر پر پہلو مارتا ہے۔ میرے پاس وہ شہر آشوب مع تتمہ کے موجود ہے مگر وہ ایسا عُریاں اور فحش ہے کہ میں اس تذکرے میں اس کا اقتباس بھی پیش کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

شہباز کے متعلق ایک بات اور بھی سُن لیجئے جو اکثر ان کے سوانح نگاروں کو غالباً معلوم نہ ہوگی۔ شہبازؔ گانے کے بڑے رسیا تھے اور اس فن میں ان کی دانست اچھی خاصی تھی۔ جس زمانے میں ان کا قیام صدر گلی میں تھا، انھوں نے فنِ موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی مگر قدرت کی ستم ظریفی یہ تھی کہ جتنا بھر موسیقی سے ان کو دلی لگاؤ تھا اتنا ہی ان کا گلا اور آواز اس کا ساتھ نہ دیتی تھی۔ راگ راگنیوں پر قابو ضرور تھا مگر آواز ایسی ناساز گار کہ خود اپنی آواز سے شرماتے تھے۔ اسی لئے اپنے ساتھیوں کے سامنے گانے سے بھی بھاگتے تھے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ رموز موسیقی کی بھی شہبازؔ نے ایک کتاب بڑی تحقیقی اور کار آمد لکھی تھی۔ جب تک یہ پٹنہ میں رہے یہ کتاب نہ چھپی۔ غالباً شہبازؔ نے آخر میں اس کو بھی ردّی کی ٹوکری میں ڈالا کیونکہ ان کے تذکروں میں بھی مجھے کہیں بھی پھر اس کا ذکر نہیں ملا۔

اب آیئے اور تھوڑی دیر شہبازؔ کے گلستانِ شاعری کی بھی گلگشت کیجئے۔ میں آپ کی سیر کے لئے ان کا کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ کلام پیش کرتا ہوں۔ یہ گلہائے مضامین اتنے دافر اور اتنے رنگ برنگی ہیں کہ ان کو پیش کرنے کا دامن تھامنا مشکل ہے۔ بہر حال ان کی فطری شاعری کی متعدد نظموں سے چار نظموں کے الگ الگ تھوڑے تھوڑے اشعار حاضر خدمت ہیں۔

دودھ پلاتی کُتیا

کتیا ہے جو دودھ پلاتی قدرت کی ہے سیر دکھاتی
چھ چھ بچے چمٹے ہوئے ہیں ایک جگہ سب سمٹے ہوئے ہیں
پاؤں ہیں نیچے ہاتھ ہیں اوپر چھاتی پر منہہ لیمن اسکوئیزر
چھاتی نہیں یہ نہہ میں دبی ہے منہہ سے لگی یہ مئے عشی ہے
جس کو دیکھو ہے وہ مزے میں آنکھیں بند ہوئی ہیں نشے میں
عرش سے ان پر مئے ہے برستی رشک کی جا ہے ان کی مستی
ظاہر میں ہے ادنیٰ کتیا باطن میں ہے ھُوَ العلیا
اپنی محبت پر اڑی ہے شفقت کی تصویر کھڑی ہے
حیراں سی چُپ چاپ کھڑی ہے فطرت گویا آپ کھڑی ہے
سر کچھ کچھ آگے کو بڑھائے دُم کچھ کچھ نیچے کو دبائے
جام محبت ہے چھلکاتی رنگ الفت ہے جھلکاتی
انساں کے گر دو ہوں بچّے دو ہی دن میں گھبرا اٹھے
پر کُتیا کے ضبط کو دیکھو تنہا پالتی ہے چھ چھ کو
لطف برابر فرماتی ہے گھبراتی ہے نا اکتاتی ہے

ایک ان کی بڑی لانبی نظم "خاں صاحب" ہے اس میں سے آپ کی تفریح کے لئے چند بند درج ذیل کررہا ہوں۔ اس نظم میں بانس کے درخت کی حکایت ہے۔ جنگلوں میں بانس کے پودوں کا اگنا، وہاں کا ماحول، پھر اپنوں سے بچھڑ کر ایک بانس کا انسان کے ہاتھ لگنا اور ڈنڈا بن کر خاں صاحب کا لقب پانا۔ میرے خیال میں یہ نظم چھپ کر ابھی تک لوگوں کے سامنے پیش نہیں ہو سکی۔

"خاں صاحب"

گرم بہ ظاہر، ٹھنڈا ہوں میں مضبوطی کا جھنڈا ہوں میں
موٹا اور مسٹنڈا ہوں میں گانٹھ گٹھیلا ڈنڈا ہوں میں
آٹھ پہر ہوں اینڈا کرتا
رشک ہے مجھ پر گینڈا کرتا

خاں صاحب کہلاتا ہوں میں لڑ کر جی بہلاتا ہوں میں
سر جس کا سہلاتا ہوں میں خوں میں اسے نہلاتا ہوں میں
پڑتا ہوں جس پہ سنبھل کر
رہتا ہے فوارہ اچھل کر

کیسا ہی ہو بھیڑ بھڑ کا میں نکل آوں مار کے دھکا
دیکھ لے مجھ کو چور اچکا رہ جاتا ہے ہکا بکا
ڈاکو ٹھگ ہیں سہمے دُبکے
چھوٹے ہوئے ہیں سب کے چھکے

بلّم برچھا چھری کٹاری میں ہوں اکیلا سب پر بھاری
کھار میری چھوٹیں کاری ہو گئیں سب تلواریں آری
ٹوٹ گئیں تیروں سے بھالیں
چھوٹ گئیں ہاتھوں سے ڈھالیں

چالاکی کا پُتلا ہوں میں اونچ اور نیچ بتاتا ہوں میں
دیکھنے میں گو اندھا ہوں میں پیٹ میں آنکھیں رکھتا ہوں میں
بوڑھے ہیں مجھ سے طاقت پاتے
اندھے ہیں مجھ سے راہ پہ آتے

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ میں ایک نظم ننھی منی شاعری کے عنوان سے چھپی تھی، یہ نظم کسی دوسرے شاعر کی تھی۔ اس میں ایک بچی نے اپنے معصومانہ انداز میں خدا کے پاس ایک عرضی بھیجی تھی اور استدعاء کی تھی کہ اس کے شیر خوار ننھے منے بھائی کو دانت عطا کئے جائیں شہبازؔ نے بچی کی عرضی کا جواب خدا کی طرف سے جس حکیمانہ انداز میں دیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے، شہبازؔ کی نظم کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں

"نئے بچوں کے دانت کیوں نہیں نکلتے"

پاس خدا کے اس بچی کا لے کے فرشتہ جب خط پہنچا
موہ لیا دل طرز ادا نے ہنس دیا خط کو پڑھ کے خدا نے
خامۂ قدرت ہاتھ میں لے کر لکھی شرح یہ اسی عرضی پر
اے معصوم اے پیاری بچی دیکھ کر تیری نیت سچی
چاہتی ہے یہ میری مرضی ہو منظور یہ تیری عرضی
لیکن یاد رہے یہ تجھ کو یاد تھا دانت بنانا مجھ کو
پر اس میں ایک بھید ہے گہرا وقت ہے یاں ہر کام کا ٹھہرا
وقت سے پہلے کام اگر ہو درہم برہم ہو ابتر ہو
دانت بھی گر اس کے بنوا دوں کیوں کر روٹی گوشت کھلادوں
دانت لگیں گر چکّی دلنے پیٹ لگے بن پاؤں چلنے
کیوں یوں خوش ہے بچہ؟ بولو ناخن سے یہ عقدہ کھولو
خوش ہے وہ اپنی حالت پر شکر کے شربت سے ہے زباں تر
کام زباں سے دودھ سے رکھتی شربت کی ہے لذّت چکھتی
عیش بدن میں مچ جاتا ہے جو پیتا ہے بچ جاتا ہے
بھوک گھڑی بھر ٹل جاتی ہے سیری پنکھا جھل جاتی ہے
فکر سے فارغ ہو جاتا ہے چھاتی سے لگ کر سو جا تا ہے

شہباز کی ایک نظم "آموں کا بچپن"۔ آموں کے درخت سے لے کر آم کے پھلوں کی تیاری تک جو ارتقائی حالت نظر کے سامنے آئی ہے۔ کچھ انھوں نے اس نظم میں بتائی ہے۔ کافی لانبی نظم ہے اس نظم کا صرف ایک ٹکڑا پیش کرتا ہوں، چوں کہ پوری نظم کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

آموں کا بچپن

پھاگن کا ہے مہینہ عشرت کا دور آیا — مہکا ہوا ہے صحرا باغوں میں مور آیا
چہرے سے پتے پتے کے خرمی عیاں ہے — جو شاخ آم کی ہے اِک شاخ زعفراں ہے
شاخیں جھکی ہوئی ہیں ٹہنا تنا ہوا ہے — جو پیڑ آم کا ہے دولھا بنا ہوا ہے
نقش و نگار زرّیں تحریر ہو رہے ہیں — جو پیڑ باغ میں ہیں کشمیر ہو رہے ہیں
اس باغ میں ہیں جتنے بادِ صبا کے جھونکے — مژدے ہیں گوش جاں میں سر سبز کیریوں کے
عشرت کی کروٹیں جوں جوں بدل رہی ہیں — بس کیریاں ہی سانچے سانچے میں ڈھل رہی ہیں
شاخوں میں جب زمرّد کی طرح یہ پھلیں گی — پتوں کے دامنوں میں یہ کیریاں

اب شہباز کی رنگین کلامی دیکھیے۔ ان کی ایک نظم ہے "ہنسی"۔ یہ بڑی طوالانی نظم ہے۔ اس میں انھوں نے ہنسی کے فلسفہ پر بحث کی ہے۔ اس نظم سے چھانٹ کر کچھ شعر ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔

قدما کہتے تھے دنیا کو کہ ہے دارِ محن — قد کو کردار سمجھتے تھے تو زلفوں کو رسَن
دیکھتے رہتے تھے ہر دم لحد دمر قد کو — نخلِ تابوت سمجھتے تھے نہالِ قد کو
پٹی رہتی تھی ہنسی ہونٹوں پر منحوسی سے — دانت کھلتے بھی تھے تو کھلتے تھے مایوسی سے
جیسے بیمار کبھی پی کے دوا ہنستا ہو — ٹوٹے چولھے پہ کبھی جیسے توا ہنستا ہو
سیر قدرت سے بھی وہ غم کا اثر لیتے تھے — آنکھیں بھر آتی تھیں وہ دیکھ جدھر لیتے تھے
شکر صد شکر کہ اب اگلا زمانہ بدلا — باتیں اگلی وہ گئیں ڈھنگ پرانا بدلا
شام میں بھی نظر آتے ہیں سحر کے جلوے — ہر دعائے سحری میں ہیں اثر کے جلوے
رات آتی ہے نظر زلف مسلسل کیطرح — آسماں تاروں سے ہے شوخ کے آنچل کیطرح

اب ذرا دیکھئے کہ جب جذبات بدلے تو صبح کی ہنسی بھی کس طرح کیف آور معلوم ہونے لگی۔

چہرہ صبح سے مٹنے کو ہیں. شب کی زلفیں شکل ہٹ کر ہیں پکڑنے کو طرب کی زلفیں
خط ابیض نہیں، آتی ہے نظر نور کی مانگ اے اثرؔ! اب تو دعاء اپنے لئے حور کی مانگ
ہے صبا منہ سے دوپٹے کو ہٹاتی جاتی ہے جھلک حُسن کی کچھ کچھ نظر آتی جاتی
مہر سیما، نہ کوئی ماہ جبیں لیٹی ہے بستر خواب پہ خود صبح بنی لیٹی ہے
نیم باز آنکھیں ہیں مستی کی دُکانیں کھولے جن کے دامن میں نگاہیں ہیں نہیں کھولے
اب تو بچتا ہی نہیں کوئی نگار آنکھوں میں کیونکہ چھایا ہے قیامت کا خمار آنکھوں میں
پائینتی جبکہ جگانے کو شعاعیں آئیں ڈرتی ڈرتی کہ جگائیں نہ جگائیں، آئیں
کروٹیں صبح قیامت کی بدلتی اٹھی آنکھیں ہاتھوں سے اک انداز سے ملتی اٹھی
بوجھ ہلکا سا کسی دوش پہ دیتی اٹھی کچھ عجب شان سے انگڑائیاں لیتی اٹھی
منہ دُھلانے کو نہ کلثوم نہ مریم دوڑی آفتابہ لئے خورشید کا شبنم دوڑی
جو بن آیا نظر اس حور کا اُمنڈا اُمنڈا منہہ کا دھونا تھا کہ ایک نور کا دریا اُمنڈا
چمکی پیشانی پہ اقبال ضیا بن کے ہنسی دلکی گالوں پہ خوش آئند حیا بن کے ہنسی

شہبازؔ کی ایک لطیف ظریفانہ نظم "بوسہ" ہے جس میں بوسہ کی زبانی کہی گئی ہے۔ یہ بھی لانبی نظم ہے۔ چند شعر اس نظم کے پیش کر رہا ہوں۔ بوسہ کی تعریف بوسہ ہی کی زبانی سنیئے۔

سنو یار نکتہ یہ منہ چومنے کا کہ کھٹا نہ میٹھا مگر ہوں مزے کا
سمجھتے ہیں نامرد گو مجھ کو پھیکا ہے میری ہی سر فتح مندی کا ٹیکا
ملاحت ہے مجھ میں نمک آکے بھرتی ادا مجھ کو قند مکرر ہے کرتی
اگر لب ہوں مئے گوں تو مئے کا مزہ ہے غرض مجھ میں ہر ایک شئے کا مزہ ہے

اب بوسہ کی ہمت کی تعریف سنیئے۔

بڑھاتا ہوں میں ہاتھ شیریں لبوں پر　　کبھی ہوں لبوں پر کبھی غبغبوں پر
کبھی میں ہوں گالوں پہ گل ہو کے کھلتا　　کبھی ہوں لبوں سے میں لب ہو کے ملتا
جہاں بزم رنگیں ہے، رنگیں ہے مجھ سے　　جہاں لعل شیریں ہے، شیریں ہے مجھ سے
مزا ہے ہر اک دل کو میری لگن میں　　مری شمع روشن ہے ہر انجمن میں

شہبازؔ کی سنجیدہ نظمیں بھی بڑے اونچے درجے کی ہیں جن میں اعلیٰ مضامین کے ساتھ خیال و فکر کا تنوع ہے، سلاست ہے اور روانی ہے۔ ان کی ایک نظم ہے -- ہیرے اور کوئلے کی لڑائی، اس نظم کے چند شعر درج ذیل کرتا ہوں۔

ہیرے نے کہا اک دن کوئلے سے مخاطب ہو　　میں مہر ہوں گردن ہو، ہوں ماہ اگر شب ہو
گر تیغ پہ ہو قبضہ مریخ ہو قبضے میں　　گر تاج پہ ہو سایہ ہم رتبہ کوکب ہو
جو مجھ سے ہوا نزدیک اقبال سے ہے نزدیک　　شاہی کا مقرّب ہو جو میرا مقرّب ہو
ترشے ہیں مرے پہلو روشن ہیں مرے جوہر　　جوہر ہے یہ انساں کا اس طرح مہذّب ہو
باطن ہے میرا روشن مشرب ہے مرا صافی　　لازم ہے کہ یوں صافی ہر شخص کا مشرب ہو
اور تو کہ تیری ظلمت گر چھائے زمانے میں　　سورج ہو تو چھپ جائے دن ہو تو وہیں شب ہو
ہو شعلہ فشاں جس دم بڑھ جائے شرارت میں　　شعلے سے ترے پیدا زہر دم عقرب ہو
جل جل کے جلاتا ہے پاتا ہے جسے خرّم　　جب سوختہ ہوں کل مطلب حاصل ترا مطلب ہو
افسردہ ہو تو جس دم افسردہ ہو بے معنی　　افروختہ ہو جس دم افروختہ بے ڈھب ہے
یہ سن کے ہوا کوئلا انگشت کے زینے پر　　سر گرم جواب اس جاں یوں خو مؤدب ہو
مانا کہ تیرے جوہر خورشید کے ہیں جوہر　　مانا کہ ترا جلوہ یہ جلوہ کوکب ہے
ظاہر پہ نہ جا میرے آثار سیاہی کے　　ظاہر ہیں سویداے دل سے تو مخاطب ہو
ترکیب پہ ظاہر کی تعریف نہیں زیبا　　خود میرے ہی اجزاء سے جب تو بھی مرکب ہو

ہر ایک کئی تیری بُرچھی کی انی ۔جب ہو چھیدے ہیں خدا جانے کتنے ہی جگر تو نے

جلنے سے میرے ساماں راحت کا مرتبّ ہو گو جلنے کو جلتا ہوں پر اتنی تسلّی ہے

ہر ملک ہو شائستہ ، ہر قوم مہذّب ہو کھیتی میں تجارت میں لیں کام اگر مجھ سے

یہ ریل یہ اسٹیمر جو ہو مرا مرکب ہو .جب گیس کی صورت میں میں شہر کروں روشن

زہر اب کو جو غم کے تریاق مجرّب ہو ہے میرے ہی شعلے سے یہ آتش سیمابی

شاہوں کے تقرّب کا حاصل مجھے منصب ہو سردی سے اکڑتے ہوں .جب شاہ و گدادونوں

یہ گنج وہ ہیں جن میں گنجینہ مطلب ہو اخبار کے گنجینے آتے ہیں نظر مجھ سے

میں تیرا مسبب ہوں تو میرا مسبب ہو پھر قرن اگر گزریں کچھ زیر زمیں مجھ کو

کر کُحلِ جواہر سے یہ نظم ملقبّ ہو شہبازؔ پھڑک اٹھے روح اسدی سن کر

یہیں پٹنہ میں شہباز نے انگریزی کی ایک نظم ” سام آف لائف“ کا ترجمہ بڑی قادرالکلامی کے ساتھ کیا تھا۔ ان کی یہ نظم غیر مطبوعہ ہے۔ چند شعر اس نظم کے بھی سن لیجیئے۔

نہ کہو مجھ سے کہ یہ عمر ہے اک موج سراب نہ کہو مجھ سے کہ یہ زیست ہے ہمخوابہ خواب

خواب حالت ہے جداگانہ یہ حالت وہ نہیں دیکھتے خواب میں جو کچھ ہیں حقیقت وہ نہیں

زندگی حق ہے، حقیقت ہے، نہیں خواب و خیال گور تغیر مکانی، نہ کہ ہستی کا زوال

خاک ہیں خاک میں مل جائیں گے سچ ہے یہ کلام اس کے مورد مگر ارداح نہیں، ہیں اجسام

نامیوں کے یہ سوانح ہمیں دیتے ہیں سبق ان کی تقلید میں کیوں ہم بھی نہ لے جائیں سبق

جانبِ ملک عدم قافلہ .جب راہی ہو نقش یادشت زمانہ میں ہمارا بھی ہو

نقش پا خضرِ رہ سالکِ ہمت ہو جائے قطع امید نہ ہو قطع مسافت ہو جائے

پٹنہ کے قیام کے دوران میں کئی برسوں کے بعد شہباز صدر گلی سے منتقل ہو کر بانکی پور چلے بھی گئے تو بھی اُن کی ادبی نشست کا سلسلہ صدر گلی میں جاری رہا۔ جب کوئی نئی نظم یا غزل یہ کہتے تو صدر گلی کی صحبت میں خاص کر کے علامہ عبدالحمید صاحب کو سناتے۔ ان ہی دنوں شہباز نے ایک انگریزی نظم "سام آف لائف" کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ حسب دستور شہباز نے حکیم صاحب موصوف کو اپنی یہ نظم سنائی تو حکیم صاحب نے فرمایا "عزیزم شہباز! ہندی میں بھی تو کسی انگریزی نظم کا ترجمہ منظوم کر کے سناؤ"۔ شہبازؔ نے کہا "بہت بہتر" دوسری دفعہ آئے تو گولڈا سمتھ کی انگریزی نظم موسوم بہ "دی ہرمٹ" (The Hermit) کا ترجمہ بھاشا میں منظوم کر کے لائے۔ اس صحبت میں اُن کے سبھی ساتھی موجود تھے۔ یہ نظم شہباز نے پڑھی تو خوب واہ وہ ہوئی۔ میرے ماموں مولوی سیّد عبدالحفیظ صاحب بھی موجود تھے۔ بہت دنوں کے بعد جب شہبازؔ کا تذکرہ آیا تو اس نظم کی شانِ نزدل کا قصہ ان ہی نے مجھ سے بیان فرمایا۔ چونکہ یہ نظم طویل اور کرم خوردہ ہے جو جگہ جگہ پر پڑھی نہیں جاتی اس لئے اس کو ہدیہ ناظرین کرنے سے قاصر ہوں۔

حضرت شہبازؔ نے مغربی انداز فکر کو رباعیوں میں سمویا ہے جن میں خیالی جام و سبو کا کیف اور حسن و عشق کی واردات تو کم ملیں گی، مگر مسائل زندگی کے نو بہ نو حل اچھوتے انداز میں ملتے جائینگے۔ کہیں کہیں مشرقی طرز فکر بھی چھلک پڑیگا نئے اسلوب بیان کے ساتھ انھوں نے کثرت سے رباعیاں کہیں جن کا مجموعہ سیّد محمد آزاد کے دیباچہ کے ساتھ شہبازؔ کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ ان کی رُباعیوں میں سے کچھ رُباعیاں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

نفس کی چوری

کی بھی اس نے کبھی نہ باخدا کی چوری کی بھی اس نے کبھی نہ ناخدا کی چوری
دن رات یہ کام چور نافرمانِ نفس کرتا ہے نبی کی یا خدا کی چوری

دماغ کی تعریف

آتی ہے یہ آواز خود اپنے سر سے شایاں ہے لکھ رکھیں گر آب زر سے
دنیا کے عجائبات مجھ میں ہیں بھرے بہتر ہوں میں ہر ایک عجائب گھر سے

صبح خیزی

صد شکر کہ وقت صبح سو کر اٹھے غنچوں کی طرح شگفتہ ہو کر اُٹھے
ہر طرح دل حزیں نے پائی راحت گو عمر کی ایک رات کھو کر اُٹھے

غم کا علاج

بے چین نہ ہوں غموں میں، غم کچھ بھی نہیں دم بھر کی یہ ٹھیس ہے، الم کچھ بھی نہیں
پائے گا ہر اک دکھ میں بہت کچھ آرام کر دل میں یہی سمجھ کہ "ہم" کچھ بھی نہیں

ہمدرد قوم کی صفت

غیرت میں، فراست میں، شجاعت میں ہو فرد ہمت میں، مروّت میں عبادت میں ہو فرد
لالچ سے مشیخت سے تعلّی سے ہو دور اتنا ہو کوئی تو قوم کا ہو ہمدرد

بیوی کی تعریف

ہے بیوی ہی راہ زندگانی میں انیس ہے بیوی ہی منزل مشقت میں جلیس
بے چین ہو دل تو ہے مفرّح معجون زخمی ہو اگر جسم تو مرہم ہے نفیس

حضرت شائق عظیم آبادی

سیّد نظیر حسین شائق مرحوم محلّہ نون گولہ کے رہنے والے تھے۔ اگلے وقتوں میں ان کے گھر میں امارت و ثروت رہ چکی تھی۔ اب بھی معززین میں ان کا شمار تھا۔ پرانے زمانے کی بچی کھچی جائداد پر بے فکری کی زندگی بسر کرتے تھے اور وقت گذاری کے لئے شعر کہتے۔ مجمع احباب کی زینت بڑھاتے اور اس طرح اپنا جی بہلاتے تھے۔ حضرت شاد کے معتمد علیہ شاگرد تھے۔ استاد پر جہاں کسی نے اعتراض کیا یہ الجھ پڑتے۔ استاد کے لئے سینہ سپر بنے ہوئے ہر جگہ ساتھ رہتے تھے۔ طبیعت بڑی شگفتہ

تھی۔ دوستوں کی محفل ان کے دم سے گلزار رہتی تھی۔ گفتگو میں کشش ایسی تھی کہ مجمع کو فوراً اپنی طرف مخاطب کر لیتے تھے۔ حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ ایک کہیئے تو اس کا سو جواب برجستہ ضلع جگت میں سن لیجئے۔ مشاعرہ ہو، بزم نشاط ہو یا مجمع عام ہو یا خلوت خاص ہو، یہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ میں نے ان کو دیکھا ہے، دراز قد، وجیہہ صورت، خاصے گورے چٹے آدمی تھے۔ میرے ہوش کے زمانہ میں ان کے چہرے سفید لانبی داڑھی خوب زیب دیتی تھی۔ ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور آنکھیں گردش کرتی ہوئی ہر چیز کا جائزہ لیتی رہتی تھیں۔ شعر بھی بڑے دبنگ آواز میں پڑھتے تھے۔ شعر گوئی میں ان کا اپنا خاص انداز تھا۔ ان کو گذرے ہوئے کافی دن ہوگئے مگر ان کا دیوان ابھی تک غیر مطبوعہ ان کے عزیزوں کے پاس پڑا ہوا ہے۔ میں ان کے چند اشعار ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ شائق نے کیا قبول اسلام شاید رُخ سے نقاب سرکی
۲۔ دل بھی سب ایک سے نہیں ہوتے کوئی شیشے کے کوئی پتھر کے
ہم سا کافر ابھی پڑھے کلمہ پہلے رُخ سے کوئی نقاب تو سرکے
۳۔ کوئی تو بات ہے ساقی کے میکدے میں ضرور کہ دور دور سے میخوار آکے پیتے ہیں!
خدا ٹھکانے لگائے حباب کی محنت ہوا اُبھار کے لے تو چلی ہے ساحل کی
تھکے ہوئے تھے مسافر عدم کے کچھ ایسے کہ چلتے چلتے بھی رستے میں ایک منزل کی

رائے بھوانی پرشاد آزاد

یہ مہاراجہ رام نرائن موزوں کے خاندان کے پس ماندگان اور پٹنہ کے رئیسوں میں سے تھے۔ یہ ہندو مسلمان کے مساوات اور یک جہتی کے حامی تھے۔ ان دنوں کی گنگا جمنی صحبتوں میں شعر و سخن کا بھی چرچا رہتا تھا۔ اس وقت اردو، فارسی دونوں کی زبان تھی۔ یہ بھی شعر کہتے تھے، ان کا دل بڑھانے کے لئے ان کے مصاحبین اور ان کے روزانہ ملنے جلنے والے احباب موجود تھے۔ ان کے یہاں بھی مشاعرے ہوتے اور یہ بھی دوسروں کے یہاں مشاعروں میں جاتے۔ حضرت شاؔد کی استادی کا دور

دَورہ تھا۔ یہ بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ استاد بھی دل بڑھاتے تھے۔ طبیعت موزوں پائی تھی اس لئے کچھ اچھے شعر بھی نکال لیتے تھے۔ حضرت شآد سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو ہو گیا۔ یہ صاحب دیوان تھے۔ ایک مثنوی بھی لکھی تھی، مگر نہ انؔ کا دیوان چھپ سکا اور نہ ان کی مثنوی۔ اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ کون بتلائے کہ ان کے دیوان اور ان کی مثنوی کا کیا حشر ہوا۔ تلاش جستجو کے بعد ان کے کچھ شعر ملے جن کو آپ کے ملاحظہ کے لئے لکھ رہا ہوں:-

۱؎ کیوں کریں سجدہ بتوں کو بے سبب جب ہمیں اللہ ہی سے کام ہے

دشمن جاں اَب ہمارا ہے لقب جاں نثاری کا یہی انعام ہے

۲؎ ناراض مجھ سے کیوں دلِ مغرور ہو گیا تجھ سے گناہ کیا دلِ مجبور ہو گیا

۳؎ نہ اس سرا کا کبھی بند کارخانہ ہوا کوئی سَحر تو کوئی شام کو روانہ ہوا

۴؎ نہ کرتی موج حوادث اگر دراندازی تو بحرِ غم سے ہمارا عبور ہو جاتا

بابو گوبردھن لعل مضطؔر

یہ تھے تو ماڑواڑی، مگر یہاں کی گنگا جمنی تہذیب ان کے رگ وپے میں رچ گئی تھی۔ ان کے والد مارواڑ سے پٹنہ سے آئے۔ یہیں انھوں نے تجارت شروع کی جس میں ان کو بہت فروغ ہوا۔ بابو گوبردھن لعل مضطؔر کی جائے پیدائش عظیم آباد تھی۔ شریف خاندانوں کے بچوں کی طرح ان کی تعلیم و تربیت اسی قاعدے سے ہوئی جو مرّوج تھا۔ اردو فارسی میں کافی مہارت تھی۔ ان کے والد کا انتقال ہوا تو تجارت اور ان کا سودی کاروبار اُن کے متعلق ہوا۔ انھوں نے اپنے بیوپار میں اور بھی ترقی کی۔ پٹنہ کے رئیسوں اور شریفوں کے یہاں آنا جانا تھا۔ اپنے بیوپار سے وقت نکال کر یہ بھی کبھی کبھی رنگین محفلیں سجاتے اور شعر و سخن کی بزم بھی منعقد کرتے۔ یہ زمانہ وہ تھا، کہ ہر ہندو اور مسلمان رئیس اور شریف پٹنہ میں اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے تھے اور

سب کے سب ایک متحدہ تہذیب میں رنگے ہوئے نظر آتے تھے۔ بابو گوبردھن لعل مضطؔر نے ارد گرد نظر ڈالی تو سبھوں کو شعر و سخن کا رسیا پایا۔ آدمی ذہین اور طبّاع تھے، یہ بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے اور شعر کہنے لگے۔ یہ کنور سکھراج بہادر رحمتی کے آخری دنوں کی بات ہے کہ بابو گوبردھن لعل مضطؔر کا نام بھی مشاعروں میں آنے لگا اور یہ بھی شاعروں کی صف میں جگہ پانے لگے۔ یہ کس کے شاگرد تھے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ اب تو ان کے گذرے ہوئے بھی بہت دن ہوگئے اور پٹنہ کے لوگ ان کو بھول گئے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام کا بھی کچھ پتہ نہیں مگر ان کے دو ایک شعرا بھی پُرانے لوگوں کی زبان پر ہیں، ان کو پیش کر رہا ہوں:-

کہتی ہے روح تن سے نکلنے کے واسطے　　اتنے ہجومِ غم ہیں کہ رستا کہاں مجھے
مملو عتاب سے ہے ہر اک حلقہ زلف کا　　بتلا تو لے کے جاتا ہے اے دل کہاں مجھے

رائے ایشوری پرشاد عطاؔ عظیم آبادی

یہ محلہ کالی استھان میں رہتے تھے۔ انگریزی اور فارسی پر کافی عبور تھا۔ ایک بڑے خاندان کے رُکن تھے اور پٹنہ کے معزّز اور دولت مند رئیسوں میں ان کا شمار تھا۔ حضرت شاؔد کے شاگردوں میں تھے۔ پٹنہ کی شعر و سخن کی محفلیں اُن سے اُجاگر رہتی تھیں۔ مشاعروں میں بڑے اہتمام سے جاتے تھے۔ شعر کہنے سے جتنا ان کو لگاؤ تھا، اس سے زیادہ فن و عروض سے دلچسپی رکھتے تھے۔ عروض کے فن کے متعلق دو ایک کتابیں بھی لکھی تھیں جن میں ایک کا نام "عروض ایشوری" تھا۔ یہ کتاب ان کے زمانے میں چھپی بھی تھی۔

رائے ایشوری پرشاد عطاؔ کی ذات بھی دلچسپ تھی، ان کی گفتگو بھی دلچسپ ہوتی تھی، ان کا شعر پڑھنا بھی دلچسپ ہوتا تھا۔ غرض یہ کہ ہمہ وجوہ دلچسپ تھے۔ احباب کے سامنے اپنا شعر پڑھتے، تو فن عروض کے نکات بڑی شرح و بسط کے ساتھ سمجھاتے جاتے۔ اشعار کے معنی اور مضمون پر زور نہیں دیتے بلکہ عروض کے

قواعد کے پورا ہونے کو شعر کی جان سمجھتے تھے۔ مشاعروں میں جاتے تو غزلیں پڑھنے والوں کی ہر غزل کے شعر کی آہستہ آہستہ تقطیع کرتے جاتے۔ کوئی شعر اگر تقطیع سے گرا ہوتا تو مشاعرے میں ہی ٹوک دیتے۔ مشاعروں کی غزلوں کے متعلق کوئی پوچھتا کہ رائے صاحب کس کی غزل کامیاب رہی؟ تو جواب دیتے بھئی! یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ کس کی غزل تقطیع سے گری ہوئی نہ تھی، میں تو غزلوں کی قدر و قیمت، فنِ عروض کے قواعد میں پورا اترنے سے لگاتا ہوں۔ ان کے ساتھ یہی ہوتا تھا کہ مشاعروں میں غزلیں ختم ہو جاتیں اور یہ ان کی تقطیع میں لگے رہتے۔ خود غزلیں لانبی کہتے تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر قافیئے لاتے اور بعض تو ایسے سننے والے چکرا جاتے۔ اکثر و بیشتر ان کی غزلیں فنِ عروض میں ان کے کرتب کا مظاہرہ ہوتیں۔ جب یہ پڑھنے کو بیٹھتے تو لوگ گھبرا اُٹھتے۔

پہلی بیوی کا انتقال ہوا تو ایک عیسائی عورت سے شادی کر لی تھی۔ یہ ہندوستان عیسائی میم تھی۔ اس لئے اب ان کے گھر کے ٹھاٹھ باٹھ سب انگریزی ہو گئے تھے۔ ہر چیز میم صاحب کی مرضی کے مطابق ہوتی تھی۔ ان کا گھر ایک انگریز کا سولہ آنہ گھر معلوم ہوتا تھا جن میں صرف ایک ہی چیز ہندوستانی تھی اور وہ بھی خالص ہندوستانی یعنی رائے ایشوری پرشاد عطؔا کی اپنی ذات، گیروا لباس، داڑھی اور مونچھیں منڈی ہوئی، سر کے بال بھی بالکل منڈے ہوئے یا قینچی زدہ ملنے کا انداز پورا ہندوستانی، بات چیت ہندوستانی، ان کے احباب ہندوستانی اور ان کے مشاغل بھی ہندوستانی۔ ان کی میم عیسائی تھی اور عمر بھر عیسائی رہی۔ اس سے دو بیٹے رائے صاحب کو تھے۔ بڑے کا نام ملیکم سنہا اور چھوٹے کا نام اڈون سنہا تھا۔ انگریزی طرز پر ان دونوں کی تعلیم بچپن ہی سے ہوتی گئی۔ لباس، گفتگو اور رہنا سہنا ان دونوں کا سبھی کچھ انگریزی تھا۔ ان کا مذہب بھی عیسائی تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر رائے پکّے ہندو تھے۔ کیا مجال کہ ان کے مذہبی معتقدات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ مذہبی پابندی کے ساتھ رواداری بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی عیسائی بیوی اور عیسائی بیٹوں کے ساتھ بڑے میل ملاپ کے ساتھ زندگی بسر کر گئے۔ یہی حال مسلمان دوستوں کے ساتھ تھا۔

غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں رائے ایشوری پرشاد کا انتقال ہوا۔ان کے بعد ہی ان کا زوال شروع ہو گیا۔ ان کے دونوں بیٹے تعلیم یافتہ ، نیک ، ملنسار سب کچھ تھے، بڑے کی شادی الہ آباد کے ایک عیسائی گھرانے میں ہوئی تھی۔ چھوٹا بیٹا اڈون سنہا انگلستان سے بیاہ کر ایک پکی میم لے آیا تھا۔ ان دونوں کے بڑھتے ہوئے اخراجات نے اور زمینداری کے معاملات کی عدم واقفیت نے آمدنی میں خلل ڈالا۔ آمدنی سے اخراجات پورے ہوتے نظر نہ آئے تو میلکم سنہا اور اڈون سنہا قرض لینے پر اتر آئے۔زمینداری پر قرضہ چڑھتا گیااور زمینداری کے مواضعات نیلام ہوتے چلے گئے۔بوڑھی میم اسی درمیان میں مر گئی۔ آخر رائے صاحب کی ساری زمینداری نیلام ہوئی اور شاید کچھ بکی بھی ہو، اور ان کے دونوں لڑکے آخر میں سرکاری نوکری کرنے پر مجبور ہوئے۔ ابھی تک انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔اس لئے دونوں کو اچھی ملازمتیں مل گئیں، پھر اچھے حالت آ گئے۔اڈون سنہا کا انتقال غالباً ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس کے چند سال بعد بڑے بھائی میلکم سنہا کا انتقال ہوا۔ میری دونوں بھائیوں سے ملاقات تھی اور حقیقت پوچھئے تو باپ کا اثر اندر اندر دونوں بھائیوں پر کافی تھا۔ ظاہر میں تو صاحب بہادر مگر دل ان کا ہندوستانی تھا۔

رائے ایشوری پرشاد عطاؔ کا مجموعہ کلام کافی ضخیم تھا۔ اس میں غزلیں قطعے ،رباعیاں،مسدس ، مخمس ، وغیرہ سب کچھ تھے مگر افسوس ہے کہ یہ مجموعہ نہ چھپ سکا۔

میں ان کے دوچار شعر جو مل سکے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

قیامت ہے ترا آنکھیں چرانا اپنے بسمل سے　　خدا کے واسطے اتنا تو کہہ دو میرے قاتل سے
بہت رسوا ہوئے میکش نکل کر تیری محفل سے　　گرے ہر ہر قدم پر منہ کے بل مستی میں اے ساقی
جو کہ شاکر ہے وہی مشکور ہے　　شکر ہم کس کا کریں ناصح بتا

ڈاکٹر سید مبارک حسین مبارکؔ عظیم آبادی

نئی تحریکیں، قوموں میں صحتمند ادب اور نئے شعور کی تخلیقی صلاحتیں ہمیشہ پیدا کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ یہی سبب ہے کہ ہر دور اپنے وقت کے نمائندوں سے پہچانا جاتا ہے اور نئی محفلیں ان ہی کے فکر کے اقدار سے سجتی بھی ہیں۔ یہ نمائندے اٹھ گئے تو وہ مخصوص دور بھی ختم ہوا۔ جب ذوقؔ، مومنؔ و غالبؔ کے بعد دلی میں ان کے دور کی بساط اٹھی تو میر مہدی مجروحؔ، حالیؔ اور داغؔ کا دور شروع ہوا۔ جب یہ دور بھی اپنی آخری منزل پر پہنچا، تو اپنے دور کے سخن فہم حضرات کو حالیؔ نے اس طرح متنبہ کیا۔

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں   نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

پٹنہ میں بھی اپنے دور کے آخری نمائندہ حضرت مبارک عظیم آبادی نے جب اپنے وقت کی بہار کو خزاں ہوتے دیکھا تو بول اٹھے۔

ان کا بھی اب چمن سے مبارک ہے چل چلاؤ   کچھ پھول رہ گئے ہیں جو اگلی بہار کے

یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے دور کا اختتام بھی دیکھا۔ اس پر کس حسرت سے کہتے ہیں۔

سر بہ زانو ہیں مبارک اس تحیّر میں ہم آہ   کل تھے ہم جن صحبتوں میں آج وہ کیا ہو گئیں

نئی محفلوں کو سنورتے دیکھتے تو آہیں بھرتے ہیں۔

لاکھ جلسے ہوں مبارک تو ہمیں کیا مطلب   جس سے دل اپنا بہلتا تھا وہ محفل نہ رہی

اگر چہ اگلی محفل ختم ہو چکی تھی، پھر بھی ایک اکیلی شمع ایک مدت تک مونس و دمساز جلتی رہی اور اپنی روشنی سے گذری ہوئی بزم کی عکاسی کرتی رہی۔ کوئی اس کے دل سے پوچھتا کہ محفل کی محفل اٹھ گئی اب تو اکیلی کس لئے جل رہی ہے؟ مگر یہ تو کوئی ہمدم و ہمراز ہی پوچھتا اور ایسے سب کے سب ایک ایک کر کے پہلے ہی اٹھ چکے تھے۔

۱۸۶۸ء میں سیّد مبارک حسین مبارکؔ عظیم آبادی، پٹنہ ہی کی خاک سے اٹھے اور نوّے برس کو پار کر کے اسی خاک کے پیوند ہو گئے۔ عظیم آباد کے ایک سَر بر آوردہ خاندان کے فرد تھے، ان کے والد سیّد فدا حسین بہت دنوں تک منصفی کے عہدے پر ممتاز رہے۔ علم و ادب میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے اور اردو فارسی میں اچھے شعر کہتے تھے۔

حضرت مبارکؔ عظیم آبادی نے گھر پر فارسی کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد انگریزی کی تعلیم کی طرف رجوع کیا۔ انٹرنس ہی میں تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھا۔ عزیزوں سے خانہ جنگی شروع ہوئی۔ بنا بنایا گھر بگڑا تو کسبِ معاش کی فکر ہوئی۔ پہلے طب کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اس سے دل ہٹا تو ہومیو پیتھک کا درس لینا شروع کیا اور اس فن میں تکمیل حاصل کی تو ڈاکٹری شروع کر دی۔ حضرت مبارکؔ کو بچپن سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ ان کے والد روکتے تو چھپ چھپ کے شعر کہتے اور اپنے مخصوص دوستوں کو سناتے۔ پہلے مولوی حسن جان خاں سہسرامی سے اصلاح لیتے تھے، اس کے بعد علامہ حکیم عبدالحمید پریشاں مرحوم کے پاس اصلاح کے لئے آئے حضرت داغؔ دہلوی کا اس وقت تمام ہندوستان میں بڑا شہرہ تھا۔ ان کا کلام سنا تو اپنی منچلی طبیعت کے مطابق پایا۔ ان ہی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ حضرت مبارکؔ نے طبیعت بھی بڑی رنگین پائی تھی۔ اس پر شاعری کا شوق سونے پر سہاگہ ہوا۔ ڈاکٹری نام کو رہی۔ شاعری نے سولہ آنے اپنا لیا۔ یہ بھی قسمت کی بات تھی کہ حضرت داغؔ سے وابستہ ہوئے، کیوں کہ حضرت مبارکؔ کو بھی طبیعت کا اُبھار استاد ہی کی طرح ملا تھا، ان ہی کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ حضرت مبارکؔ کے کلام کو پڑھئے تو ان میں آپ کو سولہ آنہ حضرت داغؔ ہی کی زبان کا چٹخارہ اور ان کے طرز بیان کے مکمل نمونے ملیں گے۔ وہی شوخی، وہی حلاوت اور ویسی ہی معاملہ بندی نظر آئیگی، مگر ساتھ ساتھ اکثر جگہ آفاقیت بھی جھلکتی جائے گی جو حضرت مبارکؔ کی انفرادیت پر دال ہے۔ حضرت

بیخود دہلوی مرحوم، حضرت سائل مرحوم جو حضرت داغ کے جانشین کہلاتے تھے اور دونوں نے برابر اعتراف کیا کہ استاد کی شاعری کا پورا پر تو حضرت مبارکؔ ہی کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ عظیم آباد نے بھی ان کو، ان کی انفرادیت کے لحاظ سے ممتاز جگہ دی۔ اگر حضرت شادؔ عظیم آبادی کے رنگ نے یہاں کی شاعری کو بڑی حد تک اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا مگر حضرت مبارکؔ کا اپنا رنگ بھی وہ چوکھا تھا کہ ہر بزم مشاعرہ میں وہ نمایاں رہا۔ حضرت مبارک نے شعر و سخن کی صحبتوں میں اہل سخن کے ہمزباں ہو کر جو کہا وہ اپنے ہی رنگ میں کہا۔ یہ کمال نہیں تو کیا ہے کہ جہاں بزم سخن میں حضرت شادؔ کی شاعری آفتاب بن کر چمکی وہاں حضرت مبارکؔ عظیم آبادی کی شاعری نے جو شمع روشن کی اس کی لو بھی پورے طور پر ضو فگن نظر آتی رہی۔

حضرت مبارکؔ عظیم آبادی شاعری کے لئے بنے تھے اور وہ بھی ان کی کائنات زندگی بن کر آخر دم تک ان کا ساتھ دیتی رہی۔ حضرت مبارکؔ اور ان کی شاعری کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ دیکھ کر حکومت ہند نے بھی حضرت مبارکؔ عظیم آبادی کے گزرانِ زندگی کے لئے ان کے آخری زمانے میں ایک سو روپے کی ماہوار پنشن تاحیات مقرر کر دی تھی۔ اس طرح عظیم آباد کا ایک کامل فن شاعر عسرت اور مالی پریشانیوں سے اپنے آخری ایام میں صرف اپنی شاعری کی بدولت بچ گیا۔ حضرت مبارکؔ عظیم آبادی کا مکان میرے مکان سے نزدیک محلہ خواجہ کلاں میں تھا۔ ہمیشہ سے میرے والد کے پاس ان کا آنا جانا تھا۔ اس وقت حکیم عبدالحمید مرحوم زندہ تھے اور ان کی یادگار علمی صحبتیں بھی میرے مکان میں چل رہی تھیں۔ (یہ میری پیدائش سے قبل کا زمانہ ہے جو میری پیدائش کے کچھ دنوں بعد تک جاری رہا۔) حضرت مبارکؔ بھی ان صحبتوں میں قریب قریب شریک ہو جاتے۔ جب علامہ حکیم عبدالحمید پریشاںؔ کی علمی صحبتیں ختم ہو گئیں اور اس کے بعد حکیم صاحب مرحوم بھی انتقال کر گئے تب بھی حضرت مبارکؔ والد مرحوم کے پاس آتے اور ان کو اپنے

اشعار سناتے۔ میرے دو ماموں میر عبدالحمید مرحوم اور خان بہادر ابراہیم حسین صاحب مرحوم سے بھی حضرت مبارکؔ کو بڑا یارانہ تھا۔ دونوں پاس ہی محلّہ ٹیڑھی گھاٹ میں رہتے تھے۔ ایک دن حضرت مبارکؔ میر ابراہیم حسین صاحب مرحوم کے پاس آئے اور کہنے لگے دیکھا آپ نے! حضرت شادؔ نے اپنے ایک مقطع میں اپنی آبرو تو بڑھائی مگر عظیم آباد کی عظمت کو مٹی میں ملا دیا اور پھر حضرت شادؔ کا یہ قطعہ پڑھا۔

مجھ ہی پر شادؔ پڑتی ہیں نگاہیں نکتہ سنجوں کی وطن خوش نام ہے جس وقت تک باقی ہے دم میرا

میر ابراہیم حسین مرحوم مسکرا کر بولے کہ اگر ایسا ہے تو آپ اپنے کسی مقطع میں اپنے ساتھ وطن کو بھی سر بلند کر کے دکھایئے۔ جواب میں حضرت مبارکؔ نے اپنی نئی غزل کا یہ مقطع سنایا۔

مبارکؔ بھی اسی خاک عظیم آباد سے اٹھا سلامت وہ زمیں یارب جو مردم خیز ہوتی ہے

آدمی مرنجان مرنج، لڑائی جھگڑے سے دور، سب کے دوست اور سب کے مداح تھے۔ جس جگہ پہنچ گئے شعر و شاعری چھڑ گئی۔ اپنا شعر سناتے، دوسروں کا سنتے، خوش دلی سے داد لیتے اور فراخ دلی سے داد دیتے۔ پڑھنے کا طریقہ بھی سب سے نرالا تھا۔ مشاعروں میں شعر پڑھتے پڑھتے کھڑے ہو جاتے، الفاظ کے ساتھ ساتھ اپنے تیور سے اور اپنے ہاتھ کے اشاروں سے شعر کے معنی کی تصویر پیش کر دیتے۔ جوش میں آتے تو پڑھتے پڑھتے خود بھی شعر کی تفسیر بن جاتے۔ اپنے دور کے سب شاعروں سے یارانہ تھا۔ حضرت شادؔ عظیم آبادی کے یہاں بھی جا کر برابر ان کا کلام سنتے اپنا کلام سناتے۔ یہی مراسم حضرت فضل حق آزادؔ، حضرت شوقؔ نیموی، میر باقرؔ عظیم آبادی، حفیظؔ جونپوری اور شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ کے ساتھ بھی تھے۔ حضرت شادؔ اور حضرت آزادؔ کی جنگ مشہور تھی، مگر یہ ان کے بھی دوست تھے اور ان کے بھی۔ نواب امداد امام اثرؔ سے سسرالی قرابت تھی۔ نواب صاحب سن میں ان سے کافی بڑے تھے، مگر شاعری میں حضرت مبارک کو برابر کا درجہ دے رکھا تھا اور محبت بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا

واقعہ ہے کہ حضرت مبارک مجھ سے بیان فرمانے لگے کہ برسات کے دن تھے۔ کالی کالی گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر آسمان پر منڈلا رہی تھیں اور میں نواب سیّد امداد امام اثر کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ "عزیزم اس وقت کوئی تازہ غزل سناؤ"۔ میں نے اپنی نئی غزل کا یہ مطلع پڑھا۔

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

نواب صاحب مرحوم نے اس مطلع کی بیحد تعریف کی اور کہنے لگے "میاں! تمہارا مطلع کسی اور بات کا بھی پتہ دیتا ہے"۔ میں نے پوچھا "وہ کیا ہے؟" فرمایا "سچ بتاؤ کبھی مئے گساری بھی کی ہے؟" جواب دیا استغفر اللہ! میں نے تو آج تک ایک بوند بھی نہیں چکھی۔ "نواب صاحب بولے" پھر تو کمال ہے۔ یہ مطلع سوائے رند میخوار کے کوئی دوسرا کہہ نہیں سکتا"۔ اسی غزل کا جب مقطع سُنا تو اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور دیر تک سینے سے لگائے رہے۔ مقطع کو بار بار پڑھتے اور کہتے کہ "واللہ تم عارف باللہ ہو۔"

مبارکؔ میں تصدق اپنے اس مشق تصور کے مجسم اب وہ تصویر خیالی ہوتی جاتی ہے

حضرت مبارک دوستی کے بھی بڑے پکے تھے۔ کسی سے اگر صرف ملاقات اور تھوڑی سی رسم و راہ بھی ہو گئی تو اس کو زندگی بھر نبھاتے، دوستی تو اس سے بہت بڑی چیز تھی۔ اپنے دوستوں اور احباب پر ہمیشہ جان چھڑکتے رہے۔ دیکھئے اپنی احباب پرستی کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

وہ الفت دوست ہوں ناصح دعا ہی دل سے نکلی ہے اگر دشمن کے گھر بھی مجمع احباب دیکھا ہے

نہ کسی پر اعتراض کرتے نہ کسی کو کسی پر اعتراض کرنے دیتے، اگر کسی نے ان کے سامنے کسی پر اعتراض شروع کیا تو کہتے۔ "چھوڑو بھی اس قصے کو! ہاں ذرا میرا یہ شعر تو سنو۔ اس طرح گفتگو کا رخ بدل دیتے۔ آدمی بڑے باذاق اور حسن پرست تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر طبیعت گدگداتی تو مجمع عام ہو یا محفل خاص، دو ایک جملہ بلاروک کس دیتے۔ ایک دفعہ خسرو پور میں میرے ایک کمسن عزیز سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی، دیر تک

ان کو بڑے غور سے دیکھتے رہے، پھر مجھ سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" میں نے کہا "یہ میرے چھوٹے سالے ہیں۔" یہ سن کر پھر ان کی طرف دیکھا اور بلا تکلف اپنا یہ مقطع پڑھنے لگے:-

لالہ رخوں میں عمر گذاری اور بہاریں بھی لوٹیں

آج بھی گل سے گالوں والے مجھ کو مبارک پیارے ہیں

اس وقت سن شریف آپ کا ستر سے کم نہ ہوگا۔ بے چین طبیعت حضرت مبارک کو ایک جگہ چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ بیگوسرائے میں رہتے تھے، وہاں ڈاکٹری بھی شروع کر دی تھی، طبیعت گھبرائی تو مظفر پور چلے آئے، کچھ دن وہاں بھی ڈاکٹری کا بکھیڑا پھیلایا۔ وہاں بھی جی نہ لگا تو خسرو پور اور بہار شریف کے درمیان گشت لگاتے رہے۔ کبھی خسرو پور میں کچھ دن رہتے کبھی بہار شریف میں دو چار مہینے گذارتے۔ اسی درمیان خسرو پور لٹ لٹا کر ختم ہوا تو بہار شریف میں چند سال پاؤں توڑ کر بیٹھے رہے۔ سب کچھ مگر جہاں رہے بار خاطر ہو کر نہ رہے۔ کھانے پینے کا اپنا انتظام رکھتے، نوکر ہر جگہ ساتھ رہتا، وہ ان کا کھانا پکاتا، خود بھی کھاتے، احباب کو بھی کھلاتے۔ اللہ تعالی بڑا مسبّب الاسباب ہے، کبھی ان کو دوسروں کے پاس حاجت روائی کیلئے جانیکی اور ہاتھ پھیلانیکی ضرورت نہ پڑی۔ ان کے بعض عزیز اور احباب ایسے تھے جو ان کی ضرورت کا خود خیال کرتے تھے۔

زندگی کے آخری دنوں میں اپنے اہل و عیال سے کٹ کر اور دوسری جگہوں سے اکتا کر پھر پٹنہ آگئے اور میرے ماموں زاد بھائی سیّد اکبر حسین ایڈوکیٹ جو بعد میں پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے) کے آبائی مکان میں رہنے لگے تھے جو محلّہ ٹیڑھی ٹھاٹ میں ہے۔ ٹیڑی ٹھاٹ محلّہ اور ان کا اپنا محلّہ خواجہ کلاں جہاں ان کا اپنا آبائی مکان (اب جو بِک بِکا کر ختم ہو چکا تھا) آمنے سامنے ہے۔ ٹیڑھی گھاٹ میں رہنے سے ایک حد تک ان کو ذہنی سکون ملتا تھا اور ان کے بچپن

کے ماحول کی کم از کم یاد تازہ ہوئی تھی۔ ٹیڑھی گھاٹ کے مکان میں ان کیلئے ایک خاص کمرہ علیحدہ مخصوص کر دیا گیا تھا جس سے لگا ہوا غسل خانہ اور چھوٹا سا باورچی خانہ بھی تھا۔ ایک نوکر بھی تھا جو ان کی خدمت بھی کرتا تھا اور ان کا کھانا بھی پکاتا تھا۔ جو کوئی ان کی ملاقات کو جاتا، بڑی خاطر تواضع کرتے چائے پلاتے، پان کھلاتے اور پھر اپنے اشعار سناتے اور اسی درمیان میں اپنی زندگی کے بہت سے رنگین قصے بھی سناتے جاتے، خود بھی ہنستے دوسروں کو ہنساتے، اس کے بعد پھر اشعار سنانے لگتے۔ کہتے تھے اب تک جو زندہ ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ فکر و غم کو پاس بھٹکنے نہیں دیتا ہوں کیوں کہ یہی فکروتردّد انسان کو کھا جاتا ہے۔ تم نوجوانوں کے ساتھ جوان بن جاتا ہوں کہ زندگی کا بوجھ ہلکا معلوم ہو، بوڑھوں سے گھبرا کر اس لئے بھاگتا ہوں کہ میں بھی بوڑھا ہوں کہیں بڑھاپے کی قنوطیت مجھ کو بھی نہ لگ جائے۔ زندگی بسر کرنے کا یہ مجرب نسخہ اپنے ایک مقطع میں اکثر سنایا کرتے تھے۔

یہ غمکدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں
غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

باوجود اس کے بھی کبھی گذرے ہوئے زمانے کی یاد ستاتی بھی تھی اور گردش روزگار سے جی گھبرا ہی اٹھتا تھا، چوں کہ مجھ پر بڑی کرم فرمائی کرتے تھے ایک دن رکشہ سے اتر کر سیدھے میرے کمرے میں آئے۔ میں تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا، جب وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ چکے تو فرمانے لگے "مجھ پر دو تین دن سے افسردگی کا موڈ طاری ہے۔" میں نے کہا "آپ اور افسردگی!"۔ جواب میں فرمایا میاں میں بھی انسان ہوں اور کبھی کبھی انسان ہونے کا ثبوت دینا ہی پڑتا ہے، کیا تمہیں یاد نہیں کہ غالبؔ نے اس کو اسطرح کہا ہے۔

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل　انسان ہوں پیالہ د ساغر نہیں ہوں میں

خیر چھوڑو اس قصے کو، میں تم کو اپنی ایک رُباعی سنانے آیا ہوں جو میری افسردگی کے موڈ میں خود بخود ٹپک پڑی ہے"۔ پھر بڑے جذباتی انداز میں یہ رُباعی پڑھنے لگے:

وہ موسمِ گل نہ وہ گل ترباقی وہ دور رہا نہ وہ دور ساغر باقی

اک کیفیت خمار آنکھوں میں ہے کچھ نقش بہار کے ہیں دل پر باقی

وہ رُباعی پڑھ رہے تھے اور ان کے چہرے کا اتار چڑھاؤ ان کی دلی کیفیت کی ترجمانی کر رہا تھا۔ رُباعی ختم ہوئی تو تھوڑی دیر تک آسمان کی طرف دیکھتے رہے اس کے بعد اسی حالت میں داغؔ کا یہ شعر پڑھا۔

آپ گھبرائیں نہیں جوڑ سے توبہ کر لیں

آپ پچھتائیں نہیں داغؔ کا حال اچھا ہے

اس کے بعد چہرے پر تبسم کے آثار نمایاں ہوئے۔ چہرہ شگفتہ ہوا تو قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہنے لگے۔ "استاد بھی غضب کرتے تھے، کیا مقطع کہہ گئے ہیں۔ چلو اَب شکوہ شکایت سب ختم۔"

اسی طرح ہنستے بولتے زندگی بسر کرتے رہے۔ نوے کے اوپر پہنچ چلے تھے مگر اس وقت تک جوانی کی شگفتہ مزاجی طبیعت میں موجود تھی۔ غم و فکر کس کو نہیں ہوتا مگر بڑی ہمت والے تھے کہ ان سے کبھی طبیعت کو اثر پذیر نہیں ہونے دیا۔

ایک دفعہ ٹیڑھی گھاٹ میں ان ہی دنوں سخت بیمار پڑے، ان کی ضعیف العمری کو دیکھ، جو ان کا معالج ڈاکٹر تھا، وہ بھی گھبرا اُٹھا اور ہم سب بھی۔ ہم سبھوں کی پریشانی کو دیکھ کر حضرت مبارکؔ کی طبیعت پر بھی اثر پڑا۔ میں ان کی عیادت کو دوسری بار گیا تو مجھے دیکھ کر اپنا یہ شعر پڑھنے لگے۔

جس کو رہنا ہے رہے قیدیٔ زنداں ہو کر

ہم تو اے نفو پھاند کے دیوار چلے!

میں نے ان کو تسلی دی کہ آپ کیوں ناامید ہوئے جاتے ہیں، جلد ہی آپ اچھے ہو جائیں گے ہوا بھی یہی کہ دو چار کروٹیں لے کر یہ ٹھیک ہو گئے۔

اپریل ۱۹۵۸ء میں نوے سال سے آگے بڑھ چکے تھے کہ ٹیڑھی گھاٹ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ "جلوۂ داغ" کے نام سے ان کی زندگی میں چند سال پہلے چھپ چکا تھا۔ اس سے بھی قبل ان کی نظموں کے دو مجموعے موسوم بہ "مرقع سخن" بھی شائع ہو چکے تھے۔ ان کی رباعیات قصیدے، نظمیں اور غزلیں بڑی تعداد میں اب بھی نامطبوعہ باقی ہیں۔ خدا کرے ان کے صاحبزادے سیّد نذیر حسین ان کو چھپوا سکیں۔

اس جگہ نمونے کے طور پر پیش کرنے کے لئے ان کے چھپے ہوئے مجموعہ کلام "جلوۂ داغ" سے ان کے اشعار کے انتخاب میں بھی مجھے بڑی دقت پڑی۔ "جلوۂ داغ" ان کی غزلوں کا خود انتخاب ہے۔ منتخب دیوان سے شعروں کا چننا کوئی معمولی بات نہیں۔ ہر شعر انتخاب کے لئے دامن پکڑتا ہے۔ اس لئے کچھ اُدھر سے کچھ ادھر سے میں نے اشعار چن لئے ہیں اور اُن کو آپ کے ملاحظہ کے واسطے درج کر رہا ہوں:-

۱۔ کھنچ گیا خود بھی ترے نقشے کے ساتھ — کھینچنے والا تری تصویر کا!

۲۔ بجھے کی جو نہیں وہ مرے دل کی آگ ہے — دم بھر میں جو جلا بھی بُجھا بھی وہ طور تھا

آرائشیں تھیں، آپ تھے، وعدے کی رات تھی — میں تھا، تسلیاں تھیں، دل ناصُبور تھا

۳۔ زلف درازپاؤں کی زنجیر ہوگئی — آپ اپنے دام میں وہ گرفتار ہو گیا

اس چال سے چلو گے تو کیسے چلے گا کام — یہ بھی خبر ہے کیا دم رفتار ہو گیا

۴۔ مینا بھی بھرا، جام بھی لبریز ہمارا — پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا

۵۔ مجھ پہ ڈورے نہ بہار گل و گلشن ڈالے — ہم نے دیکھا ہے گلستاں کا بیاباں ہونا

۶۔ سنو گے تو پھڑک جاؤ گے تم بھی — کہیں کیا ہم نے مانگی ہے دعاء کیا

۷۔ احساں جناب خضر کسی اور پر دھریں — مجھ کو تو میرے شوق نے رستہ بتا دیا

۸۔ رحمت ان پر جو شہیدانِ محبت گذرے — ان کا مرنا کہ خضر آپ کا جینا اچھا

۹۔ حشر میں حشر، قیامت میں قیامت ہوتی — دوسرا تیرے برابر کا جو قاتل ہوتا

۱۰۔ آہ کی تیری گلی میں تو خطا کون سی کی — میں نے تو اور بھی کوچہ ترا گلزار کیا

۱۱ ہم اڑتے اڑتے دام میں دانستہ آگئے کیا جانے جی میں کیا دم پرواز آگیا

۱۲ تو تو احسان جتاتی ہوئی آتی ہے صبا یوں بھی آتا ہے کوئی مرغ گرفتار کے پاس

۱۳ ہوائے شوق کے جھونکے مبارکؔ رہو گے تم پس پردہ کہاں تک

۱۴ ہماری موت ہے ہاتھوں کا پابندِ رسن ہونا

کہ ہم دشت کے مارے دل لگی دامن سے کرتے ہیں

۱۵ جبیں پر خاک ہے یہ کس کے در کی بلائیں لے رہا ہوں اپنے سر کی

۱۶ کچھ اس انداز سے صیاد نے آزاد کیا جو چلے چھُٹ کے قفس سے وہ گرفتار چلے

جس کو رہنا ہو رہے قیدی زنداں ہو کر ہم تو اے نفسو پھاند کے دیوار چلے

۱۷ گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے صُراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

۱۸ سنور چک بھی خدارا میرے زلف خم بہ خم والے

کہ کالی رات میری اور کالی ہوتی جاتی ہے

مبارکؔ میں تصدق اپنے اس مشق تصور کے

مجسم اب وہ تصور خیالی ہوتی جاتی ہے

۱۹ زباں دراز یاں ہم دل جلوں سے کیوں اے شمع

بس اپنا قصہ سوز و گداز رہنے دے

۲۰ حکمت تو دیکھئے یہ حکومت تو دیکھئے دل کا سوال کرتے ہیں آنکھیں نکال کے

یہ غمکدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

۲۱ کیا جانیں کب بہار ہوئی کب خزاں ہوئی ہم تو یہ سمجھے گردش ہفت آسماں ہوئی

آئی ہوئی بلا کی طرح محتسب ٹلا حلقے میں میکشوں کے اذاں پر اذاں ہوئی

۲۲ مبارکؔ تم کو بربادی مبارک کہ وہ خوش ہیں تمہیں برباد کرکے

۲۳ بغل میں رات ہم نے غیرت مہتاب دیکھا ہے

تمہیں اس خواب کی تعبیر ہو کیا خواب دیکھا ہے

وہ الفت دوست ہوں ناصح دعا ہی دل سے نکلی ہے
اگر دشمن کے گھر بھی مجمع احباب دیکھا ہے
خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا
میرے شیشے میں مئے دیکھی ہے یا خواب دیکھا ہے

۲۴ میرے دیدۂ و دل کی چوری تو دیکھو تمہیں لے چلے ہیں بھری انجمن سے

۲۵ جو زمیں تھی وہ آسماں ہے آج انتہاء ہوگئی تعبیر کی!

۲۶ آپ کا اختیار ہے سب پر آپ پر اختیار کس کا ہے

۲۷ وہ شکل اپنی ہر دم بدلتے رہے یہاں مشق صورت پر ستی رہی
ملی روز ہم فاقہ مستوں کو مئے خدا جانے مہنگی کہ ستی رہی

۲۸ یہاں دیکھا، وہاں دیکھا، اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا
تجھے چھپنا کہاں اے جلوۂ جاناں نہ آتا ہے

۲۹ روندنے والے مری قبر کے میں تجھ پہ نثار قبر ہر گام پہ گل پوش ہوئی جاتی ہے

۳۰ اسی پہ ناز! گھڑی دو گھڑی جلی ہوگی اسی پہ شمع ہماری برابری ہوگی
جو آپ چاہتے ہیں ہوگی ہاں وہی ہوگی مرے گلے پہ کسی دن مری چھری ہوگی
تمہارے کان سرود آشنا خدا رکھے! کسی غریب کی فریاد کب سُنی ہوگی

۳۱ روکنا جھونکے ہوائے شوق کے تھامنا، اڑتے ہیں پردے بام کے

۳۲ حریف موج و گرداب و تلاطم کم نظر آئے بہت ساحل پہ دیکھے سیر ساحل دیکھنے والے

۳۳ کرم کر، پھونک دے اے برق یہ تنکے نشیمن کے
اسیروں تک نہ اڑ کر سرگذشت آشیاں پہنچے
ہزاروں مرحلے طے ہو گئے اک جام میں ساقی
سلامت تیرا مئے خانہ کہاں سے ہم کہاں پہنچے

۳۴ وہی شاطر ہے محبت کا جسے ہر دم اِک بات نئی ہوتی ہے

حضرت حفیظ جونپوری اور پٹنہ (عظیم آباد)

غالباً سن اٹھارہ سو بانوے یا ترانوے کا زمانہ تھا کہ ایک صاحب جوان عمر جونپور سے پٹنہ آئے۔ صاف ستھرے، ہنس مکھ چہرہ، بڑے بامذاق، بذلہ سنج، رنگین مزاج اور خوش وضع مگر طبیعت کے کچھ تیز، لانبا قد، داڑھی مُنڈی اور مونچھیں بڑھی ہوئیں، شاعر بھی اور ایسے کہ اپنے اشعار سنانے کے ساتھ دوسروں کے اشعار سننے کا بھی شوق پہلے تو دو چار دن صادق پور کی سرائے میں ٹکے پھر محلہ گڑھیا میں ایک مختصر مکان کرایہ پر لے کر اٹھ آئے۔ ان کے اسباب میں ایک بڑا بکس اور بھی تھا جس میں شیشے کی بڑی بڑی کنڑیاں تھیں اور ان کنڑیوں میں جونپور کے طرح طرح عطر بھرے ہوئے تھے۔ شہر کے شرفاء اور رئیسوں سے ان کا پہلا تعارف عطر فروش کی حیثیت سے ہوا۔ گفتگو میں باصلاحیت ذی علم آدمی معلوم ہوئے تو لوگوں کی مخاطبت ان کی طرف بڑھی۔ یہ زمانہ پٹنہ والوں کی بے فکری اور رنگ رلیوں کا تھا۔ بزم نشاط اور شعر و شاعری کی محفلیں بھی ہر جگہ جمتی تھیں۔ یہ صاحب رنگین مزاج بھی تھے اور شاعر بھی۔ لوگوں سے پہلی ملاقات میں ہی شیر و شکر ہوگئے۔ ابھی ان کو آئے زیادہ دن بھی نہیں گذرے تھے کہ نجی صحبتوں کے علاوہ مشاعروں میں بھی ان کی مانگ ہونے لگی۔ یہ تھے حافظ محمد علی حفیظ جون پوری پٹنہ میں اس وقت استادانِ فن شاعری حضرت شاؔد، حضرت آزاؔد، علی باقؔر آباد، نواب امداد امام اثرؔ، حضرت شوقؔ نیموی اور میر باقؔر کے علاوہ ابھرتے ہوئے شعراء میں ننؔا صاحب موجؔ، لاڈلے صاحب بیتابؔ، ڈاکٹر مبارکؔ، حافظ نذرالرحمٰن حفیظؔ، نظیر حسین شائقؔ، ابوالخیر خیرؔ در بھنگوی اور حکیم فہیمؔ یہاں کے مشاعروں پر چھائے رہتے تھے، حفیظؔ جونپوری بھی کھنچ کر ان ہی میں مل گئے۔ حفیظ جونپوری کے طرز بیان نے خصوصیت کے ساتھ ان کو پٹنہ کے شعراء میں جگہ دی۔ ایک تو منچلی طبیعت کے آدمی تھے، اس پر طرّہ ان کی عاشق مزاجی اور رند مشربی، پھر کلام میں شوخی، معاملہ بندی، ادا بندی، حرمان و مجبوری کے گلے اور وصال یار کی تڑپ،

اُن سب نے مل کر ان کی شاعری کو اس وقت کے مذاق کے مطابق خوب چمکا رکھا تھا۔ ان کے متعلق جلد یہ راز بھی کھلا کہ ان کا پٹنہ آنا بھی۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست می بردہر جا کہ خاطر خواہ است

کی طرح پر ہوا ہے۔ ایک شاہد رعنا کے پیچھے کشاں کشاں پٹنہ آگئے ہیں۔ یہ کچھ چھپی ہوئی بات نہ رہی۔ ان کی غزلوں کے اکثر شعر بھی اس کی غمازی کرتے تھے اور یہ بھی دوستوں میں اپنے عشق و محبت اور فراق و وصال کی روددادیں بیان کرتے تھے، چنانچہ یہ مقطع اسی کے بیان میں ہے۔

چھوڑا ہے جس کے واسطے ہم نے وطن حفیظؔ
سب جانتے ہیں نام اب اس کا بتائے کون

اسی عشق کے ہاتھوں برسوں سے خانہ برباد اور سرگراں رہے جونپور چھوٹا تھا تو دوسرے شہروں کی خاک چھانتے ہوئے پٹنہ آئے تھے کہ یہاں کچھ سکون ملے اور سچ پوچھئے تو پٹنہ ہی میں ان کو بہت دنوں تک سکون ملا بھی اور اسی لئے وہ یہاں برسوں رہ گئے اور اتنی مدّت تک رہ گئے کہ پٹنہ والے بھی بھول گئے تھے کہ یہ پٹنہ کے ہیں یا جونپور کے۔ ان کی عطر فروشی کچھ اس وجہ سے بھی تھی کہ "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے" اور کچھ اس لئے بھی کہ غریب الوطنی میں روزانہ کے خرچ کے لئے پیسے آتے رہیں۔ یوں تو یہ کاشتکار گھرانے کے کھاتے پیتے آدمی تھے، یہ دوسری بات ہے کہ گھر ہی چھوڑ دیا تھا۔ پھر وہاں سے پیسے کیوں منگاتے۔ انھوں نے اپنے گھر کا دروازہ اپنے بند کر رکھا ہے، مگر ان کی شخصی جاذبیت نے ہر جگہ ان کے لئے دروازے کھول دیئے تھے۔ پٹنہ میں شاہدان بازاری کی بھی کمی نہیں تھی، مگر یہ تو یہاں ایک دوسری ہی ناظورہ عشوہ طراز کے پیچھے کھنچ کر آگئے تھے۔ محبت میں کبھی اس سے بنتی اور کبھی بگڑتی، پھر صلح صفائی ہو جاتی۔ انہی اشغال میں ان کی شاعری بھی زوروں پر چلتی رہی۔ ان ہی دنوں مظفر پور کے صاحب وجاہت اور ذی علم دو[2] بھائی مولوی اعجاز حسن

خاں اور مولوی سیّد ریاض حسن خاں کے یہاں دیوان محلّہ میں مقیم تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے یہاں پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع رہتا تھا اور ایسوں کی یہ دونوں بھائی بھی قدر کرتے تھے۔ اعجاز حسن خاں غالباً شاعر نہ تھے مگر بڑے سخن فہم اور نکتہ رس تھے، چھوٹے بھائی ریاض حسن خاں شاعر تھے اور شاعری میں حضرات داغؔ سے ان کو تلمذ تھا۔ آئے دن اُن کے یہاں شاعری کی نجی صحبتیں گرم رہتیں۔ حفیظؔ جونپوری کی بھی ان کے یہاں آمد و رفت تھی۔ ربط بڑھا تو حفیظ جونپوری ان کے ساتھ مظفر پور بھی پہنچے۔ وہاں ایک نوجوان رئیس سیّد ظفر حسن خاں جو اُن دونوں حضرات کے چچازاد بھائی تھے، ان سے حفیظ جونپوری کی ملاقات ہوئی۔ ظفر حسن خاں کے نسبتی بھائی سعادت علی خاں ضلع دربھنگہ میں علاقہ پیغمبر پور کے مالک اور دولتمند زمیندار تھے، اتفاق سے وہ زندگی کی بہار لوٹنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ حفیظؔ جونپوری ظفر حسن خاں کی وساطت سے سعادت علی خاں کے یہاں پہنچے۔ یہاں دولت کی افراط تھی، نوابی دربار لگا رہتا تھا اور زندگی کی رنگارنگ دلچسپیوں کی بھی انتہا نہ تھی۔ حفیظؔ جونپوری سعادت علی خاں کے ساتھ منسلک ہو گئے اب ان کی جولانگاہ پٹنہ، مظفر پور اور دربھنگہ تین جگہوں میں بٹی ہوئی تھی مگر مرکزیت پٹنہ ہی کو حاصل تھی۔ ایک تو یہاں ان کے مرکزحیات کی قیام گاہ تھی، دوسرے ان کی دلی دوست بھی سب پٹنہ میں تھے اور اسی سبب سے ان کا یہاں کا پھیرا مہینے میں دو چار بار ہو جاتا تھا۔ اس طرح یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ آخر ایک دن وہی حادثہ رونما ہوا جو عام طور سے شاہدان بازاری کی بیوفائی سے ظاہر ہوا کرتا ہے یعنی ان کی محبوبہ ایک دولمتند کے گھر بیٹھ گئی۔ اسی واقعہ کی طرف حضرت حفیظؔ جونپوری یوں اشارہ کرتے ہیں۔

غیر کے بس میں انھیں سن کر یہ کہہ اٹھتا ہوں ایسی تقدیر بھی اللہ غنی ہوتی ہے

جب پٹنہ میں رہنے کا واسطہ اور سبب ہی ختم ہو گیا تو مظفر پور اور دربھنگہ میں کیا رکھا تھا۔ یہ برسوں کی جمی جمائی صحبتیں چھوڑ کر پھر وحشت میں دوسرے شہروں کی خاک اڑانے لگے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

حفیظؔ ان سے ہوا قطع تعلق چھٹا ہم سے عظیم آباد صد حیف

آدمی خوددار تھے اس لئے انھوں نے اس سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ بات ان کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

روکنے کو مجھے غیرت کے سوا اس در پر کوئی درباں نہ رہا کوئی نگہباں نہ رہا

پٹنہ سے نکلے تو کچھ دنوں لکھنؤ، دلی اور کانپور میں رہے۔ جب وحشت دل کم ہوئی تو پھر پٹنہ کی صحبتیں یاد آئیں اور یہ پھر پٹنہ واپس آئے۔ پٹنہ میں دوبارہ آنے کے متعلق کہتے ہیں۔

حفیظؔ آنا ہوا ہے پھر عظیم آباد میں اپنا
پھر اگلے ولولے پیدا ہوئے اب دیکھتے کیا ہو

اب پاؤں کی بیڑی اتر ہی چکی تھی، آنکھیں بھی ماسوا کے جلوؤں کے لئے آزاد ہو گئی تھیں، مزاج میں آوارہ گردی ابھی تک باقی تھی۔ اپنی اس آوارہ گردی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

بہت ہے ہو جو کسی شاخ گل پہ عمر بسر چمن میں تنکے چنے کون آشیاں کیلئے

یہی زمانہ پٹنہ میں شاعری میں ان کے انہماک کا بھی زمانہ تھا۔ سعادت علی خاں اور ظفر حسن خاں کے گھر ان کے لئے اب بھی ویسے ہی کھلے ہوئے تھے۔ مظفر پور، پیغمبر پور اور پٹنہ پھر ان کی جولانگاہ بنا۔

صحبتوں میں وہی حسن و عشق کے چرچے اب بھی تھے، راگ اور رنگ کی محفلیں اب بھی سجتی تھیں۔ ان کی رومانی شاعری انھیں ماحول میں نئے گل بوٹے پھر کھلا رہی تھی۔

حضرت حفیظؔ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اپنے رنگین مشاغل میں بالکل کھوئے ہوئے تھے بالکل غلط ہوگا، کم از کم پٹنہ کے اکثر ماہنامے جن میں ان کی رنگین غزلیں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں، اس بات کا بھی ثبوت دیتی ہیں کہ قومی نظمیں بھی سنجیدہ طور پر ان کے قلم سے نکلیں۔ "الپنچ" اخبار کے پرچوں کو اٹھا کر دیکھئے تو طرح طرح کی متعدد نظمیں، قطعے اور مسدس ان میں ملیں گے جن میں قومی سدھار کی راہیں انھوں نے بتائی ہیں اور قوم کو علم و عمل کی طرف متوجہ کیا ہے۔ مشاعرے تو ان کی زندگی کے جزولاینفک بن گئے تھے۔ نہ یہ کسی مشاعرے میں بغیر جائے رہ سکتے تھے اور نہ مشاعرے بغیر ان کے گرمی اور دلکشی پیدا کر سکتے تھے۔ یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ان کے اور پٹنہ والوں کے درمیان سے مغائرت کے پردے اٹھ چکے تھے اور یہ اس طرح یہاں کے لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے یہ خود بھی بھول گئے تھے کہ یہ پٹنہ کے ہیں یا جونپور کے، مگر ایک دفعہ اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، کہ ان کی حساس طبیعت کو تھوڑی دیر کے لئے ٹھیس لگ گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ پٹنہ میں کچھ اور بھی لکھنؤ کے شعراء رہتے تھے ان میں سے دو ایک نے پٹنہ والوں کی شاعری پر ناجائز اعتراضات کئے۔ دونوں طرف سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا مگر جلدی ختم بھی ہوگیا کیوں کہ اعتراض ہی مہمل تھے۔ ان ہی دنوں ایک مشاعرہ ہوا سبھی شعراء شریک تھے، پٹنہ کے بھی اور باہر سے آئے ہوئے جو یہاں مقیم تھے وہ بھی۔ مشاعرہ شروع ہوا تو پٹنہ والوں کی کبیدہ خاطری ظاہر ہوئی۔ جس طرح تمام مشاعروں میں بلاامتیاز اور بلاتفریق پٹنہ کے اہل ذوق باہر کے شعرا کو بھی دادِ سخن دیا کرتے تھے اس مشاعرے میں وہ اگلی بات نظر نہ آئی۔ باہر کے دو چار شاعروں نے اپنی غزلیں پڑھیں مگر مشاعرے میں سناٹا رہا۔ حفیظؔ جونپوری بھی موجود تھے۔ پٹنہ والوں کی سرد مہری ان کو کھلنے لگی۔ بہر حال غزل ان کو بھی پڑھنی ہی تھی۔ ان کی باری آئی تو ان کی غزل شروع ہونے سے قبل ہی بڑے اشتیاق کے ساتھ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے، اس دفعہ ان کو

گرما گرمی نظر نہ آئی۔ بہر کیف انھوں نے اپنی غزل شروع کی جس کا مطلع یہ تھا۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے   ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے!

ادھر انہوں نے اپنا یہ مطلع پڑھا ادھر واہ واہ کا طوفان اٹھا، مغائرت کی حدیں جو دوسروں نے بھی قائم کر دی تھیں، ایک دم سے گریں اور ان کے دلی احباب اٹھ کر ان کے گرد آبیٹھے۔

حفیظ جونپوری نے زندگی کی تمام رودادیں اور وارداتیں کھل کر بیان کی ہیں اسی لئے ان کی شاعری میں ان کی زندگی کے تمام نقوش صاف اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور سچ پوچھئے تو یہی حقیقی شاعری بھی ہے جس میں شاعر اپنے واردات قلبی کو بے حجابانہ پیش کر دے۔ ان کی خمریات میں حضرت ریاض خیر آبادی کا کیف ملتا ہے مگر ذرا سا اس فرق کے ساتھ کہ حضرت ریاض سنی سنائی ہوئی کیفیتوں کو اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں اور یہ اپنی رندی کی وارداتی حالت مو بہ مو بہ کہہ سناتے ہیں۔ خمریات میں ان کے دو چار شعر سُن لیجئے۔

۱۔ مجھ سا بدمست کوئی رند قدح نوش نہیں   کب بہار آئی تھی اتنا بھی مجھے ہوش نہیں

۲۔ لحاظ توبہ کا دشمن ہے یہ برسات کا موسم

گھٹا ہو للچائے نہ جی کہنے کی باتیں ہیں!

۳۔ غضب سے ڈر رہے ہیں زور پر رحمت کے چھینٹے ہیں   ادھر بدلی برستی ہے ادھر واعظ برستا ہے!

۴۔ شرم سے آنکھ کسی مست کی جھک جاتی ہے   چوم لیتا ہے جو شیشہ کوئی پیمانے کو

ان کی طبیعت کی شوخی سے ان کی غزلیں گلزار بنی ہوئی نظر آتی ہیں اور سچ پوچھئے تو یہی طبیعت کی شوخی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ دو چار اشعار اس مضمون میں ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ ہاتھا پائی سے یہی مطلب بھی تھا کوئی منہ چومے کلائی تھام کے

۲۔ کیوں مجھ سے ہے یہ مفت کی تکرار کیا ہوا   اچھا جو میں نے کر ہی لیا پیار کیا ہوا

۳۔ مجھ سے کبھی ملی، کبھی اغیار سے لڑی ہو خاک اعتبار تمہاری نگاہ کا

۴۔ ہم جو تجھ سے پھریں خدا سے پھریں یاد ہے کچھ، یہ قول کس کا تھا؟

پٹنہ میں ان کا پہلا دور میری پیدائش سے قبل کا زمانہ تھا۔ ان کا آخری دور میرے بچپن کے دن تھے۔ میرے والد مرحوم کے یہاں بھی حضرت حفیظؔ آتے تھے مگر ان کا آنا اور پٹنہ میں ان کا رہنا مجھے یاد نہیں۔ میرے چچا مولوی کریم الدین احمد صاحب مرحوم بانکی پور محلہ مہندرو میں رہتے تھے۔ حضرت حفیظؔ کی آمد و رفت ان کے یہاں زیادہ تھی۔ آخری دور ان کا زیادہ تر پیغمبر پور سعادت علی خاں کے پاس گذرا۔ مولوی صاحب کریم الدین احمد صاحب مرحوم، مولوی ابوالخیر خیرؔ اور ڈاکٹر مبارکؔ عظیم آبادی سے بہت سے واقعات میں نے حفیظؔ جونپوری کے متعلق سنے۔ حضرت خیرؔ دربھنگوی بھی انھیں کے زمانے میں سعادت علی خاں کی ملازمت میں منسلک تھے اور ڈاکٹر مبارکؔ حفیظ جونپوری کے دلی دوستوں میں سے تھے۔

غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں حضرت حفیظؔ جونپوری نے پٹنہ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا۔ یہ گئے تو مگر اپنی صحبتوں کی اور اپنی شاعری کی دیرپا گونج پٹنہ میں چھوڑ گئے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی ان کے اشعار یہاں لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ پٹنہ سے جونپور واپس آگئے تو جوانی کا نشہ اتر چکا تھا، ولولے سرد پڑ چکے تھے اور طبیعت میں وحشت کی جگہ قرار و سنجیدگی آگئی تھی۔ اب گذری ہوئی زندگی کا جائزہ لیا تو نامۂ اعمال کے سارے دفتر سیاہ نظر آئے اور فرائض زندگی پس پست پڑے سسکتے دکھائی دیئے، اس لئے پہلا کام حضرت حفیظ جونپوری نے یہ کیا کہ اُجڑے ہوئے گھر کو آباد کیا، پھر بیوی بچوں سے ملے تو زندگی کی حقیقی مسرت سمجھ میں آئی ان کی فطرت میں عشق کی خمیر تو پہلے ہی سے ملی ہوئی تھی اب عشق مجازی کے بدلے عشق حقیقی کی گرمی دل میں پیدا ہونے لگی اور یہ تپش دل سکون کی تلاش میں بزرگان دین کے آستانوں تک لے جانے لگی۔ اس کیفیت کو بڑی حسرت سے اپنے ایک شعر میں یوں

کہتے ہیں۔

اک دھن بندھی ہے عالم دار فتگی میں بھی منزل کی جستجو ہے بس کارواں مجھے!

آخر کار تلاش حق کا ان کو راستہ مل ہی گیا۔ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھوں بیعت کر معرفتِ الٰہی کا درجہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ اس کے متعلق ان کا یہ شعر سنیئے۔

زمانے کی روش کو پھر حفیظؔ مست کو دیکھو

سنور جاتا ہے وہ جو مرشد کامل سے ملتا ہے!

بیعت کرنے کے بعد ان کی وضع قطع میں بھی بڑی کایا پلٹ ہوئی۔ لانبی مونچھیں کٹ کر حد شرعی تک پہنچیں تو صفاچٹ گالوں پر شرعی داڑھی بھی ابھر آئی۔ اس کو بھی ایک دوسرے شعر میں یوں کہتے ہیں۔

"بحمد اللہ حفیظؔ اب ہے مسلمانوں کی صورت میں نہ دیکھا جس نے ہو، دیکھے وہ حالت کا بدل جانا

حضرت حفیظؔ جونپوری کی خصوصیت یہ تھی کہ بات بات پر برجستہ شعر کہتے تھے، ان کی پر گوئی کے سب قائل تھے۔ غزلوں کے اشعار، قطعے، رُباعیاں، سہرے اور قصیدے اس طرح فی البدیہہ کہتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ان کے برجستہ شعر کہنے کا واقعہ سُن لیجئے۔ سیّد ظفر حسن خاں رئیس مظفر پور کے یہاں کچھ دنوں مصاحبت میں یہ منسلک تھے۔ اسی زمانے میں ظفر حسن خاں کی شادی ہوئی۔ شادی کی محفل جمی ہوئی تھی، شہ نشیں پر ظفر حسن خاں دولھا بنے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بھی ان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ریاض حسن خاں مرحوم نے حضرت حفیظؔ جونپوری سے کہا کہ "حفیظ صاحب آپ نے اس موقع کے لئے کوئی سہرا بھی نہ کہا"۔ حفیظؔ جونپوری چمک اٹھے اور کہنے لگے۔ "کہا تو نہیں ہے مگر ایک سہرا اب برجستہ سنیئے۔ یہ کہہ کر اٹھے اور دولہا کے سامنے کھڑے ہو کر برجستہ فرفر سہرا سنانے لگے۔ اشعار تھے کہ بلا رُکے ہوئے ان کے منہہ سے نکل رہے تھے، سبھوں کو حیرت تھی، پہلے سب محو حیرت تھے۔ دو ایک

صاحب سے انھوں نے یہ فرمائش کی تھی کہ "بھئی لکھتے جاؤ۔ یہ سب شعر برجستہ کہہ رہا ہوں۔ پندرہ شعروں کا یہ سہرا ہے اس کا ایک شعر سنیئے:

ہے کلائی میں جو کنگنا تو گلے میں بدھی   طرہ ہے لٹ پٹی دستار کے اوپر سہرا

مقطع یوں ہے۔

موتیوں سے بھریں منہہ کو تو صلہ کم ہے حفیظؔ   غالب و ذوقؔ کے لکھا ہے برابر سہرا

حفیظ جونپوری حضرت امیرؔ مینائی کے شاگرد تھے، اس پر یوں فخر بھی کرتے تھے۔

حفیظؔ اپنا سخن بھی مستند ہے   کہ ہوں شاگرد امیرؔ لکھنوی کا

حضرت حفیظؔ جونپوری کے کلام میں ہر صنف شاعری کے نمونے ملتے ہیں اور یہی انکی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ ان کے دو دیوان چھپے، پھر بھی پٹنہ اور لکھنؤ کے پرچوں اور اخباروں میں ان کے اتنے منتشر غیر مطبوعہ کلام دبے پڑے ہیں کہ ان کو تلاش کر کے اگر چھپوایا جائے تو ایک تیسرا ضخیم مجموعہ کلام اور نظر کے سامنے آجائے۔ ان کا پہلا دیوان عہد رنگین کی یادگار ہے جس میں جوانی کی سرمستیاں، مئے دو آتشہ کا سُرور، جام و مینا کی کھنک، حسن و عشق کا جلوۂ جفا و جور کا شکوہ اور معشوق کی پیمان شکنی کا گلہ بھرپور ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں شوخی بھی ہے، معاملہ بندی بھی ہے اور معشوقوں کی پیمان شکنی کا گلہ بھرپور ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں شوخی بھی ہے، معاملہ بندی ہے اور معشوقوں کی ادابندی بھی ہے۔ یہ دیوان ۱۹۰۳ء میں چھپا۔ ان کا دوسرا دیوان جو دس برس کے بعد ۱۹۱۳ء میں چھپا اس میں حضرت حفیظؔ کا مزاج شاعری بہت کچھ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس دیوان میں اگر ان کے پہلے دیوان کی کہیں جھلک دکھائی دیتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ سنجیدگی کے اسلوب میں حقیقت بینی کی کوشش بھی نمایاں معلوم ہوتی ہے، جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن کی آنکھیں اب دور تک جانے لگی ہیں اور ان کا دماغ

اب تصوف کے رموز کے کشاد میں مزا محسوس کرنے لگا ہے اور یہ بھی کہ حسن مجاز کی بے بضاعتی سے گھبرا کر اب یہ حسن حقیقت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اب آپ ان کے پہلے دیوان کے کچھ اشعار سنیئے۔

۱۔ ان کی شوخی بھی ہوئی ہے مری وحشت کا جواب ہاتھ ڈالا جو گریباں میں گریباں نہ رہا

۲۔ تم ہمیں ہاتھ اٹھا کر اس ادا سے کوسو دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ دعاء کرتے ہیں

لاگ ہے ہم سے عدو کو تو عدو سے ہمیں رشک ایک ہی آگ میں ہم دونوں جلا کرتے ہیں

۳۔ جب تری یاد میں تڑپا ہے تو رشک آہی گیا اپنے ہی دل پہ ہوا غیر کا دھوکا ہم کو

۴۔ آپ بدنام ہوئے میرے سبب سے سچ ہے یہ تو فرمایئے کس نے کیا رسوا مجھ کو

۵۔ تہمت ہو بھول چوک کی پیغامبر کے سر شکووں کا لطف کیا جو کوئی درمیاں نہ ہو

نالوں سے لڑ رہی ہے صدائے جرس جو آج گم کردہ راہ کوئی پس کارواں نہ ہو

۶۔ بعد توبہ بھی وہی یاد ہے مئے خانے کی گردش آنکھوں میں پھرا کرتی ہے پیمانے کی

۷۔ کہیں نہ آنکھوں سے یارب عیاں ہو حسرت دل نگاہیں دیکھ رہا ہے وہ بدگماں میری

ترا مزاج نہیں یہ تری نگاہ نہیں گھڑی گھڑی جو بدلتی رہے زباں میری

۸۔ قہر ڈھائے گی اسیروں کی تڑپ اور بھی الجھیں گے حلقے دام کے!

۹۔ دنیا میری نگاہ میں صحرائے یاس ہے جس دن سے جی اداس ہے عالم اُداس ہے

آیا جو میں تو بیٹھو نہ منہہ پھیر کر اُدھر دیکھو ادھر تمہیں سے مری التماس ہے

۱۰۔ چٹکیاں لینے کو پہلو میں رہا ایک نہ ایک تو نہیں تو ترے ارمان ستانے آئے

۱۱۔ مجھ سے بڑھ کر اُن کو ہیں مجبوریاں کہہ نہیں سکتے محبت ہو گئی!

۱۲۔ بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

۱۳۔ حسن عمل ہے صورت زیبا کا دیکھنا نیت درست ہو تو حقیقت مجاز ہے

اس کے بعد اب دوسرے دیوان کے کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ کلیم غش میں گھڑی دو گھڑی رہے ہونگے   یہاں تو جا کے نہ پھر ہوش عمر بھر آیا

۲۔ کہاں کھو دیا ہائے اس بے خودی نے   اُسے جس طرح دیکھنا تھا نہ دیکھا

۳۔ کسی طرح دل صیاد میں جگہ نہ ہوئی   بنا کے ہم نے قفس کو بھی آشیاں دیکھا

۴۔ مانتے ہیں اُسے بغیر دلیل   جائیں کیوں عالم مثال میں ہم

ہائے رے سادگی محبت کی   آگئے پھر کسی کی چال میں ہم

۵۔ ہوتی ہے ایک جام میں دونوں جہاں کی سیر

اب ہم کہاں، مباحثہ کفر و دیں کہاں

۶۔ ابھی سب کچھ ابھی کچھ بھی نہیں یہ اپنی ہستی ہے   نفس کی آمد وشد سے تماشاگہ منزل ہوں

ادھر محمل نشیں دشت میں مجنوں وار پھرتی ہے   ادھر مجنوں کو یہ سودا کہ میں لیلائے محمل ہوں

مجھے مایوس کیوں جانا مجھے مجبور کیوں سمجھا   نہ میں اٹکا ہوا دم ہوں نہ میں بیٹھا ہوا دل ہوں

۷۔ کمی نہیں تری درگاہ میں یہ ہے ایماں   بلا سے میری دعا، مستجاب ہو کہ نہ ہو

۸۔ کفر میں کبھی ایمان چھپا ہوتا ہے   ہم کو کعبے کی ہوس لے گئی بت خانے میں

۹۔ ہماری طرح دل کو تھام کر آہیں بھرا اے مجنوں   تڑپ کر آپ لیلیٰ پردۂ محمل سے نکلے گی

۱۰۔ کون و مکاں کی سیر رہی اضطراب میں   پھینکا ہے آج دل نے کہاں سے کہاں مجھے

اک دھن بندھی ہے عالم واماندگی میں بھی   منزل کی جستجو ہے پس کارواں مجھے

موج ہوا ہے زینت معراج بیخودی   کیا لے اڑی ہے بیعت پیر مغاں مجھے

۱۱۔ بُرا ہو ضعف کا یہ امتیاز بھی نہ رہا   رسن گلے میں ہے پھانسی کی یا گریباں ہے

چمک کے رہ گئی بجلی اُدھر پس پردہ   ادھر حواس ہیں ابتر نظر پریشاں ہے

۱۲۔ قیامت سے نہیں کم منزل ہستی کا ہنگامہ   کہیں ایسے میں بھی شورِ جرس معلوم ہوتا ہے

۱۳۔ وائے گم کردگی، شوق کہ اس کوچے میں   رہنما غیر کا نقش کف پا ہوتا ہے

۱۴۔ بہت آہستہ ذرا اے بیمار کراہ!   پھیل جائے نہ صدارات کے سناٹے میں

حضرت حفیظ جون پوری کے انتقال کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ غالباً انیس سو سولہ یا سترہ میں ان کا انتقال جونپور ہی میں ہوا حزیںؔ کا یہ شعر ان کی عمر بھر کی سر گردانی پر صادق آیا۔

حزیں از پائے رہ پیما بسے سر گشتگی دیدم!
سر سے شوریدہ بر بالین آسائش رسید ایں جا!!

نبّا صاحب موجؔ

نبّا صاحب اسی نام سے مشہور تھے۔ اصلی نام سیّد رضا تھا۔ نبا پیار کا نام بزرگوں کا رکھا ہوا تھا۔ موجؔ تخلص کرتے تھے۔ نواب بہادر سیّد ولایت علی کے بھتیجے نواب سیّد محمد حسن خاں فطرتیؔ کے صاحبزادے تھے۔ ہاتھ پاؤں سجل، ورزش کا شوق، گیہواں رنگ، میانہ قد، ہر بات سے ان کی متانت ٹپکتی تھی۔ آدمی کم آمیز تھے، مگر جس سے دوستی ہوگئی پھر عمر بھر کیلئے اُسی کے ہوگئے۔ عربی فارسی میں اچھی دستگاہ تھی۔ خوش نویسی میں استادانہ حیثیت رکھتے تھے۔ موسیقی کا بھی شوق تھا اور پنجہ کشی میں دور دور مشہور تھے۔ ایک دفعہ لکھنؤ کے ایک مشہور پنجہ کشی پٹنہ آئے۔ یہ نبا صاحب موجؔ کا نام سن کر آئے تھے ان کے یہاں پہونچے اور ان کے ساتھ پنجہ کشی کا اشتیاق ظاہر کیا۔ نبا صاحب نے کہا کہ پہلے میں برف منگواتا ہوں۔ برف کا ایک بڑا ٹکڑا آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں، اور دوسرا اتنا ہی بڑا ٹکڑا میں اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ برف کے ٹکڑے کو آپ داہنے ہاتھ کی مٹھی میں مسل مسل کر پگھلائیں اور اسی طرح میں بھی پگھلاؤں گا۔ جب برف کا ٹکڑا مٹھی میں گھل جائے تو ہم دونوں مقابلے کیلئے پنجے ملائیں۔ چنانچہ برف آئی۔ دونوں نے برف کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ کی ہتھلیوں میں دابا اور اس کو انگلیوں کی مدد سے مسلنے لگے۔ دس پانچ منٹ تک تو لکھنؤ والے حضرت اس طرح کرتے گئے، جب ہتھیلی اور انگلیاں شل ہونے لگیں تو گھبرا کر برف کے ٹکڑے کو ایک

طرف ڈال دیا، ان کو دیکھ کر نبا صاحب ہنسے اور کہنے لگے کیوں حضرت کیا حال ہے؟ لکھنؤ والے بولے "ارے صاحب انگلیاں کام ہی کی نہ رہیں"۔ مگر نبا صاحب نے پورے ٹکڑے کو اپنی ہتھیلی میں گھلا دیا، اس کے بعد کہنے لگے "آیئے اب مقابلہ ہو جائے۔ ان کے مد مقابل نے حیرت سے پوچھا کیا آپ کی انگلیاں ابھی تک شل نہیں ہوئیں؟" نبا صاحب نے جواب دیا "کچھ تو ضرور ٹھٹھر گئی ہیں، مگر بحمداللہ ابھی کام کی ہیں۔ آیئے آیئے پنجے ملائیں۔" مگر ان کے حریف کی انگلیاں اس وقت تک قابو میں نہیں تھیں۔ آخر لکھنؤ سے آئے ہوئے حضرت معذرت کر کے نادم ہو کر مقابلے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

محلہ صدر گلی میں میرے مکان کے سامنے ان کا عالی شان مکان تھا۔ پُرانے زمانہ کی یادگار بڑے وضعدار رئیس تھے۔ مالی حیثیت اگرچہ دوسروں کے مقابلے میں کم تھی مگر رکھ رکھاؤ میں کسی سے پیچھے نہ تھے، کبوتروں کے بڑے شوقین تھے۔ ہر نسل کے سینکڑوں کبوتر پالے ہوئے تھے۔ اسوقت کبوتر بازی کا پٹنہ میں لوگوں کو عام طور سے شوق تھا۔ ہر طرف کبوتروں کی ٹکڑیاں اُڑتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ ٹکڑیاں اُڑتے اُڑتے آپس میں مل جاتیں، کچھ دیر تک تو یہ ٹکڑیاں ایک ساتھ ہوا میں اُڑتی رہتیں۔ پھر اپنے مالکوں کی آواز پر مختلف ٹکڑیوں کے کبوتر یک بہ یک بڑے غول سے پھٹتے اور ان کی ٹکڑیاں اپنے مالک کے کوٹھوں کی طرف مُڑتیں اور غوطہ مار کر چھت پر اتر آتیں۔ اکثر دوسری ٹکڑیوں کے کبوتر بہک کر آجاتے اور یہ کبوتر مال غنیمت سمجھے جاتے۔ کبوتروں کے باہم مل کر اڑنے کی یہ سیر بھی قابل دید ہوتی تھی۔

نبا صاحب موج کو پتنگ بازی کا بھی شوق تھا۔ اپنے ہاتھ سے پتنگ کی تیلیاں بناتے اور اپنی پتنگ خود تیار کرتے۔ ڈور کے لئے نخ خود ہی بانٹتے، مانجھا بڑے اہتمام سے نخ پر چڑھاتے اور ایرے غیرے سے پتنگ کی کبھی پیچ نہیں لڑاتے، یہ سب میری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ اگرچہ میری کم عمری تھی مگر یہ سب باتیں مجھے یاد ہیں۔ طبیعت بھی بڑی موزوں پائی تھی۔ بے دھڑک عمدہ عمدہ شعر کہتے تھے۔ ایک طرح سے

شاعری ان کے ورثے میں آئی تھی۔ ان کے والد نواب سیّد نواب محمد حسن فطنتؔ خود بھی اچھے شاعر تھے اور وزیر علی عبرتؔ کے شاگردوں میں تھے۔ نبا صاحب موجؔ حضرت شادؔ عظیم آبادی کے چھوٹے بھائی کی لڑکی سے بیاہے ہوئے تھے، اس طرح حضرت شادؔ کے عزیز قریب ہوتے ہوئے ان کے شاگرد بھی تھے۔ پہلے حضرت شادؔ بھی ان سے محبت کرتے تھے مگر آخر میں کسی وجہ سے خفا ہو کر ان کی طرف التفات کم کرنے لگے۔ اکثر بڑے شاعروں میں جو کمزوری ہوتی ہے حضرت شادؔ بھی اس سے مبرّا نہ تھے۔ کبھی ایک شاگرد کو اوپر چڑھانا اور دوسرے شاگرد کو اس کے مقابلے میں نیچے گرانا بعض استادوں کا اکثر مشغلہ رہا ہے۔ نبا صاحب موجؔ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ان ہی دنوں بادشاہ نواب صاحب مرحوم کے یہاں ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ حضرت شادؔ اور ان کے سبھی شاگرد اس مشاعرے میں مدعو تھے۔ مشاعرے کے لئے جو غزل نبا صاحب موجؔ نے کہی تھی جب اصلاح کے لئے حضرت شادؔ کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اپنے پاس رکھ لی اور فرمایا کہ بعد میں اصلاح کے ساتھ واپس کر دیں گے۔ حضرت شادؔ نے بغیر اصلاح دیئے ہوئے نبا صاحب موجؔ کی غزل ان کو واپس بھیج دی مگر اپنے ایک شاگرد کی غزل پر پوری توجہ سے اس طرح اصلاح دی کہ خود ان کی غزل کا پورا اندازہ اور پر تو اس غزل میں ابھر آیا۔ نبا صاحب موجؔ کو پہلے ہی خبر مل گئی کہ اس مشاعرے میں ان کا رنگ پھیکا کر دیا جائے گا۔ یہ مشاعرے میں تو گئے مگر حقیقت حال کو جانتے ہوئے انھوں نے اسی دن سے شعر کہنا چھوڑ دیا اور مرتے دم تک پھر ایک شعر بھی نہ کہا۔ ان کا اپنا عالی شان مکان ان کو راس نہ آیا، لاولد پہلے ہی تھے اس برادری کے ایک لڑکے کو متبنّیٰ کر لیا تھا۔ وہ جب جوان ہونے کو آیا تو اس کو سانپ نے کاٹا اور وہ فوت ہو گیا۔ مکان کی نحوست اب اُن پر پورے طور پر ثابت ہو چکی تھی اس لئے اس مکان کو فروخت کر کے انھوں نے محلّہ باغ میر گلابی میں دوسرا مکان خرید لیا تھا۔ یہ صدر گلی سے لگا ہوا محلّہ ہے۔ چند سال یہاں رہے۔ ابھی باون ترپن ہی کی عمر ہو گی کہ ان پر فالج کا سخت دورہ پڑا اور اسی میں ان کا انتقال اپریل ۱۹۱۷ء میں ہو گیا۔

افسوس ہے کہ ان کے کلام کا مجموعہ مفقود ہو گیا۔ یوں تو دو ایک صاحب کے نام بتائے جاتے ہیں کہ وہ ان کے انتقال کے بعد لے اڑے مگر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ ان کے کوئی اولاد بھی نہ تھی اور بہت دن ہوئے ان کی بیوہ بیگم صاحبہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب کون بتائے کہ حقیقت میں ان کا دیوان کون صاحب اُٹھا کر لے گئے۔ ادھر اُدھر سے ان کے چند اشعار جو دستیاب ہوئے ہیں ان کو پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ خیر یارب بُلبل نا کام کی   مشت پر اور یہ کشاکش دام کی
خود گرے لیکن چھلکنے دی نہ مئے   اپنے سر لے لیں بلائیں جام کی

۲۔ یہ جام تو آخر کا غضب ڈھا گیا ساقی   ایسی تو کبھی تو نے پلائی ہی نہیں تھی
اللہ غنی اس نگہ ناز کا عالم   پلٹی تو خدائی کی خدائی ہی نہیں تھی

۳۔ تمنا دل سے رخصت ہوتی ارمان جاتے ہیں   سرائے کارواں کا کوچ ہے مہمان جاتے ہیں
کوئی گاہک نہیں جنسِ وفا کا اس زمانے میں   چلو ہم خود بڑھائے دیتے ہیں دوکان جاتے ہیں
خدا معلوم یہ کیسا اثر ہے ان کے وعدے میں   کبھی پورا نہیں ہوتا مگر سب مان جاتے ہیں

۴۔ وہ ہزار بیخودی تھی پہ مجال کیا ہے ساقی   کہ ہم اور میکدے کا کوئی راز فاش کرتے

۵۔ ہر اک سوال کا میرے دیا ہے اس نے جواب   عجیب شے ہے دل درد آشنا میرا

۶۔ خود اپنے کان سے اس نے سنا ہے راتوں کو   اب اور چاہتی کیا ہے اثر دعاء اپنا
ہے جن کے ہاتھ میں صبح وصال شام فراق   انھیں کو موج سمجھتے ہیں ہم خدا اپنا

۷۔ ممکن ہے دل کبھی اُسے بے پردہ دیکھ لے   تجھ پر وثوق اے نگہ دور میں نہیں
قاتل مرے لہو کی شہادت نہ دے سکے   اتنی چڑھی ہوئی بھی تو کچھ آستیں نہیں
اے موجِ دل تباہ ہوا عشق کے بغیر   سچ ہے کہ پھر مکان ہی کیا جب مکیں نہیں

۸۔ سچ ہے غریب بلبل کیونکر نہ چال چوکے   دام اس چمن میں لاکھوں پھیلے ہیں رنگ و بو کے
آخر بہار آئی ٹکڑے اُڑا گریباں   دو دن کو مفت احساں لینے پڑے رفو کے

۹۔ سُنیں سُنیں نہ سُنیں اُن پر زور کیا ناصح   تو کیا اب اس لئے ہم ترکِ مدعا کر لیں

لاڈلے صاحب بیتابؔ مرحوم

حضرت شاد عظیم آبادی کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس مین بوڑھے بھی تھے جوان بھی تھے اور کچھ ایسے کم سن بھی تھے جو پروان چڑھ کر جوان ہوئے اور اب جن کا بوڑھوں میں شمار ہے اور آج ان کے جانشیں کہلاتے ہیں، میں نے حضرت شادؔ کے کچھ ایسے شاگردوں کا تذکرہ اُٹھایا ہے جو میرے زمانہ میں پختہ مشق شاعر اور استاد کی حیثیت رکھتے تھے اور پھر اس فہرست کو بھی محدود کر کے صرف ان حضرات کو پیش کیا ہے جن پر لوگوں کی آنکھ برابر پڑی رہتی تھی۔ پہلی نگاہ سید علی خاں عرف لاڈلے صاحب بیتاب پر پڑتی ہے جو محلّہ مغلپورہ کے رہنے والے تھے اور فوجداری کے بڑے کامیاب مختار تھے۔ پٹنہ سیٹی کورٹ میں پریکٹس بھی کرتے تھے۔ عربی فارسی اور انگریزی میں کافی صلاحیت رکھتے تھے۔ پہلے تو پٹنہ سیٹی کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ماسٹری کرتے تھے پھر مختار کاری شروع کی اور اس پیشے میں انتہائی عروج تک پہنچے۔ یہاں کے ہر حلقہ میں ان کی عزت تھی۔ بڑے چھوٹے سبھوں سے یارانہ تھا۔ حد درجہ ملنسار، منکسر مزاج بھی تھے طبیعت بھی بڑی رساپائی تھی مقدمات کی اندھادھند میں شعر کہنے کی مہلت بہت کم ملتی، پھر بھی وقت نکال کر شعر کہہ ہی لیتے تھے۔ حضرت شاد خود ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان پر فخر بھی کرتے تھے حضرت بیتاب کو موقع ملتا، تو مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے، مگر لڑائی جھگڑے سے پہلو بچائے رکھتے تھے میرے والد مرحوم کے پاس برابر آتے تھے، کبھی ملاقات کی نیت سے اور کبھی مقدمات کے سلسلے میں، کیونکہ میرے والد مرحوم پٹنہ سیٹی کورٹ کے بنچ کے صدر آنریری مجسٹریٹ تھے۔

۱۹۰۷ء کا واقعہ ہے کہ بادشاہ نواب صاحب مرحوم کے یہاں دھوم دھام کا مشاعرہ تھا باہر سے بھی شعراء مدعو ہو کر آئے تھے۔ مختلف استادوں کی ٹولیاں الگ الگ حلقہ بنائے بیٹھی تھیں، اگلے جھگڑے اگرچہ ختم ہو چکے تھے پھر بھی مختلف ٹولیوں کی

شاعرانہ چشمکیں باقی تھیں۔ غزل پڑھنے والوں کو دوسری ٹولیوں کے شاعروں سے کھل کر داد نہیں مل رہی تھی۔ اسی درمیان لاڈلے صاحب بیتاب کے پڑھنے کی باری آئی۔ انھوں نے غزل شروع کی غالباً رسمی طور پر تہذیباً دوسری ٹولیوں کے دوچار شاعروں نے نیچی آواز میں "واہ" کہی اور تعریف میں دس پانچ گردنیں بھی ہلیں۔ جب لاڈلے صاحب بیتاؔب غزل کے حسن مطلع پر پہنچے۔

تڑپ کے رہ گئی بلبل قفس میں اے صیاد۔ یہ کیا کہا کہ ابھی تک بہار باقی ہے

اس وقت تحسین و آفرین کا وہ شور ہوا کہ درودیوار گونج اٹھے۔ پوری غزل مرصع تھی۔ دوسرے شعر نے مشاعرہ میں قیامت ڈھادی۔

سبیل ساقی کوثر نثار ہے جاری۔ پکار ہے کہ کوئی بادہ خوار باقی ہے

غالباً ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء کا زمانہ تھا، حضرت شاؔد گذر چکے تھے اور ان کی جگہ پر اب پٹنہ میں لاڈلے صاحب ان کے جانشین تھے۔ ان ہی دنوں حضرت صفؔی لکھنوی پٹنہ آئے۔ نواب سیّد احمد علی خاں مرحوم نے اپنے مکان واقع سنگی دالان میں ایک مختصر سی بزم مشاعرہ ترتیب دی۔ اصل مہمان حضرت صفی لکھنوی تھے۔ لاڈلے صاحب بیتاؔب خاص طور سے بلائے گئے، اور بھی دو چار پٹنہ کے شعراء شریک تھے۔ میں بھی شعر سننے والوں میں موجود تھا۔ اس مخصوص بزم میں حضرت صفی لکھنوی نے اپنی مشہور غزل پڑھی جس کے دو تین شعر مجھے یاد ہیں، انھیں آپ بھی سُنیں:-

ایک ٹوٹا ہوا آئینہ سہی۔ دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی
نزع کا وقت ہے بیٹھے رہیئے آپ اٹھے تو قیامت ہوگی
آپ اور گور غریباں کی طرف ہاں کوئی تازہ ضرورت ہوگی

اس غزل پر خوب واہ واہ ہوئی۔ اس کے بعد حضرت صفؔی نے لاڈلے صاحب بیتاب سے فرمائش کی کہ دو چار شعر سنائیں۔ حضرت بیتاؔب نے تعمیل فرمائش میں جو غزل سنائی۔

اس کے بھی دو چار شعر آپ سن لیجئے۔

ڈوب جانے کے سوا عشق میں چارا ہی نہیں
اس سمندر کا کسی سمت کنارا ہی نہیں
سنتے آئے ہیں کہ اک روز قیامت ہوگی
آپ نے زلف پریشاں تو سنوارا ہی نہیں
باز ہم ایسے تصوّر سے کہ جس نے اب تک
ایک نقشہ بھی ترا ٹھیک اتارا ہی نہیں
کیا ہے دریائے محبت کے ادھر کیا معلوم
تیری تلوار نے اُس گھاٹ اتارا ہی نہیں
پارسائی میں ہے فرد اس کی حیا اے بیتابؔ
شوق آلودہ نظر اس کو گوارا ہی نہیں

غزل ختم ہوئی تو حضرت صفیؔ اٹھ کر لاڈلے صاحب بیتابؔ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے آپ کو سننے کے بعد حضرت شادؔ کو سننے کی تمنا پوری ہوگئی۔

حضرت شادؔ اکثر اپنے شاگردوں کو لاڈلے صاحب بیتابؔ کے پاس اصلاح لینے کے لئے بھیج دیتے۔ اس لئے لاڈلے صاحب بیتابؔ کے بہت سے استاد بھائی ان کے شاگرد بھی ہیں، مگر اس اخلاق و انکسار کو دیکھئے کہ زندگی بھر ایسے حضرات کے ساتھ لاڈلے صاحب بیتابؔ صرف استاد بھائی کے ایسا سلوک کیا کئے اور استادی اور شاگردی کا لفظ ان کے متعلق کبھی زبان پر نہیں لائے۔ حضرت یاسؔ یگانہ عظیم آبادی، حضرت شادؔ کے بھی شاگرد تھے اور حضرت بیتابؔ کے بھی، جس کا انھوں نے اعتراف خود اپنے کلام میں کیا ہے۔

لاڈلے صاحب بیتابؔ اپنے کلام کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑ گئے تھے جو بہت دنوں تک لوگوں کی بے اعتنائی کے سبب سے کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔ مولوی سیّد انوار کریم صاحب جو محمڈن اینگلو عربک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انھوں نے اردو کے

صاحبان ذوق پر بڑا کرم کیا کہ حضرت حمیدؔ عظیم آبادی کی وساطت سے کلام بیتاب چھپوا کر شائع کرا دیا۔ کلام بیتابؔ کے چھپنے کی خبر آئی تو ہم سبھوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن جب کلام بیتابؔ ہاتھوں میں پہنچا تو سخت حیرت ہوئی کہ اتنے کہنہ مشق اور شاعر کا کلام اور اتنا مختصر۔ لاڈلے صاحب بیتابؔ کی شاعری کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی اور کم و بیش اتنی ہی غزلیں کلام بیتابؔ میں چھپی ہیں، اس پر تعجب نہ ہو تو کیا ہو۔ غزلیں یقینی طور پر کافی تھیں۔ خدا جانے بقیہ غزلوں کا کیا حشر ہوا۔ اب لاڈلے صاحب بیتابؔ کے چند اشعار آپ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ تمہاری چارہ گری کو سلام ہے میرا — کہ ایک زخم کو سو زخم اِک رفو نے کیا

۲۔ توڑ ڈالا ترے دیوانوں نے زنجیروں کو — اُف رے مستانہ وہ عالم تری انگڑائی کا

۳۔ کمال عصمت محبوب میں سمجھتا ہوں — کہ عشق تک ہوا اس کا تو غائبانہ ہوا

۴۔ آرزو خاک ہوئی، خیر یہی خاک سہی — اڑ کے چھو لے گی سلامت رہے داماں تیرا

۵۔ اسی قدر تو ہے سرمایۂ تجسس عقل — کہ کچھ زمیں کی خبر ہے نہ آسماں کا پتا

۶۔ اسی جانب کو بیخود ہو کے مجنوں دوڑ جاتا ہے — غبار اٹھتا نظر آتا ہے جس جانب بیاباں میں

۷۔ تری تلون نے مار ڈالا تری نہیں اور ہاں کے صدقے
نہ جانے پھر شام ہوتے ہوتے نہیں رہیگی کہ ہاں رہے گی

۸۔ نمود عشق اے بیتابؔ اک شان شہودی ہے — حباب ابھرے تو سمجھو یہ بھی ہے اک موج دریا کی

۹۔ دل گنہگار تصوّر ہوا میرا جس دن — وہی تاریخ بنا ہے مرے بتخانے کی

۱۰۔ دیکھیے زلف کا چھٹکا نہ پڑے شانے پر — ٹوٹ جائے کہیں زنجیر نہ دیوانے کی

۱۱۔ حسرت دید کی خود آنکھ مری دشمن ہے — جب نقاب اٹھتی ہے کمبخت جھپک جاتی ہے

۱۲۔ نگاہ مست جو ساقی کی ہر طرف پھرتی — بس ایک جام میں سب کو سرور ہو جاتا

۱۳۔ اسیری کا گلہ کیا، ہاں شکایت ہے تو اتنی ہے — قفس کے سامنے پاتا ہوں اجڑے آشیانے کو

۱۴۔ اک برق طور کے چمک اٹھنے کی دیر تھی — پھر چشم شوق تھی نہ دل ناصبور تھا

۱۵؎ عقل دوڑائی بہت کچھ تو گماں تک پہنچے کچھ حقیقت بھی ہے انساں کی کہاں تک پہنچے
لڑ گئی ان سے نظر کھنچ گئے ابردان کے معرکے عشق کے اب تیر و کماں تک پہنچے
سرخئی خارِ مغیلاں یہ پتہ دیتی ہے کہ اُدھر سے ترے دیوانے یہاں تک پہنچے
۱۶؎ اثر نہ پوچھئے ساقی کی مست آنکھوں کا یہ دیکھئے کہ کوئی ہوشیار باقی ہے
کھلی ہوئی ہیں وہ زلفیں اسیر ہو بیتاب ہنوز سلسلۂ اختیار باقی ہے

میر عنایت حسین امداد

چوک شکار پور سے بیگم پور اسٹیشن (پٹنہ سیٹی ریلوے اسٹیشن) کی طرف جانے والی سڑک سے پورب ایک گلی ملتی ہے جو دور تک پیچ و خم کھاتی ہوئی محلہ دھولپورہ (دول پورہ) میں نکلتی ہے ، اس گلی میں داخل ہوجایئے تو تھوڑی دُور ہی جاکر ٹوٹے پھوٹے پرانے عالی شان مکانات کے کھنڈر ملتے جائیں گے جن کے نام و نہاد احاطوں میں شکستہ مسجدیں بھی ہیں ، امام باڑے بھی ہیں۔ کہیں یہ بھی دیکھئے گا کہ ایسے گرے ہوئے عالی شان مکانات کے احاطوں کی دیواریں بھی گرچکی ہیں۔ یہاں اب صرف کھنڈر ہی کھنڈر نظر آئیں گے اور ان مکانات کی نیو پر بجائے عمارت کے گوبی کی کاشت دکھائی دے گی ۔ اسی راستے میں "میر اشرف کا مقبرہ" بھی ملتا ہے جس کے ویران اور شکستہ حال احاطے میں خوبصورت مسجد ، امام باڑہ اور تالاب بھی ہے ۔ میر اشرف کشمیری بڑے تاجر تھے اور دور مغلیہ میں "اضلاع ترہت" کے عامل بھی رہ چکے تھے۔ آپ راستہ چلتے جایئے تو محسوس کیجئے گا اس پورے علاقے میں دن کے وقت بھی قبرستان کی خاموشی کا عالم ہے اور سچ پوچھئے تو یہ ہونا بھی چاہئے ایک طرح پر اُن ویران علاقوں کو پٹنہ کی گزری ہوئی عظمت اور تہذیب و تمدن کا قبرستان ہی کہیئے جن پر نہ اب کوئی رونے والا ہے اور نہ ان علاقوں میں پرانے بسنے

والوں کے پس ماندگان میں سے بھی سوا دو چار کے کوئی نظر آتا ہے۔ ان ہی علاقوں میں ایک محلّہ لال املی کے نام سے بھی منسوب ہے۔ میر عنایت حسین صاحب مرحوم امداد اسی محلّہ کے رہنے والے تھے خاندانی عظمت و دولت بہت کچھ جاچکی تھی اور جو بچ رہی تھی اس کے بچائے بزرگوں کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ پرانے زمانے کو دیکھا تھا اس لئے خاندانی رکھ رکھاؤ کا بڑا خیال تھا، اور تھے معزز خاندان کے ایک رکن، جو پٹنہ میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بڑے خداترس، منکسر مزاج اور بااخلاق بزرگ تھے۔ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ بھی اس طرح جھک کر ملتے کہ ان کے اخلاق و آداب کو دیکھ کر طبیعت شرماجاتی۔ اپنے خاندان مکان میں رہتے تھے۔ ایک بڑے احاطے کے اندر، سامنے سڑک سے لگا ہوا بڑا سا پھاٹک، اندر جائیے، تو بڑے کشادہ صحن میں خوبصورت چمن بندی، پورب طرف مردانہ مکان سے لگا ہوا زنانخانہ اور کشادہ صحن گے پچھم جانب ان کے احاطے کے اندر ہی مسجد بھی اور امام باڑہ بھی کھانے پینے کو اللہ نے دے رکھا تھا اس لئے وقت گزاری کے لئے کوئی مشغلہ جی کو بھایا تو وہ شعر و سخن ہی کا مشغلہ تھا۔ شاعری بھی عجیب چیز ہے، اس سے ادب کی بھی خدمت کیجئے، اپنی خودی کو بھی بہلائیے اور نت نئی محفلیں بھی سجایئے یہ مشغلہ اس وقت کے بزرگوں کا عام مشغلہ ہوگیا تھا جس پر آج کل کے چند ترقی یافتہ نوجوان بغیر سمجھے بوجھے اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔
بہر حال میر عنایت حسین امدادؔ نے جب شاعری کو اپنایا تو خود بھی اسی کے ہو کر رہ گئے، ہر وقت ان کے پاس شاعروں کا مجمع رہتا، آئے دن چھوٹے بڑے مشاعرے ہوتے، استادوں کی مشکل غزلوں پر غزلیں کہی جاتیں اور اسی ماحول میں صبح سے شام ہوتی اور شام سے آدھی رات! ان کے استاد حضرت شادؔ عظیم آبادی نزدیک ہی پاس کے محلے حاجی گنج میں رہتے تھے۔ وقت نکال کر

وہاں بھی روزانہ پابندی کے ساتھ جاتے اور استاد کے یہاں کی صحبت اور تھوڑی دیر بیٹھ کر بہت کچھ فیض پاتے۔ حضرت شآد سے قریبی لگاؤ بھی تھا اس لئے اندرونی اور بیرونی معاملات میں اس گھر کے قریبی مشیر کار بھی تھے۔ جب کوئی بڑا مشاعرہ شہر میں ہوتا اور حضرت شآد اس میں شرکت کرتے تو یہ استاد کے ہمرکاب رہتے۔ مشاعروں میں اگر تلخی پیدا ہونے لگتی تو اپنی صلح جو طبیعت سے اس تلخی کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی نیکی ، ان کی سادہ دلی ، ان کا انکسار اور ہر ایک کے ساتھ ان کے پرخلوص اخلاق نے جہاں ان کو ہردلعزیز بنا رکھا تھا وہاں ان خصوصیتوں نے بہت سے لوگوں کو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر پردہ ڈالنے کا موقع بھی فراہم کردیا تھا۔ اپنے منہ سے میر عنایت حسین امدآد اپنی شاعری کا کبھی تذکرہ نہیں کرتے ۔ بغیر کسی کی خواہش کے اپنا کلام خواہ مخواہ نہیں پڑھتے، دوسروں کے اشعار کی بے حد تعریف کرتے اور جب اپنی غزلیں پڑھتے تو کہیں پر ان کے پڑھنے میں شاعرانہ تعلّی کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ شاعر تھے مگر کبھی کسی پر منہ نہ آئے اور ان پر اگر کبھی اعتراض ہوتا تو مسکراکر ٹال دیتے ۔ دوسروں کو مشاعروں میں آگے بڑھاتے اور خود پیچھے بیٹھتے۔ جہاں جاتے اپنے استاد بھائیوں کی صلاحیت کا ڈھول پیٹتے اور ہر طرح اپنے سے بڑھ چڑھ کر جگہ دیتے۔ دنیا کا حال تو معلوم ہی ہے ۔ کم سخن اور منکسر مزاج والوں کو آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں ہوتی ۔ یہی ان کے ساتھ ہوا۔ آج جہاں حضرت شآد کے شاگردوں کا ذکر آتا ہے وہاں حضرت امداد بہت پیچھے صف آخریں میں دکھائی دیتے ہیں ۔ میں نے ان کو دیکھا ہے ، ان کی خوبیاں میری آنکھوں کے سامنے ہیں ، اس لئے میرے دل میں ان کی عزت و وقعت ہے۔ ان کو اُٹھے ہوئے کافی مدت ہوگئی ۔ چوہتر برس کی عمر میں ۱۹۴۴ء میں انہوں نے انتقال کیا مگر افسوس ہے کہ آج تک ان کا مجموعہ کلام مسودوں میں کسمپرسی کے عالم

میں پڑا ہے جنہوں نے ان کا کلام سنا ہے، ان کی شاعرانہ صلاحیت کے معترف ہیں اور جنہوں نے نہیں سنا ہے ان کے لئے حضرت امدآد کے چند اشعار ضیافت طبع کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

۱ کہتے نہ تھے نقاب کا پردہ کہاں تلک | دیکھو نگاہ والوں کی آخر نظر گئی
۲ قاصد جو کہہ گیا ہے وہی مانتا ہوں میں | اس کے سوا حدیث کوئی معتبر نہیں
۳ آئینہ ان کا ہے، آئینہ گری اُن کی ہے | کس طرح پھر نہ وہ دعویٰ کریں یکتائی کا
۴ سارا طلسم عالم ہستی کا ٹوٹ جائے | محشر بپا ہو یار جو ترچھی نظر کرے
۵ خدا کے واسطے مجھ کو مزہ تو لینے دو | پیامِ یار کو دُہرا کے پھر ذرا کہنا
۶ مزاج شمع کو امدآد پروانے سمجھتے ہیں | بہت مشکل ہے ورنہ سوز سے دمساز ہوجانا
۷ تاسحر سوز وفا نے کیا دونوں کو تمام | شمع محفل میں سلامت ہے نہ پروانہ ہے
۸ شانہ الجھاؤ میں زلفوں کے کبھی حیراں ہے | آئینہ تکتا ہے منہ آپ کا حیرت سے کبھی
۹ فسانہ گو کو بھی نیند آگئی کہانی پر | وہ بات رہ گئی جو حاصل فسانہ تھی
۱۰ نکلو پردے سے کہ مشتاق بھری محفل ہے | انجمن کیا جو نہ ہو انجمن آراء کوئی
۱۱ سرخ ہے دامن صحرائے جنوں کوسوں تک | راہ بھولا تو نہیں باد پیما کوئی
ہر نفس پر یہ گماں ضعف سے ہے سینے میں | جھلملاتا ہے چراغ تہ دلاں کوئی
۱۲ الٰہی خیر! نہ جانے گلوں پہ کیا گزری | چمن میں آج صبا بار بار آئی ہے
۱۳ ایک منزل پہ پہنچ جانا ہے سب کو اک دن | کیوں جھگڑتا ہے مسافر ہے سرا ہے تو
۱۴ اک طلسم نظری یاں کی ہے ساری یہ بہار | ورنہ گل کیسے صبا کیسی، خیاباں کیسا
ایک پرواز میں چاہوں تو قفس کو توڑوں | پاس صیاد کا ہے ورنہ یہ زنداں کیسا
واصل بحر جو قطرہ ہوا وہ بحر ہوا | نوعیت ایک ہوئی فرق نمایاں کیسا

ہم لاکھ چاہیں یہ کہ قیامت بپا نہ ہو
ضد آپ کو جو ہو تو ابھی کیا سے کیا نہ ہو

مرزا واجد حسین یاسؔ یگانہ چنگیزی

مرزا واجد حسین یاسؔ یگانہ چنگیزی ۸۳-۱۸۸۲ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ میں ایک محلّہ چاند ماری کا گڑھا جو وسیع محلّہ مغلپورہ کا ایک حصہ ہے ، وہیں ان کا گھر تھا۔ بچپن ہی سے بلا کے ذہین تھے۔ گھر پر تھوری بہت عربی اور فارسی پڑھ کر پٹنہ کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوئے۔ ذہانت کے ساتھ طبیعت میں بغاوت کا بھی مادہ تھا۔ اپنے معلموں سے بھی لڑتے تھے ، اسی لئے جتنا بھر امکانات ان کیلئے پڑھنے کے تھے اتنا نہ پڑھ سکے اور اسکول کی تعلیم صرف انٹرنس تک مکمل کرکے انگریزی تعلیم کو بھی خیرباد کہا۔ یہ تو ان کی ذہانت اور ذکاوت کا کرشمہ تھا کہ جو پڑھا اس کو یاد رکھا اور پھر بعد میں اپنے ذاتی مطالعوں سے اپنے علم میں اضافہ کرتے گئے بچپن ہی سے شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ ہم عمروں کی ٹولیاں بنا رکھی تھیں ۔ ان ہی ٹولیوں میں بیٹھ کر خود شعر کہتے اور اپنے ہم عمر ساتھیوں سے بھی شعر کہلواتے۔ مزہ تو یہ تھا کہ بچپن کی اس شعر و شاعری کی بہ زعم خود اپنے ساتھیوں کے استاد بھی بن گئے تھے ۔ ان کے محلّہ کے بزرگوں کو جب یہ خبر ملی کہ بچوں کی ایک ٹولی ہے جس میں بچے شعر و شاعری کرتے ہیں اور مشاعرے بھی منعقد کرتے ہیں جہاں ان کے علاوہ باہر کے لوگ مدعو نہیں کئے جاتے، تو ان بزرگوں کو بڑی حیرت ہوئی ۔ یہ زمانہ پٹنہ میں شعر و شاعری کے عروج کا زمانہ تھا، ساتھ ہی ساتھ بے فکری کا بھی ، اس لئے ہر جگہ مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ بہت سے پڑھے لکھے اصحاب شاعری میں استادانہ صلاحیت بھی رکھتے تھے، چنانچہ حافظ سید نذرالرحمٰن حفیظؔ جو ایک مشہور خاندان کے سربراہ حضرت مولانا سید شاہ محمد سعید صاحب مرحوم کے نواسہ اور جانشین اور بڑے خوش گوشاعر محلّہ

مغلپورہ ہی میں رہتے تھے ، یہ مرزا واجد حسین یاسؔ کی ذہانت اور بچپن ہی میں ان کی شاعرانہ صلاحیت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور پکڑ کر اپنے یہاں لے گئے ، اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ یاسؔ عظیم آبادی کے پہلے استاد اور ان کی شاعری کو شاعرانہ اصول پر ٹھیک چلانے والے سب سے پہلے حافظ سید نذر الرحمٰن حفیظؔ ہی تھے۔ یاسؔ تیزی کے ساتھ یہاں کے نوجوان شعراء کی صف میں آگے بڑھ رہے تھے ۔ نبا صاحب موجؔ اور لاڈلے صاحب بیتابؔ اس وقت پختہ مشق ہو چکے تھے ، بلکہ استادوں کی حیثیت میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ یاسؔ دونوں حضرات کے یہاں بھی اب حاضری دینے لگے۔ حضرت شادؔ اس وقت مشہور زمانہ استاد موجود تھے ۔ یاسؔ ان کی خدمت میں پہنچے ۔ یہ یاسؔ کی جوانی کا زمانہ تھا ۔ چند غزلوں پر یاسؔ نے حضرت شادؔ سے اصلاح لینے میں بھی ان کی باغیانہ اپج نظر آتی ہے ۔ اکثر مشاعرے میں حضرت شادؔ کی اصلاح کو ہٹا کر اور حذف کر کے غزل پڑھ دیتے ۔ حضرت شاد کو یہ بغاوت پسند نہ تھی اس لئے انہوں نے حضرت لاڈلے صاحب بیتابؔ کے پاس اصلاح سخن کے لئے ان کو حوالہ کردیا ، حضرت بیتابؔ مرنجاں مرنج آدمی ہر حال میں خوش تھے ۔ حقیقت بھی یہ تھی کہ یاس رسماً شاگردی اور استادی کا رشتہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ ان کی فطری صلاحیت شاعری میں ان کو سہارا دے کر بہت آگے بڑھا چلی تھی اور پختہ مشقی کے ساتھ ان کی خودبینی بھی بڑھ رہی تھی ۔ ان ہی دنوں ان کی شادی لکھنؤ کے ایک گھرانے میں ہوئی اور یہ لکھنؤ چلے گئے ۔ وہاں پہنچ کر ان کی شاعرانہ شوریدہ سری وہاں کے شعراء سے ٹکر لینے لگی ۔ کئی سال کے بعد یہ پٹنہ آئے ۔ اس وقت تک ان کی شاعرانہ خودبینی انتہا کو نہیں پہنچی تھی ۔ ان ہی دنوں پٹنہ میں مشاعرہ ہوا تو یاسؔ بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔ غزل کے علاوہ انہوں نے ایک نیا قطعہ بھی پڑھا جس میں پٹنہ کے شعراء سے

اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ اس کے دو چار شعر میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

کون ہوں کیا ہوں مجھے بھی دیکھ لیں اہل وطن

کوچہ گردِ لکھنو خاکِ عظیم آباد ہوں

مرد جاہل ہوں مگر جہل مرکب سے بری

مرد خود بیں ہوں نہ میں خود ساختہ استاد ہوں

ہوں ادب پرودۂ آغوش بیتاب و حفیظ

ناز اس پر ہے کہ خاک آستان شاد ہوں

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب پٹنہ سے پہلی دفعہ لکھنو گئے تھے تو اس وقت لکھنو میں پیارے صاحب رشید موجود تھے۔ یہ اپنی غزلوں پر اصلاح کے لئے ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے مگر پیارے صاحب رشید کا رنگ ان کی آنکھوں میں نہ جچا اور اصلاح لینے کا خیال ہی یاس نے ترک کردیا۔ ہو سکتا ہے یہ واقعہ صحیح ہو مگر لکھنو جانے سے قبل ہی یہ اصلاح کی بندھنوں سے آزاد ہو چکے تھے اور شاعری میں انہوں نے اپنا راستہ الگ متعین کر لیا تھا، اس لئے پیارے صاحب رشید کے پاس اصلاح کیلئے یاس کا جانا مجھے تو قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اپنے متعلق "فاتح لکھنو" کا لقب اپنی زبان میں بار بار دہرانا اس کی دلیل ہے کہ یہ اس وقت کے لکھنو کے شعراء کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

یہ لکھنو سے پٹنہ پہلی دفعہ واپس آئے تو کافی مدت تک پٹنہ میں رہ گئے۔ ان کا قیام محلہ سنگی دالان میں سید ابوالحسن خان کے گھر میں تھا۔ پرانے ہم صحبتوں کی جھرمٹ میں یہ شعر و شاعری کرتے رہے اس کے بعد جب دوبارہ لکھنو گئے تو پلٹ کر نہ آئے۔ دوبارہ لکھنو جانے کے کچھ دنوں بعد یہ حیدر آباد میں سب رجسٹراری کے عہدے پر حکومت حیدر آباد کی طرف سے مقرر ہوئے۔ اسی درمیان میں ان کی شاعرانہ خودستائی اور خود بینی زور پکڑ چکی

تھی ۔ لکھنو کے شعراء سے الجھ ہی چکے تھے ، اب حضرت غالبؔ پر پل پڑے۔ کبھی حضرت غالب کے چچا بنتے ، کبھی حضرت غالبؔ کو اپنا چچا بناتے ، یاسؔ سے یگانہ چنگیزی بھی بن چکے تھے ۔ اب صرف میر تقی میرؔ ان کے خیال میں ان کے مدمقابل شاعر تھے ۔ ان کے بعد سارے گزرے ہوئے اور موجودہ شعراء اردو ان کے سامنے ہیچ تھے کبھی جب خود بینی کا نشہ کم ہوتا اور حالات کا جائزہ لیتے تو حقیقت کا احساس ہوتا ، چنانچہ ان کا ایک مطلع جو ان کے حقیقت حال کا آئینہ دار ہے ، اس کو پیش کرتا ہوں۔

خودی کا نشہ چڑھا ہوش میں رہا نہ گیا

خدا بنے تھے یگانہؔ مگر بنا نہ گیا !

۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا اور یہ لکھنو کے شعراء سے شعر ، زبان اور عروض کے معرکے لڑ رہے تھے۔ یہ اکیلے تھے اور دوسری طرف لکھنو کے سارے شعراء۔ یہ معرکے بھی کبھی یادگار ہیں ۔ یہ معرکے شعر و ادب کی حدود سے آگے بڑھ کر ذاتیات تک جا پہنچے تھے ۔ یہ اپنی زبان و قلم سے سب کو جھنجوڑتے تھے۔ اگر کبھی زخم بھی کھاتے تو اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان ہی دنوں پٹنہ سے ایک ہفتہ وار اخبار "مشیر بہار" نکلتا تھا ، جس کے ایڈیٹر مشہور صحافی اور اہل قلم لکھنو کے ظفر الملک علوی مرحوم تھے ، یاسؔ نے اخبار "مشیر بہار" میں اشاعت کے لئے ایک غزل لکھنو سے بھیجی ۔ غالبؔ کی ایک غزل پر یاسؔ کی یہ غزل تھی ۔ غالبؔ کا مطلع یوں ہے۔

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا رکھیو یا رب یہ درگنجینہ گوہر کھلا

اسی سلسلے میں آپ ذرا غالبؔ کا ایک یادگار شعر بھی سن لیجئے۔

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

یاسؔ نے اپنی غزل کے ساتھ ظفرالملک علوی صاحب کے نام ایک خط بھی لکھا تھا۔ میرے بچپن کا زمانہ تھا مگر اس خط کا مضمون مجھے تھوڑا بہت یاد ہے، وہ اس طرح پر کہ میرے والد مرحوم اخبار "مشیر بہار کے مینجنگ ڈائرکٹر تھے اور ظفر الملک علوی صاحب روزانہ ان کے پاس آتے تھے اور خطوط جو ان کے نام سے بھی آتے تھے ان کو دکھلاتے تھے۔اس طرح وہ خط میں نے پڑھا۔ چوں کہ غالبؔ کی غزل پر یاسؔ کی غزل تھی، میں نے غزل جس کے شامل ان کا خط بھی تھا ظفرالملک علوی صاحب سے مانگ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا، وہ خط اور غزل تو نہ معلوم کیا ہوئے مگر خط کا مضمون اور غزل کے دوچار شعر یاد رہ گئے ہیں۔ خط کے سارے الفاظ تو یاد نہیں مگر مطلب یہ تھا کہ مبدءِ فیاض نے شعر گوئی کی صلاحیت صرف دو شخصوں کو ودیعت کی۔اگلے زمانے میں میر تقی میرؔ تھے اور آج کل میں ہوں۔ اس کے بعد ظفرالملک صاحب سے استدعاء تھی کہ وہ اُن (یاسؔ) کی غزل کو اخبار "مشیر بہار" میں شائع کردیں تاکہ لوگ دیکھیں کہ غالبؔ نے جو غزل کہی تھی اس سے کتنی زیادہ یہ غزل چوکھی ہے۔ ظفرالملک صاحب لکھنو کے رہنے والے ایک تو یوں ہی یاسؔ سے جلے ہوئے تھے غالبؔ کی غزل پر یاسؔ کی غزل دیکھی تو اور بھی جل گئے۔ یاسؔ کا خط اور ان کی غزل اخبار "مشیر بہار" میں شائع تو کردیا مگر اپنی طرف سے بلاکسی ایڈیٹوریل نوٹ کے صرف یہ عنوان خط اور غزل کے شروع میں بڑھادیا "اپنے منہ میاں مٹھو"۔ یاسؔ کی وہ غزل اب چھپ بھی گئی ہے اور ان کے مجموعہ کلام "آیات وجدانی" میں موجود ہے۔ اگر یاسؔ کی خودستائی کو الگ کرکے دیکھا جائے تو یہ کامیاب غزل ہے، دو چار شعر اس غزل کے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

واں نقاب اٹھی کہ صبح حشر کا منظر کھلا | یا کسی کے حُسن عالم تاب کا دفتر کھلا
چپ لگی مجھ کو گناہِ عشق ثابت ہو گیا | رنگ چہرے کا اڑا رازِ دل مضطر کھلا
سُرخ خوں سے زرد چہرے پر ہے یکطرفہ بہار | دیکھئے رنگِ جنوں کیسا مرے منہہ پر کھلا
صحبتِ واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں | راز اپنی میکشی کا کیا کہیں کیونکر کھلا
ہاتھ الجھا ہے گریباں میں تو گھبراؤ نہ یاسؔ | بیڑیاں کیونکر کٹیں زنداں کا در کیونکر کھلا

یاسؔ ان ہی دنوں حیدر آباد میں رجسٹراری کے عہدے پر مقرر ہو کر چلے گئے۔ یہی زمانہ ہے کہ دنیائے ادب میں یاسؔ خوب چمکے۔ ہر طرف سے واہ واہ نے ان کی رعونت اور خودستائی کو اور بھی ہوادی جب حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ واپس آئے تو ان میں تھوڑی بہت بجزیہ نفسی جو بچ رہی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ پہلے تو شعر و شاعری میں نئے اور پرانے استادان فن سے بغاوت کرتے تھے اب اللہ اور رسول سے بھی بغاوت کرنے لگے۔ کہیں کہیں شعروں میں بھی ان کی بغاوت ظاہر ہو جاتی ہے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنے لگے تو لکھنؤ والے ان کو برداشت نہ کر سکے اور اس کا ردّعمل یہ ہوا کہ ہر طبقے کے مسلمان ایسے بھپرے کہ بُرے طور پر ایک دن تمام شہر میں اس کی تذلیل کرتے پھرے غالباً ۴۲۔۱۹۴۰ء میں ان کا انتقال ہوا اور یہ سر پھرا اور باغی شاعر ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا۔

بہر حال یہاں تو ان کی شاعری کا تذکرہ مقصود ہے۔ یاسؔ عظیم آبادی نے علم عروض میں متعدد کتابیں لکھی ہیں جو چھپیں اور خوب فروخت بھی ہوئیں۔ ان کی شاعری کے بھی کئی مجموعے چھپے۔ اس میں شک نہیں کہ یاسؔ ایک قادرالکلام شاعر تھے، زبان پر بھی قدرت تھی اور بیان میں بھی معنی

آفرینی تھی۔ ادھر اُدھر سے میں نے ان کے کچھ اشعار چنے ہیں، ان کو پیش کر رہا ہوں۔

۱ مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا — پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے — بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

۲ نیرنگ حسن و عشق کی وہ آخری بہار — تربت تھی میری اور کوئی اشکبار تھا

۳ یاسؔ اچھی نہیں گستاخی دستِ وحشت — دامنِ یار کو کیا اپنا گریباں سمجھا؟

۴ کسی کے ہور ہو اچھی نہیں یہ آزادی — کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

۵ دل آگاہ نے بیکار میری راہ کھوٹی کی — بہت اچھا تھا انجام سفر سے بے خبر ہونا

۶ پرائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک — حقیقت کھل نہ جائے اضطراب راز داں ہو کر
ارے او جلنے والے کاش جلنا بھی تجھے آتا — یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر

۷ کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو — دل میں سوائے یار کسی کا گذر نہیں

۸ یہ کس نے گرم رفتار فنا کی راہ کھوٹی کی — بٹھا کر پردۂ فانوس میں شمع شبستاں کو
گرفتارانِ ساحل کود پڑتے دَم نکل جاتا — کبھی تو زیست مشکل آزماتی مرگِ آساں کو
گناہِ بے حقیقت کو قلم نے کتنا چمکایا — پھڑک اٹھتا ہوں میں جب دیکھتا ہوں فرد عصیاں کو

۹ فلک نے بھول بھلیاں میں ڈال رکھا تھا — ہم اُن کو ڈھونڈتے یا اپنی جستجو کرتے

۱۰ نگاہِ مضطرب کی حد ہے فانوس خیالی تک — قیامت تھی اگر پروانہ شمع یقیں ہوتی
جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے — شریک رنج و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی

۱۱ ہنسی میں لغزشِ مستانہ اڑگئی واللہ — توبے گناہوں سے اچھے گناہ گار رہے
سزائے عشق بقدر گناہ ناممکن — یہی بہت ہے کہ برہم مزاج یار رہے

۱۲ ہنوز گوش برآوازِ غیب ہے کوئی — اُمیدوارِ ازل اب تک انتظار میں ہے

۱۳ پلٹ کر پھر وہی آواز بازگشت آئی — بڑھے نہ حوصلے فریاد بے اجازت کے

۱۴ صبح و شام زندگی خواب پریشاں ہی سہی — کچھ حقیقت کا بھی جلوہ جلوۂ باطل میں ہے

۱۵ حسنِ بے رنگ کہیں رنگ پکڑ سکتا ہے — پردہ جب تک نہ کوئی بیچ میں حائل ہو جائے

اگلے زمانہ کی خواتین

پٹنہ کے جس دور کا یہ تذکرہ لکھ رہا ہوں ، اس وقت شاعری کا ذوق ہر طبقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ رئیسوں سے لے کر تعلیم یافتہ عوام کے حلقہ میں بھی شعروشاعری کا چرچا تھا۔ مشاعرے آئے دن ہوتے رہتے تھے اور طرحی غزلوں پر خواتین بھی آزمائی طبع کرتی تھیں اور ان کی غزلیں کبھی کبھی ان کی طرف سے مشاعروں میں پڑھی بھی جاتی تھیں اور دادسخن حاصل کرتی تھیں۔ یہ شاعرہ عورتیں زیادہ تر اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ ان کے جذبات کی پاکیزگی ان کے کلام میں نمایاں رہتی تھی۔ اس وقت کوئی بھی شریف گھر ایسا نہ تھا جہاں عورتوں کو ضروری تعلیم نہ دی جاتی ہو ۔ صاحب علم استانیاں کثرت سے ملتی تھیں ۔ اکثر ان شریف گھرانوں کی بچیاں ، استانیوں سے اپنی تعلیم مکمل کرکے اس وقت کے مستند علماء و فضلاء سے بھی عربی اور فارسی میں درس لیتی تھیں ۔ شاعری چونکہ سوسائٹی کا جزولاینفک بن گئی تھی ، اس کا چرچا عورتوں تک بھی پہنچتا تھا اور یہ بھی پردہ کے اندر رہ کر سنجیدہ اشعار کہتیں جن میں معنی آفرینی بھی ہوتی اور رعنائی کلام بھی ملتی۔ اس شاعرانہ ماحول سے طوائفوں کا طبقہ بھی متاثر تھا اور اس کو متاثر ہونا بھی چاہئے تھا۔ کیونکہ تغزل کی رعنائیوں میں ان ہی کے یہاں کی معاملہ بندی ، ادابندی اور عیش کوشی کی جھلک نظر آتی تھی۔ طوائفوں میں جو زیادہ پڑھی لکھی ہوتیں ، وہ شعر خود کہتیں اور جن کی علمی صلاحیت کم ہوتی، وہ اپنے نیازمندوں سے اپنے لئے غزلیں لکھواتیں اور محفلوں میں لہک لہک کر گاتیں ۔

ادب و شاعری کا ذوق صرف پڑھی لکھی عورتوں تک ہی محدود نہیں تھا ۔ مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے کہ گھر کی بڑی بوڑھی خادمائیں اور مامائیں

ایسی شستہ اور صاف اردو بولتی تھیں کہ آج کل کی عورتیں تو خیر مرد بھی زیادہ تر ایسی شستہ زبان نہیں بولتے ہیں ۔ کتابی قصے اور افسانے ان کو خوب یاد تھے۔ رات میں بچے کہانیوں کی فرمائش کرتے تو یہ خادمائیں بچوں کو یہ کتابی قصے سناتیں گفتگو میں یہ خادمائیں برجستہ اور حسب حال اشعار پڑھتیں ۔ زیادہ تر یہ خادمائیں الف اور بے سے بھی آشنا نہ تھیں مگر ان کی گفتگو سن کر کوئی ان کو جاہل نہ کہہ سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ شریف خواتین جن کے ساتھ یہ خادمائیں منسلک رہتی تھیں خود تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور اپنی ماماؤں کو بھی اپنے فیض صحبت سے نیم تعلیم یافتہ بنادیتی تھیں اور ان کی زبانوں کو بھی شین قاف سے درست رکھتی تھیں ۔ بات یہ تھی کہ اس وقت شریف گھروں کی لڑکیاں جو ناکتخدا ہوتی تھیں ، گھر سے کہیں باہر براوری میں بھی ملنے کے لئے مشکل سے جاتی تھیں ۔ ہمجولیوں میں وہی ان کی خادمائیں ہوتی تھیں جو ان کی خدمت کے لئے مقرر کی جاتیں ، وہی ان کا دل بھی بہلاتیں ، شریف لڑکیاں پڑھی لکھی ہوتیں اس لئے وہ اپنی خادماؤں اور ماماؤں کو بھی تعلیم سے ایک حد تک روشناس کراتیں ، دینیات ، تاریخ اور ادب کی کتابوں سے مضامین اور قصے سناتیں اور یہ خادمائیں بھی جی لگا کر ان کو سنتیں اور بڑھی حد تک علمی اشارات سے بہرہ مند ہوتی رہتیں ۔ میرے بچپن میں میری ایک بوڑھی کھیلائی تھی ، وہ میری نانی اماں کی ہم سن خادمہ تھی۔ جب میری نانی صاحبہ کا انتقال ہو گیا تو میری والدہ مرحومہ کے پاس رہنے لگی ۔ سچ پوچھئے تو اسی میری بوڑھی کھیلائی نے بچپن میں مجھے اسلامی قصے راتوں میں کہانی کہہ کر سب سے پہلے سنائے۔ اس کے کہانی کہنے کا انداز بھی بڑا دلفریب ہوتا۔ بیچ بیچ میں شعر بھی پڑھتی اور پھر کہانی کو آگے بڑھاتی ۔ یہ بالکل پڑھی لکھی نہ تھی مگر زبان ایسی صاف کہ کوئی نہ سمجھ سکے کہ پڑھی لکھی نہیں ہے۔ میں اس کو نانی کہتا تھا۔ ایک دفعہ

میں نے پوچھا کہ نانی بوا یہ سارے کتابی قصے تمہیں کہاں سے معلوم ہوئے اور یہ جو تم طرح طرح کے اشعار پڑھتی ہو، تم نے کس سے سیکھے ؟ ہنس کر کہنے لگی " بیٹا یہ تمہاری نانی اماں کا تصدق ہے، وہی سب کچھ پڑھ کر ہم سبھوں کو بتاتی تھیں میں نے پڑھنا لکھنا تو نہیں سیکھا مگر مذہب کی باتیں ، اسلامی تاریخ کے قصے اور دوسری کتابوں کے قصے اور کہانیاں جو میں ان سے سنتی رہی سب یاد ہوگئے"

اس کے بعد زمانہ بدلا ، عورتوں کی قید بند جب ڈھیلی ہونے لگی تو علمی مشاغل میں بھی سہولتیں آنے لگیں ۔ فطرتا عورتوں کو ادب و شعر کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے ، اس لئے آج کل کے زمانے میں بھی عورتیں ادیب و شاعرہ ملیں گی ۔ فرق یہ ہے کہ اگلے زمانے کی عورتوں کی ادبی تخلیقات یا تو منظر عام پر نہ آئیں یا ان ہی کے ساتھ دفن ہوگئیں ، مگر آج ترقی کے دور میں وہ اپنی تخلیقات کی خود محافظ ہیں ، چونکہ اس جگہ موجودہ دور کی ادیبہ اور شاعرہ خواتین کا تذکرہ لکھنا مقصود نہیں ہے اس لئے صرف گذشتہ دور کی چند شاعرات کے متعلق تھوڑا سا تذکرہ لکھ کر اس بات کو ختم کردونگا۔

گذشتہ دور میں قدامت پسندی کا معیار یہاں کی پردہ نشین خواتین میں بھی اور یہاں کے شرفاء میں بھی اتنا بڑھا ہوا تھا کہ زیادہ تر شریف خواتین کے اشعار بھی پردے سے باہر نہیں آتے تھے ۔ یہ میں نے بار بار سنا ہے کہ اس زمانے کے شرفاء اس کو بالکل پسند نہ کرتے تھے کہ ان کی عورتوں کا کلام منظر عام پر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ پردہ نشیں شاعرہ خواتین کے نام بھی لوگوں کے سامنے نہ آسکے۔ مولوی فصیح الدین بلخی مرحوم نے بڑی کدوکاوش کے بعد جو کتاب "تذکرۂ نسوان ہند" لکھی ہے ، اس کتاب کی جب میں نے مدد لینی چاہی تو مخصوص دور کی شاعرات کی فہرست میں جو شریف خواتین کے نام مجھے ملے ،

وہ وہی تھے جن کے نام بلاواسطہ مجھے بھی معلوم تھے اس لئے ان سے چند خواتین کا تذکرہ حاضر خدمت ہے۔ طوائفوں میں جو شاعرات اس دَور میں تھیں اور جن کی شاعری کا چرچا اس وقت تھا ان میں سے دو تین کا تذکرہ اس جگہ شامل ہے۔

پردہ نشین شاعرہ خواتین

منیر النساء: منیرؔ تخلص۔ اصل نام منیر النساء تھا۔ رئیس گھرانے کی خاتون تھیں ان کے والد نے گھر پر ان کو فارسی اور عربی کی تعلیم دلوائی۔ ان کے شوہر بھی صاحب علم تھے اور ان کا نام شاہ لیاقت حسین چشتی کمبل پوش تھا۔ شادی سے پہلے ان کی زندگی اپنے ماں باپ کے ساتھ لکھنو میں گزری تھی اس لئے زبان بڑی شستہ تھی۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعری میں کس کی شاگرد تھیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ ان کے پوتے رئیس الحق صاحب کے پاس موجود تھا جو موضع جمواواں، ضلع پٹنہ میں رہتے تھے، مگر بد قسمتی سے یہ مجموعہ طباعت کا شرمندہ احسان نہ ہوسکا، ان کے دو تین شعر سن لیجئے:۔

۱۔ کرتی ہوں رات دن میں زیارت رسول کی
پھرتی ہے اپنی آنکھوں میں صورت رسول کی

۲۔ نہ رکھو ہجر میں بیمار مجھ کو — پلا دو شربت دیدار مجھ کو
رہوں کب تک جدائی میں تڑپتی — بلا لو جلد اے سرکار مجھ کو

۳۔ منیرؔ لونڈی ہے اپنی نبیؐ کی ڈیوڑھی کی
کسی کے دَر سے ہے اس کو تو کوئی کام نہیں

غریب:۔ پٹنہ کے ایک خوشحال باش متوسط الحال شریف میر برکت علی تھے۔ انہوں نے دوسری شادی ایک پڑھی لکھی پردہ نشین عورت سے کی یہی وہ باحیا اور صاحب عصمت خاتون تھیں مگر شعر و شاعری کی بڑی دلدادہ۔شعر بھی اچھا کہتی

تھیں، نام امیر النساء تھا اور تخلص غریبؔ کرتی تھیں "مشاہیر نسواں" میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔

ان کے بھی دو تین شعر ملاحظہ ہوں :۔

؎ لو اور وہ جلنے لگا میرے نام سے

دل اپنا سرد آہ شرر بار نے کیا

کھلتا نہ تا بمرگ مرا یہ معاملہ

رسوائے شہر مجھ کو دلِ زار نے کیا

؎ دل کو در پردہ جلایا مثل شمع کیوں غریبؔ

وہ جو پروانہ ہے غیروں پر تو ہو، کچھ غم نہ کر!

جمیلہ :۔ اس دور کی ممتاز شاعرہ رضیہ خاتون جمیلہؔ بھی تھیں۔ ان کے والد مولوی یحییٰ علی کلکتہ کے رئیسوں میں تھے۔ گھر پر اردو، فارسی اور دینیات کی کتابیں پڑھیں۔ شروع ہی سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ جب ان کی شادی خدا بخش خان بہادر سی آئی ای بانی خدا بخش اورینٹل لائبریری اور پٹنہ کے ممتاز وکیل سے ہوئی تو شعر گوئی کا شوق اس سبب سے اور بھی بڑھا کہ خود خدا بخش خاں شعر و شاعری کے دلدادہ اور ادب لطیف کے حامل تھے۔ رضیہ خاتون نے اپنا تخلص بھی شوہر ہی کے تخلص پر رکھا۔ خدا بخش خاں شاعری میں جمیل تخلص کرتے تھے اس لئے انہوں نے جمیلہؔ تخلص پسند کیا۔ جمیلہ بڑی عابد و زاہد اور پیر پرست بھی تھیں۔ شاہ جمال الدین صاحب سے ان کو بیعت تھی۔ ۱۹۲۱ء میں ان کی وفات ہوئی ان کا سن پیدائش ۱۸۶۸ء تھا۔ شوہر کے مرنے کے بہت دنوں بعد ۵۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ جب خدا بخش خاں حیدر آباد میں چیف جسٹس کے اعلیٰ عہدے پر گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ گئیں۔

اور وہیں ان کے ساتھ رہیں ۔ ان کے زمانے میں پٹنہ شعر و ادب کا گہوارہ تھا ، آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ۔ مشاعروں میں ان کی غزل کی بھی فرمائش کی جاتی ۔ اکثر مشاعروں میں ان کی طرف سے دوسرے لوگ غزل پڑھتے تھے ۔ کبھی انکے گھر میں پس پردہ بیٹھ کر مخصوص شعراء کو اپنا کلام بھی سناتی تھیں۔ خدا بخش خاں مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے ولی الدین خدا بخش گرچہ مجھ سے سن میں چند سال بڑے تھے ، مگر مجھ سے اور ان سے کافی یارانہ تھا ۔ عدالت دیوانی میں ہم دونوں پریکٹس کرتے تھے ، وہ فوجداری کے مقدمات کی طرف زیادہ جھکے رہتے تھے ، پھر روزانہ ملاقات " جبلی کلب " میں ہوجاتی تھی جو پٹنہ کی عدالت سے ملحق ہے ۔ ولی الدین خدابخش ، خدا بخش اورینٹل لائبریری کے سکریٹری اور لائبریرین بھی تھے اور یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ برسوں ان کے زمانے میں میں بھی حکومت کی طرف سے نام زد کردہ لائبریری کی مینجنگ کمیٹی کا ممبر تھا ۔ ولی الدین خدا بخش کبھی کبھی اپنی والدہ کے اشعار سناتے تھے اور ان سے سنے ہوئے جمیلہؔ کے اشعار سے مجھے جمیلہؔ کی معیارِ شاعری کی عظمت پہلی دفعہ معلوم ہوئی ۔ مولوی فصیح الدین بلخی ریسرچ اسکالر تھے ، اسی سلسلے میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر انہوں نے جمیلہ کے سات دِیوان خدا بخش اورینٹل لائبریری سے نکالے۔ افسوس کی بات ہے کہ جمیلہؔ کا کوئی دیوان چھپ کر شائع نہیں ہوا ۔ میں تو اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ کسی طرح یہ سات دیوان مرتب کرنا اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ بے حد پُرگو بھی تھیں اور قادر الکلام بھی تھیں ۔ جمیلہؔ کے دو ایک اشعار مجھے ولی الدین خدا بخش سے سنے ہوئے یاد رہ گئے ہیں ، صرف اُن ہی پر میں اکتفاء بھی کرتا ہوں، مگر اب مولوی فصیح الدین بلخی کے " تذکرۂ نسوانِ ہند " سے بھی جمیلہؔ کے چند شعر مل گئے ہیں ، اس لئے ان میں سے چُن کر کچھ اشعار پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ یہ کیا ہے ؟ آج تمہیں بت بنا دیا کس نے

جواب کیوں نہیں دیتے مرے سوالوں کا

۲۔ چار سو اس کی جستجو کیسی — دشت و صحرا کی آرزو کیسی

اس سے آخر جمیلہ کیا چاہوں — دل نہیں ہے تو آرزو کیسی

۳۔ آنکھوں سے حق نے پردہ غفلت اٹھا دیا

خواب و خیال میری نظر میں جہاں ہے اب

۴۔ حیرتی کیونکر نہ ہوں طالب ترے دیدار کے

اک جھلک سی دیکھ کر آئینہ حیراں ہوگیا !

۵۔ اے دل زار چین لینے دے — بے اجل کوئی مر نہیں سکتا

۶۔ اے جمیلہ نہ ملا بت نہ ملا مجھ کو خدا

میں تو اس ہستی موہوم میں بیکار آئی

۷۔ تم کو جمیلہ گریہ عاشق دکھائیں گے

ہنستا ہے آج دامن ابر بہار دل

شعر گو طوائفیں

معشوق :۔ میں اپنے بچپن میں ضیاء عظیم آبادی اور معشوق کی داستان عشق سنا کرتا تھا اور یہ شعر بھی جو ضیاء سے منسوب ہے اس وقت اکثر لوگوں کی زبان پر جاری تھا۔

اک ہوک جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے

میں راتوں کو اٹھ کر روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

ضیاء اور معشوق کے عشق کی جگر سوز کہانی بہت دنوں تک پٹنہ کے لوگوں کو یاد رہیں۔ ضیاء پٹنہ کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعروں میں تھے۔ صاحب جان ایک شاہد رعنا سے آنکھ لڑ گئی اور ایک ہی نظر میں دونوں ایک دوسرے کے

والہ و شیدا ہوگئے۔ صاحب جان کوٹھے پر کی بیٹھنے والی طوائف ایک کم بضاعت نوجوان پر محبت میں جان چھڑکے یہ عجیب بات تھی۔ مگر عشق خانہ خراب کسی کو کب چھوڑتا ہے صاحب جان جن کا تخلص معشوق تھا، ایک لمحہ بھی ضیاؔء سے علیحدہ ہونے کو تیار نہ تھی۔ ضیاؔء کا بھی یہی حال تھا، نہ گھر کی پرواہ اور نہ اپنے سدھ بدھ کی معشوقؔ کے لوگوں نے دیکھا کہ اس عشق و عاشقی کے چکر میں یہ سونے کی چڑیا کہیں ہمیشہ کے لئے نہ اڑ جائے اس لئے اس کو لوگ کلکتہ لے گئے۔ کلکتہ پہنچ کر جب معشوق پر یہ حال کھلا کہ ضیاؔء سے علیحدہ کرنے کے لئے وہ کلکتہ لائی گئی ہے، اس نے زہر کھا کر ضیاؔء کے فراق میں جان دے دی۔ اتفاق دیکھئے کہ یہ مثل "دل رابہ دل رہسیت" پٹنہ میں ضیاؔء کے متعلق صادق اتری۔ اسی دن ضیاؔء نے بھی زہر کھا لیا۔ ایک ہی دن ضیاؔء اور معشوقؔ نے مرکر فرہاد اور شیریں کا درجہ حاصل کر لیا۔ معشوقؔ کا صرف ایک شعر مل سکا وہ آپ بھی سن لیجئے۔

اداسی کا بھی یہ سماں یاد رکھنا   ذرا دیکھتے جاؤ مدفن کسی کا!

بندی جان نازؔ: محلہ گورہٹہ میں رہتی تھی۔ میں نے اس کو دیکھا تو بوڑھی ہو چکی تھی۔ یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا اور اس کے بھائی کوڑا شاہ کی فقیری کا شہرہ پٹنہ سے نکل کر تمام مضافات میں پھیل چکا تھا۔ اس وقت بندی جان نازؔ کی بیٹی کا شباب پٹنہ میں قیامتیں ڈھا رہا تھا۔

بندی جان نازؔ کے متعلق یہ سنا کہ اشعار بہت اچھا کہتی تھی مجھے اس وقت جبکہ یہ تذکرہ لکھ رہا ہوں، سوائے دو چار شعر کے اور اس کے اشعار نہ ملے۔اس وقت تو اس کا گھرانہ ہی نابید ہو گیا ہے۔ کوڑا شاہ کی قبر آج بھی مرجع عوام ہے۔ قل بھی وہاں ہوتا ہے، عرس بھی ہوتا ہے مگر بندی جان نازؔ کا نام لینے والا کوئی بھی اب وہاں نہیں ہے جس سے اس کی غزلوں کا سراغ لگایا جا سکے۔ حکیم آغا

حسن ازل لکھنوی کی شاگرد تھی۔ حکیم صاحب پٹنہ ہی میں رہتے تھے اور ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی یہاں وسیع تھا۔ نازؔ کے دو تین شعر جو مل سکے وہ حاضر ہیں۔

شب وصل کرتے ہو عاشق سے حجت نکالا ہے تم نے یہ جھگڑا کہاں کا !

چھٹا ہوں میں یاروں سے بھولا ہوں منزل نشاں دے مجھے اب کوئی کارواں کا

یہ خنجر یہ سر دونوں حاضر ہیں اسدم ارادہ ہو دل میں اگر امتحاں کا

امیر جان امیر : نہ جانے یہی امیر جان طوائف ہے جس کو مولوی فصیح الدین بلخی مرحوم نے شمیم سخن کے حوالہ سے اپنی کتاب ''تذکرۂ نسوان ہند'' میں اس کا نام امیر بخش امیر لکھ دیا ہے مجھے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ بہر کیف بچپن میں سنا تھا کہ امیر جان طوائف پٹنہ میں ایک مشہور طوائف گذری ہے اور وہ شعر بھی کہتی تھی۔ شمیم سخن میں امیر بخش طوائف کو پورنیہ کی رہنے والی لکھا گیا ہے۔ یہ بہت ممکن ہیکہ وہ پورنیہ سے پٹنہ چلی آئی ہو یا دونوں جگہوں میں اس کے گانے بجانے کا بازار لگتا ہو۔ امیر بخش اور امیر جان میں بھی زیادہ اختلاف نہیں معلوم ہوتا ہے میں اپنے کانوں سے سنے ہوئے بیان پر اعتماد کر کے اس کو پٹنہ ہی کی کہوں گا۔ اتفاق ی/ رہ بھی دیکھئے کہ اس کے دو شعر جو شمیم سخن میں ہیں، یہ بھی وہی ہیں جو عنداللہ کرہ میں نے کچھ لوگوں سے بچپن میں سنے تھے۔ دونوں شعر ملاحظہ ہوں۔

کھل گیا راز نہاں پیتے ہی اِک ساغرِ عشق

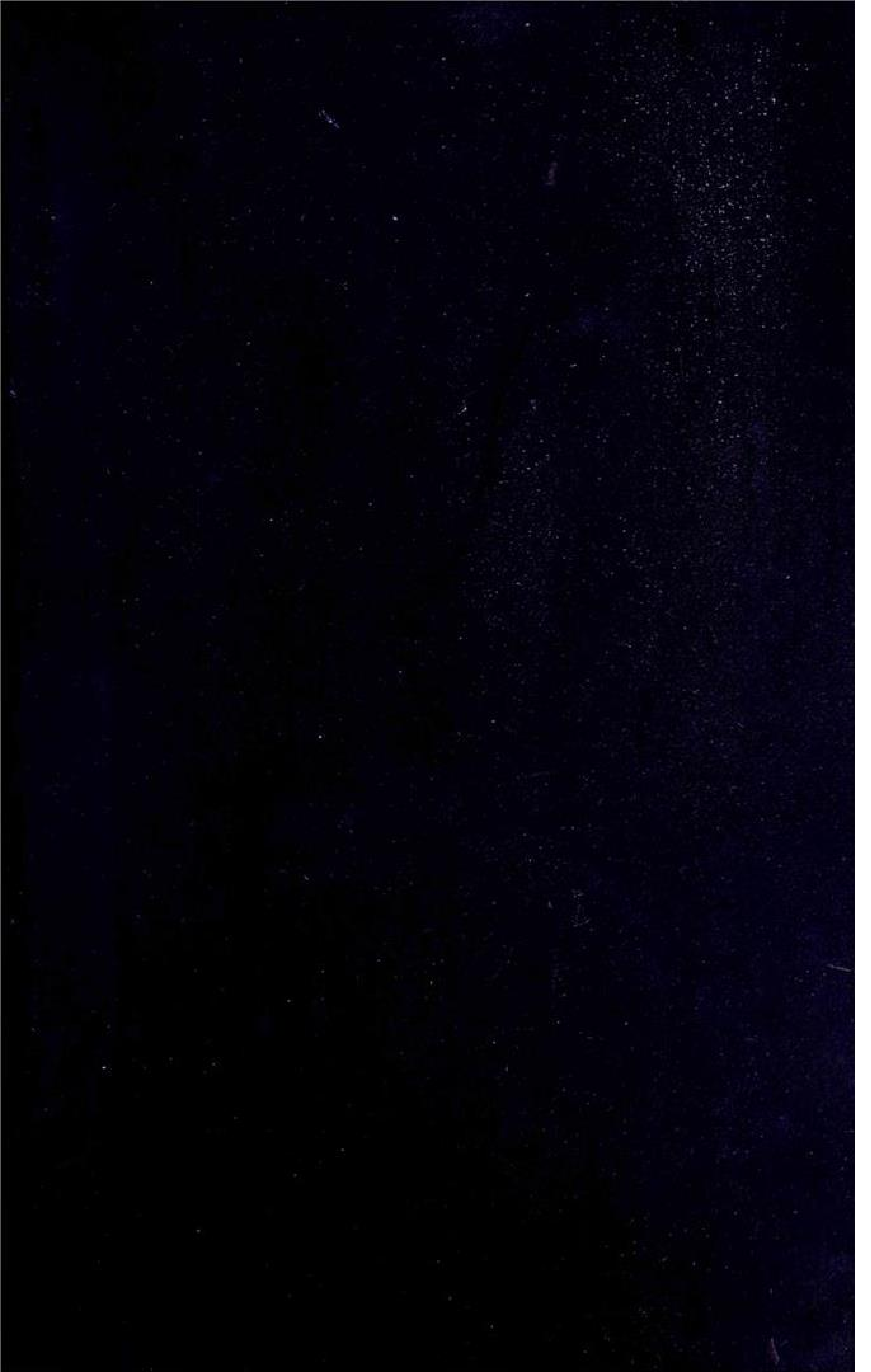
اب شرف لے گئے غافل ترے ہشیاروں پر

☆☆☆☆

عرصۂ محشر میں اس کا قُرب بھی مل جائیگا

اپنی جاہم ڈھونڈلیں گے صاحبِ محفل کے پاس

تمت بالخیر





سیّد بدرالدین احمد

پیدائش : ۱۸۶۲ء - وفات : ۱۹۸۳ء

آج قومی اتحاد یا قومی ایکتا پر ہندوستان میں پھر کافی زور دیا جارہا ہے، اس کے حصول کے لئے پروگرام اور اسکیمیں بن رہی ہیں مگر ان سب سے زیادہ کارآمد چیز جو ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگلے دور کے واقعات اور تذکرے، جن کا تصور بھی اب مٹتا جارہا ہے، ان کو اجاگر کر کے لوگوں کے سامنے پیش کئے جائیں اور اس وقت کے سماج کا ایک خاکہ بھی نظروں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہندوستان میں بسنے والے اس نتیجے پر خود ہی پہنچ جائیں گے کہ قومی ایکتا کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہ تو وہی ترکہ ہے جس کو ہمارے آبا و اجداد ہمارے لئے مشترکہ وراثت کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اسی غرض سے اس کتاب میں اگلے دور کے کچھ تذکرے اور اس وقت کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ منتشر اجزائے قومی کو پھر سے سمیٹنے میں ان سے مدد مل سکے۔ (اسی کتاب سے)

Printing & Designing by : Pakiza Offset, Sabzibagh, Patna - 6, Ph : 2667019 - Mob. : 98350-06167